500

مشہور مسلم شخصیات

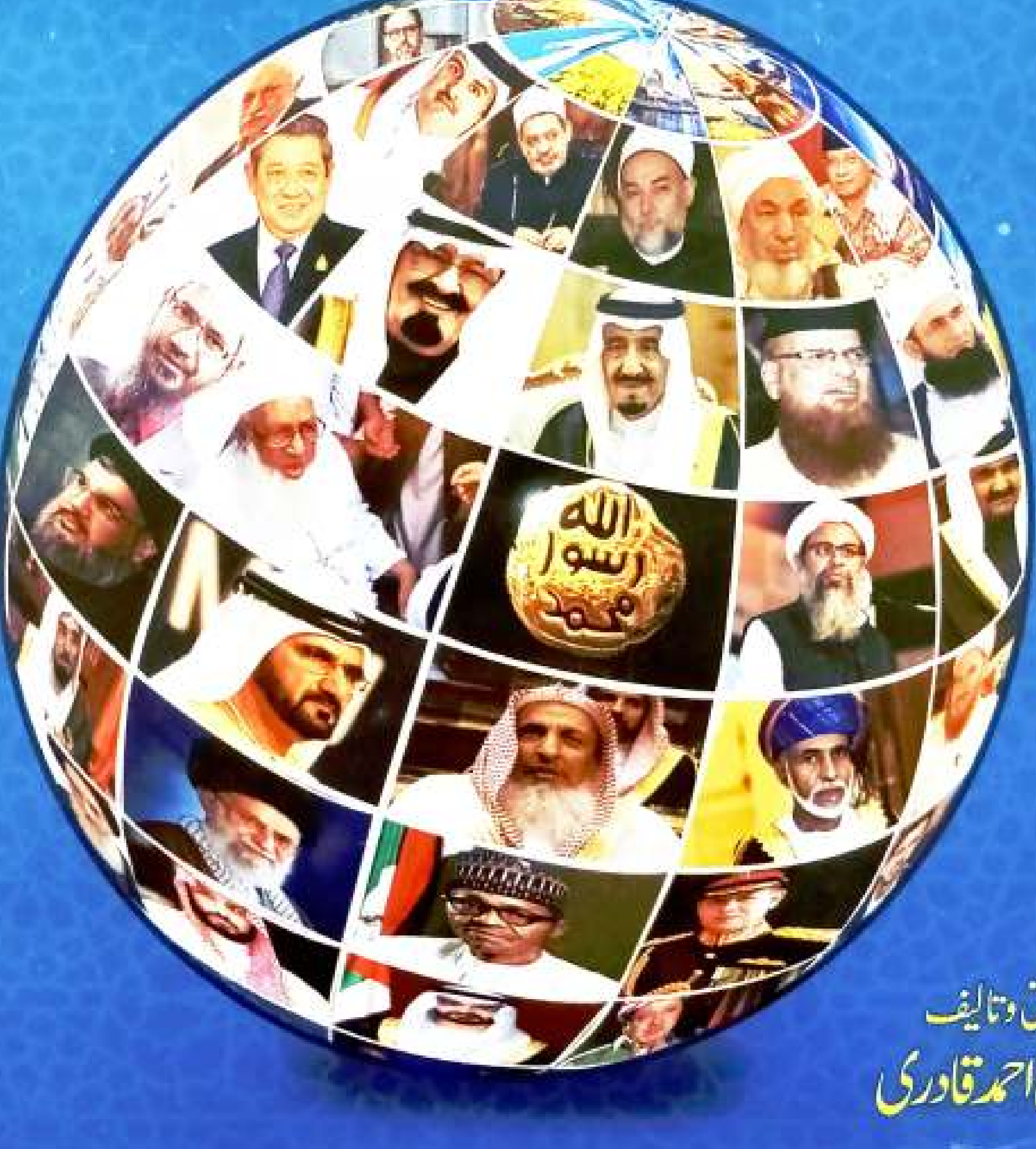

تحقیق و تالیف
اخلاق احمد قادری

500 مشہور مسلم شخصیات

ترتیب وتالیف:

اخلاق احمد قادری

DUA PUBLICATIONS

"اے رب! میرے علم میں اضافہ فرما"

ہماری کتابیں، معیاری کتابیں، پیاری کتابیں

انتباہ

تمام پبلشرز/دکاندار حضرات کو مطلع کیا جاتا ہے کہ کتاب ہذا کی جعلی کاپی
فروخت کرنے والے کے خلاف سخت سے سخت قانونی کاروائی کی جائے گی۔

حقوقِ اشاعت محفوظ

DUA PUBLICATIONS

ناشر: زاہد شیخ

نام کتاب	—	500 مشہور مسلم شخصیات
ترتیب وتالیف	—	اخلاق احمد قادری
اشاعت	—	2018ء
کمپوزنگ	—	التمش مبین
ڈیزائن	—	محمد احسن گل
مارکیٹنگ	—	عقیل باقر
مطبع	—	وقاص جاوید پرنٹرز، لاہور
قیمت	—	995/- روپے

گھر بیٹھے پاکستان کے کسی بھی کونے میں
اپنی پسندیدہ کتب منگوانے کے لیے ابھی ہم سے رابطہ کریں
کال، میسج، واٹس ایپ کے لیے اس نمبر پر رابطہ کریں 0300-4352745
یا ہمارے پیج کے ان باکس میں میسج کریں
www.facebook.com/booksparadisepakistan

دُعا پبلی کیشنز

الحمد مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ فون: 042-37233585
E-mail: duapublications@yahoo.com

خوبصورت اور معیاری کتب شائع کروانے کے لیے رابطہ کریں۔ زاہد شیخ 0300-9476417

فہرست

پیش لفظ 15

دنیائے اسلام 17

اسلام کے بڑے دبستانِ فکر

سُنی دینیات 19 | شیعہ دینیات 20

اباضیہ دینیات 21 | نظریاتی تقسیم 21

جدیدیت پسند طبقہ 22

بنیاد پرست مسلم

سُنی 23 | انقلابی شیعہ ازم 23

اسلامی سلسلہ ہائے تصوف

سُنی سلسلہ ہائے تصوف 24 | شیعہ سلسلہ ہائے تصوف 24

○

خواجہ کائنات، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم 27

خلفائے راشدین

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ 31 | حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ 35

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ 38 | حضرت حضرت علی کرم اللہ وجہہ 41

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ 45 | حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ 48

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ 49 | حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ 50

حضرت الارقم رضی اللہ عنہ بن ابی الارقم 52 | حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ 53

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ 54 | حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ 55

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بن عبیداللہ 57 | حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ 58

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ 59 | حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ 61

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ 62
حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ 63
حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ 64
حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ 66
حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ 68
حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ بن حرب 70
حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ ۷۱
حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ 73

مبلغین اسلام

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ 76
حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ 78
حضرت البراء رضی اللہ عنہ بن معرور 79
حضرت حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ 80
حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ 81
کازرونی، شیخ مرشد ابواسحٰق 82
شاہ محمد رمضان شہید ہریانوی 83
مولانا محمد الیاس 84
مولانا محمد الیاس قادری 85
ڈاکٹر ذاکر نائیک 86
مولانا طارق جمیل 89

عظیم قائدین

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ بن علی رضی اللہ عنہ 90
حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ 92
حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ 95
حضرت مصعب بن الزبیر رضی اللہ عنہ 97
حضرت زید بن علی بن حسین رضی اللہ عنہ 98
ابومسلم خراسانی 99
حضرت نفس ذکیہ رحمۃ اللہ علیہ 100
حضرت حسین بن علی رحمۃ اللہ علیہ الطالبی 102
محمد احمد بن عبداللہ مہدی سوڈانی 104
امیر عبدالقادر الحسنی 106
سید احمد شہید 108
امام شامل داغستانی 110
شریف حسین بن علی 111
یاسر عرفات 113

تابعین و تبع تابعین

حضرت محمد الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ 114
حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ 116
حضرت امام زین العابدین، علی بن حسین رضی اللہ عنہ 116
سید التابعین حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ 118
المختار بن ابی عبید الثقفی 119
حضرت مسلم بن عقیل رحمۃ اللہ علیہ 121
حضرت عمر بن عبدالعزیز 122
حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ 124
حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ 126
حضرت مسروق ابن اجدع رحمۃ اللہ علیہ 127
حضرت علمدار عباس بن علی رضی اللہ عنہ 128
حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ 129

آئمہ کرام اور فقہا

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ 131
امام مالک بن انس الاصبحی 134
حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ 136
حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ 138

امام ابوالحسن الاشعری رحمۃ اللہ علیہ 140
امام الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ 141
امام المزنی رحمۃ اللہ علیہ 142
امام الطحاوی رحمۃ اللہ علیہ 143
امام یحییٰ بن یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ اندلسی 144
امام ابن سریج رحمۃ اللہ علیہ 145
امام الماتریدی، ابومنصور محمد بن محمد 146
امام شمس الائمہ السرخسی 147
امام راغب الاصفہانی 148
امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ 149
ابن الجوزی حنبلی رحمۃ اللہ علیہ 151
امام فخرالدین رازی رحمۃ اللہ علیہ 153
امام النووی رحمۃ اللہ علیہ 155
امام ابن تیمیہ 156
امام ابن قیم جوزیہ 158
امام سراج الدین شبلی رحمۃ اللہ علیہ 159
امام سخاوی 160
الشیخ امام محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ 161
حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی 163
مولانا محمد قاسم نانوتوی 165
مولانا رشید احمد گنگوہی 167
امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ 168
مولانا عبدالحئی رحمۃ اللہ علیہ 170
مولانا اشرف علی تھانوی 171
غزالی زماں حضرت مولانا احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ 172

مفسرین کرام

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ 175
حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ 177
حضرت مقاتل بن سلیمان رحمۃ اللہ علیہ 178
امام ابن جریر الطبری رحمۃ اللہ علیہ 179
ابواللیث سمرقندی رحمۃ اللہ علیہ 181
امام ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ 182
ابن عربی الاندلسی رحمۃ اللہ علیہ 182
محی السنۃ البغوی رحمۃ اللہ علیہ 183
الشیخ الاکبر، ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ 183
امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ 185
امام البیضاوی رحمۃ اللہ علیہ 187
حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ 187
علامہ السیوطی رحمۃ اللہ علیہ 188
قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ 189
شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ 191
علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ 192
مولانا سید نعیم مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ 193
مفتی احمد یار خان نعیمی رحمۃ اللہ علیہ 194
علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ 194
مفتی محمد شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ 195
سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ 196
پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ 197
سید محمد مدنی اشرفی الجیلانی مدظلہ 198

محدثین کرام

امام ابوداؤد طیالسی 200
امام عبدالرزاق بن ہمام 201
امام نعیم بن حماد خزاعی 202
امام اسحٰق راہویہ 203

امام امام الدارمی	204	امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ	206
امام مسلم	208	امام ابن ماجہ	209
امام داؤد سجستانی	210	امام بقی بن مخلد اندلسی	211
امام ترمذی	212	امام ابو عبدالرحمٰن نسائی	213
امام ابن خزیمہ	214	الحاکم نیشاپوری	215
البیہقی	216	القاضی ابوالفضل عیاض	217
امام السہیلی عبدالرحمٰن بن عبداللہ	218	شیخ عبدالحق حقی محدث دہلوی	218
شیخ الہند محمود الحسن	219	مولانا زکریا کاندھلوی	220
علامہ ارشد سعید شاہ کاظمی	221		

سیرت نگاران

ابن شہاب زہری	223	موسیٰ بن عقبہ	225
ابان بن عثمان رضی اللہ عنہ	225	وہب بن منبہ	226
علامہ واقدی	227	ابن سعد	228
ابن اسحاق	229	ابن ہشام	230
یعقوبی	231	ابن حزم اندلسی	232
علامہ عبدالبر	233	ابن بشکوال	234
ابن سید الناس	234	الحافظ علامہ ابن کثیر	235
الشامی	236	علامہ نورالدین ابن برہان الدین حلبی	236
عبدالحق حقی محدث دہلوی	237	علامہ محمد یوسف بن اسماعیل نبہانی	237
علامہ شبلی نعمانی	238	سید سلیمان ندوی	240
قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری	241	محمد حسین ہیکل	241
ڈاکٹر محمد حمیداللہ	242	مولانا نعیم صدیقی	243
مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری	244	سید قاسم محمود	244

حفاظ کرام

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ	246	حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ	247
سالم مولائے ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ	248	حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ	248
حضرت تمیم بن اوس داری رضی اللہ عنہ	249	حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ	249
حافظ ابوالشعثا الازدی العمانی	250	قتادہ بن دعامۃ السدوسی	250
عباد بن سلیمان الصیمری	251	العبادی	251

میر سید علی ہمدانی 252
خواجہ حافظ محمد جمال ملتانی 253
مولانا رحمت اللہ کیرانوی 253
عبدالعلیم صدیقی 254
سید قطب شہید 255
شیخ ڈاکٹر یوسف القرضاوی 256
شیخ عبدالرحمٰن السدیس 257
سعود الشریم 257
عمر خضر 258

بہادران اسلام

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابی جہل 259
حضرت مالک بن بن عوف رضی اللہ عنہ 260
حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ 261
الباھلی، عبدالرحمٰن بن ربیعۃ 262
حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ 262
مالک بن الاشتر النخعی 263
عقبہ بن نافع 263
حسان بن النعمان الغسانی 264
عبداللہ بن علی 265
عمر بن حفص 265
عمر بن حفصون 266
سلطان الپ ارسلان 266
یوسف بن تاشفین 267
اسامہ بن مرشد 267
عبدالمومن بن علی 268
عمادالدین زنگی 268
جلال الدین خوارزم شاہ 269
ارطغرل 270
اورنوس غازی 270
احمد پاشا خائن 271
احمد پاشا بونیوال 271
محمد علی پاشا 272
عبدالکریم ریف غازی 272

آئمہ اثنا عشریہ

حضرت امام محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ 273
حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ 274
حضرت امام موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ 275
حضرت امام علی رضا رحمۃ اللہ علیہ 276
حضرت امام تقی رحمۃ اللہ علیہ 277
حضرت امام علی نقی رحمۃ اللہ علیہ 279
حضرت امام حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ 280
حضرت امام مہدی رحمۃ اللہ علیہ 281

شہدائے اسلام

ام عمار حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا 283
حضرت یاسر بن عامر رضی اللہ عنہ 284
حضرت خبیب رضی اللہ عنہ بن عدی 285
حضرت مبشر رضی اللہ عنہ بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ 286
حضرت عبداللہ بن طارق رضی اللہ عنہ 286
حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ بن ابی عامر 286
سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ 287
حضرت جعفر الطیار رضی اللہ عنہ 287
الحر بن یزید ریاحی 288
شیر میسور، ٹیپو سلطان شہید 289
میر نثار علی تیتو میر 290
شاہ اسمٰعیل شہید 290

سید احمد شہید 291 — غازی علم الدین شہید 291

کیپٹن محمد سرور نشان حیدر 291 — میجر راجا عزیز بھٹی شہید 292

سرفراز احمد رفیقی شہید 292 — راشد منہاس 293

میجر شبیر شریف شہید 293 — کیپٹن کرنل شیر خان شہید 294

خواتین اسلام

ام رسول صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا بنت وہب 296

ام المومنین حضرت سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا 297

ام المومنین حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا 297

حضرت سیدہ زینب رضی اللہ عنہا بنت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم 298

سیدۃ النساء العالمین، حضرت فاطمۃ الزاہرہ رضی اللہ عنہا 299

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بنت حیّ بن اخطب 299

حضرت حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا 300

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا 300 — حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بنت عبدالمطلب 301

حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا، نصیبہ 302 — حضرت خولہ بنت ازور 302

حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا 303 — حضرت زینب بنت علی رضی اللہ عنہا 303

حضرت سکینہ بنت الحسین رضی اللہ عنہا 304 — حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا 305

الخیزران بنت عطا 305 — شہزادی عباسہ 306

ملکہ زبیدہ 306 — فاطمہ الفہری 307

لبنیٰ قرطبی 307 — ست الملک 308

ترکان خاتون 308 — اروی بنت اسماء 309

شجرۃ الدر 309 — رضیہ سلطانہ 310

بغداد خاتون 310 — لِلّٰہ عارفہ 311

محدث ام ہانی 312 — ملکہ خدیجہ آف مالدیپ 312

ملکہ عائشہ الحرہ 313 — ماہم انگہ 313

حُریم روگزیلینا 314 — گلبدن بیگم 314

سلطان، چاند بی بی 315 — ملکہ نور جہاں 316

ملکہ ممتاز محل 316 — صاحب جی 317

جہاں آرا بیگم 318 — زیب النسا بیگم 318

حضرت محل 319 — سکندر بیگم 320

شاہجہان بیگم 320 — بی اماں، والدہ مولانا محمد علی جوہر 321

قرۃ العین حیدر	322	عصمت چغتائی	323
عدیلہ خانم	323	عطیہ بیگم فیضی	324
مادر ملت فاطمہ جناح	324		

جغرافیہ دان اور سیاح

البلخی	326	ابن رستہ	327
ابن حوقل	327	بشاری مقدسی	327
الاصطخری	328	البیرونی	328
الادریسی	329	نام خسرو	330
القزوینی	330	ابن جبیر	331
ابن بطوطہ	331	سیدی علی رئیس	332
اولیاء چلپی	333	ابو عبید البکری	333

وطن پرست راہنما

شہید تیتو میر	335	نواب سراج الدولہ	335
سلطان ٹیپو شہید	336	احمد خان کھرل	337
مصطفٰی کمال پاشا	337	محمد علی جناح، قائد اعظم	338
عصمت انونو	339	احمد سوئیکارنو	339
شیخ مجیب الرحمان	340	اسلام کریموف	341
عالیجاہ عزت بیگوچ	341	محمود احمد نژاد	341

وزرائے اعظم و صدور

قائد ملت خان لیاقت علی خان	343	عدنان میندریس	344
تنکو عبد الرحمان	344	صدر ایوب خان	345
ذوالفقار علی بھٹو	345	صدر انوار السادات	346
صدر صدام حسین	347	جنرل محمد ضیاء الحق	348
بے نظیر بھٹو	348	ڈاکٹر مہاتیر محمد	349

فلسفی، طبیب، موجد اور سائنسدان

جابر بن حیان	351	الخوارزمی	351
الفرغانی	352	حبش الحاسب المروزی	353
الکندی	353	ابو معشر البلخی	354
ابو حنیفہ الدینوری	354	الفارابی	355
الرازی	356	اخوان الصفا	356

ابوالقاسم الزہراوی	357	الجریطی	357
الجندی	358	ابن یونس	359
السجزی	359	ابن سینا	360
ابن الہیثم	360	ابن باجہ	361
عمر خیام	361	ابن طفیل	362
ابن رشد	363	الاقلیدی	363
جابر بن افلح	364	شرف الدین طوسی	365
السمرقندی	365	ابن البیطار	366
نصیر الدین الطوسی	366	ابن النفیس	367
ابن الشاطر	367	قاضی زادہ رومی	368
الغ بیگ	369	ابن الماجد	369
پری ریس	370	علی کشچو ترک	371
آک شمس الدین	371	سلیمان المہری	372
الحسن ابن محمد	373	سیدی علی ریس	373
ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی	374	حکیم اجمل دہلوی	374
حکیم محمد سعید دہلوی	375	ڈاکٹر عبدالسلام	375
ڈاکٹر عبدالقدیر خان	376	احمد زویل	377
اشفاق احمد	377	ڈاکٹر ثمر مبارک مند	378

خلفائے اسلام

خلفائے بنوامیہ

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ	380	مروان بن الحکم	381
عبدالملک بن مروان	381	ولید بن عبدالملک	382
ہشام بن عبدالملک	383	مروان ثانی	383

خلفائے بنوعباس

ابوالعباس السفاح			384
المنصور	385	المہدی	385
ہارون الرشید	386	مامون الرشید	386
المعتصم باللہ	387	المتوکل علی اللہ	388
المعتضد باللہ	388	المستعصم باللہ	389

خلفائے فاطمین مصر

المہدی عبید اللہ	390	القائم بامر اللہ	390
الحاکم بامر اللہ	391	المستنصر باللہ	392
الآمر باحکام اللہ	392		

امراء و خلفائے اندلس

عبدالرحمٰن الداخل	394	ہشام اول	395
الحکم الاول	395	عبدالرحمٰن الثانی	396
عبدالرحمٰن الثالث	396	الحکم الثانی	397
المنصور بن ابی عامر	398		

سلاطین و شاہان اسلام

احمد بن طولون	399	سلطان نورالدین زنگی	400
سلطان صلاح الدین ایوبی	401	سلطان محمود غزنوی	401
سلطان الپ ارسلان	402	سلطان ملک شاہ	403
سلطان شہاب الدین غوری	403	سلطان قطب الدین ایبک	404
ابوالمظفر سلطان شمس الدین التمش	405	سلطان غیاث الدین بلبن	405
سلطان الجائتو خدابندہ	406	سلطان عثمان اول	406
امیر تیمور صاحبقران	407	سلطان بایزید اول	408
سلطان غیاث الدین تغلق	408	سلطان قائتبائی	409
سلطان محمد فاتح	409	سلطان مراد اول	410
شہنشاہ ظہیر الدین بابر	411	سلطان شیر شاہ سوری	411
سلطان سلیمان قانونی	412	شہنشاہ جلال الدین اکبر	413
عباس اعظم صفوی	413	شہنشاہ شہاب الدین شاہجہاں	414
شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر	415	بہادر شاہ ظفر	415
سلطان حیدر علی	416	نظام ملک آصف جاہ	417
محمد علی پاشاہ	417	مولائی حسن	418
سلطان عبدالعزیز بن عبدالرحمان ابن سعود	419	محمد رضا شاہ پہلوی	419
شاہ حسین آف اردن	420		

اولیائے کرام و مشائخ عظام

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ	421	حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ	422
حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ	423	حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ	424

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ	424	حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ	425
حضرت حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ	426	حضرت داتا گنج بخش ہجویری رحمۃ اللہ علیہ	427
حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی پیران پیر رحمۃ اللہ علیہ	428	حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ	429
حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کا کی رحمۃ اللہ علیہ	429	حضرت شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ	430
حضرت فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ	431	حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ	431
حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ	432	حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت رحمۃ اللہ علیہ	433
حضرت لعل شہباز قلندر رحمۃ اللہ علیہ	433	حضرت موسیٰ پاک شہید رحمۃ اللہ علیہ	434
حضرت شاہ کمال قادری کیتھلی رحمۃ اللہ علیہ	435	حضرت شاہ سکندر روس الاولیاء	436
حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ	436	حضرت شاہ موسیٰ ابوالمکارم رحمۃ اللہ علیہ	437
حضرت طاہر بندگی رحمۃ اللہ علیہ	438	حضرت صابر علاؤالدین کلیروی رحمۃ اللہ علیہ	438
حضرت میاں میر لاہوری رحمۃ اللہ علیہ	439	حضرت شاہ عنایت قادری رحمۃ اللہ علیہ	440
حضرت بلھے شاہ	441	حضرت عبدالعلی شاہ رحمۃ اللہ علیہ	441
حضرت خواجہ سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ	442	حضرت مہر علی شاہ گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ	443
قبلہ عالم، حضرت علی احمد شاہ قادری رحمۃ اللہ علیہ	444	حضرت مقبول محی الدین گیلانی دامۃ برکاتہم العالیہ	444

فاتحین، سپہ سالاران اور امیران عسکر

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ	446	حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ	447
حضرت شرجیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ	448	حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ	448
حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ	449	عقبہ بن نافع	450
موسیٰ بن نصیر	451	طارق بن زیاد	451
محمد بن قاسم الثقفی	452	قتیبہ بن مسلم	452
عبدالرحمٰن غافقی	453	مسلمہ بن عبدالملک	454
افشین حیدر	454	قاضی اسد بن فرات	455
جوہر صقلی	455	بدر الجمالی	456
سلطان بیبرس اول	457	بیبرس المنصوری	457
خیرالدین باربروسہ	458	غازی الدین خان	458
نادر شاہ افشار	459	احمد شاہ ابدالی	459
جنرل بخت خان	460		

علماء و مجتہدین

ابن سیرین	463	ابن ابی الدنیا	463
ابن بابویہ	464	البغدادی	464

الطوسی	465	ابن زہر	465
الطوسی	466	ابوعبیدالبکری	466
الشہرستانی	466	ابن القطفی	467
ابن الطقطقی	467	علامہ الحلی	468
ابن الوردی	469	ابن ابی الجمہور	469
قاضی نوراللہ شوستری	469	ملاجیون	470
سید عبداللہ غزنوی	471	امام آیت اللہ خمینی	471
الشاہ احمد نورانی	472		

مصنّفین و شعرائے کرام

مصنّفین

الجاحظ	475	الاصمعی	475
ابوالعلامصری	476	بیہقی	476
البونی	477	ابن منظور	477
ابوالفداء	478	ابن الندیم	479
حاجی خلیفہ	579	ابوالفضل علامی	480
میرامن	480	سرسید احمد خان	481
بابائے اردو مولوی عبدالحق	482	مولانا ظفر علی خاں	482
مولانا غلام رسول مہر	483	ممتاز مفتی	483
مرزاابن حنیف	484	ریاض قادری	484

شعرائے کرام

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ	485	الفرزدق	486
ابن عبدربہ	487	ابوالقاسم فردوسی	587
امام البوصیری	488	مولانا روم	488
حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ	489	حافظ شیرازی	490
امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ دہلوی	490	مولانا عبدالرحمٰن جامی	491
سید خواجہ میر درد	492	میر تقی میر	492
حکیم محمد مومن خان	493	میرزا اسداللہ خان غالب	493
شیخ محمد ابراہیم ذوق	494	اکبرالٰہ آبادی	495
علامہ محمد اقبال	495	فیض احمد فیض	496
صوفی تبسم	497	ساحر لدھیانوی	497

احمد ندیم قاسمی	497	احمد فراز	498
مظفر وارثی	499		

خطاط، نقاش اور معمار

ابن البواب	500	یاقوت المستعصمی	500
بہزاد	501	معمار سنان ترک	501
قاسم آغا	502	احمد معمار لاہوری	502
عبدالصمد شیریں قلم	503	عبدالمجید صوفی پروین رقم	504
عبدالرحمٰن چغتائی	504	صادقین	505
ملک عاشق ملتانی	505	عبدالستار ایدھی	506

مورخین

البلاذری	507	الطبری	508
یعقوبی	508	المسعودی	508
الخطیب بغدادی	509	البیہقی	510
ابن الاثیر	510	ابن خلکان	510
الجوینی	511	قاضی منہاج الدین سراج	511
رشید الدین طبیب	512	ابن خلدون	512
ابن حجر عسقلانی	513	ابن عرب شاہ	514
فرشتہ محمد قاسم ہندو شاہ	514	خافی خان	515
سید امیر علی	516	ڈاکٹر مبارک علی	516

انقلابی و مصلح

الشیخ محمد بن عبدالوہاب	518	سید جمال الدین افغانی	519
محمد عبدہ	519	احمد اعرابی پاشا	520
جنرل عبدالکریم قاسم	521	ڈاکٹر مصدق	522
کرنل حواری بومدین	523	رفیق الحریری	524
حسنی الزعیم	525	جمال عبدالناصر	526
کرنل محمد قذافی	527		

پیش لفظ

تغیرات کا نام دنیا ہے۔ یہاں ایسے تغیرات اکثر ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں کہ جنہیں ایک عام فہم آدمی ابھی سمجھ نہیں پاتا کہ دوسرے تغیرات رونما ہو جاتے ہیں۔ وہ انسان جو تغیرات پیدا کرتے ہیں وہ سب سے زیادہ باعث خیر و برکت ہوتے ہیں۔ بنی نوع انسان کے لیے لازم ہے کہ ایسے عظیم انسانوں کا ان کے عظیم الشان کارناموں کی بنا پر احترام کرے چاہے وہ کسی بھی ملک و ملت سے تعلق رکھتے ہوں اور ان کے تجربات سے استفادہ بھی کرے۔ گذشتہ چودہ صدیوں میں اسلام کے دامن میں ایسے بے شمار تابندہ ستارے چمکے جنھوں نے انسانی زندگی کے ہر حلقے کو منور و تاباں کر دیا۔ یہ ایسی عظیم ہستیاں تھیں کہ جن کے بلند حوصلوں کے سامنے آلام و مصائب نے گھٹنے ٹیک دیئے اور مشکلات کے بادل چھٹ گئے۔ ان عظیم مسلم شخصیات نے اپنی مساعی جمیلہ سے ویرانوں کو رشک ارم بنا دیا۔ اپنی جانوں کو جوکھم میں ڈال کر انہوں نے بنی نوع انساں پر کیا کیا احسان کیے۔ انصاف کی جنگ کے لیے ان کی شمشیر آبدار میدان کارزار بجلی کی طرح چمکی وہ اکثر فتح مند بھی ہوئے اور کبھی کبھی انھیں مغلوب بھی ہونا پڑا۔ وہ قید ہوئے، وہ محبوس بھی ہوئے لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود انہوں نے صبر و استقلال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ وہ مجاہد بھی تھے اور غازی بھی انہوں نے دنیا کو جہالت اور غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرایا، جہالت کے اندھیروں کو شمعیں علم روشن کر کے دور کر دیا۔ بڑے بڑے تاجداران عالم نے ان کا استقبال بطور فاتح کیا اور مہذب دنیا ان کا نام ادب و احترام سے لینے لگی، دنیا ایسے عظیم انسانوں کے لیے ہر وقت چشم براہ رہتی ہے۔ سائنس ہو یا سیاحت عظیم مسلم شخصیات نے ہر میدان میں اپنی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیئے اور اپنے کردار و عمل سے ہر ممکن طور پر اسلام کا نام روشن کر دیا۔ تاریخ کے شعبے میں بھی مسلمانوں نے بے مثال خدمات انجام دیں۔ یونانیوں نے مسلمانوں سے پہلے اس شعبے میں افسانوی، اولیات کو جگہ دے کر تاریخ اور افسانہ کو گڈمڈ کر دیا تھا۔ یہ مسلمان مورخین تھے جنہوں نے تاریخ کے شعبے سے افسانوی اولیاتکو الگ کر دیا اور اسے ایک باقاعدہ سائنس کی شکل دی۔

اسی طرح علم جغرافیہ میں مسلمانوں کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ الادریسی اور یاقوت حموی جیسے نابغہ روزگار لوگوں نے معلوم دنیا کے قریے قریے کے متعلق معلومات جمع کر کے آئندہ زمانوں کے لیے علم جغرافیہ کو لازم و ملزوم قرار دے دیا۔

فلاسفہ اسلام نے الٰہیات اور فلسفے کو نہایت دلنشیں پیرایہ میں پیش کر کے اسے عام فہم بنا دیا۔ علم ریاضی کو الجبرا جیسے شعبے سے مستفید کیا اور علم ریاضی کی نئی جہتیں دریافت کر کے بنی نوع انسان کو چاند اور دوسرے اجرام فلکی تک پہنچنے کے راستے دریافت کرنے کا فن عطا کیا۔

علم فلکیات میں مسلمان فلکیات دانوں نے بہت سی ایسی اہم خدمات انجام دیں جو آئندہ زمانوں میں انسان کی

خلانوردی کے لیے بنیاد فراہم کر گئیں۔ مسلم ماہر فلکیات میں سے ابن شاطر نے کوپرنیکس سے صدیوں پہلے ہمیں بتایا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ اسی طرح ابن نفیس وہ مسلم طبیب ہے جس نے ولیم ہاروے سے کئی سو سال پہلے انسانی جسم میں دوران خون کے متعلق صحیح معلومات فراہم کیں۔ مصوری ہو یا موسیقی زندگی کے تمام شعبوں میں مسلمانوں نے کمال پیدا کیا۔ اور شعر وادب کی دنیا میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ باکمال مسلم شخصیات میں سے 1000 شخصیات کو منتخب کر کے قارئین کے سامنے اس کتاب میں پیش کیا ہے۔

دنیائے اسلام

فی زمانہ مسلمانان عالم کی آبادی 107 بلین (ایک ارب، ستر کروڑ) سے تجاوز کر چکی ہے، اور مسلمان عالمی آبادی کا 23 فی صد یا پانچواں حصہ ہیں اور مزید تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔

مذہب اسلام عقیدہ توحید (ایک خدا پر ایمان) و رسالت صلی اللہ علیہ وسلم پر مبنی ہے، اس مذہب کی بنیاد پیغمبر اسلام، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم (570ء-632ء) نے قدیم شہر مکہ میں رکھی تھی جو جزیرہ نما عرب کے مغربی ساحل پر صوبہ حجاز میں واقع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام پر اپنی آخری الہامی کتاب قرآن مجید نازل فرمائی۔ یہ یاد دلانا بھی ضروری ہے کہ اسلام ساتویں صدی عیسوی میں بھی کوئی نیا مذہب نہیں تھا بلکہ یہ خدا کے اس پیغام کی آخری شکل تھی جو اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے آنے والے پیغمبروں کو بھیجا تھا۔

قولوا آمنا باللہ وما انزل الینا وما انزل ابراھیم واسمعیل واسحٰق ویعقوب والاسباط وما اوتی موسیٰ وعیسیٰ وما اوتی النبیون من ربھم لانفرق بین احد منھم ونحن لہ مسلمون (البقرہ:136) (القران)

"اے مسلمانوں تم سب کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر بھی جو ہماری طرف اتاری گئی اور جو چیز ابراھیم اسماعیل اسحاق یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد پر اتاری گئی اور جو کچھ اللہ کی جانب سے موسیٰ علیہ السلام وعیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیاء علیہم السلام پر اتارا گیا ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں پاتے۔ ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں۔ (ترجمہ مولانا محمد جونا گڑھی)

روح اسلام: روح اسلام کو تین بڑے اصولوں کی بنیاد پر آسانی سے جانا جاسکتا ہے۔ اسلام (خدا کی رضا کے آگے جھکنا) ایمان (خدا پر ایمان) اور احسان (نیکی اور خدا شناسی)

اسلام کے پانچ بنیادی ستون: اسلام پانچ بنیادی ستونوں پر استوار ہے جن میں پہلا (1) شہادتین ہے یعنی گواہی دینا کہ اللہ معبود برحق ہے اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ (2) نماز پنجگانہ، (3) نادار اور غریب لوگوں کو آمدنی کا 40 واں حصہ سالانہ دینا زکوٰۃ کہلاتا ہے۔ (4) روزہ، رمضان المبارک میں پورے مہینے روزہ رکھنا، انا اور جسم کی نفی ہے۔ (5) حج، ذی الحجہ میں استطاعت کے مطابق حج کرنا۔

فقہ اسلام:

اسلام میں عیسائیت کی طرح کا کلیسائی نظام نہیں ہے۔ نہ ہی کوئی کلیسائی عملہ یا پاپائی نظام موجود ہے جو اس کو متحد رکھے۔ نہ ہی کوئی ایسا روحانی ہے جو اس کی دیکھ بھال کے لیے موجود ہو۔ پھر وہ کیسے ممکن ہوا کہ 1900 عیسوی کا اسلام اپنے

عقائد کے مطابق بالکل وہی ہے جو 700 عیسوی کا تھا۔ اس کے اندر چیک اور بیلنس کا نظام آخر کہاں موجود ہے، جو یہ اتنا متوازن ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام کا ایک روایتی قانون موجود ہے جو فقہ کہلاتا ہے۔ اس کا اسلامی تعلیمات پر مدون ہونا ضروری ہے۔ فقہ کے جو بڑے ماخذ قرآن اور حدیث ہیں۔ ان کے بعد قیاس اور اجماع کا درجہ ہے۔ اہل سنت و جماعت کے ہاں فقہ کے چار بڑے مکتب فکر حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی۔ ان کے علاوہ شیعی فقہ ہے جو فقہ جعفریہ کہلاتا ہے۔ اس کی بنیاد اثنا عشریہ کے چھٹے امام حضرت جعفر صادق نے رکھی تھی۔

اسی علم میں عبادات، معاملات اور تقریرات سے بحث ہوتی ہے اور یہی صدیوں کے دوران، عقائد، قانون، دینیات اور مسلک جیسے معاملات میں ایک چیک اینڈ بیلنس کی حقیقت رکھتا ہے۔ روایتی فقہ اسلام نہ صرف دین اسلام کی ہر معاملہ میں حفاظت کرتا ہے۔ بلکہ یہ دنیائے اسلام اور غیر مسلم دنیا دونوں کو بھی تحفظ فراہم کرتا ہے۔

اسلام اور تاریخ: اسلام نے تاریخ عالم میں جو اہم کردار تہذیب و فکر عالم کو نکھارنے میں ادا کیا ہے اُسے صرف چند الفاظ میں پیش کر دینا اس سے انصاف نہ کرنے کے مترادف ہے تاہم برطانیہ کے ولی عہد پرنس چارلس نے چند الفاظ میں اس کو احاطہ کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے، وہ لکھتے ہیں، از منہ وسطی میں اسلامی دنیا جو وسطی ایشیا سے بحر اوقیانوس کے ساحلوں تک پھیلی ہوئی تھی وہ ایک ایسا جہان علم تھا جہاں علماء فضلاء پیدا ہوئے۔ لیکن چونکہ ہم اسلام کو محض دشمنی کی عینک سے دیکھنے کے عادی ہیں اور اسے ایک اجنبی معاشرہ اور محض عقائد کا مجموعہ سمجھتے ہیں اس لیے ہم اسلام کے اس کردار کو بھلا دیتے ہیں جو اس نے خود یورپ کو مہذب بنانے میں ادا کیا ہے۔ مثال کے طور پر اگر چہ ہم اسپین میں مسلمانوں کی خدمات کا ذکر کرتے ہیں مگر ساتھ ہی اسپین میں مسلمانوں نے آٹھ سو سال میں جو مہذب معاشرہ اور تمدن آٹھویں سے پندرھویں صدی تک تشکیل دیا اس کی ترقیوں کے بارے میں ہم بہت کم اندازہ لگاتے ہیں۔ مسلم اسپین نے یونانی مفکرین کے علم کو یورپ کی تاریخ کے سیاہ ادوار میں جس طرح محفوظ رکھا جو بعد ازاں یورپ میں نشاۃ ثانیہ نام RENAISSAN کی آمد کا سبب بنا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ مگر یاد رہے کہ مسلم زعما کا یونانی علوم کو محفوظ رکھنے والے ملک سے کہیں زیادہ جدید مغربی دنیا کی تشکیل میں حصہ ہے۔ نہ صرف اسپین کے مسلمانوں نے قدیم یونانی اور رومی دانش کو اور تہذیب کو محفوظ رکھا بلکہ ان تہذیبوں کو اور ان کے دانشوروں کے خیالات کو ہم تک پہنچایا اور ان کی شرح و بسط بھی کی۔ سائنس، فلکیات، ریاضی، الجبرا (الجبرا ایک عربی لفظ ہے) قانون، تاریخ، طب، بصریات، زراعت، تعمیرات، دینیات اور موسیقی میں ابن رشد ابن زہر جیسی معروف شخصیات متعارف کرائیں جن کے کام کو دنیا کبھی نہیں بھلا سکے گی۔

O

اسلام کے بڑے دبستانِ فکر

MAJOR DOCTRINAL DIVISIONS WITH IN ISLAM

سُنّی دینیات

:(SUNNI THEOLOGY)

اشعری اور ماتریدی، راسخ العقیدہ سنی دبستان: یہ دونوں بڑے دبستان دینی، راسخ العقیدہ سنیوں کے اہم ترین مکتب فکر ہیں۔

اشعریہ مکتب فکر: 9صدی عیسوی سے تعلق رکھنے والے عالم دین ابوالحسن الاشعری (874ء تا 936ء) سے منسوب ایک دبستان دینی، ابوالحسن الاشعری اہل سنت کے علم الکلام کے بانی تھے۔ مشہور روایت ہے کہ رمضان المبارک میں وہ تین بار خواب میں زیارت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ وہ صحیح سنت پر قائم رہیں مگر علم الکلام کو بھی نہ چھوڑیں۔ اس زمانے میں اہل سنت عقلی دلائل (علم الکلام) کو ناپسند کرتے تھے مگر اس خواب کے بعد الاشعری نے جواب تک معتزلہ تھے۔ معتزلہ کے اعتقادات، نظریات کو خیر باد کہا اور ان کی رد میں سنی نظریات پیش کیے۔ مثلاً معتزلہ کا اعتقاد تھا کہ خدا کی صفات اس کی ذات سے جدا نہیں ہیں۔ مگر سنی دبستان فکر کی بنیاد رکھتے ہوئے انہوں نے رائے قائم کی کہ اللہ کی صفات، مثلاً علم، بصر وغیرہ ازلی وابدی ہیں اور انہیں کے ذریعے وہ عالم ہے، بصیر ہے، صفات خداوندی انسانی عقل سے ماورا ہیں مگر اس کی بھیجی ہوئی کتابوں پر ایمان لازمی ہے۔ اس طرح ایک دبستان فکر قائم ہو گیا۔

ماتریدیہ مکتب فکر: اس مکتب فکر کا نام نویں صدی عیسوی کے ایک وسطی ایشیا کے ایک عالم دین، محمد ابومنصور الماتریدی کے نام پر رکھا گیا ہے۔ الماتریدی کو امام المتکلمین اور مصلح عقائد المسلمین بھی کہا جاتا ہے۔ معتزلہ کی تاویلات قرآن مجید کی تردید کے سلسلے میں انہوں نے "تاویلات قرآن" کے عنوان سے جو کتاب لکھی وہ اہل سنت کے نقطہ نظر سے ایک ایسی کتاب ہے، جس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ علم الکلام کے میدان میں اہل سنت الجماعت کے ہاں یہ دوسری بڑی ہستی تھی جس کی آرا کے اتباع کو علمائے اہل سنت نے ہدایت پانے اور فساد و گمراہی سے اپنا عقیدہ بچانے کے لیے وسیلہ قرار دیا ہے۔

یاد رہے کہ الماتریدی اور الاشعری جیسے جلیل القدر علما کے درمیان جو فروعی یا جزوی اختلاف رائے پایا جاتا ہے وہ کسی عیب یا نقص کا موجب نہیں اور اس سے کسی کے دینی عقیدے پر حرف گیری نہیں کی جا سکتی۔ یہ فروعی اختلاف کسی لفظ کی تشریح یا کسی مسئلے کی بہتر توجیہہ تک محدود ہے۔ امام الماتریدی فقہی مسلک میں امام ابوحنیفہ کے پیروکار تھے جبکہ امام ابوالحسن الاشعری شافعی مسلک کے عالم تھے۔

سلفی مکتب فکر: یہ مکتب فکر اٹھارہویں صدی کے عالم دین محمد بن عبدالوہاب کے مسلک و تعلیمات سے متاثر ہو کر وجود میں آیا ہے۔ سلفیوں کے عقائد ان کی خصوص تاویلات اسلام کے گرد گھومتے ہیں۔ اور یہی چیز انہیں سُنیوں کی اکثریت سے الگ کرتی ہے جیسے کہ وہ خدا کی انسان سے مشابہت رکھنے والی تاویل کرتے ہیں۔ سلفی قرآن مجید اور حدیث کی لفظی تاویل پر بہت زور دیتے ہیں اور دینیات سے انسانی دلائل کے کردار پر شک کرتے ہیں۔

معتزلہ مکتب فکر: علم کلام کا ایک مدرسہ فکر جس نے عقل اور نقل کے مابین تطابق اور توافق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اعتزال کے معنی کسی شخص یا گروہ سے الگ ہو جانے کے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ انہیں معنوں میں آیا ہے۔ ''وان لم تومنوالی فاعتزلون (الدخان: 24) (یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا) اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو مجھ سے الگ ہو جاؤ۔''

معتزلہ کو اس نام سے کیوں موسوم کیا گیا اس میں اختلاف رائے ہے۔ مشہور ہے کہ حضرت حسن بصری ایک دن اپنے حلقہ درس میں بیٹھے تھے اور طلبہ کو درس دے رہے تھے۔ ایک شخص (جس کا نام واصل بن عطا تھا) نے کھڑے ہو کر کہا جناب ایک گروہ ایسا پیدا ہوا ہے جس کا کہنا ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے یہ لوگ خوارج کے وعید یہ ہیں۔ دوسرا گروہ جو مرجیہ کہلاتا تھا اس بات کا قائل تھا کہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر نہیں کہا جاسکتا۔ موخر الذکر کا خیال ہے کہ اگر ایمان صحیح ہے تو گناہ کبیرہ سے کفر لازم نہیں آتا۔ یعنی یہ لوگ کہتے ہیں کہ گناہ سے کسی قسم کا نہ ایمان پر ضرر پڑتا ہے اور نہ ہی اس کے مستقبل پر۔ ان دونوں فرقوں میں سے حق پر کون ہے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ابھی جواب نہیں دے پائے تھے کہ اس شخص نے خود ہی کہا کہ میری رائے میں ایسا شخص نہ مومن ہے نہ کافر بلکہ ان کے بین بین ہے اس پر امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ شخص ہم میں سے الگ ہو گیا۔ اس حوالے سے اس شخص کے ہم خیال لوگوں کا نام معتزلہ ہو گیا۔

ابن منظور نے لسان العرب میں لکھا ہے کہ معتزلہ کا خیال تھا کہ انہوں نے دونوں گمراہ فرقوں (یعنی خوارج اور اہل سنت) سے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ ایک مشہور معتزل نے اپنے مسلک کو اعتزال ہی سے تعبیر کیا ہے۔

شیعہ دینیات (SHI'A THEOLOGY):

اثنا عشریہ THE TWELVER۔ لغوی اعتبار سے بارہ والے۔ اصطلاحاً یہ اہل تشیع کا وہ گروہ ہے جو بارہ اماموں، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ، حضرت امام زین العابدین سجاد رضی اللہ عنہ، حضرت امام باقر رضی اللہ عنہ، حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ، امام موسیٰ کاظم، امام علی رضا رحمۃ اللہ علیہ، امام محمد تقی رحمۃ اللہ علیہ، امام حسن عسکری ذکی رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد مہدی کو مانتا ہے۔ اہل تشیع کے بعض فرقوں میں امامت کے بارے میں اختلاف رہا ہے۔ جیسے اسماعیلیہ صرف سات اماموں کو مانتے ہیں۔ ایران کی صفوی حکومت نے اثنا عشری عقیدے کو سرکاری مذہب قرار دیا تھا۔ اسماعیلی مکتب فکر: اہل تشیع کے تین بڑے گروہ ہیں۔ (1) امامیہ (2) زیدیہ (3) کیسانیہ۔ امامیہ کا عقیدہ ہے کہ خلافت فقط حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فاطمی اولاد کا حق ہے، لیکن زیدیہ اور کیسانیہ کا عقیدہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی غیر فاطمی اولاد بھی برابر کی خلافت کی حقدار ہے۔ چھٹے امام حضرت جعفر صادق کے زمانے میں فرقہ امامیہ کے دو گروہ ہو گئے۔ ایک اثنا عشریہ یا بارہ اماموں والے جبکہ دوسرا اسماعیلیہ ہے جو سات اماموں کو مانتا ہے۔

اس گروہ بندی کی وجہ یہ ہوئی کہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے کسی وجہ سے اپنے بڑے بیٹے اسماعیل کی نامزدگی کو منسوخ کر دیا تھا اور اپنے چھوٹے بیٹے امام موسیٰ کاظم کو اپنا جانشین بنا لیا تھا۔ اگر چہ حضرت اسماعیل والد کی زندگی ہی میں انتقال کر گئے تھے لیکن ان کے ماننے والوں کا عقیدہ ہے کہ وہ زندہ ہیں اور صرف روپوش ہیں۔

اسماعیلی فرقے کا عقیدہ ہے کہ امامت کا منصب خدا کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے جو بڑے بیٹے کو خود بخود ملِ جاتا ہے، اب اسماعیلی فرقے امام تو نہیں ہیں بلکہ ان کے نائب ہیں۔ حسن بن صباح کی سرپرستی میں اسماعیلیوں کو ایران میں کافی فروغ حاصل ہوا تھا۔ اسماعیلی بھی دو گروہوں میں منقسم ہیں اور زیادہ معروف گروہ وہ ہے جو آغا خاں کا پیروکار ہے۔

زیدی مکتب فکر: زیدی مکتب فکر بھی دیگر اہل تشیع کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کا قائل ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے جانشین امام کہلاتے ہیں۔ شیعان علی چوتھے امام حضرت زین العابدین تک تو متفق رہے، مگر ان کی وفات کے بعد ان کے دو گروہ ہو گئے۔ جنہوں نے امام زین العابدین کے بیٹے حضرت امام باقر کو امام مانا وہ امامیہ کہلائے اور جنہوں نے ان کے دوسرے بیٹے حضرت زید رضی اللہ عنہ کی تقلید کی وہ زیدیہ کہلائے۔

حضرت زید نے خلیفہ ہشام کے عہد میں دعویٰ خلافت کیا تھا جب حجاج بن یوسف نے آپ رضی اللہ عنہ کے خلاف عسکری کاروائی کی تو جو لوگ آپ کا ساتھ چھوڑ گئے وہ رافضی کہلائے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے 15 صفر 121ھ کو شہادت پائی۔

اباضیہ دینیات (IBADI THEOLOGY):

اباضیہ مکتب فکر: اباضیہ فرقے کا تعلق ساتویں صدی عیسوی کے خوارج سے ہے۔ صفویہ کی طرح اباضیہ بھی خوارج کی اعتدال پسند شاخ ہیں وہ غیر خارجیوں کو کفار یا مشرکین نہیں سمجھتے اور اس لیے ''استعراض'' (سیاسی قتل المسلمین) کے منکر ہیں۔ غیر اباضیوں کے ساتھ رشتہ مناکحت کی اجازت ہے۔ سیاسی معاملات میں وہ محکمہ ا (ابتدائی خوارج جو تحکیم پر اصرار کرتے تھے) ہی کی طرح امامت کے وجود کو لازمی اور لابدی شرط تسلیم نہیں کرتے۔ وہ اس عقیدے پر ایمان رکھتے ہیں کہ قیامت کے دن بھی خدا کے دیدار نہیں ہو سکیں گے۔ وہ دوزخ کے دائمی ہونے پر بھی یقین رکھتے ہیں یعنی جو لوگ دوزخ میں داخل کر دیئے جائیں گے وہ پھر کبھی اس سے نہیں نکالے جائیں گے۔ اباضیہ آج کل عمان، مشرقی افریقہ، طرابلس الغرب اور جنوبی الجزائر میں آباد ملتے ہیں۔

اباضیہ فرقے کا نام عبداللہ بن اباض المری التمیمی کے نام سے ماخوذ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اباضیہ کا آغاز 65ھ سے پہلے ہو چکا تھا۔ ازروئے روایت عبداللہ بن اباض نے انتہا پسند خوارج سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ اس ابن اباض اور خلیفہ عبدالملک بن مروان کے درمیان مورخین کے مطابق اسی زمانے دوستانہ تعلقات ضرور قائم رہے تھے۔ اباضیہ خود بھی کئی فرقوں میں منقسم ہو گئے۔ اباضیہ کے فرقوں میں سب سے بڑا اور سب سے اہم فرقہ ''وہبیہ'' ہے۔ خوارج کا یہ واحد فرقہ ہے جو ہمارے زمانے تک چلا آ رہا ہے۔ اس کی نسبت بعض اوقات استہبہ کے امام عبدالوھاب کی طرف کبھی جاتی ہے، لیکن قیاس غالب یہ ہے کہ اس فرقے کا تعلق خوارج کے امام عبداللہ بن وہب الراسبی سے ہے۔ اس بڑے فرقے کے علاوہ کچھ چھوٹی جماعتیں، نکاریہ، نفاثیہ اور خلفیہ ہیں۔

نظریاتی تقسیم

IDEOLOGICAL DIVISIONS TRADITIONAL ISLAM

روایت پرست طبقہ: یہ دنیا میں مسلمانوں کی آبادی کا 90 فی صد ہیں اور راسخ العقیدہ ORTHODOX ISLAM مسلمان بھی کہلاتے ہیں۔ راسخ عقیدہ مسلمان کوئی سیاسی تقسیم نہیں رکھتے اور زیادہ تر متفقہ طور پر صحیح الرائے ہیں۔ یہ مسلمانوں کے سب سے بڑے گروہ اہل سنت والجماعۃ کے لوگ ہیں جو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آثار صحابہ رضی اللہ

عنہم پر عمل پیرا ہیں۔ باقاعدہ شکل میں یہ مسلک چوتھی صدی ہجری میں خلیفہ المتوکل علی اللہ عباسی (847ء-861ء) کے عہد میں رائج ہوا تھا۔

اہل سنہ والجماعۃ کے چار مکاتب فکر ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

حنفی مکتب فکر: یہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ (699ء-767ء) کے مقلد ہیں اور فقہ حنفی سے استدلال کرتے ہیں۔

مالکی مکتب فکر: یہ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے پیروکار ہیں اور فقہ مالکی پر کاربند ہیں۔

شافعی مکتب فکر: یہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کے مقلد ہیں اور ان کا فقہ، فقہ شافعی ہے۔

حنبلی مکتب فکر: امام احمد بن حنبل کے مذہب پر کاربند گروہ جو فقہ حنبلی سے معاملات طے کرتا ہے۔

بنیاد پرست طبقہ (ISLAM FUNDAMENTALISM):

یہ مسلمانوں کی عالمی آبادی کے صرف 9 فی صد لوگوں پر مشتمل طبقہ ہے اور زیادہ تر بیسویں صدی میں مذہبی اور سیاسی نظریات کا حامل طبقہ ہے جو مختلف تحریکوں کا حصہ رہا ہے۔ اس میں شیعہ اور سنی دونوں تحریکیں شامل ہیں۔ ان 9 فی صد لوگوں میں 8 فی صد سلفی اور ایک فی اخوان شامل ہیں۔ یہ لوگ روایت پسند مسلمانوں کی اصلاح کے دعویدار ہیں اور اس سلسلے میں جارحانہ رویہ رکھتے ہیں۔

جدیدیت پسند طبقہ
(ISLAMIC MODERNISM):

اسلام میں جدیدیت پسندی کا رجحان انیسویں صدی میں ترکی اور مصر میں پیدا ہوا تھا۔ یہ لوگ مذہب کو مغربی دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ چلانا چاہتے ہیں۔

شیعہ: یہ عالمی مسلم آبادی کا 9.5% ہیں اور اس طرح اہل سنت والجماعت کے بعد مسلم امہ کا دوسرا بڑا فرقہ ہیں۔ یہ خود کو شیعان علی رضی اللہ عنہ (حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جماعت کے لوگ) کہلاتے ہیں۔ ان میں جیسا کہ پہلے ذکر آیا مزید تین گروہ میں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

اثنائے عشری: یہ اہل تشیع کے 8 فی صد ہیں اور فقہ جعفری یعنی فرقہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے پیروکار ہیں۔

زیدی: یہ حضرت زید بن علی رضی اللہ عنہ سے نسبت رکھتے ہیں اور شیعہ آبادی کا صرف ایک فی صد ہیں۔ یہ پانچ اماموں کو ماننے والے ہیں۔

اسماعیلی: یہ سات اماموں کو ماننے والے ہیں اور شیعہ عالمی آبادی کا صرف 0.5 فی صد ہیں ان کی نسبت حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے صاحبزادہ حضرت اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ سے ہے۔

اصولی: یہ اثنا عشریہ کا 99 فی صد ہیں اور اجتہاد پر یقین رکھتے ہیں اور عقلی دلائل سے معاملات کا حل نکالنے والے ہیں۔

اخباری: یہ اجتہاد اور دلائل عقلی کی نفی کرنے میں اور مجتہدین کی تقلید نہیں کرتے۔ یہ توضیحات و تاویلات کو بھی منع کرتے ہیں اور صرف قرآن وحدیث سے قوانین اخذ کرتے ہیں۔ اخباری صرف بصرہ عراق میں چھوٹی چھوٹی آبادیوں میں رہتے ہیں۔

اباضی: یہ خوارج سے تعلق رکھتے ہیں مگر آج کل جو اباضی دنیا میں موجود ہیں وہ ساتویں صدی کے خوارج سے علیحدہ نظریات کے حامل ہیں۔ ان کی اکثریت عمان میں اور مشرقی افریقہ میں رہتی ہے۔

بنیاد پرست مسلم
ISLAMIC FUNDAMENTALISM

سُنی SUNNI

اخوان المسلمون: اخوان المسلمون ایک روایتی سنی تحریک تھی، اس کا آغاز 1923ء میں اس کے بانی شیخ حسن البنا نے کیا تھا۔ 1929ء میں سے ایک باقاعدہ شکل دی گئی اس تحریک کا مقصد اسلام کے بنیادی عقائد کا احیا اور ان کا سخت ترین نفاذ تھا۔ مگر بعد ازاں یہ جماعت سیاسی شکل اختیار کر گئی۔ مصر میں یہ تحریک کافی مقبول ہوئی۔ 1954ء میں اس جماعت کے اراکین مصر کے صدر جمال عبدالناصر کو قتل کرنے کی کوشش کی جو ناکام ہوئی۔ مگر اس کے بعد اس جماعت کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا اور اس کی املاک ضبط کر لی گئیں۔ 2011ء کے انقلاب کے بعد اس جماعت کو ایک بار پھر مقبولیت حاصل ہوئی۔

وہابیت SALAFISM / WAHABISM: مسلمانوں میں وہابیت یا سلفی ازم کی بنیاد محمد بن عبدالوہاب نجدی (1703ء-1792ء) نے رکھی تھی۔ وہابیت یا وہابی نام ان کے مخالفین نے دیا تھا جو بعد ازاں بہت مقبول ہو گیا، ابن وہاب خود کو موحدین اور اپنے اس فرقے کو طریقت کہتے تھے، یہ عقائد کے لحاظ سے امام احمد بن حنبل اور ان کے شاگرد امام ابن تیمیہ کے مسلک پر ہیں۔ قرآن حدیث اور صحاح ستہ کو مانتے ہیں، لیکن بدعتوں کے سخت مخالف ہیں اور بدعات دور کرنے میں بہت سختی یا شدت پسندی سے کام لیتے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ سوائے اللہ کے کسی اور کی تعظیم شرک ہے۔ دعا میں کسی پیغمبر یا بزرگ کا واسطہ دینا شرک ہے۔ یہ قرآن میں تاویل کو گناہ سمجھتے ہیں اور نماز باجماعت کو لازمی سمجھتے ہیں اور بنیاد پرستی پر زور دیتے ہیں۔

انقلابی شیعہ ازم
REVOLUTIONARY SHIAISM

انقلابی شیعہ ازم ایک نظریہ IDIOLOGY ہے جو امام ایران کے انقلابی راہنما آیت اللہ روح اللہ خمینی کی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ اس کی جزئیات میں مارکیست کی انقلابیت کی جھلک موجود ہے۔ امام روح اللہ خمینی کو یقین تھا کہ سامراجی طاقتوں سے آزادی محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک آزاد شیعہ ریاست قائم کی جائے جو ولایت فقہ GUARDIAN SHIP OF THE JURIST کے زیر نگرانی ہو۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام سیاسیات ایک پریم

راہنما کے تابع ہوں جو انقلاب کامیابی سے جاری رکھنے کا ذمہ دار ہو۔ اس طرز پر حکومت بھی ایران میں قائم ہے۔

اسلامی جدیدیت پسندی ISLAMIC MODERNISM جدیدیت پسندی ایک اصلاحی تحریک ہے جو سیاسی فکر رکھنے والے ترکی شہریوں نے شروع کی جو روائتی اسلام کے متعلق بہت سے خدشات رکھتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے مغربی سماجی، سیاسی و سائنسی نظریات کا مطالعہ کیا تھا اور جو مغربی ٹیکنالوجی سے براہ راست متاثر ہوئے تھے۔ یہ لوگ خیال کرتے تھے کہ اسلامی دنیا ٹیکنالوجی میں مغربی دنیا سے بہت پیچھے رہ گئی ہے اور اتنی کمزور ہو چکی ہے کہ مغربی ترقی کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور اسی وجہ سے ترقی نہیں کر سکتی۔ وہ اپنی نا سمجھی کی وجہ سے اسلامی دنیا کی اس کمزوری کا ذمہ دار اسلامی روایت پسندی کو قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک ترقی پسند نہ ہونے کی وجہ سے اسلامی دنیا کے غیر ترقی یافتہ رہ جانے کا سبب ہے۔ اس وجہ سے ان کے نزدیک اسلامی اقداروں کی اصلاح ضروری تھی۔ جن میں فقہ اسلامی اور بنیادی عقائد بھی شامل تھے۔ انہیں نظریات کی بنا پر اسلامی جدیدیت پسندی کی تحریک کو روایت پسند مسلمانوں اور شدت پرستوں نے قابل اعتنا نہیں سمجھا اور اس کا مضحکہ اڑایا۔

اسلامی سلسلہ ہائے تصوف

ISLAMIC MYSTIC BROTHERHOODS

اگرچہ ان لاکھوں مسلمانوں کے متعلق صحیح اعداد و شمار نہیں ملتے جو اسلامی صوفی ازم کے پیروکار ہیں اور مختلف اسلامی صوفیانہ سلسلوں میں بیعت ہیں، تاہم مورخین نے تخمینہ لگایا ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز (1900ء) میں تقریباً 25 فی صد سنی مسلمان صوفیانہ سلسلوں سے منسلک تھے۔ اسلامی سلسلہ ہائے تصوف میں جہاں بہت سے سلسلے سنی مسلمانوں سے تعلق رکھتے ہیں وہیں کچھ شیعہ سلسلے ہائے تصوف بھی ہیں۔

سُنی سلسلہ ہائے تصوف

سلسلہ قادریہ: تصوف کا وہ عظیم تر سلسلہ جو امام الاولیا حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ سے منسوب ہے اور اُنہیں کی نسبت کی وجہ سے تمام سلسلہ ہائے تصوف میں عظیم تر ہے، حضرت محبوب سجاد رضی اللہ عنہ قطب ربانی کے بعد ان کے فرزند سیف الدین عبدالوہاب گیلانی اور سیدنا عبدالرزاق گیلانی نے اپنے والد گرامی قدر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سلسلہ قادریہ کو پورے عالم اسلام میں پھیلا دیا۔ برصغیر پاک و ہند میں اس سلسلے کے جو بزرگ کمال فضیلت کو پہنچے ان میں سید امیر گیلانی حضرت شاہ ہری لطیف قادری، حضرت شاہ کمال کیتھلی قادری، حضرت شاہ سکندر قادری کیتھلی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت نوشہ گنج بخش، حافظ جمال اللہ قادری، میاں میر حضرت پیار نوشاہی قادری، حضرت بلھے شاہ، سید وارث شاہ، پیر مانکی شریف، مولانا رضا احمد خاں بریلوی، مولانا نعیم مراد آبادی، فقیر نور محمد سروری قادری، حضرت سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ، حضرت سید عبدالعلی کیتھلی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ علی احمد کیتھلی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت میاں مقبول محی الدین گیلانی مدظلہ، مولانا عبدالحلیم صدیقی اور مولانا الیاس قادری، عبدالحامد بدایونی قابل ذکر ہیں۔

سلسلہ چشتیہ: فقر درویشوں کا یہ سلسلہ تصوف جس کے بانی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نویں پشت سے ایک بزرگ جناب ابو اسحٰق تھے۔ بعض روایات کے مطابق یہ بزرگ ایشیائے کوچک سے تشریف لائے تھے اور خراسان میں چشت نامی ایک گاؤں میں قیام پذیر ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے یہ سلسلہ چشتیہ کہلاتا ہے۔ پاکستان اور بھارت میں اس عظیم سلسلہ تصوف کی

اشاعت خواجہ خواجگان حضرت معین الدین چشتی نے کی۔ ان کے بعد اس سلسلہ کی تعلیمات کو ان کے خلیفہ اول حضرت بختیار الدین کاکی رحمۃ اللہ علیہ نے دہلی میں آگے بڑھایا۔ (وفات 633ھ - 1235ء) ان کے مرید و خلیفہ حضرت قطب کاملاں، شیخ فرید الدین گنج شکر تھے۔ (م 1268ء) ان کا مزار پاک پتن میں ہے۔ بابا فرید گنج شکر کے دو نامور مرید باوفا تھے، حضرت علی احمد صابری جن کا مزار مبارک رڑکی (انڈیا) کے قریب پیران کلیر میں ہے۔ ان کے مریدین صابری چشتی کے نام سے موسوم ہیں، ان کے دوسرے عظیم خلیفہ حضرت نظام الدین اولیاء تھے۔ (وفات 1324ء) جو دہلی میں مدفون ہیں۔

سلسلہ نقش بندیہ: صوفیوں کے اس سلسلہ تصوف کی بنیاد حضرت محمد بہاؤ الدین بخاری نقشبندی نے رکھی تھی۔ نقشبند کے معنی مصور کے ہیں چونکہ آپ نے حقیقت کی صحیح تصویر پیش کی تھی اس واسطے آپ رحمۃ اللہ علیہ کے مرید اس سلسلے کو نقشبندیہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ اصولوں کے لحاظ سے یہ سلسلہ حضرت خواجہ اویس قرنی کی طریقت سے مشابہ ہے۔ آپ کے ایک شاگرد صالح بن مبارک نے آپ کے بارے میں ایک کتاب "مقامات سیدنا شاہ نقشبند" لکھی ہے جب میں آپ رحمۃ اللہ علیہ کے حالات اور ذکر کے طریقے بیان کیے گئے ہیں۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ سے قبل محمد بابا سماسی کے ہاں با آواز بلند ذکر کیا جاتا لیکن آپ رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر خفی کو زیادہ بہتر سمجھا۔ اول اول اس سلسلے کو وسط ایشیا، ترکستان اور بخارا میں ترقی کی اس کے بعد پاک و ہند اور دوسرے ممالک میں پھیل گیا۔ پاکستان کے مختلف شہروں میں نقشبندیوں کے مراکز موجود ہیں۔

سلسلہ مولویہ: یہ ایک ترک سلسلہ تصوف ہے جس کی بنیاد مولانائے روم، حضرت جلال الدین رومی نے رکھی ہے (م 1273) اس سلسلے کا دائرہ اثر زیادہ تر ترکی میں ہے۔ رقص درویش اس سلسلہ تصوف کا امتیازی روحانی وصف ہے۔

سلسلہ رفاعیہ: اس سلسلہ تصوف کے بانی، ابوالعباس، احمد بن علی رفاعی تھے۔ یہ سلسلہ زیادہ تر جنوبی عراق اور مصر میں پھیلا۔

سلسلہ تجانیہ: مسلم صوفیائے کرام کا ایک سلسلہ جس کا سر سلسلہ ابوالعباس احمد بن محمد بن المختار بن سالم تجانی (1737ء-1815ء) تھا۔ یہ سلسلہ تصوف الجزائر سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سلسلہ ہائے تصوف کو خلوتیہ سلسلہ طریقت کی شاخ سمجھا جاتا ہے۔ اس سلسلہ تصوف کا دائرہ اثر سینی گال، نائیجریا، موریطانیہ اور صحرائی افریقہ تک پھیلا ہوا ہے۔

سلسلہ شاذلیہ: اس سلسلے کی بنیاد مراکش کے ایک درویش ابوالحسن الشاذلی (م۔1258ء) نے رکھی تھی۔ شاذلہ (تونس) نامی گاؤں اس بزرگ کا وطن مالوف تھا۔ یہیں سے شاذلی رحمۃ اللہ علیہ اور شاذلیہ کی نسبتیں پیدا ہوئیں۔ اس سلسلہ کے اثرات زیادہ تر شمالی افریقہ اور مصر پر مرتب ہوئے۔

سلسلہ کبراویہ: یہ سلسلہ آج کے ازبکستان اور کل کے خوارزم سے تعلق رکھتا تھا اس کے اثرات وسطیٰ ایشیا کے علاقے میں پھیلے۔ اس سلسلے کی بنیاد شیخ نجم الدین کبریٰ نے رکھی تھی۔

سلسلہ سہروردیہ: تصوف کا وہ سلسلہ جو شیخ شہاب الدین سہروردی سے منسوب ہے۔ شیخ شہاب الدین کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ پاک ہند میں اس سلسلے کے بڑے نمائندے حضرت بہاؤ الدین ذکریا ملتانی تھے۔

خلوتیہ: اس سلسلہ کی بنیاد ایک ایرانی صوفی الخلوتی (م 1397ء) نے رکھی تھی۔ اس سلسلے نے زیادہ تر بلقان، شام اور لبنان میں ترقی کی۔

شیعہ سلسلہ ہائے تصوف

بکتاشیہ: ترکی کا ایک سلسلہ درویشاں جس کے سرپرست حاجی بکتاش ولی تھے۔ جو بارہ اماموں کے قائل اور

اندرونی عقائد سے شیعی تھے۔ وہ خصوصیت کے ساتھ امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کا احترام کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی عبادات کا مرکز حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات تھی۔ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اللہ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ملا کر ایک طرح کی تثلیث کے قائل تھے۔ 10 محرم تک وہ ''ماتمی راتیں'' (ماتم گجلری) مناتے تھے۔

عرفان: عرفان اور معرفت کے معنی عربی زبان میں جاننے کے ہیں۔ شیعہ صوفی ازم کے لیے عرفان کی اصطلاح مستعمل ہے۔ ملا صدرالدین شیرازی (980ھ/1572ء۔1640ء) شیعہ صوفی ازم میں ایک الگ دبستان قائم کیا تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے حکمت کی ایک اساس قائم کی اور اس کے اصول عرفان، روایات اور احادیث نبوی ﷺ اور آئمہ شیعہ کے اقوال وفرمودات سے دلائل پیش کیے۔

سلسلہ نعمت اللّہی: اس شیعی سلسلہ تصوف کے بانی، امیر نورالدین نعمت اللہ ولی بن میر عبداللہ تھے۔ جو امام اہل تشیع، حضرات امام باقر رحمۃ اللہ علیہ کی الاولاد سے تعلق رکھتے تھے۔ ایران میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی اور انہیں صاحب کرامت ولی مانا جاتا تھا۔

O

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

خواجہ کائنات

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم جنہوں نے انسانیت کو فلاح کی راہ دکھائی اور دنیا سے جہالت کے اندھیروں کو دور کیا اور اسلام کے اجالوں سے چہار دانگ عالم کو منور کر دیا۔

خواجہ کائنات، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (571ء-632ء)

خواجہ کائنات، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی زبان پر آتے ہی احتراماً نگاہیں ادب سے جھک جاتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام نوع انسانی میں سب سے بلند اور اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہیں۔ اسی ادب کا تقاضہ ہے کہ فخر انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر قلم بند کرتے ہوئے نہایت حزم و احتیاط سے کام لیا جائے کہ مبادا کوئی ایسا لفظ زبان قلم پر نہ آجائے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شایان شان نہ ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کی تخلیق تمام کائنات کی تخلیق سے پہلے ہوئی جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام پیغمبران کرام علیہم السلام کے آخر میں نبوت سے سرفراز کیا گیا اور یوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مقام اول و آخر پر فائز ہیں۔

نسب اشرف: ابوالقاسم، محمد رسول اللہ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدالمناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوئی بن غالب بن فہر بن مالک بن النضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن فزار بن معد بن عدنان۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ نسب اشرف اس حد تک خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اور اس سے اوپر کی پشتوں کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے "کذب النسابون" یعنی نسب بتانے والے جھوٹے ہیں۔" (السہیلی، الروض الانف)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ نسب کی ایک ایک کڑی جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش مربوط ہے، نجابت، شرافت اور عزت و نیک نامی کا پیکر تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب اجداد اور امہات یعنی والدہ، نانیاں اور دادیاں نہایت پاک باز، نیک اور باوقار خواتین تھیں۔ خاندان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے رتبے و مقام کی وضاحت کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ "انا سید ولد آدم علیہ السلام یوم القیامۃ ولا فخر" یعنی میں روز قیامت کو تمام اولاد آدم علیہ السلام کا سردار ہوں اور اس میں فخر کی کوئی بات نہیں ہے۔" (البخاری شریف)

حضرت عبداللہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد گرامی قدر جناب عبداللہ حضرت عبدالمطلب کے صاحبزادے اور

حضرت ہاشم کے پوتے تھے۔ حضرت عبداللہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت ام حکیم البیضاء جڑواں پیدا ہوئے تھے۔ جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ اپنے والد حضرت عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے بڑے لاڈلے اور محبوب فرزند تھے اور حسن سیرت اور حسن صورت کا بڑا حسین امتزاج تھے۔ ان کے اخلاق حمیدہ اور اوصاف جلیلہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکبازی کا بڑا شہرہ تھا۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی حضرت عبدالمطلب نے ان کی شادی بنو زہرہ کی ایک نیک اور پاکباز خاتون حضرت سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا بنت وھب بن عبدالمناف سے کردی۔ بقول مورخ ابن کثیر، سیدہ آمنہ مجسم طہارت نفس، شرافت، عصمت وعفت اور پاکبازی تھیں۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ تجارت کے سلسلے میں شام گئے اور واپسی میں مدینہ منورہ (یثرب) میں کچھ روز علیل رہ کر ان کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شکم مادر میں تھے۔

پیدائش دریتیم صلی اللہ علیہ وسلم: حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا نے خاوند کے انتقال کو تقدیر الٰہی سمجھتے ہوئے انتہائی صبر ورضا اور ہمت واستقامت سے برداشت کیا۔ اس کا صلہ اللہ تعالیٰ نے انہیں رحمۃ للعالمین، ختم المرسلین جیسا فرزند عطا کر کے دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم 22 اپریل 571ء/ عام الفیل کو پیدا ہوئے۔ پیدائش کے بعد حضرت سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا کو حکم الٰہی ہوا کہ نومولود کا نام ''احمد'' رکھیں۔ جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا حضرت عبدالمطلب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' رکھا، جس کے معنی تعریف کیا گیا اور ستائش کے قابل ہیں۔

رضاعت: اشراف قریش کے رواج کے مطابق نومولود نے تین یوم تک حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا اور ابولہب کی ایک لونڈی حضرت ثوبیہ رضی اللہ عنہا کا دودھ پیا، پھر عرب کے عام رواج کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحرا کی کھلی فضا میں پرورش پانے کے لیے اور رضاعت کے لیے دایہ حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کے سپرد کر دیا گیا اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحرا میں لے گئیں جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریباً چار برس تک پرورش پائی۔ مکہ واپس آئے مگر اگلے دو سال کے بعد پھر صحرا بھیج دیئے گئے۔ یوں چھ سال کی عمر میں والدہ کی وفات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کفالت آپ کے دادا نے سنبھالی مگر دو سال بعد ہی وہ بھی داغ مفارقت دے گئے۔

اب دریتیم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا حضرت ابوطالب کی کفالت میں آگئے۔

سفر شام: 12 برس کی عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا حضرت ابوطالب کے ساتھ بصرہ وشام کا سفر کیا۔ اسی سفر کے دوران بحیرہ راہب سے ملاقات ہوئی۔ یہی سفر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک تاجر کی حیثیت سے متعارف کرا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آئندہ تجارت میں بڑی شہرت پائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجارتی شہرت سے مکہ کی ایک متمول خاتون حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا بہت متاثر ہوئیں اور ان کی درخواست پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اسباب تجارت کے ساتھ کئی مرتبہ سفر شام کیا۔

شادی: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حمیدہ سے وہ اتنی متاثر ہوئیں کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شادی کی خواہش ظاہر کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا کی اجازت سے رضامند ہوگئے اور یہ شادی ہوگئی۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر 25 سال اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی 40 سال کے لگ بھگ تھی۔

نزول وحی: جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک 40 سال ہوئی تو غار حرا میں اعتکاف کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی نازل ہوئی۔ وحی کا یہ سلسلہ اگلے 23 سال تک جاری رہا۔ قرآن مجید انہیں آسمانی ہدایات کا مجموعہ ہے۔ نزول وحی کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کا اعلان فرمایا تو سوائے چند لوگوں کے اکثریت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اعلان کی مخالفت کی جو اتنی بڑھی کہ حضرت ابوطالب کی وفات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے منصوبہ کی صورت

اختیار کر گئی جس کی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بحکم خداوندی مدینہ منورہ ہجرت کرنا پڑی۔

ہجرت عظمیٰ: اس سفر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ساتھ تھے۔ ہجرت تاریخ اسلام کا ایک اہم موڑ ہے۔ ہجرت کے بعد 13 سال کی تاریخ اہم واقعات سے لبریز ہے۔ مدینہ میں تشریف لانے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باقاعدہ طور پر ایک اسلامی ریاست قائم کی اور ایک منظم حکومت کی بنیاد رکھی۔ اور صرف آٹھ سال کے بعد انتہائی کامیابی سے نہ صرف مکہ فتح کر کے قریش کی مخالفت پر قابو پالیا بلکہ پورا جزیرہ عرب جلد ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطیع اور فرمانبردار ہو گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کو ایک مضبوط عسکری طاقت میں بدل کر رکھ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت تک جزیرہ نما عرب کے تمام عربی زبان بولنے والے قبائل ایک مذہب اور ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہو چکے تھے۔ انہیں لوگوں نے بہت جلد روم اور ایران کی مستحکم ترین طاقتوں کے پرخچے اڑا کر رکھ دیئے اور اسلام نے جزیرہ نما عرب سے باہر کی راہ پائی۔

وصال: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال مبارک 8 جون 632ء بمطابق 12 ربیع الاول 11ھ بروز پیر مدینہ منورہ میں ہوا۔ روضہ اطہر اس شہر میں موجود ہے اور مرجع خلائق ہے۔

اہل بیت: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے وصال کے بعد حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت زینب رضی اللہ عنہا ام مساکین، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا، حضرت زینب بنت جحش، حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا، حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ماریہ قبطیہ سے شادی کی۔

اولاد: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد مطہرہ کی متفق علیہ تعداد سیرت نگاروں نے 6 بتائی ہے۔ ان کے نام یہ ہیں: حضرت قاسم رضی اللہ عنہ، حضرت زینب، حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا، حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا، حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اور حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ۔ آخری فرزند حضرت ماریہ قبطیہ کے بطن سے ہیں باقی تمام اولاد سیدہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے ہے۔ آپ کی اولاد میں سے حضرت فاطمہ الزہرا کا سلسلہ نسب آگے بڑھا۔

سیرت: آپ صلی اللہ علیہ وسلم بے حد شفیق اور مجسم رحم و عفو تھے۔ بڑے بڑے دشمن کو بھی معاف فرمایا کرتے تھے۔ بیکسوں، مسکینوں، یتیموں اور بیواؤں کے دستگیر تھے۔ بچوں پر شفقت فرماتے اور غریبوں کے ملجا اور دکھیاروں کے ہمدرد تھے، آپ ﷺ نے اپنی 63 سالہ حیات میں کسی سے بدلہ نہیں لیا۔ لایمکن الثنا کما کان حقہ، بعداز خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عسکری قابلیت کی انتہا یہ ہے کہ ہجرت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم۔ نے کل 27 غزوات میں حصہ لیا اور صرف ایک عشرے کے اندر سرزمین عرب کا بارہ لاکھ مربع میل کا علاقہ فتح کر لیا۔ اپنی عسکری زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوٹے بڑے کل 38 لشکر مختلف اطراف میں روانہ کیے۔ روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کل پندرہ نکاح کیے۔ ایک وقت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں گیارہ ازواج مطہرات موجود رہیں اور نو کو صدمہ مفارقت دے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی جائیداد میں نخلستان فدک شامل تھا۔ جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پالتو جانوروں میں تین گھوڑے، ایک خچر 20 دودھ دینے والی اونٹنیاں، سات بکریاں، تین تلواریں، تین کمانیں اور دو زرہیں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسلحہ جات میں شامل تھیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے متعلق محققین نے لکھا ہے کہ حیرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ صلی علیہ وسلم نے عمر بھر نہ لکھا سیکھا اور نہ پڑھا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب اُمی بھی ہے، لیکن اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

قرآن حکیم ایسی عظیم و بے مثال کتاب، جو علم و حکمت کا سر چشمہ ہے لوگوں کو سکھائی اور اس کے علوم و معارف اور مطالب و معانی سے انہیں آگاہ کیا اور اس کی تفسیر میں علم و حکمت کے وہ گراں بہا ملفوظات چھوڑے جنہیں ''احادیث'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے متعلق یہ بات بھی اہم ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں وہ اوصاف حمیدہ اور کمالات حسنہ کیسے مجتمع ہو گئے جو کسی انسان میں آج تک جمع نہ ہوئے اور جن کی بدولت آپ صلی اللہ علیہ وسلم عظیم و بے نظیر مفکر و حکیم، ہادی و راہنما، مصلح و معلم انسانیت، مدبر و سیاست دان، عظیم ماہر حربیات، فقید المثال عسکری قائد، فاتح و حکمران، منتظم و قاضی اور ماہر معاشیات و اخلاقیات بن گئے۔ اور تاریخ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عظیم و عہد آفرین شخصیت، رب العالمین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃ للعالمین کے صفاتی لقب سے یاد کیا بلکہ الرؤف و رحیم جیسی ربانی صفات سے بھی متصف فرمایا۔

صلی اللہ علیہ وسلم

O

خلفائے راشدین

مسلم اُمہ کے افق کے وہ روشن ستارے جن کا ہر حکم ایک رشد و ہدایت ہے

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (573ء-634ء)
حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (586ء-644ء)
حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ (579ء-656ء)
حضرت علی کرم اللہ وجہہ (599ء-661ء)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (573ء-634ء)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سابق بالتصدیق ملقب بالعتیق اور من جانب اللہ مؤید بالتوفیق ہیں۔ سفر و حضر میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق خاص، زندگی کے ہر موڑ پر مہربان دوست، بلکہ بعد از موت بھی روضہ اطہر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انیس ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں آپ رضی اللہ عنہ کو ثانی اثنین اذھما فی الغار (توبہ 40) کے لقب سے یاد فرمایا جس کی وجہ سے آپ رضی اللہ عنہ شرف و بزرگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عالم اسلام کی دوسری بڑی شخصیت اور خلیفہ بلا فصل ہیں۔

نصب اشرف:

حضرت عبداللہ بن ابی قحافہ، عثمان بن عامر بن عمرو بن کعب بن سعد بن تیم بن مرہ۔ آپ رضی اللہ عنہ کی والدہ ماجدہ حضرت ام الخیر سلمیٰ بنت صخر بن عامر بن کعب تھیں۔ آپ رضی اللہ عنہ کے والد کی چچا زاد بہن تھیں۔ آپ رضی اللہ عنہا کا خاندان تیم بن مرہ قریش کے دس معزز خاندانوں میں سے ایک تھا۔ ''اشناق'' کا منصب اس خاندان کے سپرد تھا، یعنی یہ لوگ خون بہا اور تاوان کی رقم معین کرتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کا سلسلہ نسب چھٹی پشت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ نسب سے مل جاتا ہے۔

لقب:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا لقب صدیق ہے۔ نبی اور صدیق کے مدارج ایسے ملے جلے ہیں کہ بعض انبیا علیہم السلام کو بھی صدیق کا رتبہ عطا کیا گیا۔ مثلاً حضرت ابراہیم (سورۃ مریم: 42) حضرت ادریس علیہ السلام اور حضرت یوسف

علیہ السلام (سورہ یوسف:42)
حدیث شریف کے مطابق اس لقب کی وجہ تسمیہ شاید یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ تعالی نے مجھے تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا، لیکن تم نے جھٹلا دیا، البتہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے میری تصدیق کی اور پھر اپنے مال و جان سے غم خواری کی (البخاری، مناقب)

ولادت:

آپ رضی اللہ عنہ کی سنہ 3 عام الفیل میں 573ء میں ہوئی۔ آپ رضی اللہ عنہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تقریباً ڈھائی برس چھوٹے تھے۔

دوستی:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دوستی زمانہ جاہلیت سے تھی۔ زمانہ جاہلیت میں بھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اخلاق حسنہ کا سرچشمہ تھے اور اس سلسلے میں اتفاق یہ ہے کہ ان کے اخلاق میں اخلاق نبوی ﷺ کا پرتو نظر آتا تھا۔ حافظ ابن عبدالبر (الاستیعاب) نے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جاہلیت ہی سے شراب اپنے اوپر حرام کر رکھی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دوستانہ تعلقات اتنے تھے کہ صبح و شام دونوں وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مکان پر ضرور تشریف لے جاتے تھے۔

قبول اسلام اور شرف صحابیت:

اس بات پر تمام سیرت نگاروں کا اتفاق ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اعلان نبوت کے فوری بعد ابتدائی اوقات میں اسلام قبول کیا تاہم روایات مختلف ہیں۔ تاہم علما سیر نے لکھا ہے کہ بالغ لوگوں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اور خواتین میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اور بچوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اسلام قبول کیا تھا۔ اور یوں شرف صحابیت حاصل کرنے میں بھی آپ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مکہ کے ممتاز اور ذی اثر لوگوں میں سے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کی سعی جمیلہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، سعد بن ابی وقاص، ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بن الجراح، عثمان بن عفان ابوسلمہ ابن عبدالسد اور خالد بن سعید رضی اللہ عنہ بن العاص نے اسلام قبول کیا تھا۔ غلاموں میں آپ رضی اللہ عنہ کا غلام حضرت عامر بن فہیرہ تھا جس نے اسلام قبول کیا۔ اخلاقی امداد کے سلسلے میں ان کا ایک قابل ستائش کارنامہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت ہے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حطیم کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ عقبہ بن معیط نے ایک کپڑا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن مبارک میں ڈال کر زور سے گلا گھونٹا۔ عین اسی وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وہاں پہنچ گئے اور عقبہ کو کندھے سے پکڑ کر دھکا دیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ہٹا دیا اور فرمایا کہ تم اس شخص کو قتل کرتے ہو جو یہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے۔ (البخاری، مناقب الانصار) ایسی حقیقی اخلاقی اور مالی امدادوں کا اعتراف خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری خطبے میں اس طرح فرمایا ہے۔ "رفاقت اور مال میں مجھ پر سب سے بڑا احسان ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہے۔" (البخاری: مناقب الانصار) (دائرۃ المعارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی)

ہجرت عظمیٰ:

جب مشرکین مکہ کے مظالم حد سے بڑھ گئے تو مسلمانوں کو ہجرت حبشہ کی اجازت ملی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی حبشہ کی طرف ہجرت کا ارادہ فرمایا تھا مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ابن الدغنہ کے اصرار پر واپس مکہ آگئے بلکہ آپ رضی اللہ عنہ نے ابن الدغنہ کی امان بھی اسے واپس کر دی اور فرمایا کہ میں خدا کی پناہ میں آتا ہوں۔

پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نہ صرف رفیق ہجرت بلکہ رفیق غار ثور بھی بنے۔ سفر ہجرت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رفیق سفر ہونے کا حق ادا کر دیا اور ہر طرح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال رکھا، پھر جب مدینہ منورہ میں قبا کے مقام پر پہنچے تو چونکہ اکثر انصار نے جمال نبوی ﷺ کی زیارت نہیں کی تھی اس لیے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دھوکے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ سمجھے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر دھوپ پڑی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی چادر تان کر کھڑے ہو گئے، اس وقت لوگوں کو چادر کے سائے میں آفتاب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم نظر آیا۔ مدینہ کی آب و ہوا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو موافق نہیں آئی اس لیے بخار آنے لگا۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خرابی صحت کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور بخار کی بیماری مدینہ منورہ سے منتقل ہو گئی۔ مدینہ میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مواخات قائم کی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اسلامی بھائی خود حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ ایک دوسری روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سلسلہ مواخات قائم فرمایا تھا۔

تعمیر مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جو جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمائی اس کی قیمت بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ادا فرمائی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مدنی زندگی میں عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام غزوات اور مشاہد میں شریک رہے اور ریاستی امور میں سے بھی چند کی امارت آپ رضی اللہ عنہ نے سرانجام دی۔ غزوہ بدر میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے زیادہ کوئی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب نہ تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس غزوہ میں یہ شرف بھی حاصل تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قبے میں موجود تھے۔ غزوہ احد میں مسلمانوں کے قدم اتفاقی طور پر اکھڑ جانے کے بعد جو بارہ اصحاب رضی اللہ عنہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد پہاڑ پر موجود تھے ان میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ غزوہ میں ایسے واقعات پیش آئے جن سے خاندان صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلتیں اور بڑھ گئیں اور قرآن کریم کی دس آیات آپ رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی کی برأت میں نازل ہوئیں۔ فتح مکہ کے موقع پر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے تو دائیں طرف حضرت ابوبکر صدیق تھے اور بائیں طرف حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے والد گرامی قدر نے اس موقع پر ہی اسلام قبول کیا تھا۔ غزوہ حنین میں جب ہوازن کی سخت تیر اندازی کی بدولت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب صرف چند جانباز رہ گئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی ان میں شامل تھے۔ رجب 9ھ میں غزوہ تبوک پیش آیا چونکہ یہ زمانہ عسرت اور تنگ حالی کا تھا۔ اس موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے آگے بڑھ گئے اور اپنے گھر کا تمام اثاثہ آپ رضی اللہ عنہ نے خدمت نبوی میں پیش کر دیا۔ اور اپنے اہل خانہ کے لیے اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم رہنے دیا۔ ایسا ایثار بھلا تاریخ عالم میں کہیں اور کیسے مل سکتا ہے۔

علالت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے دوران حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ سترہ وقت کی نمازیں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں پڑھائیں۔

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ رضی اللہ عنہ کو امامت کرتا ہوا دیکھا اور تبسم فرمایا۔ پھر جب وصال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سقیفہ بنو ساعدہ میں انصار سے خطاب کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ یا حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر چاہا کہ انھیں میں سے کسی کو خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بنا دیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ بلکہ ہم آپ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کریں گے۔ آپ رضی اللہ عنہ ہمارے سردار اور ہم سے افضل ہیں اور آپ رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی گئی جو "بیعت سقیفہ" کہلاتی ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسی دن سر منبر فرمایا کہ میں آپ لوگوں پر حاکم مقرر کیا گیا ہوں، حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں اگر اچھا کام کروں تو میری مدد کیجئے اور برائی کروں تو مجھے ٹھیک کر دیجئے۔

زمانہ خلافت: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا زمانہ خلافت 2 سال 3 ماہ اور گیارہ روز ہے۔ اس مختصر مدت میں جو چشم زدن میں گذر گئی آپ رضی اللہ عنہ نے ایسے عظیم الشان کارنامے انجام دیئے کہ جن پر تاریخ اسلام ہمیشہ ناز کرے گی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے قرآن کو جمع کرا کے ایک کتاب کی صورت دی اور اسے عہد نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کے مسودات کے مطابق ترتیب دیا اور اس کام کے لیے صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایک بورڈ مقرر فرمایا۔

مرتدین و منکرین زکوٰۃ سے جنگ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد فتنہ ارتداد نے سر اٹھایا اور بہت سے مرتد اور قبائل زکوٰۃ کی ادائیگی سے منکر ہو گئے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے مرتد قبائل اور منکران زکوٰۃ اور جھوٹے مدعیان نبوت مثلاً مسیلمہ کذاب اور سجاح کی سرکوبی کے لیے صحابہ کرام کو روانہ فرمایا اور کامیابی حاصل کی۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات کے آخری دنوں میں ایک سریہ کے لیے روانہ ہونے کا حکم دیا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے لشکر کو روانہ فرمایا۔ ان فتنوں سے نمٹنے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے شام و عراق کی فتوحات کے لیے لشکروں کو روانہ فرمایا اور اس طرح مسلمانوں پر بیرونی دنیا کے راستے کھول دیئے۔ یمامہ، بصریٰ، اجنادین اور مرج الصفر کی جنگیں آپ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں لڑی گئیں۔ سوا دو برس خلیفہ رہنے کے بعد آپ رضی اللہ عنہ علیل ہو گئے اور 15 دن کی علالت کے بعد بعمر 63 سال انتقال فرمایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک میں دفن ہوئے۔ غار میں بھی رفیق تھے اور اب مزار میں بھی رفیق ہیں۔

اپنی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے اپنی تین تمناؤں کا اظہار فرمایا تھا۔ جن میں سے ایک یہ تھی کہ "کاش میں اشعث کی مار دیتا! دوسری یہ کہ کاش میں خالد رضی اللہ عنہ بن خطاب کو عراق کی طرف بھیج دیتا۔ اسی طرح آپ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین باتیں دریافت کرنے کی تمنا کا بھی اظہار کیا تھا۔ ایک یہ کہ کاش میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر لیتا امارت (خلافت) کس کو ملنا چاہیے؟ تاکہ پھر کسی کو نزاع کا موقع نہ ملتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرنے والی دوسری بات یہ تھی کہ کاش میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ معلوم کر لیتا کہ حکومت میں انصار کے لیے کیا حصہ ہے؟ تیسری بات یہ تھی کہ کاش میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی میراث کے متعلق دریافت کر لیتا کہ اس بارے میں آج بھی میرے دل میں کچھ بے اطمینانی سی ہے۔

بستر مرگ پر دراز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی صاحبزادی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنے کپڑوں میں کفنایا گیا تھا؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ تین کپڑوں میں۔ اس پر آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی صاحبزادی کو وصیت فرمائی کہ میرے یہ دونوں کپڑے دھو لو جبکہ ایک تیسرا میرے کفن کے لیے بازار سے خرید لینا۔ پھر جب جناب سیدہ رضی اللہ عنہا نے اپنے والد کو یاد دلایا کہ ابا جان! ہم تو آسودہ حال ہیں تو آپ رضی

اللہ عنہ نے اپنی وصیت بدلتے ہوئے فرمایا کہ مردہ کی نسبت زندہ لوگوں کو کپڑوں کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ میرے یہ کپڑے پرانے اور بوسیدہ ہونے والوں کے لیے مناسب ہیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وصیتوں میں سے ایک وصیت یہ تھی کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن کرنا، چنانچہ آپ کی وصیت کے مطابق آپ رضی اللہ عنہ کا سر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شانہ مبارک کے قریب یا سینہ مبارک کے برابر رکھا گیا اور آپ رضی اللہ عنہ کی لحد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لحد سے ملحق رکھا گیا۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنے محبوب آقا حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے ہوئے خدمت خلق کے لیے ہمہ وقت تیار اور فکر مند رہتے تھے۔ وہ محلّہ والوں کے کام کاج کے لیے اور ان کا سودا سلف خریدنے کے لیے بازار چلے جاتے تھے۔ بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی خبر گیری فرماتے اور ان کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔ بیماروں کی تیمارداری کے لیے تشریف لے جاتے۔ بوڑھے آدمیوں اور کمزوروں کے کام خود اپنے ہاتھ سے انجام دیتے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان سب کاموں میں رازداری سے کام لیتے تھے۔ روایت ہے کہ مدینہ منورہ کے مضافات میں ایک نابینا بڑھیا رہتی تھی۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس بڑھیا کے متعلق معلوم ہوا تو آپ رضی اللہ عنہ روزانہ اس کی خدمت کے لیے اس کے خیمہ میں جانے لگے، مگر چند ہی دنوں میں معلوم ہوا کہ کوئی دوسرا شخص صبح سویرے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آمد سے پہلے ہی اس بڑھیا کی جھونپڑی میں آ کر اس کے کام انجام دے جاتا ہے۔ یہ جاننے کے لیے کہ وہ شخص کون ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک رات پچھلے پہر اٹھ کر اس بڑھیا کی جھونپڑی کے قریب پہنچے اور ایک جھاڑی کی اوٹ میں چھپ گئے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے دیکھا کہ کوئی اور نہیں بلکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس بڑھیا کی خدمت کے کام سرانجام دے کر اس کی جھونپڑی سے نکل رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گئے اور بولے "خدا کی قسم! اے خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ آپ رضی اللہ عنہ ہی ہیں جو روزانہ اس کام میں مجھ سے پہل کر جاتے ہیں۔ سیدنا ابوبکر صدیق کی زندگی کا بیشتر حصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں بسر ہوا۔ اس لیے صحبت پاک کے فیض سے آپ رضی اللہ عنہ کو عبادات کا بھی بے پناہ شوق تھا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (586ء-644ء)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مسلم دنیا کی ان عظیم شخصیات میں ہیں جن پر بنی نوع انسان جتنا فخر کرے کم ہے، اللہ نے آپ رضی اللہ عنہ کے ذریعے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت حقہ کو غلبہ عطا کیا اور آپ رضی اللہ عنہ کے ذریعہ حق و باطل میں فرق کیا۔

نسب اشرف: حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن الخطاب بن نفیل بن عبدالعزیٰ بن رباح بن عبداللہ بن قرط بن بن رزاح بن عدی بن کعب۔ خلیفہ ثانی قبیلہ قریش کی شاخ بنوعدی سے نسبت رکھتے تھے۔ ان کی والدہ ماجدہ حضرت حنتمہ بنت ہاشم بن المغیرہ بن عبداللہ بن عمر مخزومی تھیں۔ آپ رضی اللہ عنہ کی ولادت حرب فجار سے چار سال پہلے ہوئی اور ذوالحجہ سنہ 6 نبوی میں بعمر چھبیس یا ستائیس سال میں اسلام قبول فرمایا۔ آپ رضی اللہ عنہ کی کنیت ابوحفص تھی جو انہوں نے اپنی ممتاز صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہ، ام المومنین کی نسبت سے اختیار فرمائی تھی۔ وفات یکم محرم سنہ 24ھ کو ہوئی تھی۔

حلیہ: گورے چٹے، بلند قامت اور جسیم و شحیم آدمی تھے۔ بائیں ہاتھ سے بھی دائیں ہاتھ کی طرح کام کر سکتے تھے۔ دوڑتے ہوئے گھوڑے پر اچک کر بیٹھ جاتے تھے۔ ایام جاہلیت میں آپ رضی اللہ عنہ نے عراق و شام کے سفر بہ کثرت کیے

تھے نیز وہاں کے حکمرانوں سے ملاقاتیں بھی کی تھیں۔ ان کے ہاں چھ بیویوں اور تین لونڈیوں نو لڑکے اور چار لڑکیاں پیدا ہوئیں (ابن سعد) جن میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سب سے ممتاز اور بڑے عالم وفاضل اور متقی ہوئے۔

مخالفت اسلام اور اسلام: عہد نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کے آغاز میں اسلام کے شدید مخالف تھے۔ اور اپنے قبیلے کے ان افراد کو ایذا دیتے تھے جو اسلام لے آئے تھے اسی وجہ سے ایک دن ان کے ایک رشتہ دار نے ان سے کہا تھا کہ اپنے بہنوئی اور بہن کی تو خبر لو۔ اپنی بہن کے ہاں کچھ تکرار کے بعد جب تلاوت قرآن سنی تو ایمان لے آئے۔ لوگ اس زمانے میں اپنے اسلام لانے کو چھپاتے تھے مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمان ہوتے ہی اپنے مخالفین کے مجمع میں برملا اعلان کیا اور دیر تک جم غفیر کی مار پیٹ کا تنہا مقابلہ کرتے بعد ازاں اپنے قبیلے بنو عدی کی اسلام کے خلاف مخالفت کو عملی طور پر رکوانے میں کامیاب ہوگئے یہاں تک کہ جب دارالندوہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا منصوبہ تیار کیا گیا تو اس میں بنو عدی کا کوئی فرد شریک نہیں تھا اور نہ ہی بنو عدی کے کسی فرد نے غزوہ بدر میں شرکت کی تھی۔ قبل از ہجرت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بھائی بنے اور ہجرت کے بعد کی مواخات میں عتبان بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ کے بھائی بنے (ابن حزم جوامع السیر) ہجرت کے بعد ابتدائی زمانے میں جب لوگ بڑی کثرت سے بیعت کرنے کے لیے آنے لگے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خواتین سے بیعت لینے پر مامور فرمایا تھا۔ غزوہ بدر سے لے کر غزوہ تبوک تک ہر معرکے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ رہے۔ شعبان 7ھ میں ایک عسکری مہم کی قیادت کی اور بنو عامر کے علاقے میں گئے تا کہ بنو ہوازن کی بعض شاخوں کی گوشمالی کریں۔ مگر یہ خانہ بدوش لوگ اور اسلامی لشکر کی آمد پر بھاگ گئے اور لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔

علمی ذوق: صحابہ کرام رضی اللہ عنہ میں بہت کم لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا علمی ذوق رکھتے تھے۔ ایک دن انہوں نے کسی یہودی سے زبور یا تورات کی کچھ عبارتیں سنیں جو انہیں اس قدر پسند آئیں کہ نقل لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سنانے لگے کہ ''ہمارے علم میں ان کے علم کے ذریعے سے اضافہ ہو۔'' مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منع کر دیا۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ رضی اللہ عنہ کو محاصل زکوٰۃ مقرر فرمایا یہ غالباً 10 ہجری کا واقعہ ہے۔ کیونکہ لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے بھی زکوٰۃ مانگی، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اطلاع ہونے پر بتایا کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ایک سال قبل زکوٰۃ پیشگی ادا کر دی تھی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان عالیشان ہے کہ ''میرے دو آسمانی وزیر ہیں'' حضرت جبرائیل وحضرت میکائیل علیہم السلام اور دو زمینی وزیر ہیں حضرت ابوبکر وحضرت عمر رضی اللہ عنہم۔ الذھبی (تاریخ اسلام)

ایک مرتبہ کسی اہم تبلیغی مشن کی تکمیل کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسم کو کچھ اچھے لوگوں کی تلاش تھی، کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام پیش کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میں اُن سے بے نیاز کہاں ہوسکتا ہوں؟'' ''وہ تو دینی کاموں م یں میرے لیے کان اور آنکھ کی طرح ہیں؟''

خلافت صدیقی میں فتنہ ارتداد کے زمانے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے محض زکوٰۃ سے انکار کرنے والوں سے فی الوقت جنگ نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا، مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مصلحت پر اصولوں کو ترجیح دی اور فرمایا کہ قرآن کریم میں نماز اور زکوٰۃ کا باہم ذکر آتا ہے پس جو کوئی زکوٰۃ کی فرضیت کو نہیں مانتا وہ بھی مرتد ہے اور اس کے خلاف جہاد کرنا لازم ہے۔ مسیلمہ کذاب کے خلاف جنگ میں بکثرت ایسے مسلمان شہید ہوئے جن میں بہترین قاری اور حفاظ شامل تھے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کو بین الدفتین جمع کرنے کا مشورہ دیا اور آپ رضی اللہ عنہ کی مشاورت پر اسلام کا یہ بڑا کارنامہ انجام پایا۔ خلافت صدیقی میں مدینہ کے قاضی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا گیا، مگر اس عہد کے لوگوں کے اخلاق

اتنے اچھے تھے کہ مہینے گذر جاتے اور ایک مقدمہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عدالت میں پیش نہیں ہوتا تھا۔ (ابن عبدالبر: الاستیعاب، تاریخ طبری) آپ رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دست راست اور مشیر خاص بھی تھے۔ کبھی اختلاف رائے ہو جاتا تو باہم ایک دوسرے کی اتنی عزت کرتے تھے کہ اسے نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بستر مرگ پر بلا تامل آپ رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین مقرر فرمایا۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنی وصیت کا یہ جملہ لکھوایا کہ ''اگر میں وفات پا جاؤں تو میرا جانشین'' اتنا کہنے کے بعد بے ہوش ہو گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی صوابدید پر جملہ مکمل کر دیا۔ ''حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہوں گے۔'' جب کچھ دیر بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ہوش آیا تو پوچھا کیا لکھا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام بطور جانشین سنا تو بڑے خوش ہوئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تعریف فرمائی اور کہا کہ تم بڑی صلاحیتوں کے مالک ہو۔'' جب کچھ لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سخت مزاجی کی شکایت کی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بیماری کی نقاہت کے باوجود اٹھ بیٹھے اور کہا کہ میں خدا کو جواب دوں گا کہ تیری مخلوق میں سب سے بہترین کو اپنا جانشین مقرر کیا ہے۔

عہد خلافت: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تخت خلافت پر متمکن ہونے کے بعد دستوری نہج میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور حسب ضرورت عمومی مشاورت سے کام کرتے رہے۔ اندرونی خلفشار ختم ہونے کے بعد اب مسلم اُمہ کسریٰ ایران اور قیصر روم کے خلاف برسر پیکار تھی اور ابتدائی فتوحات کے بعد حوصلے بہت بلند ہو چکے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دونوں محاذوں پر سپہ سالار فوراً بدل دیے، لیکن جنگ جاری رکھنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ پھر دنیا نے ششدر ہو کر دیکھا کہ جلد ہی ایک طرف عراق، ایران، ترکستان، افغانستان اور مغربی ہندوستان اور دوسری طرف شام، اناطولیہ، آرمینیا، مصر اور لیبیا تک اسلامی مملکت سے شامل کر لیے گئے۔ شروع میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ جنگ کو طول دینے سے ہچکچاتے تھے، لیکن جب دیکھا کہ یزدگرد، شہنشاہ ایران، اسے مسلمانوں کی کمزوری پر محمول کر کے مشکلیں پیدا کر رہا ہے تو امن قائم کرنے کے لیے دفاعی نوعیت کے علاقوں کو فتح کرنے کا حکم دیا خاص کر سنہ 18 ھ میں (ابن کثیر: البدایہ)

پھر فتوحات کا دائرہ بڑھا تو مدینہ منورہ میں دولت کی ریل پیل ہو گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جگہ کوئی اور شخص حکمران ہوتا تو عرب یقیناً دولت کی وجہ سے اصول و اخلاق کھو دیتے اور دین کو بھول بیٹھتے مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہ اپنی ذات پر اسراف کرتے تھے اور نہ اس کی اجازت کسی اور کو دیتے تھے۔ عاملوں اور گورنروں پر بڑی کڑی نظر رکھتے تھے۔ تقرر کے وقت ان کی دولت معلوم کرنے اور پھر وقتاً فوقتاً ان کا محاسبہ کرتے رہتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے عہد میں جہاں عراق، شام، بیت المقدس، مصر و طرابلس اور ایران و افغانستان کے بہت سے علاقے فتح ہوئے وہیں آپ رضی اللہ عنہ کے عہد میں کوفہ، بصرہ، مسقط جیسے نئے شہر بھی تعمیر و آباد کیے گئے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد تقریباً 10 1/2 برس (644ء-624ء) تک مثالی طور پر حکومت کی۔ آپ رضی اللہ عنہ بادشاہوں کے بادشاہ تھے مگر درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ایک دن مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نماز فجر کی امامت فرما رہے تھے کہ ابولولو فیروز نامی ایک غیر مسلم مجوسی نے اچانک آپ رضی اللہ عنہ پر خنجر سے حملہ کر دیا اور پے در پے مہلک زخم لگائے جن کی تاب نہ لاتے ہوئے آپ رضی اللہ عنہ نے شہادت پائی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اجازت سے روضہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں دفن ہوئے اور آج بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں آرام فرما ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بعد از وصال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چہرہ مبارک سے کپڑا اٹھایا اور فرمایا۔ ''واللہ اس دنیا میں سوائے اس کفن پوش کے آج تک کوئی شخص میں نے نہیں دیکھا جس کے اعمال پر مجھے رشک آیا ہو۔''

وصال سے پہلے جب صاحب فراش تھے تو بیماری میں شہد کی ضرورت پیش آئی تو مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں سب مسلمانوں کو جمع کر کے درخواست کی کہ اگر آپ رضی اللہ عنہ اجازت دیں تو بیت المال سے تھوڑا سا شہد لے لوں۔ لوگوں نے منظور کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے شہد لینا پسند کیا۔

خلیفہ ثانی کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے آپ رضی اللہ عنہ کے جسم پر نرم کپڑا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کے جبے میں بارہ بارہ پیوند لگے ہوتے تھے۔ جب اسی حال میں قیصر وکسریٰ کے سفیروں سے بلا جھجک ملتے تو مسلمان شرم محسوس کرتے مگر آپ رضی اللہ عنہ اس کا کبھی اثر نہیں لیتے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے مل کر ایک دن آپ رضی اللہ عنہا کو کہا کہ امیر المومنین! خدا تعالیٰ نے آپ رضی اللہ عنہ کو مرتبہ عطا فرمایا ہے۔ قیصر وکسریٰ کے سفیر آپ سے ملنے آتے ہیں۔ اب آپ رضی اللہ عنہ کو اپنی معاشرت بدلنی چاہیے۔ فرمایا افسوس تم دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج ہو کر مجھے دنیا طلبی کی ترغیب دیتی ہو، معلوم ہوتا ہے کہ تم دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فقر و فاقہ کو فراموش کر بیٹھی ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے عہد خلافت میں عوام کی عزت نفس اور فطری آزادی کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور عوام کو کبھی دبانے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ اسی وجہ سے بارہا مجمع عام میں لوگ آپ رضی اللہ عنہ پر انتہائی بے باکانہ انداز میں نکتہ چینی کرتے جسے آج کے معیار کے لحاظ سے انہیں گستاخانہ بھی کہا جا سکتا ہے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ عوام کی اس نکتہ چینی کو نہ صرف خندہ پیشانی سے برداشت کرتے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے اور اپنے عوام کے سامنے ایک عملی مثال قائم کرتے تھے بصورت دیگر تین براعظموں پر حکومت کرنے والے خلیفہ ثانی ''اگر چاہتے تو اپنے پر تنقید کرنے والوں کو ہر ممکن طور پر خاموش بھی کرا سکتے تھے۔ مگر آپ رضی اللہ عنہ عوام کی عزت نفس کو کبھی مجروح کرنا پسند نہیں فرماتے تھے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ (579ء-656ء)

ذوالنورین، شرم وحیا کے وہ پیکر کہ جس کی آمد پر خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا لباس سنبھال کر اور سمٹ کر بیٹھتے تھے کہ ایسی شخصیت سے شرم کیوں نہ کی جائے کہ جس سے خدا کے فرشتے بھی شرم کرتے ہوں۔ نسب اشرف یہ حضرت عثمان بن عفان بن ابی العاص بن امیہ بن عبد شمس بن مناف۔ تیسرے خلیفہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قریش کی مشہور شاخ بنو امیہ میں سے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں قریش کا قومی علم ''عقاب'' زمانہ جنگ میں اسی خاندان کی تحویل میں ہوتا تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا سلسلہ نسب پانچویں پشت میں حضرت عبد مناف پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ نسب سے مل جاتا ہے۔ اُن کی والدہ اروی بنت کریز تھیں اور اُن کی نانی ام حکیم البیضاء بنت عبد المطلب، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سگی پھوپھی تھیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد گرامی قدر کی جڑواں بہن تھیں۔ (انساب اشراف)۔

حضرت عثمان کی کنیت ابو عمرو اور ابو عبداللہ تھی جبکہ لقب ذوالنورین جو انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دہرے داماد ہونے کی وجہ سے ملا تھا۔

ولادت: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ولادت عام الفیل کے چھ سال بعد 576 عیسوی میں مکہ میں ہوئی تھی۔ ان کا شمار ان معدودے چند افراد میں ہوتا تھا جنہوں نے زمانہ جاہلیت ہی میں لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ چنانچہ زمانہ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بھی کتابت وحی پر مامور فرمایا۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معتمد خاص (سیکریٹری) کے فرائض بھی ادا کرتے تھے۔ بڑے سلیم الفطرت تھے۔ دور جاہلیت میں بھی کسی برائی سے ان کا دامن آلودہ

نہیں ہوا تھا۔ شرم وحیا ان کے اخلاق عالیہ کا طرہ امتیاز تھا۔ آج بھی خطبات جمعہ میں امت مسلمہ ان کی شان میں کامل الحیاء والایمان کے الفاظ استعمال کرتی ہے۔ بلوغت کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد انہوں نے بھی دیگر معززین قریش کی طرح تجارت کو بطور پیشہ اپنایا تھا اور اپنی ایمانداری اور راست بازی کی وجہ سے تجارت میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی تھی اور ''غنی'' کے لقب سے سرفراز ہوئے تھے۔

حضرت عثمان کا شمار سابقون الاولون، عشرہ مبشرہ اور ان چھ اکابر صحابہ میں ہوتا ہے جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندگی بھر راضی وخوش رہے (الصواعق المحرقہ) (دائرۃ المعارف اردو پنجاب یونیورسٹی)

شرف دامادی رسول صلی اللہ علیہ وسلم: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا عقد حضرت عثمان کے ساتھ کر دیا۔ یہ نکاح اتنا بابرکت تھا کہ مکہ کے لوگ عام طور پر کہا کرتے تھے۔ احسن زوج راہ السان رقیہ رضی اللہ عنہا وزوجھا عثمان رضی اللہ عنہ (البدایہ والنہایہ) یعنی بہترین جوڑا جو کسی انسان نے دیکھا، رقیہ رضی اللہ عنہا اور ان کے خاوند عثمان رضی اللہ عنہ کا ہے۔

ہجرت حبشہ: بعثت کے پانچویں سال جن صحابہ کرام نے اہل مکہ کے مظالم سے تنگ آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایما پر ملک حبشہ کی طرف ہجرت کی ان میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کی زوجہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بھی شامل تھے۔ یہ اسلام کی اولین ہجرت تھی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اول المہاجرین تھے۔ قیام حبشہ کے دوران ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے ہاں ایک صاحبزادے عبداللہ تولد ہوئے انہیں کی نسبت سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی کنیت ابو عبداللہ تھی۔

مواخات: دوسری بار اللہ کی راہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس وقت ہجرت کی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مواخات حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ الانصاری سے کرادی۔ دونوں گھرانوں میں اس موقع پر جو گہری محبت اور یگانگی پیدا ہوئی وہ ہمیشہ قائم رہی۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر ایک دردناک مرثیہ کہا تھا اور وہ باقی زندگی اس سانحہ پر مغموم رہے تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بڑے مالدار تاجر اور حد درجہ فیاض اور سخی تھے۔ ان کا مال ہمیشہ اسلامی رفاہی کاموں میں صرف ہوتا تھا، مدینہ منورہ میں مہاجرین کی آمد کے موقع پر پانی کی شدید قلت تھی، یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تھے جنہوں نے ''بئر رومہ'' ایک یہودی سے 30 ہزار درہم میں خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ہمیشہ غزوات میں مالی طور پر بھی شرکت کی تھی مگر غزوہ تبوک میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بڑھ چڑھ کر اسلامی حکومت کو مالی امداد فراہم کی تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس غزوہ میں سامان رسد کے لیے ایک ہزار اونٹ، ستر گھوڑے اور ایک ہزار دینار خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پیش کیے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپ رضی اللہ عنہ کی اس فیاضی سے اس درجہ خوش ہوئے کہ دیناروں کی تھیلی کو اپنے دست مبارک میں اچھالتے ہوئے فرمایا۔ ''آج کے بعد عثمان رضی اللہ عنہ کچھ بھی کریں ان کو کوئی عمل نقصان نہیں پہنچائے گا۔ (الترمذی، باب مناقب عثمان)

حضرت رقیہ کی وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دوسری صاحبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کر دیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اسی وجہ سے ''ذوالنورین'' کہلائے۔ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا نے بھی شعبان 9ھ میں وفات پائی تو اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''اگر میری کوئی اور بیٹی

بھی ہوتی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بیاہ دیتا۔" (البدایہ والنہایہ)

عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ وہ ہے جب زوہ حدیبیہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنا سفیر بنا کر مکہ بھیجا۔ اور آپ رضی اللہ عنہ کے قتل کی افواہ کے نتیجے میں "بیعت رضوان" اور صلح حدیبیہ کے واقعات ظہور پزیر ہوئے۔ بعدازاں غزوہ حنین اور فتح مکہ میں ان کی شرکت ثابت ہے۔

خلافت صدیقی وفاروقی میں: حضرت عثمان خلیفہ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان کے مشیر تھے اور افتاء کی خدمت بھی ان کے ذمے تھی۔ نیز سرکاری کاتب کی حیثیت سے بھی فرائض انجام دیتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں بھی وہ مجلس شوریٰ کے ممتاز ارکان میں شامل تھے۔ (الطبری)

عہد خلافت عثمانی: حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب ابولولوء فیروز کے قاتلانہ حملے سے شدید مجروح ہوئے اور زندگی کی امید باقی نہ رہی تو انہوں نے چھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک مجلس قائم کردی جنہوں نے چھ اشخاص کو خلافت کا حقدار ٹھہرایا جن میں سے ایک حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ تھے جنہوں نے اس کمیٹی کو کہا کہ تم اس معاملے کو صرف تین اشخاص میں محدود کردو، اس کمیٹی نے بالآخر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں فیصلہ دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت سب سے پہلے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کی اور ان کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی بیعت کی اور پھر باری باری سب نے ان کی بیعت کرلی۔ (ابن سعد)۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر کہا تھا کہ ہم نے اپنے میں سے بہترین شخص کی بیعت کی ہے۔

خلافت عثمانی بارہ سال کے عرصے پر محیط ہے۔ جن میں سے چھ سال بڑے پُرامن گذرے اور فتوحات کا سلسلہ بڑی سرعت سے بڑھا۔ اور اس مبارک عہد میں مسلمانوں نے دور دراز کے ملک ہندوستان کی طرف بھی توجہ دی اور ان کے قدم گجرات (ہند) کے ساحلی علاقوں تک پہنچے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مسجد الحرام میں توسیع کی گئی اور ایک بڑا کارنامہ عالم اسلام کو ایک مصحف اور ایک قرات قرآنی پر جمع کرنا تھا۔ یہ عہد عثمانی کا مہتم بالشان واقعہ قرار دیا جاتا ہے۔

مگر خلافت عثمانیہ کے آخری چھ سال جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر والی انگوٹھی ایک کنویں میں گرگئی، محققین کی نظر میں پُرازفتنہ ہیں۔

شہادت: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے عہد آخر میں ان کی حکومت کے خلاف جو بغاوت کی آگ بھڑکی محققین کے نزدیک اس میں ایک یہودی بظاہر مسلمان عبداللہ بن سبا کا ہاتھ تھا۔ اس نے محب اہل بیت و بنی ہاشم کے پردے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے قبیلے بنوامیہ کے خلاف منظم پروپیگنڈہ کا جال بچھادیا۔ (الطبری)۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ چونکہ مزاجاً نرم تھے۔ ان کی یہی نرمی اور نیک دلی تباہ کن فتنہ وفساد کا باعث بن گئی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ایسی چیزوں پر اظہار خفگی کیا کہ اگر یہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہوتیں تو لوگ ناراض نہ ہوتے۔ اُن کے خلاف لگائے جانے والے الزامات بے بنیاد اور مہمل ہیں۔ ان کی بنا پر کسی بغاوت اور انقلاب کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔ ان کی اپنے عزیزوں کے لیے صلہ رحمی کو مخالفوں نے کنبہ پروری کا رنگ دیا گیا۔

35ھ کے آخر میں شرپسندوں نے مدینہ کا رخ کیا۔ اس زمانے میں مدینہ بسبب حج اور لشکر کشی تقریباً خالی تھا۔ ان باغیوں نے پہلے تو امیر المومنین کا مسجد میں آنا دشوار کردیا اور پھر آپ رضی اللہ عنہ کے دولت کدے کا محاصرہ کرلیا۔ اس محاصرے کے دوران اپنے مکان کی چھت سے آپ رضی اللہ عنہ نے باغیوں سے خطاب بھی کیا مگر باغی حد سے بڑھ گئے اور انہوں نے امیر المومنین کا نہ صرف پانی بند کردیا بلکہ پتھر بھی مارے اور گھر کو آگ بھی لگادی۔ پھر ان باغیوں نے گھر میں داخل ہوکر آپ

رضی اللہ عنہ کو اس وقت شہید کردیا جب آپ رضی اللہ عنہ تلاوت فرمارہے تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کے اسباب: خوارج کا وجود اگرچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد خلافت میں واقعہ تحکیم کے بعد سامنے آیا مگر حقیقت یہ ہے کہ شیعیت کی طرح خارجیت کا عنصر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ہی سے مسلمانوں کی صفوں میں پیدا ہو چکا تھا۔ مثلاً صحیح بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق تین سوال کیے۔(1) کیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ غزوہ بدر میں شریک تھے؟(2) کیا انہوں نے غزوہ احد میں فرار اختیار نہیں کیا تھا؟(3) کیا انہوں نے صلح حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں پر بیعت نہ کی تھی؟ حضرت عبداللہ بن عمر اس شخص کے تمام سوال پر ہاں ہاں کرتے رہے۔ اور پھر ہر ایک کی علیحدہ وجہ بیان فرمائی۔ محدثین لکھتے ہیں کہ سوال کرنے والا یہ شخص خارجی خیالات کا حامل ایک فرد تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت مذکورہ بالا اسباب کے علاوہ بعض لوگوں کی ذاتی رنجشوں اور شکایت کی وجہ سے بھی ہوئی تھی۔ ان شکایت کنندگان میں سے بعض نے آپ رضی اللہ عنہ کی مخالفت میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا، بعض اگرچہ خاموش رہے لیکن مخالفین نے ان کی خاموشی سے فائدہ اٹھایا۔ پہلی قسم کے لوگوں میں یہ افراد شامل تھے۔

(1) حضرت محمد بن ابی بکر پر ایک معاملہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سخت گرفت کی تھی، اسی بنا پر وہ خلیفہ سوئم سے شدید ناراض تھے اور ان کی باغیانہ حرکتوں کا یہی سبب تھا۔

(2) کعب بن ذی الحبکہ یہ باغیوں کا سرغنہ تھا اور اسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کسی ارتکاب جرم پر سزا دی تھی اسی وجہ سے وہ باغی ہو گیا تھا۔

(3) ابوفردہ کا ایک شخص جو ایک گورکن اور حضرت عثمان کا آزاد کردہ غلام تھا کسی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ناراض ہو کر باغیوں میں شامل ہو گیا۔

اسی طرح دوسرے باغی بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ذاتی رنجش رکھتے تھے۔ ان لوگوں سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہمیشہ نرمی سے پیش آئے مگر باغیوں نے ان سے بدلہ لینے کی ٹھان رکھی تھی اور یوں وہ قصر خلافت پر حملے کے مرتکب ہوئے۔

حضرت حضرت علی کرم اللہ وجہہ (600ء-661ء)

باب مدینۃ العلم، زینت العارفین، امام العارفین، پروردہ نبوت، پیشوا المتقین، فاتح خیبر، نور مطیعین، دشمنان اسلام کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے والی عظیم مسلم شخصیت۔

نسب اشرف: حضرت علی کرم اللہ وجہہ بن ابی طالب بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن لوئی (ابن حزم: جمہرۃ انساب عرب) آپ رضی اللہ عنہ کی کنیت ابوالحسن وابوتراب اور لقب حیدر تھا۔ والدہ کا نام فاطمہ بنت اسد تھا جو حضرت ابوطالب کی بنت عم تھیں، اس لیے حضرت علی نجیب الطرفین ہاشمی تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم زاد بھائی تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ چوتھے نامور خلیفہ راشد اور چھوٹی عمر کے لوگوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے بے مثال خطیب، عظیم سپہ سالار عالم بے مثل، عدیل، صاحب فکر وبصیرت اور دوسری بے شمار فضیلتوں کے حامل تھے۔

والدین: آپ رضی اللہ عنہ کے والد گرامی قدر حضرت ابوطالب حصار نبوت صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور انہوں نے مرتے دم تک شمع نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی والدہ ماجدہ حضرت فاطمہ نے اسلام قبول کیا اور مدینے کی طرف ہجرت فرمائی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت اسد کا انتقال مدینہ منورہ میں ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم نے بطور احسان مندی انھیں اپنی قمیض پہنائی اور قبر میں بھی ان کے ساتھ لیٹے۔

ولادت: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولادت 11 قبل از نبوت یعنی 23 ق ھ 600ء میں ہوئی۔ آپ رضی اللہ عنہ کعبہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش کے وقت حضرت ابوطالب سخت معاشی مشکلات سے دوچار تھے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا کا مالی بوجھ کم کرنے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی آغوش تربیت میں لے لیا اور سفارش کر کے ان کے دوسرے بیٹے حضرت جعفر کو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی تولیت میں دے دیا۔ (تاریخ طبری)

قبول اسلام: حضرت علی رضی اللہ عنہ کا عہد طفولیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آغوش تربیت میں گذرا۔ یہ اسی ''تربیت صالح'' کا نتیجہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زمانہ جاہلیت میں بھی اپنی جبین کسی بت کے سامنے نہیں جھکائی اور دس گیارہ برس کی عمر میں اسلام قبول کر لیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ چھپ کر نماز ادا کرنے لگے۔ ایک دن حضرت ابوطالب نے انہیں ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا تو پوچھا کیا کر رہے ہو؟ پھر منع نہ فرمایا بلکہ کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اچھی بات کا ہی مشورہ دیتے ہیں، اس لیے یہ عمل جاری رکھو۔ بہرحال آپ رضی اللہ عنہ بطور بچہ سابقون الاولون میں شامل تھے۔

مکہ مکرمہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں ابتلا و آزمائش کے تیرہ کٹھن سال گزارے۔ اس دوران شعب ابی طالب میں محصوری کے تین سال خصوصی طور پر صبر آزما تھے۔ جب کٹھنائیاں بڑھیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے برادر محترم جناب جعفر رضی اللہ عنہ اپنی زوجہ، اسما بنت قیس رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہجرت کر کے حبشہ تشریف لے گئے مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کٹھن گھڑیوں میں ہمیشہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق و معاون و جانثار رہے۔ تا آنکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت مل گئی۔ ہجرت کی رات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر آرام کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی اگرچہ سخت خطرہ تھا اور حملہ آور گھر کے باہر حملے کرنے کے لیے پر تول رہے تھے مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس رات بڑی گہری اور آرام دہ نیند آئی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ آپ رضی اللہ عنہ کے کانوں میں گونج رہے تھے کل صبح تمام لوگوں کی امانتیں ان کے سپرد کر کے مدینہ کی طرف ہجرت کرنا۔ آپ رضی اللہ عنہ کو یقین تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ کے بعد بھلا دشمن ان کا بال بھی بیکا کیسے کر سکتا تھا۔

مدینہ منورہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رشتہ مواخات قائم کیا۔ ایک اور روایت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مواخات حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ نے قائم کیں تھیں۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنی دامادی کا شرف بخشا یعنی سیدۃ النسا حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا سے ان کا نکاح کر دیا۔ یہ نکاح اس سادگی سے ہوا کہ تاریخ اسلام میں مثالی ہے۔ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے بطن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کئی بچے پیدا ہوئے، جن میں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ، امام حسین رضی اللہ عنہ، حضرت زینب رضی اللہ عنہا شامل ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہ کی زندگی میں دوسری شادی نہیں کی۔ اُن کے وصال کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے متعدد نکاح کیے۔

غزوات میں شرکت: حضرت علی رضی اللہ عنہ اسلام کے بہادر اور جوانمرد ترین اشخاص میں سے ایک تھے۔ 2ھ میں جب قریش سے عسکری آویزشوں کا سلسلہ چلا تو پہلی باقاعدہ جنگ جو لڑی گئی وہ غزوہ بدر تھی۔ غزوہ بدر میں جب قریش نے اپنے مبارز (مدمقابل) طلب کیے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مقابلے پر بھیجا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے حریف کو آسانی سے قتل کر دیا اور بدر اور تمام دیگر

غزوات پر اپنی بہادری کے جوہر دکھائے۔ 7ھ میں غزوہ خیبر پیش آیا۔ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آج اس بہادر کو علم دیا جائے گا جو اس قلعہ کو فتح کرے گا۔ وہ بہادر حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے جنہوں نے خیبر کے اس مضبوط ترین قلعہ کو اپنی جوانمردی سے فتح کر دکھایا۔ غزوہ تبوک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے قائمقام کے طور پر مدینہ میں چھوڑا۔ اس پر منافقوں نے طنز کیا کہ شاید تم اچھے سپاہی نہیں ہو اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں بچوں اور عورتوں کی حفاظت کے لیے چھوڑا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گلہ کرنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تمہیں پسند نہیں کہ میرے نزدیک تمہارا وہی رتبہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نزدیک حضرت ہارون علیہ السلام کا تھا اور کوہ طور پر جاتے ہوئے انہوں نے حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی پیچھے اپنا قائم مقام بنایا تھا۔ پھر اسی طرح 9ھ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نجران کے عیسائیوں سے مباہلہ کرنے کے لیے نکلے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلو میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور سیدہ فاطمہ اپنے صاحبزادوں کے ساتھ تھے۔ ان نورانی چہروں کو دیکھ کر وہ نجرانی ڈر گئے اور مباہلہ کرنے سے باز آئے۔ رمضان 10ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یمن بھیجا۔ وہاں آپ رضی اللہ عنہ کی تبلیغ سے ایک پورا قبیلہ ایک ہی دن میں مسلمان ہو گیا اور انہوں نے زکوٰۃ ادا کر دی۔ وہاں سے فارغ ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ مکہ گئے اور حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ واپسی کے سفر میں رابغ کے قریب غدیر خم کے مقام پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پرزور خطبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صفائی م یں دیا اور فرمایا۔ ''من کنت مولاہ فعلی مولاہ۔ شیعہ م کتب فکر کے علما آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جملے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولی عہد کی دلیل لیتے ہیں، لیکن خود حضرت علی رضی اللہ عنہ اس خیال سے متفق نظر نہیں آتے۔ یہاں یہ دلیل بھی ہے کہ سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کے بعد ان سے باغ فدک کے سلسلے میں تو گفتگو فرمائی مگر آپ رضی اللہ عنہا نے یہ نہیں فرمایا کہ خلافت میرے شوہر کا حق ہے بلکہ انہوں نے اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث اور باغ فدک کا مطالبہ فرمایا جو اس بات کی عیاں دلیل ہے کہ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جائز خلیفہ سمجھتی تھیں تو انہوں نے ان سے اپنے مقدمے کے لیے رجوع کیا تھا۔ بہرحال حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ اور آپ رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ پورا تعاون کرتے تھے۔ اسی طرح خلافت فاروقی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے مشیر خاص رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کی رائے کا خصوصی احترام کرتے تھے۔

خلافت علوی: باغیوں کے ہاتھوں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم مقرر ہوئے۔ بعد ازاں انتظامی تقاضوں کے تحت آپ رضی اللہ عنہ نے مدینہ چھوڑ کر کوفہ کو دارالحکومت بنایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جنگ جمل اور جنگ صفین کے معرکے پیش آئے۔

جنگ جمل: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کے قصاص کی تحریک پہلے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے دی گئی۔ بصرہ میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ ہو گئے۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ گورنر بصرہ، عثمان بن حنیف کو شکست دے کر بصرہ پر قبضہ کر لیا اور آخر سازشی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو لڑانے میں کامیاب ہو گئے۔ جنگ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو پورے احترام کے ساتھ مدینہ منورہ روانہ کیا۔

جنگ صفین: جنگ جمل سے فارغ ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے کیونکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے انکار کر دیا تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون

آلود کپڑے اور ان کی زوجہ حضرت نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں دکھا کر انہوں نے شام کے لوگوں کو انتقام لینے کے لیے ابھارنے کی کوشش کی تھی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کے قصاص کے نام پر قاتلوں سے انتقام لینے کے بہانے ایک بڑی فوجی جمعیت بھی اکٹھی کر لی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس جب کوئی دوسرا راستہ نہ رہا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فوج کشی کے ذریعے انہیں بیعت کرنے پر مجبور کرنے کی کوشش کی۔ آپ رضی اللہ عنہ اپنا لشکر لے کر کوفے سے نکلے اور صفین کے میدان میں دریائے فرات کے کنارے خیمہ زن ہو گئے۔ شعبان 37ھ/ 657ء میں دونوں فریقین پوری قوت سے میدان میں اترے اور خونریز جنگ شروع ہو گئی جو کہ کئی مہینے جاری رہی۔ شامی مغلوب ہو رہے تھے اور عراقی غالب آ رہے تھے کہ لیلۃ الحریر کا واقعہ پیش آ گیا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جب اپنی فوجوں کی شکست کا یقین ہو گیا تو انہوں نے حضرت عمرو بن العاص کی مشاورت سے ایک عجیب چال چلی ایک صبح جب دونوں افواج آمنے سامنے آئیں اور گھمسان کا رن پڑا تو قریب تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حامی افواج میدان جنگ میں جیت جاتیں کہ شامی افواج اپنے نیزوں پر قرآن کریم کے صحیفے بلند کیے اعلان کرنے لگیں کہ تمہارے ہمارے درمیان فیصلہ کتاب اللہ کرے گی۔ اس پر عراقیوں نے ہاتھ روک لیا اور معاملہ تحکیم تک پہنچا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ثالث حضرت ابو موسیٰ اشعری نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے مشورے پر جو حضرت معاویہ کی طرف سے ثالث مقرر ہوئے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت سے دستبردار اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلافت کا حقدار قرار دے دیا۔ اسی تحکیم کے معاملے میں کچھ لوگ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حامی تھے باغی بن کر خوارج کہلائے۔ اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد میں دو خلافتیں قائم ہو گئیں۔ ایک دمشق میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی اور عراق اور نجد و حجاز میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خوارج میں سے ایک ابن ملجم نامی شخص نے کوفہ کی جامع مسجد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ حملہ کیا اور حضرت علی 4 سال 9 ماہ اور چند دن تک تخت خلافت پر متمکن رہ کر شہید ہو گئے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو تاریخ انسانیت کی بے مثال شخصیات ہیں۔

پیکران مہر ووفا

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ (573ء-663ء)
حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ بن حرب (م 653ء)
حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ (م-656ء)
حضرت بلال رضی اللہ عنہ بن رباح (م 643ء)
حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ (م-657ء)

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بن عوام (596ء تا 656ء)
حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بن عبید اللہ (592ء-656ء)
حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن مسعود (583ء-652ء)
(حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ (م-637ء)
حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ (591ء-672ء)

حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ (568ء-653ء)
حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ (م-678ء)
حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ (580ء تا 652ء)
حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ (581ء-630ء)
حضرت الارقم رضی اللہ عنہ بن ابی الارقم
رضی اللہ عنہ (594ء-673ء)
حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ (م نواح 721ء)
حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ (م-652ء)
حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ (612ء-710ء)
حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ (م۔627)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ (580ء تا 652ء)

وہ عظیم صحابی رسول جن کی اقتداء میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا فرمائی۔

نام ونسب: حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا اصل نام عمرو تھا۔ (صحیح بخاری کتاب الوکالۃ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا اسلامی نام عبدالرحمٰن رکھا (ابن سعد)۔ ان کی کنیت ابومحمد تھی۔ ان کے والد بنو زہرہ سے تھے اور ان

کی والدہ کا تعلق بھی بنوزہرہ ہی تھا۔ یہ دونوں شادی سے قبل عم زاد بہن بھائی تھے۔ سلسلہ نسب کچھ یوں ہے۔ عبدالرحمٰن بن عوف بن عبدعوف بن عبد بن الحارث بن زہرہ بن کلاب۔ والدہ کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ الشفا بنت عوف بن عبد۔ اس کے آگے وہی سلسلہ نسب ہے جو ان کے والد کا ہے۔ چھٹی پشت میں حضرت کلاب پر جا کر یہ سلسلہ نسب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ نسب سے مل جاتا ہے۔ اسی سلسلہ نسب کی وجہ سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا ایک اور رشتہ بھی تھا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم زلف تھے۔ تاہم قریش کے خاندانوں میں بنوزہرہ کثرت تعداد اور دولت وثروت کے لحاظ سے کچھ زیادہ ممتاز نہیں تھے۔ قریش ہونے کے باوجود انہیں مناصب حرم سب سے کوئی منصب نہ مل سکا تھا۔

ایک بار حضرت عبدالرحمٰن کے والد عوف تجارت کے سلسلے میں عفان (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے والد) اور فاکہ بن مغیرہ کے ہمراہ تجارتی سفر پر یمن گئے۔ راستے میں بنوجذیمہ نے عوف اور فاکہ کو قتل کر دیا۔ عفان اور حضرت عبدالرحمٰن بچ گئے۔ حضرت عبدالرحمٰن نے اپنے والد کے قاتل کو وہیں ختم کر کے قصاص لے لیا تھا۔ (سیرت ابن ہشام)

ولادت: طبقات ابن سعد میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی ولادت عام الفیل کے 10 برس بعد یعنی 580ء بتائی گئی ہے۔ اس طرح وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دس برس چھوٹے تھے۔ حافظ ابن حجر نے اپنی تصنیف ''الاصابہ'' میں ان کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہم عمر بتایا ہے۔ اور اس خیال کی تائید کی ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درحقیقت تیرہ برس چھوٹے تھے۔

قبول اسلام: بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی عمر تقریباً ستائیس یا تیئس برس تھی۔ (610ء) وہ اپنی فطری سلامت روی اور پاکیزہ نفسی کی وجہ سے ایک روایت کے مطابق زمانہ جاہلیت ہی میں شراب سے اجتناب برتتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دعوت پر انہوں نے اسلام قبول کیا۔ یہ ابتدائے اسلام کا واقعہ ہے اسلام قبول کرنے والوں میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف تیرہویں تھے۔ اس وقت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دارالارقم میں پناہ گزین نہیں ہوئے تھے اور وہاں سے دعوت کا آغاز بھی ابھی نہیں کیا تھا۔

ہجرت: حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حبشہ اور مدینہ منورہ دونوں ہجرتوں میں حصہ لیا۔ ہجرت حبشہ میں جو سنہ 5 نبوی میں ہوئی تھی حضرت عبدالرحمٰن پندرہ مہاجرین کے ساتھ روانہ ہوئے۔ اگرچہ اس وقت ان کی دو بیویاں اور بچے بھی تھے۔ تاہم انہوں نے ہجرت تنہا کی تھی اور اہل عیال اور گھر بار کو چھوڑ کر اسلام کے نام پر حبشہ چلے گئے تھے۔ حبشہ سے واپس مکہ آئے اور پھر 13 نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں دوسری بار ہجرت بطرف مدینہ کی۔ ابن اسحٰق کے مطابق وہ چند مہاجرین کے ہمراہ مدینہ میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن ربیع کے گھر اترے۔ ان کے گھر حضرت عبدالرحمٰن کا اترنا صحیح بخاری میں بھی مذکور ہے۔ صحیح بخاری کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور سعد رضی اللہ عنہ بن ربیع کے درمیان رشتہ مواخات قائم کیا تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن کے اسلامی بھائی نے اس مقصد کے لیے بے نظیر ایثار سے کام لینا چاہا مگر حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی بے نیاز اور غیور طبیعت نے شکریے کے ساتھ ان کی درخواست نامنظور کر دی۔

حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ نے یہاں تک خلوص سے کام لیا کہ اپنی دو بیویوں میں سے ایک سے دستبردار ہونے کی پیشکش کی تا کہ حضرت عبدالرحمٰن اس سے نکاح کر لیں ساتھ ہی اپنا آدھا مال بھی انہیں دینے کی پیشکش کی مگر حضرت عبدالرحمٰن نے کہا مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ خدا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مال اور اہل وعیال میں برکت دے۔ ہاں مجھے بازار کا راستہ ضرور بتا دیجئے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے انہیں بازار قینقاع کا راستہ بتا دیا۔ دوسرے دن صبح حضرت

عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بازار پہنچے اور گھر اور دیگر معاملہ سے کاروبار شروع کیا۔ (صحیح بخاری) پھر ان کا کاروبار چمک اٹھا اور خود ان کے الفاظ کہ اگر میں کوئی پتھر بھی اٹھاتا تو یہ خیال ہوتا کہ اس کے نیچے سونا یا چاندی ملے گی۔ پھر کاروبار یہاں تک بڑھا کہ ایک بار ان کے اسباب تجارت کا قافلہ مدینہ پہنچا تو شہر میں غل مچ گیا۔ اس قافلے میں خوراک سے لدے ہوئے سات سو اونٹ تھے۔ انہوں نے تجارت کو فروغ دینے کے لیے امیہ بن خلف سے ایک معاہدہ بھی کیا۔ یہ مدینہ میں آنے کے بعد لکھا گیا تھا۔ کاروبار کو فروغ دینے کے بعد انہوں نے مدینہ کی ایک انصار خاتون سے شادی کی۔ ایک روز جب خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لباس پر حجلہ عروسی کی نشانی کے طور پر زعفرانی رنگ کا دھبہ دیکھا تو پوچھا خیر ہے؟ عرض کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے ایک انصاری خاتون سے شادی کی ہے۔ ارشاد ہوا کیا مہر دیا؟ عرض کیا: کھجور کی گٹھلی کے برابر سونا فرمایا ''ولیمہ کریں'' خواہ ایک ہی بکری ہو۔''

مدنی زندگی میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے تمام غزوات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرکت کی۔ غزوہ بدر میں شرکت کا ذکر جامع صحیح بخاری میں بھی ملتا ہے۔ غزوہ احد میں جب لوگوں نے پشت پھیری تو حضرت عبدالرحمٰن ان چند صحابہ رضی اللہ عنہم میں شامل تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گرداگرد جمع تھے اور بہادری کے جوہر دکھا رہے تھے۔

شعبان 6ھ میں ایک سریہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی قیادت میں دومۃ الجندل روانہ ہوا۔ اس میں 700 مجاہدین شامل تھے۔ اس سریہ کی امارت کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک اعزاز یہ بخشا کہ ان کا عمامہ کھول کر خود اپنے دست مبارک سے ان کے سر پہ ایک سیاہ عمامہ باندھا پیچھے شملہ چھوڑا اور ہاتھ میں علم عنایت فرمایا۔ دومہ پہنچ کر عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے وہاں کے لوگوں کو تین دن تک دعوت اسلام دی۔ قبیلہ کلب کا سردار اصبغ بن عمرو جو نصرانی تھا مشرف بہ اسلام ہوا اس کے ساتھ اس کے قبیلے کے بہت سے افراد نے بھی اسلام قبول کیا۔ حسب فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبدالرحمٰن نے اصبغ کی صاحبزادی سے شادی کر کے رشتہ صہر قائم کیا۔ غزوہ تبوک وہ غزوہ ہے جس میں حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی شمولیت صحیح مسلم کی کتاب الصلوٰۃ اور الطہارت سے ثابت ہے۔ اسی غزوہ کے دوران ایک دن نماز فجر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے پڑھائی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ نماز پڑھی۔ جب انصار و مہاجرین میں خلافت کی نسبت نزاع پیدا ہوا تو بعض روایات کی رو سے اس جگہ حضرت عبدالرحمٰن عوف رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے اور کہا جاتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اولین بیعت کرنے والوں میں شامل تھے۔ جیش اسامہ رضی اللہ عنہ کو رخصت کرنے کے لیے جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پاپیادہ چل رہے تھے تو اسامہ رضی اللہ عنہ کی سواری کی مہار حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے تھامی ہوئی تھی۔

11ھ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حج پر نہ جاسکے تو انہوں نے حضرت عبدالرحمٰن کو امیر حج مقرر کر دیا۔ اسی طرح 13ھ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ حج کے لیے نہ نکل سکے تو انہوں نے بھی حضرت عبدالرحمٰن کو امیر حج بنا کر بھیجا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب مجلس شوریٰ قائم کی تو حضرت عبدالرحمٰن اس کے سرگرم رکن تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کی قائم کردہ خلافت کمیٹی نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کا نام بھی خلافت کے لیے نامزد افراد کی فہرست میں شامل کیا مگر انہوں نے اپنا نام ہٹا کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو منتخب کر دیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے 32ھ/654ء میں وفات پائی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کی نماز جنازہ ادا کی۔

پیکرِ مہر و وفا

حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ (م 639ء/643ء)

ظلم سہتے ہوئے چلچلاتی ہوئی دھوپ میں اور تپتی ہوئی صحرائی زمین پر نعرہ ''احد'' بلند کرنے والے عظیم انسان حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن کی حیثیت سے معروف و مشہور ہیں۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ حبشی نژاد تھے، مکہ مکرمہ میں قبیلہ بنوجمح کے درمیان سراۃ کے مقام پر بحیثیت غلام پیدا ہوئے۔ بعض روائتوں میں اس قبیلے کا کوئی گمنام انسان ان کا مالک بتایا گیا ہے اور بعض میں ان کا آقا امیہ بن خلف بتایا گیا ہے۔ اسلام کی تاریخ میں وہ سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں شامل ہیں۔ بعض روایات کے مطابق ابتدائے اسلام میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد یہی مسلمان ہوئے تھے اور غلاموں میں سب سے پہلے اسلام لانے والے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ غلام ہونے کی وجہ سے ان پر بہت سختیاں اور ظلم کیے گئے، خصوصاً امیہ بن خلف نے انہیں ایذائیں پہنچائیں، لیکن اس پیکرِ مہر و وفا نے یہ تمام مصائب بڑے صبر سے برداشت کیے مگر اسلام کے دامن کو نہیں چھوڑا۔ بالآخر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان مصائب غلامانہ سے ان کی نجات کا سبب بنے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے امیہ سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو خرید لیا یا اپنے تندرست و توانا غلام کے بدلے میں بدل لیا جو مسلمان نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد حضرت بلال ہمیشہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر رہے۔

بعد از ہجرت مدینہ منورہ میں حضرت بلال، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور کئی دیگر مکی مسلمان بخار میں مبتلا رہے تا آنکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے بخار مدینہ کی فضاؤں سے دور ہوگیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور ابورویحہ رضی اللہ عنہ الخثعمی کے درمیان رشتہ مواخاۃ قائم کردیا تھا۔ یاد رہے یہ وہی ابورویحہ رضی اللہ عنہ تھے جنہیں حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے شام کی مہم پر روانگی کے وقت اپنا وظیفہ لینے کا مجاز قرار دیا تھا۔ اسی رشتہ مواخاۃ کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے افریقہ کے وظیفہ لینے والوں کی فہرست قبیلہ خثعم کے ساتھ منسلک کردی تھی۔ ہجرت مدینہ کے بعد جب پہلے سال نماز سے پہلے اذان دینے کا فیصلہ کیا گیا تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ مؤذن مقرر ہوئے۔ وہ تمام غزوات میں خواجہ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ غزوہ بدر میں انہوں نے ہی امیہ بن خلف اور اس کے بیٹے کو قتل کیا تھا......

حضرت بلال رضی اللہ عنہ اگرچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عصابردار، خازن اور ذاتی خادم بھی تھے اور بعض اوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معاون و پیش کار کے فرائض بھی ادا کرتے تھے۔ مؤذن کی حیثیت سے انہیں عروج اس وقت حاصل ہوا جب مکہ مکرمہ کو مسلمانوں نے فتح کرلیا اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے پہلی مرتبہ کعبے کی چھت پر مومنوں کو نماز کی طرف بلایا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں بھی مؤذن رہنا منظور کرلیا، لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے اس منصب پر قائم رہنے کے لیے کہا تو وہ راضی نہ ہوئے اور شام کی مہم پر روانہ ہوگئے۔ پھر زندگی کا باقی حصہ انہوں نے شام میں بسر کیا۔ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ہی مؤذن کا منصب ترک کردیا تھا کیونکہ جب وہ اذان دیتے ہوئے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ پاتے تھے تو ان میں اذان دینے کا یارا نہیں رہتا تھا۔ ایک دو مواقع پر انہوں نے اذان

دینے کی کوشش بھی کی تھی۔ پہلا موقع وہ تھا جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ جابیہ تشریف لے گئے تھے اور دوسرا وہ کہ جب وہ مدینہ کے در و بام کو دیکھنے کے لیے شام سے مدینہ آئے اور امام حسن رضی اللہ عنہ اور امام حسین رضی اللہ عنہ نے ان سے اذان دینے کی فرمائش کی۔ یہ دونوں مواقع انتہائی رقت انگیز تھے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو ان کی زندگی ہی میں بڑی عزت حاصل ہوگئی تھی۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے خلاف تحقیقات کرنے کے لیے اپنا ایک نمائندہ شام بھیجا تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے خلیفہ کے نمائندے اور متاثل سالار حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے بڑا تعاون کیا اور ان کی ہر ممکن مدد کی۔

حلیہ: مورخین نے آپ رضی اللہ عنہ کا حلیہ بیان کیا ہے کہ قد لمبا اور کسی قدر خمیدہ تھا، رنگ سیاہ، چہرہ پتلا گھنے بال جن میں بہت سے سفید بال ملے ہوئے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ساٹھ سال کے قریب عمر پائی۔ مورخین نے آپ رضی اللہ عنہ کی تاریخ وفات 17ھ/639ء/18ھ 641ء یا 21ھ/693ء بیان کی ہے اور ان کا مدفن دمشق یا حلب کو بتایا ہے۔

زمانہ غلامی میں جب ابتدائے اسلام میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ ایمان لائے تو امیہ بن خلف انہیں اسلام سے متزلزل کرنے کے لیے کڑی دھوپ میں گرم تپتی ہوئی زمین پر لٹا کر کوئی بھاری پتھر ان کے سینے پر رکھ دیتا اور انہیں اسلام چھوڑ دینے کا کہتا تو ان کی زبان سے ''احد! احد!'' کے نعرے بلند ہونا شروع ہو جاتے تھے۔ ظلم کی اسی انتہا کی وجہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ان پر ترس آیا تھا اور انہوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو امیہ بن خلف سے آزاد کروا کر ظلم سے بچا لیا تھا۔ قریش نے جب دیکھا کہ بلال حبشی رضی اللہ عنہ جو کل تک غلام تھا اب ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ و عثمان رضی اللہ عنہ کے برابر بیٹھتا ہے اور اس کے ساتھ کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جاتا تو ان کو بہت طیش آیا کہ اسلام تو ان کے آبائی عقائد کے ساتھ خاندانی عظمت و وقار کو بھی خاک میں ملائے دیتا ہے اور حبش کا ایک غلام ابن سرداران قریش کے برابر جگہ پاتا ہے۔

کہ وفاشعاری جن کا صحیفہ اخلاق تھا

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ (581ء تا 630ء)

وہ عظیم ہستی جس نے اپنے سگے والد کے ساتھ غلامی رسول صلی اللہ علیہ وسلم چھوڑ کر جانے سے انکار کر دیا۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ تھے، ان کی کنیت ابواسامہ رضی اللہ عنہ تھی انہیں بچپن میں ہی بنوقین کے غارت گروں نے گھر سے اٹھا کر بازار میں بطور غلام فروخت کر دیا تھا۔ مگر ان کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ کے بھتیجے حکیم بن حزام بن خویلد نے خرید کر مکہ لا کر اپنی پھوپھی، سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔ اور اس وفا شعار بیوی (حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا) نے ان کو زمانہ بعثت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اسی دوران جب حضرت زید کے والد حارثہ انہیں تلاش کرتے ہوئے مکہ آئے تو انہیں پتا چلا کہ ان کا بیٹا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں غلام ہے۔ انہوں نے چاہا کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کو آزاد کرائیں۔ لیکن خود حضرت زید رضی اللہ عنہ نے حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت سے جدا ہونا گوارا نہ کیا۔ اور اپنے والد کو واپس بھیج دیا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف آزادی عطا کی بلکہ انہیں اپنا متبنیٰ بھی بنا لیا، یوں ان کا نام زید بن محمد صلی اللہ علیہ وسلم مشہور ہو گیا اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تجارتی کاروبار میں اکثر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر میں صرف 10 برس چھوٹے تھے، اُن کا شمار السابقون الاولون میں ہوتا ہے۔ آزاد کردہ غلاموں یعنی موالیوں میں سب سے پہلے انہوں نے ہی اسلام قبول کیا تھا۔ مکہ میں ان کا رشتہ

مواخات حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب کے ساتھ استوار کیا گیا تھا۔ ہجرت مدینہ کے بعد پہلے ہی سال مکہ گئے تاکہ ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں کو اپنے ساتھ مدینہ لائیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید رضی اللہ عنہ سے اپنے خاندان کے ایک فرد جیسا سلوک فرماتے تھے۔ اسی وجہ سے حضرت زید رضی اللہ عنہ کی شادی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحش سے کردی تھی، لیکن ناموافقت کے باعث ان دونوں میں نہ بن سکی اور نوبت طلاق تک پہنچی۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے حضرت زینب کے بعد ام کلثوم بنت عقبہ سے شادی کی، جن کے بطن سے زید اور رقیہ پیدا ہوئے اور پھر درہ بنت ابی لہب سے، لیکن ان دونوں کو بھی انہوں نے طلاق دے دی، علاوہ ازیں انہوں نے ھند بنت العوام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آزاد کردہ کنیز حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا سے بھی شادی کی تھی۔ حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہ سے ان کے ہاں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے تھے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے سوا حضرت زید رضی اللہ عنہ کی کوئی اور اولاد زندہ نہ رہی تھی اور زید اور رقیہ بچپن ہی میں فوت ہوگئے تھے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ ایک بہادر سپاہی بھی تھے اور تیر اندازی میں کمال رکھتے تھے۔ بدر سے موتہ تک کے تمام اہم غزوات میں انہوں نے بڑی بہادری اور شجاعت کے ساتھ حصہ لیا۔ غزوہ مریسیع کے دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنی جانشینی کا شرف بخشا تھا اور مدینہ منورہ کا قائم مقام حاکم بنایا تھا۔ بیشتر سرایا ان کی سپہ سالاری میں لڑے گئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جس فوج کشی کی مہم میں حضرت زید رضی اللہ عنہ شریک ہوئے اس کی مہم کی قیادت ان کے سپرد کی جاتی تھی۔ اس طرح انہوں نے نو سرایا کی قیادت فرمائی۔ 8ھ میں حضرت زید رضی اللہ عنہ نے بعمر 55 برس اس وقت شہادت پائی جب وہ سریہ موتہ میں مسلمانوں کی قیادت اور علمبرداری کر رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی شہادت کا بڑا صدمہ پہنچا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا قصاص لینے کی کوشش بھی فرمائی۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ نے صحیفہ اخلاق میں وفا شعاری کا باب سب سے نمایاں ہے۔ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا پسندی ان کا مقصد حیات تھا اور اسی بات نے ان کو اور ان کی اولاد کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ محبوب بنا دیا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اگر حضرت زید رضی اللہ عنہ زندہ رہتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اپنا جانشین بنا لیتے۔

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ

مشرکین جب حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو آگ میں جلاتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے گذرتے ہوئے فرماتے ''یا نار کونی برداً وسلاماً علیٰ عمار'' یعنی اے آگ تو عمار پر برد و سلام ہو جا جیسا کہ تو ابراہیم پر ہوگئی تھی۔

نام و نسب: حضرت عمار بن یاسر بن عامر بن مالک، ابوالیقظان، رسول اللہ کے ایک صحابی اور بعد ازاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حلیف وطرف دار۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے والد یاسر رضی اللہ عنہ جو ابو حذیفہ المخزومی کے آزاد کردہ غلام تھے، اپنے مالک کی ایک کنیز حضرت سمیہ سے شادی کرلی تھی جسے آزاد کر دیا گیا تھا۔ مگر آزاد ہو جانے کے باوجود حضرت یاسر رضی اللہ عنہ اور اس کا کنبہ ابو حذیفہ کے پاس ہی رہا۔ یہ لوگ ابتدائی زمانے میں اسلام قبول کرنے والوں میں سے تھے اور انھوں نے اسلام کی خاطر سخت ترین اذیتیں بھی اٹھائیں۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ آخرکار ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ سے مدینہ منورہ ہجرت کرنے کے بعد وہ واپس آگئے۔

ظلم و تعذیب: حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ مکہ کے ان کمزور اور زیریں طبقہ کے لوگوں میں سے تھے جن پر اس لیے ظلم کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے دین سے پھر جائیں۔

عمر بن الحکم سے مروی ہے کہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ پر اتنا عذاب کیا جاتا کہ وہ یہ بھی نہ جان سکتے کہ ظلم کرنے والے کیا کہتے ہیں۔ محمد بن کعب القرظی سے مروی ہے کہ مجھ سے ایک ایسے شخص نے بیان کیا جس نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو برہنہ تن صرف پاجامے میں دیکھا تھا۔ اس نے جب اُن کی پیٹھ دیکھی تو اس پر بہت سے نیل اور نشان دیکھے جب اس شخص نے ان نیلوں اور نشانوں کے متعلق پوچھا تو حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے کہا یہ اس کے نشان ہیں جو قریش نے مجھے دوپہر کی سخت دھوپ میں عذاب دیئے تھے۔ عمرو بن میمون سے مروی ہے کہ مشرکین مکہ جب حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو آگ میں جلاتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے گزرتے تو اپنا ہاتھ ان کے سر پر پھیرتے اور فرماتے۔ ''یا نار کونی برداً وسلاماً علیٰ عمار۔'' ''اے آگ تو عمار رضی اللہ عنہ پر برد و سلام ہو جا جیسا کہ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ہو گئی تھی۔'' پھر فرماتے اے عمار تمہیں سرکشوں کی ایک جماعت قتل کرے گی۔

ابوالزبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم آل عمار کے قریب سے گزرے تو ان پر عذاب کیا جا رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اے آل عمار! مژدہ سن لو کہ تمہارے وعدے کا مقام جنت ہے۔ (طبقات ابن سعد)

انہیں عذابوں سے نکل کر آپ رضی اللہ عنہ نے حبشہ ہجرت کی تھی۔ حبشہ سے مدینہ آمد کے بعد انہوں نے تمام ابتدائی غزوات میں شرکت کی اور بدر و احد و خندق اور بالعموم تمام غزوات رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔

جب مدینہ منورہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار میں رشتہ مواخات قائم کیا تو حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کا رفیق بنایا۔

عہد صدیقی اور عہد فاروقی میں: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جنگ یمامہ کے دوران ان کا ایک کان کٹ گیا تھا۔ 641ء میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں کوفہ کا حاکم بنایا۔ اس حیثیت میں انہوں نے خوزستان کی فتح میں حصہ لیا۔

طرف دار علی رضی اللہ عنہ: حضرت عمار رضی اللہ عنہ شروع ہی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے معتمد خاص بن گئے۔ جنگ جمل سے پہلے حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے کوفے کی آبادی کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت میں مجتمع کیا۔ وہ 37ھ/657ء میں جنگ صفین میں بھی شریک ہوئے تھے۔ اس وقت وہ ایک ضعیف العمر شخص تھے۔

شہادت: جنگ صفین سے پہلے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھی کہتے تھے کہ واللہ ہم عمار رضی اللہ عنہ کو کبھی قتل نہیں کریں گے۔ اگر ہم انہیں قتل کریں گے تو ہم ویسے ہی ہو جائیں گے جیسا کہ لوگ کہتے ہیں (یعنی باغی) جنگ صفین ہوئی تو مولائے عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب کہتے ہیں ہم مقتولین کو دیکھنے گئے تو دیکھا کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ بھی مقتولین میں شامل ہیں۔ ایک اور صحابی سے روایت ہے کہ اس کے بعد ہم حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور کہا کہ اے ابوعبداللہ! تم نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کیا سنا ہے۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ انہیں ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔ میں نے انہیں بتایا کہ وہ مقتولین میں شامل ہیں۔ پھر جب ان کو لے جا کر حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا لاشہ دکھایا تو ان کا رنگ فق ہو گیا۔ تاہم انہوں نے اپنی سیاسی طبیعت کے مطابق فوراً ایک اور پہلو اختیار کر لیا اور کہا کہ ان کو اُنہی لوگوں نے قتل کیا ہے جو انہیں ساتھ لے کر آئے تھے (یعنی ان کا ان کو میدان جنگ میں لانا ان کے قتل کا سبب بنا ہے)۔

طبقات ابن سعد میں درج ہے کہ جس شخص نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو قتل کیا وہ ابوغادیہ مزنی تھا۔ اس نے ان پر نیزہ سے وار کیا جس سے وہ گر پڑے۔ اس روز وہ تخت رواں پر بیٹھ کر جنگ کر رہے تھے۔ ان کی عمر اس وقت 94 سال کی

تھی۔ جب وہ نیزے کے زخم سے گر پڑے تو ایک اور شامی ان پر ٹوٹ پڑا اور اس ظالم نے ان کا سر کاٹ لیا۔ پھر ان دونوں قاتلوں میں جھگڑا ہو گیا۔ دونوں کہتے تھے کہ ان کو میں نے قتل کیا ہے۔ دونوں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے کہا واللہ دونوں دوزخ میں جھگڑ رہے ہیں (کہ دونوں میں سے کون دوزخی ہے) ان کی یہ بات حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے سن لی۔ انہوں نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو کہا کہ ایک قوم نے اپنی جانیں ہمارے لیے خرچ کیں اور تم انہیں سے کہتے ہو کہ تم لوگ دوزخ کے لیے جھگڑتے ہو۔ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا واللہ بات تو یہی ہے، اسے تم بھی جانتے ہو اور مجھے یہ پسند کہ میں اس قسم کے واقعات سے (کاش!) بیس سال پہلے ہی مر جاتا۔

ابن عون سے مروی ہے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ 94 یا 91 سال کی عمر میں قتل کیے گئے، ان کی ولادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر کی تھی۔ (طبقات ابن سعد) ضعیف العمری میں جنگ صفین میں شہید ہونے کے بعد کئی صدیوں تک بھی صفین کے نزدیک ان کے مقبرے کی نشاندہی کی جاتی تھی۔

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اچھے عالم شمار کیے جاتے ہیں اور اس کے علاوہ ان کی شہرت ان کے زھد اور اسلام سے وفاداری کے باعث بھی تھی، کفار مکہ کو ان پر ظلم ڈھاتے دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو صبر واستقلال اور عزیمت کی تلقین فرماتے تھے اور جیسا کہ پہلے ذکر آیا کہ جنت کی بشارت بھی دیتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو "الطیب المطیب" کا لقب مرحمت فرمایا تھا۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے مدینہ منورہ میں ایک مسجد کی بنیاد رکھی تھی اور اس کا نام قباء رکھا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث مبارکہ میں جس کا ذکر پہلے بھی آیا۔ باغیوں کے ایک گروہ (فئۃ باغیۃ) کے ہاتھوں حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے شہید ہونے کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے ایک بیٹے تھے جن کا نام محمد تھا۔ وہ بھی علم الحدیث کی بنا پر مشہور تھے۔ ان کی ایک بیٹی بھی تھی جس کا نام ام الحکم تھا۔

حضرت الارقم رضی اللہ عنہ بن ابی الارقم (594ء تا 673ء)

وہ سعادت مند ہستی جس نے اپنا آبائی مکان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شروع کے زمانے کے ایک صحابی رضی اللہ عنہ، جو عام طور پر حضرت الارقم بن ابی الارقم رضی اللہ عنہ کے نام سے معروف ہیں۔ اور جن کی کنیت ابو عبید اللہ تھی۔ ان کے والد کا نام عبد مناف تھا اور وہ مکہ کے مشہور اور با اثر قبیلہ مخزوم سے تعلق رکھتے تھے، حضرت الارقم رضی اللہ عنہ کی والدہ کے نام میں اختلاف ہے، مگر عام خیال یہ ہے کہ وہ قبیلہ بنوخزاعہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ حضرت الارقم رضی اللہ عنہ کا سال وفات 53ھ/ 673ء یا 55ھ/ 675ء بتایا جاتا ہے، اس سے اُن کی عمر کا اندازہ تقریباً اسی سال کے لگ بھگ بنتا ہے۔ ان کا سال پیدائش مورخین نے 594ء کے قریب بتایا ہے۔ یہ بھی اندازہ ہے کہ وہ بہت کم عمری میں ہی مسلمان ہوئے تھے۔ یعنی ایک روایت کے مطابق وہ ساتویں مسلمان تھے اور دوسری روایت کے مطابق وہ بارہویں مسلمان تھے۔ حضرت الارقم رضی اللہ عنہ کو تقریباً 614ء میں ان کا مکان جو کوہ صفا پر واقع تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سکونت کے لیے پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ یہ مکان ان کے نام پر ہی دار الارقم کہلاتا تھا۔ یہی مکان ابتدائی زمانہ اسلام میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب کے اسلام لانے کے وقت تک نوزائیدہ ملت اسلامیہ کے مستقر کی حیثیت رکھتا تھا۔ طبقات ابن سعد میں کئی جگہ پر کچھ لوگوں کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے اور دیگر ایسے واقعات کا ذکر کیا گیا

ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت الارقم رضی اللہ عنہ کے گھر میں تشریف لائے یا وہاں آنے سے پہلے پیش آتے تھے، لیکن ابن ہشام نے ان باتوں کا ذکر سیرت ابن ہشام میں نہیں کیا۔ حضرت الارقم رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ منورہ کو ہجرت کی اور غزوہ بدر میں شریک ہوئے اور دیگر غزوات وسرایا میں بھی شرکت کی۔ حضرت الارقم رضی اللہ عنہ کا گھر جس میں ایک مسجد بھی تھی، ان کے خاندان کے قبضہ میں رہا، تا آنکہ خلیفہ منصور عباسی نے اُسے خرید لیا پھر یہ خلیفہ ہارون الرشید کی والدہ خیزران کے قبضہ میں چلا گیا اور ''بیت الخزران'' کہلایا۔ حضرت الارقم رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت وصیت کی تھی کہ ان کی نماز جنازہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ پڑھائیں۔

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ (596ء تا 656ء)

وہ عظیم ہستی جنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ''حواری'' تسلیم کیا تھا۔

نام ونسب: حضرت زبیر بن العوام بن خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی بن کلاب،

کنیت: ابوعبداللہ اور لقب حواری تھا۔ اُن کی والدہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سگی پھوپھی تھیں جب کہ ان کے والد حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بھائی تھے۔ اس طرح وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے تھے۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ قدیم الاسلام اور سابقون الاولون میں سے تھے۔ حدیث شریف کے مطابق وہ پانچویں شخص تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ وہ عشرہ مبشرہ میں شامل تھے۔ یعنی وہ دس لوگ جنہیں ان کی زندگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنتی ہونے کی بشارت دے دی تھی۔

ان کی ازواج میں اسما بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا اپنے اس عزم وہمت کی وجہ سے مشہور ہیں جس کا اظہار انہوں نے اپنے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں کیا تھا۔ ان کے بطن سے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے دوسرے بیٹے عروہ پیدا ہوئے تھے، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے تیسرے نامور بیٹے حضرت مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ تھے جن کے بہادرانہ کارناموں سے تاریخ اسلام کے صفحات پُر ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ انتہائی مصائب اور تکالیف کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ رہے۔ انہوں نے حبشہ کی طرف جانے والی دونوں ہجرتوں میں بھی شرکت کی۔ ہجرت مدینہ کے بعد ان کا رشتہ مواخات حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور بعض روایات کے مطابق حضرت طلحہ یا ابن مالک رضی اللہ عنہ سے قائم کیا گیا تھا۔ اپنی مدنی زندگی میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام غزوات میں شریک رہے۔ جنگ بدر میں مسلمانوں کے دو شہسوار تھے ایک حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ اور دوسرے حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ میمنہ پر متعین تھے اور حضرت مقداد رضی اللہ عنہ میسرہ پر، جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو الحواری کا لقب ان خدمات کے صلے میں عطا کیا تھا جو انہوں نے بنو قریظہ سے جنگ کے دوران بطور مخبر انجام دیں تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے۔ ''ہر نبی کا ایک حواری ہوتا ہے اور میرا حواری الزبیر رضی اللہ عنہ ہے۔'' غزوہ خندق کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو بنو قریظہ کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ آپ رضی اللہ عنہ تین مرتبہ اس فرض کی ادائیگی کے لیے گئے۔ اسی جنگ کے دوران انھوں نے تیر اندازی کے بھی خوب جوہر دکھائے۔ فتح مکہ کے دن حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے

ہاتھ میں دو جھنڈے تھے۔ ان کا شمار اسلام کی انتہائی بہادر اور دلیر شخصیات میں ہوتا ہے۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی زندگی، وفات اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ادوار خلافت میں ان کے کارناموں کو بھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے جنگ جمل کے موقع پر شہادت پائی۔ اس وقت ان کی عمر 60 اور 67 کے درمیان تھی۔

احادیث مبارکہ کی روشنی میں پتہ چلتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں میں ان کی بڑی وقعت تھی۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک بار جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے گفتگو کے دوران میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے۔

''فداک ابی وامی'' (تجھ پر میرے ماں باپ قربان)۔

کہا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک ریشمی قبا عطا کی تھی جسے وہ جنگ کے وقت زیب تن کیا کرتے تھے۔ (سیر الاعلام)

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ ایک دولت مند انسان تھے اور بڑے مخیر حضرات میں سے ایک تھے۔ ان کے ایک ہزار غلام تھے جو انہیں خراج ادا کرتے تھے وہ خراج کا یہ سارا روپیہ خیرات کر دیتے تھے۔ پھر بھی ان کی وفات کے وقت وہ لاکھوں روپے کی جائیداد اور نقدی چھوڑ گئے تھے۔ ان کی وصیت طبقات ابن سعد میں درج ہے۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ

اللہ کی راہ میں ایک آنکھ جاتے رہنے کے باوجود دیگر اسلامی جنگوں میں شرکت کی۔

نام ونسب: حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بن ابی عامر بن مسعود ثقفی، کنیت ابوعبداللہ، مشہور صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور عرب کے نامور قائدین اور مفکرین میں سے ایک۔ انہیں مغیرہ الرائی بھی کہا جاتا ہے۔

زمانہ جاہلیت میں وہ ایک وفد کے ساتھ مقوقس، شاہ مصر کے دربار میں گئے۔ 5ھ میں اسلام قبول کیا، صلح حدیبیہ، یمامہ اور فتوح شام میں لشکر اسلام میں شامل رہے۔ جنگ یرموک میں ان کی ایک آنکھ جاتی رہی۔ بعد ازاں جنگ قادسیہ اور ہمدان وغیرہ میں بھی شرکت کی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے انہیں بصرہ کا والی بنا دیا تھا۔ اس زمانے میں بھی انہوں نے متعدد علاقے فتح کیے۔ حضرت عثمان کے عہد حکومت میں بھی وہ کوفہ کے والی کے منصب پر بحال رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ کے اختلافات کے زمانے میں گوشہ نشین ہو گئے مگر بعد ازاں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل گئے۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں ایک بار پھر کوفہ کا والی مقرر کر دیا۔ اس منصب پر وہ اپنی وفات تک متمکن رہے۔

ان کے قبیلے بنو معتب کے لوگ طائف کے مشہور بت خانے کے محافظ تھے۔ مغیرہ رضی اللہ عنہ مشہور صحابی اور شہید اسلام حضرت عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بھتیجے تھے۔ ان کا شمار کاتبین نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہوتا ہے۔ حضرت [illegible] رضی اللہ عنہ نے بحیثیت سپہ سالار لشکر اسلام ان کو ایرانی سپہ سالار رستم کے پاس بطور ایلچی بھیجا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حکم پر اہل بخیر کی طرف بھی گئے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ سے 136 احادیث مروی ہیں۔

ایسے عاقل تھے کہ جب دو باتیں ان کے دل میں کھٹکتی تھیں تو ضرور کسی ایک میں راہ پا لیتے تھے۔

جب وہ اسلام قبول کرنے کی غرض سے مدینہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اصحاب کے ساتھ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تشریف فرما پایا۔ حضرت مغیرہ سفری لباس

میں تھے انہوں نے اسلامی آداب کے مطابق سلام کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھا کہ وہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کو جانتے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ میرے بھائی عروہ کے بیٹے ہو؟ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا جی ہاں، میں آیا ہوں کہ شہادت دوں کہ "لا الٰہ الا اللہ وان محمد رسول اللہ۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا مصر سے آئے ہو؟ تمہارے ساتھ جو مالکی گئے تھے ان کا کیا ہوا؟ اس پر حضرت مغیرہ نے اعتراف کیا کہ بعض امور میرے ان کے درمیان طے ہوئے تھے جو زمانہ جاہلیت کے مطابق تھے میں نے انہیں قتل کر دیا اور ان کا مال میرے ساتھ ہے میں اس میں سے خمس اپنے ساتھ لایا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا کہ تمہارا اسلام تو قبول کر لیا مگر نہ اس مال میں سے کچھ لیں گے اور نہ ہی اس کا خمس وصول کریں گے کیونکہ یہ بدعہدی ہے اور بدعہدی میں کوئی خیر نہیں۔ اس پر حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ! میں نے انہیں بحالت کفر قتل کیا ہے اور اب آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لے آیا ہوں، اسلام اپنے ماقبل کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ (طبقات ابن سعد)

یہ واقعہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے شاہ مصر مقوقس کے دربار میں حاضر ہونے کے بعد پیش آیا تھا۔ شاہ مصر مقوقس طائف کے اس وفد سے دریائے نیل میں ایک مایہ دار مجلس میں ملا تھا۔ مقوقس اس وفد کے دیگر اراکین کے ساتھ اچھی طرح پیش آیا مگر اس کے ساتھیوں نے اُس کا تعارف اچھی طرح نہ کرایا جس کی وجہ سے مقوقس نے اُن سے اچھا سلوک نہ کیا۔ واپسی کے سفر میں حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے عزم کیا وہ اپنی اس توہین کا بدلہ اپنے ساتھیوں کو قتل کر کے لیں گے اور پھر موقع پاتے ہی ان کو قتل کر دیا اس کے بعد وہاں سے سیدھے مدینہ منورہ مشرف بہ اسلام ہونے کے لیے آ گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دور اندیش نگاہوں نے سارا معاملہ جان لیا اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے ان کے مالکی ساتھیوں کا پوچھا تھا۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ (پ614ء، م نواح 721ء)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی اور سپہ سالار اور تحکیم حضرت علی و معاویہ رضی اللہ عنہم کے حکم اور کوفہ کے قاضی۔

نام ونسب: ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ ابن قیس الاشعری بن سُلیم بن خضرار بن حرب۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی اور سپہ سالار جو 614ء میں پیدا ہوئے۔ آپ رضی اللہ عنہ کا اصل وطن یمن تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ اپنے قبیلے کے افراد کے ساتھ یمن سے براستہ سمندر روانہ ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اس وقت حاضر ہوئے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم 7ھ/628ء میں یہود کے خلاف نخلستان خیبر میں صف آراء تھے۔ چنانچہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست حق پرست پر بیعت کر کے خدام نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی صف میں شامل ہو گئے۔ ان کے متعلق بعض ماخذوں میں جو یہ لکھا ہے کہ انہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت بھی کی تھی محققین کے بموجب صحیح نہیں ہوسکتا۔

8ھ/630ء میں حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ غزوہ حنین میں شریک ہوئے۔ 10ھ/632ء میں اُنہیں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے ساتھ یمن میں اشاعت اسلام کے لیے بھیجا گیا اور اسی علاقے میں وہ بعد ازاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف سے عامل بھی رہے۔ 17ھ/638ء میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو بصری کا عامل مقرر کر دیا۔ 22ھ/642ء میں اہل کوفہ کی درخواست پر حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا عامل مقرر کیا۔ اس عہدے پر وہ چند ماہ مامور رہے۔ پھر جب حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا عامل بنا دیا گیا تو حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو دوبارہ بصرے کی ولایت کا

عامل بنا دیا گیا۔

بصرہ کے والی کی حیثیت سے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے خورستان کی تسخیر (16ھ/ 637ء) کی۔ 17ھ/ 638ء میں خورستان کا دارالسلطنت فتح ہو گیا مگر جنگ جاری رہنے کی وجہ سے انہیں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ بعض مستحکم اور مضبوط قلعہ بند شہروں کو مسخر کرنا اس فتح کے لیے ضروری تھا۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے الجزیرہ کی تسخیر میں بھی حصہ لیا اور 639ء میں اس مقصد کے لیے اپنی فوجوں کو عیاض بن غنم رضی اللہ عنہ کی فوجوں سے ملا دیا۔ اس کے علاوہ ایران کے کچھ علاقوں کی فتح میں بھی شریک ہوئے۔ نہاوند کے معرکے میں بھی ان کا موجود ہونا مذکور ہے۔

644ء میں ایک نہایت خونریز جنگ کے بعد انہوں نے بہت سے کرد قبائل کو شکست دی۔ یہ قبائل صوبہ الاہواز میں مخالفانہ ارادوں کے ساتھ جمع ہو گئے تھے اور اس علاقے کے باشندوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ انہوں نے اس شہر کا محاصرہ کر لیا جہاں باغی پناہ گزین ہو گئے تھے۔ اس شہر پر قبضہ کے بعد مال غنیمت کی تقسیم کے بارے میں ان کے خلاف دربار خلافت میں شکایت پہنچائی گئی تھی۔ اس بارے میں انہوں نے امیر المومنین کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنا پڑی۔ (الطبری)۔ اس کامیابی کے بعد حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے صوبہ فارس پر چڑھائی کی اور بہت سے معرکوں میں حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کی مدد کی اس موقع پر ایک ضمنی حادثے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے خلاف پہلے ہی سے (647ء) عدم اطمینان کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مورخ الطبری نے 29ھ کے واقعات کے ذیل میں حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی فوجوں میں بھی عدول حکمی کی تحریک برپا ہونے کا ذکر کیا ہے۔ بعدازاں ان کی مزعومہ کوتاہیوں کے خلاف بڑا سنگین احتجاج ہوا جو اہل بصرہ کے ایک وفد نے 29ھ/ 650ء میں مدینہ حاضر ہو کر کیا جس پر امیر المومنین، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کی جگہ عبداللہ بن عامر کو مامور کرنے کا فیصلہ کیا۔ ادھر حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ اہل کوفہ کے دلوں میں اس قدر گھر کر چکے تھے کہ انہوں نے وہاں کے والی، سعید بن العاص کو نکال کر وہاں ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو دوبارہ تقرری کا مطالبہ کیا، چنانچہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت تک کوفہ کے والی رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے کوفیوں کی طرف سے ان کی بیعت کی اور اپنے منصب پر بحال رہے۔ لیکن جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ وطلحہ سے جنگ چھڑ گئی تو ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے کوفہ کی رعایا کو غیر جانبدار رہنے کا حکم دیا اور باوجود پورا دباؤ پڑنے کے انہوں نے اپنے رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اس کے نتیجے میں شیعان علی رضی اللہ عنہ نے انہیں اولین موقع پر شہر بدر کر دیا اور امیر المومنین نے نہایت تحدیر آمیز الفاظ میں ان کی معزولی کا حکم نامہ جاری کیا مگر چند ماہ بعد انہیں امان دی گئی۔

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ان دو حکموں میں سے ایک تھے جو جنگ صفین (657ء) میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان ہونے والے تنازعات کو چکانے کے لیے مقرر کیے گئے تھے۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے ثالث مقرر کیا گیا تھا کہ ثالث ایک غیر جانبدار شخص ہوتا ہے۔ مگر حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے مشورے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت کے لیے نااہل قرار دے دیا۔ اس واقعہ کے بعد حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے ملکی سیاسیات میں کوئی حصہ نہ لیا۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو ان کی قراءت قرآن، صلوٰۃ کی بنا پر بڑی عزت واحترام کی نگاہ کے ساتھ جاتا ہے۔ ان کی آواز بڑی پرکشش تھی (طبقات ابن سعد) ان چیزوں کے علاوہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کا نام علوم قرآنیہ کے ساتھ وابستہ چلا آیا ہے۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بن عبید اللہ (592ء تا 656ء)

عشرہ مبشرہ میں شامل ایک صاحب ثروت وسخاوت اور نامور صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نام ونسب: حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بن عبید اللہ بن عثمان بن عمرو بن کعب بن سعد بن تیم بن مرہ، کنیت ابو محمد تھی۔ والدہ صفیہ بنت عبد اللہ بن عمار الحضرمی تھیں۔ صفیہ کی والدہ عاتکہ بنت وہب بن عبد بن قصی بن کلاب تھیں اور وہب بن عبد تمام قریش کے بعد صاحب الرفادہ تھے۔ یاد رہے صاحب الرفادہ وہ لوگ تھے جو حجاج کرام سے ان کی ضروریات کے انتظامات کے لیے رقم وصول کرتے تھے۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اولین اسلام لانے والوں میں سے تھے۔ حدیث میں ہے کہ انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ قریش کی دھمکیاں اور بدسلوکیاں برداشت کیں۔ ہجرت مدینہ کے بعد سے ان کا شمار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشیروں اور جاں نثار صحابہ میں ہوتا ہے۔ جنگ بدر کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کارواں قریش کی نقل وحرکت پر نظر رکھنے کے لیے بھیجا تھا۔ اس لیے وہ وقت پر واپس نہ پہنچ سکے اور جنگ میں شریک نہ ہو سکے۔ تاہم ان کو دوسرے مہاجرین کے ساتھ مال غنیمت سے برابر کا حصہ دیا گیا۔ جنگ احد میں انہوں نے خاص طور پر داد شجاعت دی اور خطرے کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لیے سینہ سپر رہے۔ جنگ احد میں انہیں مورخین کے مطابق چوبیس زخم آئے اور دشمنوں کی ایک ضرب سے ان کی دو انگلیوں کی نسیں ہی کٹ گئیں۔ جن کی وجہ سے ان کا یہ ہاتھ شل ہو گیا تھا۔ اس جاں نثاری اور بہادری کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بھی ان کی بڑی قدر ومنزلت رہی۔ غزوہ احد کے بعد حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں دوسرے غزوات میں شرکت اور غزوہ حنین میں بھی خاص طور پر بہادری کے جوہر دکھائے تھے اور جاں نثاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ جتنے صاحب ثروت اور دولت مند تھے اتنے ہی فیاض اور سخی بھی تھے۔ ان کی شجاعت کے کارناموں کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں طلحہ الخیر کا لقب مرحمت فرمایا تھا اور چونکہ وہ غزوات اور سرایا کے مصارف کے لیے گرانقدر رقوم پیش کرتے تھے اور انہوں نے مسلمانوں کی ضرورت کے لیے پانی کا ایک چشمہ خرید کر وقف کر دیا تھا، غزوہ العمرہ میں مسلمانوں کے کھانے کے تمام اخراجات برداشت کیے تھے، غزوہ تبوک کے موقع پر مصارف جنگ کے لیے کثیر رقم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی تھی۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی انہیں مالی خدمات کے پیش نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں طلحہ الخیر اور طلحہ الفیاض کے لقب مرحمت فرمائے تھے۔ یہ دونوں القاب ان کی فیاضی اور سخاوت پر دلالت کرتے ہیں۔ ایک صحابی حضرت قبیصہ بن جابر کہتے ہیں کہ ایک عرصہ تک میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہا اور میں نے ان سے بڑھ کر کسی کو بغیر مانگے مال کثیر دینے والا نہیں پایا۔

ایک مرتبہ انہیں حضر موت سے سات لاکھ درہم کی خطیر رقم وصول ہوئی تو انہوں نے یہ ساری رقم مہاجرین وانصار میں تقسیم کر دی اور ان کی بیوی کے حصے میں صرف ایک ہزار درہم آئے۔ ایک مرتبہ ایک بدوی ان کے پاس سائل کی حیثیت سے آیا اور کسی رشتے کا واسطہ دے کر سوال کیا۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے اسے کہا کہ اس سے پہلے کسی نے اس رشتے کا واسطہ دے کر مجھ سے کبھی سوال نہیں کیا۔ میرے پاس زمین ہے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کے بدلے تین لاکھ درہم کی پیشکش کی ہے۔ چاہو تو یہ زمین لے لو اور چاہو تو اس کی قیمت۔" اس بدوی نے نقد قیمت لینا پسند کیا۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بنو تیم کے (اپنے قبیلے کے) غریب اور نادار اور محتاج لوگوں کی کفالت کرتے تھے،

مقروضوں کے قرض ادا کرتے تھے اور غریب خاندانوں کی لڑکیوں کی شادی کر دیتے تھے۔

انہیں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی بڑی عقیدت تھی اور وہ ہر سال ان کی خدمت میں دس ہزار درہم پیش کرتے تھے۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اپنی مہمان نوازی کے لیے بھی بڑے مشہور تھے۔

عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عہد صدیقی اور عہد فاروقی میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ دونوں خلفائے راشدین کے مشیروں میں شامل تھے اور ان کے مشوروں کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کا نام ان چھ بزرگوں میں شامل تھا جنہیں خلیفہ نامزد کرنے کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لینے کی مہم میں شامل ہو گئے اور غلط فہمیوں کے پھیل جانے کی وجہ سے نوبت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ جمل تک جا پہنچی اور اسی معرکہ میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے جام شہادت نوش کیا۔ اس وقت ان کی عمر باسٹھ سے چونسٹھ برس کی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کی شہادت سے بڑا صدمہ پہنچا۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ ایک کامیاب تاجر تھے اس لیے انہوں نے اپنے پیچھے لاکھوں درہموں اور دیناروں کے علاوہ سیروں سونا چاندی اپنے ترکے میں چھوڑا تھا۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے مختلف اوقات میں کئی شادیاں کیں تھیں۔ ان کی ازواج میں حمنہ رضی اللہ عنہا بنت جحش، ام کلثوم رضی اللہ عنہا بنت ابی بکر، سعدی رضی اللہ عنہا بنت عوف، ام ابان رضی اللہ عنہا بنت شیبہ بن ربیعہ اور خولہ بنت القعقاع کے نام ملتے ہیں۔ ان ازواج سے ان کے ہاں دس بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ ان کی ایک صاحبزادی ام اسحاق بنت طلحہ رضی اللہ عنہ سے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے نکاح فرمایا تھا اور ان کی وفات کے بعد وہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے عقد میں آئی تھیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پوتے عبداللہ بن عبدالرحمن اور حضرت مصعب بن الزبیر بھی حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے داماد تھے۔ ہجرت کے بعد ان کا رشتہ مواخات حضرت ابی رضی اللہ عنہ بن کعب سے قائم کیا گیا تھا۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ

جندب بن جنادہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی اپنے زہد و عبادات کی وجہ سے مشہور

نام و نسب: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا نام بالعموم کتب تاریخ میں جندب بن جنادہ بیان کیا گیا ہے۔ لیکن ان کے اور نام بھی ملتے ہیں مثلاً بریر، در (ابن ہشام) ان کی والدہ کا نام رملۃ بنت الرقیعۃ ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اسلام قبول کرنے سے پہلے بھی خدائے واحد کے پرستار تھے۔ انہیں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی اطلاع ملی تو اپنے بھائی کو دریافت احوال کے لیے بھیجا مگر جب اس کے بیان سے تسلی و تشفی نہ ہوئی تو خود مکہ معظمہ آئے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی معیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا۔ پھر کچھ دنوں بعد اپنے قبیلے میں واپس جا کر 5ھ میں غزوہ خندق تک وہیں مقیم رہے۔ محققین کے مطابق حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے غزوہ خندق کے بعد مدینہ منورہ ہجرت فرمائی۔ ہجرت کے بعد بھی بہت کم غزوات میں شرکت فرمائی۔ غزوہ تبوک کے سوا کسی اور غزوہ میں ان کا ذکر نہیں ملتا۔ ان کی طبیعت پر زہد اور تقشف کا غلبہ تھا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں تو ان کا قیام مدینہ منورہ ہی میں رہا، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں کچھ عرصے کے بعد شام میں سکونت پذیر ہو گئے، تاہم یہ وہ زمانہ تھا جب خلافت اسلامیہ میں ایک زبردست انقلاب کے آثار رونما ہو چکے تھے۔ اس سے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہیں اہل شام کا ناز و تنعم، امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ اور دولت کی فراوانی پسند نہیں آئی۔ رفتہ رفتہ انہوں نے حضرت امیر معاویہ

رضی اللہ عنہ پر بھی نکتہ چینی شروع کر دی۔ جس کی اطلاع جب حضرت عثمان کو ملی تو انہیں واپس مدینہ بلا لیا گیا، لیکن یہاں آ کر بھی وہ دولت اور مال و زر کے خلاف اپنے خیالات کی اشاعت میں مصروف رہے۔ لہٰذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اشارے پر انہیں مدینے کے قریب الربذۃ کے مقام پر خلوت نشین ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ اسی مقام پر 32ھ/ 652ء میں انتقال فرمایا۔ نماز جنازہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔

جب وقت وفات نزدیک آیا تو الربذہ میں ان کی تجہیز و تدفین کے لیے کوئی دوسرا مرد موجود نہیں تھا گھر میں دو خواتین تھیں، جو رو رہی تھیں مگر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو وہ فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم یاد تھا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے ایک ویران جگہ پر انتقال کرنے اور مسلمانوں کی ایک جماعت کے وہاں آ کر ان کی تدفین کے فرائض ادا کرنے کی پیشین گوئی کی تھی۔ پھر ایسا ہی ہوا آخری سانس کے ساتھ انہوں نے بیوی کو کہا کہ باہر جا کر دیکھو مسلمانوں کی ایک جماعت بس پہنچنے ہی والی ہے۔ پھر اس جماعت کے سربراہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان کی تجہیز و تکفین فرمائی۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بڑے زاہد و عابد، بڑے حلیم اور بُردبار اور منکسر المزاج انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں علم و تقویٰ کے ساتھ ساتھ دین کا فہم بھی خوب عطا کیا تھا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس باب میں وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ہم پلہ تھے۔ دولت اور اس کی تقسیم اور استعمال کے متعلق ان کے نظریوں پر آج کل بالخصوص توجہ کی جا رہی ہے کہ معاشرے میں مالی انصاف قائم کرنے کے لیے انتہائی اہم ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ سے 281 حدیث مروی ہیں جن میں سے بخاری اور مسلم دونوں میں 31 احادیث درج ہیں۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اگرچہ بدری نہیں تھے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا وظیفہ بھی اصحاب بدر کے برابر یعنی پانچ ہزار درہم سالانہ مقرر کیا تھا۔ (اصابہ)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (583ء تا 652ء)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص، راوی حدیث، مفسر قرآن اور فقیہ

نام و نسب: ابو عبدالرحمٰن، عبداللہ بن غافل بن حبیب بن شمخ بن فار بن مخزوم ابن صاهلة بن کاهل بن الحارث بن تمیم بن سعد بن هذیل، صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم 12 عام الفیل/ 583ء میں پیدا ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں اکثر کی طرح وہ مکی معاشرے کے ادنیٰ طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ایام جوانی میں وہ عقبہ بن ابی معیط کے مویشی چراتے تھے، اسی لیے بعد ازاں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ایک بحث کے دوران انہیں ایک ھزلی غلام کہا تھا۔ (طبری) انہیں عام طور پر بنو زہرہ کا حلیف بتایا جاتا ہے اور اسی طرح ان کے والد کو بھی۔ موخرالذکر یعنی ان کے والد کے متعلق اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ عبداللہ کا بھائی عقبہ اور ان کی ماں ام عبد بنت عبدود بن سواءِ قدیم ترین صحابہ میں سے ہیں۔ چنانچہ امام النووی نے عقبہ کو "صحابی ابن صحابیہ" بتایا ہے۔ ان کے قبول اسلام کو ایک معجزہ سمجھا گیا ہے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ جا رہے تھے۔ الاستیعاب میں ہجرت کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (عبداللہ کے پاس سے گذرے) تو ان کی ملاقات عبداللہ سے ہوئی جو بکریوں کا ریوڑ چرا رہے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے دودھ مانگا تو انہوں نے اپنی دیانت داری کی بنا پر دودھ پلانے سے انکار کر دیا۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بھیڑ کو پکڑ کر اس کے تھنوں پر ہاتھ پھیرا تو تھن بڑے ہو گئے اور ان سے دودھ کی ایک بڑی مقدار نکل آئی۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے تھنوں کو بالکل ویسا کر دیا جیسے وہ پہلے تھے۔

چھ سابقون الاولون میں چھٹے

یہ درست ہے کہ عبداللہ اولین صحابہ میں سے تھے، چنانچہ وہ فخریہ طور پر اپنے آپ کو چھ اولین مسلمانوں میں سے چھٹا کہا کرتے تھے۔ دوسری روایت کے مطابق وہ اس وقت اسلام لائے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی دارالارقم میں منتقل نہیں ہوئے تھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے سے پہلے اسلام لائے تھے۔ قبول اسلام کے وقت ان کی عمر انیس یا بیس برس تھی۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے مکہ میں علی الاعلان قرآن مجید پڑھا تھا۔ حالانکہ ان کے دوست انہیں اس کام سے روکتے تھے۔ کیونکہ ان کی پشت پر کوئی حفاظت کرنے والا قبیلہ نہیں تھا۔ چنانچہ اسی وجہ سے ان سے بدسلوکی کی گئی۔ انہوں نے حبشہ ہجرت بھی کی تھی۔

ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں وہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پر رہتے تھے اور وہ اور ان کی والدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر اس کثرت سے آتے جاتے دکھائی دیتے تھے کہ ناواقف لوگ انہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا آدمی سمجھتے تھے، لیکن حضرت عبداللہ محض ''صاحب نعلین'' کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وفادار خادم خاص تھے۔ وہ ظاہری وضع قطع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید کیا کرتے تھے، لیکن لوگ ان کی پتلی ٹانگوں پر ہمیشہ ہنسا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ کے بال سرخ اور لمبے تھے اور وہ کبھی خضاب نہیں لگاتے تھے۔ ان کی ایک خصوصیت ان کا سفید لباس اور عطر کا متواتر استعمال تھی۔ وہ زیادہ تر نماز پر زور دیا کرتے تھے اور نفلی روزے کم رکھتے تھے تاکہ خدا کے کاموں کے لیے اپنی جسمانی طاقت محفوظ رکھ سکیں۔ ایسے مشاہد موجود ہیں کہ جنگ بدر میں جب ابوجہل زخمی ہوگیا تو حضرت عبداللہ اس کا سر کاٹ کر فاتحانہ انداز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے تھے۔ ابن مسعود مبشر بالجنۃ میں سے بھی تھے۔ فتنہ ارتداد کے دنوں میں جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ کو حفاظت کے لحاظ سے مستحکم کرنا چاہا تو شہر کے کمزور مقامات کی حفاظت اور نگرانی کے لیے جن لوگوں کو منتخب کیا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ان میں شامل تھے۔ انہوں نے جنگ یرموک میں بھی حصہ لیا تھا۔ عہد فاروقی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں کوفے کے بیت المال کے انتظام کے لیے رکھا تھا اور ساتھ ہی اسلام کی تلقین کے لیے بھیجا تھا۔ قرآن اور سنت کا عالم ہونے کی وجہ سے لوگ اکثر ان کے پاس مسائل دریافت کرنے آتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان سے 848 احادیث مروی ہیں۔ ان کی ایک خاص بات یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث روایت کرتے وقت ان پر لرزہ طاری ہوجاتا تھا اور یہاں تک کہ پیشانی سے پسینہ بہنے لگتا تھا۔ جو کچھ وہ بیان کرتے نہایت احتیاط سے کرتے تھے تاکہ کہیں کوئی غلط بات نہ کہہ دیں۔ حرمت شراب کی ایک روایت تر تعبیر کے لیے ان کی سند پیش کی جاتی ہے۔

ان کے آخری ایام کے متعلق متضاد روایات ملتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں کوفے کے عہدے سے معزول کردیا تھا۔ جب لوگوں کو یہ خبر ملی تو لوگوں نے انہیں روکنا چاہا، لیکن انہوں نے کہا ''مجھے جانے دو'' کیونکہ اگر فتنے برپا ہونے والے ہیں تو میں ان کا باعث نہیں بننا چاہتا۔ کتاب اصابہ میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی معزولی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ (نسب الاشراف) کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد وہ مدینہ واپس تشریف لے آئے اور وہیں بعمر ساٹھ سال 32ھ یا 33ھ میں وفات پائی اور رات کے وقت بقیع غرقد میں دفن ہوئے۔

جب وہ بستر مرگ پر تھے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان سے ملنے اور ان کی مزاج پرسی کے لیے آئے تو ان کا حال دریافت کیا اور پوچھا کہ ان کی خواہش کیا ہے۔ تو انہوں نے ایسے جوابات دیئے جو قدماء کی پارسائی کے ساتھ قدیم طرز

کی دینداری کا نمونہ تھے۔

انہوں نے الزبیر کو اپنا وصی مقرر کیا: تاہم ایک روایت یہ ہے کہ انہوں نے کوفہ میں وفات پائی تھی اور 20ھ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں معزول نہیں کیا تھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زیادہ تر شہرت بحیثیت محدث و مفسر قرآن ہے۔ مسند احمد میں ان کی بیان کردہ احادیث کو جمع کر دیا گیا ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ (612ء تا 710ء)

مشہور انصاری صحابی اور خادم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
جنہیں ان کی والدہ نے خدمت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں پیش کیا۔

نام ونسب: حضرت انس بن مالک بن النضر بن ضمضم بن زید بن حرام بن جندب بن عامر بن غنم بن عدی بن النجار۔ مشہور صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم، خادم خاص، امام، مفتی، قاری، معلم قرآن، محدث، جلیل القدر اور نامور راوی، انصاری، خزرجی، مدنی، کنیت ابو ثمامہ، ابو حمزہ، ہجرت سے نو یا دس سال پہلے پیدا ہوئے۔ ان کے والد، مالک اسلام سے محروم رہا، لیکن والدہ ام سلیم بنت ملحان مشرف بہ اسلام ہوئیں اور بعد ازاں مدینہ منورہ میں بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرا بیٹا انس بطور تحفہ قبول فرمائیے یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرے گا۔ چنانچہ وہ مدینہ منورہ میں اگلے نو دس برس تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتے رہے۔ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے ابو طلحہ انصاری کے اسلام لانے کے بعد ان سے شادی کر لی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلیم رضی اللہ عنہ کے لیے جنت کی بشارت بھی دی تھی (مسند احمد، ابوداؤد طیالسی) ام سلیم رضی اللہ عنہا ہی نے 7ھ میں ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بنت حیی کی شادی کے موقع پر ان کے بال سنوارنے اور عطر لگانے کا شرف حاصل کیا تھا۔ (انساب الاشراف) البراء بن مالک اور عمرو بن مالک حضرت انس رضی اللہ عنہ بھائی تھے۔ اُن کے چچا حضرت انس بن النضر بن ضمضم جنگ احد میں بہادری کے جوہر دکھاتے ہوئے ستر یا اسی زخم کھانے کے بعد شہید ہوئے تھے۔ (ابن خلدون) حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ماموں حضرت حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ نے بیر معونہ کے حادثے میں شہادت پائی تھی۔ ان کے والد مالک بن النصر کا مدینہ میں شیریں پانی کا کنواں تھا، جس کا پانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر نوش فرماتے تھے۔ (انساب الاشراف)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عمر بھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو کبھی مجھ سے ناراض ہوئے اور نہ کبھی برا بھلا کہا، یہاں تک کہ کبھی یہ بھی نہ فرمایا کہ یہ کام کیوں کیا اور کیوں نہیں کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے دعا فرمائی تو ان کے جان و مال میں بڑی برکت ہوئی۔ انہوں نے لمبی عمر پائی اور ان کی اولاد سو سے تجاوز کر گئی۔ (البخاری شریف) حضرت انس رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بکثرا احادیث روایت کی ہیں اور تقریباً ایک سو راویوں نے اُن سے روایت کی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایات کی تعداد 2286 ہے۔ متفق علیہ 180، البخاری میں منفرد 80 اور مسلم میں منفرد 70 ہیں۔ ان کی اولاد سے بھی بکثرت حدیث کی بکثرت روایت ہوئی۔ مشہور بصری محدث ابو عمیر، عبدالکبیر بن محمد بن عبداللہ بھی انہیں کی اولاد میں سے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ جب حدیث شریف روایت کر چکتے تو احتیاطاً کہا کرتے تھے ''او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (یا جیسے رسول خدا نے فرمایا) (مسند احمد)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کل آٹھ غزوات میں شرکت کی۔ جنگ بدر میں شریک ہوئے تو کم عمری کی وجہ سے

لڑائی میں حصہ نہ لے سکے، البتہ لشکر کے ساز و سامان کی نگرانی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتے رہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر بیعت شجرہ میں موجود تھے۔ فتح مکہ اور غزوات حنین وطائف میں بھی شریک تھے (تہذیب التہذیب)

عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایران میں فتح تستر میں شریک تھے اور وہاں کے حاکم ھرمزان کو لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جو بعد ازاں مسلمان ہو گیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو بحرین کا محصل بنا کر بھیجا تھا۔ محمد بن سیرین فارس میں ان کے کاتب رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں اور ان کے بھائی البراء بن مالک رضی اللہ عنہ کو بصرے میں حضرت ابوموسیٰ الاشعری کے ساتھ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے خلاف حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کے الزامات کی تحقیق کے لیے بھیجا تھا۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے عہد میں کچھ دن بصرے میں امامت بھی کرائی۔ حجاج بن یوسف نے سختی کی تو خلیفہ عبدالملک نے معذرت کی اور حجاج کو ڈانٹا اور معافی مانگنے کا حکم دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ابوحمزہ کی کنیت مرحمت فرمائی تھی (اعلام النبلاء)

حضرت انس نے ایک سو تین سال کے لگ بھگ عمر پائی اور 92ھ میں بمقام بصرہ وفات پائی۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور انصاری صحابی اور قبیلہ خزرج کے سخی و جواد سردار

نام ونسب: حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بن ولیم بن حارثہ بن ابی خزیمہ بن ثعلبہ بن ظریف، الخزرجی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور سخی و جواد صحابی رضی اللہ عنہ حضرت سعد یثرب (مدینہ منورہ) کے بڑے نامور اور متمول آدمی تھے اور اُن چند افراد میں سے تھے جو زمانہ جاہلیت میں عرب میں لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ ایک عمدہ تیراک اور تیراندازی کی حیثیت سے بھی مشہور تھے۔

تاریخ اسلام میں پہلی مرتبہ ان کا نام بیعت عقبہ ثانی کے اجلاس کی کاروائی کے سلسلے میں آتا ہے۔ وہ ان نو خزرجی افراد میں سے ایک تھے جو اس موقع پر نومسلموں کے نقیب منتخب ہوئے تھے۔ پھر قافلے کے پیچھے رہ جانے کی وجہ سے اہل مکہ کے ہاتھ چڑھ گئے اور انہوں نے ان سے برا سلوک کیا۔ دو مکی دوستوں کی مداخلت سے، جن کی ایک بار انہوں نے خدمت کی تھی۔ جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

ہجرت کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم الابواء کے خلاف مہم پر تشریف لے گئے تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم مقام کی حیثیت سے مدینہ میں رہے تھے۔ ایک صحیح روایت کے مطابق انہوں نے غزوہ بدر میں شرکت نہیں کی تھی۔ وہ جنگ احد میں موجود تھے جہاں انہوں نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تیمارداری کی تھی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم دشمنوں کے حملوں میں مجروح ہو گئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے کئی دوسرے غزوات میں بھی شرکت کی اور اسلام کے نہایت پر جوش مجاہد ثابت ہوئے اور کئی مرتبہ علمبرداری کے فرائض سرانجام دیئے۔ انہیں سخاوت میں امتیاز خصوصی حاصل تھا۔ قبیلہ بنونضیر کے محاصرے کے دوران میں انہوں نے اپنے خرچ پر مسلمانوں میں کھجوریں تقسیم کرائیں تھیں۔

بنوقریظہ کا محاصرہ کرنے والی فوج کو انہیں نے سامان رسد بہم پہنچایا تھا۔ اور غزوہ تبوک کے موقع پر مسلمانوں کی امداد کے لیے خصوصی طور پر ایک بڑا عطیہ پیش کیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ خندق میں بنوغطفان کے دو

سرداروں عینیہ بن حصن اور الحارث بن عوف کے ساتھ سیاسی گفت وشنید شروع کی اور انہیں اس بات پر آمادہ کرلیا کہ اگر وہ واپس چلے جائیں تو کھجوروں کی آئندہ فصل کا ایک تہائی حصہ انہیں دے دیا جائے گا، لیکن حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ، سعد بن معاذ اور حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ مفاہمت کی اس کوشش کے حق میں نہیں تھے۔ کیونکہ بہادر اور غیور انصار کو اس قسم کے سمجھوتے میں مسلمانوں کی کمزوری اور زلت کا پہلو نظر آتا تھا۔ وہ ہر قیمت پر اسلام کی سربلندی کے خواہاں تھے اور جان پر کھیل جانے کے لیے بالکل تیار، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سرداران انصار کی رائے کو پسند فرمایا اور اس سمجھوتے کی گفتگو کو وہیں ختم کردیا۔ عبداللہ بن اُبی کی وفات کے بعد حضرت سعد قبیلہ خزرج کے بلا مقابلہ سردار بن گئے اور یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہیں کہ لوگوں نے انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کے لیے بھی تجویز کیا تھا۔ جونہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کی خبر مدینہ منورہ میں پھیلی اوس اور خزرج کے بنو میں جمع ہوئے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے انہیں خطاب کرکے یہ سفارش کی کہ انصار میں سے کسی ایک کو چن لیا جائے۔ حاضرین میں کثرت رائے ایسے لوگوں کی تھی جو فوراً حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے کے لیے تیار تھے۔ ان حالات میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بن الجراح وہاں تشریف لائے اور خاصی بحث وتمحیص کے بعد اور تمام معاملات پر غور وخوض کرنے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت خلافت کی گئی۔ اس کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ سیاسی زندگی سے کنارہ کش ہوگئے اور بعد ازاں الحوران کی طرف چلے گئے جہاں آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں وفات پائی۔

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ

جلیل القدر انصاری صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور قبیلہ بنو اوس کے سردار

نام ونسب: حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ بن النعمان بن امرئ القیس بن زید بن عبدالاشہل بن جشم، الانصاری، الاوسی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی اور مدینہ منورہ میں اوس کے ایک بڑے قبیلے بنو عبدالاشہل کے نامور اور معزز سردار تھے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے اس وقت حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو مشرف بہ اسلام کیا تھا جب انہیں یثرب کے بارہ نقیبوں کے ساتھ یثرب میں بھیجا گیا تھا۔ مسلمان ہونے کے بعد حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اسلام کی نشر واشاعت کے لیے ایک کامیاب کوشش کی اور اپنے سارے قبیلے کو مشرف بہ اسلام کرلیا۔ ابتدا ہی سے انہوں نے اسلام کے لیے بڑی گرمجوشی اور سرگرمی کا اظہار کیا اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ بواط پر روانہ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روایت کے مطابق حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت الصائب بن عثمان بن مظعون کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ حضرت سعد بن معاذ جنگ بدر میں قبیلہ اوس کے علم بردار تھے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنگ احد میں زخمی ہوئے تو حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی معیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امداد کے لیے روانہ ہوئے۔ جنگ خندق کے موقع پر حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ بھی دیگر انصاری سرداروں کی طرح بنو غطفان کو خراج کی ادائیگی کے خلاف تھے اور انہوں نے بھی اس کے خلاف احتجاج کیا، لیکن اس کے فوراً بعد ہی ایک مشرک کا تیر ان کے ایک ہاتھ کو بری طرح زخمی کرگیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اس مہلک زخم کی وجہ سے کچھ عرصہ صاحب فراش رہے اور حضرت رفیدہ اسلمیہ ان کی تیمارداری اور مرہم پٹی کرتی رہیں۔ بالآخر اسی مہلک زخم کے خراب ہوجانے کی وجہ سے وہ شہید ہوگئے۔ یاد رہے حضرت رفیدہ اسلمیہ بڑی نیک خاتون تھیں اور بیماروں

کی دیکھ بھال کرنے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے میں بڑی مہارت رکھتی تھیں۔

غزوہ خندق میں قریش اور ان کے اتحادیوں کی پسپائی کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منبع فساد قبیلہ قریظہ کو سزا دینے کا فیصلہ کیا کیونکہ ان لوگوں نے عہد شکنی اور غداری کی تھی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوقریظہ کے خلاف اقدام کرنا چاہا تو بنوقریظہ نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو ثالث تسلیم کر کے یہ اعلان کیا کہ وہ جو فیصلہ بھی کریں گے ہمیں منظور ہوگا۔ انہیں یہ امید تھی کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اپنے سابقہ اتحادیوں کا خیال رکھیں گے۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اس وقت زخموں سے گھائل ہو کر صاحب فراش تھے۔ انہیں بحالت بیماری بنوقریظہ کے پاس بھیجا گیا۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام حاضرین سے یہ وعدہ لینے کے بعد کہ ان کا فیصلہ غیر مشروط طور پر تسلیم کیا جائے گا، یہ اعلان کیا کہ بنوقریظہ کے مردوں کو اس غداری کے جرم میں قتل کر دیا جائے اور عورتوں اور بچوں کو قیدی بنالیا جائے اور ان کی جائیداد تقسیم کر دی جائے۔ اس فیصلے کی دوسرے دن ہی تعمیل کر دی گئی۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ بھی اس کے بعد جلد ہی اپنے زخم کے خراب ہو جانے کی وجہ سے جاں بحق ہو گئے۔

احادیث میں انہیں ایک بڑے مجاہد کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ ان کا شمار اصحاب النقبا میں ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی موت سے عرش عظیم جنبش میں آ گیا ہے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت عمرو بن معاذ رضی اللہ عنہ غزوہ احد میں شہید ہوئے تھے۔

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ (591ء تا 672ء)

میزبان رسول صلی اللہ علیہ وسلم

جس کے گھر کے دروازے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری بحکم الٰہی مدینہ میں آ کر رکی

نام ونسب: حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ، خالد بن زید بن کلیب النجاری الخزرجی، 31 ق ھ/591ء میں یثرب میں پیدا ہوئے۔ والدہ کا نام ھند بنت سعد تھا۔ طبقات ابن سعد میں اُن کا نام زھراء لکھا ہوا ہے۔ جو ممکن ہے لقب ہو۔ یہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے والد کی ماموں زاد بہن تھیں۔

قبول اسلام: حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام بیعت عقبہ اولیٰ اور بیعت عقبہ ثانیہ کے درمیانی وقفہ کا واقعہ ہے۔ سنہ 12 نبوت میں جب حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ 73 انصاری مردوں کا قافلہ لے کر خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے حاضر ہوئے تو ان حضرات میں حضرت ابوایوب انصاری بھی شامل تھے (سیرت ابن ہشام) ابن ہشام نے شرکائے عقبہ ثانیہ کی پوری فہرست درج کی ہے۔ اس فہرست میں پہلا نام حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ ہی مکان پر بوقت ہجرت مدینہ آنحضرت کی ناقہ قصوئی بحکم الٰہی جا کر ٹھہری تھی۔ مدینہ کے تمام رؤسا اور سرداران خواہشمند تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مشرف میزبانی ان کو بخشیں اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا جہاں آج ہماری سواری بحکم الٰہی جا کر ٹھہرے گی اسی کو ہم مشرف میزبانی بخشیں گے اور یوں یہ اعزاز حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مکان کی تعمیر تک انہیں کے ہاں قیام فرمایا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اسی مکان میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بھی فروکش تھے۔ 26 ربیع الاول کو جمعہ کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچے تھے، گویا اسی دن سے حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کو مشرف میزبانی حاصل ہوا تھا۔ یہ شرف کتنے عرصہ تک رہا؟ یہاں مختلف روایات میں البتہ متفق علیہ یہ ہے کہ آپ

صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں پہنچنے کے بعد اپنا مکان بننے تک حضرت ابوایوب انصاری کے ہاں ہی قیام فرمارہے تھے۔ لیکن مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیر کب مکمل ہوئی تھی؟ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ تعمیر مسجد تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ماہ تک دار ابوایوب میں قیام فرمایا تھا اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ مسجد نبوی کی تعمیر 26 ربیع الثانی تک مکمل ہوگئی تھی۔ ابن حجر ہی نے ابن اسحاق کی روایت سے لکھا کہ ابوامامہ کا انتقال ہوا تو مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیر جاری تھی اور علامہ واقدی نے اس مہینے کو ماہ شوال کا مہینہ بتایا ہے۔ ابن ہشام کی روایت یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچنے کے بعد ماہ ربیع الاول سے دوسرے سال کے ماہ صفر تک وہاں قیام فرمایا تھا۔ دوسرے سال ہی میں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکانات مکمل ہوئے تھے۔ ہجرت کے پانچ ماہ بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے مکان پر مہاجرین و انصار کو جمع کیا اور ان میں مواخاۃ قائم کی تو اس سلسلہ مواخاۃ میں حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کے اسلامی بھائی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ بنائے گئے تھے۔

غزوات میں شرکت: حضرت ابوایوب انصاری نے عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام غزوات و مشاہد میں حصہ لیا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر بھی آپ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بھی حضرت ابوایوب انصاری باقی تمام عمر جہاد میں مصروف رہے، یہاں تک کہ محاصرہ قسطنطنیہ میں شہادت پائی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے تین براعظموں، ایشیا، افریقہ اور یورپ میں مجاہدانہ سفر کیے۔

جب 35ھ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ ہوا اس وقت آپ مدینہ ہی میں تھے بلکہ بعض اوقات مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں امامت کے فرائض بھی ادا کرتے تھے۔ عہد خلافت علوی میں مورخ ابن الاثیر کے مطابق آپ رضی اللہ عنہ نے معرکہ نہروان (38ھ) میں شرکت فرمائی۔ اس موقع پر آپ رضی اللہ عنہ سواروں کے دستے کی قیادت کررہے تھے۔ المسعودی نے جنگ جمل میں بھی حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کی شرکت کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح جنگ صفین میں ان کی شرکت کا ذکر صرف علامہ عبدالبر نے اپنی کتاب ''الاستیعاب'' میں کیا ہے۔ ابن عساکر میں اس جنگ میں ان کی شرکت سے انکار کیا ہے۔ المسعودی جیسے مورخ کو بھی اس شرکت کا علم نہ تھا۔ اغلب یہی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ وہ صرف معرکہ نہروان میں ہی شامل تھے جو خوارج کے خلاف لڑا گیا تھا۔ اس جنگ سے پہلے خوارج کو جن لوگوں نے سمجھانے کی کوشش کی تھی ان میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ 36ھ میں جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہمیشہ کے لیے مدینہ منورہ کو چھوڑا تو ان کی طرف سے مقرر کردہ مدینہ کے والیوں میں حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے خلافت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ میں 42ھ میں بازنطینیوں کے خلاف جب جنگوں کا زور بڑھا تو تقریباً 75 برس کے یہ مجاہد بازنطینیوں کے خلاف حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبدالرحمٰن کے ہمراہ مصروف جہاد ہوگئے۔ 46ھ میں بحری جنگوں میں شرکت کے لیے وہ مصر تشریف لے گئے۔

قسطنطنیہ میں: 49ھ میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے قسطنطنیہ پر حملہ کرنے کے لیے ایک بحری بیڑا تیار کیا۔ یزید بن معاویہ اس بحری بیڑے کا سپہ سالار تھا۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ، ابن زبیر رضی اللہ عنہ جیسے صحابہ کے علاوہ معمر حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی اس مہم میں شامل تھے۔ چار سال تک آپ رضی اللہ عنہ قسطنطنیہ پر حملوں میں شریک رہے، پھر محاصرہ قسطنطنیہ کے دوران ہی آپ رضی اللہ عنہ بیمار پڑ گئے۔ یزید آپ رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لیے آیا اور اس نے پوچھا: ''آپ رضی اللہ عنہ کو کچھ کہنا ہے؟ فرمایا ہاں یہ کہنا ہے کہ جب میں وفات پا جاؤں تو میرا جنازہ اٹھا کر اسے دشمن کی سرزمین میں جہاں تک لے جاسکو لے جاؤ اور جب آگے بڑھنے کا امکان نہ رہے تو اسی جگہ مجھے دفن کردینا۔

چنانچہ 52ھ کی ایک رات آپ رضی اللہ عنہ غالباً اسہال کی بیماری سے فوت ہوگئے تو آپ رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ یزید نے پڑھائی اور قسطنطنیہ کی فصیل کے سامنے انہیں دفن کر دیا گیا۔

حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کے مزار کا ذکر سب سے پہلے ابن قتیبہ نے کیا ہے۔ ابن حجر بھی اپنی تصنیف تہذیب میں اُن کے مزار کا ذکر کرتے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ بازنطینی بھی اُن کے مزار کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور قحط کے ایام میں اس مقبرے کی زیارت کے لیے آئے تھے اور بارش کے لیے دعائیں مانگا کرتے تھے۔ کہتے ہیں بازنطینوں ہی آپ رضی اللہ عنہ کے مزار کی عمارت تعمیر کی تھی۔

مزار کی تعمیر: پھر جب سلطان محمد فاتح نے 1456ء میں قسطنطنیہ کو فتح کیا۔ اس سے شیخ آق شمس الدین نے حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کے مقبرے کا ذکر کیا تھا۔ جلاء القلوب میں لکھا ہے کہ آق شمس الدین نے قسطنطنیہ کی فصیل کے نیچے ایک مقام پر نور کا ہالہ دیکھا اور کہا کہ سرہانے کی طرف سے دو ہاتھ زمین کھودو ایک پتھر نکلے گا جس پر عبرانی اسم الخط میں کچھ لکھا ہوگا۔ چنانچہ جب یہ پتھر برآمد ہوا اور اسے پڑھوایا گیا تو حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کا نام لکھا ہوا تھا۔ یہ پتھر قبر سے باہر دیوار میں اب بھی لگا ہوا ہے۔ سلطان محمد فاتح نے اس جگہ عمارت تعمیر کروادی۔ قبر پر تابوت رکھا گیا جس پر چاندی منڈھی ہوئی تھی۔ مزار کے ساتھ ایک جامع مسجد اور ایک مدرسہ بھی تعمیر کروایا۔ اس مسجد میں توسیع انمک جی زادہ احمد پاشا نے 1590ء میں کرائی۔ 1723ء میں اس میں دو غلام گردشوں اور دو نئے میناروں کا اضافہ کیا گیا۔ سلطان محمد فاتح کے وقت سے اس مزار کو یہ اہمیت حاصل رہی کہ سلاطین عثمانیہ کی تاج پوشی کے موقع پر سلطان یہاں آتا اور شیخ الاسلام اس کی کمر میں بانی خاندان سلطان عثمان خان کی تلوار حمائل کرتا تھا۔ خود سلطان محمد فاتح کی کمر میں یہ تلوار شیخ الاسلام شمس الدین نے حمائل کی تھی۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ

وہ صحابی رسول ﷺ جو بعض روایات کی رو سے 60 سال سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتظار میں تھے

حضرت سلمان فارسی ایک مشہور صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ ان کی کنیت ابوعبداللہ تھی اور وہ معروف بہ سلمان الخیر تھے (ابن سعد)

نام و نسب: وہ اپنا نام سلمان بن اسلام بن اسلام بتایا کرتے تھے۔ مشہور مورخ ابن الاثیر نے اُن کے سلسلہ نام و نسب میں یہ لکھا ہے مابہ ابن بوزخشاں بن مورسلان بن بہوذان بن فیروز بن سہرک۔

مقام بود و باش: حضرت سلمان رضی اللہ عنہ اصفہان کے قریہ "جی" یارام ہرمز کے مضافات میں رہتے تھے۔ ان کے والد ایک آتش کدے کے مہتمم اعلیٰ تھے اور اچھے خاصے لینڈ لارڈ تھے۔ اس قریے کے لوگ آتش پرست تھے اور چتکبرے گھوڑے "الخیل البلق" کی پوجا بھی کرتے تھے، لیکن حضرت سلمان فارسی نے ان میں رہنے کے باوجود کبھی آگ کی پوجا کی نہ کبھی اس گھوڑے کو پوجا تھا۔

پرورش: حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے والد نے ان کی پرورش بڑی احتیاط سے کی تھی اور انہیں گھر ہی میں رکھ کر ان کی تربیت کی تھی۔ ایک موقع پر کسی مصروفیت کی بنا پر جب ان کے والد اپنی اراضی کی دیکھ بھال کے لیے نہ جا سکے تو انہوں نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کو وہاں بھیج دیا اور جلد واپس آنے کی تاکید کی۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے راستہ میں ایک گرجا گھر میں جب عیسائیوں کو عبادت کرتے دیکھا تو انہیں عیسائیوں کا انداز عبادت پسند آگیا۔ اس میں وہ کچھ ایسے محو ہوئے کہ گھر کی خبر نہ رہی اور انہوں نے عیسائیوں کو کہا کہ وہ اس مذہب کے متعلق جاننا چاہتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ

عیسائیت کے تعلیمی مراکز زیادہ تر شام میں ہیں۔ یہ معلومات حاصل کر کے جب گھر واپس آئے اور اپنے والد کو راضی پر نہ جانے اور راستے میں گرجا میں ہونے والی عبادات کے متعلق بتایا۔ ان کے والد نے ناراض ہو کر ان کا گھر سے نکلنا بند کر دیا۔ مگر جلد ہی ایک قافلہ کے ہمراہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ شام چلے گئے۔ اور وہاں متعدد اسقفوں کے ساتھ رہے اور عیسائیوں سے تحصیل علم کی اور راہبوں کی ریاضت دیکھی۔ تحصیل علم کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ عیسائیوں کی کتابوں میں ایک پیغمبر کی آمد کا تذکرہ موجود ہے۔ اس پیغمبر کا ظہور سرزمین حجاز و عرب میں ہوگا۔ جلد ہی حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے دل میں اس پیغمبر سے ملنے کی آرزو جاگزیں ہوگئی اور وہ موصل، نصیبین اور عموریہ کے راستے مختلف علاقوں سے ہوتے ہوئے ''تہامہ'' کے شوق میں حجاز جانے والے بنوکلب کے ایک قافلے کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ ان عرب تاجروں نے نیک نفس اور پرہیزگار حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کو کسی یہودی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

جب سرزمین حجاز میں وادی القریٰ اور مدینہ منورہ کے اردگرد حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کو کھجور کے جھنڈ اور باغات نظر آئے تو انہیں عیسائی راہبوں کی وہ پیشین گوئیاں یاد آگئیں جو انہوں نے کتاب مقدس کے حوالے سے کی تھیں۔ ساتھ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو غلامی کے باوجود امید کی کرن پھوٹتی ہوئی دکھائی دی کہ میں نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے علاقے میں تو پہنچ گیا ہوں انشاء اللہ عزیز شرف ملاقات بھی حاصل ہو جائے گا۔ راہبوں کی پیشین گوئی کے مطابق نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی کشادہ ہونا تھی اس لیے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ ہر کشادہ پیشانی شخص کو غور سے دیکھتے اور اس میں دیگر علامات نبوت تلاش کرتے رہے۔ مگر جن کی جستجو تھی ان کی قدم بوسی نصیب نہ ہوتی۔ پھر ایک دن انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قبا میں ورود کی خبر ملی۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ صدقے کی کچھ کھجوریں لے کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقے کی کھجوریں کھانے سے احتراز فرمایا۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے راہبوں کی پیشین گوئیوں میں نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک یہ علامات بھی سن رکھی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صدقہ سے اجتناب فرمائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے کی کھجوریں نہ کھانے سے ان کا ماتھا ٹھنکا، مگر وہ خاموشی سے واپس آگئے۔ ایک علامت تو انہیں مل گئی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں قیام فرما ہوئے تو حضرت سلمان رضی اللہ عنہ ایک بار پھر حاضر ہوئے اس مرتبہ انہوں نے کچھ کھجوریں بطور ہدیہ پیش کیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازراہ احتیاط حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا کہ کہیں یہ کھجوریں صدقہ کی تو نہیں ہیں؟ پھر جواب نفی میں ملنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ خود نوش فرمائیں اور کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم کو دے دیں۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے دل میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے کہ انہیں اب اپنی منزل پر پہنچنے کا یقین ہو چلا تھا۔ کچھ دن بعد پھر بارگاہ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے تاکہ نبوت کی جو نشانیاں انہیں راہبوں نے بتائی تھیں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ پھر جب ان نشانیوں کی زیارت کر لی تو آپ رضی اللہ عنہ ایمان لے آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے خلوص اور ان کی ارادت مندی سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہیں اس یہودی کی غلامی سے آزاد کرا دیا۔ الذھبی نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے یہودی مالک کا نام عثمان بن اشہل القرظی لکھا ہے اور آزادی دلانے کی تاریخ دوشنبہ ماہ جمادی الاول، ہجرت کا پہلا سال رقم کی ہے۔

مواخات المدینہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوالدردہ رضی اللہ عنہ کا بھائی بنایا تھا چونکہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نہ تو مہاجر تھے اور نہ ہی انصار اس لیے اس موقع پر اکیلے رہ گئے تھے اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں فرمایا۔ ''سلمان من اہل بیتی۔'' ''یعنی سلمان میرے اہل بیت میں سے

ہیں۔''اور اس طرح اُن کی دل جوئی فرمائی۔

5 ھ میں غزوہ خندق کے موقع پر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ایک سرگرم مجاہد کے طور پر تاریخ اسلام میں ابھرتے ہیں۔ جب قریش اور یہود اپنے اتحادیوں کے ساتھ مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے باہر پڑاؤ ڈالنے اور دشمن کو روکنے نکلے۔ اس موقع پر حضرت سلمان رضی اللہ عنہ فارسی کے مشورے اور تجویز پر مدینہ منورہ کے گرد خندق کھودنے کا اہتمام ہوا۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے جو اس وقت بہت قوی تھے اور ان میں عسکری قابلیت بھی تھی۔ انہوں نے خندق کی تجویز پیش کرتے ہوئے اپنے گذشتہ تجربات کا ذکر اس طرح کیا۔''اِنا کُنا بفارس اذ حوصرنا خندقنا علینا۔'' (الطبری) گویا وہ ایران میں بھی جنگیں لڑنے کے تجربات رکھتے تھے یا انہوں نے محاصراتی جنگوں کا مشاہدہ بھی کیا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے مختلف مذاہب کے علوم حاصل کیے تھے اور وہ لکھنا بھی جانتے تھے۔ دوسری طرف علم سے لگاؤ کی وجہ سے وہ اصحاب صفہ کے رکن بھی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے طویل گفتگو کرنا پسند فرماتے تھے۔ کبھی کبھی رات کی نشست میں بھی گفتگو کا سلسلہ غیر معمولی طور پر طویل ہو جاتا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حذیفہ بن یمان کے بعد حضرت سلمان فارسی کو مدائن کا گورنر بنایا تھا۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے بعہد خلافت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں وفات پائی۔ ان کی تاریخ وفات 35 ھ یا 36 ھ میں بیان کی جاتی ہے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی عمر کے بارے میں مختلف رائے پائی جاتی ہیں۔ الذہبی کی رائے ان کی عمر کے بارے میں صحیح ترین ہے۔ ان کے نزدیک حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ تقریباً 40 برس کی عمر میں حجاز پہنچے تھے اور انہوں نے 36 ھ میں وفات پائی۔ اس طرح وہ تقریباً چھہتر سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کا مزار مدائن (ایران) میں موجود ہے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کی اولاد کا سلسلہ بھی اب تک باقی بیان کیا جاتا ہے۔ ان کے ایک بیٹے کا نام کثیر تھا اور ان کی دو لڑکیاں مصر میں تھیں جن میں سے ایک کی نسل باقی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

حضرت عمیر بن عامر الدوسی الیمانی رضی اللہ عنہ، مشہور صحابی اور یکے از اساطین علم حدیث

نام و نسب: حضرت عمیر بن عامر بن عبد ذی الشریٰ الدوسی الیمانی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ صحابی جن کا شمار ان صحابہ کرام میں ہوتا ہے جو علم الحدیث کے اساطین سمجھے جاتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ابو ہریرہ کے بارے میں فرمان عالیشان ہے کہ ''ابو ہریرہ علم کا ظرف ہیں۔'' (البخاری شریف، کتاب العلم) ان کا نام پہلے عبدالشمس تھا۔ اسلام لانے پر بدل کر عمیر، عبداللہ یا عبدالرحمٰن ہو گیا، لیکن ان ناموں کے علاوہ بھی ان کے کئی نام اور بھی بتائے جاتے ہیں۔

لقب: انہیں ابو ہریرہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے قبیلے کی بکریاں چراتے وقت اپنے ساتھ دل بہلانے کے لیے بلی کا ایک بچہ رکھا کرتے تھے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ حضرت طفیل بن عمرو الدوسی رضی اللہ عنہ کی تبلیغ سے مسلمان ہوئے تھے۔ جب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یمن کے اس سردار اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ حجاز پہنچے تو اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کی عسکری مہم میں مصروف تھے۔ چنانچہ اس وجہ سے یہ قافلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لیے خیبر پہنچا۔ اس وقت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی عمر تقریباً تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ قبول اسلام کے بعد وہ اپنے وطن واپس

نہ گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ہی میں رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی داد و دہش پر ان کی بسر اوقات ہوتی تھی۔ وہ ان غریب اور نادار لوگوں میں سے تھے جو اہل صفہ کہلاتے تھے اور جنہوں نے اپنی زندگیاں علم کے حصول کے لیے وقف کر دیں تھیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو اپنی والدہ سے بڑی محبت تھی اور انہیں کی ترغیب پر وہ بھی اسلام لے آئیں تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں انہیں بحرین کا گورنر مقرر کیا تھا مگر بعد ازاں ان کو اس منصب سے معزول کر کے ان کا مال و دولت ضبط کر لیا۔ بعد ازاں جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں ان کے منصب پر بحال کرنا چاہا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ مدینہ منورہ سے اپنی غیر حاضری کے زمانے میں مروان نے انہیں اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ لیکن اگر یہ روایت صحیح ہے کہ وہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی نماز جنازہ میں شریک تھے (58ھ) تو ان کی وفات 59ھ/ 679ء میں ہوئی ہوگی۔ انہوں نے تقریباً 78 سال عمر پائی تھی۔ ولید نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور وہ جنت البقیع میں دفن کیے گئے۔

راوی حدیث اگر چہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے صرف چار سال پہلے اسلام قبول کیا تھا گر وہ اتنی احادیث کے راوی ہیں جو کسی اور صحابی کے ہاں مشکل ہی سے ملتی ہیں یعنی کُل 5375۔ ان میں سے 325 احادیث متفق علیہ ہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی مسند میں ان کی روایات 213 صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ جن راویوں نے براہ راست حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے احادیث روایت کی ہیں ان کی تعداد محققین نے آٹھ بتائی ہے۔ ایک روایت میں جو تھوڑی سی مختلف شکلوں میں نقل کی جاتی ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس امر کی توجیہ کی ہے کہ وہ دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مقابلے میں زیادہ احادیث کے راوی کیوں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب دوسرے لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے تھے تو وہ بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر رہتے تھے اور اسی وجہ سے انہیں دوسروں کے مقابلے میں زیادہ فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سننے کے مواقع میسر آتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو درخواست کی کہ میں جو کچھ سنتا ہوں بھول جاتا ہوں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب میں کچھ کہہ رہا ہوتا ہوں تو تم اپنا جبہ پھیلا دو اور جب میں اپنا کلام ختم کروں تو اُسے اپنے گرد لپیٹ لیا کرو۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس فرمان نبوی پر عمل کیا تو اس کے بعد سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی ہوئی کوئی بات نہیں بھولے۔ (البخاری، کتاب العلم) ایک مغربی مستشرق ڈاکٹر اشپرنگر نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے اسے کسی طور بھی حق بجانب نہیں کیا جاسکتا بلکہ اسے مغربی مستشرقین کے تعصب اور کم علمی کی بنیاد پر قائم کی گئی رائے کہا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ جو روایات ان سے مروی ہیں یا کہی جاتی ہیں ضروری نہیں کہ وہ انہیں کی ہوں۔ ممکن ہے کہ بعد کے زمانے میں جب جھوٹی حدیثیں وضع کی گئیں انہیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منسوب کرنا لوگوں کو آسان معلوم رہا ہو...... حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی بہت سی روایات صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں درج ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو احادیث یاد تھیں وہ انہوں نے احاطہ تحریر میں بھی لے آئی تھیں۔ صرف چند روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کی بعض روایات پر اعتراض کرتے تھے۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ انہیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے حفظ و امانت پر کوئی شک تھا، بلکہ ان کے تفقہ پر انہیں اعتراض تھا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کچھ فارسی بھی جانتے تھے۔ انہیں توراۃ میں بیان کیے گئے کچھ مسائل سے بھی اسی وجہ سے واقفیت تھی۔ ان کے خوف خدا، عبادت و ریاضت، محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم و آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم، والدہ کی خدمت، اظہار حق میں جرات، سادگی اور فیاضی کے جستہ جستہ واقعات تاریخ

اسلام کے صفحات میں ملتے ہیں۔

طبقات ابن سعد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو محض دو وقت کے کھانے پر دختر غزوان کو کرائے پر دے دیا تھا۔ وہ انہیں تکلیف دیتی تھی، مجبور کرتی تھی کہ برہنہ پا چلوں پھر اللہ نے اس سے میرا نکاح کر دیا تو میں اسے تکلیف دیتا تھا کہ وہ کھڑے ہو کر برہنہ پا چلے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن وہ بھوک کی وجہ سے اپنے گھر سے نکلے اور مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلے تو اثنائے راہ میں انہیں صحابہ کی ایک ایسی جماعت ملی جو بھوک کی وجہ سے نکلی تھی۔ جب یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تم لوگوں کو اس وقت کیا چیز لائی ہے۔ ان سب نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں بھوک لائی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجوروں کا ایک طباق منگوایا اور ہم میں سے ہر شخص کو دو دو کھجوریں مرحمت فرمائیں اور فرمایا کہ یہی دو کھجوریں کھاؤ اور پانی پیو تو آج کے دن کے لیے تمہارے لیے کافی ہوں گی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک کھجور کھالی اور ایک کھجور اپنی تھیلی میں رکھ لی۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اے ابوہریرہ! تم نے یہ کھجور کیوں رکھ لی۔" حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا "یارسول اللہ! میں نے اسے اپنی والدہ کے لیے سنبھال کر رکھ لیا ہے۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم یہ کھجور کھالو میں تمہیں تمہاری والدہ کے لیے علیحدہ سے دو کھجوریں دوں گا۔" اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید کھجوریں عنایت فرما دیں۔

ابن شہاب سے مروی ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اپنی والدہ کے ساتھ رہنے کی وجہ سے تا وقتیکہ وہ وفات نہ پا گئیں حج پر نہیں گئے تھے اور ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اپنی والدہ کو اسلام کی دعوت دیتے تھے مگر وہ قبول نہیں کرتی تھیں۔ ایک روز جب انہوں نے دعوت دی تو ان کی والدہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایسی باتیں کیں جو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے وہ روتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا ماجرا بیان کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی جس کے بعد جب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ واپس گھر آئے تو ان کی والدہ غسل کر رہی تھیں پھر جب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ گھر میں داخل ہوئے تو ان کی والدہ نے کلمہ طیبہ پڑھا اور مسلمان ہو گئیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ دوڑتے ہوئے واپس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خوشخبری سنائی۔

حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ بن حرب

قریش کے ممتاز و متمول تاجر اور سردار مکہ جو قبول اسلام کے بعد والی نجران و حجاز بن گئے

نام و نسب: ابوسفیان بن حرب بن امیہ: قریش کے ایک کنبے "عبدشمس" کے فرد تھے۔ مکہ میں ایک متمول تاجر اور سرمایہ دار کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ خاندان عبدشمس کا سردار ہونے کی وجہ سے ہجرت سے پہلے کے سالوں میں حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں دوسرے سرداران قریش کے ساتھ شریک تھے۔ تاہم ان کی مخالفت اتنی شدید نہیں تھی جتنی ابوجہل کی تھی۔ متعدد مواقع پر وہ قریش کے تاجرانہ قافلوں کی قیادت کرتے تھے۔ بالخصوص 2ھ/624ء میں انہیں کی قیادت میں ایک ہزار اونٹوں کا وہ قافلہ شام سے مکہ واپس لوٹ رہا تھا جس پر مسلمانوں کی طرف سے حملہ کا خطرہ پیدا ہوا تو ابوسفیان نے اہل مکہ کے پاس مدد کے لیے ایلچی بھیجے۔ اہل مکہ ابوسفیان کے قافلے کی مدد کے

لیے ایک ہزار نفوس کا لشکر لے کر ابوجہل کی سرکردگی میں نکلے۔ ابوسفیان اپنی ہوشیاری اور مستعدی کی بدولت اپنے قافلے کو بچا کر نکلنے میں کامیاب ہو گئے، لیکن ابوجہل مسلمانوں کے ساتھ لڑنے اور انہیں نقصان پہنچادینے کا یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا اس لیے نتیجتاً جنگ بدر لڑی گئی جو خود اہل مکہ پر تباہی لانے کا موجب بنی۔ ابوسفیان کے بیٹوں میں سے حنظلہ اس جنگ میں مارا گیا اور عمرو گرفتار ہوا جو بعد ازاں رہا کر دیا گیا۔ ابوسفیان کی بیوی ھند کا باپ عتبہ بھی اس جنگ میں مارا گیا۔ جنگ بدر کا انتقام لینے کے لیے اہل مکہ نے جو جنگی تیاریاں کیں ان کا نگراں بظاہر حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ ہی تھا۔ اور جو کثیر لشکر 3ھ میں مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا گیا اس کے سپہ سالار بھی حضرت ابوسفیان ہی تھے اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ شاید بنوامیہ کا فرد ہونے کی وجہ سے قریش کے لشکر کی سپہ سالاری اس کا موروثی حق تھا۔ مگر اس حملہ یا جنگ احد کا نتیجہ قریش کے حق میں تسلی بخش نہیں نکلا۔ اس کے بعد 5ھ میں یہود کی شہ پر الاحزاب کا وفاق تشکیل پایا اور اس نے ابوسفیان ہی کی سرکردگی میں مدینہ کا محاصرہ کر لیا مگر اس مہم کے بھی ناکام ہو جانے کے بعد ابوسفیان کی ہمت جواب دے گئی۔ کم از کم مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی آئندہ قیادت مقابل گروہ کے راہنماؤں صفوان بن امیہ اور سہیل بن عمرو اور عکرمہ بن ابی جہل کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ صلح حدیبیہ کے معاملات طے پانے میں حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا نام نہیں ملتا ہاں البتہ 8ھ/ 630ء میں جب قریش اور اس کے حلیفوں نے علی الاعلان اس کی عہد شکنی کی تو قریش کے ندامت محسوس کرنے کے بعد ابوسفیان کو اس معاہدے کی تجدید کے لیے ایک سفارتی مشن پر مدینہ بھیجا گیا مگر اس کا یہ سفارتی مشن ناکام رہا۔ پھر فتح مکہ کے موقع پر لشکر اسلام کے مکہ میں داخل ہونے سے پہلے، حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ، حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے شہر سے باہر آکر اسلام قبول کر لیا اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی حوصلہ افزائی کے لیے اس کے گھر کو بھی دارالامن قرار دیا۔

بعد ازاں حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے غزوہ حنین اور پھر محاصرہ طائف میں شرکت کی، جس میں ان کی ایک آنکھ بھی جاتی رہی۔ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ قریش کے بعد سیادت عرب کا دعویٰ ہوازن اور ثقیف کے ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کا محاصرہ اٹھا کر مراجعت فرمائی اور جعرانہ کے مقام پر غزوہ حنین وطائف کا مال غنیمت تقسیم فرمایا۔ اس موقع پر مکہ کے اکثر نومسلم روسا جن میں ابوسفیان پیش پیش تھے مولفۃ القلوب کے طور پر بڑے گرانقدر عطیات مرحمت فرمائے۔ جب اہل طائف نے ہتھیار ڈالے تو حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے کہ جس کہ اس شہر سے مراسم تھے اللات کا بت توڑنے میں مدد دی۔ روایت ہے کہ انہیں نجرات اور شاید حجاز کا بھی والی مقرر کیا گیا تھا۔ مگر اس کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ تقرر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بعد کے زمانے میں وہ جنگ یرموک (636ء) میں حاضر وشامل تھے۔ اس جنگ میں ان کی دوسری آنکھ بھی جاتی رہی۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے 32ھ/653ء میں وفات پائی تھی۔ اس وقت ان کی عمر 88 سال کے لگ بھگ تھی۔ ان کے بیٹوں میں سے یزید بن ابوسفیان نے فلسطین میں ایک مسلمان سپہ سالار کی حیثیت سے وفات پائی۔ جبکہ دوسرے بیٹے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے خلافت بنوامیہ کی بنیاد رکھی تھی۔

حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ (568ء-653ء)

عم محترم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ایک جلیل القدر صحابی اور خلفائے بنوعباس کے جد اعلیٰ

نسب اشرف: العباس بن عبدالمطلب، کنیت ابوالفضل، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا۔ آپ صلی اللہ علیہ

وسلم کے والد بزرگوار (حضرت عبداللہ) کے سوتیلے بھائی ان کی والدہ قبیلہ النمر کی نُتیلہ بنت جناب تھیں۔ خاندان عباسیہ، جو ان کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد سے ہے انہیں کے نام سے منسوب ہے۔ عہد عباسیہ کے مورخین ان کی بے حد تکریم و تعظیم کرتے تھے اور اسی بنا پر ان کے حالات زندگی کے بارے میں شدت عقیدت کا اظہار کرتے تھے۔

تجارت: حضرت عباس تاجر تھے اور تجارت کرتے تھے اور اپنے سوتیلے بھائی حضرت ابوطالب سے زیادہ خوشحال تھے۔ حضرت ابوطالب ایک قرض کی ادائیگی یوں کی کہ حاجیوں کو پانی پلانے (سقایہ) اور کھانا کھلانے (رفادہ) کا منصب بھی انہیں تفویض کر دیا تھا۔ اگرچہ الطائف میں ان کا ایک باغ بھی تھا۔ پھر بھی دولت و ثروت میں وہ قبائل عبد شمس (بنوامیہ) اور بنومخزوم کے سرکردہ لوگوں کے ہمسر نہیں تھے۔

قد و قامت: حضرت عباس رضی اللہ عنہ بڑے قد آور، بارعب، عقلمند اور حسین و جمیل انسان تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی تعظیم کرتے اور ہمیشہ تکریم سے پیش آتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف تین برس پہلے پیدا ہوئے تھے۔ بنو ہاشم کے بیکسوں محتاجوں اور غریبوں کے لیے روٹی، کپڑا اور دیگر ضروریات کی فراہمی اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ بعض روایات سے معلوم دیتا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمیشہ حمایت کی تھی۔ ایک روایت یہ ہے کہ انہوں نے عقبہ کے اجتماع میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کی تھی اور اہل مدینہ کو بتایا تھا کہ اگر تم اپنے بال بچوں سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کر سکو تو اُنہیں مدینہ آنے کی دعوت دو۔ حضرت عباس جنگ بدر میں قریش کی طرف سے بہ امر مجبوری لڑے، قید ہو گئے، لیکن بعد ازاں رہا کر دیئے گئے۔ انہوں نے 8ھ میں فتح مکہ کے موقع پر کھلم کھلا اسلام کا اظہار کیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرط مسرت سے ان کی پذیرائی کی اور فتح مکہ کے بعد سقایہ کا موروثی منصب انہیں کے پاس رہنے دیا۔ روایت ہے کہ انہوں نے غزوہ حنین میں نہایت پامردی کا ثبوت دیا اور اپنے گرجدار نعرے سے جنگ کا پانسا پلٹ دیا۔ بعد ازاں انہوں نے مدینہ منورہ میں اقامت اختیار کی اور غزوہ تبوک کے لیے مالی امداد دی تھی۔ بعض روایات کی رو سے انہوں نے فتوحاتِ شام میں حصہ لیا تھا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی توسیع کرنا چاہی تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اپنا مکان اس مقصد کے لیے ان کی نذر کر دیا۔ یہ بھی مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں فدک و خیبر کی پیداوار میں سے سالانہ حصہ دیا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعد ازاں وظائف کی فہرست پر نظر ثانی کر کے انہیں اصحاب بدر کے برابر وظیفہ دیا تھا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا انتقال 32ھ میں بمطابق 653ء میں ہوا۔ اس وقت ان کی عمر 88 یا 86 سال تھی۔ ان کے نامور فرزند حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا مرتبہ صحابہ اور فقہا اور مفسرین مدینہ میں بہت بلند تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ کی ابتدائی تجاویز میں وہ شامل تھے۔

لوگوں نے بیان کیا ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب کی اولاد میں حضرت فضل ان کے سب سے بڑے بیٹے تھے، انہیں کے نام پر ان کی کنیت تھی۔ وہ خوبصورت تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے دوران انہیں اپنے اونٹ پر ہم نشین بنا لیا تھا۔ شام طاعون عمواس پھیلنے سے ان کی وفات ہوئی تھی۔

حضرت عباس کے بیٹوں میں حضرت عبیداللہ بڑے سخی اور مالدار تھے۔ ان کی وفات مدینہ میں ہوئی تھی۔

حضرت عباس کے چوتھے بیٹے عبدالرحمٰن کی وفات شام میں ہوئی۔

حضرت قثم، حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے پانچویں بیٹے تھے۔ یہ شکل و شمائل میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہت رکھتے تھے۔ مجاہد بن کر خراسان گئے تھے، سمرقند میں وفات پائی۔

ان کی ایک بیٹی ام حبیبہ بنت عباس تھیں۔

ان سب کی والدہ ام الفضل تھیں جو لبابۃ الکبریٰ بنت حارث بن حزن بن بجیرہ بن الھزم تھیں۔
حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی اولاد ام الفضل کے علاوہ دوسری بیویوں سے بھی اولاد تھی۔
حضرت عباس رضی اللہ عنہ بدر کے قیدیوں میں: بدر کے قیدیوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ جس رات یہ قید ہوئے اس رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جاگتے رہے۔ بعض اصحاب نے پوچھا یا نبی اللہ! آپ کو کیا چیز جگا رہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''عباس کی آہ'' ایک صحابی اٹھے اور انہوں نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی بیڑیاں ڈھیلی کردیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا بات ہے اب میں عباس کی آہ نہیں سنتا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ماجرا سنایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ سب قیدیوں سے یہی سلوک کرو۔
حضرت عباس رضی اللہ عنہ دیگر قیدیوں کے ساتھ مدینہ منورہ لائے گئے تو ان ان کے لیے ایک کرتہ بطور لباس درکار تھا۔ لوگوں کو پورے مدینہ میں ان کی پیائش کے مطابق کوئی کرتا نہ ملا، سوائے عبداللہ بن ابی کے کرتے کے جو انہوں نے اپنے والد کو پہنایا تھا اور ان کے پاس تھا۔ عبداللہ بن ابی نے یہ کرتا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔ جب عبداللہ بن ابی کی وفات ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا یہ احسان اسے اپنا کرتا مرحمت فرما کر ادا کیا تھا۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ (577ء تا 663ء)

نامور صحابی، سپہ سالار، فاتح مصر اور عرب سیاست اور ذہانت کے امین

نام ونسب: حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، السہمی، القریشی النسب صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ تاریخ اسلام میں ان کے حصے کا آغاز اس وقت سے ہوا جب 8ھ/ 629ء میں مشرف با اسلام ہوئے۔ اس وقت وہ بالضرور ایک ادھیڑ عمر کے انسان تھے۔ کیونکہ اپنی وفات کے وقت جو 42ھ/ 663ء میں ہوئی ان کی عمر 90 سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ وہ اپنے زمانے کے سیاست دانوں میں سے ایک مدبر سیاستدان تھے۔ اہل مکہ میں سے جو اہل نظر تھے انہوں نے غزوہ احزاب میں مدینہ منورہ کے محاصرہ میں ناکام ہوجانے کے بعد سے ہی اسلام کی حقانیت پر غور کرنا شروع کردیا تھا اور اسلام کی صداقت اور سچائی پر انہیں یقین ہوگیا تھا۔ اس لیے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن ا[illegible] رضی اللہ عنہ جیسے مدبر انسان نے اسلام کے دامن میں پناہ لی۔ بعض روایات کے مطابق حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ [illegible] ملک حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے زیر اثر اسلام لائے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر ہدایت اپنی خدمات کا آغاز کردیا تھا۔ بعض چھوٹے چھوٹے معرکوں میں بھیجنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو عمان روانہ کیا اور وہاں پہنچ کر انہوں نے دو بھائیوں، جیفر اور عباد بن جلندی (الارذی) سے جو وہاں کے حاکم تھے سلسلہ گفت وشنید کا آغاز کیا۔ چنانچہ وہ دونوں جلد ہی دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے۔ عمان پہنچنے کے بعد حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو دوبارہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دوبارہ دیکھنا نصیب نہ ہوسکا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر انہیں عمان ہی میں ملی اور وہ اسے سن کر مدینہ آئے، لیکن انہیں وہاں زیادہ عرصہ ٹھہرنا نصیب نہ ہوا۔ غالباً 12ھ/ 633ء میں خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں فوج دے کر فلسطین بھیج دیا۔ فتح شام کے متعلق بیانات اگرچہ کچھ مبہم ہیں، لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اس کاروائی میں حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے بہت نمایاں طور پر حصہ لیا تھا۔ دریائے اردن کے مغرب کے علاقے کی تسخیر بالخصوص انہیں کا کارنامہ تھا، اور وہ جنگ اجنادین اور یرموک اور فتح دمشق کی عسکری مہمات میں بھی شریک تھے۔
پھر بھی ان کی شہرت کی اصل وجہ ان کی فتح مصر ہے۔ بعض ماخذ کی رو سے وہ اپنی فوج لے کر اپنی ذمہ داری پر مصر

گئے تھے، لیکن زیادہ امکان یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس مہم کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ اس کا بھی امکان ہے کہ یہ کام انہیں کے حکم پر کیا گیا ہو۔ اس میں تو شک نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے حضرت الزبیر کی قیادت میں کمک بھیجی تھی۔ 18ھ/ 640ء کے موسم گرما میں یونانیوں یا بازنطینیوں کو مصر میں شکست ہوئی۔ 641ء میں بابلیون پر عربوں کا قبضہ ہوگیا۔ 642ء میں اسکندریہ ان کے زیر اثر آ گیا۔ لیکن حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا کارنامہ فقط مصر کی فتح ہی نہیں۔ بلکہ انہوں نے اس کے نظام حکومت، محکمہ عدل و انصاف کے نظم و نسق اور محاصل عائد کرنے کے قواعد وضوابط بھی مقرر کیے۔ فسطاط کی بنیاد انہیں نے رکھی تھی۔ جو بعد میں چوتھی صدی میں قاہرہ کہلایا۔

خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت کے آغاز میں جب حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو ان کے عہدے سے معزول کر کے ان کی جگہ عبداللہ بن سعد بن ابی رباح کو والی مصر مقرر کیا تو یہ ضرور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جیسے شخص کو ناگوار گذرا ہوگا۔ چنانچہ ناراضگی کے اظہار کے طور پر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کاروبار حکومت سے کنارہ کش ہوگئے۔ لیکن پھر وہ ایک مدبر انسان تھے کہ جب مصر میں اور دیگر جگہوں پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے فضا مکدر ہوگئی تو بھی حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے یہ تدبیر اختیار کی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دشمنوں سے بالکل الگ رہے۔ اس فتنے کے دران میں وہ مکہ مکرمہ میں قیام پذیر رہے۔ جب جنگ جمل ختم ہوئی تو میدان خلافت میں دو امیدوار مدمقابل آ گئے۔ یہ تھے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ۔ نہ صرف اس وقت حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ دوبارہ میدان عمل میں اتر آئے بلکہ انہوں نے کھلم کھلا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حمایت کا اعلان کیا اور ان کا ساتھ دیا۔ معرکہ صفین میں وہ شامی فوج کے سالار تھے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فتح ہوتی ہوئی نظر آئی تو حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی ذہانت نے وہ حیلہ تراشا کہ شامی فوج نیزوں پر قرآن باندھ کر میدان میں اتری اور وہ نعرہ بلند کیا کہ اب ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ قرآن کریم کرے گا۔ ان کی یہ تدبیر کام کر گئی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بہت سے ساتھی ان کا حکم نہ ماننے پر خارجی بن گئے۔ ادھر یہ فیصلہ کن جنگ ایک غیر فیصلہ کن لڑائی میں بدل گئی۔ اس کے بعد دونوں فریق تحکیم پر متفق ہوگئے اور اس کے لیے دو حکم حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ مقرر ہوئے۔ فیصلہ کے لیے مقررہ دن کے آنے سے پہلے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں یہ اہم اقدام کیا کہ مصر پر قبضہ کر کے اسے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے علاقے میں شامل کرلیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے اس وقت والئ مصر اس وقت محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ تھے۔ ایک نوجوان شخص کو زیر کرلینا حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جیسے زیرک انسان کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ انہوں نے نہ صرف محمد بن ابی بکر کو شکست دی بلکہ قتل بھی کردیا۔

اسی سال میں شعبان کے مہینے میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اذرح روناہ ہوئے تاکہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر حکم کے فرائض ادا کریں۔ (الطبری) یہاں بھی انہوں نے اپنی سیاسی بصیرت سے کام لیا اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی سادگی سے فائدہ اٹھایا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ نے اٹھ کر اعلان کیا کہ وہ معاویہ رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ کو خلافت کے منصب اعلیٰ کے لیے نااہل سمجھتے ہیں ادھر دوسرے حکم یعنی حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ میرے فاضل دوست اپنے موکل کو خلافت کے لیے نااہل سمجھتے ہیں جبکہ میں اپنے موکل (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ) کو خلافت کا اہل سمجھتا ہوں۔ اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے حق خلافت بھی انہیں کے حکم کی وجہ سے جاتا رہا، لیکن حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ الٹا حق خلافت حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی ذہانت کی وجہ سے ہاتھ آ گیا۔ اس کے بعد حضرت عمرو بن

العاص اپنی وفات تک حاکم مصر رہے۔ یہی ان کی خواہش تھی۔ 15 رمضان 40ھ/ 22 جنوری 661ء کو وہ اتفاقیہ طور پر زادویہ خارجی کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچ گئے جوان تین خارجیوں میں سے ایک تھا جنہوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا بیک وقت منصوبہ بنایا تھا۔ اتفاق سے جس دن زادویہ نے حملہ کرنا تھا حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ناسازی طبع کی وجہ سے مسجد میں نہ آ سکے۔ زادویہ نے ان کی جگہ امامت کرانے والے خارجہ بن حذافہ کو مہلک زخم لگایا۔ اپنا کام تمام کرنے کے بعد جب قاتل کو اصل حقیقت کا پتہ چلا تو اس نے کہا کہ اس کا ارادہ تو حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا تھا۔ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے اس کے تقریباً دو سال بعد وفات پائی۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ایک خوش گفتار مصاحب، شیریں بیان خطیب اور قادر الکلام مدبر اور سیاست دان تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عسکری مہمات میں ان پر بالکل اعتماد فرماتے تھے۔

مبلغین اسلام

وہ شہید و غازی جنہوں نے اپنی جانوں کے نذرانے تک دے کر اسلام کی تبلیغ جاری رکھی یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے......

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ (م۔625ء)
حضرت البراء بن معرور رضی اللہ عنہ (م۔ق ھ 622ء)
کازرونی شیخ مرشد ابو اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ (963ء تا 1034ء)
حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ (1885ء تا 1944ء)
ڈاکٹر ذاکر اے نائیک
حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ
حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ
شاہ محمد رمضان شہید رحمۃ اللہ علیہ (1796ء تا 1825ء)
حضرت مولانا الیاس قادری دامت برکاتہم العالیہ
مولانا طارق جمیل

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ (م 3ھ/625ء)

تاریخ اسلام میں پہلی نماز جمعہ پڑھانے والے
اور مدینہ منورہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھیجے گئے پہلے مبلغ اسلام

نام ونسب: حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ بن ہاشم بن عبد مناف بن عبد الدار بن قصی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مصعب الخیر کا لقب دیا تھا۔ ان کی کنیت ابو محمد تھی۔ قریش کے ایک خانوادے عبد الدار سے تعلق تھا اور دولتمند ماں باپ کے بیٹے تھے، اور ان کے مناسب وموزوں قد وقامت پر ہر ایک کی نظر پڑتی تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ وتلقین کا ان پر ایسا اثر ہوا کہ وہ اپنی معاشرتی وجاہت کو خیر باد کہہ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمزور اور معتوب پیروؤں کے زمرے میں شامل ہو گئے۔ روایات میں ان کی سابقہ ناز ونعمت کی زندگی اور بعد کے زمانے کی مفلوک الحالی کے تضاد کو بڑی شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ابراہیم نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ جوانی، خوبصورتی اور پیشانی کے بالوں میں مکہ کے نوجوانوں میں یکتا وبے مثال تھے۔ وہ اہل مکہ میں سب سے زیادہ عطر لگانے والے تھے اور حضرمی جوتے پہنتے تھے (طبقات ابن سعد)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کا ذکر کر کے فرماتے تھے کہ میں نے باریک کپڑے پہننے والا اور ناز ونعمت والا کسی کو نہیں دیکھا۔ جب حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دار ارقم میں انہیں اسلام کی دعوت دیتے ہیں تو وہ آئے اور اسلام لے آئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تصدیق کی اور روانہ ہو گئے مگر اپنے والدین سے

اپنے اسلام کو چھپایا اور خفیہ طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کا سلسلہ جاری رکھا۔ عثمان بن طلحہ نے انہیں نماز پڑھتے دیکھ لیا اور اُن کے والدین کو خبر کر دی جب اُن کے والدین کو خبر ہوئی تو انہوں نے انہیں مسلمانوں کی طرح عبادت کرنے سے روکا تو وہ کئی مسلمانوں کے ساتھ حبشہ کو ہجرت کر گئے۔ لیکن وہاں سے ہجرت مدینہ سے پہلے ہی واپس آ گئے اور ان کی ماں ان کو ملامت کرنے سے باز آ گئی۔

حضرت عروہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک روز ہم عمر بن عبدالعزیز کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، وہ مسجد بنا رہے تھے کہ مصعب بن عمیر آئے، ان کے جسم پر دھاری دار چادر کا ایک ٹکڑا تھا، اس میں چمڑے کا پیوند لگا تھا، اس کی انہوں نے آستین بنالی تھی۔ اصحاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھا تو رحم کی وجہ سے اپنے سر جھکا لیے۔ ان کے پاس کوئی اور چیز بھی نہیں تھی کہ جس سے وہ کپڑے بدل دیتے (یعنی وہ اتنے غریب ہو گئے تھے کہ نہ صرف ان کے امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ ختم ہو چکے تھے بلکہ پیوند لگانے کے لیے کپڑے کا ٹکڑا بھی ان کے پاس نہیں تھا) کل کا شاندار امیر زادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں آ کر درویشانہ زندگی کو فخر سمجھنے لگا تھا۔

حضرت مصعب رضی اللہ عنہ بن عمیر نے سلام کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا اور اچھی طرح ان پر اللہ کی ثناء کی اور فرمایا ''الحمدللہ'' دنیا کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور اپنے اہل کو بدل دے۔ میں نے انہیں (حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کو) دیکھا ہے کہ مکہ میں قریش کا کوئی نوجوان اپنے والدین کے پاس ان سے زیادہ ناز و نعم میں نہ تھا۔ انہیں اس سے خیر کی رغبت نے، جو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں تھی، نکال لیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کہ مندرجہ بالا سطور سے ظاہر ہے حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کی بڑی قدر کیا کرتے تھے اور عقبہ میں منعقد ہونے والی پہلی بیعت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اولین مبلغ اسلام کی حیثیت سے مدینہ منورہ بھیج دیا گویا وہ اسلام کے ہراول دستے کی حیثیت رکھتے تھے۔ مدینہ منورہ میں جہاں انہوں نے اپنی تبلیغ وسعی سے متعدد لوگوں کو حلقہ بگوش اسلام کیا۔ وہ وہاں نماز جمعہ کی امامت بھی کیا کرتے تھے اور ان کی غیر حاضری میں حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نماز جمعہ پڑھاتے تھے۔

جب انہوں نے مکہ سے مدینہ منورہ ہجرت کی تو وہ حضرت سعد بن معاذ کے ہاں ٹھہرے۔ ایک روایت میں ان کے حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے ہاں ٹھہرنے کا بھی آیا ہے۔ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ اسلام کی دعوت دیتے، قرآن پڑھ کر سناتے اس طرح ایک ایک دو دو آدمی مسلمان ہونے لگے اسلام ظاہر ہو گیا اور آہستہ آہستہ مدینہ منورہ اور اس کی مضافاتی بستیوں، (عوامی) میں پھیلنے لگا، اس پر انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھ کر اس امر کی اجازت طلب کی کہ وہ ان لوگوں کو نماز جمعہ پڑھائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت مرحمت فرمائی اور ساتھ ہی تحریر فرمایا کہ اس دن کو دیکھ لینا کہ جس دن یہود اپنے سبت (ہفتے) کی وجہ سے بلند آواز میں نماز پڑھتے ہیں۔ جب آفتاب ڈھل جائے تو اس وقت دو رکعت نماز سے اللہ کے قریب ہو جاؤ اور خطبہ پڑھو۔

حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے پہلی نماز جمعہ سعد بن خثیمہ کے مکان پر پڑھائی، وہ بارہ آدمی تھے اور اس روز کھانے کے لیے انہوں نے ایک بکری ذبح کی تھی۔ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ تاریخ اسلام میں پہلے آدمی ہیں جنہوں نے نماز جمعہ پڑھائی۔

عقبہ ثانیہ کے موقع پر حضرت مصعب رضی اللہ عنہ بن عمیر ان 70 انصار لوگوں کے ساتھ تھے جنہوں نے یہ بیعت کی تھی۔ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ مکہ میں سب سے پہلے بارگاہ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے اور اپنے گھر نہ گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انہوں نے مدینہ کے لوگوں کے تیزی سے اسلام قبول کرنے کی خبر دی۔ پھر اپنی والدہ کے پاس

گئے تو سب کو بتایا کہ وہ بھی اب دین اسلام پر ہیں۔

ہجرت کے بعد جنگ بدر و احد کے موقع پر انہوں نے بنو عبدالدار کے ایک تربیت یافتہ کی حیثیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علم برداری کے فرائض انجام دیئے اور علم اسلام کی مکمل حفاظت کی۔ جنگ احد میں حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے علم اٹھایا جب دیگر مسلمان ڈگمگا گئے تو حضرت مصعب رضی اللہ عنہ علم اسلام کو تھامے ثابت قدم رہے۔ ابن قمیہ مشرک آیا جو سوار تھا اس نے ان کے داہنے ہاتھ پر تلوار ماری اور اسے جسم سے علیحدہ کر دیا۔ ایسے میں حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کہہ رہے تھے "دعا محمد الا رسول قد...... من قبل الرسل" (محمد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ان سے پہلے بھی رسول ہو گذرے ہیں) اس کے بعد انہوں نے علم کو بائیں ہاتھ میں تھام لیا۔ ابن قمیہ نے بائیں ہاتھ پر بھی تلوار ماری اور اُسے بھی کاٹ دیا تو انہوں نے جھنڈا اپنے سینے سے لگا کر تھام لیا۔ وہ اب بھی وہی آیت تلاوت کر رہے تھے۔ اس کافر نے تیسری بار ان پر نیزے سے حملہ کیا اور نیزے کو ان کے جسم کے پار کر دیا۔ نیزہ ٹوٹ گیا اور حضرت مصعب رضی اللہ عنہ بھی گر پڑے۔ بنی عبدالدار کے دو آدمی بڑھے جو سویبط رضی اللہ عنہ بن سعد بن حرملہ اور ابوالروم رضی اللہ عنہ تھے۔

حضرت ابوالروم رضی اللہ عنہ نے ان سے یہ علم لے لیا۔ اور یہ علم برابر ان کے ہاتھ میں رہا۔ یہاں تک کہ وہ مسلمان ہو کر واپس ہوئے۔ اس طرح حضرت مصعب رضی اللہ عنہ جنگ احد میں بہادرانہ شہید ہوئے۔ انہوں نے اسلام کس والہانہ جذبے کے تحت قبول کیا تھا، وہ ان کے رویئے سے عیاں تھا۔ آخر دم تک وہ اسلام کے بول بالا کے لیے کوشاں رہے۔

حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ

12 نقبائے مدینہ میں سے ایک اور صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم

نام ونسب: حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ ابن سماک بن عتیک بن امری القیس بن زید بن عبدالاشہل، کنیت ابو یحییٰ اور ابوالحضیر تھی۔ ان کی والدہ ایک روایت کے مطابق ام اسید بن النعمان بن امری القیس تھیں۔

حضرت اُسید بن الحضیر زمانہ جاہلیت میں اپنے والد کے بعد اپنی قوم میں شریف ترین انسان تھے۔ بعد از اسلام وہ عقلائے اہل الرائے میں شمار ہوتے تھے۔ ایام جاہلیت میں بھی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ انہیں تیرنا اور تیر اندازی بھی آتی تھی۔ یہ سب خوبیاں حضرت اسید رضی اللہ عنہ میں جمع ہو گئی تھیں ایسے شخص کو جس میں یہ خوبیاں ہوں ایام جاہلیت میں کامل کہا جاتا تھا۔

واقد بن عمرو سے روایت ہے کہ حضرت اسید بن الحضیر رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن معاذ ایک ہی دن حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام لائے تھے۔

حضرت اسید رضی اللہ عنہ 70 دیگر انصار کے ساتھ بیعت عقبہ ثانی میں حاضر ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مدینہ منورہ کے لیے نامزد کیے جانے والے بارہ نقباء میں شامل کیا۔ پھر مواخات مدینہ کے موقع پر حضرت اسید رضی اللہ عنہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے اسلامی بھائی بنائے گئے۔

حضرت اسید رضی اللہ عنہ غزوہ بدر میں حاضر نہیں ہوئے تھے اور وہ اکابر اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو نقباء و غیر نقباء تھے بدر سے پیچھے رہ گئے تھے۔ ان کو گمان تک نہیں تھا کہ قریش والوں کے قافلہ تجارت کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ و قتال کی نوبت آئے گی۔ کیونکہ ان کے نزدیک رسول اللہ اور ان کے ساتھی محض قریش کا قافلہ تجارت روکنے کے لیے مدینہ منورہ سے نکلے تھے۔ پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر کی فتح کے بعد واپس مدینہ منورہ پہنچے

تو حضرت اسید رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ میرا گمان یہ تھا کہ وہ تجارتی قافلہ ہے اور نوبت جدال وقتال تک نہیں پہنچے گی۔ اگر میں خیال کرتا کہ وہ دشمن ہے تو کبھی پیچھے نہ رہتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے سچ کہا۔

حضرت اسید غزوہ احد میں شریک تھے اور اس روز انہیں سات زخم آئے تھے۔ جس وقت لوگ بھاگے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب اور ثابت قدم رہے۔ خندق اور تمام دیگر غزوات میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم سے روایت کی ہے کہ اسید بن الحضیر کیسے اچھے آدمی تھے۔ ابن مالک سے مروی ہے کہ حضرت اسید بن الحضیر اور حضرت عباد بن بشیر مہینے کی آخری تاریک رات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے دونوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے باتیں کرتے رہے یہاں تک کہ جب نکلے تو ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ راستے کی تاریکی کو دور کرنے کے لیے ان دونوں میں سے ایک کا عصا روشن ہو گیا۔ اس روشنی میں وہ چلتے رہے۔ جب راستہ جدا ہوا تو ان میں سے ہر ایک کا عصا اس کے لیے روشن ہو گیا جس کی روشنی میں اپنے گھروں کو چلے۔

حضرت بشیر بن یسار سے روایت ہے کہ حضرت اسید بن الحضیر اپنی قوم کی امامت کرتے تھے، بیمار ہو گئے تو انہوں نے بیٹھ کر نماز پڑھائی پھر لوگوں نے بھی ان کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھی۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت اسید بن الحضیر اپنی وفات کے وقت اپنے اوپر چار ہزار کا قرض چھوڑ گئے۔ ان کے مال سے ایک ہزار سالانہ آمدنی ہوتی تھی۔ لوگوں نے اس مال کو بیچنے کا ارادہ کیا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا انہوں نے قرض خواہوں کو بلا بھیجا اور کہا کہ آیا کہ تمہیں منظور ہے کہ تم لوگ ہر سال ایک ہزار وصول کرلو اور اپنا قرض چار سال میں وصول کرلو، ان لوگوں نے کہا ہاں اے امیر المومنین! یوں لوگ جائیداد فروخت کرنے سے باز رہے۔ (طبقات ابن سعد)

حضرت البراء رضی اللہ عنہ بن معرور

تحویل قبلہ سے پہلے مکہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے والے
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خزرجی صحابی اور 12 نقبائے مدینہ میں سے ایک

نام ونسب: حضرت البراء رضی اللہ عنہ بن معرور بن صخر، حضرت ابوبشر، الانصاری، الخزرجی، السلمی العقبی، النقیب۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی، متقی اور فاضل اور فقیہ۔ 622ء کے موسم حج کے موقع پر بہ مقام عقبی، مکہ جو بہتر انصار بارگاہ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرنے کے لیے حاضر ہوئے تھے۔ ان میں معمر ترین شخص، شیخ البراء رضی اللہ عنہ بن معروف الخزرجی کو خصوصی اہمیت حاصل تھی اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں سے یہ بیعت لینا چاہتے ہیں کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت اسی طرح کریں گے جیسے اپنی ازواج واولاد کی کرتے ہیں تو حضرت البراء نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ تھام لیا اور سب حاضرین کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا وعدہ کر کے معاہدے پر اثبات کی مہر ثبت کردی۔ اسی مجلس میں جو عقبہ ثانیہ کہلاتی ہے۔ یثرب کی نئی آبادی کے لیے بارہ نقیب (سردار) منتخب ہوئے اور اس موقع پر حضرت البراء رضی اللہ عنہ کو بنوسلمہ کا سردار مقرر کیا گیا۔

تاریخ اسلام میں ان کی شہرت اس واسطے سے بھی ہے کہ وہ تحویل قبلہ سے پہلے ہی مکہ معظمہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں روکا اور فرمایا کہ بیت المقدس ہی صحیح قبلہ ہے تو انہوں نے کہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کہا مان لیا لیکن بایں ہمہ بستر مرگ پر وصیت کی کہ ان کی میت کا رخ مکہ معظمہ کی طرف رکھا جائے۔

ان کی وفات ماہ صفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ سے ایک ماہ قبل مدینہ منورہ میں ہوئی۔ وہ قبلہ

رخ ہی مرے اور پہلے شخص تھے جو قبلہ رخ ہی اپنی وصیت کے مطابق دفن کیے گئے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی قبر پر جا کر ان کے لیے دعائے مغفرت کی۔ وفات سے پہلے انہوں نے اپنی جائیداد کا تیسرا حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام اپنی وصیت میں کر دیا تھا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے از راہِ کرم ان کے وارثوں کو واپس کر دیا۔ ان کے بیٹے حضرت بشر رضی اللہ عنہ بدری صحابی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بنوسلمہ کا سردار نامزد فرمایا تھا۔ غزوہ خیبر کے موقع پر انہی حجرت بشر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ زہریلا گوشت تناول کیا تھا جس کے باعث ان کی وفات ہوگئی تھی۔ البراء کے بھائی قیس رضی اللہ عنہ بن معرور بھی صحابی تھے، جو حدیبیہ میں شریک ہوئے تھے۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ عقبہ ثانیہ کے موقع پر حضرت البراء بن معرور رضی اللہ عنہ پہلے شخص تھے جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کلام کیا۔ حضرت البراء اس موقع پر کھڑے ہوئے اور اللہ کی حمد وثنا کی اور کہا کہ سب تعریفیں اسی اللہ کے لیے ہیں کہ جس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہمیں بزرگی بخشی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیں عطا کیا۔ ہم لوگ ان م یں سب سے پہلے ہوئے جنھوں نے قبول کیا اور ان میں سب سے آخر ہوئے جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت دی۔ ہم نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کی اور سنا اور فرمانبرداری کی۔ اے گروہ اوس وخزرج! اللہ نے اپنے دین سے تمہارا اکرام کیا ہے اگر تم نے فرمانبرداری کی اور اطاعت شعاری سے کام لیا اور شکر گذاری اختیار کی ہے تو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو۔ یہ کہہ کر وہ بیٹھ گئے مگر ان کی یہ باتیں انہیں خصوصی مقام کی اہل بنا گئیں۔ (طبقات ابن سعد حلاء) اردو دائرہ المعارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی مقالہ حضرت براء رضی اللہ عنہ بن معرور)

حضرت حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ

بیرِ معونہ کے حادثے میں شہید ہونے والے مبلغین میں سے ایک

نام ونسب: حرام بن ملحان کا نام طبقات ابن سعد میں کچھ یوں رہا ہے۔ مالک بن خالد بن زید بن حرام بن جندب بن عامر بن غنم ابن عدی بن النجار تھا۔ ان کی والدہ ملیکہ بنت مالک بن عدی بن زید تھیں۔ حرام بن ملحان بدر اور احد اور بیر معونہ میں شریک تھے۔ بیرِ معونہ میں جو ہجرت کے چھتیسویں مہینہ صفر میں ہوا شہید ہوئے۔ ان کی اولاد نہ تھی۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کچھ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہمارے ساتھ ایسے آدمیوں کو بھیج دیجئے جو ہمیں قرآن وحدیث کی تعلیم دیں اور معلم ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے 70 انصار صحابہ بھیج دیئے جو قاری کہلاتے تھے۔ انہیں 70 معلمین میں میرے ماموں حرام بھی شامل تھے۔ یہ لوگ قرآن پڑھتے اور باہم درس دیتے اور سیکھتے۔ دن کو پانی لا کر مسجد میں رکھتے، لکڑیاں جنگل سے چن کر لاتے اور بیچ کر اہل صفہ اور فقرا کے لیے غلہ خریدتے۔

قبیلہ کلاب کا رئیس ابو براء بن مالک مدینہ منورہ میں حاضر ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دعوت اسلام دی جسے اس نے قبول نہ کیا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ مسلمان مبلغین ومعلمین کی ایک جماعت اہل نجد کے ہاں بھیج دیجئے۔ مجھے امید ہے کہ ان کی تبلیغ سے وہاں ضرور اسلام پھیلے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ مجھے اپنے آدمیوں کے متعلق اہل نجد سے اندیشہ ہے۔ ابو براء نے کہا کہ میں ان کی ضمانت دیتا ہوں آپ نے اس کے اصرار پر جو 70 مبلغین کی جماعت تیار کی اس میں اکثریت اصحاب صفہ کی تھی۔ اس جماعت کے امیر حضرت منذر بن عمرو ساعدی رضی اللہ عنہ مقرر فرمائے گئے جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے خسر اور حضرت عاصم بن عمر رضی اللہ عنہ کے نانا تھے۔

نجد میں بیرِ معونہ کے مقام پر صحابہ کی اس مقدس جماعت نے قیام کیا۔ حضرت حرام بن ملحان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نامہ مبارک دے کر بنو عامر کے رئیس عامر بن طفیل کے پاس بھیجا تھا۔ وہ شقی القلب فرعون وقت، قاصد رسول

ابن ملحان کو دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے نہ تو نامہ مبارک کو کھولا اور نہ ہی پڑھا بلکہ سفارتی آداب کا لحاظ نہ کرتے ہوئے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا اس نے اس قاصد رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حرام رضی اللہ عنہ بن ملحان کو نیزہ مار کر شہید کر دیا۔ شہید ہوتے ہوئے حضرت حرام رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔

پھر عامر بن طفیل نے اپنے قبیلے کے لوگوں یعنی بنی عامر کو اس مقدس جماعت صحابہ کو شہید کرنے کا کہا، لیکن بنی عامر نے اس کا یہ حکم اس لیے ماننے سے انکار کر دیا کہ عامر بن طفیل کے چچا ابو براء نے مسلمانوں کو ضمانت دی تھی۔ ان سے مایوس ہو کر عامر بن طفیل نے بنو سلیم سے رجوع کیا اور ان کے قبائل عصیہ، رعل اور ذکوان کو لے کر مسلمانوں کی اس مختصری نہتی جماعت پر حملہ کر کے اسے شہید کر دیا۔ اس جماعت میں سے صرف دو افراد زندہ بچے۔ ایک حضرت کعب بن زید انصاری رضی اللہ عنہ اور دوسرے حضرت عمرو بن امیہ ضمری جن کو عامر بن طفیل نے یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ اس کی ماں نے قبیلہ ضمری کے کسی شخص کو آزاد کرنے کی منت مان رکھی تھی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اس حادثے کی خبر دی کہ وہ مسلمان اپنے پروردگار کو ملے وہ ان سے راضی ہوا اور اس نے انہیں راضی کر دیا۔

حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ

وہ عظیم مبلغ ومجاہد جن کی نعش کو شہد کی مکھیوں نے ڈھانپ لیا اور ایک سیلاب ساتھ بہا کر لے گیا

نام ونسب: حضرت عاصم رضی اللہ عنہ بن ثابت بن قیس۔ ان کی والدہ شموس بنت ابی عامر بن صیفی بن نعمان بن مالک تھیں۔ عاصم کی اولاد میں محمد تھے۔ مدینہ منورہ میں عقد مواخاۃ کے موقع پر حضرت عاصم رضی اللہ عنہ بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن جحش کے درمیان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رشتہ مواخاۃ قائم فرمایا تھا۔ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ غزوہ بدر واحد میں شریک تھے۔ غزوہ احد میں جب مسلمان بھاگے تو چند ایک ثابت قدم مجاہدین میں حضرت عاصم رضی اللہ عنہ بن ثابت بھی شامل تھے۔ وہ مسلسل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہم کاب رہے۔ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے موت پر بیعت کی تھی اور اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نامزد تیر اندازوں میں شامل تھے۔

غزوہ احد میں حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے مشرکین مکہ کے علمبرداروں میں سے حارث اور مسافع فرزندان طلحہ بن ابی طلحہ کو قتل کیا تھا۔ یاد رہے کہ طلحہ بن ابی طلحہ غزوہ احد میں قریش کا علمبردار تھا۔ اس کی بیوی سلافہ بنت سعد نے اپنے بیٹوں کے قتل کی وجہ سے منت مانی تھی کہ وہ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ بن ثابت کے کاسہ سر میں شراب پیئے گی اور اُن کا سر لانے والے کو 100 اونٹ اور بطور انعام دے گی۔ اس کے علاوہ مقتولین قریش کے اور گھرانے اور خاندان بھی اپنے مقتولوں کا بدلہ لینے کے لیے بے چین تھے۔ انہیں دنوں ایک دشمن اسلام خالد بن سفیان اہل مکہ کو ان کی نام نہاد فتح جنگ احد پر مبارک باد دینے کے لیے مکہ آیا۔ اس نے جب طلحہ بن ابی طلحہ کی بیوی سلافہ کی منت کے متعلق سنا تو اس لالچی شخص نے انعام کے لالچ میں حضرت عاصم رضی اللہ عنہ بن ثابت اور دوسرے مسلمانوں کو دھوکے سے گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ مگر ابھی اپنے منصوبے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا تھا کہ خود قتل ہو گیا، لیکن اس کے قبیلہ یعنی بنولحیان نے اس کے اس مکروہ منصوبے کو عملی جامہ پہنایا۔ بنولحیان خود تو اپنے ہاں مسلمان مبلغین کو مدعو نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے ہمسایہ قبیلے کے لوگوں سے ساز باز کر کے سات افراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھجوائے جنہوں نے درخواست کی کہ ہمارے لوگ اسلام کی طرف رجحان رکھتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم چند مسلمان مبلغین کو ہمارے ساتھ بھجوا دیں تا کہ وہ اپنی تبلیغ سے ہمارے لوگوں میں دین کا فہم پیدا کریں، قرآن پڑھائیں اور شریعت اسلامیہ کی تعلیم دیں۔ انہوں نے حضرت عاصم رضی اللہ عنہ بن ثابت کا نام خاص طور پر لیا

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ درخواست قبول فرمائی اور سات مسلمانوں کی ایک جماعت ان
کہ وہ ایک اچھے مبلغ ہیں۔ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ بن ثابت یا حضرت مرثد بن ابی مرثد کو مقرر کیا۔ دھوکے باز کفار
کے ہمراہ کر دی۔ اس جماعت کا امیر منازل طے کرتی ہوئی مسلمان مبلغین و معلمین کی یہ
نے اس اپنی اس کامیابی کی اطلاع بنولحیان کو خفیہ طور پر کر دی۔ جب مسلح بنولحیان کے افراد اس نہتی مبلغین کی جماعت
جماعت رجیع کے چشمے پر پہنچی جو عسفان اور مکے کے درمیان واقع ہے تو دفعتاً
تھی جن میں ایک سو تیر انداز بھی شامل تھے۔
پر جھپٹ پڑے۔ حملہ آوروں کی تعداد دو سو کے لگ بھگ مزاحمت و مقاومت کی، چار مبلغین شہید ہو گئے۔
مسلمانوں کی اس مختصر جماعت نے بڑے بہادرانہ انداز میں
تین سے امان دینے کا وعدہ کر کے دھوکہ باز کفار نے ہتھیار ڈلوا دیے اور انہیں گرفتار کر لیا۔ ان اصحاب ثلاثہ کے نام یہ ہیں۔
حضرت خبیب رضی اللہ عنہ بن عدی، حضرت زید رضی اللہ عنہ بن الدثنہ اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن طارق۔ جب مرا
الظہران کے مقام پر پہنچے تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن طارق نے خود کو کفار سے چھڑوا لیا لیکن دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ
تھی اس لیے انہوں نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔ کفار کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ کسی طرح حضرت
عاصم رضی اللہ عنہ بن ثابت کا سر کاٹ کر سلافہ سے سو اونٹ حاصل کریں، لیکن ان کی یہ آرزو داغ حسرت بن کر رہ گئی۔ پہلے تو
حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کی نعش پر شہد کی مکھیوں نے ہجوم کیا، جس کی وجہ سے کفار باوجود کوشش کے ان کے قریب نہ جا سکے۔ وہ
ابھی شہد کی مکھیوں کے اڑنے کے انتظار میں تھے کہ اچانک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی جو نعش کو نہ جانے کہاں بہا کر لے گئی۔
یوں کفار یہ حسرت اپنے دل میں لیے کہ وہ سو اونٹ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کے بریدہ سر کے عوض حاصل کریں، ناکام لوٹے۔
روایت ہے کہ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے اپنے اوپر یہ لازم کر لیا تھا کہ نہ وہ کسی مشرک کو چھوئیں گے اور نہ کوئی
مشرک ان کو چھو سکے گا۔ جب کفار سے جنگ شروع ہوئی تو حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے پہلے اتنی تیر اندازی کی تھی کہ ان کے
تیر ختم ہو گئے تھے۔ پھر انہوں نے نیزے سے جنگ لڑنا شروع کی تھی یہاں تک کہ وہ بھی ٹوٹ گیا اور صرف تلوار ان کے پاس
رہ گئی تھی۔ تب انہوں نے دعا کی تھی کہ "اے اللہ! میں نے ابتدائے روز میں تیرے دین کی حمایت کی لہٰذا تو میرے روز آخر
میں میرے گوشت کی حفاظت فرما۔" مشرکین ان کے ساتھیوں میں سے جسے قتل کرتے تھے اس کی کھال اتار لیتے تھے۔ انہوں
نے دوران جنگ دو مشرکوں کو شدید زخمی اور ایک کو قتل کر دیا، اس پر مشرکوں نے اتنی شدید نیزہ بازی کی ان کو آخر قتل کر دیا۔ مگر سر
کاٹنے میں ناکام ہو گئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کی آخری دعا قبول فرمائی تھی۔

کازرونی، شیخ مرشد ابواسحٰق (963ء تا 1034ء)

24000 آتش پرستوں اور یہودیوں کو مشرف با اسلام کرنے والے مبلغ اسلام

نام و نسب: شیخ مرشد ابواسحٰق ابراهیم بن شہریار کازرونی، ایران کے شہر کازرون جو شیراز سے 55 میل کے فاصلے
پر واقع ہے، کے بزرگ علما و صالحین میں سے تھے اور درویشوں کے ایک سلسلہ کے بانی جوان کے نام کی نسبت سے اسحٰقیہ یا
کازرونیہ کہلاتا ہے۔ کازرون میں (353ھ تا 426ھ/ 963ء تا 1034ء) بقید حیات رہے اور اسی شہر میں اپنی خانقاہ میں
مدفون ہیں۔ مستوفی کے زمانے میں ان کا مزار "حریم" تصور ہوتا تھا۔ وہ ایران کے ایک مجوسی خاندان سے تھے اور اس خاندان
میں ان کا والد پہلا شخص تھا جو مشرف بہ اسلام ہوا، شیخ کی ولادت ان کے والد کے اسلام لانے کے بعد ہوئی (نفحات الانس جامی)
جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد وہ اسلام کے ایک سرگرم مبلغ بنے اور بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے 24000
آتش پرستوں اور یہودیوں کو مشرف با اسلام کیا اور لاکھ مسلمانوں نے توبہ کر کے ان کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ ان کی
تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر ان کے سلسلے کے ارکان ہمیشہ سرگرم مبلغ رہے جو کفار کے خلاف جہاد اور غزاء کی تلقین کیا کرتے تھے۔

الخفیہ سلسلہ ایران سے ہوتا ہوا ہندوستان اور چین تک پھیل گیا، جہاں انہوں نے اپنی شاخیں قائم کرلیں۔ بالخصوص بندرگاہوں پر (مثلاً کالی کٹ اور زیتون میں) دوسری طرف یہ سلسلہ ترکی میں اناطولیہ تک آ پہنچا۔ جہاں بیان کیا جاتا ہے کہ بانی سلسلہ نے اپنی زندگی ہی میں اپنے پیروؤں کو جہاد کے لیے روانہ کیا تھا لیکن اس علاقے میں اس سلسلہ کی موجودگی کا پورا ثبوت چودھویں صدی ہی سے ملتا ہے۔ اپنے مجاہدانہ تبلیغی جوش و خروش کی وجہ سے الخفیہ سلسلے نے پندرھویں سدی میں سلطنت عثمانیہ کے معاملات میں لازمی طور پر نمایاں حصہ لیا ہوگا۔

ایک اطالوی سیاح سپنڈ یگینو SPANDUGINO نے سولہویں صدی کی ابتداء میں اپنے ایک رسالے میں اس سلسلے کو چار بڑے سلسلوں میں شمار کیا ہے۔ قدرتی طور پر اس کا نفوذ روم ایلی میں بھی ہوا ارض روم کے تکیہ حضرت اسحٰق کارزونی کا ذکر اولیا چلپی نے کیا ہے اور لکھا ہے کہ آناطولی سے یہ سلسلہ حلب پہنچا، بروسہ، قونیہ اور ارض روم میں اس سلسلے کے تکیے (ابواسحٰق خانے) موجود تھے۔ چودھویں صدی میں اس سلسلے کی تنظیم یقیناً اعلیٰ درجے کی ہوگی کیونکہ زاویہ شیخ کے خادم شیخ کی مہر لگا کر ضرورت مندوں کو ان لوگوں کے نام ہنڈیاCHEQUES دیا کرتے تھے جنہوں نے کازرونی سلسلے کا حلف اٹھایا ہوتا تھا۔ وصولی کے بعد وصول کنندہ امر کے پیچھے رسید درج کرتا تھا۔ شیخ کی تربیت کو ''تریاک اکبر'' کہا جاتا تھا اس لیے کہ آپ کی خاک مزار کے متعلق معتقدین (بالخصوص ملاحوں اور عطار) کا عقیدہ تھا کہ وہ حیرت انگیز نتائج پیدا کرتی ہے۔ سلطان شاہ رخ بن تیمور نے 808ھ/1916ء میں مزار شیخ کی زیارت نہایت عقیدت واحترام کے ساتھ کی تھی۔ ترکی میں الخفیہ نے اپنے آپ کو ایک نسبتاً متاخر سلسلے میں مدغم کردیا، لیکن عوام میں کازرونی سے عقیدت کے مظاہرے اب تک بھی کبھی کبھی دیکھنے میں آتے ہیں۔

شاہ محمد رمضان شہید ہریانوی (1769ء تا1825ء)

ہادی ہریانہ، برعظیم پاک وہند کے ایک عظیم مبلغ اور واعظ جس نے ہزاروں کو مسلمان کیا۔

نام ونسب: شاہ محمد رمضان شہید بن عبدالعظیم بن شاہ عبدالحکیم بن شاہ لطف اللہ الملقب بہ عطا محمد خاں سہ ہزاری نائب صوبیدار لاہور۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ ضلع رھتک کے ضلع اور قصبہ مہم میں ماہ رمضان میں پیدا ہوئے۔ نام سے سال پیدائش نکلتا ہے۔ ان کا صدیقی خانوادہ رھتک اور مہم کے قلعوں میں رہتا تھا۔ ابوالفضل نے عہد اکبری میں ان قلعوں کو پختہ اینٹوں سے تعمیر کرایا تھا۔ ان کے جد اول زبدۃ الاولیا حضرت قاضی قوام الدین سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کے خلفاء میں سے تھے اور رہتک کے قاضی کے طور پر ان کا تقرر اس علاقے میں ہوا تھا۔

شاہ محمد رمضان نے قرآن شریف اور فقہ کی چند کتابیں اپنی والدہ سے پڑھ کر حضرت شاہ عبدالقادر دھلوی کے حلقہ درس میں شمولیت اختیار کی اور چودہ سال 1783ء تا1796ء علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل کی۔ وہ ہفتے میں دوبار حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے استفادہ کرتے تھے۔ اور ان سے حضرت شاہ ولی اللہ کی قول الجمیل اور کتاب الانتباہ پڑھ کر ان کی اجازت پائی اور ہادی ہریانہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ شریعت اور طریقت میں توازن اور طریقت کے مروجہ خانوادوں میں بیعت ان کا شعار رہا۔ ان کے ہاتھ پر ان کی تبلیغ سے غیر مسلموں کی ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا۔ ''صاحب نقیب الاولیاء لکھتے ہیں کہ ''ھریانہ، میوات اور سوتر میں ہزاروں غیر مسلم ان کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور بلا مبالغہ لاکھوں نے کفر وشرک سے ان کے ہاتھ پر توبۃ النصوح کی۔ انہوں نے اسلامی شعائر بالخصوص ذبیحہ گاؤ کی ترویج کی اور مسلم راجپوتوں سے مشرکانہ رسوک ترک کرائیں۔ ان کے نام اور لباس ہندوانہ ہوتے تھے۔ ان کے لیے اسلامی نام اور مسلمانوں کی وضع قطع کے لباس تجویز فرمائے۔

شاہ محمد رمضان شہید سال کے بیشتر حصے میں اپنے درویشوں کے ساتھ مختلف علاقوں کے تبلیغی دورے کیا کرتے تھے۔ان کی درویشوں کی جماعت میں عالم، حافظ اور قاری حضرات شامل ہوتے تھے اور نومسلموں کو بھی تالیف قلب کے لیے اپنی جماعت میں شامل رکھتے تھے۔نومسلموں میں ایک فرانسیسی نوجوان بھی شامل تھا جو ان کے ہاتھ پر اسلام لایا تھا۔اکثریت مسلم راجپوتوں کی تھی۔شاہ صاحب جس گاؤں میں جاتے وہاں اگر مسجد نہ ہوتی تو تعمیر کرا دیتے تھے اور اس کی تعمیر میں بعض اوقات خود بھی حصہ لیتے تھے۔

انہوں نے چند کتابیں بھی تصنیف کیں اور ہریانوی نظم کو بھی وسیلہ اظہار بنایا۔ان کی تصانیف میں ''عقاید عظیم'' وصیت نامہ، فتاوی محمدی وغیرہ بہت اہم ہیں۔

1824ء میں اپنے مخلصین کے ساتھ حج پر بھی گئے۔راستے میں ہر جگہ وعظ و تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا۔مندسور میں ان کے واعظ سے چند بوھرے بہت متاثر ہوئے۔حج سے واپسی پر جب مندسور واپس آئے تو بوھروں کے چالیس رفقا نے 18 جمادی الاولی 1240ھ/ 8 جنوری 1825ء کو انہیں مسجد میں شہید کر دیا۔ان کا مزار قصبہ مہم میں ہے۔

ان کی وفات کے بعد بھی ان کی اصلاحی تحریک جاری رہی۔1857ء کی جنگ آزادی میں بھی ان کے متبعین نے حصہ لیا، ضلع رھتک کے 1910 کے گزیٹیئر میں اس کا ذکر موجود ہے۔سرکاری اہتمام سے لکھی ہوئی تاریخ ضلع رھتک میں باغیوں کے سرغنہ کا نام حضرت مولوی شاہ محمد اسماعیل صدیقی شہید بتایا گیا ہے جو''ہادی ہریانہ'' کے چھوٹے بھائی تھے۔(دائرۃ المعارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی)

مولانا محمد الیاس (1885ء تا 1944ء)

ہندوستان کے مشہور عالم اور تحریک تبلیغی جماعت کے بانی

نام ونسب: مولانا محمد الیاس، حافظ محمد اسمٰعیل صدیقی جھنجانوی کے صاحبزادے تھے اور 1303ھ/ 1885ء میں پیدا ہوئے۔تاریخی نام اختر الیاس تھا۔والدہ بی صفیہ مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، خلیفہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، (بعد ازاں انہوں نے حضرت سید احمد شہید سے بھی بیعت کی تھی)۔بی صفیہ حافظ قرآن تھیں اور عابد و زاہد، متبع سنت اور تقویٰ شعار گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔

مولانا محمد الیاس کے والد مولانا محمد اسمٰعیل دھلی کے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے سمدھیانے میں شاہی قلعہ میں بچوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔1857ء کے بعد وہ بستی نظام الدین اولیاء میں بنگلہ والی مسجد میں (جو واعظ و تبلیغ کا مرکز تھی) رہنے لگے اور اسی مسجد میں انہوں نے بقیہ زندگی گزار دی۔اور وفات کے بعد اسی مسجد کے جنوب مشرقی گوشے میں مدفون ہوئے۔مسجد کے اطراف میں جو مسلمان آباد تھے وہ مولانا محمد اسمٰعیل کے فیض و برکات سے مستفید ہوتے رہتے تھے۔مولانا کی پہلی بیوی سے مولانا محمد تھے، جنہوں نے اپنے والد کے بعد بہت کچھ دینی خدمات انجام دیں۔اصلاح میوات کا کام انہیں نے شروع کیا تھا۔اس سے پہلے مولانا محمد اسمٰعیل بھی میوات میں اصلاحی کام کرتے تھے۔

مولانا محمد الیاس نے خاندانی دستور کے مطابق بچپن ہی میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا اور ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ فارسی کی تحصیل بھی کی۔شوال 1311ھ میں ان کے بھائی مولانا محمد یحییٰ مولانا رشید احمد گنگوہی کی خدمت میں گنگوہ چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کی۔وہ مولانا الیاس کو بھی ساتھ لے گئے اور ان کو پڑھانا شروع کر دیا۔گنگوہ اس وقت صلحا و فضلا کا مرکز تھا۔تقریباً دس برس تک ان کو مولانا رشید احمد گنگوہی کی صحبت اور مجالس کی شرکت شب و روز حاصل رہی۔اس دینی ماحول نے بھی ان کی آئندہ زندگی پر بڑا اثر مرتب کیا۔مولانا گنگوہی بالعموم بچوں اور طلبا سے بیعت نہیں کرتے تھے، لیکن

محمد الیاس کی ذہانت اوران کے غیر معمولی حالات کی بناپرانہوں نے انہیں بیعت کیا۔

1326ھ میں مولانا محمد الیاس دارالعلوم دیو بند میں شیخ الہند حضرت مولانا محمد الحسن کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور صحیح بخاری اور جامع ترمذی شریف کی سماعت کی۔ اس کے کئی سال بعد شب وروز کی مسلسل محنت کے ساتھ اپنے بھائی محمد یحیٰ سے دورہ حدیث مکمل کیا۔ مولانا گنگوہی کی وفات کے بعد انہوں نے شیخ الہند سے تجدید بیعت کی درخواست کی۔ شیخ الہند نے مولانا خلیل احمد انبیٹھوی شارح ابوداؤد سے بیعت ہونے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ ان سے تعلق قائم کرکے منازل سلوک طے کیں۔ مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور میں مدرس رہے۔ پھر اپنے بڑے بھائی مولانا محمد کے انتقال کے بعد واپس بستی نظام الدین اولیاد ہلی آنا پڑا اور وہاں حدیث کا درس دینے پر مامور ہوئے۔

مولانا محمد الیاس نے تین بار حج کی سعادت حاصل کی۔ 1924ء میں جب ہندوؤں کی شدھی تحریک نے زور پکڑا توانہوں نے میوات کے علاقے میں اصلاح کا کام شروع کر دیا۔ میوات میں انہوں نے میلوں پیدل چل کر اور کبھی بیل گاڑی میں بیٹھ کر سالہاسال تبلیغی دورے کیے اور جگہ جگہ مسجدوں اور مکتبوں میں واعظ کا سلسلہ جاری رکھا، لوگوں سے ملے انہیں دین کی طرف راغب کیا، کلمہ سکھایا اور اس کا مفہوم بتایا جو اہل نظر آئے ان کو ذکر وفکر کی تلقین کی۔ میوات کے بعد انہوں نے دہلی اور یو پی میں بھی دینی تحریک کو عام کرنے کی کوشش کی۔ پنجاب کے بہت سے مقامات پر تبلیغی جماعتیں بھیجیں اور خود بھی بڑی بڑی جماعتوں کے ساتھ یو۔ پی کے علاقے میں تشریف لے گئے۔ ان کو سواحل ہند پر تبلیغی کام کرنے کی بڑی خواہش تھی چنانچہ انہوں نے دومرتبہ خصوصی طور پر کراچی بھی تبلیغی وفود بھیجے۔ انہوں نے عبادات، علم وذکر، اخلاص اور اکرام مسلم پر بہت زور دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر طبقے اور ہر گروہ کے مسلمان تبلیغی جماعتیں بنا کر نکلیں۔ ان کے نزدیک کچھ عرصہ کے لیے اپنے ماحول سے نکلنا مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کو سنوارنے اور آخری زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے ضروری تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک واضح طریق کار اور نظام کار تیار کیا جس کے عملی نمونے انہوں نے اپنے فیض یافتگان اور صحبت یافتگان کے سامنے پیش کیے۔ اس طریقے پر کام کے عرصہ میں میوات اور بیرون میوات میں لاکھوں افراد پر مشتمل ایک صالح اور دیندار معاشرہ تشکیل پا گیا۔ 21 رجب 1363ھ/ 14 جولائی 1944ء کی رات مولانا الیاس صاحب نے وفات پائی اور بستی نظام الدین اولیاء میں اپنے والد اور بھائی کے پہلو میں دفن ہوئے۔

ان کے بعد ان کے فرزند مولانا محمد یوسف اپنے والد کے جانشین ثابت ہوئے اورانہوں نے دعوتی کام کی رفتار کو تیز سے تیز کرنے کی کوششیں کیں اور تحریک تبلیغی جماعت کو عالم اسلام کے گوشے گوشے تک پہنچانے کی سعی کی۔ مولانا الیاس کے خلیفہ یہ تھے۔ حضرت مولانا یوسف، حضرت مولانا حافظ مقبول احمد گنگوہی، مولانا سید رضا حسن نیر، حضرت سید احمد شہید، قاری محمد داؤد وغیرہ۔

مولانا محمد الیاس قادری

وہ مبلغ اسلام جس نے بیسویں صدی کے آخری عشروں میں فرائض وواجبات کی ادائیگی
اورسنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر زور دیا

نام ونسب: محمد الیاس قادری ایک مسلم مبلغ اور عالم دین ہیں جنہوں نے دعوت اسلامی کی بنیاد رکھی۔ محمد الیاس قادری 26 رمضان المبارک 1369ھ/12 جولائی 1950ء کو پاکستان کے شہر اوراس وقت کے دارالحکومت کراچی میں پیدا ہوئے۔

آباؤاجداد: آپ کے آباؤاجداد ھند کے گاؤں کتیاں کے رہنے والے تھے۔ آپ کا تعلق کتیاں میمن برادری سے

ہے۔ آپ کے دادا کی نیک نامی کی شہرت پورے کتیاں میں پھیلی ہوئی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد آپ کے والدین ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور شہر حیدرآباد سندھ میں سکونت اختیار کی۔ آپ کے والد کا نام حاجی عبدالرحمٰن تھا جو ایک نیک اور پارسا انسان تھے۔ انہوں نے سری لنکا کی حنفی میمن مسجد کی بہت سال تک خدمت کی وہاں اس وقت لوگوں نے آپ کی قصیدہ غوثیہ پڑھتے ہوئے کرامات بھی دیکھی۔ مولانا الیاس قادری کے والد گرامی 1950ء میں ادائیگی حج کے دوران بیماری کی وجہ سے وفات پا گئے تھے۔ اس وقت مولانا کی عمر صرف ایک سال تھی۔ آپ کے بڑے بھائی اور والدہ نے بالترتیب 1396ھ/ 1977ء اور 1398ء، 1979ء میں وفات پائی۔

ابتدائی تعلیم: آپ نے کسی مدرسہ یا دارالعلوم سے باقاعدہ تعلیم دین حاصل نہیں کی بلکہ مفتی اعظم پاکستان مفتی وقارالدین کی خدمت میں 22 سال مسلسل حاضر ہوتے رہے۔ مفتی مرحوم سے کتنا علم حاصل کیا اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ علامہ الیاس قادری پوری دنیا میں ان کے واحد خلیفہ ہیں۔ 1981ء میں جب علماء کرام اہلسنت کی دینی اصلاحی تنظیم بنانے کے لیے تگ ودو کر رہے تھے۔ اس وقت بھی مفتی وقارالدین نے آپ کا نام اس کام کے لیے پیش کیا۔ کیونکہ الیاس قادری صاحب پہلے سے ہی خود اسی طرز پر کام کر رہے تھے۔

بیعت وارادت: امام احمد رضا خاں سے بے حد عقیدت کی بنا پر مولانا الیاس قادری کو آپ کے سلسلے میں داخل ہونے کا شوق پیدا ہوا۔ اس بارے میں خود لکھتے ہیں "کہ ایک ہی ہستی مرکز توجہ بنی، گو مشائخ اہل سنت کی کمی نہیں تھی مگر پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا۔ اس مقدس ہستی کا دامن تھام کر ایک ہی واسطے سے اعلیٰ حضرت سے نسبت قائم ہو جاتی تھی کہ براہ راست گنبد خضرا کا سایہ ان پر پڑ رہا تھا۔ اس مقدس ہستی سے میری مراد حضرت شیخ الفضیلت آفتاب رضویت، ضیائے الملت، مقتدائے اہل سنت، مرید وخلیفہ اعلیٰ حضرت، پیر طریقت، رہبر شریعت، شیخ العرب والعجم میزبان ومہمان مدینہ، قطب مدینہ حضرت علامہ مولانا ضیاالدین احمد مدنی قادری رضوی کی ذات گرامی ہے۔

القابات: پاک و ہند کے علماء وعوام میں آپ امیر اہلسنت کے لقب سے مشہور ہیں۔ مرید نام سے پہلے شیخ طریقت کا اضافہ کرتے ہیں۔ تبلیغ قرآن وسنت کی عالمگیر تحریک دعوت اسلامی کے بانی ہونے کی وجہ سے آپ کو بانی دعوت اسلامی بھی کہا جاتا ہے۔

تنظیم دعوت اسلامی کا قیام: آپ نے 1401ھ 1981ء میں دعوت اسلامی جیسی عظیم اور عالمگیر تحریک کے کام کا آغاز کیا۔ آپ کی کوششوں کے نتیجے میں مختصر سے عرصہ میں دعوت اسلامی کا پیغام دنیا کے 195 ملکوں میں پہنچ چکا ہے۔ مختلف ممالک میں یہ تنظیم کفار کو مشرف بہ اسلام کر رہی ہے اور لاکھوں مسلم نوجوانوں کی زندگیوں میں انقلاب بپا کر چکی ہے جس کی بدولت وہ فرائض وواجبات کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ سر پر سبز عمامہ اور چہرے پر سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق داڑھی رکھے ہوئے ہیں۔ دعوت اسلامی کے قیام سے لے کر اب تک مولانا الیاس قادری مسلسل اسلام کی تبلیغ میں مشغول ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر نائیک

وہ مبلغ اسلام کے جس کا شہرہ پوری دنیا میں ہے

نام ونسب: ڈاکٹر ذاکر نائیک ممبئی مہاراشٹر، ہندوستان کے رہنے والے ہیں۔ وہ 18 اکتوبر 1965ء میں ممبئی (بمبئی) ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ایک ہندوستانی اسلامی مبلغ ہیں جو مذاہب عالم کے تقابلی علم میں ایک اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں وہ ہندوستان کے بہت بااثر سلفی ماہر نظریات بھی ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک IRF اسلامی ریسرچ فاؤنڈیشن

ہندوستان کے بانی اور صدر ہیں اور انہوں نے PEACE TV چینل کا جو تقابلہ مذاہب عالم کے لیے مخصوص ہے، آغاز کیا تھا۔ اپنے اسی چینل کے ذریعے وہ دنیا کے 100 ملین لوگوں (ناظرین) سے خطاب کرتے ہیں۔ وہ دیگر اسلامی مبلغین سے مختلف انداز میں خطاب کرتے ہیں اور ان کا انداز خطاب گفتگو جیسا ہوتا ہے۔ وہ صرف انگریزی زبان میں گفتگو اور تقریر کرتے ہیں اور اردو یا عربی زبان میں گفتگو نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ وہ روایتی اسلامی یا ہندوستانی لباس پہننے کی بجائے ہمیشہ کوٹ اور پتلون میں ملبوس اور ٹائی لگائے ہوتے ہیں۔ ایک مبلغ بننے سے پہلے انہوں نے ٹوپی والا نیشنل میڈیکل کالج سے MBBS کی ڈگری حاصل کی تھی مگر پھر ایک مبلغ بن گئے۔ انہوں نے مذاہب عالم کے تقابلی جائزہ میں اور خود اسلام پر کئی مختصر رسالے شائع کیے ہیں۔ اگرچہ ڈاکٹر صاحب اسلام میں فرقہ پرستی کے خلاف ہیں اور اس پر سخت تنقید کرتے ہیں مگر لوگ انہیں سلفی نظریات کا حامل، انقلابی اسلامی وہابی ازم کا خصوصی نمائندہ سمجھتے ہیں۔

سوانح عمری: ڈاکٹر ذاکر نائیک نے کشن چند چیلارام کالج ممبئی سے ایف ایس سی اور پھر مزید طبی تعلیم ٹوپی والا میڈیکل کالج سے حاصل کی بعد ازاں ممبئی یونیورسٹی سے سرجری اور بیچلر آف میڈیسن کی ڈگریاں حاصل کیں، تاہم انہیں کسی اسلامی دارالعلوم سے استفادہ کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔

1991ء میں انہوں نے اسلام کی دعوت کے لیے کام کرنا شروع کر دیا اور اسلامی ریسرچ فاؤنڈیشن کی بنیاد رکھی۔ 2006ء میں ڈاکٹر ذاکر نائیک نے کہا تھا کہ وہ جنوبی افریقہ سے تعلق رکھنے والے ایک ہندوستانی گجراتی مبلغ احمد دیدات سے بہت متاثر ہیں اور 1987ء میں ان سے ملنے کا بھی انہیں شرف حاصل ہوا تھا۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب کبھی کبھی ''دیدات پلس'' DEEDAT PLUS بھی کہلاتے ہیں۔ یہ لقب انہیں خود ''احمد دیدات'' نے دیا تھا۔ ذاکر نائیک صاحب نے ممبئی میں ایک اسلامی بین الاقوامی اسکول بھی کھولا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک اور ادارہ یونائیٹڈ اسلامک ایڈ بھی چلاتے ہیں جو نادار مسلمان طالب علموں کو مالی امداد فراہم کرتا ہے۔ اسلامی ریسرچ فاؤنڈیشن کی ویب سائٹ ڈاکٹر ذاکر نائیک کو پیس ٹیلی ویژن نیٹ ورک کے پیچھے اُسے چلانے والی طاقت قرار دیتی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب کی بیوی فرحت نائیک اسلامی ریسرچ فاؤنڈیشن خواتین کے شعبہ کی منتظم ہیں۔

لیکچرز اور مناظرے: ڈاکٹر ذاکر نائیک نے دنیا کے مختلف ممالک میں لیکچر دیئے اور مباحثوں میں حصہ لیا ہے۔ ایک ماہر بشریات تھامس بلوم ہینسن نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر نائیک صاحب نے جس طرح قرآن اور حدیث سے مختلف زبانوں میں حوالے یاد کیے ہیں اور ان کا تبلیغی مشن انہیں اسلامی حلقوں میں مقبول بناتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب کے بہت سے لیکچرز اور مباحثے ریکارڈ کر کے دنیا بھر میں اون لائن اور DVD پر تقسیم کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ انگریزی زبان میں ان کے خطابات ممبئی میں کیبل نیٹ ورک پر بھی ہفتہ وار نشر کیے جاتے ہیں۔ اور پیس ٹیلی وژن انہیں پوری دنیا میں مصنوعی سیارے کے ذریعے ٹیلی کاسٹ کرتا ہے۔ جن موضوعات پر ڈاکٹر صاحب خصوصی طور پر خطاب کرتے ہیں وہ ''اسلام اور جدید سائنس''، ''اسلام اور عیسائیت''، ''اسلام اور سیکولرازم'' وغیرہ ہیں۔ ہندوستانی حکومت نے 2012ء میں پیس ٹیلی وژن کی نشریات پر پابندی عائد کر دی تھی۔ اس کے علاوہ نیویارک ٹائمز نے ایک گمنام ہندوستانی صحافی کے حوالے سے لکھا ہے کہ حالیہ سالوں میں انہیں ممبئی پولیس نے کئی کانفرنسوں کے انعقاد سے روک دیا ہے کیونکہ وہ اپنی کانفرنسوں میں مذہبی اختلافات اور تضادات کو ہوا دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ انڈین سیٹلائٹ سے نشریات پلے کرنے والے ادارے نے بھی پیس ٹیلی وژن کی نشریات کو براڈکاسٹ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اپریل 2000ء میں ڈاکٹر ذاکر نائیک نے شکاگو امریکہ میں ولیم کیمپ بیلی نامی پادری سے قرآن اور دی بائبل کے موضوع پر مباحثہ کیا تھا۔ جس میں بتایا گیا تھا کہ دونوں الہامی کتب سائنس کی روشنی

میں کیا بتاتی ہیں۔ یہ ان کے مباحثوں میں سب سے زیادہ مشہور مباحثہ ہے۔ 21 جنوری 2006ء میں ڈاکٹر نائیک نے بنگلور میں سری سری روی شنکر نامی ہندو عالم سے ''اسلام اور ہندوازم سے خدا کے وجود'' پر مباحثہ کیا۔ فروری 2011ء میں ڈاکٹر نائیک نے آکسفورڈ یونین سے ویڈیو کانفرنس کے ذریعے ہندوستان سے خطاب کیا۔ اس کے علاوہ 2007ء کے بعد سے ڈاکٹر صاحب ممبئی کے سومایا گراؤنڈ سیویون میں ایک دس روزہ امن کانفرنس منعقد کرتے ہیں جس میں ڈاکٹر صاحب کے علاوہ 20 اور مسلم اسکالر خطاب کرتے ہیں۔

2004ء میں ڈاکٹر نائیک صاحب نے اسلامک فاؤنڈیشن اینڈ سروسز نیٹ ورک آف آسٹریلیا کی دعوت پر یونیورسٹی آف ملبورن میں خطاب کیا اور دلائل دینے کے مذاہب عالم میں صرف اسلام خواتین کو مردوں کے برابر کی حیثیت دیتا ہے۔ اسی خطاب کیدوران انہوں نے کہا کہ مغربی لباس خواتین کے لیے اچھا نہیں ہے بلکہ یہ مردوں کو زنا کی ترغیب دیتا ہے۔

2010ء میں کینیڈا اور برطانیہ کی حکومتوں نے ڈاکٹر نائیک صاحب کو اپنے ملک کا ویزا دینے سے انکار کر دیا۔ ان کے متوقع لندن میں خطابات کی وجہ سے برطانیہ کی وزیر داخلہ کی سیکرٹری تھریسا مئی نے ان کے برطانیہ میں داخلے پر پابندی عائد کر دی۔ ان کے مطابق ڈاکٹر صاحب کے بہت تبصرے ایسے ہیں جن کو برداشت کرنا مشکل ہے۔ ادھر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ برطانیہ کی وزارت داخلہ کی سیکرٹری کا یہ فیصلہ غیر منصفانہ اور سیاسی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے وکیل نے ہوم سیکرٹری کے اس فیصلے کو ''وحشیانہ اور غیر انسانی'' قرار دیا۔ ہندوستانی فلم ساز مہیش بھٹ نے ڈاکٹر صاحب کی حمایت میں کہا کہ برطانوی حکومت کا یہ فیصلہ آزادی تحریر و تقریر کے خلاف ہے۔ اسی سال ڈاکٹر صاحب کو کینیڈا میں بھی داخل ہونے سے روک دیا گیا تھا۔

2012ء میں ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب نے ملائشیا میں چار لیکچر دیئے۔ ان کے یہ لیکچر جوہور باہرو JOHOR BAHRU یونیورسٹی میں دیئے گئے تھے۔

ڈاکٹر نائیک کے خیالات: ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ ان کا مقصد ان تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کی مذہبی حوصلہ افزائی کرنا ہے جو اپنے مذہب سے شرمندہ نظر آتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا مذہب فرسودہ ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ یہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے خلاف پھیلائی گئی غلط فہمیاں دور کرے۔ اور ستمبر 2001ء کے بعد سے مغربی میڈیا جو اسلام کے خلاف زہر اگل رہا ہے اس کے اثرات دور کیے جائیں۔ ڈاکٹر نائیک کے مطابق امریکہ میں اسلام کے خلاف پھیلائی گئی نفرت کے باوجود ان کے ہاتھ پر تقریباً 34000 امریکیوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ یہ صرف ستمبر 2001ء سے جولائی 2002ء تک ظہور پذیر ہوا تھا۔

اسامہ بن لادن پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے ایک ویڈیو میں کہا تھا۔ کہ وہ بن لادن پر تنقید نہیں کر سکتے کیونکہ وہ کبھی اس سے ملے نہیں اور نہ ہی اسے ذاتی طور پر جانتے تھے۔

کنیزیں اور خواتین غلام: ڈاکٹر نائیک نے علمائے اسلام کی تقلید کرتے ہوئے کنیزوں اور غلام خواتین کے ساتھ ان کے مالکوں کے جنسی تعلقات کو مباح قرار دیا ہے۔

انعامات اور اعزازات: ڈاکٹر ذاکر نائیک کو انڈین ایکسپریس کی فہرست میں 100 با اثر ہندوستانیوں میں سے 89 واں رینک دیا گیا ہے۔ یہ فہرست 2010ء میں شائع کی گئی تھی۔ ایک ہندوستانی خاتون پروین سوامی کے مطابق ڈاکٹر صاحب ہندوستان کے سب سے بڑے سلفی نظریہ کے حامل شخص ہیں۔ ان کے کچھ اعزازات مندرجہ ذیل دیئے جا رہے ہیں۔

دبئی انٹرنیشنل ہالی قرآن سوسائٹی نے انہیں 2013ء کی اسلامی شخصیت قرار دیا۔ 2013ء

ٹوکومال ہجرہ نامی تنظیم نے انہیں امتیازی اسلامی شخصیت کا ایوارڈ دیا۔ 2013ء

یونیورسٹی آف ری پبلک آف گیمبیا نے انہیں کمانڈر کا نشان دیا۔ 2014ء

سعودی عرب کے شاہ سلیمان بن عبدالعزیز نے انہیں شاہ فیصل ایوارڈ دیا۔ 2015ء

تنقید: دارالعلوم دیوبند کے علما نے ڈاکٹر ذاکر نائیک کے خلاف ان کے غیر اسلامی شعار پر فتویٰ دیا ہے اور انہیں سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

اسی طرح وال سٹریٹ جرنل کے نمائندے سدانند دھومے نے ڈاکٹر صاحب پر شدید تنقید صرف اس لیے کی ہے کہ انہوں نے ارتداد اور ہم جنس پرستی کی سزا موت قرار دی ہے۔ مزید یہ کہ ڈاکٹر صاحب انڈیا میں کو شرعی قوانین کا نفاذ چاہتے ہیں۔ اس لیے انہیں تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ دھومے نے ڈاکٹر صاحب پر اس لیے بھی تنقید کی ہے کہ وہ مسلمان ممالک میں غیر اسلامی عبادت گاہوں اور دیگر یادگاروں کے حق میں نہیں ہیں۔ ٹائمز آف انڈیا میں بھی ڈاکٹر صاحب کو ایک متنازعہ شخصیت قرار دیا ہے۔

مولانا طارق جمیل

نام: طارق جمیل یکم جنوری 1953ء کو پیدا ہوئے۔ وہ پاکستان میں مولانا طارق جمیل کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ایک مذہبی مبلغ اور اسلامی اسکالر ہیں۔ ان کا تعلق تلمبہ، میاں چنوں پنجاب سے ہے۔ وہ تبلیغی جماعت کے رکن ہیں اور ایک دیوبندی عالم ہیں۔ فیصل آباد میں وہ ایک مدرسہ چلاتے ہیں۔ مولانا طارق جمیل کو 14-2013ء کے ایڈیشن کتاب THE MUSLIMS 500 میں فی اہم اسلامی ترجمان کے طور پر جگہ دی گئی۔

تعلیم اور مستقبل: مولانا طارق جمیل نے دارالعلوم اسلامیہ عربیہ رائے ونڈ سے تعلیم پائی۔ آج کل وہ اکثر اپنے تبلیغی دوروں میں مختلف مقامات پر خطاب کرتے ہیں اور امن اور ہم آہنگی پر زور دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ رواداری اور ہر شخص کی عزت کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ وہ اسلام میں فرقہ واریت کے خلاف ہیں۔ اپنی تقریروں میں وہ بڑے وسیع اسلامی موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں اور معاشرتی زندگی میں خود احتسابیت، ایمانداری اور رضا کارانہ طور پر خود پر پابندیاں لگانے کا سبق دیتے ہیں۔ مئی 2014ء میں بین الاقوامی انسانی حقوق کے کمیشن کے چیف نے مولانا طارق جمیل سے ملاقات کی ان کے ساتھ اسد بشیر اور وینا ملک بھی تھیں۔ ان حضرات نے خصوصی طور پر مولانا کا شکریہ ادا کیا کہ وہ اپنے خطابات میں اسلام کی سچی تصویر پیش کرتے ہیں۔

جنوری 2014ء میں پاکستانی اداکارہ وینا ملک نے اعلان کیا کہ مولانا طارق جمیل کے خطابات نے اس کی دنیا بدل دی ہے اور وہ شوبز اور فلم انڈسٹری چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ تاہم اس نے انڈسٹری کو نہیں چھوڑا۔ بعض خبروں اور رپورٹوں کے مطابق جن کی تصدیق اگرچہ خود عمران خان نے نہیں کی۔ مولانا طارق جمیل پی ٹی آئی کے چیف عمران خان سے اگست 2014ء میں ملے تھے۔ مولانا نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنے ''آزادی مارچ'' کے دوران محتاط اور پُر امن رویہ اپنائیں۔ مولانا ہی کی درخواست پر عمران خان ''سونامی مارچ'' کی بجائے اپنے اس سیاسی دھرنے کا نام آزادی مارچ رکھا تھا۔ جبکہ مولانا طاہر القادری کے قریبی حلقوں کے مطابق ''آزادی مارچ'' کی اصطلاح انہوں نے عمران خان کو فراہم کی تھی۔

4 نومبر 2014ء کو مولانا طارق جمیل پاکستان کے موجودہ وزیر اعظم، محمد نواز شریف سے ان کی رہائش گاہ واقع رائے ونڈ میں ملے اور انہوں نے وزیر اعظم کو رائے ونڈ کے سالانہ تبلیغی اجلاس میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ مولانا طارق جمیل کی انہیں تبلیغی سرگرمیوں کی بنا پر کتاب THE 500 MUSLIMS میں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ معاشرے کے ہر طبقہ کو بشمول تاجر سے وزیر اعظم متاثر کر رہے ہیں۔

عظیم قائدین

جن کی کامیابیوں کے اثرات آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں مگر دشمن کے کثیر التعداد ہونے کی وجہ سے یہ اکثر عسکری کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ 625ء تا 670ء

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ 624ء تا 692ء

حضرت زید بن علی رضی اللہ عنہ بن حسین 698ء تا 740ء

حضرت حسن بن علی طالبی (م۔786ء)

سید احمد شہید (1786ء تا 1830ء)

شریف حسین بن علی (1854ء تا 1930ء)

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ 626ء تا 681ء

حضرت مصعب بن زبیر

حضرت محمد نفس زکیہ

امیر عبدالقادر الحسینی (1808ء تا 1883ء)

امام شامل داغستانی

یاسر عرفات (1921ء-2004ء)

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ بن علی رضی اللہ عنہ (625ء تا 670ء)

وہ عظیم قائد جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق دو مسلمان مخالف گروہوں میں اتحاد پیدا کیا

نسب اشرف: حضرت الحسن رضی اللہ عنہ بن علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب بن عبدالمطلب بن ہاشم۔ کنیت ابومحمد، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے نواسے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بڑے صاحبزادے، 15 رمضان 3ھ/ یکم اپریل 625ء کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کا نام حرب رکھا تھا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدل کر حسن رکھا۔

ان کی کنیت ابومحمد بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز فرمائی تھی۔ لیکن اس نام کا ان کا کوئی فرزند نہیں تھا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی بیوی ام الفضل رضی اللہ عنہا نے اپنے بیٹے قثم کے ساتھ اپنا دودھ پلایا تھا۔ یوں حضرت قثم رضی اللہ عنہ اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ رشتے میں چچا بھتیجے ہونے کے باوجود رضاعی بھائی بھی تھے۔

حضرت ابوبکرہ ثقفی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تھے اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ ان کی گود میں تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا کہ یہ میرا بیٹا سردار ہے اور امید ہے کہ خدا اس کے ذریعے سے مسلمانوں کے دو مخالف گروہوں میں صلح کرائے گا۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ حضرت انس رضی اللہ عنہ بن مالک کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جسمانی خدوخال میں بے

حد مشابہت رکھتے تھے۔ ابتدائی زندگی بھی انھوں نے اپنے بابرکت نانا اور والدین کے سایہ عاطفت میں گذاری۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جب مسلمانوں کے لیے سالانہ وظائف مقرر ہوئے تو سب سے زیادہ رقم ان حضرات کے لیے مختص کی گئی جنھوں نے غزوہ بدر میں شرکت کی تھی۔ اگرچہ امام حسن رضی اللہ عنہ اور ان کے چھوٹے بھائی امام حسین رضی اللہ عنہ غزوہ بدر کے وقت ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے وظائف بھی بدری صحابہ کے برابر مقرر کیے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت کے عہد آخر میں جب ان کے خلاف فتنوں کا طوفان اٹھا اور باغیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ کر لیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حفاظت کے لیے متعین کر دیا۔ اس فرض کی ادائیگی کے دوران حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ زخمی بھی ہوئے اور آپ رضی اللہ عنہ کا سارا بدن خون سے رنگین ہوگیا۔ باغی اس دروازے سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر میں نہ داخل ہوسکے جہاں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ متعین تھے۔ تاہم باغی ایک دوسری دیوار پھاند کر گھر میں داخل ہوگئے اور انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بحالت تلاوت قرآن پاک شہید کر دیا۔ (السیوطی۔ تاریخ الخلفاء) شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد جب اہل مدینہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قبول خلافت کا اصرار کیا تو حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے اپنے والد بزرگوار کو مشورہ دیا کہ آپ رضی اللہ عنہ اس وقت خلافت کو قبول نہ کریں جب تک ممالک اسلامیہ کے لوگ آپ رضی اللہ عنہ سے اس کی درخواست نہ کریں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کے بعد جب جنگ جمل پیش آئی تو یہ اطلاع مدینہ منورہ میں موصول ہوئی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جماعت جس میں حضرت الزبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے مکہ سے عراق کی جانب روانہ ہوگئی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی عراق کا قصد کیا مگر اس سے پہلے حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو کوفے بھیج دیا۔ کوفے میں بر سر منبر حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے اہل کوفہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت پر آمادہ کیا۔ تاریخ کی کتابوں میں مزید تفصیل یہ ملتی ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نو ہزار چھ سو پچاس کوفیوں کو ساتھ لے کر ذی قار پہنچے جہاں حضرت علی رضی اللہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ جنگ جمل میں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی شرکت کے سوا کوئی اور تفصیل نہیں ملتی۔ اس کے بعد 37ھ میں جنگ صفین پیش آئی۔ اس میں بھی بجز شرکت کے کوئی اور اہم بات نہیں پیش آئی۔ البتہ التوا جنگ کا جو معاہدہ فریقین کے درمیان لکھا گیا تو اس میں ایک شاہد حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ بھی تھے۔

رمضان 40ھ میں ابن ملجم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مہلک وار سے شدید زخمی کر دیا۔ زخمی ہونے کے بعد آپ رضی اللہ عنہ تین دن تک زندہ رہے۔ اس اثنا میں آپ رضی اللہ عنہ سے امام حسن رضی اللہ عنہ کی جانشینی کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا، ''نہ میں حکم دیتا ہوں اور نہ میں روکتا ہوں۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تجہیز و تکفین کے بعد جامع مسجد کوفہ میں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی بیعت خلافت ہوئی۔ بیعت کرنے والوں کی تعداد 2 ہزار سے زائد تھی۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی بیعت خلافت کے چار ماہ بعد حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اہل عراق کو ساتھ لے کر نکلے اور اُدھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اہل شام کے ساتھ بہ ارادہ جنگ نکلے۔ دونوں لشکر بمقام مسکن آمنے سامنے آگئے۔ حالات و واقعات کا جائزہ اور دونوں لشکروں کا اندازہ کر کے حضرت حسن رضی اللہ عنہ اس نتیجے پر پہنچے کہ دونوں میں سے کوئی فریق اس وقت تک شکست تسلیم نہیں کرے گا جب تک دوسرا فریق اُسے برباد نہ کردے۔ یہی امر اور ہزاروں بے گناہ

انسانوں کی آئندہ موت امر صلح کی محرک ہوئی اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو صلح کے لیے لکھا۔

معاہدہ صلح: عمرو بن سلمۃ الدرجی کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس امام حسن رضی اللہ عنہ نے اسی غرض کے لیے بھیجا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن سمرہ اور حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا۔ دونوں نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی شرائط صلح مان لیں۔ پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ کوفے میں داخل ہوئے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ قصر میں اترے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نخیلہ میں۔ صحیح بخاری کی کتاب الصلح میں ایک روایت ہے کہ جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ جب حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی فوج پہاڑوں کی طرح شامی لشکر کی طرف بڑھی تو حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو کہا کہ "میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ ایک ایسا لشکر ہے جو اس وقت تک پیٹھ نہیں پھیرے گا جب تک دشمنوں کو قتل نہ کر دے۔ اس پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر یہ لوگ ہمارے لوگوں کو قتل کر دیں گے تو میری طرف سے معاملات کا ذمہ دار کون ہوگا؟ پھر اسی وقت انہوں نے حضرت عبدالرحمٰن سمرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو امام حسن رضی اللہ عنہ کی طرف بھیجا۔

دونوں فریقین میں صلح اس پر طے پائی کہ کوئی عراقی محض بغض اور کینہ کی وجہ سے نہیں پکڑا جائے گا۔ سب کو بلا استثنا امان ہوگی۔ صوبہ اھواز کا کل خراج حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ انہیں دو لاکھ درہم سالانہ کا وظیفہ بھی دیا جائے گا۔ صلات وعطیات میں بنو ہاشم کو بنوامیہ پر ترجیح دی جائے گی۔ یہ معاہدہ طے پانے کے بعد کوفہ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت ہوئی۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا مشورہ یہ تھا کہ امام حسن رضی اللہ عنہ سے مجمع عام میں دستبرداری کا اعلان کرلیا جائے تاکہ کسی غلط فہمی کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ اس پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے امام حسن رضی اللہ عنہ کو تقریر کرنے کی درخواست کی حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ ہمارے اگلوں کے ذریعے تمہیں اللہ نے ہدایت دی اور پچھلوں کے ذریعے تمہاری خونریزی بند کرائی۔ اس کے علاوہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے خاندان بنی ہاشم کے سرکردہ افراد سے بھی مشاورت کی جب امام حسین رضی اللہ عنہ کے سامنے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے اپنا خیال ظاہر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ خدا کی پناہ۔ یعنی تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، لیکن امام حسن رضی اللہ عنہ نے ان کو بھی راضی کر لیا۔ ان کی مدت خلافت چار ماہ بتائی جاتی ہے۔ صلح کے بعد حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ واپس چلے گئے اور زندگی کا بڑا حصہ عبادت الٰہی میں گزارا۔

وفات: ربیع الاول 50ھ میں بمقام مدینہ زہر خورانی کی وجہ سے ہوئی۔ بعض روایتوں میں زہر دینے والی یا والے کا نام نہیں اور بعض میں زہر دینے والی کا نام جعدہ بنت اشعث دیا گیا ہے جو حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی بیوی تھی۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ زہر اس عورت نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ایما پر دیا تھا۔

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ (626ء تا 681ء)

وہ عظیم قائد کو صرف بہتر مجاہدین کے ساتھ اسلام کے لیے ہزاروں سے ٹکرا گئے

نسب اشرف: حضرت الحسین رضی اللہ عنہ بن علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب بن عبدالمطلب بن ہاشم

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب نواسے اور فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرزندار جمند، سید الشہداء اور اثنا عشریہ کے تیسرے امام منصوص من اللہ، آغوش نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پرورش پائی۔

پیدائش: عام شہرت کی بنا پر تاریخ ولادت 3 شعبان 4ھ 1 جنوری 626ء تسلیم کی جاتی ہے۔ البتہ بعض محققین نے 5 شعبان 4ھ کو ترجیح دی ہے۔ ولادت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نومولود کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی اور بچے کو اپنے لعاب دہن کی پہلی غذا مرحمت فرمائی۔ نام حُسین رکھا اور ساتویں دن عقیقہ کیا، سر کے بال اتروائے، بالوں کے ہم وزن چاندی صدقہ کی، ایک یا دو مینڈھے ذبح کیے گئے۔

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی کنیت ابو عبد اللہ اور لقب سید الشہداء ہے۔

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اپنے بھائی سیدنا حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ سے کچھ ہی چھوٹے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دونوں سے یکساں محبت فرماتے تھے۔ دونوں فرزند اپنے عظیم ترنانا کی تصویر تھے۔ امام حسن رضی اللہ عنہ سر سے سینہ تک اور امام حسین رضی اللہ عنہ سینہ سے قدم تک (سیر اعلام النبلا) ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لائے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ سب کو چادر میں لیا اور فرمایا۔ ''اللھم ھٰؤلاء اھلبیتی، اللھم اذھب عنھم الرجس وطھرھم تطھیرا۔'' ''اے پروردگار یہ میرے اہل بیت ہیں ان سے ہر قسم کے عیب و رجس دور کر دے اور انہیں کما حقہ پاک رکھ۔'' اس کے بعد سورۃ احزاب کی آیت تطہیر نازل ہوئی۔ ذوالحجہ 10ھ/ 631ء میں نجرات کے عیسائیوں کا ایک وفد مدینہ منورہ آیا جب انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آیات قرآن سنائی گئیں تو انہوں نے انکار کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مباہلہ کرنے کی دعوت دی پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرات حسنین رضی اللہ عنہم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ و فاطمہ رضی اللہ عنہا کو لے کر باہر نکلے تو یہ نورانی صورتیں دیکھ کر نجران کے عیسائیوں کا اسقف مباہلہ سے باز آیا کہ کہیں عیسائیوں کا وجود ہی دنیا سے نہ ختم ہو جائے۔ اس واقعہ کا تذکرہ قرآن کریم کی سورۃ آل عمران کی آیات 59 تا 61 میں موجود ہے۔

632ء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات اہل بیعت کے لیے سخت صدمہ کے باعث بنی۔ پھر عہد فاروقی میں جہاں امام حسن رضی اللہ عنہ و حسین رضی اللہ عنہا کے لیے پانچ ہزار درہم سالانہ کے وظائف مقرر کیے گئے وہیں ایران کے شاہی خاندان سے شاہ یزدگرد کی بیٹیاں جب مدینہ لائی گئیں تو ان میں سے ایک حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے منسوب ہوئی جبکہ دوسری سے حضرت محمد بن ابی بکر کا نکاح کیا گیا۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی اسی زوجہ محترم حضرت شہر بانو کے بطن سے حضرت زین العابدین پیدا ہوئے تھے۔

655ء میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کے بعد 657ء میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو بصرہ آنا پڑا۔ پھر جب کوفہ کو دار الحکومت بنایا گیا تو حضرت امام حُسین رضی اللہ عنہ بھی مدینہ سے کوفہ منتقل ہو گئے۔ جنگ جمل میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے میسرہ کی کمان کی تھی۔ پھر جب جنگ صفین کا معرکہ پیش آیا تو اس میں بھی وہ اپنے والد کے ساتھ تھے۔ ایک موقع پر مروان اموی نے کہا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے صاحبزادوں کو جنگ میں نہیں شریک ہونے دیتے بلکہ خود میدان میں آکر لڑتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں صاحبزادوں کو اس لیے میدان جنگ سے روکتے تھے کہ کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل منقطع نہ ہو جائے (روضہ صفین) مگر حضرات حسنین طلبین جنگ صفین کے بعد بھی اپنے والد کے ساتھ رہے اور انہوں نے معرکہ نہروان میں بھی شرکت کی تھی۔

21 رمضان 40ھ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ اس دار فنا سے دار البقا کی طرف روانہ ہوئے تو حضرت امام حسین رضی

اللہ عنہ کوفہ میں موجود تھے۔ اور اپنے والد بزرگوار کی تجہیز و تکفین میں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہے۔ پھر حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کرنے کے بعد تمام اہل بیت مدینہ تشریف لے گئے۔

مدینہ میں امام حسن رضی اللہ عنہ کی زندگی میں امام حسین رضی اللہ عنہ خاموشی سے دینی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ دونوں بھائیوں کے آداب میں یہ شامل تھا کہ امام حسین رضی اللہ عنہ امام حسن رضی اللہ عنہ کے سامنے ادب سے بات کرتے تھے اور محمد حنفیہ امام حسین رضی اللہ عنہ کے سامنے ادب سے بات کرتے تھے۔ اور امام حسن رضی اللہ عنہ اپنے چھوٹے بھائی کی تعظیم اس قدر کرتے کہ معلوم دیتا کہ وہ بڑے ہوں۔

51ھ/671ء میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کو محض حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت کرنے کی پاداش میں قتل کیا تو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے ان سے ملاقات کر کے اس قتل پر سخت احتجاج کیا اور حالات و معاملات کی بگڑتی ہوئی صورت حال پر بات چیت کی۔ جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی میں اپنے بیٹے یزید کی بیعت لی تو امام حسین رضی اللہ عنہ نے یہ بیعت نہ کی۔

امام حسین رضی اللہ عنہ کا وہ کارنامہ جس نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی وہ عاشورہ 61ھ کی قربانی کا ہے۔ واقعہ کربلا کے چشم دید گواہوں میں عقبہ بن سمعان اور ضحاک بن عبیداللہ شامل تھے۔ ان سے منسوب مقتل الحسین کربلا کے سانحہ پر مبسوط تصنیف ہے۔

یزید کی ولی عہدی کی حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے شدید مخالفت کی اس پر شام سے ان کی جواب طلبی ہوئی اس کے جواب میں انھوں نے حکومت وقت پر سخت تنقید کی اور خیالات واضح کرتے ہوئے یزید کی ولی عہدی کا ناجائز قرار دیا۔ رجب 60ھ/680ء میں یزید نے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا اور مدینہ منورہ میں اپنے والد کی وفات کی خبر کے ساتھ ایک حکم نامہ بھیجا جس میں گورنر مدینہ کو کہا گیا تھا کہ وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ و عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو بیعت پر مجبور کرے اور یہاں تک سختی روا رکھے کہ یہ حضرت بیعت پر راضی ہو جائیں۔ گورنر مدینہ سے ملاقات کے بعد حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے مکہ معظمہ کا رخ کیا۔ مکہ میں آپ رضی اللہ عنہ کا قیام شعب علی رضی اللہ عنہ میں رہا۔ اسی دوران اہل کوفہ نے امام حسین رضی اللہ عنہ کو خط لکھے اور اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہوئے امام کو کوفہ آنے کی دعوت دی۔ کوفہ والوں کی اس دعوت پر امام صاحب رضی اللہ عنہ نے حضرت مسلم بن عقیل کو کوفہ روانہ کیا۔ حضرت مسلم کوفہ پہنچے تو ان کا شاندار استقبال کیا گیا اور ہزاروں لوگوں نے ان کے ہاتھ پر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی بیعت کی۔ یزید نے ابن زیاد کو گورنر کوفہ مقرر کر کے کوفہ کے لوگوں کے دلوں میں دہشت بٹھا دی جس کی وجہ سے اہل کوفہ نے حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا اور ابن زیاد نے انہیں شہید کر دیا۔ دوسری طرف یزید نے یہ تدبیر اختیار کی امام حسین رضی اللہ عنہ کو خفیہ طریقے سے اگر مدینہ میں نہ سہی تو مکہ میں بالضرور قتل کر دیا جائے۔ اس نے عمرو بن سعید کو ایک بڑی فوج دے کر اس کام کے لیے روانہ کر دیا۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ حالات کی صورتحال کا اندازہ کر کے 8 ذوالحجہ کو عراق کے لیے نکلے۔ عمرو بن سعید نے اپنے بھائی کے ساتھ ایک دستہ فوج بھیجا کہ حضرت امام رضی اللہ عنہ کو گرفتار کر دیا جائے مگر وہ ناکام رہا۔ دوسری طرف آپ رضی اللہ عنہ نے کوفہ کی طرف سفر جاری رکھا۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اپنے ارادے کے نتائج اور ان کے دینی فوائد سے آگاہ تھے اس لیے آپ رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے مشوروں کے باوجود یہ سفر جاری رکھا۔ 2 محرم 61ھ/680ء کو آپ کربلا پہنچے تو حر بن یزید تمیمی نے ایک ہزار سپاہیوں کے ساتھ امام کے قافلے کو گھیرے میں لے لیا۔ 3 محرم کو عمر بن سعد 4 ہزار یا 6 ہزار فوج لے کر کربلا پہنچ گیا۔ امام صاحب رضی اللہ عنہ کو ایک بار پھر یزید کی بیعت کا کہا مگر امام رضی اللہ عنہ نے

اس فاسق و فاجر شخص کی بیعت پر موت کو ترجیح دیا اور 10 محرم الحرام کو 72 ساتھیوں کے ساتھ ہزاروں کا مقابلہ کرتے ہوئے مردانہ وار شہید ہو گئے۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ (624ء تا 692ء)

مہاجرین کے ہاں مدینہ منورہ میں پیدا ہونے والا پہلا بچہ جو مکہ میں شہید ہوا

نام ونسب: حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ بن عوام بن خویلد بن اسد

حضرت زبیر بن عوام کے فرزند جو قریش کی شاخ عبدالعزیٰ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی والدہ حضرت اسمار ضی اللہ عنہا بنت ابی بکر رضی اللہ عنہ تھیں۔ حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہ کی ولادت ہجرت کے 20 ماہ بعد ہوئی۔ تقریباً ذوالقعدہ 2ھ/ 4 اکتوبر یا 30 نومبر 692ء کو شامی افواج کے خلاف لڑتے ہوئے جو حجاج بن یوسف ثقفی کی قیادت میں تھیں، شہادت پائی۔

مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد مہاجرین کے ہاں جو سب سے پہلا بچہ پیدا ہوا وہ حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کے والد اور والدہ دونوں طرف سے ان کی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرابت تھی اور یہی قرابت ان کی شہرت کا سبب بن گئی تھی۔

کہتے ہیں کہ وہ اپنے والد کے ہمراہ جنگ یرموک (15ھ/636ء) میں موجود تھے اور جب حضرت زبیر رضی اللہ عنہ مصر میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی فوج میں شامل ہوئے (19ھ/640ء) تو اس وقت بھی وہ اپنے والد کے ہمراہ تھے۔ وہ عبداللہ بن ابی سرح کی اس مہم میں بھی شامل تھے جو 647ء میں براعظم افریقہ میں بوزنطیوں کے خلاف لڑی گئی تھی۔ کہتے ہیں اس مہم میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے بوزنطی حاکم جرجیر کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا تھا، اس طرح وہ تاریخ اسلام کی بہت سی جنگوں میں شریک رہے۔ بعد ازاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو اس مجلس کا رکن بنا دیا جس کا کام قرآن مجید کا صحیح نسخہ تیار کرنا تھا۔

شہادت عثمان کے بعد وہ اپنے والد اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بصرے پہنچے اور وہاں جنگ جمل میں 4 دسمبر 656ء پیدل فوج کی قیادت کی۔ اس لڑائی کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ واپس آ گئے اور بعد کی خانہ جنگی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ سوائے اس کے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ و معاویہ رضی اللہ عنہ کی تحکیم میں موجود تھے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ابن الزبیر رضی الہ عنہ جنہوں نے اپنے والد سے میراث میں خاصی دولت پائی تھی، سیاست سے کنارہ کش رہے اور کسی موزوں وقت کا انتظار کرتے رہے، تاہم انہوں نے یزید کو ولی عہد تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس کی بیعت نہ کی۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات (60ھ/680ء) پر وہ اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ ابن علی رضی اللہ عنہ ہر دو نے یزید کی بیعت نہ کی۔ حاکم مدینہ، مروان کی دھمکیوں سے بچنے کے لیے وہ مکہ چلے گئے جہاں انہیں کسی نے نہیں ستایا، لیکن جب معرکہ کربلا میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ خفیہ طور پر اپنی فوج تیار کرنے لگے تو انہیں گرفتار کرنے کے لیے ایک چھوٹی سی فوج خود ان کے بھائی عمرو کے ماتحت مدینہ سے بھیجی گئی، عمرو کو شکست ہوئی اور عمرو کو گرفتار کر لیا گیا اور کافی زدوکوب کرنے کے بعد ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں قید کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ وہ اس قید محبوسی میں مر گئے اور ان کی لاش کو سولی پر لٹکا کر ان کی تشہیر کی گئی (681ء) اس کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے کھلم کھلا یزید کی معزولی کا اعلان کر دیا۔ مدینہ منورہ کے انصار نے بھی ان کی پیروی کی اور اپنا ایک الگ سردار منتخب کر لیا۔ یزید کو جب محسوس ہوا کہ بات حد سے بڑھتی جا رہی ہے تو اس نے ایک شامی فوج

مسلم بن عقبہ کی قیادت میں روانہ کی۔ اس فوج نے اہل مدینہ کو جنگ حرہ میں شکست دی (27 اگست 683ء) مسلم بن عقبہ کی وفات کے باوجود یہ فوج حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ کو گھیرنے کے لیے مکہ کی طرف بڑھی (24 ستمبر 683ء) مگر اس کے 24 دن بعد یزید کے مرنے کی خبر ملی تو اس فوج نے مکہ کا محاصرہ اٹھا لیا اور اموی فوج کے سالار حصین بن نمیر نے حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہ کو ترغیب دی کہ وہ اس کی فوج کے ساتھ شام چلیں اور دارالحکومت پر قبضہ کرلیں لیکن انہوں نے مکہ میں رہنے کو ترجیح دی۔

یزید کی موت کے بعد حکومت بدنظمی کا شکار ہوگئی اور خانہ جنگی شروع ہوگئی حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے امیرالمومنین ہونے کا اعلان کردیا۔ شام، مصر، جنوبی عرب اور کوفے کے مخالفین بنوامیہ نے ان کی خلافت کو تسلیم کرلیا، لیکن ان کا اقتدار برائے نام تھا۔

مرج راہط میں مروان بن حکم کی فتح کے بعد (جولائی 684ء) اور پندرہ ماہ بعد کوفے میں مختار کی بغاوت کی وجہ ان کے حامیوں کو شام، مصر اور عراق میں اپنے بچاؤ کی فکر پڑ گئی۔ گو بصرے میں حضرت مصعب بن الزبیر رضی اللہ عنہ کو المہلب کی حمایت حاصل کرلی اور مختار کو شکست دی اور 687ء میں عراق پر از بسر تو اقتدار قائم کرلیا۔ اسی دور میں قبیلہ بکر کے خارجیوں نے بحرین (یعنی الحسا) پر قبضہ کرلیا، اور 688ء میں حضر موت اور یمن چھین لیا اس طرح ابن الزبیر صرف حجاز کے حکمران رہ گئے۔ 688ء میں حاجیوں نے جن چار اماموں کی قیادت میں حج ادا کیا وہ یہ تھے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، ایک خارجی، ایک اموی اور محمد بن حنفیہ۔ جب 691ء میں سارا عراق بھی امویوں کے زیر اقتدار آ گیا تو عبدالملک بن مروان نے مکہ سے نمٹنے کے لیے حجاج بن یوسف ثقفی جیسا سخت انسان روانہ کیا۔

محاصرہ مکہ یکم ذوالقعدہ 72ھ/25 مارچ 692ء کو شروع ہوا اور اگلے چھ ماہ تک جاری رہا۔ اس عرصہ میں یہ مقدس شہر اور کودبیت اللہ الحرام منجنیقوں سے کی جانے والی سنگ باری کی زد میں رہے۔ آخر میں جب حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے حامی ہمت ہار گئے، یہاں تک کہ ان کے بیٹوں نے بھی حجاج کے آگے ہتھیار ڈال دیئے، تو حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہ نے اپنی والدہ کی فہمائش پر دوبارہ میدان جنگ میں نکلے اور شہید ہوگئے۔ ان کی لاش کو عین اس جگہ سولی پر لٹکایا گیا جہاں کچھ عرصہ پہلے ان کے بھائی عمرو کی لاش کی تشہیر کی گئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد عبدالملک بن مروان کے حکم پر ان کی نعش ان کی والدہ کے حوالے کردی گئی اور انہوں نے اسے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہ کے گھر میں مدینہ منورہ میں دفن کردیا۔

حضرت عبداللہ کا شمار عہد صحابہ کے بہادر ترین افراد میں ہوتا ہے۔ فتح افریقہ میں انہوں نے بڑے بہادرانہ کارنامے انجام دیئے۔ جنگ جمل میں ان کو 40 سے زائد زخم آئے اور جس شخص نے ان کی سلامتی کی خبر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دی تھی اسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دس ہزار درہم بطور انعام دیئے تھے۔ یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کی بیعت لی اور مصر، حجاز، یمن، خراسان، عراق اور شام کے کچھ حصے پر اپنی حکومت کا اعلان کردیا اور مدینہ منورہ کو اپنا دارالحکومت قرار دے دیا۔ جب اموی خلیفہ عبدالملک کے عہد میں حجاج بن یوسف نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف فوج کشی کی تو وہ مدینہ سے مکہ منتقل ہوگئے۔ ان کا عہد خلافت کل نو برس رہا۔ اس دوران میں انہوں نے اپنا سکہ جاری کیا اور تاریخ اسلام میں پہلی بار گول درہم متعارف کرائے، ان کے درہم کے ایک "محمد رسول اللہ" نقش تھا اور دوسری طرف "امر اللہ بالوفاء والعدل" رقم تھا۔

کتب حدیث میں حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے 33 حدیثیں مروی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اپنی عبادت گذاری اور تلاوت قرآن کریم کے لیے بھی مشہور تھے۔ وہ رات بھر قیام کرتے اور دن کو روزہ رکھتے تھے۔

حضرت مصعب بن الزبیر رضی اللہ عنہ

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بن عوام کے فرزند اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے بھائی اور عراق کے عامل

نام ونسب: حضرت مصعب بن الزبیر رضی اللہ عنہ بن عوام بن خویلد بن اسد

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت الزبیر رضی اللہ عنہ کے بیٹے اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے بھائی، بڑے وجیہہ اور بہادر شخص تھے۔ ان کی سخاوت اسراف کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔ وہ اپنی بہادری اور شجاعت میں تو اپنے بھائی عبداللہ اور دوسرے زبیریوں سے مشابہ تھے ہی، لیکن تشدد کے جذبہ سے متاثر ہو کر وہ بعض اوقات ایسی سزائیں دیتے تھے جو بہت اذیت ناک ہوتی تھیں۔ انہوں نے مروان اول کے عہد خلافت میں فلسطین پر خاص تدبیر سے حملہ کر کے اپنے عسکری کارناموں کی ابتدا کی تھی۔ بعد میں ان کے بھائی نے انہیں بصرے کا گورنر بنا کر بھیج دیا۔ اس کے بعد جلد ہی انہیں اہل کوفہ کی امداد کو جانا پڑا، جو مختار بن ابی عبید کی دراز دستیوں سے تنگ آ چکے تھے۔ انہوں نے پہلے تو اس ثقفی شرپسند کی فوجوں کو جو ان کے خلاف فراہم کی گئیں تھیں مار بھگایا اور پھر مختار کو کوفہ میں چار ماہ مسلسل محصور رکھا۔ مختار کی موت کے بعد مصعب نے اس کے ہزاروں پیروکاروں کو تہہ تیغ کرنے کا حکم دیا اور اس وجہ سے اتنے ہی دشمن پیدا کر لیے، جتنے کہ ان مقتولین کے رشتہ دار تھے۔ عبداللہ بن الحر کے مقابلے میں ان کو زیادہ کامیابی نصیب نہ ہوئی جسے عراق میں اس غرض سے بھیجا گیا تھا کہ وہ مروانیوں کے حق میں جوابی انقلاب پیدا کریں۔ اسی قسم کی ایک کوشش بصرے میں خالد بن اسید اموی نے کی جو ناکام ہوگئی مگر اس کے ساتھیوں پر حضرت مصعب کے لیے انتہا تشدد کی وجہ سے بصرے کے عمائدین ان کے خلاف ہوگئے۔

اس کے بعد بہت جلد حضرت مصعب کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ انہیں عراق کی مدافعت کرنا پڑے گی جس پر خلیفہ عبدالملک خود حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ چنانچہ باجمیرہ کے مقام پر افواج کو اکٹھا کیا گیا۔ مصعب یہاں شام کی افواج کی آمد کے منتظر رہے اور اس کے بعد وہ دیر الجاثلیق کی طرف پلٹ گئے۔ اس کی حالت خطرے میں پڑ گئی، کیونکہ بصرے کی افواج نے اس کے ہمراہ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس ولایت کی آزمودہ کار فوج مہلت کے پاس بہت دور تھی وہ خارجیوں سے مسلسل جنگ لڑ رہا تھا۔ زبیری افواج نے معمولی گرم جوشی کا اظہار کیا۔ مصعب کی فوج کے افسر اس کی سخت گیری سے تنگ آ چکے تھے اور غداری پر تل گئے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے عبدالملک سے بات چیت شروع کر دی تھی۔ مروانیوں نے اپنے وعدوں کے ایفا میں بخل سے کام نہیں لیا۔ عبدالملک نے خود مصعب سے گفتگو کی لیکن اس نے اپنے ہمراہیوں کی غداری سے آگاہ ہو کر ہر قسم کی پیشکش کو مسترد کر دیا اور بہادروں کی موت مرنے کا عزم کر لیا۔ اس کے ساتھیوں میں سے صرف ایک شخص ابراہیم بن الاشتر نے میدان میں داد شجاعت دی۔ دوسرے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے اور بعض شامی فوجوں سے جا ملے۔ عبدالملک نے آخری مرتبہ حضرت مصعب سے جان بخشی کا وعدہ کیا اور عراق کی گورنری بھی پیش کی لیکن بے سود۔ اس کے گھوڑے سے گرتے ہی ایک منتقم عبیداللہ بن ذبیان بکری نے مصعب کا کام تمام کر دیا۔ یہ واقعہ جمادی الاول 72ھ/ اکتوبر 691ء میں پیش آیا۔ خود عبدالملک نے ان کی لاش پر آنسو بہائے اور شعرا کو حکم دیا کہ وہ ان کے شجاعانہ خاتمے پر نوحے لکھیں۔ مصعب کی دریا دلی کی وجہ سے شعرا نے ان کی شان میں بے شمار قصائد لکھے۔ حضرت مصعب اس لیے بھی مشہور تھے کہ ان کے حرم میں اس وقت کی دو بے حد باوقار اور باتمکین خواتین ایک حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی عائشہ اور دوسری سکینہ بنت حسین رضی اللہ عنہ بن علی رضی اللہ عنہ تھیں۔

حضرت زید بن علی بن حسین رضی اللہ عنہ (698ء-740ء)

وہ مجاہد جو صاحب سیف وقلم تھے حکومت وقت کے خلاف انقلاب بپا کرتا ہوا شہید ہو گئے

نام ونسب: حضرت زید بن علی بن حسین رضی اللہ عنہ بن علی بن ابی طالب۔ فاطمی وعلوی خانوادے کے جید عالم، جوان مجاہد اور فرقہ زیدیہ کے امام، جن کے پیروکار آج بھی خاصی تعداد میں یمن میں موجود ہیں۔ وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پوتے حضرت امام زین العابدین، علی بن حسین رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے تھے۔ ان کی تاریخ ولادت میں اختلاف ہے اور مورخین نے 75ھ، 78ھ یا 80ھ سال پیدائش بتایا ہے، لیکن 42 سال کی عمر میں شہید ہو جانے پر سب کا اتفاق ہے۔

حضرت زید حضرت امام زین العابدین جیسے والد کے بیٹے اور حضرت امام باقر جیسے عظیم عالم کے بھائی تھے۔ 94ھ میں والد کی وفات کے بعد انہوں نے اپنے بھائی حضرت امام باقر رحمۃ اللہ علیہ سے درس لیا اور اس کے بعد دوسرے علماء وفقہائے مدینہ سے اکتساب علم کیا۔

پاکیزہ علمی ماحول میں پرورش پانے، ذاتی فطانت اور فطری رجحان نے ان کے فکر ونظر کو جلا بخشی۔ حضرت زید کو بچپن سے ہی قرآن مجید سے غیر معمولی شغف تھا۔ اس لیے جوانی میں ''حلیف القرآن'' کہلائے اور تدبر فی القرآن کی وجہ سے ہی ان میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور قرآنی نظام فکر وعمل کا جذبہ پیدا ہوا جسے انہوں نے عام کرنے کے لیے تقریروں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اسی سلسلے میں مدینہ سے دمشق گئے اور قید میں بھی یہ سلسلہ جاری رکھا۔ ابوغسان ازدی کہتے ہیں کہ اموی خلیفہ ہشام نے انہیں پانچ ماہ تک قید رکھا۔ ہشام نے ان کی ذاتی صفات وکمالات کو دیکھتے ہوئے خوفزدہ ہو کر والئ عراق کو لکھا کہ لوگوں کو ان کے پاس آنے سے روک دو کیونکہ ان کی زبان تلوار سے زیادہ تیز اور نیزے سے زیادہ دلدوز ہے۔

حضرت زید ابھی پینتیس چالیس سال کے درمیان تھے کہ اچانک حالات نے پلٹا کھایا۔ اموی حکومت نے ان پر جھوٹا الزام لگا کر انہیں شام بھیج دیا اور ہشام بن عبدالملک نے جابرانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے انہیں قید کر دیا۔ پھر خالد بن عبداللہ کی طرف سے عائد کردہ الزامات کی صفائی پیش کرنے کے لیے انہیں کوفہ جانے کا حکم دیا گیا۔ خالد کو 120ھ میں معزول کر دیا گیا۔ نئے والی کوفہ یوسف بن عمر نے خالد کو قید کر کے مختلف الزامات میں اس کے خلاف تحقیق وتفتیش شروع کر دی۔ اس کی لپیٹ میں حضرت زید رضی اللہ عنہ بھی آ گئے۔ وہ حیرہ میں یوسف بن عمر کو ملے خالد اور زید کی روبرو بات چیت ہوئی اور حضرت زید رضی اللہ عنہ بے گناہ ثابت ہوئے۔ وہ حیرہ سے کوفہ آ کر قیام پذیر ہو گئے اور حکومت کے رویے سے مایوس ہو کر انہوں نے وہاں تبلیغ شروع کر دی اور لوگوں کو دینی اقدار کی دعوت دی۔ حکومت پر تنقید کرنے کی وجہ سے ان کو کوفہ چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا۔ والی کوفہ یوسف بن عمر نے کوفہ اور اس کے ارد گرد جاسوسوں کا جال پھیلا دیا۔ اہم آبادیوں کی نگرانی کڑی کر دی اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کے حامیوں پر تشدد شروع کر دیا، وہ خود کوفہ ہی میں رہے مگر ان کے پیروکاروں کی حفاظت کی وجہ سے حکومت ان کا سراغ نہ لگا سکی۔ حکومت نے ان کی تلاش میں گھروں پر چھاپے مارے اور طاقتور زعماء کو قتل کر کے اصل منصوبہ معلوم کرنے کے بعد اہم جگہوں کی ناکہ بندی کر دی اور کوفہ والوں کو خبردار کرتے ہوئے تہدید کے ساتھ پیش قدمی شروع کر دی۔ ادھر حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اپنے معینہ وقت (یکم صفر 122ھ) سے ایک ہفتہ پہلے ہی کوفے میں رات کے وقت دو سو اٹھارہ مشعل بردار لوگوں کے ساتھ خروج کر کے اعلان انقلاب کیا اور رات بھر کوفے کے بازار ''یا منصور امت'' کے نعروں سے گونجتے رہے۔ صبح کو حکومتی فوج سے مقابلہ ہوا جس میں ان کے مخلص سالار قتل ہوئے۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا۔
''الحمد للہ! میرا دین کامل ہے۔ اگر میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض پورا نہ کرتا تو قیامت کے روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حوض کوثر پر شرمندہ ہونا پڑتا۔ دوسرے روز بھی معرکہ کارزار جاری رہا۔ تازہ کمک کے باوجود حکومتی فوج شکست کھاتی رہی۔ حضرت زید جامع مسجد میں اپنے جانثار ساتھیوں کے ہمراہ دلیری اور تدبر سے لڑتے رہے۔ مسجد کا محاصرہ توڑ کر لوگوں کو اطمینان دلانے کی کوشش کی، مگر خون کے دریا میں کودنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ دوسرے روز بھی کئی بہادر اور وفادار ساتھیوں نے شہادت پائی۔ باقی ماندہ نے دارالرزق میں مورچہ بنا کر لڑائی جاری رکھی۔ یوسف بن عمر تجربہ کار فوجی سالاروں کے ساتھ نئے حملے کے لیے چار ہزار سپاہ کے ساتھ تیار ہوا۔ سلیمان بن کیسان الکلبی تیر اندازوں کا دستہ لے کر آگے بڑھا۔ ان ظالموں کی تیروں کی بارش نے بہت سے جانیں لے لیں۔ ایک تیر خود حضرت زید کی پیشانی میں پیوست ہوگیا۔ بچے کھچے جانثار انہیں اٹھا کر سبجہ لے گئے جہاں طبی امداد کے باوجود وہ شہادت کا جام نوش کر گئے۔ لوگوں نے رات ہی کو سبجہ یا عباسیہ میں دفن کر کے قبر پر نہر کا پانی جمع کر دیا۔ لیکن ایک نبطی غلام کی مخبری پر، جو نزدیکی کھیت میں پانی لگا رہا تھا۔ صبح کو حکومت کے کارندوں نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کی نعش کو نکال کر بے حرمتی کی اور سر تن سے جدا کر کے ہشام کے پاس لے گئے۔ اس کے بعد بھی انتقام کا سلسلہ جاری رہا۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ کے بعد ان کی تحریک کو ان کے دو فرزندوں یحییٰ اور عیسیٰ نے خون دے کر آگے بڑھایا۔ یہ خون رنگ لایا اور ابو مسلم خراسانی خاتمہ حکومت بنوامیہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ خلافت عباسیہ کے زمانے میں زیدیوں نے طبرستان اپنی آزاد حکومت قائم کی تھی۔

ابو مسلم خراسانی

ابو مسلم حیرت انگیز قابلیت کا انسان تھا، اس کی زبان جادو آفرین الفاظ کی بارش کرتی تھی
اور اس کی تلوار کشور کشائی کی حامل تھی۔

نام ونسب: ابو مسلم ابراہیم بن عثمان بن بیشار خراسان

خراسان میں عباسیوں کی انقلابی تحریک کا راہنما تھا، جس کے ابتدائی حالات اور نسب تاریکی میں ہیں۔ وہ غالباً ایرانی النسل غلام تھا اور کوفے میں بنو عجل کے ہاں ملازم تھا۔ جہاں اس نے فرقہ شیعہ سے تعلقات پیدا کیے۔ چنانچہ 119ھ/737ء میں وہ غالی شیعہ المغیرہ بن سعید کے پیروؤں میں شامل ہوگیا۔ 741ء تا 742ء میں اسے عباسیوں کے خراسانی نقباء نے جو مکہ معظمہ جا رہے تھے، اسے ایک زندان میں محبوس پایا۔ انہوں نے اسے رہائی دلائی اور امام ابراہیم بن محمد کے پاس لے گئے۔ امام موصوف نے جب اس ایرانی نوجوان میں انقلابی عزم وارادے پائے تو اندازہ لگایا کہ یہ ایرانی نوجوان خلافت عباسیہ کے خواب کو ضرور شرمندہ تعبیر کر دے گا۔ امام ابراہیم نے ابو مسلم کو خراسان میں عباسی تحریک کا نقیب اعظم بنا دیا اور ایک سیاہ جھنڈا دے کر کہا کہ تمام خراسانیوں کو اس جھنڈے کے نیچے جمع کرو۔ (746ء)

خراسان پہنچ کر اسے ابتدا میں مقامی سرداروں بالخصوص سلیمان بن کثیر کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، لیکن اس نے اس مخالفت پر قابو پایا اور پھر بڑی مستعدی اور سرگرمی سے اس امر میں کامیاب ہوگیا کہ عباسیوں کی اس دعوت کو کامیابی سے ہمکنار کر سکے جو مدت سے جاری تھی۔ چنانچہ یکم شوال 129ھ/ 15 جون 747ء کو اس نے بغاوت کا سیاہ علم برسر عام بلند کر دیا۔ اموی فوج کے اندرونی اختلاف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ابو مسلم نے یمنی گروہ کی تائید حاصل کر لی اور ربیع الثانی یا

جمادی الاولی 130ھ/ دسمبر 747ء میں اس نے خراسان کے دارالحکومت مرو پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد وہ ماخران کی طرف بڑھا اور اسے امام ابراہیم کا حکم نامہ ملا کہ سرزمین خراسان میں جو شخص بھی عربی بولتا ہوا سے قتل کر دو۔ اس حکم کا مطلب تھا کہ خراسان میں کوئی اموی نہ رہے کہ وہی عربی بولتے تھے۔ ابومسلم اور اس کے سرداروں نے گردونواح کے تمام علاقوں میں لشکر کشی شروع کردی۔ ان میں سے ایک سردار قحطبہ بن تسبیب نے مغرب کی سمت پسپاہ ہوتی ہوئی اموی افواج کا تعاقب اپنے ذمہ لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خراسان میں بنوامیہ کی حکومت ختم ہوگئی۔

جب ابومسلم کے خروج کی خبر دمشق پہنچی تو خلیفہ مروان الحمار حیران رہ گیا کہ اب تک تو بنوامیہ کا صرف علوی دعویداران خلافت سے واسطہ تھا اب بنوہاشم سے عباسی بھی بنوامیہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ مروان حمار نے امام ابراہیم کو حمامہ سے گرفتار کروا کر دمشق بلوالیا، ادھر ابومسلم فاتحانہ انداز میں بڑھتا چلا گیا۔

السفاح کی خلافت کا اعلان ہوا تو ابومسلم بدستور اندرون ملک والی کی حیثیت سے برقرار رہا۔ اس نے اندرون ملک میں امن وامان قائم کیا، بخارا میں شیعہ باغیوں کی سرکوبی اور اس کے ساتھ ساتھ مشرق کی سمت میں اسلامی فتوحات کو وسعت دی۔ ابوداؤد کی مہم بھی اسی سال پیش آئی۔ اس کے علاوہ نئے حکمران خاندان جس کی کامیابی بہت کچھ اُسی کی مرہون منت تھی سے اس کے تعلقات روز بروز کشیدہ ہوتے چلے گئے۔ بظاہر اس کی طرف سے بغاوت کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ہاں البتہ بعض محققین کا خیال ہے کہ ابومسلم اسلام میں کسی بڑے الحاد کی داغ بیل ڈالنا چاہتا تھا۔ مگر یہ خیال صداقت سے خالی نظر آتا ہے۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ اس کا ذاتی وقار اور اقتدار اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ بجائے خود بنوعباس اس سے خائف تھے۔ چنانچہ المنصور نے 753ء میں پہلے تو اپنے چچا عبداللہ بن علی کے خلاف ابومسلم سے کام لیا اور پھر اسے بغداد بلا بھیجا اور دھوکے سے 755ء میں قتل کردیا۔ اس کے قتل کے بعد بھی خراسان اور دیگر مشرقی صوبوں میں اس کی یاد قائم رہی۔

حضرت نفس ذکیہ رحمۃ اللہ علیہ

امام حسن رضی اللہ عنہ کے پوتے اور عباسی خلیفہ ابوجعفر المنصور کے خلاف ایک بغاوت کے قائد

نسب اشرف: حضرت محمد بن عبداللہ بن حسن رضی اللہ عنہ بن علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب ہاشمی۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے پوتے جو علوی خاندان کے ان افراد میں سے تھے، جنہوں نے اپنی دعوت برائے خلافت میں خاموشی اور صبر سے انتظار نہیں کیا، بلکہ اس کے حصول کے لیے ذاتی طور پر عملی کوشش کی اور صاحب اقتدار عباسی حکمرانوں سے ٹکرا گئے۔ علامہ الواقدی کے مطابق انہیں اور ان کے بھائی ابراہیم کو ہونے والے حکمرانوں کی سی تعلیم دی گئی تھی۔ اور محمد بن عبداللہ کو ان کے والد ''المہدی'' کے لقب سے پکارتے تھے۔ اموی خلیفہ ہشام کے عہد میں دو فرقہ پرست شیعہ راہنماؤں المغیرہ اور بیان نے جو محمد بن امام باقر رحمۃ اللہ علیہ کو امام تسلیم نہیں کرتے تھے، محمد بن عبداللہ کے حق میں دعوت دینے کی کوشش کی تھی۔

جب اموی خلیفہ ولید کے انتقال کے بعد بنوامیہ کے فوری زوال کی علامات دکھائی دینے لگیں تو حضرت عبداللہ کے خاندان نے ان کے حکم پر محمد کے ہاتھ پر بیعت کرلی، لیکن امام باقر رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے حضرت جعفر صادق نے ایسا نہ کیا۔ اس سے زیادہ وسیع حلقوں میں بھی انہیں جائز وارث تسلیم کرلیا گیا۔ جن میں فرقہ معتزلہ بھی شامل تھا۔ کہتے ہیں ابوجعفر جو بعد میں عباسی خلیفہ ہوا اور معتزلی مذہب سے تعلق رکھتا تھا، وہ بھی ان لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے محمد بن عبداللہ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی مگر اس بات کا اشارہ خود حضرت نفس ذکیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خطوط بنام ابوجعفر المنصور میں نہیں کیا۔ عباسی خلافت کے آغاز میں جب ابوالعباس سفاح خلیفہ بنا تو علویوں کو میدان مقابلہ سے نکال دیا گیا اور یہ دونوں بھائی غائب

ہو گئے اور اس حرکت سے انہوں نے یہ ظاہر کر دیا کہ وہ سفاح کی خلافت کو تسلیم نہیں کرتے، اس کے ساتھ ہی ان کی زندگی کا وہ دور شروع ہو گیا جو خطرات اور آزمائشوں سے پُر تھا۔ خاص طور پر اس وقت جب 754ء میں ابو جعفر المنصور خلیفہ ہوا۔ وہ ایک مقام سے دوسرے مقام پر اپنے حامیوں کی تلاش میں خفیہ طور پر جاتے رہتے تھے۔ مگر وہ اپنے آپ کو خلیفہ المنصور کی دستبرد سے کسی جگہ بھی محفوظ نہیں پاتے تھے، لیکن لوگ اہل بیت کی اولاد ہونے کی وجہ سے بحیثیت مجموعی ان سے محبت وانس رکھتے تھے اور کم از کم ان سے غداری کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے۔ اس طرح وہ نہ صرف بصرہ اور کوفہ بھی گئے، بلکہ عدن کے راستے سندھ تک بھی پہنچے۔ تاہم عام طور پر وہ عرب ہی میں مقیم رہے۔ جہاں وہ اپنے آپ کو قبیلہ جہینہ میں زیادہ محفوظ پاتے تھے۔ خلیفہ کو ان کی پیہم تلاش کے باوجود ناکامی پر بڑی تشویش ہوئی۔ اس نے بارہا اس پر غم وغصہ کا اظہار بھی کیا اور مدینہ کے حاکموں سے مطالبہ کیا کہ انہیں جلد تلاش کر کے دربار خلافت میں پیش کریں لیکن اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ 140ھ/758ء میں جب وہ حج کرنے کے لیے آیا تو اس نے حضرت محمد رحمۃ اللہ علیہ اور ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ کے والد عبداللہ کو قید خانے میں ڈال دیا، کیونکہ وہ اپنے بیٹوں کے چھپنے کی جگہ نہیں بتاتے تھے۔ پھر آئندہ ایک حج کے موقع پر 762ء میں حضرت عبداللہ کے بھائی حسن کے بیٹے اور پوتوں کو بھی گرفتار کر لیا۔

ان حضرات پر کوفہ میں بڑا تشدد کیا گیا اور انہیں قید خانے میں مستقل ڈال دیا گیا۔ اسی حالت قید میں ان میں سے بیشتر فوت ہو گئے۔ ابراہیم کے خسر محمد بن عبداللہ کے ساتھ بھی انتہائی ظلم روا رکھا گیا اور ان کا سر قلم کر کے خراسان بھیج دیا گیا اور ساتھ ہی ایک تحریر کے ذریعہ اہل خراساں کو خائف کیا گیا کہ یہ سر علوی محمد بن عبداللہ کا ہے۔ دسمبر 761 میں خلیفہ کو اس کی مرضی کا ایک والئی ریاح بن عثمان مل گیا جس نے حضرت نفس ذکیہ رحمۃ اللہ علیہ کو تلاش کرنے میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ مگر اسے زیادہ محنت نہ کرنی پڑی کیونکہ رجب 145ھ/762ء میں حضرت نفس ذکیہ رحمۃ اللہ علیہ مدینے میں ظاہر ہو گئے اور انہوں نے وہاں انقلاب برپا کر دیا۔ ان کے بھائی ابراہیم نے بصرے میں خروج کیا۔ تاہم یہ بات واضح نہیں ہو سکی کہ آیا کہ ان دونوں بھائیوں نے اقدام اس وجہ سے کیا کہ نفس ذکیہ کی رائے میں یہ اس کام کے لیے انتہائی موزوں وقت تھا یا حالات نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ اپنی تجاویز کو جلد عملی جامہ پہنائیں۔ بہر حال اس اقدام کے لیے تیاری ٹھیک طور پر نہیں کی گئی کیونکہ ان کے پیرو اگر چہ بصرہ اور مصر میں بہت تھے، جہاں علی بن محمد کو خلیفہ کے حاکم نے گرفتار کر لیا۔ اسی طرح ان کے حامی خراسان بلکہ سندھ میں بھی بہت تھے جہاں عبداللہ کے ایک اور بیٹے الاشتر کو بھیجا گیا تھا۔ اس اقدام میں کسی باقاعدہ تنظیم کا سوال ہی نہیں تھا، اور جیسا کہ اکثر ہوتا رہا تھا علویوں کے لیے جوش وخروش تنکوں کی آگ کی مانند تھا جو بہت جلد بھڑک اٹھتی مگر اتنی ہی تیزی بجھنے بھی لگتی تھی۔ مدینہ میں جہاں اس انقلاب نے ریاح بن عثمان کو اچانک آلیا تھا، محمد نے اپنے کردار کے مطابق بڑی نرمی سے کام لیا۔ انہوں نے قید خانے کے دروازے کھول دیئے، ہر قسم کی خونریزی کی ممانعت کر دی اور محض ریاح کو گرفتار کر لینے پر قناعت کی۔ جب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بن انس نے یہ فتویٰ دیا کہ جو بیعت انہوں نے عباسیوں سے کی تھی وہ باطل ہے تو عمائدین شہر ان کے طرفدار ہو گئے اور مکہ بھی اس نئے حکمران کے تصرف میں آ گیا۔ اس بغاوت کے رونما ہونے کے بعد المنصور کو اطمینان سا ہو گیا، کیونکہ وہ کہتا تھا اب لومڑی اپنے بھٹ سے نکل آئی ہے، وہ بڑی عجلت بغداد سے روانہ ہوا اور کوفہ پہنچا جو خطرے کا خاص مقام تھا۔ اپنی ذکاوت اور ذہانت سے وہ سمجھ گیا تھا کہ بغاوت کا مقام مدینہ کمزور ہے اس لیے پہلے مدینہ منورہ پر حملہ کرنا چاہیے۔ تاہم کوئی کاروائی کرنے سے پیشتر اس نے حضرت نفس ذکیہ رحمۃ اللہ علیہ کو مکمل معافی کی پیشکش کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طرفین میں مخصوص نوعیت کی خط وکتابت شروع ہو گئی جس میں ایک دوسرے کے حسب ونسب پر بڑی لے دے کی گئی۔ اس کے بعد المنصور نے اپنے ایک عزیز عیسیٰ بن موسیٰ کو چار ہزار سپاہ دے کر حضرت نفس ذکیہ رحمۃ اللہ علیہ

کے خلاف بھیجا، لیکن ساتھ ہی یہ ہدایت بھی دی کہ اگر مصالحت سے مسئلہ نمٹ جائے تو جنگ نہ کی جائے۔ ادھر عباسی فوج کی آمد سے اہل مدینہ کچھ ٹھنڈے پڑ گئے۔ تاہم حضرت نفس ذکیہ بالکل مایوس نہ ہوئے۔ انہوں نے متعدد اشخاص کے اس نیک نیت مشورے کو مسترد کر دیا کہ وہ مدینہ چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں کیونکہ اس میں اس شہر کی بے حرمتی کا پہلو شامل سمجھتے تھے لیکن انہوں نے اپنے آدمیوں کو یہ فیصلہ کرنے کی اجازت ضرور دے دی کہ وہ ان کے ساتھ رہیں یا نہ رہیں۔ انہیں محض اللہ کی ذات پر بھروسہ ہے۔ انہوں نے ان سب باتوں کی بھی تقلید کی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں کی تھیں۔ مثلاً انہوں نے مدینہ کے گرد خندق کو دوبارہ کھدوایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار زیب تن کی اور نعرہ بھی وہی لگایا جو غزوہ حنین میں لگایا گیا تھا۔ حتیٰ کہ جنگ کے آغاز میں عہد نبوی کی ایک ایک آدمی کی مبارزت کا بھی احیا کیا۔ ادھر عیسیٰ نے چند روز تک عام معافی کا اعلان جاری رکھا لیکن بے سود رہا۔ اس کے بعد اس نے خندق پر چند دروازے ڈلوا کر خندق کو پار کیا اور مدینہ میں داخل ہو کر جنگ شروع کر دی جس کے بعد حضرت نفس ذکیہ رحمۃ اللہ علیہ کے حامی دن بدن کم ہونے لگے یہاں تک کہ ان کے سردار حضرت نفس ذکیہ رحمۃ اللہ علیہ بھی سہ شنبہ 14 رمضان 145ھ/762ء کو میدان کارزار میں شہید کر دیئے گئے اور ان کا سر کاٹ کر خلیفہ المنصور کے پاس بھجوا دیا گیا۔ حضرت نفس ذکیہ ایک مثالی شخصیت کے مالک تھے مگر شجاع ہونے کے ساتھ نرم مزاج تھے۔

حضرت حسین بن علی رحمۃ اللہ علیہ الطالبی

. عباسی خلیفہ الہادی کے عہد میں ہونے والی ایک علوی بغاوت کے قائد

نسب اشرف: حضرت الحسین بن علی بن الحسن بن الحسن بن علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب۔ ایک علوی قائد جس نے عباسی خلیفہ الہادی کے عہد خلافت میں مدینے میں ایک خروج کی قیادت کی اور 8 ذوالحجہ 169ھ/ 11 جون 786ء کو مدینہ میں شہید کر دیئے گئے۔ ان کے والد کا نام علی العابد تھا اور وہ اپنے زہد و اتقا اور بلند پایہ خیالات کے لیے مشہور تھے اور حضرت عبداللہ بن حسن المثنیٰ اور ان کے عزیز اس جماعت میں شامل تھے جنہیں خلیفہ المنصور نے پہلے مدینہ منورہ میں اور بعد از اں کوفہ کے ایک خوفناک قید خانے میں قید کر دیا تھا۔ (دیکھئے حضرت نفس ذکیہ رحمۃ اللہ علیہ) کیونکہ وہ انہیں عبداللہ کے بیٹوں ابراہیم اور حضرت نفس ذکیہ کی وجہ سے شک وشبہ کی نظر سے دیکھتا تھا۔

حضرت الحسین کی والدہ زینب بھی بہت متقی اور پرہیزگار خاتون تھیں اور عبداللہ بن حسن المثنیٰ کی بیٹی تھیں۔ لہٰذا الحسین کی پرورش انتہائی زہد و تقویٰ کے ساتھ اور بنو عباس کے خلاف سخت نفرت کے ماحول میں ہوئی۔ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ عباسی خلیفہ المہدی سے ان کے خاصے تعلقات تھے اور خلیفہ انہیں مالی عطیات بھجواتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ خلیفہ نے چالیس ہزار دینار الحسین طالبی کو دیئے تو انہوں نے یہ خطیر رقم بغداد و کوفے کے غرباء اور مساکین میں تقسیم کر دی۔ ایک موقع پر خلیفہ سے سفارش کر کے ایک علوی قیدی کو رہائی بھی دلائی۔ مگر جس خروج کی انہوں نے مدینہ میں قیادت کی اس کا فوری محرک وہ اہانت آمیز سلوک تھا جو حاکم مدینہ کے ایک نائب، عبدالعزیز بن عبداللہ نے اس شہر کے بنو طالب کے ساتھ 169ھ/786ء میں کیا تھا۔

ان دنوں حاکم مدینہ اسحٰق بن عیسیٰ ابن علی خلیفہ کے دربار میں حاضری کے لیے بغداد گیا ہوا تھا جو ابھی تخت نشین ہوا تھا۔ عبدالعزیز کو جب یہ خبر ملی کہ بعض شیعی حاجیوں نے اپنے قیام مدینہ کے دوران الحسین اور دیگر علویوں سے خفیہ ملاقاتیں کی ہیں تو اس نے شہر میں بنو طالب کی آمد ورفت پر پابندی لگا دی اور حکم دیا ان میں سے ہر ایک کا کوئی عزیز ان کی ضمانت دے اس کے بعد بعض واقعات سے صورت حال مزید خراب ہو گئی۔

ذوالقعدہ کے نصف اول کی ایک صبح پو پھٹتے ہی 26 علویوں اور ان کے بہت سے موالیوں اور دس حاجیوں کے

ایک گروہ نے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم شریف پر قبضہ کر لیا اور موذن کو مجبور کیا کہ وہ شیعی دستور کے مطابق اذان دے، یعنی حی علی خیر العمل کہے۔ یہ اذان سن کر عبدالعزیز سمجھ گیا کہ علوی بغاوت شروع ہو گئی ہے۔ اس بغاوت کا پتہ لگتے ہی وہ خود روپوش ہو گیا اور تلاش کے باوجود کہیں نہ مل سکا۔ الحسین نے نماز فجر کے بعد ایک تقریر کی اور لوگوں سے بیعت لینے کا آغاز کر دیا انہوں نے لوگوں کو ہدایت کی کہ بیعت کے لیے یہ کلمہ استعمال کریں ''علی الکتاب والسنہ والرضا من اہل بیت'' جو خدا کی کتاب اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت اور رضائے اہل بیل کی دعوت تھی۔

الحسین نے لقب مرتضیٰ بھی اختیار کیا جو خلافت کے ولی عہدوں اور خلفا کا دستور تھا اس موقع پر دو علویوں نے ان کی تائید سے انکار کر دیا۔ ان میں سے ایک موسیٰ بن جعفر تھے جو اثنا عشریہ کے ساتویں امام الحسینی کاظم بھی کہلاتے ہیں۔ ایسا ہی واقعہ اس وقت ہوا تھا جب علویوں کے ایک خفیہ اجلاس میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ محمد نفس ذکیہ آئندہ خلیفہ ہوں گے اور بنو حسین کے ممتاز ترین فرد حضرت جعفر صادق نے اپنی رائے دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان دونوں موقع پر حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے محمد نفس ذکیہ کے والد عبداللہ کو کہا تھا کہ اپنے بیٹے محمد کو خطرے میں نہ ڈالو اور جو موسیٰ الکاظم نے الحسین سے کہا تھا وہ یہ تھا کہ ''تم مارے جاؤ گے۔''

یہ خروج عام نہیں تھا اس لیے کہ جب کچھ لوگ مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے آئے تو انہوں نے دیکھا حضرت الحسین طالبی رحمۃ اللہ علیہ منبر پر سفید عمامہ اور سفید جبہ زیب تن کیے بیٹھے تھے۔ وہ سمجھ گئے کہ ان کے ارادے کیا ہیں اور وہ بغیر نماز پڑھے ہی واپس چلے گئے۔ جب اس خروج کی خبر پھیلی تو مدینہ کے بہت سے لوگوں نے اپنے گھروں کے دروازے بند کر لیے۔ اس دوران حاکم مدینہ کے دو سپاہیوں اور بنو عباس سے ہمدردی رکھنے والے رضا کاروں نے مسجد پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ بہت جلد منتشر ہو گئے کیونکہ ان کا قائد یحییٰ ادریس بن عبداللہ کے ہاتھوں قتل ہو گیا، لیکن باوجود کوشش کے پورا شہر باغیوں کے تصرف میں نہ آ سکا اور صورتحال اتنی نازک ہو گئی کہ کھانے پینے کا انتظام کر لینے کے بعد وہ مسجد ہی میں مقیم ہو گئے اور وہاں گیارہ دن تک محصور رہے۔ اس اثنا میں مسجد اتنی غلیظ ہو گئی کہ اسے مکمل طور پر دھونا پڑا۔ آخر کار 24 ذوالقعدہ کو الحسین نے اپنے آپ کو اس صورت حال سے نکالنے کے لیے تین سو مسلح ساتھیوں کے ساتھ جنہیں راستے میں مکہ سے کمک مل گئی تھی وہ شہر کی طرف بڑھے۔ اس سال عباسی خاندان کے بہت سے ارکان فریضہ حج ادا کرنے کے لیے مکہ آئے ہوئے تھے جن میں المہدی کے چچا العباس بن محمد اور اس کا بیٹا عبیداللہ اور کئی دوسرے شامل تھے۔ الہادی نے انہیں حکم دیا کہ اپنی قوت کو مجتمع کر کے الحسین کے مقابلے پر پہنچیں۔ مکہ میں طاقت کا مظاہرہ کر کے وہاں کے لوگوں کو خوفزدہ کر کے عباسی مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

سفید پوش علویوں اور سیاہ پوش عباسیوں میں جنگ فخ کے مقام پر ہوئی جو مکہ سے چھ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ معرکے کے دوران الحسین کو عباسیوں کی طرف سے امان کی پیشکش کی گئی لیکن انہوں نے اسے خودداری سے رد کر دیا اور لڑتے رہے یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ ان کے گرد و پیش میں تقریباً سو آدمی قتل ہوئے جو ان کی ذاتی شجاعت کی علامت تھی۔ اگلے تین دن تک فخ کے مقام پر جنگ میں کام آنے والوں کی لاشیں جنگلی جانور شکار کرتے رہے۔ ابوالزفت یا عبداللہ بن اسحٰق بن ابراہیم کی ایک آنکھ زخمی ہو گئی اور انہوں نے امان قبول کر لی جو انہیں ان کے چچا محمد بن سلیمان نے پیش کی تھی، لیکن اس کے باوجود انہیں عبداللہ بن العباس نے اپنے والد اور موسیٰ بن عیسیٰ کی انگیخت پر قتل کر دیا۔ اس قتل کے نتیجے میں محمد اور دوسرے لوگوں میں ایک بڑا انزاع پیدا ہو گیا۔ دو علویوں ایک محمد نفس ذکیہ کے بھائی اور الحسن کو قتل کروا دیا گیا۔ الحسین طالبی کا سر پہلے الہادی کے پاس لے جایا گیا، جس نے اُسے دیکھ کر خوشی کا اظہار نہیں کیا، بعد ازاں خراساں بھیج دیا گیا تا کہ اس علاقے کے شیعوں کو

عبرت حاصل ہو سکے۔ اس دوران بہت سے باغیوں نے حاجیوں میں مل کر جانیں بچائیں۔ بالخصوص دو علویوں نے جو بعد ازاں مشہور ہوئے یعنی ادریس بن عبداللہ یا ادریس اول اور یحیٰ بن عبداللہ۔ جب الحسین کے قتل کی خبر مدینہ پہنچی تو عبدالعزیز اپنی پناہ گاہ سے نکل آیا اور اپنے عہدے پر واپس آ کر اس نے بعض علویوں کے مکانات جلوا دیئے۔ اور ان کے مکینوں کا مال مال غنیمت سمجھتے ہوئے ضبط کر لیا۔ اس طرح اس خروج کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ خروج مقتولین کی تعداد کی وجہ سے خروج کربلا سے ذرا کم تھا۔ عباسی خلیفہ المہدی اپنے عہد کے شروع میں شیعی فرقے کی جانب مصالحانہ رویہ رکھتا تھا بعد ازاں اس کا رویہ معاندانہ ہو گیا اور یہی روش اس کے جانشین الہادی نے اپنائی جس کی وجہ سے یہ واقعہ پیش آیا۔

محمد احمد بن عبداللہ مہدی سوڈانی (1843ء تا 1885ء)

انیسویں صدی میں ترکوں اور انگریزوں کے خلاف سوڈان کی جنگوں کا قائد

نام ونسب: محمد احمد بن عبداللہ، مہدی سوڈانی

پیدائش: وہ 1843ء میں دنقلہ کے جزیرے میں پیدا ہوئے جو العوردہ کے شمال میں واقع مجمع الجزائر ارگو کا حصہ ہے۔ وہ عرب کے بربر میں سے کنوز خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ بعد کی زندگی میں مہدی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا شجرہ نسب اور سلسلہ بیعت ثابت کرنے کے لیے اپنے حسب ونسب کی جو تفصیل دی تھی اس کی رو سے والد کی جانب سے اس نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ سے اور والدہ کی طرف سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس علمدار سے صلبی نسبت ظاہر کی۔

وہ بحری جہاز اور کشتیوں پر کام کرنے والے ایک بڑھئی کا بیٹا تھا، اس کے 4 بہن بھائی تھے۔ ابتدائی زمانے ہی سے اس کی طبیعت تصوف کی جانب مائل تھی اور معمولی تعلیم کے بعد اس نے 1861ء میں سلسلہ سمانیہ میں شیخ محمد شریف سے بیعت کی تھی۔ سات سال کی ارادت مندی کے بعد شیخ شریف اسے اس سلسلے کی خلافت مرحمت کر دی۔ کچھ عرصہ خرطوم میں قیام کرنے کے بعد جہاں اس نے شادی بھی کر لی وہ نیل ابیض سے آبا نامی جزیرے میں چلا گیا جو کوتی کے شمال میں واقع ہے۔ اس جزیرے پر اس نے ایک جامع مسجد اور ایک خانقاہ بھی تعمیر کرائی اور مریدوں کو اپنے گرد جمع کر کے وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اس کے پیر ومرشد شیخ شریف بھی جن سے اس نے قریبی تعلقات برابر قائم رکھے تھے 1872ء میں اس جزیرے پر اس کے قریب ہی آبسے۔ شواہد سے محسوس ہوتا ہے کہ اپنے شیخ کی یہ بات اسے کچھ زیادہ پسند نہیں آئی بلکہ ناگوار گذری۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد محمد احمد کے دل پر یہ القا ہوا کہ وہ مہدی المنتظر ہے۔ یہ کیفیت ان روایات کے پیش نظر جو مسلمانوں میں حضرت مہدی المنتظر کے متعلق پائی جاتی ہیں۔ اس کیفیت کے بعد اس کے تعلقات اپنے شیخ سے بگڑ گئے۔ اب وہ اپنے پہلے شیخ طریقت کے حریف شیخ القرشی سے جا ملا اور 1880ء میں اسی کا سجادہ نشین بھی بن گیا۔ دنقلہ سے مقام سنار اور نیل ارزق سے کردفان تک کے علاقے کی سیاحت کے دوران اس نے بھانپ لیا کہ لوگوں کے دلوں میں سیاسی بددلی اور بے اطمینانی موجود ہے اور ان پر مصری حکومت کی طرف سے تشدد کیا جا رہا ہے۔ سوڈان کی مخلوط آبادی اس کا مذہبی جنون، ترکوں اور عربوں کا باہمی نفاق ترکوں کے حکمران طبقے سے شیعوں کی دیرینہ مخالفت، یہ سب وہ حقائق تھے جو اس کی مہدویت کے دعوے کے لیے بارآور ثابت ہو سکتے تھے۔ محمد احمد نے ان سب کوائف کا جائزہ لے کر جو تحریک شروع کی وہ اس کے خطوط اور اعلانات کے مطابق اس کی روحانی واردات پر مبنی تھی جس کا اسے پورا یقین تھا اور شروع ہی سے یہ تحریک سیاسی اور معاشرتی خیالات سے مخلوط ہو گئی جو دنیائے مشرق میں مذہب سے علیحدہ نہیں کیے جا سکتے؛ آخر میں اس تحریک نے کچھ منفی رخ بھی

اختیار کیا۔ روایات میں بیان شدہ کلیئے کے مطابق محمد احمد مہدی نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ دنیا کو بدکاری اور برائی سے پاک کرنے کی غرض سے آیا ہے، اس غرض کے لیے اس نے سب سے پہلے نولوگوں کو ''ترکوں'' کے خلاف جہاد کرنے کی دعوت دی۔ اس سے قبل وہ کردفان اور دارفور کے علاقوں کے متعدد سرداروں کو بیعت کے ذریعے حلف وفاداری (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے طریقے کے مطابق اپنے سے وابستہ کر چکا تھا اور عبداللہ الطعایشی (جو بعدازاں اس کا خلیفہ ہوا) جیسے بہادر افراد کو اپنے ساتھ ملا چکا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے مختلف رسالوں اور فرمانوں کے ذریعے لوگوں کو اپنی تائید وحمایت کرنے پر مائل کیا اور انہیں بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنی زیارت سے مشرف فرمایا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے اُسے مہدی الزماں مقرر کیا ہے۔ نیز یہ کہ اس نے حضرت خضر علیہ السلام، حضرت جبرائیل علیہ السلام اور دیگر اقطاب کی زیارت بھی کی ہے۔ اور انہیں (لوگوں کو) دعوت دی کہ ''مذہبی زندگی'' کی تطہیر کریں، اور لوگ ''ہجرت'' کرکے اس کے پاس آئیں اور اس کی بیعت کریں۔ اسے مہدی الزماں مان کر اس کی تقلید کریں اور جہاد میں حصہ لیں وغیرہ وغیرہ۔ دارنو یہ میں گدیر کی پہاڑی اس کی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی۔

شعبان 1881ء میں وہ پہلی مرتبہ المہدی کی حیثیت سے منظر عام پر آیا۔ محمد احمد کی جو گفت وشنید خرطوم کی حکومت سے ہوئی وہ بے سود ثابت ہوئی اور ابوالسعود کی قیادت میں فوج کے جو دستے اس کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے بھیجے گئے وہ اس کے مریدوں نے تباہ کر دیے۔ اس عسکری کارنامے کے بعد اسے مزید فتوحات حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ مزید براں مصری حکومت کو مصر میں اعرابی پاشا کی بغاوت کی وجہ سے اس کے خلاف کوئی شدید کارروائی کرنے کا موقع بھی نہ ملا جس سے اس کے اور اس کے ساتھیوں کے حوصلے بڑھ گئے، اس کے پیروکار جو درویش کہلاتے تھے انہوں نے دو سال کے اندر اندر تقریباً پورے سوڈان پر قبضہ کر لیا۔ ان کے خلاف فاشودہ کے حاکم رشید پاشا، یوسف السلالی (گدیر میں مئی 1882ء) اور ھکس HICKS پاشا شیکان یا کشکل میں) کی مہمات سب کی سب ناکام ہوگئیں۔ اس طرح مہدیہ سلسلہ بلاروک ٹوک کردفان سے بحر الغزال کی راہ سے مشرقی سودان تک پھیل گیا۔ وہاں سواکن میں عثمان دقنہ جو غلاموں کی تجارت کرتا تھا اور بعدازاں مہدی کا قابل ترین سپہ سالار ثابت ہوا، مہدی کی ملازمت میں داخل ہوگیا۔ مہدی کی یہ خواہش بھی تھی کہ وہ مغرب کی سمت میں اپنی طاقت کو بڑھائے۔ اس غرض سے اس نے محمد السنوسی سے جنوب میں اور مراکو سے تعلقات اور اتحاد پیدا کرنے کی کوشش جو بے نتیجہ رہی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز مصر پر اپنا تسلط جما چکے تھے چنانچہ مصری حکومت مہدیوں کی بغاوت کچلنے کے لیے ایک انگریز جنرل گورڈن کی خدمات حاصل کیں۔ مہدی بھی اس زمانے میں اپنے عروج پر تھا۔

1884ء میں ایک مہم اسے خرطوم لے گئی جہاں انگریزی جنرل گورڈن نے بڑی بہادری سے درویشوں کا مقابلہ کیا، لیکن خرطوم 30 جنوری 1885ء کو مہدی کے قبضے میں آگیا اور گورڈن مارا گیا۔ تاہم اس فتح کے بعد محمد احمد مہدی بھی کچھ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکا۔ وہ مصر پر حملے کی تیاری میں مصروف تھا کہ 9 رمضان 1302ھ/22 جون 1885ء کو وہ بعارضہ تپ محرقہ ام درمان میں جو خرطوم کے قریب واقع ہے، وفات پا گیا۔ یہاں بعدازاں اس کی قبر پر اس کے خلیفہ عبداللہ نے ایک قبہ تعمیر کرایا۔ اب ام درمان مہدیوں کا صدر مقام بن گیا تا آنکہ لارڈ کچنر LORD KITCHNER نے 1897 جنرل گورڈن کا انتقام لیتے ہوئے خلیفہ عبداللہ کی حکومت اور سلسلہ مہدیہ دونوں کا خاتمہ کر دیا۔

محمد احمد مہدی کی قیادت میں مہدیہ سلسلے کی تنظیم نے خاصی ترقی کی تھی۔ یہ تنظیم جو شروع میں سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی دعویدار تھی، بعدازاں ایک خالصتاً عسکری تنظیم بن گئی کیونکہ جہاد کو حج سے زیادہ اہم تسلیم کر لیا گیا تھا۔ محمد احمد مہدی کے چار خلفاء اس کے پاس رہتے تھے جن میں سے الطعایشی اس کا گہرا دوست تھا، اس میں شبہ نہیں کہ مہدی کی

شخصیت پر اس دوست کا اثر بھی نہایت گہرا تھا۔ مال غنیمت کی تقسیم میں خاص توجہ سے کام لیا جاتا تھا اور اسی طرح بیت المال کے انتظام میں بھی بڑی احتیاط برتی جاتی تھی۔

محمد احمد مہدی کی تعلیمات کی بعض خصوصیات سے انتہائی مقبول عام تصوف کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کا زاہدانہ رویہ دنیاوی ترقی کے خلاف تھا۔ مہدیہ سلسلہ چونکہ رسمی تعلیم کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا، اس لیے تعلیم یافتہ طبقہ اس کے مریدین سے بالکل الگ تھلگ رہا۔ ان کے نزدیک قرآن پاک کے علاوہ اگر کسی چیز کو وقعت حاصل تھی تو وہ مہدی کے احکام تھے یا راتب اور مجلس نامی مجموعہ وظائف کتاب جس میں محمد احمد مہدی کی جمع کردہ اور تالیف کردہ سنہ تھی (مجموعہ احادیث) جو سنت کی پہلی کتابوں کی جگہ مستعمل تھی، لیکن نامکمل ہی رہی۔ چاروں فقہی مسلک کے ترک کرنے میں اس ''اختلاف'' کا اظہار ہوتا ہے جو صوفیہ کرام میں اکثر پایا جاتا ہے۔ بعض قواعد وضوابط میں وہابیت کے اثرات کا غلبہ محسوس ہوتا ہے، مثلاً آرائش وزیبائش، موسیقی، شادی بیاہ پر فضول خرچی، تمباکو نوشی اور شراب نوشی منع تھی، بالخصوص پیر پرستی اور جھاڑ پھونک تعویذ، گنڈوں کی مخالفت میں بھی بڑے غلو سے کام لیا جاتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ محمد احمد مہدی اپنی موت سے کچھ پہلے اپنے پیروؤں اور معتقدین کی نظر میں ایک دیوتا یا اوتار کے جیسا مقام پا گیا تھا۔ محمد احمد مہدی نے پانچ ارکان سنہ کی جگہ چھ ارکان مقرر کیے تھے۔

(1) صلواۃ، نماز باجماعت پر بے حد زور دیا گیا تھا۔
(2) جہاد کو حج بدل قرار دے دیا گیا تھا۔
(3) اللہ کے احکام کی اطاعت۔
(4) اضافہ شدہ کلمہ شہادت
(5) تلاوت قرآن
(6) راتب یعنی وظائف اذکار۔

امیر عبدالقادر الحسنی (1808ء تا 1883ء)

الجزائر پر فرانسیسی قبضے کے خلاف جدوجہد کے نامور قائد

نام ونسب: عبدالقادر بن محی الدین، الحاج امیر عبدالقادر الحسنی الجزائری، ایک نجیب الطرفین شرفاء کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو شرافت علم وفضل اور زہد وتقویٰ کی وجہ سے مشہور تھا۔ وہ اصلاً ریف کے رہنے والے تھے اور قبیلہ ہاشم میں آباد ہوگئے تھے۔ 1223ھ/ 1808ء میں المعسکر سے کوئی 20 کلومیٹر جانب غرب وادی الحمام میں قیطنہ کے مقام پر پیدا ہوئے۔ انہوں نے ارزیو ARZEW اور پھر وہران ORAN میں تعلیم حاصل کی، 1829ء میں ان کی شادی ہوئی اور انہوں نے حج کیا۔ یہ ہیں اہم ترین کوائف جو مورخین نے ان کی جوانی کے متعلق جمع کیے ہیں۔

فرانسیسی قبضہ اور اس کے خلاف اعلانِ جہاد: فرانسیسیوں نے 5 جولائی 1830ء کو الجزائر پر قبضہ کرنے کے بعد اپنی فتوحات کو منظم کرنے کے سلسلے میں جس تامل وتذبذب سے کام لیا اس سے محی الدین کو جو وہران میں تھے، یہ موقع مل گیا کہ وہ عیسائیوں کے خلاف جہاد کا علم بلند کر دیں۔ انہوں نے جلد ہی اس کی قیادت اپنے بیٹے امیر عبدالقادر کو سونپ دی اور 5 رجب 1284ھ/ 22 نومبر 1832ء کو قبائل الہاشم، بنو عامر اور الغرابہ نے اعلان کر دیا کہ وہ عربوں کے سلطان ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ خود آبادی کے بعض عناصر عبدالقادر کے سخت مخالف تھے اور ان کے حامیوں کو وہران اور مستغانم کے سامنے ناکامی ہوئی (1833ء)

عبدالقادر کی سرگرمیوں کے باعث ملک میں شورش برابر جاری رہی۔ اس صورت حال نے فرانسیسی جنرل دی میثال DESMICHELS کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ وہ اپنے حریف سے صلح کر لے۔ (26 فوری 1834ء)۔ اس

طرح سرکاری طور پر تسلیم کیے جانے کے بعد الجزائر کے اس نئے امیر المومنین نے اپنے حلقہ اقتدار کو الجزائر کے دروازوں تک وسعت دے دی لیکن بہت جلد جنگ کی آگ پھر بھڑک اٹھی، چنانچہ پہلے مارشل کلوزیل CAUZEL اور پھر بیجو BUGEAUO نے مقطع MACTA کی شکست (28 جون 1835ء) کا انتقام یوں لیا کہ معسکر کو نذر آتش کر دیا۔ (6 دسمبر) تلمسان پر قبضہ کرلیا (6 جنوری 1836ء) اور وادی کے کنارے ایک شاندار فتح حاصل کی (6 جولائی)

عبدالقادر کی فوجوں نے اگرچہ تین مرتبہ اس کا ساتھ چھوڑ دیا، لیکن انہوں نے تین مرتبہ ہی اپنی فوجوں کو دوبارہ مجتمع کرلیا۔ فرانسیسیوں کی حالت بھی بدستور نازک رہی کیونکہ ان کے شہر محصور تھے، ان کے فوجی دستوں کو مسلسل پریشان کیا جاتا تھا اور ان کے ساتھیوں کو سزائیں دی جاتی تھیں۔ اس خیال سے کہ مغربی حصہ ملک کو ایسی حالت میں جب قسطنطنیہ CONSTANTINE کے خلاف مہم بھیجی جارہی تھی، حملوں سے بچایا جائے لوئی فلپ کی حکومت نے امیر عبدالقادر سے صلح کی بات چیت کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ معاہدہ تافنہ TREATY OF TAFNA پر دستخط کر کے بیجو نے بھی ایک بدتر صورت میں اسی غلطی کا اعادہ کیا جو جنرل دی میثال سے سرزد ہوئی تھی۔ فرانسیسی اگرچہ دہران، ارزیو، مستغانم، بلیدہ اور کولیہ پر قابض رہے، تاہم عبدالقادر کو وہران کا سارا صوبہ، الجزائر کے صوبے کا حصہ اور تیطری کی ساری ولایت مل گئی۔

جون 1837ء سے نومبر 1839ء تک امیر عبدالقادر نے جنگ بندی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان علاقوں کے نظم ونسق کی درستی پر توجہ دی جو انہیں مل گئے تھے۔ انہوں نے تقدمۃ TAGDAMPT میں اپنا دارالحکومت قائم کیا اور اپنی نئی مملکت کے اندرونی دورے شروع کر دیئے اور مقامی رئیسوں کی تقرری سے نظام کو بہتر بنانے کی کوشش کی اور جنوب میں صحرا تک اپنا اقتدار تسلیم کرلیا۔

عبدالقادر اپنے ان دوروں کے دوران معاہدہ تافنہ کی حدوں سے بھی آگے بڑھ گئے جو فرانسیسی مقرر کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ فرانسیسی جنرل مارشل والی VALEE نے ایک نئے معاہدہ کا مسودہ بھیجا، جس میں ان علاقوں کا تعین کیا گیا تھا، لیکن امیر عبدالقادر نے اس نئے مسودے کی تصدیق کرنے سے انکار کر دیا۔

''آہنی پھاٹکوں کی مہم'' نے جس کے دوران ڈیوک آف اورلینز نے قسطنطنیہ کو الجزائر سے ملا دیا، امیر کے لیے جنگ جدال کی اہم وجہ پیدا کر دی۔

20 نومبر 1839ء کو اس کی فوجوں نے متیجہ MITIDJA پر حملہ کر دیا، فرانسیسیوں کی نوآبادیوں کو تاراج کیا اور آبادکاروں کو تہہ تیغ کر دیا۔ اب الجزائر خطرے میں پڑ گیا۔ فرانسیسیوں نے پہلے ملیانہ اور پھر المدیہ MEDEA پر قبضہ کرلیا۔ (مئی جون 1840ء) لیکن اس قبضے سے فرانسیسیوں کی مشکلات میں کوئی کمی واقع نہ ہو سکی۔ کیونکہ انہیں اپنی قلعہ بند فوجوں کو رسد پہنچانے کے لیے حفاظتی دستوں کی نقل و حرکت ضروری تھی مگر ان پر متواتر حملے جاری تھے۔

گورنر جنرل کے عہدے پر جنرل بیجو کی نامزدگی نے حالات کا رخ موڑ دیا۔ وہ یہ سمجھ گیا کہ جب تک عبدالقادر کی طاقت کو ختم نہیں کیا جائے گا حفاظتی دستوں کی نقل و حرکت جاری نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی الجزائر پر قبضہ رکھا جا سکتا ہے۔

1841ء سے 1843ء تک بیجو نے تقدمۃ، معسکر، بوغازی، تازہ، سیدہ اور تلمسان کے علاوہ بھی کئی شہر سر کر لیے اور ایک عسکری مہم اس غرض سے روانہ کی کہ امیر عبدالقادر کو گرفتار کیا جائے اور اس کے حامیوں اور مددگاروں کو ختم کر دیا جائے۔ امیر کے سفری دارالحکومت سمالہ پر قبضہ (16 مئی 1843ء) ہو جانے سے ان کی طاقت پر ضرب کاری پڑی اور ان کے حلیف قبائل نے فرانسیسیوں کی اطاعت اختیار کرلی۔ امیر عبدالقادر کا تعاقب جاری رکھا گیا اسی تعاقب کی وجہ سے اپنی کمزوری محسوس کرتے ہوئے امیر نے اسی سال کے آخری حصے میں بالآخر مراکش کی سرحدوں میں پناہ لی۔ وہ چاہتے تھے کہ

کسی جگہ امن سے بیٹھ کر نئی فوج تیار کر لیں اور مراکش سے فرانس کے تعلقات بھی نہ رہیں۔ ان کی توقعات غلط ثابت ہوئیں اور فرانسیسیوں نے مراکش کے علاقوں پر قبضہ کر کے مراکش کے سلطان مولائی عبدالرحمٰن کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے مہمان، امیر عبدالقادر کو ملک سے نکال دے۔ امیر عبدالقادر 1846ء میں ان ہنگاموں کی قیادت کرنے جن کے شعلے ہر طرف بلند ہو رہے تھے۔ واپس الجزائر پہنچ گئے۔ ان کی ابتدائی کامیابیوں نے ایک بار پھر توقع پیدا کر دی کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لہٰذا ان ہنگاموں کو فرد کرنے اور امیر عبدالقادر کو واپس مراکش کی طرف دھکیلنے کے لیے فرانس کو فوج کے اٹھارہ دستے استعمال کرنا پڑے۔ سلطان مراکش اب امیر عبدالقادر کا دشمن بن گیا کیونکہ سلطان خائف تھا کہ عبدالقادر اس کے اقتدار شاہی میں رقیب بن جائیں گے۔ مراکشی فوج کے حملوں کی وجہ سے امیر عبدالقادر الجزائر میں داخل ہو گئے اور جنوب کی طرف آگے بڑھنے کے تمام راستے مسدود پا کر انہوں نے مجبوراً اپنے آپ کو 23 دسمبر 1847ء کو فرانسیسی جنرل Dued AUMALE کے حوالے کر دیا۔

ان سے وعدہ کیا گیا کہ انہیں مکہ یا اسکندریہ پہنچا دیا جائے گا لیکن انہیں فرانس میں اگلے پانچ سال تک نظر بند رکھا گیا۔ 16 اکتوبر 1852ء کو صدر فرانس شہزادہ لوئی نپولین نے امیر کو رہا کر دیا۔ اس کے بعد الجزائر کے جہاد آزادی کے قائد نے فرانس کی شہریت اختیار کر لی۔ اور کچھ عرصہ فرانس میں گزارنے کے بعد دمشق میں جا بسے (1855ء) امیر عبدالقادر نے 1883ء میں وفات پائی اور ابن عربی کے مقبرے (دمشق) میں دفن کیے گئے۔

سید احمد شہید (1786ء تا 1830ء)

انیسویں صدی کے نصف میں ہندوستان کے مشہور بزرگ، عالم باعمل، مصلح، مجاہد اور قائد

نام ونسب: سید احمد شہید بن سید محمد عرفان، 6 صفر 1201ھ/ 28 نومبر 1786ء میں ہندوستان کے شہر رائے بریلی (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ آپ کا شجرہ نسب چھتیسویں پشت میں جا کر امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملتا ہے۔ سادات کا یہ خاندان سلطان التمش کے زمانے میں ہندوستان آ کر گڑہ مانک پور میں آباد ہو گیا تھا۔ سید احمد کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ تحصیل علم پر ان کی زیادہ توجہ نہیں تھی وہ مردانہ کھیلوں کے بڑے شائق تھے۔ ہم عمر لڑکوں کا لشکر بنانے اور بطور جہاد بہ آواز بلند تکبیریں کہتے ہوئے ایک فرضی دشمن لشکر پر حملے کرتے تھے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ میں قائدانہ صلاحیتیں بچپن سے بدرجہ اتم موجود تھیں۔ شوق جہاد ان پر ہر زمانے میں غالب رہا۔ جسمانی قوت بھی غیر معمولی تھی، ورزش بہت کرتے تھے نیز اپنا وقت زیادہ تر ہمسایوں اور اہل محلہ کی خدمت میں صرف کرتے تھے۔

جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد چند عزیزوں کے ہمراہ ملازمت کے لیے لکھنو گئے، جو ملازمت کے خواہاں تھے، جتنی اسامیاں نکلیں وہ سب دوسروں کو دلا دیں اور خود تحصیل علم ظاہر و باطن کے شوق میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے پاس دہلی پہنچ گئے۔ شاہ صاحب نے انہیں اپنے بھائی شاہ عبدالقادر محدث کے پاس اکبر آبادی مسجد میں بھیج دیا۔ اس زمانے میں سید صاحب کی طاعات وعبادات قابل رشک تھیں۔ آغاز سلوک میں سالہا عشاء کی نماز کے وضو سے فجر کی نماز ادا کرتے تھے۔ 1807ء میں شاہ عبدالعزیز سے بیعت سلوک کی اور منازل سلوک طے کر کے 1808ء میں وطن واپس ہوئے۔ انہیں دنوں آپ رحمۃ اللہ علیہ کی شادی ہوئی۔

ہندوستان میں اسلامی حکومت کی بحالی اور شرعی نظام کا اجرا، سید صاحب کا محبوب ترین نصب العین تھا۔ اسی کے لیے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی۔ صاحبان وقت وجاہ و حشم اور سالاران عسکر میں سے صرف نواب امیر خان اس کار

حق میں معاون بن سکتا تھا کہ اس کے پاس زبردست فوج اور بھاری توپ خانہ موجود تھا۔ اور وہ انگریزوں کے اثر سے آزاد ہونے کے علاوہ وسط ہند میں چھاؤنی ڈالے پڑا تھا۔ چنانچہ 1809ء میں سید صاحب نواب موصوف سے ملنے کے لیے راجپوتانہ پہنچ گئے اور سات برس ان کے ساتھ گذارے کہ نواب **صاحب** اپنی عسکری قوت کو اسلامی مقاصد کے حصول کے لیے وقف کردیں۔ اس دوران نواب صاحب کو جو لڑائیاں پیش آئیں سید صاحب ان میں بھی شریک رہے اور ان کے لشکر میں احیائے دین کا کام بھی جاری رکھا۔

انگریزوں کے جوڑ توڑ کرنے سے 1817ء میں نواب صاحب کے حالات اچانک نازک صورت اختیار کر گئے اور وہ انگریزوں سے معاہدہ کر کے ٹونک کی ریاست لینے اور اپنی فوج کو منتشر کرنے پر رضامند ہو گئے۔ سید صاحب نے انہیں اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر بے سود رہی اور سید صاحب نواب صاحب کی رفاقت ترک کر کے 1818ء کے وسط میں دہلی پہنچ گئے اور مسلمانوں کی دینی اصلاح کے ساتھ ساتھ جہاد کے لیے ایک تنظیم قائم کرنے میں مصروف ہو گئے۔

دہلی میں سید صاحب کو بہت سے رفیق اور ہم خیال مل گئے جن میں حضرت شاہ ولی اللہ کے خاندان کے دو ممتاز و مشہور عالم دین (شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے) مولانا شاہ اسمٰعیل اور ان کے داماد مولانا عبدالحئی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ تقریباً دو سال تک انہوں نے روہیل کھنڈ، آگرہ اور اودھ کے مختلف مقامات کے دورے کیے اور دینی اصلاح اور تنظیم جہاد کا کام کرتے رہے۔ شاہ اسمٰعیل اور مولانا عبدالحئی نے جہاد اور شہادت کے فضائل پر مسلسل واعظ کا سلسلہ جاری رکھا اور اس اہم فریضہ کی اہمیت و فضیلت مسلمانوں کے ذہن و دل میں بٹھا دی جس سے مسلمان خود بخود جان و مال راہ خدا میں قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے اور اسے سعادت سمجھنے لگے۔ مشاغل سلوک کے علاوہ فنون جنگ کی مشق بھی سید صاحب کے مریدوں کا مشغلہ بن گئی۔ سید صاحب نے اصلاح معاشرہ کے سلسلے میں نکاح بیوگان کا اجراء کیا جسے اس دور میں مسلمان شرفا ہندوؤں کی طرح باعث ننگ سمجھنے لگے تھے۔ سید صاحب نے خود اپنی بیوہ بھاوج سے عقد کیا۔

سمندری راستوں پر فرنگیوں کے قابض ہونے کے بعد سے مسلمانوں کے لیے حج پر جانا دشوار ہو گیا تھا۔ ان حالات میں بعض علماء نے فرضیت حج کے ساقط ہو جانے کا فتویٰ دے دیا کہ امن طریق باقی نہ رہا جو شرائط حج میں شامل ہے۔ حضرت شاہ اسمٰعیل اور حضرت مولانا عبدالحئی نے بہ دلائل یہ فتویٰ رد قرار دیا اور حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی نے اس رد کی توثیق کر دی۔

مگر یوپی کے مولوی یار علی نے ایک قدم آگے نکلتے ہوئے حرمت حج کا فتویٰ دے دیا کہ یہ اپنے آپ کو جان بوجھ کر ہلاکتوں میں ڈالنے کے برابر ہے۔ ان افکار باطلہ کی تردید کے لیے سید صاحب نے خود حج کا ارادہ کیا اور اعلان کیا جو مسلمان چاہے وہ ساتھ چلے چاہے اس کے پاس خرچ ہو یا نہ ہو۔ 753 آدمی ان کے ساتھ حج پر جانے کے لیے تیار ہو گئے آپ نے ان سب کا خرچہ خود برداشت کیا۔

حج سے واپسی پر آپ ہمہ تن جہاد کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ جہاد کا مقصد تھا کہ اسلامی حکومت بحال ہو جائے نہ کہ آپ کو کوئی سلطنت کی خواہش تھی۔ 7 جمادی الآخرہ 1241ھ/ 17 جنوری 1826ء کو سید صاحب نے دار الحرب ھند سے ہجرت کی۔ پہلے قافلے میں غازیوں کی تعداد پانچ چھ سو کے درمیان تھی اور سید صاحب کے پاس پانچ چھ ہزار روپے کی رقم تھی۔ رائے بریلی سے کالپی، گوالیار، ٹونک، اجمیر، پالی، امرکوٹ، حیدرآباد سندھ، بولان کوئٹہ، قندھار، غزنی، کابل اور جلال آباد ہوتے ہوئے آپ پشاور پہنچے۔ پینتالیس روز اس مقصد کے لیے کہ لوگوں کو دعوت جہاد دی جائے کابل میں مقیم رہے اور امیر افغانستان اور ان کے بھائیوں کے اختلافات دور کرنے کی کوشش کی۔

سید صاحب کے عزم جہاد کا شہرہ سن کر پنجاب و سرحد کی سکھ حکومت نے جرنیل بدھ سنگھ کی قیادت میں دس ہزار

فوج کو اکوڑہ (سرحد) بھیج دیا۔ 20 جمادی الاولیٰ 1224ھ/20 دسمبر 1826ء کو نو سو غازیوں نے جن میں سے ایک سو چھتیس ہندوستانی تھے سکھ فوج پر شب خون مارا اور سات سو سکھوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہندوستانی شہداء کی تعداد صرف چھتیس تھی۔ اکوڑہ کی کامیابی نے مجاہدین کے دلوں میں امید کا چراغ روشن کر دیا۔ 11 جنوری 1827ء کو بمقام ھنڈ سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت امامت جہاد کی گئی اس میں پشاور کے درانی سرداروں نے بھی بیعت کی اور سکھوں سے لڑنے کے لیے تقریباً ایک لاکھ مجاہد جمع ہو گئے۔ سکھوں نے دھمکی آمیز خط لکھ کر پشاور کے درانی سردار یار محمد کو ساتھ ملا لیا۔ اس نے جنگ سے ایک رات پہلے سید صاحب کو زہر دلوا دیا۔ پھر جب جنگ شروع ہوئی اور سکھوں کے پیر اکھڑنے لگے تو خفیہ قرارداد کے مطابق یار محمد اور اس کے بھائی شکست شکست کا شور مچاتے ہوئے میدان سے بھاگ نکلے اس طرح غازیوں کی یہ فتح شکست میں بدل گئی اور سکھوں نے اپنی چالاکی سے یہ میدان جیت لیا۔

اب سید صاحب نے پنجتار کو اپنا مستقر بنا لیا، لیکن رنجیت سنگھ برابر فوجیں بھیجتا رہا اور اپنے جاسوسوں کے ذریعے اس نے رشوت دے کر بعض سرحدی سرداروں کو رشوت دے کر سید صاحب اور مجاہدوں کے خلاف کھڑا کر دیا۔ اس پر سید صاحب نے کشمیر کو مرکز جہاد بنانے کا فیصلہ کیا جب مجاہدین کشمیر جا رہے تھے تو کچھ لوگوں نے ان کی روانگی کی اطلاع سکھوں کو کر دی۔ بالاکوٹ کے مقام پر سکھوں نے بے خبری میں مجاہدین کو گھیر لیا۔ سکھوں کی فوج کہیں زیادہ تھی چنانچہ سید صاحب نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مردانہ وار لڑتے ہوئے جمعہ 6 مئی 1831ء کو جام شہادت نوش کیا۔ آپ کا مزار بالاکوٹ میں مرجع خلائق ہے۔

امام شامل داغستانی

امام شامل رحمۃ اللہ علیہ داغستان میں نقشبندیہ سلسلے کے پیشوا اور روسی حکومت کے خلاف جہاد آزادی کے آخری قائد

نام ونسب: امام شامل، داغستان کے ایک ہر دلعزیز قائد، نقشبندیہ سلسلے کے پیشوا، روس کے خلاف جہاد آزادی کا سب سے آخری اور سب سے کامیاب راہنما۔ اپنے پیشروؤں کی طرح وہ بھی اواس AVAS سے تعلق رکھتا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے آخری سالوں میں موضع گمری GIMRI میں پیدا ہوا، جہاں ان کی آبائی جائیداد واقع تھی۔ سب سے پہلے انہوں نے 1830ء میں خون زاق کے قلعے پر حملہ کر کے شہرت حاصل کی اگرچہ یہ حملہ ناکام رہا۔ 1834ء میں اس کے پیشرو حمزہ بیگ کی شہادت کے بعد حریت پسندوں نے انہیں اپنا سالار امر دسے کارواں بنا لیا۔ 1837ء میں انہوں نے شکست کھائی اور مجبوراً ہتھیار ڈالنے پڑے۔ درحقیقت یہ ایک قسم کی جنگ بندی تھی جو عمل میں آئی۔ ایک سال بعد انہوں نے پھر اقتدار حاصل کر کے داغستان کے ایک بڑے حصے پر اپنی حکومت قائم کر لی بلکہ اس کے مغرب میں چیچنیا پر بھی قبضہ کر لیا۔ ان کا نظام حکومت احکام شریعت کے مطابق تھا۔ اسی لیے ان کا عہد حکومت بعد ازاں "عہد شریعت" کے نام سے مشہور ہوا۔ ان کا علاقہ 32 اضلاع میں منقسم تھا اور ہر ضلع میں ایک نائب صوبے دار اور عدالتی امور کے تصفیے کے لیے ایک مفتی مقرر تھا۔ مفتی کے ماتحت چار قاضی ہوتے تھے جن کا تقرر خود مفتی کرتا تھا۔ شامل کی مسلح فوج ساٹھ ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ البتہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کی کوئی باقاعدہ فوج نہیں تھی بلکہ مجاہدین ان کے ساتھ تھے۔ داغستان کا کوہستان اور اس سے بھی زیادہ دشوار گزار چیچنیا کے جنگل ان کی سلطنت کی پشت و پناہ تھے اور دشمن سے بچاؤ کا کام دیتے تھے۔ اس علاقے میں قلعہ ودنو WEDENO واقع تھا جو 1845ء تک سے لے کر روسی فتح یکم اپریل 1859ء تک امام شامل کی سکونت گاہ رہا۔

روسی حکومت نے فوجی قوت کے بل بوتے پر بغاوت کو فرو کرنے کی چند ناکام کوششیں کرنے کے بعد 1845ء میں پہاڑی علاقے کے اندر آہستہ آہستہ نفوذ کی تدبیر اور جنگلوں کی صفائی شروع کی۔ ادھر امام شامل نے سلطنت ترکیہ سے

فوجی اور مالی مدد طلب کی جو ترکیہ روس کے ساتھ جنگ کریمیا میں الجھے ہونے کی وجہ سے فراہم نہ کرسکا۔ ویدنو WEDENO کے سقوط کے بعد جنگ کا فیصلہ ہوگیا۔

25 اگست 1859ء کو امام شامل نے اپنے آخری پہاڑی قلعے گونیب GONIB میں ہتھیار ڈال دیئے اور انہیں کامیابی کی کوئی امید نہ رہی۔ سینٹ پیٹرز برگ میں جب وہ روس کے زار الیگزنڈر ثانی کے روبرو بطوری باغی پیش ہوئے تو اس نے شہر کالوگا KALUGA ان کی اور ان کی اولاد کی سکونت کے لیے ان کو عطا کردیا۔ وہیں انہوں نے خود درخواست دائر کرکے 1866ء میں اپنی اور اپنی اولاد کی طرف سے زار کی وفاداری کا حلف اٹھایا۔ فروری 1869ء میں وہ روس کی طرف سے اجازت ملنے پر حج کے لیے مکہ چلے گئے۔ جہاں مارچ 1871ء میں انہوں نے مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ ان کی وفات سے قبل ان کے سب سے بڑے بیٹے غازی محمد کو اپنے بیمار باپ کی عیادت اور دیکھ بھال کے لیے مکہ جانے کی اجازت دی گئی۔ اس کے بعد غازی محمد نے سلطنت ترکیہ کی ملازمت اختیار کرلی اور وہ 1877ء کی جنگ میں شریک ہوا۔ نیز داغستان کے لوگوں میں اس نے شورش پیدا کرنے میں بھی حصہ لیا۔ اس نے 1903ء میں مکہ میں وفات پائی۔ امام شامل کے دوسرے بیٹے محمد شفیع نے روس کی ملازمت اختیار کرلی تھی اور بالآخر میجر جنرل کے عہدے پر فائز ہوکر قازان میں مقیم ہوگیا تھا۔

شریف حسین بن علی (1854ء تا 1931ء)

ترکی حکومت کے خلاف حجاز میں بغاوت کا طوفان بپا کرنے والا عرب قوم پرست قائد

نام و نسب: شریف حسین بن علی، شریف مکہ، شریف حسین حجاز کے ہاشمی سادات کے ایک مقتدر گھرانے سے تعلق رکھتا تھا جس کے متعدد افراد ترک سلطنت میں مکہ معظمہ کے والی رہ چکے تھے۔ وہ 1854ء میں استنبول میں پیدا ہوا جہاں اس کا باپ جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔ تین سال بعد اس کے والد کو مکہ واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ شریف حسین نے تعلیم و تربیت مکہ معظمہ ہی میں پائی۔ وہ جوانی میں شعر و شاعری کا دلدادہ تھا اور اسے سیر و شکار سے بڑا شغف تھا۔ اس نے اپنے چچا شریف عبداللہ پاشا کے زمانہ امارت میں نجد کے قبائلیوں کی بڑی سرکوبی کی تھی۔ عبداللہ پاشا کی وفات کے بعد شریف حسین کا دوسرا چچا عون الرفیق مکہ کا والی مقرر ہوا تو اس نے شریف حسین کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے اسے واپس استنبول بھجوادیا۔ وہاں اُسے عثمانی پارلیمنٹ، شوریٰ الدولت کا رکن نامزد کردیا گیا۔ شریف حسین سترہ برس استنبول میں مقیم رہا۔ اس اثنا میں اس نے اعیان سلطنت اور انجمن اتحاد و ترقی کے ارکان کو اعتماد میں لے لیا۔ جب 1336ھ/1914ء میں اس کے چچا عون الرفیق انتقال ہوا تو اسے مکے کا والی بنا کر مکہ بھیج دیا گیا۔ اس وقت بلاد عسیر میں بغاوت کی آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ شریف حسین نے اس بغاوت کو فرو کیا۔ اس زمانہ میں احرار عرب، عراق، شام اور فلسطین میں خودمختاری کا مطالبہ کررہے تھے۔ جبکہ اراکین انجمن اتحاد و ترقی انہیں وعدوں پر ٹال رہے تھے۔ اس تحریک کا خفیہ مرکز دمشق میں تھا جس سے شریف حسین کا بیٹا فیصل بھی منسلک تھا۔ والی شام جمال پاشا کو اس خفیہ تحریک کا سراغ لگ گیا اور اس نے اس تحریک کو سختی سے کچل کر رکھ دیا۔ شریف حسین کا بیٹا کسی نہ کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔

اسی اثنا میں پہلی جنگ عظیم (1914ء تا 1918ء) چھڑ گئی جس میں ترکیہ جرمنی کا اتحادی بن گیا۔ انگریز چونکہ ترکیہ کے حصے بخرے کرنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے شریف حسین اور اس کے بیٹوں کو شہ دی تو وہ ترکیہ سے آزادی کے خواب دیکھنے لگے اور عرب قوم پرستوں کے قائدین بن گئے۔ اتفاق سے شریف حسین کا دوسرا بیٹا، امیر عبداللہ جو بعد ازاں اردن کا بادشاہ بنا مکہ معظمہ سے استنبول جاتے ہوئے قاہرہ میں ٹھہرا۔ لارڈ کچنر، برطانوی ایجنٹ مقیم مصر نے اپنے اورینٹل

سیکرٹری رولانڈ اسٹار کی وساطت سے امیر عبداللہ سے بات چیت کی، طویل مذاکرات اور مراسلت کے بعد یہ طے پایا کہ اگر شریف حسین ترکوں کے خلاف اتحادیوں کی جدوجہد میں ساتھ دے تو اُسے حجاز کا خودمختار حکمران تسلیم کرلیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اتحادی ممالک دوسرے عرب ممالک، شام و عراق وغیرہ کو بھی حصول آزادی میں مدد دیں گے۔ اس ملاقات کے بعد ہی لارڈ کچنر نے پورٹ سوڈان کے راستے شریف حسین کو اسلحہ اور دیگر ساز وسامان جنگ اور امدادی رقوم بھیجنا شروع کردیں اور اس کے عرب قوم پرست ہونے سے مکمل فائدہ اٹھایا۔ شریف حسین نے انگریزوں کی مرضی کے مطابق ترکوں کے خلاف بغاوت کرنے کی تیاریاں زور وشور سے شروع کردیں۔

10 جون 1916ء کو منصوبے کے عین مطابق شریف حسین نے اپنے محل کے ایک دریچے سے بندوق چلا کر ترکوں کے خلاف بغاوت کا اعلان کیا اور ساتھ ہی حجاز کے ایک آزاد ریاست ہونے کا اعلان بھی کردیا۔ مالی امداد اور آزادی کے موہوم سے وعدوں پر حجاز، شام اور فلسطین کے عرب قبائل کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے۔ ادھر حکومت برطانیہ نے اپنا خاص ایجنٹ کرنل ٹی۔ ای۔ لارنس عربوں کی راہنمائی کے لیے عرب بھیج دیا۔ اس کے زیر ہدایت باغی عربوں نے حجاز ریلوے اور دیگر ذرائع مواصلات جو دمشق سے مدینہ تک پھیلے ہوتے تھے منقطع کردیئے۔ حجاز ریلوے جو قسطنطنیہ کو مدینہ منورہ سے ملاتی تھی تباہ وبرباد کردی گئی۔ اس کے نتیجے میں ہزاروں ترک فوجی بھوک اور پیاس سے ہلاک ہوگئے۔ بالآخر حکومت برطانیہ نے شریف حسین کو حجاز کا آزاد حکمران تسلیم کرلیا اور امیر فیصل کو بھی انگریز فوجوں کے جلو میں دمشق پہنچا دیا گیا جہاں وہ امیر شام بن گیا، اس طرح اس برطانوی تخریب وسازش کے نتیجے میں خلافت عثمانیہ کا عرب سرزمین پر چار سو سالہ اقتدار ختم ہوگیا۔

جنگ عظیم اول کے اختتام 1918ء کے بعد عرب قوم پرستوں سے برطانیہ نے آنکھیں پھیر لیں اور تمام وعدے فراموش کردیئے۔ فرانسیسیوں نے امیر فیصل کو شام سے نکال دیا۔ انگریزوں نے فلسطین اور عراق پر قبضہ کرلیا اور فلسطین کو ایک یہودی ریاست بنانے کا اعلان کردیا۔ شریف حسین نے جب امیر عبداللہ کو انگریزوں کے پاس ان کے وعدے یاد دلانے کے لیے بھیجا تو انگریزوں نے اسے بہلا پھسلا کر شرق اردن کی امارت قبول کرنے پر رضامند کرایا جس کا صدر مقام عمان قرار پایا۔ شریف حسین نے 1924ء میں عمان کا سفر کیا۔ اسی دوران جب ترکیہ میں مصطفیٰ کمال نے خلافت کا قدیم مسلم ادارہ ختم کرنے کا اعلان کیا تو شریف حسین نے تخت خلافت پر متمکن ہونے کا فیصلہ کردیا۔ عمان پہنچنے پر وہاں کے لوگوں نے اس کے ہاتھ پر بیعت خلافت کی اور اُسے امیر المومنین کا خطاب دیا گیا۔

دوران جنگ میں اہل حجاز کو سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ضروریات زندگی کمیاب ہوگئی تھیں۔ ہزاروں قحط سے ہلاک ہوگئے۔ بدویوں کی لوٹ مار سے حرم کے راستے مخدوش ہو کر رہ گئے۔ مزید براں عوام میں سیاسی بے چینی اور اضطراب پھیلنے لگا۔ سلطان عبدالعزیز ابن سعود والئی نجد اور شریف حسین کے درمیان چپقلش کافی عرصے سے جاری تھی۔ شریف حسین نے جب اعلان خلافت کیا تو آل سعود نے اسے مسترد کردیا۔ شریف حسین نے برافروختہ ہو کر اہل نجد کو حج سے روک دیا جو ہر مسلمان کا بنیادی حق ہے۔ اس کے جواب میں سلطان عبدالعزیز سعود کی افواج نے طائف پر فاتحانہ حملہ کیا اور قبضہ کرلیا۔ شریف حسین نے جب مغربی صحافیوں کو طائف میں اہل نجد کی طرف سے کیئے گئے ظلم وستم کی داستان سنائی تو خود اس کی عوام آل سعود سے خوفزدہ ہو کر دل چھوڑ بیٹھی۔ ادھر نجدیوں نے مکہ معظمہ کی طرف پیش قدمی شروع کردی۔ نجدیوں کی اس فاتحانہ یلغار اور ان کے ظلم وستم کے افسانوں کی وجہ سے شرفاء مکہ نے شریف حسین کو تاج وتخت سے دستبردار ہونے کا مشورہ دیا، چنانچہ وہ اپنے بڑے بیٹے کے حق میں دستبردار ہوگیا اور جدہ چلا گیا۔ اس کے بعد اپنی سلطنت کو بچانے کے لیے شریف حسین نے انگریزوں سے مدد کی درخواست کی لیکن انہوں نے غیر جانبداری کا بہانہ بنا کر مداخلت کرنے سے انکار

کر دیا۔ شریف حسین حالات سے مایوس ہو کر پہلے اپنے بیٹے امیر عبداللہ کے پاس عقبہ چلا گیا پھر وہاں سے انگریزوں کے مشورے پر وہ قبرص میں منتقل ہو گیا۔ اور وہاں چھ سال بعد 1931ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

شریف حسین آف مکہ طبعاً جاہ پسند اور طالب اقتدار تھا اس نے فرات کے کنارے سے دریائے نیل تک ایک سلطنت عرب قائم کرنے کا خواب دیکھا تھا جو شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر شریف حسین اور اس کے بیٹے ترکوں کے خلاف بغاوت نہ کرتے تو شاید آج اسرائیل کا وجود تک نہ ہوتا اور سلطان نجد بھی نجد تک محدود رہتا۔

یاسر عرفات (1921ء تا 2004ء)

نام ونسب: اصل نام محمد عبدالرؤف کنیت ابوعمار تھی۔

تنظیم آزادی فلسطین کے چیئرمین اور فلسطین کے پہلے صدر۔ بیت المقدس کے ایک نواحی قصبے میں پیدا ہوئے۔ قاہرہ یونیورسٹی سے سول انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ 1950ء میں فلسطینی طلبا کی لیگ کے انتظامی رکن بنے اور پھر 1952ء تا 1956ء اس لیگ کے صدر رہے۔ 1956ء کے آغاز میں مصر میں فوجی تربیت حاصل کی اور مصری فوج میں شامل رہے 1959ء میں کویت کی ایک کمپنی میں ملازمت کی اور عرب اسرائیل جنگ میں بھی حصہ لیا۔ بعد ازاں سعودی عرب اور خلیج فارس میں بھی ملازمت کرتے رہے پھر بیروت آ گئے۔ اکتوبر 1956ء میں انہوں نے عرب اسرائیل جنگ میں بطور لیفٹیننٹ ایک مصری فوجی دستے کی قیادت کی تھی۔ 1960ء میں الفتح میں بطور ترجمان بھرتی ہوئے۔ اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر جلد ہی اس تنظیم کے چیئرمین (1969ء) بنا دیئے گئے۔

1960ء سے فلسطینی سیاست میں سرگرم عمل ہو کر حصہ لینا شروع کیا تھا۔ الفتح کے چیئرمین منتخب ہونے کے بعد انہیں فلسطین کی انقلابی فوج کا جنرل کمانڈر بھی بنا دیا گیا۔ ستمبر 1969ء میں رباط مراکش میں منعقدہ اسلامی سربراہی کانفرنس میں تنظیم آزادی فلسطین PLO کو فلسطینیوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کیا گیا اور انہوں نے اس کانفرنس میں تنظیم آزادی فلسطین کے مبصر کی حیثیت سے شرکت کی۔ فروری 1974ء میں لاہور میں منعقد ہونے والی اسلامی سربراہی جنرل اسمبلی میں فلسطین کا مسئلہ پیش کیا۔ 21 اگست 1982ء کو تنظیم آزادی فلسطین کو اس کے بیروت ہیڈ کوارٹرز سے بے دخل کر دیا گیا اور فلسطینی آزادی پسندوں کی ٹکڑیاں شام، عراق، اردن، شمالی وجنوبی یمن، سوڈان، اور تیونس والجزائر منتقل ہو گئیں۔

دسمبر 1983ء میں جب مصر اور تنظیم آزادی فلسطین کے تمام اختلافات ختم ہو گئے تو وہ قاہرہ پہنچے جہاں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ نومبر 1984ء میں ایک بار پھر تنظیم آزادی فلسطین کے چیئرمین منتخب ہوئے۔

1990ء میں انہوں نے اسرائیل کو ایک آزاد اور خودمختار ریاست تسلیم کر کے کھلے دل اور کھلے ذہن کا انسان ہونے کا ثبوت دیا جوابی طور پر اسرائیل نے فلسطین کو تسلیم کر لیا۔ 1995ء میں اسرائیل نے مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی پر فلسطین کی حاکمیت تسلیم کر لی اور یاسر عرفات نے بطور صدر فلسطین اتھارٹی کا عہدہ سنبھال لیا۔ 1994ء میں انہیں مشترکہ طور پر نوبل انعام بھی دیا گیا۔

فلسطین کے عظیم قائد یاسر عرفات کی وفات 11 نومبر 2004ء کو ہوئی۔ اس کی وفات کے متعلق متضاد خبریں ملتی رہیں کہ ان کے امریکہ اور اسرائیل سے تعلقات خراب ہونے کے نتیجے میں انہیں سلو پوائزن SLOW POISEN یا آہستہ روز ہر دیا گیا تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ ہلاک ہو گئے۔ ان کے بعد محمود عباس صدر منتخب ہوئے اور ان کو امید کی کرن قرار دیا گیا۔ محمود عباس ہی یاسر عرفات کے بعد تنظیم آزادی فلسطین PLO کے چیئرمین بھی منتخب ہوئے۔ جنوری 2005ء میں انہوں نے واضح اکثریت حاصل کی۔

تابعین و تبع تابعین

صحابہ کرام علیہم الرضوان کی جانشین شخصیات

حضرت محمد الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ (637ء تا 700ء) — حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ (م۔643ء۔712ء)
حضرت علی بن حسین — سید التابعین حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ
المختار بن ابی عبید ثقفی (622ء،686ء) — حضرت مسلم بن عقیل رحمۃ اللہ علیہ
حضرت عمر بن عبدالعزیز (681ء تا 720ء) — حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ
حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ — حضرت مسروق بن اجداع
حضرت عباس علمدار رحمۃ اللہ علیہ (647ء تا 680ء) حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ (714ء-778ء)

حضرت محمد الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ (637ء تا 700ء)

وہ عظیم تابعی جو جنگ کو ناپسند کرتے ہوئے گوشہ نشین زندگی گزارنے کو ترجیح دیتے تھے۔

نام و نسب: محمد اکبر بن علی بن ابی طالب بن عبدالمطلب بن ہاشم

ان کی والدہ حنفیہ خلوہ بنت جعفر بن قیس بن مسلمہ بن ثعلبہ بن الدول بن حنیفہ تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ یمامہ کے قیدیوں میں سے تھیں جو حضرت علی بن ابی طالب کے حصہ میں آئی تھیں۔ ان کے بطن سے حضرت محمد بن حنفیہ 16ھ/637ء میں پیدا ہوئے۔ وہ طبعاً بہت عزلت گزین واقع ہوئے تھے اور ہمیشہ پھونک پھونک کر قدم رکھا کرتے تھے مگر اس کے باوجود بھی حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی طرح حالات سے مجبور ہو کر سیاسی مسائل فی زمانہ میں الجھ گئے۔ جب حضرت امام حسن اپنے حقوق سے دست بردار ہو گئے اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ 61ھ/680ء میں کربلا کے سانحہ میں شہید ہوئے تو بہت سے لوگ انہیں آل علی کا سربراہ سمجھ کر ان سے عقیدت رکھنے لگے۔ اس سے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو جو امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد کھلم کھلا خلافت کا دعویٰ کر رہے تھے، کچھ شکوک و شبہات پیدا ہو گئے۔ یہ حقیقت تھی کہ حضرت ابن حنفیہ کو امویوں کی مخالفت جماعت سے کوئی ہمدردی نہیں تھی، لیکن معاملہ اس وقت مزید نزاکت اختیار کر گئے جب ایک ثقفی طالع آزما مختار بن عبید نے ان کو قصاص اہل بیت کے نام پر اپنے ساتھ ملانے کی کئی کوششیں کیں مگر وہ ناکام رہا۔ تب اس نے 685ء میں حضرت حنفیہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جانشین، وصی اور مہدی وقت ظاہر کر کے ان کے نام پر دعوت دینا شروع کر دی۔ اس موقع پر بھی حضرت ابن حنفیہ نے بڑی احتیاط اور تحمل سے کام لیا اور اس

بات سے انکار کر دیا کہ انہیں مہدی کے اہم لقب سے پکارا جائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں مختار کا کوئی پاس نہیں تھا اور وہ جانتے تھے کہ اس دعویٰ کہ بازی عقیدت حقیقی نہیں اور وہ ابن الوقت ہے۔ تاہم خطرات میں گھرے ہوئے ہونے کی وجہ سے وہ اس کی کھلم کھلا مخالفت بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے جب کئی لوگ کوفہ سے آئے کہ ان سے مختار ثقفی کے متعلق رائے دریافت کریں تو انہوں نے گول سا جواب دے کر انہیں ٹال دیا۔ اس کی وجہ تھی کہ یہ تحریک بہت پھیل گئی تھی اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور دوسرے لوگوں کی شہادت کا قصاص لینے کے سلسلے میں بڑی خونریزی ہو چکی تھی۔ دوسری طرف حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیعت لینے کے لیے محمد الحنفیہ پر دباؤ ڈال رکھا تھا اور ان کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور دیگر عزیزوں کے ساتھ چاہ زمزم کے قریب قید کر رکھا تھا۔ اب ان کے لیے اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا کہ مختار سے امداد طلب کریں۔ یہ مختار کی منہ مانگی مراد تھی، چنانچہ اس نے فوراً چند سوار مکہ مکرمہ بھیج دیئے اور عین وقت پر حضرت محمد الحنفیہ اور دوسرے قیدیوں کو رہا کرا دیا۔ لیکن ساتھ ہی حضرت محمد الحنفیہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اس کے آدمیوں نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے آدمیوں یا فوج سے کچھ تعرض نہ کیا، کیونکہ خونریزی سے حرم کی سرزمین کی بے حرمتی ہوتی تھی۔ اس رہائی کے بعد حضرت محمد بن حنفیہ نے اپنے عزیز و اقارب کے ہاں منیٰ میں پناہ لی اور کچھ دن کے بعد طائف چلے گئے۔ بعد ازاں انہوں نے مختار کی خدمات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ لہٰذا جب 67ھ/ 687ء میں مختار کی تحریک ناکام ہوگئی اور اس کا علم بردار مارا گیا، تو وہ اس واقعہ سے بے تعلق رہے۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی دھمکیوں اور خلیفہ عبدالملک کے پیہم اصرار کے باوجود انہوں نے دونوں میں کسی مدعی خلافت کی بیعت نہیں کی اور غیر جانبداری کے اپنے اصول پر قائم رہے کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ اس حکمران کی بیعت کریں جس کو امت مسلمہ متحدہ طور پر قبول کرے۔

چنانچہ 688ء میں جب حج کے موقع پر اموی، زبیری اور خارجی بھی مکہ آئے ہوئے تھے وہ ایک آزاد فریق کی حیثیت سے مسلح ہو کر غیر جانبداری کا اظہار کرنے کے لیے وہاں پہنچ گئے۔

حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد کہیں جا کر ان کے مطالبے یعنی اتفاق رائے عامہ نے ایک حقیقت کی شکل اختیار کر لی اور انہوں نے عبدالملک کو حقیقی حکمران تسلیم کرتے ہوئے اس کی بیعت کر لی اور وہ خلیفہ کی خدمت میں 697ء میں بمقام دمشق حاضر بھی ہوئے پھر اس کے بعد مدینہ منورہ لوٹ آئے جہاں 81ھ/ 700ء میں انہوں نے وفات پائی۔

میدان سیاست میں ان کی خاموش اور محتاط روش کو روایات میں خالصتہً دینی احساسات کا نتیجہ بتایا گیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد کو ان کا حق خدائے قدیر ہی دلائے گا، انسانی طاقت نہیں دلا سکتی۔ تاہم بعض محققین کے نزدیک یہ ان کی امن پسندی کا نتیجہ تھا۔ بیعت کے بعد خلیفہ عبدالملک نے ابن حنفیہ کو اپنا قرضہ ادا کرنے کے لیے گراں قدر رقم دی اور ان کے بال بچوں اور اقرباء کے سالانہ وظائف مقرر کر دیئے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ اس کے بعد ایک خوشحال زندگی بسر کرتے رہے تھے۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ ان سے محبت میں غلو کرنے والے گروہ نے ان کی وفات کے بعد، موزوں موقعہ سمجھتے ہوئے یہ کہانی مشہور کر دی کہ وہ مرے نہیں ہیں بلکہ ایک قسم کے عالم ارواح میں مدینہ منورہ کے مغرب میں رضوی کی پہاڑیوں پر زندہ موجود ہیں۔ جہاں سے وہ ایک فاتحانہ لشکر کے قائد کی حیثیت سے واپس آئیں گے۔ یاد رہے رجعت امام کا یہی عقیدہ عبداللہ بن سبا نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب کیا تھا۔ اس عقیدے کو اب حضرت محمد الحنفیہ سے منسوب کر دیا گیا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ جنگ پسند آدمی نہیں تھے بلکہ خاموش زندگی گزارنے کو ترجیح دیتے تھے۔

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ (643ء م-712ء)

یکے از آئمہ حدیث وفقہائے سبعہ، عظیم تابعی مدینہ

نام ونسب: حضرت عروہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ بن عوام بن خویلد۔ ان کی والدہ حضرت اسما بنت ابوبکر تھیں۔ کنیت ابوعبداللہ تھی۔ مدینہ منورہ کے قدیم ترین محدثوں اور آئمہ حدیث میں سے تھے۔ ان کا شمار مدینہ منورہ کے فقہائے سبعہ میں ہوتا ہے۔ 23ھ اور 29ھ کے مابین کسی سال میں پیدا ہوئے اور 91ھ اور 99ھ کے درمیان وفات پائی، مورخین نے سال ولادت 22ھ/643ء اور سال وفات 93ھ/712ء درج کیا ہے۔

وہ اپنے بڑے بھائی حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے عمر میں تقریباً 21 سال چھوٹے تھے۔ طبعاً جنگجو نہیں تھے اس لیے زمانے کی سیاست سے الگ تھلگ رہ کر علمی مشاغل میں منہمک رہے۔ جب 73ھ میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے حجاج سے شکست کھائی تو اس کے کچھ عرصہ بعد وہ مدینہ منورہ واپس آگئے اور وفات تک اپنی ہی جائیداد کو وسیلہ معاش بنا کر ہمہ تن علمی کاموں پر مصروف رہے۔ یہیں انہوں نے خلیفہ عبدالملک کی فرمائش پر اسلام کے بالکل ابتدائی دور کے متعلق مراسلات کا ایک سلسلہ غالباً خلیفہ کے نام خطوط کی شکل میں لکھنا شروع کیا (طبری) ان کے زہد وعبادات کے سلسلے میں روایت یہ ہے کہ روزانہ ہر رات کو چوتھائی قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ جب ان کا سرطان زدہ پاؤں کاٹا گیا تو انہوں نے انتہائی صبر سے کام لیتے ہوئے اف تک نہ کی۔ حضرت عروہ اپنی خالہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں ان کی وفات سے تین سال پہلے تک بڑے التزام واہتمام سے حاضر ہوتے رہے اور ان سے سن کر بہت سی احادیث جمع کیں۔ اسی طرح انہوں نے اپنے والدین، نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے احادیث روایت کی ہیں۔

خود ان سے جن بزرگوں نے روایت کی ہے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں، محمد بن مسلم، ابن شہاب زہری، حضرت عروہ کے بیٹے محمد، عثمان، عبداللہ، یحیٰ اور بالخصوص ہشام، سلیمان بن یسار اور ابن ابی ملیکہ۔

بحیثیت محدث حضرت عروہ کا مقام بہت بلند ہے اور ان کا نام ان سات بڑے فقیہوں (فقہائے سبعہ) میں شامل ہے۔ علم مصطلح الحدیث میں حضرت عروہ بن زبیر بڑے ثقہ، قابل اعتماد اور مستند راوی مانے جاتے ہیں۔ انہوں نے ایک بڑا کتاب خانہ جمع کر لیا تھا، جس میں تاریخی اور فقہی دونوں طرح کی کتب موجود تھیں۔

سیرت نگاری میں بھی وہ اولین تسلیم کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے ایک کتاب المغازی تالیف کی تھی، لیکن ان کی مرویات صرف بعد کی کتب تاریخ، مثلاً تالیفات ابن سعد، الطبری اور ابن اسحٰق بھی میں ملتی ہیں۔ محققین کے نزدیک یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی کتاب المغازی کا معتدبہ حصہ موسیٰ بن عقبہ، مولیٰ بنو زبیر کی کتاب المغازی میں شامل ہو۔ ان کی مرویات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ باقاعدہ اسناد کے بغیر روایت کرتے ہیں۔ اسناد کا دستور بعد کے زمانے میں رائج ہوا تھا۔

حضرت امام زین العابدین، علی بن حسین رضی اللہ عنہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پوتے اور اہل بیت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے چشم وچراغ، ایک عظیم تابعی

نسب اشرف: حضرت علی بن حسین بن علی بن ابی طالب بن عبدالمطلب بن ہاشم۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پوتے اور اہل بیت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے چشم وچراغ، اپنے زہد وعبادت کی وجہ سے زین العابدین کے لقب سے مشہور ہوئے۔ وہ اپنے حلم وورع کے لیے بھی ضرب المثل تھے۔ ان کا شمار آئمہ اثنا عشریہ میں ہوتا ہے۔ امامیہ حضرات کے نزدیک وہ چوتھے

امام تھے، جب کربلا میں ان کے والد بزرگوار حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید ہوئے (680ء) تو وہ صاحب فراش تھے۔

شمر ذی الجوشن جیسے شقی القلب نے ان کو بھی قتل کروانا چاہا، لیکن ایسے میں عمرو بن سعد شامیوں کے آڑے آیا اور حضرت امام بچ گئے۔ اس کے بعد ابن زیاد، گورنر کوفہ نے ان کو اہل بیت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بچے کھچے افراد کے ہمراہ دمشق بھجوا دیا۔ یزید نے اہل بیت کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کیا اور سرکاری فوج کی نگرانی میں واپس مدینہ بھیج دیا۔ جب اہل مدینہ نے یزید کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا تو امام زین العابدین نے اس بغاوت سے کوئی حصہ نہ لیا۔ اور آپ اس دوران مدینہ چھوڑ کر عقیق چلے گئے۔ جنگ 7ھ میں (683ء) میں فتح یابی کے بعد جب مسلم بن عقبہ مدینہ منورہ میں داخل ہوا تو اس نے امام زین العابدین کی بڑی تعظیم وتکریم کی۔ اس کے قریبی زمانے میں مختار بن عبید ثقفی نے حصول اقتدار کے لیے محبت اہل بیت کے نام پر خون حسین انتقام کی دعوت دی اور ہزاروں لوگ اس کے ساتھ ہو گئے، لیکن حضرت امام زین العابدین اس کے دام میں نہ آئے اور اس ہنگامے سے بالکل الگ رہے۔ اس کے بعد بنوامیہ اور ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مختار کی بڑی جنگیں ہوئیں، لیکن حضرت امام ان جنگوں سے بالکل کنارہ کش رہے۔ علم وفضل اور زہد وتقویٰ غرض کہ ہر شے میں ان کی جلالت وعظمت پر سب کا اتفاق ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ، فیاضی اور دریا دلی ان کا خاص وصف تھا اور اس وصف میں وہ اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے تھے وہ پوشیدہ طور پر سینکڑوں غریب اور مسکین لوگوں کی خورد ونوش کا سامان کرتے تھے۔ تحمل اور بردباری اور نرمی وملاطفت ان پر تمام تھی اور ان کے اخلاق اعلیٰ کی نمایاں صفات میں شامل تھیں۔ اپنے حق پرست اسلاف کی طرح خلفائے ثلاثہ کے ساتھ امام صاحب بھی سچی عقیدت رکھتے تھے اور ان کے متعلق نازیبا الفاظ سننا آپ رحمۃ اللہ علیہ کو گوارا نہیں تھا۔

مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے اور یہیں بعض مورخین کے مطابق انہوں نے 92ھ/710ء یا 712ء میں وفات پائی۔

حضرت امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ وسلم کثیر الاولاد تھے۔ ان کے ہاں چھ بیٹے ہوئے، حضرت محمد، حضرت زید، حضرت علی، حضرت حسین، حضرت عبداللہ اور حضرت عمر۔ ان چھ بیٹوں کے علاوہ سات بیٹیاں بھی تھیں۔ حضرت خدیجہ، حضرت عبدۃ، حضرت ام کلثوم، حضرت ام الحسن، اور حضرت فاطمہ علیہ۔

حضرت امام حسین بن علی کی نسل حضرت امام زین العابدین کے ذریعے خوب پھیلی۔ کتاب انساب الاشراف پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے ہاں عمر، عمرو اور معاویہ نام کے کئی بزرگ ملتے ہیں۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان ناموں سے انہیں اور ان کی نسل کے بزرگوں کو ایک گونہ تعلق اور لگاؤ تھا۔

بعد کے زمانے میں ان کی نسل سے ایک بزرگ امیر کا بن علی بن حمزہ بن موسیٰ بن جعفرہ ہو گزرے ہیں جن کا زمانہ چوتھی صدی ہجری تھا۔ محققین کا خیال ہے کہ وہ سیر وسیاحت ہوئے کرتے ہوئے امریکہ کی سرزمین تک پہنچے تھے۔ اہل تشیع کی کتابوں میں حضرت امام صاحب کی حق گوئی وبیباکی کا یہ واقعہ بھی یادگار ہے کہ جب اہل بیت اطہار شام کے بازاروں سے گزر رہے تھے تو یزید کی حکومت کے کسی ہمدرد نے انہیں روک کر پوچھا "اے فرزند حسین بتاؤ کہ فتح کس کی ہوئی؟ آپ نے فرمایا اگر واقعتاً سمجھنا چاہتے ہو کہ فاتح کون ہے تو نماز کے وقت جب اذان واقامت کہنا اس وقت تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ فتح کس کی ہوئی ہے اور شکست کس کا نصیب بنی ہے۔

پھر جب اہل حرم دربار یزید میں پہنچائے گئے، قافلہ کا نگہبان محضر بن ثعلبہ العائذی نے مژدہ سنایا، اس اعلان مسرت پر حضرت امام زین العابدین نے فرمایا، ام محضر کا بیٹا بڑا ہی شریر اور معلون ہے۔ یزید کے سامنے جب امام حسین رضی اللہ عنہ کا سر مبارک پیش کیا گیا تو یزید نے فتح کے نشے میں کہا، "اے فرزند حسین! آپ کے والد نے قطع رحم کیا (معاذ اللہ)

اور میرے حق کو فراموش کر دیا، میری حکومت سے ٹکر لی، اس کا نتیجہ تم نے دیکھا، اللہ نے کیا دکھایا (معاذ اللہ) امام صاحب نے انتہائی صبر و تحمل سے فرمایا "ما اصاب من مصیبۃ فی الارض..........ان ذالک علی اللہ یسیر (57: الحدید) یعنی ہم پر اور روئے زمین پر کوئی مصیبت ایسی نہیں پڑتی جو کتاب (لوح محفوظ) میں نہ ہو، اس سے پہلے کہ ہم پیدا کریں، بلاشبہ یہ بات اللہ کے لیے آسان ہے۔"

ان کے علاوہ شیخ جعفر عباس حائری نے بلاغۃ الامام علی بن الحسین میں امام صاحب کے وہ بلاغت آفرین خطبات جمع کر دیئے ہیں جو انہوں نے دربار شام میں دیئے تھے۔ یہ خطبات واقعہ کربلا کی اہمیت اور مخالفین کی باطل پرستی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ شہر یزید میں اور اس کے دربار میں امام صاحب کی یہ حق گوئی و بیباکی ایک لسانی جہاد کی حیثیت رکھتی ہے اور ان کی عظمت و کردار کی امین ہے۔

سید التابعین حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ

دیوانہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، وہ عظیم تابعی کہ جن کی خدمت میں خلیفہ ثانی اور خلیفہ چہارم دعا کے لیے حاضر ہوئے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رقم طراز ہیں کہ حضرت امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یمن کا رہنے والا اویس نامی شخص تمہیں ملے گا، وہ اپنی ضعیف ماں کو تنہا چھوڑ کر میری ملاقات کو نہیں آسکا۔ اس کی ماں کے سوا اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ پھر فرمایا اے عمر رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ! تم میرے بعد (ظاہری وصال شریف) میدان عرفات میں اس سے ملو گے، میرا سلام اس کو پہنچانا اور کہنا کہ میری امت کے لیے دعا کرے، سب نے یہ بات سن کر کہا کہ خدا عزوجل نے اس کو (حضرت اویس رضی اللہ عنہ) کیا عالی مرتبہ عطا فرمایا ہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بحکم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اویس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اپنی خلافت کے آخری سال ایام تشریق میں میدان عرفات پہنچے اور کوہ ابوقبیس پر خطبہ مسنونہ کے اختتام پر عامۃ المسلمین سے اہل قرن سے حضرت اویس قرنی کا نام لے کر پوچھا۔ پھر جب ایک معمر شخص نے بتایا کہ وہ ایک دیوانہ اور کم حیثیت انسان ہیں اور آپ رضی اللہ عنہ سے ملاقات کے شایان شان نہیں تو خلیفہ ثانی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے فرمایا کہ ہاں میں اسی دیوانے اور کم حیثیت اویس سے ملنے کا مدتوں سے متمنی ہوں جس کا چہرہ ہر وقت اداس اور گرد آلود رہتا ہے۔ یقیناً وہی ہیں جس کے بارے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ مجھے اسی کی تلاش ہے۔ پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے ملنے وادی "غرا" پہنچے تو دیکھا کہ وہ اونٹ چرا رہے ہیں۔ اور نماز پڑھنے میں مصروف ہیں۔ نماز سے فراغت کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے ملنے اور ان کے دریافت پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ تھے بتایا کہ یہ خلیفۃ المسلمین ہیں اور میں علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب ہوں۔ حضرت اویس ان کے احترام میں کھڑے ہو گئے اور کہا "السلام علیکم یا امیر المومنین بن خطاب ابن ابی طالب پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا کہ آپ رضی اللہ عنہ امت مسلمہ کے لیے دعا کیجیے۔ حضرت اویس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مجھ سے بہتر آپ رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ آپ رضی اللہ عنہ بموجب وصیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی امت کے لیے دعائے مغفرت کریں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیراہن مبارک بھی قبول فرمائیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصی طور پر آپ رضی اللہ عنہ کے لیے بھجوایا ہے۔ پھر حضرت اویس قرنی نے پیراہن رسول اللہ کو اپنے سر پر رکھا اور اسے ایک الگ جگہ لے گئے پھر پیراہن مبارک کو سامنے رکھ کر بموجب حکم سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ان کی امت کے لیے دعا فرمائی۔

نام ونسب: سید التابعین، حضرت اویس قرنی بن عامر۔ ان کا سلسلہ نسب قبیلہ قرن بن رومان بن ناجیہ بن مراد سے جاملتا ہے۔ حضرت اویس رضی اللہ عنہ اہل یمن میں سے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پایا اور غائبانہ اسلام قبول کیا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ثابت نہیں ہے۔ تاریخ اسلام کے اوراق میں ان کے حالات زندگی بھی کم ہی ملتے ہیں۔ ان کے جو حالات ہم تک پہنچے ہیں وہ بالعموم ھرم بن حیان الھدی البصری کے روایت کردہ ہیں۔ ان کے بیانات کے مطابق حضرت اویس قرنی یمن کی امدادی فوج میں یعنی 17ھ کے بعد مدینہ منورہ آئے اور یہیں ایک روایت کے مطابق خلیفہ ثانی سے ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ پھر وہ کوفہ اور بصرہ چلے گئے اور گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دوسری ملاقات جیسے کہ پہلے ذکر آیا میدان عرفات میں ہوئی۔ اس کے بعد آذربائیجان کے معرکے سے واپسی پر اچانک بیمار ہوکر وفات پائی۔ ان کے بارے میں دوسرے اقوال یہ ہیں کہ انہوں نے جنگ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے حصہ لیا تھا۔ اور تقریباً چالیس زخم کھائے تھے اور شہید ہوگئے تھے۔ بقول بعض حضرت اویس رضی اللہ عنہ نے دمشق میں وفات پائی تھی۔

المختار بن ابی عبید الثقفی (622ء-686ء)

پہلی صدی ہجری کا مشہور طالع آزما اور قتل حسین رضی اللہ عنہ کے قصاص کی ایک شیعی تحریک کا بانی

نام ونسب: المختار بن ابی عبید بن مسعود بن عمرو بن عمر بن عوف الثقفی۔ ایک شیعی تحریک کا بانی جس نے 66ھ/685ء-686ء میں کوفہ پر قبضہ کرلیا تھا۔ وہ قبیلہ بنوثقیف سے تعلق رکھتا تھا کہتے ہیں کہ المختار 622ء میں پیدا ہوا تھا۔ 640ء میں وہ ایک نوجوان تھا اور یہ حقیقت ہے کہ اس کا حریف حضرت عبداللہ بن الزبیر بھی 622ء میں پیدا ہوا تھا۔ المختار کا باپ 13ھ میں ایران کی جنگ میں ایرانیوں کے خلاف جہاد کرتا ہوا شہید ہوگیا تھا۔ المختار کی پرورش اس کے چچا سعد بن مسعود نے کی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں المدائن کے حاکم تھے۔ جب سعد کو خارجیوں کے تعاقب میں جانا پڑا تو المختار اس کا نائب تھا۔

اپنی ابتدائی زندگی اور خاندانی روایات کی وجہ سے المختار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شیعان میں شامل تھا۔ تاہم مورخ طبری کے مطابق جب حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں المدائن میں اس کے چچا سعد کے پاس قیام کیا تھا تو المختار نے کہتے ہیں کہ اپنے چچا کو مشورہ دیا تھا کہ وہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو ان کے حریف حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حوالے کردیں۔ اور شیعان علی نے اس واقعہ کے 25 سال بعد اس غداری کی وجہ سے اس کی مذمت کی تھی۔ تاہم یہ بھی واقعہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں زیاد بن ابیہ کے سامنے اس نے حضرت عدی بن حجر کے خلاف گواہی دینے سے انکار کردیا تھا، جن پر یہ الزام عائد کیا گیا تھا کہ انہوں نے بنوامیہ کے خلاف 51ھ میں بغاوت بپا کرنے کی کوشش کی تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی ہمدردیاں پہلے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھیں۔ بہرحال حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد کہیں جا کر یہ صورت حال پیدا ہوئی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خاندان کے حامیوں کی امیدیں پھر تازہ ہونے لگیں اور المختار گمنامی کے پردے سے نکل کر دوبارہ سیاسی افق پر نمودار ہوگیا۔ اس نے 61ھ میں مسلم بن عقیل کی حمایت میں نمایاں حصہ لیا، تو گورنر کوفہ عبیداللہ بن زیاد نے اسے قید میں ڈال دیا۔ جب حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کربلا میں شہید ہوگئے تو اسے رہائی نصیب ہوئی اور وہ مکہ چلا گیا۔ جہاں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ خفیہ طور پر بنوامیہ کے خلاف ایک تحریک کی تیاری میں مصروف تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ المختار نے کوشش کی کہ ابن الزبیر رضی اللہ عنہ کو

قبل از وقت بغاوت پر آمادہ کر دے، مگر جب اسے ناکامی ہوئی تو وہ اپنے وطن طائف چلا گیا جہاں وہ کچھ عرصہ مقیم رہا۔ پھر ایک سال بعد وہ الزبیر رضی اللہ عنہ کے پاس واپس پہنچا جو اس دوران علی الاعلان خلیفہ بن چکے تھے۔ اس نے 64ھ میں مکہ کے پہلے محاصرے میں دادِ شجاعت دی۔ تاہم وہ الزبیر کا ساتھ صرف اس لیے دے رہا تھا کہ اسے کوفہ جانے کا موقع مل جائے جو اس زمانے میں بنوامیہ کے مخالف الزبیر کے زیرِ نگیں تھا۔ طبری کی ایک روایت کے مطابق خود الزبیر نے اسے عراق بھیجا تھا تا کہ وہ وہاں جا کر نظامِ حکومت میں مدد دے۔

اس زمانے میں کوفہ کے شیعان حضرت سلیمان بن صرد کے زیر اثر تھے اور المختار اس کی جماعت میں شامل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے محمد بن حنفیہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے غیر فاطمی صاحبزادے کے نمائندے کے طور پر الگ تبلیغ شروع کر دی۔ اگرچہ اس نے اب تک الزبیر کی حکومت کی کھلم کھلا مخالفت نہیں کی تھی، لیکن اس کا رویہ مشکوک تھا۔ اس وجہ سے زبیری حاکم عبداللہ بن یزید نے اسے قید کر دیا لیکن اس کی قید سخت نہیں تھی اس لیے وہ کوفہ کے لوگوں سے ملتا جلتا رہا۔ سلیمان بن صرد کی شکست کے بعد اسے اس شرط پر رہا کر دیا گیا کہ وہ زبیری حکومت کے خلاف کبھی بغاوت نہیں کرے گا۔ المختار نے اس رہائی سے فائدہ اٹھا کر ابراہیم بن الاشتر کا تعاون حاصل کر لیا۔ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشہور سپہ سالار مالک بن اشتر کا بیٹا تھا۔ پھر 14 ربیع الاول 66ھ کو بغاوت شروع ہوگئی۔ ابن الاشتر کی پر جوش قیادت کی وجہ سے زبیری حکمران کوفہ نے راہ فرار اختیار کی اور کوفہ پر المختار کے ساتھیوں کا قبضہ ہو گیا اور اس نے اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے جن لوگوں نے قتل حسین رضی اللہ عنہ میں حصہ لیا تھا موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس بغاوت کے بعد المختار نے کوفہ اور کوفہ کے باہر جو کامیابیاں حاصل ہوئیں ان کے باوجود اسے ہر وقت ابن الزبیر کے بھائی مصعب بن الزبیر سے خطرہ لگا رہتا تھا۔ بظاہر اس کی شیعی تحریک کامیابی ہو چکی تھی اور کہتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کرسی کی پرستش کی وجہ سے بے حد دلچسپ واقعات پیش آئے تھے پھر المصعب کی فوج کے ہاتھوں شیعی فوج کو دریائے دجلہ کے کنارے المذار کے مقام پر شکست ہوئی اور پھر حروراء کے مقام پر تو شیعی فوج بالکل ہی درہم برہم ہوگئی اور المختار نے کوفہ کے قلعہ میں پناہ لی اور بڑی بہادری سے چار ماہ تک محاصرین کا مقابلہ کرتا رہا۔ آخر کار اس کے بہت سے حامی اُسے چھوڑ کر چلے گئے اور وہ خود مایوسی کے عالم میں قلعہ سے نکل کر حملہ آور ہوا اور مارا گیا، (14 رمضان 67ھ)

مورخین کے مطابق اس کی لاش کا مثلہ کر کے اس کا ہاتھ کوفہ کی جامع مسجد کے دروازے پر آویزاں کر دیا گیا اور کئی سال بعد الحجاج نے اسے وہاں سے اتروایا۔ اس کی ایک بیوی کو بھی قتل کر دیا گیا۔

موجودہ زمانے میں مورخین المختار کی اصل حقیقت کے بارے میں مختلف رائے رکھتے ہیں۔ وہ تاریخی روایات جو کوفے اور بالخصوص اشراف کے حلقے میں پیدا ہوئیں قدرتی طور پر اس کے خلاف ہیں۔ ان روایات کی رو سے وہ ایک نبی کاذب تھا۔ جو محض قسمت آزمائی کرنا چاہتا تھا۔ قدیم مورخین میں سے ابن الحزم نے لکھا ہے کہ المختار نے کوفہ میں نبوت کا جھوٹا دعویٰ بھی کیا تھا۔

اس کا رویہ اگرچہ بعض اوقات پُرفریب ہو جاتا تھا۔ مثلاً اس نے ابن الحنفیہ کے نام کو جس طریقے سے استعمال کیا اگرچہ وہ کبھی اس کے ساتھ تعاون کرنے پر رضامند نہیں ہوئے تھے۔ تاہم محققین کا خیال ہے کہ نہ تو اس کی دورخی یا کارروائیاں اس کے لیے کافی نہیں کہ اسے بدنیت اور بدعہد قرار دیا جائے۔ جب حضرت محمد الحنفیہ کو اس نے حضرت ابن الزبیر کی قید سے مکہ میں سوار بھیج کر رہا کرایا تھا اور وہ ان کا خصوصی احترام کرتا تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص اپنی مقصد برآری اور کامیابی کے لیے عوام الناس کو بھڑکانا چاہتا ہو وہ ایسے حربے اور داؤ پیچ استعمال کرنے میں حق بجانب ہوتا ہے۔ یہ بات یقینی

معلوم ہوتی ہے کہ المختار کو اپنے مشن کی سچائی پر صدق دل سے یقین تھا اور موالی کو مساوات کا درجہ عطا کرنے کے متعلق اس کے جو خیالات تھے ہاں وہ قبل از وقت ضرور تھے۔ ایک بات جو المختار کی شخصیت کے متعلق اب تک پراسرار ہے اور رہے گی وہ مستشرق الہاوزن کہ خیال کے مطابق یہ ہے کہ المختار جیسی جنون زدہ شخصیتیں ہمیشہ پراسرار ہوا کرتی ہیں۔ اس کے متعلق یہ بھی اہم ہے کہ اس کے دل ودماغ میں مذہب اور مفاد کے متعلق شیعی فرقے کے وہ مخصوص تصورات آخر کیونکر پیدا ہوئے؟ جن کا وہ خود ہی بانی تھا۔ اس پر مورخین روشنی نہیں ڈال سکے۔

حضرت مسلم بن عقیل رحمۃ اللہ علیہ

حضرت امام حسین کے سفیر اور عم زاد بھائی جو واقعہ کربلا کے ایک اہم کردار تھے

نسب اشرف: حضرت مسلم بن عقیل بن ابی طالب بن عبدالمطلب۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے عم زاد بھائی۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے جناب امیر معاویہ کی وفات کے بعد مکہ میں پناہ لی اور حضرت مسلم بن عقیل کو کوفہ کی صورت حال کا مطالعہ کرنے کے لیے اپنا سفیر بنا کر وہاں بھیجا، کیونکہ وہاں شیعان علی امام صاحب کو بلا رہے تھے اور دعوت دے رہے تھے کہ وہاں آ کر اپنی خلافت کا اعلان کریں۔ جب حضرت مسلم کوفہ پہنچے تو وہاں ہزار ہا شیعان علی نے امداد کا یقین دلایا۔ چنانچہ انہوں نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو بڑی منت سے لکھا کہ وہ جلد از جلد آ کر اس تحریک کی قیادت اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ اس دوران کوفہ کے متلون مزاج گورنر، نعمان بن بشیر کی جگہ مستعد اور سخت مزاج عبیداللہ بن زیاد کو گورنر مقرر کر دیا گیا۔ اس تبدیلی سے آنے والے خطرے کی علامتوں کو بھانپ کر حضرت مسلم بن عقیل نے ہانی بن عروہ کے ہاں پناہ لی۔ ابن زیاد بڑا چالاک تھا وہ ایسی غضب کی چال چلا کہ حضرت مسلم بن عقیل کی پناہ گاہ کا پتہ چل گیا۔ ہانی کو حضرت مسلم کو پناہ دینے کی پاداش میں قید کر دیا گیا۔ حضرت مسلم کے تمام پیروکاران کا ساتھ چھوڑ گئے۔ نماز عصر میں امامت کرتے ہوئے جب انہوں نے نیت باندھی تو ہزاروں لوگ ان کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے جب انہوں نے سلام پھیرا تو صرف چند لوگ ان کے ساتھ تھے۔ حالات اچانک اتنے بدل گئے کہ حضرت مسلم ایک جگہ سے نکل کر دوسری جگہ چھپتے رہے۔ اشعث بن قیس کی اولاد نے ان کے آخری چھپنے کی جگہ کا پتا بتا دیا۔ یہ ایک ایسا فعل شنیع تھا جس کی وجہ سے شیعوں کو اس خاندان سے نفرت ہوگئی۔ جب حضرت مسلم بن عقیل گرفتار ہوگئے تو انہوں نے مقابلہ کیے بغیر خود ابن زیاد کے سپاہیوں کے حوالے کر دیا مگر اس کے باوجود انہیں پناہ دینے کی بجائے ان کا سر کاٹ کر یزید اول کے دربار میں بھیج دیا گیا۔

حضرت مسلم حضرت ابو طالب کے دوسرے بیٹے حضرت عقیل رضی اللہ عنہ بن ابی طالب کے صاحبزادے تھے۔

ان کی والدہ علیہ نامی ایک نبطیہ خاتون تھیں جنہیں حضرت عقیل رضی اللہ عنہ شام سے ایک کنیز کی حیثیت سے خریدا تھا۔

حضرت عقیل رضی اللہ عنہ بعد از ہجرت مدینہ میں رہتے تھے، خاندان ابی طالب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شخصیت مرکزیت رکھتی تھی۔ جناب مسلم نے اپنے عم بزرگوار کی آغوش تربیت میں ہوش سنبھالا۔ وہ جنگ صفین میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ 40ھ میں جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شہادت پائی تو مسلم، حضرت امام حسین کے زیر سایہ آ گئے۔ بظاہر اسی زمانے میں ان کا عقد رقیہ بنت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا۔ حضرت مسلم جبکہ حضرت عقیل کی ایک ام ولد کنیز کے صاحب زادے تھے۔ حضرت مسلم کے دو فرزند حضرت عون و محمد کوفہ میں اور دو میدان کربلا میں شہید ہوئے تھے۔

50ھ میں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو جناب مسلم حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے زیر سایہ آ گئے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو ان پر بڑا اعتماد تھا۔ جب حضرت امام نے انہیں اپنا سفیر بنایا تو انہوں نے بڑی دلیری

سے اپنایہ فرض پورا کیا اور امام پر اپنی جان قربان کردی۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے حکم پر حضرت مسلم جب کوفہ پہنچے تو وہ 5 شوال 60ھ کو مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کے گھر قیام پذیر ہوئے۔ کوفہ والوں کو جب امام مسلم کی آمد کی خبر ملی تو جوق در جوق ان کا ایک بڑا مجمع حضرت مسلم سے ملنے کے لیے آیا اور صرف ایک ہفتے میں اٹھارہ ہزار سے زائد کوفیوں نے ان کا حلقہ اطاعت قبول کیا۔

گورنر کوفہ نعمان بن بشیر نے اعلان کیا کہ جو مجھ سے نہیں لڑے گا تو میں بھی اس سے نہیں لڑوں گا اور محض ظن وگمان پر میں کسی کو گرفتار نہیں کرسکتا۔ اسی بنا پر یزید نے عبیداللہ بن زیاد جیسے ظالم اور سخت مزاج شخص کو گورنر کوفہ بنادیا اور اسے حکم دیا تھا کہ حضرت مسلم بن عقیل کا کوئی بندوبست کرو۔ جب کوفہ کے حالات خراب ہوئے اور حضرت مسلم گرفتار ہوگئے تو انہیں احساس ہوا کہ انہوں نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو کوفہ آنے کا لکھ کر اچھا نہیں کیا۔ ابن زیاد کے دربار میں جب وہ عمر بن سعد کو ملے تو انہوں نے انہیں وصیت کی کہ وہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو لکھ دیں کہ وہ کوفہ تشریف نہ لائیں اور ساتھ ہی وصیت کی کہ میری زرہ اور تلوار میری وفات کے بعد بیچ کر میرا قرض ادا کردیا جائے۔

ابن زیاد نے ظلم کی انتہا کرتے ہوئے حکم دیا کہ حضرت مسلم کو کوفہ کے محل کی بلندی پر لے جاؤ اور سر اتار کر جسم کے ساتھ نیچے گرادو۔ یہ حکم سن کر حضرت مسلم بالکل سکون اور وقار سے رہے اور تکبیر و تسبیح واستغفار پڑھنے لگے، درود سلام کا ورد کرتے ہوئے محل کی چھت پر پہنچے جہاں بقول طبری بکیر بن حمران نامی شخص یا جلاد نے ان کا سر قلم کرکے انہیں چھت سے نیچے گرادیا، ان کے بعد ہانی بن عروہ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ بعدازاں ان کے سربریدہ جسم کوفہ کی گلیوں میں پھرائے گئے۔ حضرت مسلم وہانی کے مقبرے مسجد کوفہ میں موجود ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز (681ء تا 720ء)

اپنے طرز حکمرانی سے خلافت راشدہ کی یاد تازہ کرنے والے عظیم تابعی القرشی، صالح اور عادل خلیفہ بنوامیہ جو اپنی عدل گستری، انصاف پسندی، سادگی اور نیکی وتقویٰ کے باعث خلفائے راشدین میں پانچویں خلیفہ شمار ہوتے ہیں۔

آپ کی ولادت 61ھ/ 681ء میں مدینہ منورہ میں ہوئی۔ ان کے والد عبدالعزیز کئی سال تک مصر کے گورنر رہ چکے تھے۔ والدہ کی طرف سے وہ حضرت عمر بن خطاب کی آل میں سے تھے۔ ان کی والدہ ام عاصم بنت عاصم بن عمر بن خطاب تھیں۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ مدینہ منورہ میں بسر ہوا۔ ان کے والد نے انہیں مصر سے مدینہ اس لیے بھیج دیا تھا کہ وہ مدینہ میں شایان شان تعلیم حاصل کرسکیں۔ چنانچہ اپنے والد کی وفات کے وقت (85ھ/ 704ء) تک وہ مدینہ ہی میں مقیم رہے۔ پھر ان کے چچا یعنی خلیفہ عبدالملک ان کو دمشق لے گئے اور اپنی بیٹی فاطمہ سے ان کا عقد کردیا۔ ربیع الاول 87ھ/ فروری 706ء میں خلیفہ ولید اول نے آپ کو حجاز کا والی مقرر کیا اور وہ دوبارہ شہر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں آگئے۔ دیگر عاملوں کے برخلاف، جو زیادہ تر ظالمانہ طریق سے حکومت کرتے تھے، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مدینہ آتے ہی دس متقی محدثین کی ایک مجلس شوریٰ تشکیل دی، جس سے وہ ہر اہم معاملہ میں مشاورت کرتے تھے۔ انہوں نے اس مجلس شوریٰ کے ارکان کو یہ حق بھی دے رکھا تھا کہ وہ ان کے ماتحت عمال کی کڑی نگرانی کریں۔ ان کی حکومت کئی اور طریقوں سے رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال رکھتی تھی مگر کچھ بعد اموی معاملات کے مختار کل حجاج بن یوسف کو حضرت عمر بن عبدالعزیز کا حلیمانہ طرز حکومت پسند نہیں آیا کیونکہ عراق کے لوگ اس کے مظالم سے تنگ آکر حرمین شریفین اور حجاز میں پناہ لینے لگے تھے۔ آخر الحجاج کے اصرار پر ان کو 93ھ/ 712ء میں واپس دمشق بلا لیا گیا، تاہم وہ کسی عتاب یا توہین کے مستوجب نہیں ٹھہرے۔ جب سلیمان بن عبدالملک نے ان کو اپنا ولی عہد نامزد کیا تو وہ آئندہ کے لیے خلیفہ قرار پائے۔ صفر 99ھ/ ستمبر اکتوبر 717ء میں بمقام وابق

سلیمان نے وفات پائی تو مشہور عالم اور فقیہ، رجاء بن حیوۃ نے امویوں کو جامعہ دمشق میں جمع کیا اور کسی شخص کا نام بتائے بغیر کہا کہ خلیفہ سلیمان نے اپنی وصیت میں جس فرد کو اپنا جانشین نامزد کیا ہے انہیں اس کی بیعت کرنا چاہیے۔ جب لوگ یہ بیعت کر چکے تو رجاء بن حیوۃ نے بتایا کہ خلیفہ سلیمان وفات پا گیا ہے اور یہ کہ اس نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو اپنا جانشین منتخب کیا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کو خلیفہ عبدالملک کے دو بیٹوں یزید اور ہشام پر ترجیح دی گئی تھی اس لیے ہشام نے اعتراض کیا مگر اس کا اعتراض دب گیا اور حضرت عمر بن عبدالعزیز بغیر کسی شدید مخالفت کے مسند خلافت پر رونق افراز ہو گئے۔

خلیفہ کی حیثیت سے وہ اپنے پیشرو خلفائے بنوامیہ سے بالکل منفرد تھے۔ ان کی طبیعت میں خوف خدا اور تقویٰ غالب تھا۔ اور انہیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ وہ خدا کے سامنے جواب دہ ہیں۔ وہ اپنے فرائض حکمرانی انتہائی دیانتداری سے انجام دیتے تھے۔ انتہائی سادگی اور کفایت شعاری ان کی امتیازی خصوصیات میں شامل تھیں۔

ان کا عہد خلافت صرف ڈھائی سال تک رہا اور یہ فوجی کارناموں کی وجہ سے کچھ زیادہ نمایاں نہیں رہے۔ انہوں نے مسند خلافت پر بیٹھتے ہی سلیمان کے حکم پر کیا گیا محاصرہ قسطنطنیہ اٹھا لیا کیونکہ ان کے نزدیک اس عسکری کاروائی کے مقابلے میں انسانی زندگیاں زیادہ قیمتی تھیں۔ ان کے عہد میں اندلس کے سلسلہ کوہ البرانس PYRNEES کو عبور کر کے عرب افواج سرزمین فرانس میں داخل ہو گئیں تھیں مگر مال غنیمت کے حصول کے بعد واپس آ گئیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے زیادہ دلچسپی حکومت کے اندرونی معاملات میں لی۔ خراسان کے ناقابل اعتماد عامل یزید بن مہلب کو گرفتار کر کے اس کی جگہ الجراح بن عبداللہ الحکمی کو مامور کیا۔ بنوعلی سے بھی ان کا رویہ انتہائی نرم اور شفقت آمیز تھا۔ انہوں نے مساجد میں بر سر منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہنے کا سلسلہ حکماً روک دیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فدک کا نخلستان بھی بنوعلی رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔ یہ نخلستان شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی جائیداد میں شامل تھا۔ بعدازاں اسے امویوں کی جائیداد میں شامل کر لیا گیا تھا۔ مگر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اسے واپس اولاد علی رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔ اسی طرح حضرت طلحہ کی جو جائیداد مکہ میں تھی اور جسے خلیفہ عبدالملک نے ضبط کر لیا تھا اسے انہوں نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی اولاد کو واپس کر دیا۔ ان کی عام طور پر یہی کوشش رہی کہ جو لوگ کسی نہ کسی طرح حکام کے استحصال بالجبر کا شکار ہوئے ان کے نقصان کی تلافی کر دی جائے۔ ایک متقی مسلمان کی حیثیت سے انہوں نے دیگر مذاہب کے پیروکاروں سے بھی رواداری کا سلوک کیا۔ عیسائیوں، یہودیوں اور مجوسیوں کو اجازت تھی کہ وہ اپنے کلیسا، عبادت خانے اور آتش کدے بدستور اپنے قبضے میں رکھیں۔ تاہم اسلامی قلمرو میں انہیں نئی عبادت گاہیں تعمیر کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ دمشق میں خلیفہ الولید یوحنا المصبح کے کینسہ یا سلیق کو منہدم کرا کے اس کی اراضی کو مسجد جامع اموی میں شامل کر دیا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں جب عیسائیوں نے سابقہ خلیفہ کی اس کاروائی کی شکایت انہیں کی تو اس پر انہوں نے اپنے عامل کو حکم دیا کہ جو اراضی یا سلیق کی مسجد میں شامل کی گئی ہے وہ واپس کر دی جائے۔ لیکن چونکہ مسلمانان دمشق نے اس کی مخالفت کی، لہٰذا عیسائیوں کی رضامندی سے یہ معاملہ یوں طے پایا کہ شہر کے باہر کے کچھ کلیسا جو مسلمانوں نے جنگ کے دوران بزور شمشیر حاصل کیے تھے وہ انہیں کینسہ یا سلیق یوحنا کی زمین کے بدلے میں دے دیئے گئے۔ اسی طرح خلیفہ راشد پنجم نے ٹیکس، خراج اور دیگر محصولات کے معاملات کو انتہائی انصاف پسندی پر مشتمل طریق پر جاری کیا اور ان معاملات کی اصلاح کی۔

قدیم مورخین کا خیال تھا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز ایک غیر معمولی کردار کے انسان تھے جو اپنے مذہبی رجحانات کی وجہ سے ایک خیالی نصب العین کے پیچھے پڑے رہے اور انہوں نے حقیقی حالات کا کچھ خیال نہ کیا۔ مگر موجودہ زمانے کے محققین نے ان کی کارگزاریوں کو ان کے اصلی رنگ میں پیش کر کے اس زمانے کی بڑی واضح تصویر پیش کی ہے۔ اُن کا زمانہ خوارج کے

فتنے سے محفوظ رہا، مگر بعض تو تیں جو پوشیدہ تھیں وہ خفیہ طور پر کام کرتی رہیں جو بالآخراموی خاندان کے زوال کا باعث بنا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے بیس دن بستر علالت پر گذارنے کے بعد رجب 101ھ/ فروری 720ء میں وفات پائی اور حلب میں دفن کیے گئے۔ان کے جانشین ان کے چچازاد بھائی یزید بن عبدالملک بنے۔وہ ایام جوانی ہی سے متقی اور پرہیزگار تھے اور مدینہ منورہ کے اولین محدثین کے زیر اثر وہ بھی علم حدیث کے ایک مستند عالم مانے جاتے تھے۔ان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ان کا شمار حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے جامعین میں ہونے لگا۔عباسی عہد کے سرکاری مورخین جو خلفائے بنوامیہ کی مذمت کرتے نظر آتے ہیں حضرت عمر بن عبدالعزیز کو مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔

حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ (م 93ھ/ 714ء)

تابعین کے بڑے آئمہ کرام میں سے ایک اور حجاج بن یوسف کے ظلم کا شکار ہونے والی شخصیت

نام ونسب: حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نام اور ابوعبداللہ کنیت تھی۔یہ بنی والبہ بن حارث کے غلام تھے۔اسی وجہ سے والبی بھی کہلاتے تھے۔حضرت سعید بن جبیر ہی سے روایت ہے کہ مجھ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے پوچھا آپ کن میں سے ہیں؟ میں نے کہا میں بنی اسد سے ہوں۔پھر آپ رضی اللہ عنہ نے پوچھا شرفاء میں سے ہو یا غلاموں میں سے؟ میں نے عرض کیا غلاموں میں سے۔اس پر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یوں کہو نا کہ آپ ان میں سے ہیں جن پر بنی اسد میں سے اللہ نے انعام واحسان فرمایا (کہ مسلمان ہونے کی سعادت بخشی)

حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔مجاہد کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت سعید بن جبیر کو کہا کہ حدیثیں سناؤ تو حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ میں آپ رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں حدیثیں سناؤں (یعنی یہ تو ایسا ہوا جیسے آفتاب کے سامنے چراغ جلانا) حضرت عباس نے فرمایا کہ نہیں تم سناؤ۔یہ تو خدا کی نعمت ہے کہ تم میرے سامنے حدیثیں بیان کرو۔اگر صحیح بیان کرو گے تو بہتر اور کہیں غلطی کرو گے تو میں اس کی تصحیح کروں گا۔یوں حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف سے سب سے بڑی سند ملی تھی۔

فضل وکمال: امام نوی کا بیان ہے کہ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ تابعین کے بڑے آئمہ کرام میں سے تھے۔حافظ ذہبی نے انہیں علمائے اعلام میں سے بتایا ہے۔تفسیر، حدیث، فقہ، زہد وعبادات اور اخلاق وتقویٰ وغیرہ جملہ کمالات و اوصاف میں بڑے بڑے اماموں کا ہم پلہ تھے اور سرکردہ تابعین میں سے ایک تھے۔

حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے یوں تو بڑے بڑے صاحب علم صحابہ کرام سے اکتساب علم کیا۔حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا حلقہ درس بڑا وسیع اور عظیم وجلیل تھا جس میں تفسیر قرآن، حدیث، فقہ، فرائض، ادب وانشا اور شعروشاعری کے دریا بہتے تھے۔سعید بن جبیر سب سے زیادہ اسی سرچشمہ فیض سے سیراب ہوئے۔حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ میں بڑی پابندی کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حلقہ درس میں شریک ہوتا تھا، کچھ تک انہیں درس میں شرکت کے دوران لکھنے کی اجازت نہیں تھی بلکہ زبانی انحصار کرنے کا حکم تھا، لیکن بعدازاں ان کو لکھنے کی اجازت مل گئی۔اور آپ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھنا شروع کردیا؛ کاغذ تو ابھی میسر نہیں تھا اس لیے چمڑے کی بیاض اگر پُر ہوجاتی تو کپڑوں اور کبھی کبھی ہتھیلی پر بھی لکھا کرتے تھے۔

جعفر بن ابی المغیرہ سے روایت ہے کہ جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی بینائی جاتی رہی تو جو کوئی آپ رضی

اللہ عنہ سے کوئی مسئلہ پوچھنے آتا تو آپ رضی اللہ عنہ اس سے فرماتے تم حضرت سعید بن جبیر سے پوچھو اب تمہیں میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ علم ریاضی کے بڑے ماہر تھے علم فرائض میں بھی انہیں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس کوئی سائل علم فرائض کا کوئی مسئلہ پوچھنے کے لیے آیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اسے کہا کہ ابن جبیر کے پاس جاؤ کہ وہ مجھ سے زیادہ علم الحساب جانتے ہیں۔ وہ تم کو اس فرض کے بارے میں بتائیں گے جو مقرر ہے۔

سیاسی سرگرمیاں: حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ ایک عرصہ تک مدینہ منورہ میں رہے پھر عراق کے مختلف شہروں میں علم وعرفان کی بارشیں کرتے اور تشنگان علم کی پیاس بجھاتے رہے۔ کوفہ میں آپ رضی اللہ عنہ نے مستقل سکونت اختیار کر لی۔ کچھ عرصے عبداللہ بن عتبہ بن مسعود کے کاتب رہے۔ مشہور اموی گورنر حجاج ان کا بڑا قدردان تھا اور ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ اس نے انہیں جامع کوفہ کا امام مقرر کیا تھا۔ پھر عہدہ قضاۃ بھی ان کو سونپ دیا، لیکن اہل کوفہ نے احتجاج کیا کہ قاضی کو عربی النسل ہونا چاہیے۔ اس لیے حجاج نے انہیں عہدہ قضاۃ سے ہٹا کر ابو بردہ بن موسیٰ اشعری کو قاضی بنادیا۔

حجاج سے مخالفت: حجاج تو آپ رحمۃ اللہ علیہ پر انعام واکرام کی بارش کر رہا تھا مگر آپ رحمۃ اللہ علیہ اس کے انعامات سے متاثر نہیں تھے۔ اور اس کے اس کے مظالم کی وجہ سے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیے جب ابن اشعث نے حجاج کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو حضرت ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ساتھ دیا۔ ان کی وجہ سے کوفہ کے بہت سے قراء، علما اور محدثین ابن اشعث کے ساتھ ہوگئے۔ ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ علما کی اس جماعت کے سربراہ تھے، اور میدان جنگ میں لوگوں کو حجاج اور بنوامیہ کے خلاف یہ کہہ کر ابھارتے تھے کہ یہ لوگ اسلامی عدل وانصاف کے منافی ہیں اور انہوں نے خلفا کا طریقہ چھوڑ کر ظالمانہ طور پر حکومت کرنا شروع کردی ہے اور یہ فسق وفجور کی سرپرستی میں پیش پیش ہیں۔

ابتدا میں ابن اشعث کی بڑی قوت تھی اور اسے کچھ کامیابیاں حجاج کے خلاف حاصل ہوئیں مگر جب خلیفہ عبدالملک بھی اس کے خلاف ہوگیا تو وہ پوری حکومتی فوج کا مقابلہ نہیں کرسکا۔ اور دیر جماجم کے مرکز میں شکست کھا کر سیستان بھاگ گیا۔

اس کی شکست کے بعد حضرت ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ بھی مکہ چلے آئے۔ مکہ کے والی خالد بن عبداللہ قسری نے ان کو گرفتار کرکے حجاج کے پاس بھجوادیا، وہ اب ان کا سخت ترین دشمن بن چکا تھا۔ ان کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ جب ابن جبیر اس کے دربار میں پیش کیے گئے تو ان کے درمیان جو مکالمہ ہوا وہ آج بھی تاریخ کے صفحات میں کچھ یوں محفوظ ہے۔

حجاج نے ان کا نام پوچھنے کے بعد کہا کہ آپ شقی بن کیسر ہو اور میں تمہاری دنیا کو دہکتی آگ سے بھر دوں گا۔

حضرت ابن جبیر نے اس پر کہا کہ اگر مجھے اس بات کا یقین ہوتا کہ یہ بات آپ کے اختیار میں ہے تو میں آپ کو معبود بنالیتا۔

اس پر حجاج نے ان سے سوال کیا کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے، حضرت ابن جبیر نے کہا کہ وہ امام الانبیا اور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ حجاج حجاج نے پھر سوال کیا کہ تم حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو کہ جنت میں ہیں یا دوزخ میں؟۔ ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ اگر میں جنت یا دوزخ میں گیا ہوتا تو بتاتا کہ یہ حضرات کہاں ہیں؟ عالم غیب کی بھلا میں کیا خبر دے سکتا ہوں۔ آخر بہت سے سوالات کے بعد حجاج نے ان سے پوچھا کہ وہ کس طرح سے قتل کیا جانا پسند کریں گے۔ اس پر حضرت ابن جبیر نے بے باکانہ کہا کہ خدا کی قسم تم مجھے جس طرح قتل کرو گے خدا تم کو آخرت میں اسی طرح قتل کرے گا۔ آخر حجاج نے ان کو قتل کرنے کا حکم دے دیا اور اپنے سامنے ہی ان کو قتل کرنے کے لیے چھرا چھپانے کا حکم دیا۔ اس پر حضرت ابن جبیر نے اتنی مہلت مانگی کہ دو رکعت نماز ادا

کر کیں پھر دفعتاً جلاد کی تلوار چمکی اور ان کا لاشہ گر کر تڑپنے لگا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ (م96ھ/716ء)

تابعین کے بڑے عالموں میں سے ایک سادہ مگر فضل وکمال میں ممتاز عالم

نام ونسب: حضرت ابراہیم بن یزید بن اسود بن عمرو بن ربیعہ بن حارثہ بن سعد بن مالک بن النخع مذحج۔ ابوعمران کنیت تھی۔ یہ یک چشم تھے۔ نخع قبیلہ بنو مذحج کی ایک شاخ ہے یہ لوگ کوفہ میں آباد ہو گئے تھے۔

حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ بھی تابعین میں اپنے فضل وکمال اور زہد وتقویٰ کی وجہ سے کوفہ میں ممتاز تھے، لیکن عجز وانکساری اور سادگی کا یہ عالم تھا کہ کوئی پہچان نہیں سکتا تھا کہ یہ کون ہیں۔ محمد بن سیرین سے روایت ہے کہ میں اپنی مجلس میں ایک نوجوان ابراہیم کا ذکر سنا کرتا تھا، مسروق کے نزدیک وہ سب سے زیادہ عالم تھے، لیکن وہ ہم میں ایسے رہتے تھے کہ گویا ہمارے ساتھ نہیں۔ یہی ابراہیم علقمہ کے حلقہ درس میں بیٹھا کرتا تھا مگر لوگوں میں گمنام حیثیت کا مالک تھا۔

حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کی قوت حافظہ اتنی قوی تھی کہ خود فرماتے ہیں کہ میں کبھی کچھ لکھنے کا تردد نہیں کیا۔

عبدالملک بن ابی سلیمان کے بیان کے مطابق حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے جب کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو وہ کہتے کہ تمہارے درمیان ابراہیم موجود ہے اور تم مجھ سے مسائل دریافت کرنے آتے ہو۔ حضرت ابراہیم جب کبھی حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول سنتے تو بڑا تعجب کرتے اور کہتے کہ میں تو خود ان کے علم کا محتاج ہوں۔

حضرت علقمہ ان کے چچا اور اسود ان کے ماموں دونوں کوفہ کے ممتاز ترین محدثین میں سے تھے، حضرت ابراہیم نخعی نے انہیں جیسے جید عالموں کے دامن میں پرورش پائی تھی۔ ابوزرعہ نخعی کہتے ہیں کہ ابراہیم ممتاز ترین علمائے اسلام میں سے ایک تھے۔ ان کو حدیث اور فقہ دونوں میں کامل دستگاہ حاصل تھی۔

فضل وکمال: حضرت اعمش رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ میں نے جب بھی حضرت ابراہیم نخعی سے کسی حدیث مبارکہ کا ذکر کیا آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعلق میری معلومات میں اضافہ کیا یعنی علم حدیث میں انہیں اتنی دسترس حاصل تھی کہ وہ ہمیشہ اس کا نیا پہلو بیان فرماتے تھے۔ طلحہ کہا کرتے تھے کہ کوفہ میں سب سے بڑی ہستیاں دو ہیں خثیمہ اور ابراہیم۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عقیدت: حضرت ابراہیم نخعی کو جس چیز نے سب سے زیادہ فائدہ دیا وہ یہ تھی کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ ابومعشر کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیم نخعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی ازواج مطہرہ سے جو اس زمانے میں بقید حیات تھیں کے پاس جاتے اور ان سے علمی استفادہ کرتے۔ خاص طور پر ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے انہیں خصوصی عقیدت وارادت تھی کہ ازواج مطہرات میں سب سے زیادہ علوم نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کی وارث اور فقیہہ بھی تھیں۔ ان کی مجلسوں میں حاضری دیتے تھے۔ اگرچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حضرت ابراہیم نخعی کا سماع حدیث ثابت نہیں، تاہم ان جیسی برگزیدہ ہستی کی مجلسوں میں شریک ہونا ہی باعث خیر وبرکت تھا۔

ایسی احادیث جن کا کوئی راوی درمیان سے چھوٹ جائے مرسل حدیث کہا جاتا ہے۔ ابن معین حضرت ابراہیم نخعی کی مرسل روایات کو امام شعبی کی روایات سے زیادہ پسند کرتے تھے۔

حضرات صحابہ کرام علیہم الرضوان اور تابعین اس امر کو بخوبی سمجھتے تھے کہ اسلامی زندگی کی بنیاد ایمان وعمل صالح ہے۔ عقائد کی اصلاح ودرستی سے اعمال درست ہوتے ہیں اور ظاہر کی پاکیزگی ہی باطن کی صفائی ہوتی ہے۔ اسی بنا پر حضرت

ابراہیم نخعی عقائد کے بارے میں سلف کے عقائد سے ذرا بھی تجاوز نہیں کرتے تھے۔ عہد صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد ارجاء کا نیا عقیدہ پیدا ہوا یعنی جس نے ایک مرتبہ کلمہ توحید لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ لیا بس وہ مسلمان ہو گیا خواہ وہ اس کلمے کے بنیادی مفہوم کو سمجھے یا نہ سمجھے یعنی توحید و رسالت کی حقیقت کو پائے نہ پائے۔ اس کے بعد چاہے وہ ساری زندگی شرک و گناہ کی دلدل میں دھنسا رہے وہ ہرگز دوزخ میں نہیں جائے گا۔ حضرت ابراہیم نخعی اس عقیدہ اور اس کے حامل افراد مرجیہ کے خلاف تھے اور تلقین کرتے تھے کہ ایسے لوگوں سے دور رہنا ضروری ہے۔

ظالم امراء کی مخالفت: اسلام کا مقصد دنیا میں عدل و انصاف قائم کرنا ہے۔ دنیا میں جتنی چیزیں بھی ظلم و فساد پھیلانے والی ہیں اسلام ان سب کو مٹانا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے حق نے ہمیشہ ظالم و جابر بادشاہوں اور امراء کے خلاف علم جہاد بلند کیا ہے اور اعلیٰ الاعلان کلمہ حق بلند کرتے ہوئے ان کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ میں بھی یہ صفت بدرجہ اتم موجود تھی۔ کچھ سلاطین و امراء سے ان کے دوستانہ مراسم بھی تھے مگر حجاج بن یوسف جیسے ظالم و جابر سے ان کی نہیں بنتی تھی۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ اسے برا بھلا کہتے تھے اور بعض اوقات اس پر لعنت بھی بھیجتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے حجاج اور اس جیسے ظالم امراء پر لعنت بھیجنے کے بارے میں دریافت کیا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ خود قرآن پاک میں ظالموں پر لعنت بھیجتا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ ظالموں پر لعنت بھیجنا منافی اخلاق نہیں ہے۔ حجاج کی موت پر آپ اس قدر خوش ہوئے کہ سجدے میں گر پڑے اور آنکھوں سے مسرت کے آنسو جاری ہو گئے۔

جب حضرت ابراہیم خود مرگ وفات میں مبتلا ہوئے تو ایک شخص ان کی عیادت کو آیا اس نے دیکھا کہ آپ رو رہے ہیں۔ پوچھا تو فرمایا کہ میں دنیا چھوڑنے پر نہیں رو رہا بلکہ اپنی دو بیٹیوں کی وجہ سے رو رہا ہوں۔ انہوں نے پچاس سال کی عمر میں 96ھ میں کوفہ میں وفات پائی۔

حضرت مسروق ابن اجدع رحمۃ اللہ علیہ

حضرات تابعین میں سے وہ صاحب فضل و کمال جسے ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اپنا بیٹا کہتی تھیں

نام و نسب: حضرت مسروق بن اجدع، کنیت ابو عائشہ تھی۔ وہ یمن کے مشہور خاندان ہمدان کے سردار اور عرب کے نامور شہسوار معدی بن کرب کے عزیز تھے۔ شجرہ نسب کچھ یوں تھا۔ مسروق بن اجدع بن مالک بن امیہ بن عبداللہ بن سلیمان۔ ہشام بن کلبی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ عہد فاروقی میں ایک مرتبہ یمن کے وفد میں حضرت مسروق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا آپ کون ہیں؟ عرض کیا مسروق بن اجدع، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اجدع شیطان کا نام ہے اس لیے تم مسروق بن عبدالرحمٰن ہو۔ ابوالضحیٰ کی روایت ہے کہ مسروق کہتے تھے میں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امامت میں نماز پڑھی تھی۔

یہ یمن کے شہسواروں میں سے تھے۔ قادسیہ کے معرکے میں شریک ہوئے اور ان کے سر میں گہرا زخم آیا۔ اس کا نشان باقی رہا۔ ان کے تین اور بھائی تھے جو معرکہ قادسیہ میں شہید ہو گئے تھے۔

خانہ جنگی سے احتراز: جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جنگوں کا زمانہ آیا حضرت مسروق نے کسی جانب سے بھی لڑائی میں حصہ نہ لیا۔ البتہ انہوں نے جنگ صفین میں عام مسلمانوں کو اس باہمی جدال و قتال سے روکنے کی کوشش بھی کی تھی۔

عبادت گذاری: مرہ لکھتے ہیں کہ ہمدانیوں میں کوئی شخص مسروق جیسا صاحب فضل و کمال نہیں ہوا۔ ابواسحاق کہتے

ہیں مسروق نے حج کیا۔ جب تک مکہ میں رہتے مسجد ہی میں سویا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت مسروق رحمۃ اللہ علیہ چند آدمیوں کے ساتھ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حکم دیا کہ میرے بیٹے کے لیے شہد گھولو۔ جب بھی حضرت مسروق ان کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ (رضی اللہ عنہا) ان کی شہد سے تواضع کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ اس شہد کو چکھ لو کیونکہ میں روزے سے ہوں ورنہ میں خود چکھ لیتی۔ حضرت مسروق نے عرض کیا کہ ہم بھی روزہ سے ہیں۔ آپ نے پوچھا تم نے کیسا روزہ رکھا ہے۔ مسروق نے کہا کہ ہم نے احتیاطاً روزہ رکھ لیا کہ آج کہیں رمضان شریف کا چاند نظر نہ آگیا ہو۔ آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ جب سب لوگ رمضان کا روزہ رکھیں تو تم بھی رکھا کرو۔

دولت دنیا سے بے نیازی: حضرت مسروق دولت دنیا سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ جب انہیں کوئی رقم ہاتھ آئی تو وہ اسے راہ خدا میں صرف کر دیا کرتے تھے۔ حضرت مسروق علم وعمل کا پیکر تھے، اخلاق کا سرچشمہ خشیت الٰہی ہے، وہ خوف خدا سے ہر وقت لرزتے رہتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے کہ انسان کے لیے یہ علم کافی ہے کہ وہ خدا سے ڈرتا رہے اور جہل یہ ہے کہ وہ اپنے علم وعمل پر غرور کرے۔

حضرت عائشہ سے مادرانہ محبت: علمی اعتبار سے علمائے تابعین میں حضرت مسروق کا بہت بلند مقام ہے۔ انہیں ابتدائے عمر ہی سے طلب علم کا شوق تھا۔ شعبی کا بیان ہے کہ ان سے زیادہ طلب علم کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس پر مزید خوش قسمتی اور فضل الٰہی یہ تھا کہ ان کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جیسی عالمہ وفاضلہ کی مادرانہ شفقت ومحبت میسر آگئی تھی۔ وہ انہیں اپنا بیٹا کہہ کر پکارتی تھیں۔

عہدہ قضاۃ: شعبی کا بیان ہے کہ مسروق منصب قضاۃ پر بھی فائز رہے مگر وہ اس کا کوئی معاوضہ یا تنخواہ نہیں لیتے تھے۔

دم آخر: دم آخر بارگاہ الٰہی میں حضرت مسروق نے عرض کیا خدایا! میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سنت کے خلاف طریقے پر نہیں مر رہا ہوں۔ خدا کی قسم میں نے اپنی تلوار کے سوا کوئی اور چیز نہیں چھوڑی۔ میری وصیت ہے کہ میری تلوار بیچ کر میرے کفن کا انتظام کر دینا۔ حضرت مسروق نے 73ھ/695ء میں انتقال کیا تھا۔

حضرت علمدار عباس بن علی رضی اللہ عنہ (647ء-680ء)

پیکر وفا، علم بردار حضرت امام حسین، معرکہ کربلا کے غازی اور افضل الشہداء، عظیم تابعی شخصیت

نسب اشرف: حضرت عباس بن علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب بن ہاشم۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کی کنیت ابوالفضل، ابوالقاسم، ابوقربہ اور لقب سقاء تھا۔

ولادت: آپ کی ولادت 26ھ/ بمطابق 647ء کو مدینہ منورہ میں ہوئی، سن ولادت میں اختلاف نہیں پایا جاتا، لیکن تاریخ ولادت میں سخت اختلاف ہے۔ بعض مورخین نے 18 رجب 26ھ اور بعض نے 26 جمادی الثانی 26ھ بتائی ہے۔ تحقیقی قول کے مطابق آپ رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش 4 شعبان المعظم 26ھ/ بمطابق 18 مئی 647ء کو ہوئی۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ کا نام حضرت بی بی فاطمہ کلابیہ تھا۔ آپ کو پیکر وفا اور مجسم وفا کہا جاتا ہے، صفت وفا کو حضرت عباس سے وہی نسبت ہے جو روح کو انسانی جسم سے۔

معرکہ کربلا کے دن جب 10 محرم الحرام 60ھ کو آپ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے بچوں کو پیاس سے بے قرار دیکھا تو ایک مشک (چمڑے کی سلی ہوئی تھیلی جس میں پانی بھرا جاتا ہے) لے کر پانی لینے کے لیے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر چلے اور فرات کی جانب بڑھے۔ راستے میں جس دشمن نے بھی رکاوٹ بننے کی کوشش کی اُسے اپنی تلوار

آبدار سے جہنم رسید کردیا اور نہر فرات تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ دریا کے گھاٹ سے بزور شمشیر یزیدی سپاہیوں کو پرے دھکیل دیا اور خود گھوڑے سمیت دریا میں پہنچے۔ اسی حالت میں مشک بھری، اور پھر خود بھی پانی کے دو گھونٹ پینا چاہے لیکن یہ خیال کر کے کہ امام حسین رضی اللہ عنہ نے ان کے بچے اور اہل قافلہ تمام پیاسے ہیں ان کو پانی پلانے سے پہلے پانی پینا گناہ کبیرہ سے بڑھ کر ہے اور ایک مرد حق کے اصولوں کے خلاف ہے۔ آپ پانی پیئے بغیر دریا سے باہر نکل آئے۔

پانی سے بھری مشک لے کر اپنے پیاروں کی پیاس بجھانے کے لیے خیام سادات کربلا کی طرف بڑھے تو دشمن آپ رحمۃ اللہ علیہ کی تاک میں تھے۔ انہوں نے آپ رحمۃ اللہ علیہ کو گھیر لیا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ بڑی بہادری سے دشمنوں سے لڑتے رہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ہاتھ میں مشک تھامی ہوئی تھی جبکہ دوسرے ہاتھ سے شمشیر علی رضی اللہ عنہ کے جوہر دکھا رہے تھے۔ آپ کی رگوں میں خون بنی ہاشم رواں تھا اور بہادری آپ کے خون میں شامل تھی۔ دشمن آپ کی تلوار سے کٹ کٹ کر گر رہے تھے مگر جیسے ہی ایک گرتا دوسرا اس کی جگہ لے لیتا۔ دشمنوں کی تعداد ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ دشمنوں کو اس بات کا احساس تھا کہ اگر پانی سادات کربلا تک پہنچ گیا تو پھر ان کی خیر نہیں۔ چار سو دشمنوں میں گھرا حیدر کرار رضی اللہ عنہ کا فرزند تنہا سینکڑوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ مگر دشمنوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ سے آخر آپ رحمۃ اللہ علیہ کے دونوں بازو کٹ گئے۔ آپ رضی اللہ عنہ کا ایک بازو کہیں گرا اور دوسرا کہیں مگر بازو کٹنے کے باوجود آپ نے ہار نہیں مانی اور جنگ جاری رکھی۔ دشمن صرف تلواروں اور نیزوں سے ہی نہیں تیروں سے بھی آپ پر مسلسل حملے کر رہے تھے۔ تیروں سے چھلنی ہونے کے بعد جب پیکر وفا اپنے گھوڑے سے زمین پر گرا تو دشمنوں نے گرز کی ضرب سے آپ کو شہید کر دیا۔ ع، کہا عباس رضی اللہ عنہ نے افسوس بازو

کٹ گئے میرے سکینہ تک یہ مشک آب لے جائی نہیں جاتی

بعد ازاں دریائے فرات سے ایک نہر نکالی گئی جو علقمہ کہلاتی ہے۔ آج یہ نہر حضرت عباس علمبردار کے روضہ مبارک کے پاس سے گذرتی ہے تاکہ شہدا کربلا سیراب ہو جائیں۔

علمدار فوج حسینی، حضرت عباس امام حسین رضی اللہ عنہ کے عظیم جانثاروں اور کربلا کے مجاہدوں میں خصوصی احترام کے اہل ہیں۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اپنی بے مثال بصیرت، لاجواب عزیمت اور خاندانی وجاہت اور ذاتی شجاعت کی بنا پر علمداری کے منصب کے تمام حقوق ادا کر کے اپنی زندگی کو ہمیشہ کے لیے جاویداں کر لیا۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ (713ء-778ء)

حکام کے تحائف مسترد کرنے والے عہد تبع تابعین کے مشہور عالم، محدث اور صوفی بزرگ، ایک عظیم شخصیت

نام ونسب: حضرت سفیان الثوری رحمۃ اللہ علیہ بن سعید بن مسروق الثوری الکوفی عہد تبع تابعین کے ایک مشہور و معروف عالم، محدث اور صوفی۔ الثوری کے متعلق تذکرہ نگاروں کا عام طور پر یہ خیال ہے کہ ان کی یہ خاندانی نسبت ثور بن عبد المناۃ...... بن الیاس بن مضر سے ہے۔

ان کا سال ولادت 95ھ یا 97ھ (713ء) عیسوی ہے۔ حضرت سفیان ثوری نے ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی جن کا شمار کوفہ کے جید فضلاء میں ہوتا تھا۔

حضرت سفیان ثوری ان بزرگوں میں سے تھے جنہوں نے سرکاری عہدے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور ارباب حکومت سے علیحدہ اور کنارہ کشی کی وجہ سے معتوب قرار پائے۔ طبقات سعد میں لکھا ہے کہ شاید ایک مرتبہ حضرت سفیان نے ایک والی سے نذرانہ کی کوئی رقم وصول کر لی تھی، لیکن اس کے بعد ہمیشہ وہ حکام کے تحائف مسترد کرتے رہے۔ 150ھ میں انہوں نے کوفے کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔ اس دور کے اکثر فقہا سرکاری خدمات سے بوجوہ الگ رہنے کی

کوشش کرتے تھے۔ بوجہ تقویٰ ان کا خیال تھا کہ سرکاری منصب قبول کرنے کے بعد ان میں دنیاداری کے بعض برے اثرات پیدا ہو سکتے تھے۔ جن فقہائے کبار نے سلاطین وخلفا سے کنارہ کشی کی ان میں حضرت امام ابوحنیفہ اور حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ سرفہرست ہیں۔

بہرحال 150ھ میں وہ کوفے سے رخصت ہو گئے اور بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح منصب قضاۃ پر تقرر سے بچنے کے لیے وہ عراق کی حدود سے نکل گئے اور یمن جا کر قیام کیا اور وہاں ایک تاجر کی حیثیت سے آباد ہو گئے۔ لیکن یمن جانے کے باوجود وہ دربار بغداد کی جوابی سزاؤں سے محفوظ نہ رہ سکے۔ ان کو تلاش کر لیا گیا، مگر وہ مکہ مکرمہ چلے گئے۔ مکہ کے امیر محمد بن ابراہیم کو 158ھ میں خلیفہ نے حکم دیا کہ ان کی تلاش کی جائے۔ خلیفہ المنصور نے لکڑی کے کچھ سوداگروں کے ذریعے جو مکہ مکرمہ جا رہے تھے حکم دیا کہ حضرت سفیان ثوری کو سولی پر چڑھا دیں جو یقیناً کسی کاتب کی غلطی نہیں تھی بلکہ ایک اور معاملے کی طرف اشارہ تھا۔ تاہم امیر مکہ نے کچھ فراست سے کام لیتے ہوئے خلیفہ کے حکم کی تعمیل نہیں کی بلکہ ابن سعد کے مطابق ان کو خلیفہ کے حکم سے آگاہ کر دیا، اس لیے وہ جلد ہی روپوش ہو گئے۔ الطبری کے بیان کے مطابق وہ حضرت سفیان کو گرفتار کر کے قید کر چکا تھا، لیکن بعدازاں اس نے ان کو رہا کر دیا۔ اس تمام قصے کی تفصیلات مختلف رنگ آمیزیوں کے ساتھ اور مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہیں اس لیے یہ امر یقینی معلوم دیتا ہے کہ حضرت سفیان ثوری نے پیچھا کرنے والوں سے اغلب ہے کہ اپنی جان کعبہ شریف کے اندر جا کر چھڑوائی ہوگی۔ آخر مکہ مکرمہ میں ان کا رہنا دشوار ہو گیا اور وہ یحییٰ بن سعید کے پاس بصرہ چلے گئے، جہاں بڑے بڑے فقہا ان سے درس حدیث لیا کرتے تھے۔ بصرہ میں جان بچانے کے لیے انہیں جگہ بدلنا پڑی۔ حماد بن زید نے انہیں دربار خلافت سے مصالحت کا مشورہ دیا جس کے نتیجے میں انہوں نے دربار خلافت سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع کر دیا جس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا، لیکن بغداد واپس جانے کے لیے روانہ ہوئے ہی تھے کہ بیمار پڑ گئے اور یہ بیماری ان کا مرض وفات ثابت ہوئی۔ شعبان 161ھ/مئی 778ء میں وفات پا گئے۔ ان کی عمر بوقت وفات 64 سال تھی۔ اپنی وفات تک وہ دنیوی حکومت سے بچنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ ان کا بیٹا جس سے انہیں محبت تھی وہ انہیں زندگی ہی میں داغ مفارقت دے گیا تھا۔ انہوں نے اپنی جائیداد کا مالک اپنی ہمشیرہ اور بھانجے کو قرار دے دیا تھا۔ بہت سے جغرافیہ دانوں نے ان کی قبر کا بصرہ میں ذکر کیا ہے، 150ھ کے بعد انہیں اپنے مولد کوفہ کو دیکھنے کا کبھی موقع نہیں مل سکا۔

بہت سے راوی حضرت سفیان ثوری کے تبحر علمی اور ثقاہت کا اعتراف کرتے ہیں۔ ان کی زندگی پر نہایت پر معنی تبصرہ وہ ہے جو الذھبی نے اپنی تصنیف "میزان الاعتدال" میں کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بہترین اوصاف کے حامل تسلیم کیے گئے ہیں۔ بعض اوقات ان کا مقام حضرت مالک بن انس سے بھی بلندتر قرار دیا گیا ہے۔ وہ ان لوگوں میں شمار ہوئے ہیں جو سب سے پہلے ان تمام روایات کو جو ان کے حافظے میں محفوظ تھیں ضبط تحریر میں لائے۔

بحیثیت فقہ وہ ایک مستقل مسلک کے بانی تھے مگر یہ بعد میں ختم ہو گیا۔ یہ امر ہے کہ وہ اہل سنت والجماعت سے تھے اور اس قرار ایمانی سے بخوبی ثابت ہے جو انہوں نے شعیب بن جریر کو لکھوایا تھا۔ اس میں وہ قرآن مجید کے غیر مخلوق ہونے کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ایمان مشتمل ہے، قول عمل اور نیت پر۔ ایمان بڑھ سکتا ہے گھٹ نہیں سکتا۔ حضرت سفیان ثوری کے ارباب طریقت میں سے ہونے میں بھی کچھ کلام نہیں۔ ان کے صوفی ہونے کی شہادت یہ ہے کہ خود اصفیاء ان کو مشائخ کبار میں سے سمجھتے تھے۔ شیخ فریدالدین عطار نے اپنی تصنیف تذکرۃ الاولیا میں ایک طویل مقالہ ان کی شخصیت پر لکھا ہے۔ مگر اس مضمون میں مناقب پر زور دیا گیا ہے ان کے اصل کارناموں پر روشنی نہیں ڈالی گئی۔ حضرت ابوسفیان ثوری حضرت امام ابوحنیفہ کے ہم عصر تھے اور دونوں میں اختلاف رائے بھی پایا جاتا تھا۔

آئمہ کرام اور فقہا

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ (699ء-767ء)
حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ (767ء-820ء)
امام ابوالحسن الاشعری رحمۃ اللہ علیہ (874ء-931ء)
امام الطحاوی رحمۃ اللہ علیہ (859ء-933ء)
امام یحییٰ بن یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ اندلسی
امام شمس الائمہ السرخسی (1009ء-1090ء)
امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ (1058ء-1111ء)
امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ (1149ء-1209ء)
امام ابن تیمیہ (1263ء-1328ء)
امام سراج الدین شبلی رحمۃ اللہ علیہ (1314ء-1371ء)
امام محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ (1703ء-1792ء)
مولانا محمد قاسم نانوتوی (1842ء-1880ء)
امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ (1856ء-1921ء)
مولانا اشرف علی تھانوی (1863ء-1943ء)
حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ (711ء-795ء)
حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ (780ء-855ء)
امام الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ (750ء-804ء)
امام المزنی رحمۃ اللہ علیہ (791ء-878ء)
امام الماتریدی رحمۃ اللہ علیہ
امام راغب الاصفہانی
ابن الجوزی حنبلی رحمۃ اللہ علیہ (1116ء-1200ء)
امام النووی رحمۃ اللہ علیہ (1233ء-1277ء)
امام ابن قیم جوزیہ (1291ء-1350ء)
امام سخاوی (1428ء-1497ء)
حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (1703ء-1762ء)
مولانا رشید احمد گنگوہی (1829ء-1905ء)
مولانا عبدالحئی رحمۃ اللہ علیہ (1869ء-1923ء)
غزالی زماں حضرت مولانا احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ (1913ء-1986ء)

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ (699ء-767ء)

امام اعظم، امت مسلمہ کے بہت بڑے عالم دین، ماہر الکلام اور امام فقہ حنفی

نام ونسب: حضرت امام اعظم، النعمان بن ثابت، ابوحنیفہ بانی وامام فقہ حنفی۔ شجرہ نسب، النعمان بن ثابت بن زوطا ابن مرزبان۔ 80ھ/699ء میں پیدا اور 150ھ/767ء میں بحالت اسیری بغداد میں وفات پائی اور وہیں ملکہ خیزران کے مقبرے کے مشرقی جانب ان کا مزار ہے۔

ان کی کنیت ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہے جو حقیقی نہیں، بلکہ وصفی معنی کے اعتبار سے ہے، یعنی ''ابوالملتہ الحنیفیہ''۔ وہ کوفے میں ایک قسم کا ریشمی کپڑا (خز) بناتے اور اس کی تجارت کرتے تھے۔ کوفہ میں دار بن حریث میں جو جامع کوفہ کے قرب میں واقع تھا، ان کی دوکان اور کارخانہ تھا۔ یہ بات یقینی ہے کہ وہ امام حماد (م۔120ھ) کے درسوں میں شریک ہوتے تھے۔ بعد کے سوانح نگاروں نے ان کے اساتذہ کے ضمن میں مستند محدثین کی جو طویل فہرست دی ہے انہیں تسلیم کرنے میں بہت سے محققین کو تامل رہا ہے۔ الذھبی اور ابوالمحاسن نے ان کے اساتذہ کے سینکڑوں نام گنوائے ہیں۔ طبقات ابن سعد میں انہیں تابعین کے طبقہ پنجم میں شامل کیا ہے۔ اس سے وہ تابعین ہی میں سے تھے۔ انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ بن مالک کی زیارت کی تھی اور عبداللہ بن ابی اوفی، سہل بن سعد اور ابو طفیل عامر بن واثلۃ کا زمانہ پایا۔ امام حماد کی وفات کے بعد وہ کوفہ میں فقہ اسلام پر سب سے ممتاز سند اور کوفی مکتب فقہ کے سب سے بڑے نمائندہ قرار پائے۔ خلیفہ وقت المنصور عباسی انہیں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ اس کام کے لیے کسی طرح بھی آپ رحمۃ اللہ علیہ کو آمادہ نہ کر سکا جس پر 146ھ میں انہیں بغداد کے اذیت ناک قید خانے میں انہیں قید کر دیا گیا۔

ممکن ہے انہیں قید کیے جانے کے کوئی سیاسی محرکات بھی ہوں اور عباسی حکومت ان کے سیاسی خیالات میں خائف ہو جو وہ اہل بیت، نفس الذکیہ اور ابراہیم کے متعلق رکھتے تھے۔ محققین نے لکھا ہے کہ نامہ دانشوراں میں امام اعظم کا ابراہیم کے نام جو خط نقل کیا گیا ہے وہ معتبر کتابوں میں نہیں ملتا۔ امام اعظم کے علم کی طرح ان کی ذہانت نے عظیم الشان ذخیرہ علم پر تصرف کر کے آپ رحمۃ اللہ علیہ کو بانیان علوم کی صف میں جگہ دے دی۔ امام ابن مبارک کے الفاظ میں آثار اور فقہ فی الحدیث کے لیے ایک ''مقیاس'' صحیح پیدا کرنا وہ لازوال علمی کارنامہ ہے۔ جو ہمیشہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے منسوب رہے گا۔ اسی مقیاس اور اس رائے نے فقہ کے متعدد ابواب مرتب کروائے۔ کتاب میں لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جس قدر مسائل مدون کیے ان کی تعداد بارہ لاکھ نوے ہزار سے زاید ہے۔ امام اعظم نے جس طریق پر علم فقہ کی تدوین کا عزم کیا تھا وہ نہایت وسیع اور دشوار کام تھا، اس لیے انہوں نے اتنے بڑے اور اہم کام کو محض اپنی ذاتی رائے اور معلومات تک محدود کرنا نہیں چاہا۔ اس غرض سے انہوں نے اپنے شاگردوں میں سے چالیس نامور اشخاص کا انتخاب کیا اور ان کی باقاعدہ ایک مجلس تشکیل دی۔ الطحاوی نے ان میں سے تیرہ کے نام دیے ہیں۔ ان میں امام ابو یوسف، امام زفر رحمۃ اللہ علیہ، جیسی نمایاں شخصیات شامل تھیں۔ اس طرح گویا فقہ کا گویا ایک ادارہ علمی تشکیل پا گیا۔ جس نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی سرکردگی میں 30 برس تک کام کیا۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ہی میں اس مجلس کے فتاویٰ نے حسن قبولیت حاصل کر لیا تھا۔ جیسے جیسے یہ فتاویٰ تیار ہوتے جاتے ساتھ ہی ساتھ ممالک میں پھیلتے جاتے تھے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اصول تحقیق خود ہی تحریر فرمائے۔ آپ فرماتے ہیں ''میں کتاب اللہ سے اخذ کرتا ہوں۔ اگر وہاں کوئی مسئلہ نہیں ملتا تو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لیتا ہوں اور جب وہاں بھی نہ ملے تو صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی کا قول مان لیتا ہوں اور جب معاملہ، ابراہیم، شعبی ابن سیرین اور عطا پر آ جائے تو یہ لوگ مجتہد تھے تب میں انہیں لوگوں کی طرح اجتہاد کرتا ہوں۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ عنہ کا دور ابتلا: عہد بنو امیہ میں مروان بن محمد اموی کے گورنر عراق، یزید بن عمرو بن ھبیرۃ الفرازی نے ان کو قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش اور ان کے انکار پر ان کو ہر طرح سے قاضی بننے پر مجبور کیا مگر امام صاحب مسلسل انکار کرتے رہے۔ اس پر اس ظالم نے حکم دیا کہ سو کوڑے دس کے حساب سے آپ رحمۃ اللہ علیہ کو لگائے جائیں، یہ انتہائی ظالمانہ سزا انہوں نے انتہائی صبر کے ساتھ برداشت کر لی مگر ظالم حکومت کی طرف سے پیش کیا گیا عہدہ قضا منظور نہیں کیا۔

عباسی عہد میں:

جب عباسی عہد میں اہل بیعت اطہار سے حضرت محمد نفس زکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم نے عباسی حکومت کے خلاف خروج کیا تو حضرت امام مالک کی طرح حضرت امام ابوحنیفہ نے عباسیوں کی بے اعتدالیوں کی وجہ سے ابراہیم کی تائید کی۔جیسا کہ پہلے ذکر آیا کہ نامہ دانشوراں میں حضرت امام ابوحنیفہ کا خط اسی ابراہیم بن عبداللہ کے نام ہے۔امام ابوحنیفہ خود تو اس جنگ میں شریک نہ ہوئے تاہم انہوں نے مکمل طور پر ابراہیم کا ساتھ دیا۔خلیفہ المنصور نے جب ان لڑکوں کو بغداد طلب کیا جنہوں نے ابراہیم کا ساتھ دیا تھا تو ان میں حضرت امام ابوحنیفہ بھی شامل تھے۔جب کچھ سوالات پوچھنے کے بعد خلیفہ المنصور نے ان کے لیے قضاۃ کا عہدہ تجویز کیا امام صاحب نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ میں اس عہد کی قابلیت نہیں رکھتا۔ منصور نے غصہ میں آ کر کہا ''تم جھوٹے ہو''۔امام صاحب نے کہا کہ آپ نے میرا کام آساں کر دیا اگر میں جھوٹا ہوں تو پھر میرا یہ دعویٰ ضرور سچا ہے کہ میں اس عہدے کی قابلیت نہیں رکھتا، کیونکہ کوئی جھوٹا شخص قاضی مقرر نہیں ہوسکتا۔اس پر المنصور کے حاجب الربیع نے خلیفہ سے کہا کہ ابوحنیفہ تو آپ کے جد بزرگوار حضرت عبداللہ بن عباس رحمۃ اللہ علیہ کا مخالف ہے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ حلف علی الیمین کا استثنا ایک دو روز کے لیے جائز ہے اور ابوحنیفہ کہتا ہے کہ نہیں استثنا ہو تو یمین کے ساتھ ہو۔تاخیر کے بعد استثنا نہیں ہوسکتا۔منصور نے ان کی طرف دیکھا۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ربیع کہتا ہے کہ اہل عساکر جو اقرار بیعت خلیفہ کے سامنے کرتے ہیں اس کی پابندی جائز نہیں بلکہ ان پر واجب نہیں، منصور نے پوچھا کیونکر، کہا اس لیے کہ حضور کے سامنے حلف کر لیا اور گھر پہنچ کر انشاءاللہ کہہ دیا، اس پر منصور ہنس پڑا اور ربیع سے کہا کہ ابوحنیفہ سے علمی چھیڑ چھاڑ نہ کرو۔ربیع جب دربار سے باہر نکلا تو اس نے کہا ابوحنیفہ آج تو تم نے مجھے قتل ہی کروا دیا تھا، امام صاحب نے کہا نہیں یہ ارادہ تو تمہارا تھا، میں نے اپنی جان بچائی اور تم کو بھی بچایا۔

ایسا ہی واقعہ ابوالعباس طوسی کے ساتھ پیش آیا وہ امام صاحب کا مخالف تھا۔اس نے منصور کے سامنے پوچھا اے ابوحنیفہ! امیر المومنین ایک شخص کے قتل کا حکم دیتے ہیں جس کا بظاہر کوئی قصور نہ ہو۔تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے؟ امام صاحب نے کہا کہ امیر المومنین کا حکم مبنی برحق ہوتا ہے یا مبنی باطل؟ طوسی کو کہنا پڑا کہ مبنی برحق۔امام نے کہا پھر نفاد حق کے متعلق سوال پوچھنے کی تم کو ضرورت کیوں پڑی؟

خطیب ابن بغدادی کی روایت ہے کہ منصور نے جب زیادہ جبر کیا تو امام صاحب مجبوراً دارالقضا میں جا کر بیٹھ گئے۔ایک مقدمہ پیش ہوا جس میں قرضہ کا دعویٰ کیا گیا تھا۔لیکن ثبوت کے گواہان نہیں تھے۔مدعا علیہ کو سرے سے انکار تھا۔ امام صاحب نے حسب قاعدہ مدعا علیہ سے کہا کہ تم قسم کھاؤ کہ مدعی کا تم پر کچھ لینا دینا واجب نہیں وہ تیار ہو گیا۔''واللہ'' کا لفظ کہا تھا کہ امام صاحب نے گھبرا کر روک دیا اور آستین سے کچھ روپے نکال کر مدعی کے حوالے کر دیئے اور کہا کہ تم اپنا قرض لو ایک مسلمان سے قسم کیوں کھلواتے ہو۔عدالت سے آ کر خلیفہ سے کہہ دیا کہ مجھ سے کسی طرح یہ کام نہیں ہو سکے گا۔اس پر خلیفہ نے انہیں قید کرنے کا حکم جاری کر دیا، اس قید سے حضرت امام ابوحنیفہ اس وقت چھوٹے جب قید حیات سے چھوٹ گئے۔اس دوران اکثر منصور انہیں اپنے دربار میں بلوا کر ان سے علمی مباحثے کیا کرتا تھا۔

وفات: المنصور نے امام صاحب کو 146ھ میں قید کیا تھا لیکن اس حالت میں بھی اس کو اطمینان نہیں تھا اور جو اندیشہ اسے امام صاحب سے لاحق تھا وہ قید کی حالت بھی باقی رہا۔جس سے بچنے کی آخری تدبیر مورخین کے نزدیک اس نے یہ کی کہ بے خبری میں ان کو زہر دلوا دیا۔جب امام صاحب کو زہر کا اثر محسوس ہوا تو سجدہ کیا اور اسی حالت وفات پائی۔

ان کے وصال کی خبر بغداد میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور سارا بغداد امنڈ آیا۔ قاضی شہر نے ان کو غسل دیا۔ اور پہلی بار جو نماز جنازہ ادا کی گئی اس میں تقریباً پچاس ہزار افراد نے شرکت کی، چھ بار ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور عصر کے وقت ان کو دفن کر دیا گیا۔ ان کے مزار پر سلطان الپ ارسلان نے 459ھ میں مقبرہ تعمیر کروایا تھا۔

امام مالک بن انس الاصبحی (711ء-795ء)

مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے محدث، عالم اور فقیہ

نام ونسب: حضرت مالک رحمۃ اللہ علیہ بن انس بن مالک بن ابی عامر بن عمرو بن الحارث بن عثمان بن جثیل بن عمرو بن حارث۔ ان کے لیے آخری جدامجد ذوالاصبح کے لقب سے مشہور تھے۔ اور امام مالک کی نسبت الاصبحی اسی نسبت سے ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ العافیہ بنت شریک بن عبدالرحمٰن بن شریک الازدیہ تھیں۔

حضرت امام مالک کے پردادا ابی عامر نے اسلام قبول کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف حاصل کیا تھا۔

ولادت: امام مالک کی ولادت کی صحیح تاریخ معلوم نہیں ہو سکی، مشہور قول کے مطابق وہ 93ھ/711ء میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم وتربیت کے بعد وہ پہلے بزازی کے پیشے میں اپنے بھائی کے معاون بنے۔ اس زمانے میں انہیں موسیقی سے شغف اور پرندے پالنے کا شوق تھا۔ پھر اپنی والدہ کی ترغیب وتربیت سے وہ تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے ایک مکتب میں علقمہ بن ابی علقمہ سے نحو اور عروض کی تعلیم حاصل کی۔ دینی علوم میں انہوں نے علم فقہ کا انتخاب کیا کیونکہ یہ علم اس زمانے میں دیگر علوم سے زیادہ نفع بخش تھا۔

علم الحدیث: گھر میں امام کے دادا اور چچا اور والد خود محدث تھے۔ امام صاحب نے طلب حدیث کی تو اپنے گھر کو ان علوم کا مرجع پایا۔ امام صاحب کے دادا جو ثقہ راویوں میں سے ایک تھے امام صاحب کے ہوش سنبھالنے تک زندہ تھے۔ ابوسہل نافع امام کے ایک چچا روایت وحدیث کے شیخ تھے۔ نافع کے علاوہ امام صاحب نے مدینہ منورہ کے دیگر شیوخ کبار سے بھی علم حدیث میں اکتساب کیا۔ ان میں ممتاز نام یہ ہیں، محمد بن شہاب الزہری، حضرت امام جعفر صادق محمد بن حکدر، محمد بن یحییٰ الانصاری، ابوحازم یحییٰ بن سعید۔

علم فقہ: امام مالک نے علم فقہ کی ابتدائی تعلیم گو اپنے چچا نافع اور دیگر شیوخ سے پائی، لیکن اس کی تحصیل ابوعثمان ربیعہ الرائی سے خاص طور پر کی تھی۔ ربیعہ الرائی خاص مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں درس دیتے تھے۔ امام مالک، حضرت حسن بصری، شعبہ اوزاعی، لیث مصری، یحییٰ انصاری جیسے علمائے فاضل ان کے حلقہ درس میں شامل ہوتے تھے۔

امام ربیعہ رائی مسائل واجتہادات لوگوں میں نہایت مقبول تھے اور پسند کیے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ امام مالک اپنے درس میں ان کے اجتہادات بیان کر رہے تھے کہ لوگوں کو اتنی دلچسپی پیدا ہوئی کہ انہیں مزید اجتہادات بیان کرنے کی فرمائش کی گئی۔

حلقہ درس: امام مالک نے تعلیم کا زمانہ ختم کر کے درس وتدریس کی سند بچھائی۔ اس وقت ان کی عمر ایک روایت کے مطابق پندرہ سال تھی۔

تعظیم حدیث: امام معن بن عیسیٰ سے روایت ہے کہ امام مالک روایت حدیث کے لیے نشست فرمانے کا ارادہ کرتے تو سب سے پہلے غسل کرتے اور جسم ولباس کو عطر لگاتے اور اگر ان کی مجلس میں روایت حدیث کے دوران کوئی بول

اٹھتا تو یہ آیت تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ یایھا الذین آمنو لاترفعو اصوات کم فوق صوت النبی۔ ''اے ایمان والو! اپنی آواز کو نبی کی آواز سے بلند نہ کرو۔ امام مالک فرمایا کرتے تھے کہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت کے وقت بولنا گویا خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بولنے کے مترادف ہے۔

ایک مرتبہ آپ رحمۃ اللہ علیہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں درس حدیث دے رہے تھے کہ ایک پہاڑی بچھو کسی طرح آپ رحمۃ اللہ علیہ کی کمر پر چڑھ آیا اور روایت حدیث کے دوران اس نے آپ رحمۃ اللہ علیہ کی کمر پر ڈنک مارا۔ مگر احترام حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ نے اف تک نہ کی یہاں تک کہ اس بچھو کے کئی بار ڈنک مارنے سے آپ بے ہوش ہوگئے مگر احادیث مبارکہ کی روایت کے دوران آپ نے آہ تک نہ بھری۔

دور ابتلاء: طلاق مکروہ کے بارے میں امام مالک کا فتوہ حاکم مدینہ کی مرضی کے خلاف تھا۔ اس کے علاوہ امام صاحب نے عباسی حکومت کے خلاف حضرت نفس زکیہ کے خروج کی حمایت کی تھی اور ان کی خلافت کے حق میں فتویٰ دیا تھا۔ حضرت نفس زکیہ کی شہادت کے بعد جعفر نے مدینہ پہنچ کر نئے سرے سے خلافت عباسیہ کی بیعت لی اور امام مالک کو کہلا بھیجا کہ وہ آئندہ طلاق جبری (مکروہ) کے عدم اعبار کا فتویٰ نہ دیں کہ لوگوں کو بیعت جبری کی بے اعتبار و عدم صحت کے لیے سند ہاتھ آجائے گی۔ امام صاحب سے ترک حق کی خواہش بالکل نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس لیے امام صاحب نے بدستور معاملہ جبری کے عدم صحت کا فتویٰ جاری رکھا۔ گورنر مدینہ نے غضبناک ہوکر حکم دیا کہ اس کو 70 کوڑے مارے جائیں، امام صاحب کو محکمہ امارت میں گنہ گاروں اور مجرموں کی طرح لایا گیا۔ ان کے کپڑے اتارے گئے اور شانہ امامت پر دست ظلم سے 70 تازیانے رسید کیے گئے یہاں تک کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کی تمام پیٹھ خون سے آلودہ ہوگئی۔ اس پر بھی تسلی نہ ہوئی تو حکم دیا گیا کہ امام صاحب کو اونٹ پر بٹھا کر پورے شہر میں ان کی تشہیر کی جائے۔ امام صاحب کو اسی حال میں مدینہ منورہ کے بازاروں اور گلی کوچوں میں گھمایا گیا۔ آپ کی زبان صداقت سے جو الفاظ نکلے وہ یہ تھے۔ ''جو مجھ کو جانتا ہے، وہ جانتا ہے اور جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں امام مالک بن انس ہوں اور فتویٰ دیتا ہوں کہ طلاق جبری درست نہیں ہے۔'' اس کے بعد خون آلود کپڑوں میں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تشریف لائے اور پشت مبارک سے خون صاف کیا اور دو رکعت نماز ادا کی۔ یہ تعزیر گو حقیر تھی مگر اس نے امام صاحب کے عزت و وقار کو اور بلند کر دیا۔ (147ھ)

امام صاحب کو سزا دینے کی یہ نازیبا حرکت جو گورنر مدینہ جعفر نے کی تھی خلیفہ المنصور کو پسند نہیں آئی اور اس کو معزول کر کے اور گدھے پر بٹھا کر بغداد طلب کیا اور امام صاحب کو معذرت کا خط ارسال کیا۔

پھر اگلے سال جب منصور حج پر آیا تو اس نے امام صاحب سے ملاقات کی اور امام صاحب کو یقین دلایا کہ نہ میں نے تعزیر کی اجازت دی تھی اور نہ مجھے اس کا علم بھی ہوسکا تھا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ ''ہاں آپ کو اطلاع نہ ہوگی۔''

الموطاء: امام صاحب نے علم حدیث پر پہلی باوثوق کتاب ''الموطا'' لکھی تھی۔ یہ کتاب آپ نے خلیفہ المنصور کے فرمان کے تحت لکھنا شروع کی تھی اور اسی خلیفہ کے عہد خلافت کے آخر تک اس کتاب کی تکمیل سے فارغ ہوگئے تھے۔ ہارون الرشید عباسی نے امام صاحب کو کتاب الموطاء املا کرانے کے لیے بغداد طلب کیا تھا۔ اگرچہ امام صاحب نے انکار کیا مگر پھر بھی بغداد گئے اور ہارون الرشید نے آپ کے اعزاز میں ایک مجلس علمی منعقد کروائی۔ امام صاحب نے بعمر 81 برس 179ھ/795ء میں ضعیف العمری اور بیماری میں انتقال کیا۔ آپ کے جنازے میں خلقت کا ایک ہجوم تھا اور والی مدینہ عبداللہ بن محمد ہاشمی نے خود پاپیادہ جنازے میں شرکت کی۔ آپ کو جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔

اہل علم کی توقیر: خلیفہ ہارون الرشید آپ کی مجلس درس میں آیا تو اسے اپنی مسند خلافت سے نیچے اتر کر بیٹھنا پڑا

لیکن ایک مرتبہ ہم عصر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ آپ کی مجلس میں تشریف لائے تو آپ نے اس قدر تعظیم کی کہ ان کے لیے اپنی چادر فرش پر بچھائی، وہ اٹھ کر گئے تو اپنے طلبہ کو بتایا کہ یہ عراق کے ابوحنیفہ ہیں، اس ستون کو سونا ثابت کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد ایک مرتبہ کوفہ کے محدث سفیان ثوری آئے تو ان کی بھی پوری طرح تعظیم کی، لیکن امام ابوحنیفہ سے کم۔ ان کے چلے جانے کے بعد فرمایا کہ لوگوں کی علمی قدر و مراتب عزت کرنا چاہیے۔

عبدالرحمٰن بن قاسم آپ کے شاگرد تھے، لیکن جب خط لکھتے تو فقیہ مصر لکھا کرتے تھے، ایک بار ایک محدث، آپ کے نامور شاگرد مدینہ آ رہے تھے، امام صاحب نے اپنے تلامذہ کو لے کر خود بہ نفس نفیس ان کے استقبال کے لیے شہر سے باہر نکل آئے۔

امام صاحب کی تصنیفات: موطا، رسالہ مالک الی رشید، احکام القرآن، رسالہ مالک ابی بن مطرف، رسالہ مالک ابی بن وہب وغیرہ۔ کتاب موطاء اور آپ کی دیگر تصانیف میں امتیاز یہ ہے کہ موطا کی روایت امام کے تمام تلامذہ نے کی ہے اور بقیہ رسائل و کتب صرف بعض تلامذہ کی روایت سے ثابت ہیں۔

امام مالک کی تصنیف کتاب الموطاء کے بارے میں محققین کی رائے ہے ''اصح الکتب بعد کتاب اللہ۔''

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ (767ء-820ء)

اہل سنت والجماعت کے آئمہ اربعہ میں سے ایک، فقہی مسلک شوافع کے بانی اور محدث

نام و نسب: نام محمد، کنیت ابوعبداللہ، لقب ناصر الحدیث، شافعی اور ان کے جداعلیٰ شافع کی جانب نسبت ہے۔

سلسلہ نسب یہ ہے، محمد بن ادریس بن عباس بن عثمان بن شافعی۔ ساتویں پشت میں جا کر آپ کا سلسلہ نسب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ نسبی اعتبار سے اس سے زیادہ شرافت بھلا کیا ہو سکتی ہے۔ مورخین نے آپ رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ کا نام ہاشمیہ دیا ہے وہ قبیلہ ازد سے تعلق رکھتی تھیں۔ جبکہ والد کی طرف سے آپ قریشی ہاشمی و مطلبی تھے۔

ولادت: آپ بمقام غزہ رجب 150ھ/ 767ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا سایہ آپ کے سر پر سے پیدائش سے پہلے ہی اٹھ چکا تھا۔ پیدائش کے بعد ان کی والدہ انہیں عسقلان آپ نے اپنے عہد طفولیت کے آٹھ سال اپنے ماموں کے ہاں قبیلہ ازد میں اور نواح یمن میں گزارے۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ لڑکپن میں انہیں زیارت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ اے لڑکے تو کس خاندان کا ہے؟ امام شافعی کہتے ہیں میں نے عرض کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے قریب آؤ، جب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا لعاب دہن میرے منہ میں ڈال دیا۔ پھر فرمایا جاؤ خدا تم پر برکت نازل فرمائے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ تقریباً اسی عمر میں میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت اللہ میں نماز پڑھتے دیکھا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو لوگوں کو تعلیم دے رہے تھے کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے بھی کچھ سکھایئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آستین سے ایک ترازو نکال کر مجھے مرحمت فرمائی اور فرمایا کہ تمہارے لیے یہ ہمارا عطیہ ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جب میں نے کسی عالم سے اس خواب کی تعبیر دریافت کی تو اس نے کہا تم دنیا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مطہرہ کی نشر و اشاعت کرو گے اور امام بنو گے۔

تعلیم و تربیت: جب آپ کی عمر دس برس ہوئی تو والدہ نے مکہ مکرمہ بھجوا دیا جہاں رہ کر آپ رحمۃ اللہ علیہ کو علم الانساب کی تعلیم حاصلکرنا تھی۔ جب آپ ایک ماہر انساب کے پاس گئے تو مالی حالت کے کمزور ہونے کی وجہ سے اس نے انہیں مشورہ دیا کہ پہلے کوئی ذریعہ معاش پیدا کرو پھر علم سیکھنا۔ مگر میرا حال یہ تھا کہ دل تعلیم کی طرف مائل تھا۔ جب کسی عالم سے کوئی حدیث سنتا تو فوراً یاد کر لیتا یا ہڈیوں پر لکھ لیا کرتا پھر انہیں محفوظ کر دیتا۔ پھر آپ نے محمد بن شہاب زہری عمرو بن دینار اور مسلم بن خالد زنجی سے استفادہ کیا۔

کامل تین برس میں آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اچھے حافظے کی وجہ سے علم فقہ و حدیث پر دسترس حاصل کر لی۔ مجالس حدیث میں اکثر حضرت امام مالک کا ذکر ہوتا تھا اس لیے امام شافعی شوق علم میں ان کی خدمت میں مدینہ حاضر ہوئے۔ انہوں نے پہلے نام پوچھا اور پھر کہا "خدا سے ڈرتے رہنا عنقریب تمہاری شان بڑی نمایاں ہوگی۔

علوم ظاہری کی تکمیل: امام شافعی نے فق ادب ولغت، فن تاریخ، علم طب، علم ہیت اور نجوم کے علاوہ علم فراست بھی حاصل کیا۔ آپ سے مروی ہے کہ جب آپ علم فراست کی تکمیل کے بعد یمن سے واپس آرہے تھے تو اثنائے راہ میں ایک قصبہ میں رات ہوگئی اور آپ کو ایک شخص ملا جس علم فراست کی رو سے دنی الطبع وخفیف الحرکات ہونا چاہیے تھا مگر وہ انتہائی خوش اخلاق سے اور اس نے امام صاحب کی شب بسری کے لیے بھی بہت اچھا بندوبست کر دیا۔ اب امام صاحب نے سوچا کہ فراست کے اعتبار سے یہ شخص بالکل مختلف ہے۔ یا تو علم فراست سرے سے غلط ہے یا پھر ضرور یہ کوئی ایسی حرکت کرے گا جو شریفانہ نہ ہوگی۔ پھر صبح جب امام صاحب روانہ ہونے لگے تو انہوں نے اس شخص کا شکریہ ادا کیا اور اسے مکہ آنے کی دعوت دی مگر اس شخص نے اب تمام اخلاق کو بالائے طاق رکھ کر ان سے انہیں ٹھہرانے اور راحت مہیا کرنے کا معاوضہ طلب کر لیا اور علم فراست صحیح ثابت ہوا۔

امام شافعی کا دور ابتلا: تحصیل علم کے بعد مکہ میں امام شافعی نے عربی زبان وادب، فقہ وحدیث اور دیگر علوم میں بڑی شہرت اور نیک نامی پیدا کی۔ اتفاق سے انہیں دنوں حاکم یمن مکہ آیا، وہ امام کے تبحر علمی اور ادبی ذوق سے بہت متاثر ہوا اور اس نے امام شافعی کو یمن میں ایک سرکاری عہدہ پیش کر دیا۔ مگر مقامی رقابتوں اور محلاتی سازشوں کی وجہ سے امام شافعی اس عہدے پر زیادہ عرصہ تک فائز نہ رہ سکے۔ مخالفین نے ان پر الزام لگایا کہ وہ در پردہ زیدی مدعی خلافت یحییٰ بن عبداللہ کے حامی ہیں۔ اس الزام کی پاداش میں گرفتار کر کے رقہ لایا گیا اور خلیفہ ہارون الرشید کے سامنے پیش کیا گیا۔ خلیفہ نے امام شافعی کے دلائل و براہین سن کر انہیں بے قصور قرار دے کر رہا کر دیا۔ (803ء) خلیفہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے حسن بیان اور وسعت علم سے بڑا متاثر ہوا۔ وہاں امام محمد بن الحسن الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ (م 805ء) ایسے نامور حنفی فقیہ اور محدث سے ان کے گہرے مراسم ہوگئے جن کی کتابیں انہوں نے خود اپنے لیے نقل کی تھیں۔

واپسی: کچھ عرصہ عراق میں رہنے کے بعد 804ء میں حران اور شام ہوتے ہوئے واپس مکہ مکرمہ لوٹ گئے۔ مکہ میں ان کا اول اول خیر مقدم حضرت امام مالک کا شاگرد ہونے کی حیثیت سے کیا گیا۔ اور بیت اللہ شریف میں انہوں نے درس دینا شروع کر دیا۔ وہ اپنے درس میں فقہی جزئیات پیش کرتے ہوئے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک کے اختلافات کا ذکر کرتے تو طلبا بڑے متاثر ہوتے، البتہ بہت سے مالکی ان کی باتوں سے ان سے بدظن ہوگئے، جس کی وجہ سے 195ھ/810ء میں بغداد آ کر مقیم ہوگئے اور ایک حلقہ درس قائم کر لیا۔ اس وقت تک امام شافعی کے فقہی خیالات میں بڑی پختگی آ گئی تھی۔ قیام بغداد کے دوران انہوں نے مصر کے نئے والی عباس بن موسیٰ کے بیٹے عبداللہ سے وابستگی پیدا کر لی تھی۔ 28 شوال 198ھ/ 21 جون 814ء کو اس وابستگی کی بنا پر مصر چلے گئے مگر وہاں فسادات بپا ہونے کی وجہ سے انہیں مکہ لوٹنا

پڑا۔ 816ء میں ایک بار پھر مصر گئے اور وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہیں فسطاط میں انہوں نے بالآخر رجب 204ھ مطابق 20 جنوری 820ء کو وفات پائی اور المقطم کے دامن میں بنو عبد الحکم کے مسقف قبے میں مدفون ہوئے۔ ان کے مقبرے کے بالمقابل بعد ازاں سلطان صلاح الدین ایوبی نے ایک بہت بڑا اور وسیع مدرسہ بنایا تھا۔ امام شافعی کے مقبرے کا گنبد الملک الکامل نے 608ھ/ 1211ء میں تعمیر کروایا۔ یہ مصر کی بڑی مقبول زیارت گاہ ہے، امام شافعی نے فقہی اجتہاد اور حدیث دونوں کو اپنایا۔ انہوں نے نہ صرف اس فقہی مواد پر عبور حاصل کیا جو موجود تھا بلکہ اپنی کتاب الرسالۃ میں اصول وطریق استدلال فقہ کی تحقیق کی۔ انہیں محققین نے بجا طور پر اصول فقہ کا بانی تسلیم کیا ہے۔ انہوں نے قیاس کے باقاعدہ قواعد و ضوابط وضع کیے تھے۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ (780ء-855ء)

مذاہب اربعہ میں حنابلہ کے بانی، وہابیت کے مورث اعلیٰ اور تحریک سلفیہ کے محرک

نام ونسب: احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ امام بغداد، مشہور ومعروف عالم دین، فقیہ اور محدث (16ھ/ 780ء یا 241ھ/ 855ء)۔ آپ اسلام کی نہایت اولوالعزم شخصیات میں سے تھے اور اسلام کے تاریخی ارتقاء اور جدید احیا پر آپ کی تعلیمات کا گہرا اثر پڑا ہے۔ آپ اہل سنت کے چار مذاہب میں سے مذہب حنبلی کے بانی ہیں اور اپنے شاگرد حضرت امام ابن تیمیہ کے واسطے سے وہابیت کے مورث اعلیٰ قرار پاتے ہیں اور کسی حد تک سلفیہ کی قدامت پسند اصلاحی تحریک کے بھی محرک ہیں۔

امام احمد بن حنبل نسلاً عرب تھے اور قبیلہ ربیعہ کی ایک شاخ بنو شیبان سے آپ کا تعلق تھا۔ آپ کے دادا حنبل بن ہلال کے زمانے میں جو بنو امیہ کی طرف سے سرخس کے والی اور عباسیوں کے ابتدائی حامیوں میں تھے، یہ خاندان خراسان کے شہر مرو کلکچلا گیا تھا۔ پھر دسمبر 780ء میں امام صاحب کے والد محمد بن حنبل بغداد منتقل ہو گئے جس کے چند ماہ بعد امام صاحب پیدا ہوئے اور پیدائشی بغدادی تھے۔

تعلیم وتربیت: بغداد میں علم لغت، علم فقہ اور حدیث کی تعلیم پانے کے بعد انہوں نے 795ء میں خود کو علم حدیث کے مطالعے کے لیے وقف کر دیا اور اس سلسلے میں العراق، حجاز، یمن اور شام کے سفر کیے اور خراسان جیسے دور دراز علاقوں تک بھی طلب حدیث میں پہنچے۔ آپ نے حدیث اور فقہ کی تحصیل بہت سے اساتذہ سے کی جن میں بغداد کے قاضی امام ابو یوسف اور ھیثم بن بشیر شامل تھے۔ اس کے بعد آپ کے بڑے استاد سفیان بن عینیہ رہے جو دبستان حجاز کے سب سے بڑے مستند عالم تھے۔

فتنہ خلق قرآن: المامون نے اپنے عہد حکومت کے اواخر میں بشر المریسی کے زیر اثر سرکاری طور پر معتزلہ کی حمایت کرنے کی حکمت عملی اختیار کر لی، جس کے بعد امام احمد بن حنبل کے دور محنت ابتلا کا آغاز ہوا اور جس کی وجہ سے آپ کو آگے چل کر ایک بڑی شہرت حاصل ہونے والی تھی۔ امام احمد بن حنبل نے المعتزلہ کے عقیدہ خلق قرآن کو قبول کرنے سے سختی سے انکار کر دیا، جو کہ راسخ اسلامی عقیدے کے خلاف تھا۔ جب المامون کو جو اس وقت طرطوس میں مقیم تھا، اس کا علم ہوا تو اس نے حکم دیا کہ ابن حنبل کو اور معترض محمد بن نوح کو اس کے پاس بھیج دیا جائے۔ چنانچہ ان دونوں کو پابہ زنجیر کر کے روانہ کر دیا گیا، لیکن رقہ سے کوچ کرنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد انہیں خلیفہ المامون کے فوت ہونے کی خبر ملی، اس لیے دونوں کو واپس بغداد بھیج دیا گیا۔ اسی سفر کے دوران ابن نوح کا انتقال ہو گیا اور ابن حنبل کو بغداد واپس پہنچنے پر پہلے یاسریہ میں اور پھر دار عمارۃ میں قید کر دیا گیا۔ پھر وہاں سے آخر کار درب موصلی کے عام قید خانے میں منتقل کر دیا گیا۔

اگرچہ نئے خلیفہ المعتصم کی خواہش تھی کہ عقیدہ خلق قرآن نا ماننے والوں کا احتساب بند کر دیا جائے، لیکن کہتے ہیں کہ معتزلی قاضی احمد بن ابی داؤد نے اسے یہ مشورہ دیا کہ جو موقف سرکاری طور پر اختیار کیا جا چکا ہے اسے ترک کر دینا حکومت کے لیے باعث خطرہ ہے: چنانچہ امام احمد بن حنبل کو خلیفہ کے حضور میں پیش ہونے کا حکم دیا گیا (رمضان 219ھ) اب بھی آپ رحمۃ اللہ علیہ نے خلق قرآن کے عقیدے کو قبول کرنے سے قطعی طور پر انکار کر دیا۔ اس پر آپ رحمۃ اللہ علیہ کو اخلاقی مجرموں کی طرح بری طرح زدوکوب کیا گیا، تاہم دو سال قید رکھنے کے بعد آپ کو گھر جانے کی اجازت دے دی گئی۔

اس کے بعد آپ رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ المعتصم کے باقی عہد میں گوشہ نشین رہے اور حدیث شریف کا درس دینے سے احتراز کیا۔ خلیفہ الواثق باللہ کے تخت نشین ہونے کے بعد یعنی 842ء میں آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ جاری کرنے کی دوبارہ کوشش کی لیکن پھر جلد ہی اسے موقوف کرنا بہتر خیال کیا۔ گو حکومت کی جانب سے کوئی حکم امتناعی جاری نہیں ہوا تھا، لیکن خطرہ یہ تھا کہ کہیں معتزلی قاضی پھر آپ کے خلاف کاروائی شروع نہ کر دے۔ لہٰذا آپ کی خلوت نشینی جاری رہی اور بعض اوقات اپنے دشمنوں سے بچنے کے لیے آپ کو روپوش بھی ہونا پڑا۔

سنی مذہب کی بحالی: خلیفہ المتوکل کے 847ء میں تخت نشین ہونے کے بعد سُنی مذہب کو دوبارہ سرکاری مذہب کی حیثیت دی گئی تو امام صاحب نے اپنے درس و تدریس کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا۔ تاہم ان محدثین میں آپ کا نام نہیں ملتا جن کو خلیفہ نے فرقہ جہمیہ اور معتزلہ کی تردید کے لیے نامزد کیا تھا۔ جور و تشدد کے دور کی سربرآوردہ شخصیات اب تقریباً غائب ہو چکی تھیں۔ اس وجہ سے اب خلیفہ وقت اور امام احمد بن حنبل کے درمیان راہ و رسم کی سبیل نکل آئی۔ احمد بن ابی داؤد کو 852ء میں اس کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا اور بعض روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ احمد بن ابی داؤد کی جگہ ابن اکثم کے تقرر کی سفارش بھی آپ رحمۃ اللہ علیہ نے ہی کی تھی۔ 237ھ/852ء میں خلیفہ المتوکل نے آپ کو سامرا میں طلب کیا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ شاید خلیفہ کا منشا یہ تھا کہ آپ نوجوان شہزادے المعتز کو حدیث پڑھائیں اور یہ بھی امکان کہ شاید خلیفہ اس مشہور عالم دین سے منت کی بحالی کے سلسلے میں کام لینے کا خواہش مند تھا۔ سامرا کے اس سفر میں آپ کو دربار خلافت کے سربرآوردہ لوگوں سے بھی ملنے کا موقع ملا۔ جو بیانات محفوظ رہ گئے ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سامرا پہنچنے پر حاجب وصیف نے آپ کی بڑی آؤ بھگت کی اور ایتاخ کے پرتکلف محل میں ٹھہرایا۔ کثرت سے تحائف اور عطیات آپ کی خدمت میں پیش کیے اور شہزادہ المعتز سے ملاقات کرائی۔ مگر آپ کی اپنی درخواست پر آپ کی عمر اور صحت کے پیش نظر آپ کو کسی خاص ذمہ داری کے قبول کرنے سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔

انتقال: امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال جولائی 855ء میں کچھ مدت صاحب فراش رہنے کے بعد بغداد میں ہوا۔ آپ نے 75 سال عمر پائی اور شہیدوں کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔ آپ کے جنازے کی تفصیلات بھی افسانوی معلوم دیتی ہیں مگر آپ کے مقبرے پر جوش عقیدت کے ایسے مظاہرے ہوئے کہ مقامی حکام کو قبرستان کی حفاظت کے لیے پہرا لگانا پڑا۔ جب خلیفہ المعتصم کے دربار میں آپ کو کوڑے لگائے گئے تو ایک جلاد جب کوڑے لگا کر تھک جاتا تو دوسرا تازہ دم جلاد آ کر آپ کو پیٹنے لگتا تھا۔ تازیانے کی ہر ضرب سے جو صدا آپ کی زبان سے نکلتی تھی وہ القرآن کلام اللہ، غیر مخلوق تھی۔ خود معتصم باللہ جس کی ہیبت سے قیصر روم بھی لرزاں تھا۔ جلادوں کے زدوکوب کرنے کے دوران آپ کے قریب آ کر کہنے لگا۔ ''اے احمد! خدا کی قسم میں جس قدر اپنے بیٹے سے محبت رکھتا ہوں اس سے کہیں زیادہ تم سے محبت ہے۔ اگر تم خلق قرآن کا اقرار کر لو تو خدا کی قسم ابھی اپنے ہاتھوں سے آپ رحمۃ اللہ علیہ کی بیڑیاں کھول دوں۔'' لیکن پیکر حق و صداقت اور مجسم سنت راشدہ کی زبان صدق سے نکلتا تھا کہ اگر تم قرآن یا حدیث سے ثابت کر دو تو سر تسلیم خم کر لوں گا۔''

امام ابوالحسن الاشعری رحمۃ اللہ علیہ (874ء-931ء)

مشہور عالم دین اور اہل سنت کے علم کلام کے بانی اور الاشعریہ مکتب فکر کے موسس

نام ونسب: ابوالحسن علی بن اسمٰعیل، حضرت ابوموسیٰ الاشعری کی نویں پشت میں تھے اور کہا جاتا ہے کہ وہ 260ھ/873ء میں بصرے میں پیدا ہوئے۔ ایک روایت میں ان کا شجرہ نسب یوں بیان کیا گیا ہے علی بن اسمٰعیل بن اسحٰق بن سالم بن اسمٰعیل بن عبداللہ بن موسیٰ بن ابی بردہ۔

ان کی زندگی کے حالات بہت کم ملتے ہیں۔ وہ بصرے کے رئیس المعتزلہ الجبائی کے بہترین تلامذہ میں سے تھے اور اگر وہ معتزلہ کو چھوڑ کر قدیم طریقے والوں یعنی اہل سنت والجماعت میں شامل نہ ہو جاتے تو یقیناً اس کے جانشین ہوتے۔

تبدیلی: حضرت ابوالحسن الاشعری کی اس تبدیلی رائے یا انقلاب عقائد کی تاریخ 300ھ/912ء عیسوی بیان کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کا اعلان انہوں نے جامع مسجد بصرہ کے منبر پر کیا تھا۔ زندگی کے آخری دنوں میں انہوں نے بغداد میں سکونت اختیار کر لی تھی اور 936 عیسوی میں وہیں وفات پائی اور بغداد ہی میں مدفون ہوئے۔

زیارت النبی صلی اللہ علیہ وسلم: مشہور روایت ہے کہ حضرت ابوالحسن الاشعری، ایک رمضان المبارک میں خواب میں تین بار زیارت النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہوئے۔ خواب ہی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ صحیح سنت کی پیروی کریں۔ انہیں یقین ہو گیا کہ یہ خواب سچا ہے اور چونہ اہل سنت عقلی دلائل (علم الکلام) کو ناپسند کرتے تھے اس لیے انہوں نے بھی اسے (یعنی علم الکلام کو) چھوڑ دیا۔ تاہم جب انہیں تیسری بار زیارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہوئی تو انہیں حکم ملا کہ وہ صحیح سنت پر قائم رہیں اور علم الکلام کو نہ چھوڑیں۔ زندگی کے اسی موڑ سے الاشعری نے اپنے موقف کا نہایت مختصر مگر مکمل خاکہ تیار کر لیا اور معتزلہ کے اعتقادی نظریات کو خیر باد کہہ کر انہوں نے علمائے اہل سنت کا مذہب اختیار کر لیا۔ وہ اپنے آپ کو امام احمد بن حنبل کا پیروکار کہنے لگے اور ساتھ ہی اپنے ان نئے عقائد کا اسی قسم کے عقلی دلائل و براہین سے ثبوت بہم پہنچایا جن سے معتزلہ کام لیتے تھے۔

وہ بڑے بڑے مسائل جن میں انہوں نے معتزلہ کی مخالفت کی اور اہل سنت کا الگ تشخص قائم کیا وہ حسب ذیل ہیں۔

(1) انہوں نے رائے قائم کی کہ اللہ کی صفات مثلاً علم۔ بصر، کلام، ازلی و ابدی ہیں۔ اور انہیں کے ذریعے وہ عالم و علیم ہے، بصیر و متکلم ہے۔ اس کے برعکس معتزلہ کا اعتقاد یہ ہے کہ خدا کی صفات اس کی ذات سے جدا نہیں ہیں (یعنی اس کے لیے فقط ذات ہے صفات نہیں ہے)۔

(2) معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ قرآن مجید میں جو اللہ کے ہاتھ اور چہرے (وجہ) وغیرہ کا ذکر آیا ہے اس میں ان الفاظ سے مراد اس کا فضل اور اس کی ذات وغیرہ ہے۔ الاشعری اگرچہ اس امر سے متفق ہیں کہ ان الفاظ سے مراد کوئی جسمانی چیز نہیں ہے، تاہم یہ سب چیزیں اس کے لیے حقیقتاً ثابت ہیں، گو ہمیں ان کی اصلی اہمیت معلوم نہیں: وہ خدا کے "استوٰی علی العرش" (تخت پر بیٹھنے) کو بھی انہیں معنوں میں تسلیم کرتے ہیں۔

(3) معتزلہ کے اس عقیدے کے خلاف کہ قرآن مخلوق ہے الاشعری کا عقیدہ یہ ہے کہ "کلام" اللہ کی ازلی صفت ہے اور اس لیے قرآن غیر مخلوق ہے۔"

(4) معتزلہ کے اس عقیدے کے خلاف کہ خدا کو حقیقی معنی میں دیکھا نہیں جا سکتا کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ جسم رکھتا ہے، الاشعری یہ مانتے ہیں کہ اللہ کا دیدار آخرت میں یقیناً حاصل ہوگا مگر اس کی صورت اور کیفیت کیا ہوگی

اس سے ہم بالکل نا آشنا ہیں۔

(5) معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ انسان اپنے افعال میں اختیار کا مالک ہے۔ اس کے مقابلے میں الاشعری اس پر زور دیتے ہیں کہ ہر چیز اللہ کے ارادے اور اس کی قدرت کے تحت ہے۔ وہ انسان کے فعل کا خالق ہے، اس حیثیت کہ وہ اس کے اندر فعل کی قوت پیدا کرتا ہے۔ عقیدہ ''کسب'' کا (جو بعد سے الاشعری کی ایک خصوصی اہمیت قرار پایا) موجد خود الاشعری کو قرار دیا جاتا ہے، لیکن گو وہ اس نظریے سے واقف تھے تاہم خود ان کا یہ عقیدہ معلوم نہیں ہوتا۔

(6) معتزلہ اپنے اصول ''المنزلۃ بین المنزلتین'' کی بنا پر قائل ہیں کہ کبیرہ گنا کا مرتکب مسلمان نہ مومن رہتا ہے نہ کافر ہو جاتا ہے۔ الاشعری اس پر زور دیتے ہیں کہ وہ مومن تو رہتا ہے، لیکن اپنے جرم کی پاداش میں عذاب جہنم کا مستحق قرار پاتا ہے۔

(7) الاشعری آخرت کے مختلف احوال و کیفیات، مثلاً حوض کوثر، پل صراط، المیز ان، میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی حقیقت واصلیت کے قائل ہیں، لیکن معتزلہ یا تو اس کا انکار کرتے ہیں یا ان کی عقلی توجیہ کرتے ہیں۔

الاشعری وہ پہلے شخص نہیں تھے جنہوں نے قدیم اہل سنت کے عقائد کی تائید اور ان کے اثبات کے لیے علم کلام سے کام لیا۔ ان لوگوں میں جنہوں نے اس سے پہلے اس قسم کی کوشش کی الحارث بن اسد المحاسبی بھی تھے۔ الاشعری کو البتہ اس بات میں اولیت حاصل ہے کہ انہوں نے (طریقہ کلامیہ سے) اس طرز سے کام لیا جو جمہور اہل سنت کے قابل قبول تھی۔ انہیں یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ وہ معتزلہ کے عقائد و آراء سے بخوبی واقف تھے اور گہرا مطالعہ کر چکے تھے۔ جیسا کہ ان کی تصنیف ''مقالات اسلامین'' سے پتہ چلتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کسی یورپی طالب علم کو بادی النظر میں الاشعری کا طرز استدلال امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے متبعین (جو انتہا درجے کے قدامت پسند تھے) سے زیادہ مختلف معلوم نہیں دیتا، کیونکہ ان کے بہت سے دلائل قرآن و حدیث سے لیے گئے اور ان دونوں مقدس ماخذوں کی تعبیر ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ان کے مخالفین بشمول معتزلہ، خود اس قسم کے دلائل استعمال کرتے تھے اور الاشعری ہمیشہ مخالف کے طرز استدلال ہی سے کام لے کر اس کو لاجواب کر دیتے تھے، تاہم جب مخالفین کسی خالص عقلی مفروضے کو تسلیم کر لیتے تو الاشعری ان کی تردید میں اس مفروضے کو بھی بے دھڑک استعمال کرتے تھے۔ آخر کار جب عقلی دلائل کا جواز قبول کر لیا گیا تو الاشعری کے بہت سے متبعین کے لیے اس قسم کے طریق استدلال کو آگے بڑھانا آسان ہو گیا۔ تا آنکہ بعد کی صدیوں میں علم کلام بالکل معقولات ہی پر مبنی رہ گیا، حالانکہ یہ خیال الاشعری کی افتاد طبع سے بہت فاصلے پر تھا۔

300ھ تک اپنی تالیف شدہ کتابوں کی فہرست جن کی تعداد چونسٹھ تھی الاشعری نے اپنی ایک کتاب میں دی تھی، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک کثیر التعداد مصنف تھے۔ الاشعری نے اپنی عمر کے آخری بیس سال کے اندر اپنے گرد بہت سے تلامذہ اکٹھے کر لیے تھے اور اس طرح ایک دبستان فکر، معتزلہ سے علیحدہ قائم ہو گیا جو اہل سنت والجماعت کا مکتب فکر ہے۔

امام الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ (750ء-804ء)

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے وہ نامور شاگرد جو فقہ حنفی کے اولین مرتب ہیں

نام ونسب: ابوعبداللہ محمد بن الحسن بن فرقد، بنو شیبان کے ایک آزاد کردہ غلام (مولی)، نامور بزرگ، حنفی فقیہ جو 132ھ/750ء میں واسط میں پیدا ہوئے، انہوں نے کوفہ میں پرورش پائی اور چودہ سال کی عمر میں حضرت امام ابوحنیفہ سے

تعلیم حاصل کی۔ انہیں کے زیر اثر اپنے آپ کو علم فقہ کی تحصیل کے لیے وقف کر دیا، کہا جاتا ہے کہ صرف 20 سال کی عمر میں وہ جامع مسجد کوفہ میں خطبہ دیا کرتے تھے۔ انہوں نے علم الحدیث، حضرت سفیان ثوری، امام الاوزاعی اور امام مالک جیسے بلند پایہ عالموں سے حاصل کیا۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں تین سال تک مدینہ منورہ میں حاضر ہوتے رہے۔ فقہ میں ان کی تربیت زیادہ تر امام ابو یوسف کی مرہون ہے، لیکن وہ جلد ہی اپنے خطبات کی وجہ سے خود امام ابو یوسف کے اثر و اقتدار کے لیے خطرہ بن گئے، چنانچہ امام ابو یوسف نے انہیں ارباب حکومت سے مصر یا شام میں عہدہ قضاۃ دلوانا چاہا مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

مشیر خلیفہ: 793ء میں خلیفہ ہارون الرشید نے ان سے زیدی امام یحییٰ بن عبداللہ کے بارے میں مشورہ کرنا پسند کیا۔ اس موقع پر انہوں نے خلیفہ کی مرضی کے خلاف رائے دی۔ خلیفہ چاہتا تھا کہ امان دینے کے بعد نقض عہد کر کے یحییٰ کو سزا دینا کسی طور پر جائز نہیں۔ اس فتویٰ کی وجہ سے خلیفہ نے ناراض ہو کر انہیں عہدہ قضاۃ سے برطرف کر دیا اور آئندہ فتویٰ جاری کرنے سے بھی روک دیا۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ وہ مرجئی نظریات رکھتے تھے۔ تاہم انہوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ شیعہ سرگرمیوں سے الگ رکھا۔ 180ھ/ 796ء میں خلیفہ ہارون الرشید نے جب رقہ کو اپنا دارالحکومت بنایا تو انہیں الرقہ کا قاضی مقرر کر دیا۔ اسی سال وہ النبویہ کے مقام پر وفات پا گئے۔

امام الشیبانی اصحاب الرائے میں اعتدال پسند شخصیت تھے اور اپنی تعلیم کو حتی الامکان حدیث پر مبنی رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ ایک قابل نحوی بھی مانے جاتے ہیں۔ ان کے شاگردوں میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا نام بھی لیا جاتا ہے جنہوں نے اپنے استاد سے کئی مسائل میں اختلاف رائے کیا، حنفی مذہب کی نشر و اشاعت کا سہرا امام ابو یوسف اور امام الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ کے سر ہے۔ ان کی تصانیف جن پر بکثرت شرحیں لکھی گئیں، قدیم ترین مواد فراہم کرتی ہیں جس سے ہمیں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کے متعلق رائے قائم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اگرچہ بہت سے امور میں انہیں حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے اختلاف ہے۔ ان کی اہم تصانیف میں ''کتاب الاصل فی الفروع یا المبسوط: الجامع الکبیر، الجامع الصغیرش'' شامل ہیں۔

امام الشیبانی نے امام مالک کی موطاء کا ایک نسخہ مع ناقدانہ حواشی اور اضافوں کے ساتھ مرتب کیا تھا جو عام مروجہ نسخوں سے مختلف ہے۔

امام المزنی رحمۃ اللہ علیہ (791ء-878ء)

فقہ شافعی کے ترجمان اور امام شافعی کے شاگرد خاص اور ''المختصر'' کے مصنف

نام ونسب: ابو ابراہیم اسمٰعیل بن یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی کے خاص شاگردوں میں سے تھے اور فقہ شافعی کے سب سے خاص ترجمان اور علمبردار تسلیم کیے جاتے ہیں۔

ولادت: وہ (175ھ/ 791ء-792ء) میں پیدا ہوئے اور مصر میں زندگی بسر کی۔ ان کا ایک اور عظیم کارنامہ اپنے استاد (امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ) کے مکتوبات اور ملفوظات کا ایک مشہور ملخص المختصر کے نام سے مرتب کرنا ہے۔ تاہم وہ رائے میں آزاد تھے اور انہوں نے اپنے استاد سے بہت سے مسائل میں اختلاف ظاہر کیا ہے۔ مگر وہ بنیادی باتوں میں ان سے متفق تھے، جیسا کہ المختصر سے عیاں ہوتا ہے۔ (المختصر میں انہوں نے اپنے استاد کی بعض آرا کو صاف طور پر غلط قرار دیا ہے) بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ المزنی ایک خاص مذہب فقہ کے خود بھی بانی ہیں۔ (النووی) اس سلسلے میں محققین ابن سریج کی

ایک کتاب کا بھی حوالہ دیتے ہیں جو شافعی مذہب کے ایک امام تھے اس کتاب کا نام محققین نے "کتاب التقریب بین المزنی والشافعی"۔
امام المزنی کے شاگردوں نے شافعی مذہب کی نشر و اشاعت شام، عراق اور خراسان میں کی۔ ان لوگوں میں جنہیں ان کے درس میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا الطحاوی بھی شامل تھے جو بعد ازاں حنفی ہو گئے تھے۔ مالکیوں اور ظاہریوں نے بھی امام المزنی سے مناظرے کیے۔ (الفہرست)

امام مزنی رحمۃ اللہ علیہ نے 23 رمضان المبارک 264ھ/ 29 مئی 878ء کو جمعرات کے دن مصر میں وفات پائی۔ ابن خلکان نے ابن یونس کے حوالے سے تاریخ وفات 24 ربیع الاول بروز پنجشنبہ دی ہے جو محققین کی نظر میں درست نہیں کیونکہ ہفتے کے دن ٹھیک نہیں بیٹھتے۔ انہیں القرافہ کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

امام مزنی رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے اہم تصنیف جسے امام النووی اپنے زمانے تک کی شافعی مذہب کی پانچ بڑی کتابوں میں شمار کرتا ہے وہ "المختصر" ہے جس کا ذکر پہلے آیا ہے۔

ابن الندیم کی الفہرست کے مطابق اس کتاب کے دو نسخے تھے، ایک طویل جو الفہرست کی تدوین کے زمانے ہی غیر معروف ہو چکا تھا اور ایک مختصر جو بہت زیادہ پڑھا جاتا تھا اور اس پر متعدد شرحیں بھی لکھی گئی تھیں۔ طویل تر نسخہ الشافعی کی تصنیف کتاب "الام" کے حاشیے پر طبع ہوا تھا اور اس کے کم سے کم پہلے نصف کی بابت یہ کہا گیا ہے کہ وہ اس متن کے مطابق ہے جس کے ناقل ابوعبداللہ محمد بن عاصم تھے اور جس میں ان کے فرزند ابراہیم کے اضافے موجود تھے۔

ان کی دوسری تصانیف جو فی زمانہ موجود نہیں ہیں ان کا ذکر ابن خلکان اور السبکی نے کیا ہے۔ اسی طرح ان کی ایک تصنیف کتاب العقارب کا ذکر حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں کیا۔ اس کتاب میں المزنی رحمۃ اللہ علیہ نے 40 مسئلوں پر بحث کی ہے۔ ان کی ایک اور کتاب "نہایۃ الاختصار" ایک مخطوطے کی شکل میں موجود ہے۔ یہ ایک نہایت مختصر کتاب ہے جس میں زیادہ تر المزنی نے اپنی آراء درج کی ہیں۔

المآخذ: المسعودی مروج الذہب، النووی، التہذیب، ابن خلکان وفیات، السبکی، طبقات الشافعیہ۔

امام الطحاوی رحمۃ اللہ علیہ (859ء-933ء)

مصر کے ایک بڑے حنفی عالم، فقیہ، محدث اور "معانی آثار" کے مصنف

نام ونسب: نام احمد، کنیت ابوجعفر، سلسلہ نسب کچھ یوں ہے الامام الحافظ احمد بن محمد بن سلامہ بن عبدالملک ازدی، حجری طحاوی، مصری حنفی۔

ولادت: مصرت میں وادی نیل کے کنارے "طحا" نامی بستی میں پیدا ہوئے جس کی نسبت سے الطحاوی کہلائے۔ ان کا تعلق یمن کے قبیلہ ازد کی ایک شاخ حجر سے تھا۔ ان کی پیدائش 239ھ/854ء میں ہوئی تھی۔

تعلیم وتربیت: امام طحاوی کے والد ادب وشاعری میں ممتاز مقام رکھتے تھے اور ان کی والدہ جو ابوابراہیم المزنی کی ہمشیرہ تھیں خود بڑی فقیہہ اور عالمہ تھیں۔ امام سیوطی نے ان کا ذکر بڑے شافعی علما میں کیا ہے۔ والدہ کی تربیت کے بعد امام طحاوی نے ابوجعفر احمد بن ابی عمران موسیٰ بن عیسیٰ اور امام ابوزکریا یحییٰ بن محمد جیسے علما سے تعلیم حاصل کی۔ عسقلان کے علما سے بھی اکتساب علم کیا اور بطور خاص شام میں قاضی ابوحازم سے استفادہ کیا اور فقہ وحدیث دونوں کی تعلیم پائی۔

تبدیلی مذہب: امام زاہد الکوثری نے اپنی تصنیف میں لکھا ہے۔ شروع میں امام طحاوی، امام مزنی شافعی کی شاگردی میں بھی رہے اور شافعی المذہب تھے۔ مگر بعد ازاں حنفی مذہب اختیار کیا۔ امام طحاوی اپنے حنفی ہونے کی وجہ یہ بیان

کی ہے کہ جب امام مزنی کی شاگردی کے بعد وہ جب احمد بن ابی عمران قاضی کی شاگردی میں آئے تو انہوں نے شافعی مذہب چھوڑ کر حنفی مذہب اختیار کیا اس کی ایک اور وجہ امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ امام ابویوسف اور امام محمد کی کتابوں کا مطالعہ بھی تھا۔

شاگرد اور تلامذہ: امام طحاوی کی علمی شہرت جب دور دور تک پھیل گئی تو پھر تشنگان علم حدیث وفقہ دور دراز سے اکتساب علم کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے اور بہت سے شائقین علم نے آپ کی شاگردی اختیار کی۔ امام طحاوی کے شاگردوں کی فہرست بھی بڑی طویل ہے۔ اس کے چند اسماء یہ ہیں۔ احمد بن ابراہیم بن حماد احمد بن محمد، عبدالرحمٰن بن احمد بن یونس، الحافظ ابوبکر محمد بن جعفر بن الحسین البغدادی وغیرہ۔

وفات: امام طحاوی نے یکم ذوالقعدہ 321ھ/933ء میں بعمر 82 سال وفات پائی۔

تصنیفات: امام طحاوی کی تصانیف میں "احکام القرآنیہ"، "اختلاف العلما"، الجامع الکبیر فی شروطیہ اور معانی الآثار اور مختصر الطحاوی اہم تصانیف ہیں۔

امام یحییٰ بن یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ اندلسی

نام ونسب: بربر کے قبیلہ معمورہ سے تعلق تھا۔ قرطبہ میں سکونت اختیار کی۔ تحصیل علم کے لیے 28 سال کی عمر میں دنیائے اسلام کا سفر کیا۔ مصر میں لیث بن سعد اور عبدالرحمٰن بن وہب اور عبدالرحمٰن بن قاسم سے، مکہ میں سفیان بن عینیہ سے استفادہ کیا۔ پھر مدینہ منورہ میں امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں "عاقل اہل اندلس" کا خطاب مرحمت کیا۔

ان کے متعلق ایک حکایت یہ ملتی ہے کہ ایک دن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ درس میں بیٹھے تھے اور لوگ بھی شامل درس تھے۔ ایسے میں کسی نے باہر سے آ کر کہا ہاتھی آیا، ہاتھی آیا۔ چونکہ عرب میں ہاتھی نہیں پایا جاتا۔ اس لیے سب آدمی ہاتھی دیکھنے کے لیے مجلس سے باہر چلے گئے مگر امام یحییٰ بیٹھے رہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے پوچھا کہ ہاتھی تو اندلس میں بھی نہیں ہوتا پھر تم کیوں اسے دیکھنے کے لیے باہر نہیں گئے۔ عرض کیا "جناب! میں مغرب سے چل کر یہاں تک اس لیے آیا ہوں کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے چہرہ مبارک کی زیارت کروں اور جناب کی عمدہ خصائل اور عادات کو سیکھوں۔ میں یہاں اس لیے نہیں آیا کہ ایسی علمی مجلس چھوڑ کر گلی کوچوں میں ہاتھی دیکھتا پھروں۔" امام صاحب نے اُن کے اس جواب کو نہایت پسند فرمایا اور انہیں عاقل اہل اندلس کا خطاب عطا کیا۔

تحصیل علم کے بعد جب امام یحییٰ واپس اندلس پہنچے تو وہاں رئیس العلما تسلیم کیے گئے۔ امام کا مذہب اندلس میں انہیں کی وجہ سے پھیلا اور خود ان سے بے شمار علمائے اندلس نے اکتساب فیض کیا اور بہت سے علمائے حدیث نے روایت حدیث کی۔

چنانچہ امام مالک کی کتاب موطاء کی جملہ روائتوں میں سے زیادہ مشہور وہ روایات ہیں جو یحییٰ بن یحییٰ سے مروی ہیں۔ امام صاحب اپنی فضیلت وامامت کی وجہ سے امرائے اندلس کی نگاہوں میں جلیل القدر تھے۔ حالانکہ انہوں نے علم حدیث سے لگاؤ کی وجہ سے کوئی سرکاری عہدہ قبول نہیں کیا تھا۔ تاہم شاہی دربار اور امرائے کبار کے ہاں ان کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔

ابن حزم اندلسی کا قول ہے کہ دو مذاہب کی اشاعت دنیائے اسلام میں حکومت کی مدد سے ہوئی۔ (1) حنفیہ مذہب کی اشاعت اس وجہ سے ہوئی کہ قاضی ابویوسف کو خلیفہ ہارون الرشید نے قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز کر دیا۔ وہ

حنفیہ مذہب کے مطابق فتوے جاری کرتے تھے اور اپنے ماتحت قاضیوں کو بھی اس کے مطابق فتویٰ دینے پر پابند کرتے اور قاضی اسی کو بناتے تھے جو مذہب حنفیہ کے مطابق فتوے دینے کا عہد کرتا، سلطنت عباسیہ میں تھوڑے ہی عرصے میں اس مذہب کے فتاویٰ پھیل گئے اور عباسی حکومت کا سرکاری مذہب، مذہب حنفیہ ٹھہرا۔ (2) اسی طرح مذہب مالکیہ امام یحییٰ بن یحییٰ کی وجہ سے پھیلا کیونکہ یحییٰ کے مشورے کے بغیر کسی شخص کو قاضی کے منصب پر فائز ہیں کیا جاتا تھا اور وہ ہمیشہ مالکی المذہب قاضیوں کو پسند کرتے تھے۔ جب علماء نے دیکھا کہ سرکاری عہدے اسی وقت ملتے ہیں جب امام یحییٰ سفارش کرتے ہیں تو سب علمائے اندلس نے مالکی مذہب اختیار کر لیا۔

احمد بن ابوالفیاض سے روایت ہے کہ میں امیر عبدالرحمٰن الداخل اموی، سلطان اندلس کی خدمت میں حاضر تھا۔ سلطان نے فقہا کو طلب کیا۔ رمضان المبارک کا مہینہ تھا اور بتایا کہ میں حالت روزہ میں اپنی بیوی کے ساتھ ہم بستر ہو گیا ہوں۔ اس وقت غلبہ محبت میں نفس کو روک نہیں سکا۔ اب نادم ہوں، بتائیے کہ صورت توبہ کیا ہے؟ امام یحییٰ بن یحییٰ نے کہا کہ دو ماہ کے متواتر روزے رکھیے۔ امام یحییٰ کے بعد کسی دوسرے فقیہ کو جرات نہ ہو سکی جو سلطان کو کوئی دوسرا مشورہ دیتا۔ جب علماء دربار سے باہر نکلے تو لوگوں نے کہا کہ آج آپ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر فتویٰ کیوں نہ دیا؟ کیونکہ ان کے نزدیک تو کفارہ کی تینوں صورتیں برابر ہیں۔ یعنی خواہ کوئی کفارے میں روزے رکھے، خواہ غلام آزاد کرے، خواہ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ کہا کہ اگر ہم سلطان کے لیے یہ آسانی کے دروازے کھول دیں جو غربا اور عام لوگوں کے لیے ہیں تو پھر یہ اس کے لیے ایک عام بات ہو جائے گی اور اس طرح وہ روز بروز روزے توڑ کر غلام آزاد کر دیا کرے گا یا کھانا کھلا دے گا۔ اس لیے میں نے سلطان کے لیے وہ صورت تجویز کی جو نہایت سخت ہے اور جس میں نفس شہوانی کی اصلاح بھی مضمر ہے۔

کہتے ہیں جب مدینہ منورہ سے تحصیل علم کے بعد واپس اندلس جا رہے تھے تو کچھ دیر کے لیے مصر میں رکے۔ وہاں عبدالرحمٰن بن قاسم کے پاس ایک کتاب دیکھی جس کو انہوں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا تھا۔ ان کو شوق ہوا کہ علم کا یہ حصہ بھی خاص استاد سے ہی حاصل کروں۔ لہٰذا وہاں سے لوٹ کر پھر مدینہ آ گئے۔ مگر استاد کو مرض الموت میں بیمار پایا۔ بیماری میں استاد کی خدمت کرتے رہے اور پھر ان کی نماز جنازہ سے فارغ ہو کر دوبارہ واپس لوٹے۔ احمد بن خالد روایت ہے کہ جب سے اندلس میں اسلام پھیلا، اس وقت سے آج تک جو عظمت امام یحییٰ کو حاصل ہوئی وہ کسی اور عالم کو حاصل نہ ہو سکی۔

امام یحییٰ کے متعلق مشہور اندلسی مورخ ابن بشکوال نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ ابو محمد یحییٰ بن یحییٰ مستجاب الدعوۃ تھے اور نشست و برخاست اور عادات و اطوار میں انہوں نے اپنی زندگی کو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نمونے پر استوار کر رکھا تھا۔

امام یحییٰ خود بیان کرتے ہیں کہ میں لیث بن سعد کی رکاب تھام کر ان کے ساتھ چلا، ان کے غلام مجھے ہٹانا چاہتے تھے۔ مگر انہوں نے فرمایا کہ نہ ہٹاؤ۔ پھر فرمایا یحییٰ! اہل علم اسی طرح تیری خدمت کریں گے جس طرح تو آج میری خدمت کر رہا ہے۔ چنانچہ ان کے اس پیشین گوئی کے عین مطابق ہی ہوا۔ امام یحییٰ نے جب 848ء میں وفات پائی اور قرطبہ کے باہر مدفون ہوئے۔ بعدازاں ان کی قبر پر شہر کے لوگ دعاء استسقاء کے لیے حاضر ہوتے تھے۔

امام ابن سریج رحمۃ اللہ علیہ

فقہ شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے امام اور تقریباً 400 تصانیف کے مصنف

نام ونسب: ابوالعباس احمد بن عمر بن سریج البغدادی رحمۃ اللہ علیہ عرب سوانح نگاروں کے مطابق تیسری صدی

ہجری کے سب سے بڑے شافعی عالموں میں سے تھے۔ بہت سے مشہور شافعی علما ان کے شاگردوں میں شامل تھے۔ خود انہوں نے اتنی شہرت حاصل کر لی تھی کہ بہت سے لوگوں کے نزدیک وہ تمام شافعی علما یہاں تک کہ امام المزنی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی افضل تھے۔ وہ ایران کے شہر شیراز میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز رہے اور انہوں نے ظاہر یہ وغیرہ کے رد میں کئی رسالے لکھے۔ اور ابن داؤد ظاہری سے کئی مناظرے بھی کیے۔ کثیر التعداد کتابوں کے مصنف تھے۔

مورخین نے ان کی تصنیف شدہ کتابوں کی تعداد چار سو سے زائد بتائی ہے، لیکن افسوس کہ ان کی تصانیف میں سے آج کوئی بھی موجود نہیں۔ اگرچہ ان کی چند تصانیف کے نام ضرور ہم تک پہنچے ہیں۔ انہوں نے بغداد میں ساڑھے ستاون برس کی عمر میں وفات پائی۔ وہ جمادی الاولی 306ھ / اکتوبر، نومبر 918ء میں فوت ہوئے تھے۔

امام الماتریدی، ابو منصور محمد بن محمد

سُنی علم الکلام کے امام اور سنی علم الکلام کی دوسری بڑی شخصیت

نام ونسب: الماتریدی، ابو منصور محمد بن محمد بن محمود جو امام الہدیٰ، یعنی ہدایات و روشنی کے راہنما اور امام اہل سنت والجماعت کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ماترید سمرقند کا ایک محلّہ یا اس کا ایک نواحی قصبہ تھا۔ اسی قصبے میں آپ پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخ پیدائش کسی سوانح نگار نے نہیں لکھی ہے۔

تعلیم وتربیت: الماتریدی نے علوم متداولہ کی تحصیل امام محمد بن مقاتل، نصیر بن یحییٰ بلخی، امام ابو نصر عیاض اور شیخ ابوبکر احمد جوجانی سے حاصل کی۔ اس طرح امام الماتریدی دو واسطوں سے قاضی ابو یوسف اور امام محمد کے شاگرد تھے۔

الماتریدی کے شاگردوں میں اسحاق بن محمد سمرقندی علی استغنی اور عبدالکریم البزدوی کے نام شامل ہیں۔

امام الماتریدی کو امام المتکلمین اور مصلح عقاید المسلمین بھی کہا جاتا ہے۔ معتزلہ کی تاویلات قرآن مجید کی تردید کے سلسلے میں انہوں نے "تاویلات قرآن" کے عنوان سے جو کتاب تصنیف کی تھی وہ اہل سنت والجماعت کے نقطہ نظر سے ایک ایسی کتاب قرار پائی جس کی نظیر نہیں ملتی۔ علم الکلام کے میدان میں اہل سنت والجماعت دو عظیم شخصیات کے مقلد ہیں یہ دونوں شخصیات، ابوالحسن الاشعری اور الماتریدی، بے حد محترم اور عزیز ہیں اور انہیں امامت وریاست کا اعزاز بخشا جاتا ہے۔ جن میں سے ایک شافعی المسلک تھے جبکہ دوسرے یعنی الماتریدی امام ابوحنیفہ کے شاگردوں کے شاگرد تھے۔ گویا یہ دونوں بزرگ سنی علم الکلام کے قطبین اور امام ہیں اور ان دونوں کی آراء کے اتباع کو اہل سنت والجماعت کے علما نے ہدایت پانے اور فساد و گمراہی سے اپنے عقیدے کو محفوظ کر لینے کا وسیلہ بتایا ہے۔ اس کے علاوہ امام الماتریدی نے سنی علم الکلام کے ضمن میں الاشعری سے جو اختلاف رائے میں قائم کیا ہے جو فروعی ہے۔ امام ابوالحسن الاشعری چونکہ فقہی مسلک میں امام شافعی کے پیروکار تھے اس لیے شافعیہ کے ہاں ان کا علم الکلام مسلم ٹھہرا۔ امام الماتریدی چونکہ حنفی فقہ کے عالم تھے اس لیے حنفیہ کے ہاں الماتریدی کا علم الکلام اتنا مقبول ہوا کہ قدیم زمانے میں فقہی مسلک اور علم الکلام میں مطابقت اب لازم ٹھہری۔

ابن الاثیر نے اپنی تاریخ الکامل میں لکھا ہے کہ یہ بات بے حد تعجب کا باعث سمجھی جاتی ہے کہ کوئی عالم فقہ حنفی کے مسلک پر ہو اور علم الکلام میں الاشعری کے مکتب فکر کو اختیار کرے۔ تاہم الماتریدی کے علم الکلام کو وہ شہرت اور مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جو الاشعری کے علم الکلام کو ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے فقہ میں فروعی اختلافات کی موجودگی کے باوجود ان بلاد اسلامیہ میں بھی کہ جن میں فقہ حنفی رائج تھا، وہاں بھی علم الکلام میں امام الاشعری کی پیروی کی جاتی رہی۔

علامہ شبلی نے اس کی دو بڑی وجوہات بتائی ہیں، ایک تو یہ کہ اشعری علم علم الکلام تقدم زمانی اور کثرت تصانیف کے باعث اہل سنۃ والجماعۃ کے ہاں مقبول ہو چکا تھا۔ اس لیے اس علم کے میدان میں کام کرنے والے علما پہلے سے ہی الاشعری کی پیروی کرتے تھے۔ دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ الاشعری اور الماتریدی کا اختلاف رائے اصولی نہیں تھا بلکہ فروعی تھا اس لیے اہل سنت والجماعت کے تمام طبقے اور مکاتیب فکر اشعری علم الکلام کی پیروی میں کوئی مضائقہ تصور نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ ایک محقق، لکھتے ہیں کہ اشاعرہ اور ماتریدیہ عقائد اہل سنت والجماعت سے متفق علیہ ہیں۔ بعض مسائل میں ان کے ہاں اگر اختلاف پایا بھی جاتا ہے تو وہ کسی عیب یا نقص کا موجب نہیں ہے اور اس سے کسی دینی عقیدے پر حرف گیری نہیں کی جا سکتی۔ کیوں کہ یہ اختلاف جزوی اور فروعی نوعیت کا ہے، جو کسی لفظ کی تشریح یا مسئلے کی بہتر توجیہ تک محدود ہے۔

ان دو عظیم شخصیات کے درمیان بعض مسائل پر جو فروعی یا جزوی اختلاف رائے پایا جاتا ہے اس کے بارے میں علما نے مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب جو ابو عذبہ الحسن بن عبدالحسن کی تصنیف ہے۔ وہ کتاب الروجہ البہیہ درقع بین الاشاعرہ والماتریدیہ ہے۔ ماتریدی اور اشعری کے درمیان اختلافات کی تعداد بعض علما نے پچاس، بعض نے چالیس اور بعض نے تیرہ دی ہے۔ جبکہ بعض نے صرف تین قرار دیے ہیں۔ علامہ شبلی نے ایسے 9 مسائل کی فہرست دی ہے جن میں اشاعرہ اور ماتریدیہ میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔

امام الماتریدی نے جو بیش بہا کتابیں تصنیف کیں ان میں کتاب التوحید، کتاب المقالات رد اھل الادلۃ للکعبی۔ بیان اوہام معتزلہ اور کتاب الجدل، شرح فقہ امام ابوحنیفہ بہت اہم ہیں۔

امام شمس الائمہ السرخسی (1009ء-1090ء)

ایک مشہور حنفی فقیہ اور شرح السیر الکبیر کا مصنف

نام ونسب: ابوبکر محمد بن ابی سہل احمد۔ مشہور حنفی فقیہ جن کی ولادت بقول عبدالحئی لکھنوی 400ھ/ 1010ء میں ہوئی۔ وہ غالباً سرخس میں پیدا ہوئے جو مشہد اور مرد کے درمیان دریائے بھری روڈ کے کنارے واقع ہے۔ مولانا عبدالحئی لکھنوی نے لکھا ہے کہ دس سال کی عمر میں وہ اپنے والد کے ہمراہ بسلسلہ تجارت بغداد آ گئے۔ بعدازاں بخارا جا کر شمس الآئمہ عبدالعزیز حلوائی یا حلوانی کے شاگرد بنے اور علوم وفنون میں اس قدر امتیاز حاصل کر لیا کہ جب 1056ء میں ان کے استاد کی وفات ہوئی تو ان کی مسند درس کے ساتھ ساتھ اس کے لقب خاص، شمس الآئمہ کے بھی وارث قرار پائے۔ یہ زمانہ صلیبی جنگوں کی وجہ سے بڑا پر آشوب تھا۔ ان کے استاد الحلوانی نے اشراط الساعۃ پر درس دیئے جو السرخسی نے انہیں کتاب کی شکل دے دی۔ یہ آج کل پیرس کے عربی مخطوطوں میں محفوظ ہے۔

صلیبی جنگوں کے پیش نظر السرخسی نے قتال وجنگ سے متعلق فقہی احکام ومسائل پر مشتمل امام محمد شیبانی کی اہم تالیف السیر الکبیر کی شرح بھی املا کرائی۔ کتاب السیر الکبیر میں امام محمد نے جہاد وقتال اور صلح وجنگ کے طریقے اور غیر مسلم اقوام سے تعلقات اور تجارت وغیرہ پر بحث کی ہے۔ غرض کہ اسلام کے بین الاقوامی نقطہ نظر کو جاننے کے لیے یہ کتاب بڑی اہم ہے۔ السرخسی کی یہ شرح حیدرآباد دکن سے شائع ہو چکی ہے۔ کسی نامعلوم وجہ سے السرخسی کو قید کر دیا گیا تو قید خانے میں بھی انہوں نے طلباء کو شرح المبسوط، شرح السیر کبیر اور اصول فقہ املا کرائیں۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ امام محمد کی تالیف المبسوط کی شرح السرخسی نے لکھی۔ اس سلسلے میں تاریخی حقیقت یہ ہے کہ امام محمد کی کتاب المبسوط اپنی ضخامت اور بہت گراں ثابت ہونے لگی تو الحاکم الشہید ابوالفضل محمد بن احمد

الروزی نے المبسوط کی تلخیص تالیف کر دی تھی۔ جس میں تکرار کو حذف کر کے طلبا کے لیے سہولت پیدا کر دی تھی اسی المختصر کی شرح السرخسی نے لکھی تھی جو المبسوط کے نام سے قاہرہ میں تیس جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

محققین کے بیانات سے گمان ہوتا ہے کہ السرخسی کو بخارا سے گرفتار کر کے فرغانہ کے نواح میں ایک شہر اوزکند میں قید یا جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ یہ علاقہ ان دنوں فراخانیوں کے قبضے میں تھا۔

شرح السیر الکبیر کے خاتمہ کلام میں السرخسی نے خود ہی صراحت کی ہے کہ اوزجند کی قید سے رہائی ملی تو وہ دس دن کا سفر کر کے مرغینان گئے۔ جہاں وہ امام سیف الدین بن ابراہیم کے گھر مہمان رہے اور وہیں املا کی تکمیل کرائی۔

قدیم سوانح نگار السرخسی کی قید کی وجہ بیان نہیں کرتے۔ اس زمانے میں محاصل شرعی کے علاوہ نئے نئے ٹیکس لگائے جا رہے تھے۔ امام السرخسی نے ان میں سے بعض ٹیکسوں کو انتہائی ظالمانہ قرار دیا تھا امکان ہے کہ کسی ٹیکس کی عدم ادائیگی کی تحریک کی قیادت کے الزام میں انہیں قید و جلاوطن کر دیا گیا ہو۔

زمانہ قید میں بعض عقیدت مند اہل کاروں نے تجویز پیش کی کہ دل بہلانے کے لیے کچھ تدریسی کام کریں۔ چنانچہ المبسوط کی شرح کے دیباچہ میں وہ خود لکھتے ہیں کہ امام محمد شیبانی کی کتاب الاصل کا جو خلاصہ المختصر الکافی کے نام سے محمد بن احمد الحاکم المروزی نے لکھا تھا اس کی شرح قلمبند کرنے کی انہیں ایک عرصہ سے خواہش تھی اب یہ کام کیا ہے۔ مگر افسوس کے انہوں نے مقدمے میں تاریخ نہیں دی اس شرح کو املا کرانے میں انہیں محققین کے مطابق تقریباً تیرہ سال لگے تھے۔ کتاب اصول فقہ کے آغاز میں درج ہے کہ وہ شوال 479ھ میں شروع ہوئی تھی۔ شرح السیر الکبیر کے خاتمہ کلام میں انہوں نے لکھا ہے کہ اس 716 حصہ مکمل ہوا تو انہیں قید سے رہائی ملی تھی۔ یہ جمعہ 20 ربیع الاول 480ھ کا دن تھا۔

قید ہی کی طرح ان کی رہائی کی وجہ بھی نامعلوم ہے۔ فقہاء اور حکمرانوں کے درمیان بڑی کشمکش پائی جاتی تھی۔ فقہا نے سلجوقی حکمران ملک شاہ کو دعوت دی تھی جس نے یہ سارا علاقہ فتح کر لیا تھا۔ اور جند پر قبضہ 483ء میں بیان کیا جاتا ہے۔ السرخسی کی وہاں سے رہائی 480ء میں ہوئی گویا علما کی برہمی کو کم کرنے کے لیے مصلحتاً عمل میں لائی گئی تھی۔

الشرح السیر الکبیر میں السرخسی نے صلح حدیبیہ کی یہ دلچسپ توضیح کی ہے کہ چونکہ مکے اور خیبر والوں کے درمیان عسکری معاہدہ تھا اور جس کی رو سے یہ طے پایا تھا کہ مسلمان اگر ان دونوں فریقوں میں سے کسی پر اگر حملہ کر دیں تو دوسرا فریق مدینہ منورہ پر حملہ کر دے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی منہ مانگی شرائط کو منظور کر کے انہیں غیر جانبدار رہنے پر آمادہ کیا تھا۔ (یاد رہے کہ مکہ مدینہ کے جنوب میں اور خیبر شمال میں ہے۔ یعنی اہل مکہ پر حملہ کی صورت میں اہل خیبر شمال سے نکل کر مدینہ پر حملہ کر سکتے تھے)۔

انگریزی انسائیکلو پیڈیا آف اسلام طبع لائیڈن کے مقالہ نگار HEFFERING نے ان کے قید کیے جانے کی وجہ ایک فقہی مسئلے میں خاقان بخارا کے خلاف ان کا فتویٰ دینا لکھا ہے مگر یہاں دیگر سوانح نگاروں کی رائے یہ ہے کہ یہ ان کی قید سے رہائی کے بعد کا واقعہ ہے اور اس کا تعلق امیر البلا یعنی مرغینان کے والئی سے ہے۔ امیر مذکور کسی عورت سے خود نکاح نہیں کرنا چاہتا تھا کہ ان کے امتناعی فتویٰ کی وجہ سے خفا ہو کر اس نے ایسا کیا تھا۔

امام راغب الاصفہانی

امام تفسیر و لغت دینیہ کے ایک نامور عربی عالم اور مصنف ''المفردات القرآن''

نام و نسب: ابوالقاسم الحسین بن محمد بن المفضل، علوم دینیہ کا نامور عربی عالم، جس کی زندگی کے بارے میں اس

کے سوا کچھ اور معلوم نہیں ہو سکا کہ اس نے چھٹی صدی عیسوی کے آغاز، غالباً 502ھ/1108ء میں وفات پائی۔ بعض محققین نے انہیں معتزلی عالم قرار دیا ہے، لیکن امام فخر الدین الرازی نے اپنی کتاب ''اساس التقدیس'' میں ان کے اہل سنت اور صحیح العقیدہ ہونے کی توثیق کی ہے۔ ان کی تصانیف، تفسیر القرآن اور ادب و ثقافت سے متعلق ہیں۔ قرآن مجید سے متعلق ان کی کتاب جامع التفاسیر قابل ذکر ہے، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ البیضاوی نے اپنی تفسیر میں اس سے بہت کچھ اخذ کیا تھا۔ نواب صدیق حسن خان نے اکسیر فی اصول التفسیر میں کم از کم تفسیر راغب کا تین مواقع پر ذکر کیا ہے۔ انہوں نے ایک مقام پر اس کا نام ''تحقیق البیان فی تاویل القرآن'' تحریر کیا ہے۔ جبکہ باقی مقامات پر تفسیر راغب اصفہانی کے کہنے پر اکتفا کیا ہے۔

اس کے بعد امام راغب اصفہانی نے قرآن مجید کی ایک عمدہ لغات ''المفردات'' کے نام سے تالیف کی۔ اسے حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق مرتب کیا اور اس کا مکمل نام ''کتاب المفردات الفاظ قرآن (المفردات فی غریب القرآن) رکھا۔ اس لغت کے جس مخطوطہ کا مستشرق براکلمان نے حوالہ دیا ہے اس کے علاوہ بھی اس کے بہت سے نسخے محفوظ ہیں۔ یہ لغت المفردات فی غریب القرآن کے نام سے ابن الاثیر کی کتاب النہایۃ کے حاشیے پر 1322ھ میں قاہرہ سے شائع ہوئی تھی۔ جس کو محمد الزہری المراوی نے مرتب کیا تھا۔ المفردات کا اردو ترجمہ ''المفردات القرآن'' کے نام سے 1963ء میں لاہور سے شائع ہوا تھا۔ حرف آغاز کے بعد الراغب کے حالات زندگی اور تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے۔ امام راغب نے اس کے دیباچے میں اپنی ایک اور کتاب کی توقع دلائی ہے۔ جس میں مترادفات قرآن مجید پر بحث مقصود تھی۔ اس دیباچے کی ایک عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے المفردات سے پہلے اخلاقیات پر اپنی خاص کتاب الذریعۃ الی مکارم الشریعۃ تالیف کر لی تھی جس کے متعلق محققین نے لکھا ہے کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اس کا ایک نسخہ ہمیشہ اپنے پاس رکھا کرتے تھے۔

امام راغب اصفہانی کی ایک مقبول ترین ادبی تصنیف محاضرات الادبا ومحاورات الشعراء البلغا ہے۔ اس کتاب کا علم پہلے پہل 1829ء میں ہوا تھا جب جی فلیوجل نے اس کا کچھ حصہ طبع کیا تھا۔ بعد ازاں یہ کتاب قاہرہ سے 1305ھ میں دو جلدوں میں چھپی تھی۔ ابراہیم زیدان نے 1902ء میں قاہرہ ہی سے اس کی ایک تلخیص شائع کی تھی۔ امام راغب اصفہانی کی تالیفات محاضرات الادبا اور خصوصاً مفردات القرآن کے مطالعہ سے یہ پتا چلتا ہے کہ مؤلف جامع، علوم وفنون ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ صوفی بھی تھے۔ چنانچہ ان کے بارے میں ''روضات الجنات'' کے مصنف نے لکھا ''موصوف کو علم'' تھے اور ادب وفلسفہ بلکہ جملہ علوم میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔

علامہ الذہبی نے ان کا تذکرہ اپنی ''طبقات المفسرین'' میں کیا ہے اور انہیں علم وفضل میں یگانہ روزگار شخصیت قرار دیا ہے۔ امام السیوطی ان کو لغت ونحو کے آئمہ میں شمار کرتے ہیں۔ البیہقی نے اپنے ''تتمہ صوان الحکمۃ'' میں انہیں حکماء کی صف میں کھڑا کیا ہے اور یاقوت حمودی نے ان کا تعارف ایک ادیب کی حیثیت سے کر لیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف ہمہ فنی امام تھے اور بیک وقت تفسیر ولغت کے امام ہونے سے بہت بڑے حکیم اور صوفی بھی تھے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ (1058ء-1111ء)

عالم اسلام کے سب سے زیادہ بدیع الخیال مفکر، عالم دینیات، متکلم، صوفی اور مصنف

نام ونسب: ابوحامد، محمد بن محمد بن الغزالی الطوسی، الشافعی، حجۃ الاسلام زین الدین لقب، دنیائے اسلام کے سب سے زیادہ بدیع الخیال مفکر اور سب سے بڑے عالم دینیات۔

ولادت: وہ ایران کے مشہور شہر الطوس (خراسان) میں 450ھ/1058ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے طوس اور

نیشاپور میں تعلیم پائی۔ بالخصوص امام الحرمین سے۔ طالب علمی کے زمانے ہی میں صاحب تصنیف اور صاحب فتویٰ ہو گئے تھے اور بسا اوقات امام الحرمین ابوالمعالی اس فاضل شخص کے شاگرد ہونے پر فخر کرتے تھے۔ 478ھ/1086ء میں جب ان کے استاد امام الحرمین کا انتقال ہوا اس وقت تک انہیں کے ساتھ مقیم رہے۔ ان کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ صوفیانہ ماحول میں رہنے سہنے اور صوفیانہ ریاضتوں میں حصہ لینے کے باد جود شروع میں ان پر تصوف کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ان کا رجحان نسبتاً دینی اور فقہی باریکیوں کی چھان بین کی طرف تھا جس کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب ان کی عمر بیس سال سے بھی کم تھی۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی انہوں نے تقلید (یعنی محض سند کی بنیاد پر کسی مذہبی عقیدے کو قبول کرنا) سے اپنا رخ موڑ لیا تھا۔ نیشاپور سے وہ سلجوقی وزیر نظام الملک کے دربار میں پہنچے اور 484ھ تک علماء وفقہا کی اس جماعت میں شامل رہے جو وزیر موصوف کے دربار میں رہتے تھے۔ پھر ان کا تقرر بحیثیت معلم مدرسہ نظامیہ بغداد میں ہو گیا۔

بغداد میں اپنے قیام کے دوران میں وہ پورے طور پر تحقیق کرنے کی وجہ سے متشکک اور مرتاب بن چکے تھے۔ ان کے اس تشکک کا تعلق صرف مذہب سے نہیں تھا بلکہ وہ کسی بھی قطعی علم کے امکان سے تعلق رکھتا تھا۔ جہاں تک علم فلسفہ کا تعلق ہے۔ دائرہ المعارف اسلامیہ کے مطابق الغزالی کبھی اس تشکک پر غالب نہیں آسکے۔

مدرسہ نظامیہ میں انہوں نے فقہ پر درس دیا اور ان کے طرز تعلیم اور قوت تقریر و کثرت معلومات و توضیح مشکلات سے تمام بغداد دنگ رہ گیا۔ مدرسہ کے علما کے علاوہ سینکڑوں، علما ان کے درس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے چند کتب باطنیہ کے خلاف بی لکھیں جنھوں نے 485ھ میں وزیر نظام الملک کو قتل کروا دیا تھا۔ 483ھ سے 487ھ تک انہوں نے علم فلسفہ کا بغور مطالعہ کیا اور پھر آخر کار تصوف کی طرف مائل ہو گئے۔ ان کے اپنے قول کے مطابق عقل وفکر نے ان کی کوئی راہنمائی نہ کی تھی لہٰذا وہ واردات مذہب کی طرف رخ کر گئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ خدا نے حقائق میں ان کا ایمان از سر نو تازہ کر دیا تھا۔ اور قیامت کے ہولناک دن کا خوف ان کے دل پر چھا گیا تھا۔ ماہ رجب سے ذوالقعدہ 488ء تک دہشت نے ان کے اندر جو انقلاب پیدا کر دیا تھا اس کی وجہ سے انہیں ایک درد اور کرب کی جس حالت سے گذرنا پڑا تھا اس کی وجہ سے ان کی ذہنی اور جسمانی صحت جواب دے گئی اور بالآخر وہ ذوالقعدہ میں مدرسہ نظامیہ کے بلند منصب کو چھوڑ کر ایک جہاں گرد درویش کی حیثیت سے بغداد سے نکل کھڑے ہوئے۔ اب انہوں نے اپنی زندگی کو زہد و تقشف اور غور وفکر کرنے کے لیے وقف کر دیا تا کہ ان کی روح کو سکون اور ذہن کو یقین حاصل ہو۔ ان کے خیال کے مطابق عقل کا استعمال محض اس اعتماد کو دور کرنے کے لیے ہونا چاہیے جو خود اسے اپنے آپ پر ہے۔ علم صرف وہی معتبر ہے جس کی بنا پر محسوسات و مدرکات پر ہے۔ خالص فلسفیانہ نظامات کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔ اس بارے میں ان کا جدال اتنا ہی سخت تھا جتنا ھیوم HUME کا حتیٰ کہ جو علما ظن وتخمین سے کام لیتے تھے ان کے کلمات بھی عقلاً ناقابل یقین تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اصولاً وہ جو کہتے تھے ٹھیک کہتے تھے، کیونکہ ان اصولوں اور کلیات کا ثبوت تخمینی منہاجات کے ذریعے ناممکن ہے۔ البتہ اس بلاواسطہ (حضوری) علم کے ذریعے ہوسکتا ہے جو فیضان الٰہی سے مومن کو عطا ہوتا ہے یہ ذاتی واردات ہیں۔ اس معرفت سے ہمیں وحی و رسالت کا ثبوت مل جاتا ہے اور اس عمارت کی صداقت پر یقین آجاتا ہے۔ جو از روئے الٰہیات اٹھائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ امام زالی کے افکار میں جو غیر معمولی وضاحت پیدا ہو گئی تھی، فلسفہ ہی کے مطالعہ سے ہوئی تھی اور یہ آخری موقع تھا جب یونانی جدلیات کی مختلف شکلیں امام موصوف کی بدولت اسلام میں داخل ہوئی تھیں، گویا جس کام کا آغاز ابوالحسن الاشعری نے نیم شعوری طور پر کیا تھا، الغزالی نے اسے نہایت دانشمندی سے انجام تک پہنچا دیا تھا۔

انہوں نے 488ھ میں مدرسہ سے مستعفی ہو کر زہد و انقطاع الی اللہ اختیار کیا اور حج کر کے واپسی پر دس سال کے

لیے دمشق کی جامع اموی میں معتکف ہو گئے پھر وہاں سے بیت المقدس تشریف لے گئے جہاں نہایت ہی زہد کے ساتھ عبادتوں میں مشغول رہے۔ وہاں سے یوسف بن تاشفین سے سلطان اندلس ومراکش سے ملاقات کے لیے مصر کا سفر کیا اور بلاد مغرب جانے کے لیے بحری سفر کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ انہیں سلطان مذکورہ کی وفات کی خبر ملی اس لیے وہاں سے پھر وطن لوٹ آئے۔ ایک دفعہ پھر نیشاپور گئے اور کچھ عرصہ پھر مدرسہ نظامیہ میں بھی دوبارہ معلم کے فرائض ادا کرتے رہے۔ پھر مستعفی ہو کر وطن واپس آ گئے۔ وطن واپس آ کر اپنے گھر کو دو حصوں میں تقسیم کیا، ایک حصہ صوفیا کے لیے خانقاہ بنا دیا اور دوسرے حصہ میں مدرسہ تشکیل دیا۔ اپنے اوقات کی ترتیب اس طرح رکھی پہلے تلاوت قرآن مجید پھر مجالس اہل دل پھر درس وتدریس۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات کی تعداد بہت زیادہ ہے، وسط، بسیط، الخلاصہ فی الفقہ، تہافتہ الفلاسفہ، مشکوٰۃ الانوار، کیمیائے سعادت اور اربعین ان کی سب سے اہم تصنیف احیائے العلوم الدین ہے۔ معقولات اور فلسفہ میں ان کا درجہ ابونصر فارابی اور بوعلی سینا کے برابر ہے۔

امام غزالی ان لوگوں میں سے ہیں جن کی توفیق الٰہی نے دستگیری فرمائی اور جن کو احکام وظواہر پر شرع پر اطمینان قلب وانشراح صدر حاصل ہوا۔ ورنہ بہت سے لوگ جو فلسفہ کی طرف مائل ہوئے وہ یا تو دین سے بالکل آزاد ہو گئے یا پھر دین کو تابع عقل تو ضرور سمجھنے لگے۔ امام غزالی ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اسرار شریعت کو بیان کیا اور ظواہر کو قائم رکھا اور اسی کو درجہ کمال قرار دیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے نزدیک امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا کلام بھی اعلیٰ اور سند بھی عالی ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قدر کمال وفضیلت کے باوجود بھی بعض اہل علم نے ان پر ان کی زندگی میں اور بعد میں بھی ان پر بہت سے اعتراضات کیے ہیں۔ انھی کے ایک شاگرد امام ابوبکر ایوبی کا قول ہے کہ ہمارے شیخ نے بہت سی ایسی باتیں لکھی ہیں جن کو اہل عراق نہیں مانتے۔ مگر ابن جوزی، ابن حجر مکی اور ابن سبکی کا مذہب یہ ہے کہ اس قسم کی لغویات سے الغزالی کی شان اعلیٰ اور برتر ہے۔ ادھر امام ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ غزالی کی کتابوں میں الحادات پائے جاتے ہیں۔ مگر وہ خود اس اعتقاد کے لوگوں کی تکفیر کرتا ہے۔ ادھر ابن سبکی کا قول ہے کہ غزالی رحمۃ اللہ علیہ سے بغض رکھنے والا یا تو حاسد ہوگا یا زندیق۔ بے شک ان کا درجہ عالی ان کے لقب حجۃ الاسلام سے بخوبی نمایاں ہے اور ان کی تصانیف میں صداقت موجود ہے۔

عام لوگوں میں یہ حکایت بہت مشہور ہے کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی روح نے حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کے ساتھ شب معراج میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں کچھ بحث کی تھی۔ اس کی اصلیت محققین کے نزدیک صرف اتنی ہے کہ یہ واقعہ صرف شیخ شاذلی رحمۃ اللہ علیہ کے خواب کا ہے۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ خواب دیکھنے والے کے نزدیک امام صاحب کی وقعت کس قدر تھی۔ امام غزالی کا انتقال 505ھ/1111ء میں ہوا اور وہ طوس میں مدفون ہوئے۔

ابن الجوزی حنبلی رحمۃ اللہ علیہ (1116ء-1200ء)

مشہور حنبلی فقیہ، واعظ اور کثیر التصانیف مصنف

نام ونسب: ابن الجوزی، عبدالرحمٰن بن علی بن محمد ابوالفرج جمال الدین القرشی البکری، الحنبلی اور البغدادی، حنبلی مسلک کے مشہور فقیہ، بہت سی کتابوں کے مؤلف اور عرب کے واعظ۔ ان کا سلسلہ نسب پندرہ پشتوں کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔ ان کی نسبۃ الجوزی کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ بظاہر صحیح ترین قول یہ ہے کہ ان کی نسبت بصرے کے ایک محلے جوزۃ کی طرف ہے۔ ان کے ایک بزرگ اسی محلے میں رہتے تھے۔

ولادت: ابن الجوزی کا سال ولادت بھی مختلف فیہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود ابن جوزی کو بھی قطعی طور پر اپنا

سن پیدائش معلوم نہیں تھا۔ اور جب ان سے سال پیدائش کے بارے میں پوچھا جاتا تو وہ مبہم سا جواب دیتے تھے۔ بہر حال وہ 508ھ یا 517ھ کے درمیان پیدا ہوئے تھے۔ ان کا سال پیدائش 510ھ بھی دیا جاتا ہے۔ ابن الجوزی بغداد میں پیدا ہوئے۔ جب ان کی عمر صرف تین سال تھی تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ والدہ اور پھوپھی نے ان کی ابتدائی تربیت کی۔ اور پھر انہیں اس وقت کے مشاہیر علما کی خدمت میں لے گئیں۔

بظاہر فلسفہ اور علم کلام کے علاوہ باقی تمام علوم متداولہ انہوں نے اکابر علما سے حاصل کیے۔ ان کے اساتذہ میں 78 بزرگوں کا نام لیا جاتا ہے۔ جن میں ان کے استاد فقہ ابوبکر الدینوری تھے۔ ادب اور لغت میں بالخصوص انہوں نے ابو منصور الجوالیقی سے اکتساب فیض کیا۔ ابن الجوزی، ایک تیز فہم شخص تھے چنانچہ جب ان کے ایک استاد ابن الزغوانی (م 527) کا انتقال ہوا تو انہوں نے استاد کی مسند وعظ و تذکیر پر متمکن ہونا چاہا، لیکن نوعمری کی وجہ سے یہ شرف انہیں حاصل نہ ہو سکا مگر اس کے بعد جب لوگوں نے ان کے وعظ کا نمونہ دیکھا تو انہیں جامع المنصور میں وعظ کرنے کی اجازت مل گئی۔ اب ابن الجوزی نے اپنی تحصیل علم کی سعی کو پہلے سے تیز کر دیا۔ ان کے نزدیک سب سے بہتر نافلہ عبادت تحصیل علم تھی۔ اس لیے زہد کی طرف چنداں مائل نہ تھے بلکہ کھانے میں بھی ایسی غذائیں کھاتے جو قوت حافظہ کو بہتر بناتی تھیں۔

ابن الجوزی نے اپنے مواعظ کے بدولت، جن میں اس کی فصاحت و بلاغت بڑے عروج پر ہوتی تھی اور اس کے علم نے ان مواعظ کو چار چاند لگا دیئے تھے، بڑی شہرت پائی۔ وہ ابن ھبیرہ کے زمانہ وزارت میں اس کے مقرب اور منظور نظر رہے۔ جب خلیفہ المستنجد باللہ متمکن تخت خلافت ہوئے تو بغداد کے دیگر مشائخ وعلماء کے ساتھ ان کے لیے بھی خلعت فاخرہ بھیجا گیا۔ خلیفہ المقتدر باللہ (566ھ-575ھ) کے عہد میں بھی ان پر خاص عنایات تھیں۔ چنانچہ انہوں نے اس خلیفہ کے نام پر اپنی کتاب المصباح المضئی فی دولۃ مستضی کا نام رکھا۔ پھر 568ء میں مصر کے فاطمی خلفاء کا سلسلہ ختم ہو جانے کے بعد جب مصر میں عباسی خلفاء کے نام پر خطبہ پڑھا جانے لگا تو اس نے ایک کتاب تصنیف کی اور اس کا نام النصر علی مصر رکھا اور اسے خلیفہ کی خدمت میں پیش کیا۔ خلیفہ نے انہیں بہت سے انعامات کے علاوہ باب الدرب میں وعظ کرنے کی اجازت عطا کی۔

ان کے مواعظ اس درجہ پر اثر ہوتے تھے کہ ایک لاکھ سے زائد لوگوں نے ان کے مواعظ کے دوران ان کے ہاتھ پر توبہ کی اور یہود و نصاریٰ کے 20 ہزار آدمی بھی ان کے ہاتھ پر ایمان لائے۔

مجلس وعظ میں اکثر خلیفہ وقت بھی حاضر ہوتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی مجالس وعظ میں ایک لاکھ کا مجمع ہو جاتا تھا اور تقریباً پانچ ہزار سے دس ہزار لوگ تو عموماً ان کے درس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

دور مصائب: جیسا کہ بہت سے ماخذوں میں مذکور ہے کہ آخر عمر میں ابن الجوزی پر بڑی بڑی مصیبتیں پڑیں۔ ان مصائب کی ایک وجہ مورخین نے یہ بتائی ہے کہ ان کے اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے ایک فرزند کے مابین مخالفت ہو گئی تھی، اس لیے کہ ابن جوزی ان کے والد ماجد کو نہ ماننے والوں میں سے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ کچھ اور اثرات بھی کارفرما تھے اور نتیجہ یہ ہوا کہ ابن الجوزی کو شہر واسط میں قید کر دیا گیا۔ اس قید و بند کی صعوبتوں میں انہوں نے پانچ سال گزارے اور آخر 595ھ میں خلیفہ وقت کے حکم پر انہیں رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد آپ رحمۃ اللہ علیہ بغداد تشریف لے آئے۔ اور رمضان 597ھ/1200ء میں مختصر سی علالت کے بعد آپ رحمۃ اللہ علیہ نے وفات پائی۔ آپ کی وفات کا سوگ پورے بغداد میں منایا گیا اور اُس دن بغداد کے تمام بازار بند رہے اور تمام شہر ماتم کدہ بن گیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن الجوزی کی بیشتر اور اہم ترین فعالیت وعظ گوئی تھی۔ وہ اپنے وعظوں میں ہمیشہ اپنے مسلک یعنی مذہب امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی حمایت کرتے تھے۔ اہل بدعت پر آپ اتنی کڑی نکتہ چینی کرتے کہ خود آپ

ہم مسلکوں کو بار ہا فتنے کا خوف ہوا اور انہوں نے آپ کو اس سخت روی سے باز رکھنا چاہا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے امام غزالی کی احیائے علوم دین کو ضعیف احادیث سے پاک کر کے اس کا ایک نیا نسخہ تیار کیا۔

تصنیف وتالیف: تصنیف وتالیف سے ابن جوزی کو غیر معمولی شغف تھا۔ وہ جس روانی سے واعظ کہتے تھے ایسی ہی تیزی سے لکھتے تھے۔ خود کہتے ہیں کہ انہوں نے تین سے زائد کتابیں تصنیف کی تھیں۔ جن میں سے بعض کئی کئی جلدوں پر مشتمل تھیں۔ آپ کی تصانیف میں کتاب صفہ، تلبیس ابلیس، کتاب الاذکیا اور قصاص والمذکرین اہم ہیں۔

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ (1149ء-1209ء)

سربرآوردہ عالم، محقق اور مفسر، صاحب تفسیر کبیر

نام ونسب: ابوعبداللہ محمد بن عمر بن الحسین، اسلام کے مشہورترین علمائے دین ومفسرین میں ایک سربرآوردہ عالمجو معروف امام علم کلام بھی ہیں، شافعی المذہب فقیہ تھے۔

ولادت: 543ھ/1149ء میں ایران کے شہر رے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ضیاء الدین ابوالقاسم رے کے ایک مشہور خطیب تھے۔ اس لیے ان کے بیٹے کا لقب ابن الخطیب ہوگیا۔ مولانا ضیاء الدین ابوالقاسم عم الکلام کے بھی عالم تھے۔ ان کی تصانیف میں "غایۃ المرام" بھی شامل ہے۔ امام فخر الدین رازی کے اساتذہ میں ان کے والد کے علاوہ ان کے استاد فلسفہ مجد الدین الجیلی اور استاد الفقہ حضرت الکمال السمنانی بھی شامل ہیں۔

خوارزم میں: ادب اور علوم دینیہ کی تحصیل سے فراغت اور بقول مورخ ابن خلقان کیمیا میں کسی قدر تحقیقات میں ناکامی کے بعد امام فخر الدین رازی خوارزم گئے، جہاں وہ معتزلہ کے خلاف مناظروں میں مسلسل مشغول رہے، جنہوں نے بالآخر انہیں خوارزم چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا، خوارزم سے ماوراء النہر پہنچے تو وہاں بھی ایسی ہی مخالفت کا سامنا ہوا، چنانچہ اپنے آبائی شہر رے واپس آ کر انہوں نے سلطان شہاب الدین غوری سلطان غزنہ سے تعلقات استوار کیے۔ جس نے ان کا احترام کیا اور ان پر اعزازات اور دولت کی بارش کر دی۔ بعد ازاں سلطان خوارزم، علاؤ الدین خوارزم شاہ محمد بن تکش نے بھی ان کے ساتھ فیاضی کا سلوک کیا۔ اس بادشاہ نے ان کی حد درجہ تکریم کی اور ان کے لیے ایک مدرسہ بھی تعمیر کروایا۔

1184ء میں جب وہ بخارا جا رہے تھے تو اثنائے راہ میں شہر سرخس میں ٹھہرے تو سرخس کے ایک طبیب عبدالرحمٰن بن عبدالکریم نے انہیں اپنے ہاں ٹھہرایا۔ اظہار تشکر کے طور پر انہوں نے بوعلی سینا کی کلیات کی شرح لکھی اور اس کا انتساب طبیب مذکور کے نام کیا۔ بخارا پہنچنے پر انہیں حسب توقع سرپرستی نہ ملی تو وہ ہرات چلے گئے، جہاں غزنہ کے غوری سلطان غیاث الدین نے انہیں شاہی محل میں عوام کے لیے ایک مدرسہ کھولنے کی اجازت دی۔ سمرقند اور ہندوستان اور دیگر مقامات کی سیاحت کے بعد وہ ہرات میں اقامت گزیں ہوگئے۔ ھرات میں انہیں شیخ الاسلام کے لقب سے ملقب کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں ان کی شان وشوکت انتہائی عروج پر تھی چنانچہ اس زمانے میں کسی مقام کا سفر کرتے تو ان کے 300 سے زائد شاگرد اور متبعین ان کے ہمرکاب ہوتے تھے۔

آغاز زندگی میں وہ اتنے تنگدست تھے کہ ایک مرتبہ بخارا میں بیمار پڑے تو اس شہر میں مقیم ان کے ہم وطنوں کو ان کا علاج کرانے کے لیے چندہ جمع کرنا پڑا تھا۔ بعد ازاں وہ بڑی خوش حالی سے بہرہ مند ہوئے۔ انہوں نے اپنے دو بیٹوں کی شادی رے کے ایک مالدار طبیب کی بیٹیوں سے کر دی، اس طبیب کے انتقال کے بعد اس کی دولت سے بھی انہیں وافر حصہ ملا تھا۔

ان کی ذکاوت، ان کے ادراک عقل اور ان کے زبردست حافظے نے انہیں ایک ایسا معلم بنا دیا تھا جسے پورے

وسطی ایشیا میں شہرت نصیب ہوئی۔ چنانچہ ہر جگہ سے لوگ ان کے پاس اپنے مسائل کے حل کے لیے آتے تھے۔ ان کی آواز قوی اور پرجوش تھی، وعظ کرتے وقت وہ خود بھی سر بسر تاثر بن جاتے تھے اور اپنے سامعین کو بھی اس قدر متاثر اور مضطرب کر دیتے تھے کہ ان کے آنسو نکل آتے۔ ان کے مواعظ نے بہت سے کرامیوں کو سنی بنا دیا۔ اہل سنت والجماعت کے اصول و عقائد کو دلائل عقلیہ و براہین صادقہ سے ایسا صحیح و محکم ثابت کر دیا کہ دوسرے فرقوں کے لوگ اپنا مذہب بدلنے پر مجبور ہو گئے۔ فلسفے میں گہری مہارت اور مناظراتی مشغلے کے باوجود وہ حد درجہ متدین تھے بقول ابن الصلاح خود کو فلسفہ اور کلام میں اس قدر انہماک رکھنے پر ملامت کیا کرتے تھے۔ آخر میں انہوں نے اپنی وصیت میں لکھا تھا کہ ”میں نے علم کلام کے تمام طریقوں اور فلسفے کی تمام راہوں کو آزمایا، لیکن میں نے ان سے اطمینان پایا نہ مجھے ان سے سکون قلب حاصل ہوا، یہ دولت مجھے تلاوت قرآن مجید سے حاصل ہوئی۔“

مسلک اہل سنت والجماعت کے دفاع کے لیے الرازی نے غیر معمولی انہماک دکھایا جس کی وجہ سے ان کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے۔ معتزلہ کے علاوہ انہیں کرامیہ سے بھی واسطہ پڑتا تھا۔ کرامیہ تفسیر قرآن میں ”تشبیہ“ کے قائل تھے اور اپنے مخالفین کی تذلیل میں سب و شتم اور بہتان تراشی سے بھی احتراز نہیں کرتے تھے۔ جب 1202ء میں امام رازی فروکوہ میں مقیم تھے تو کرامیہ نے ان کے خلاف باقاعدہ شورش بپا کر دی اور ان پر الزام لگایا کہ وہ اسلام کی تعلیمات پر ارسطو، فارابی اور ابن سینا کے فلسفے کو ترجیح دیتے ہیں جس سے وہ اسلام کی صورت مسخ کرنے کے مرتکب ہیں۔ انہوں نے یہ الزام بھی لگایا کہ وہ مخالف اسلام مواد کا رد کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ مگر یہ سب بے سروپا الزامات ثابت ہوئے۔

الرازی 1209ء میں سخت بیمار پڑے اور موت کی آمد آمد کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے اپنے ایک شاگرد ابراہیم بن ابی بکر کو اپنی وصیت لکھوائی۔ اس وصیت کا متن ابن ابی ابی بکر اور ابن السبکی کی کتب میں محفوظ ہے۔ یہ وصیت ان کے اہل سنت ہونے کا ایک واضح اقرار اور کلی طور پر برضائے الٰہی ہونے کا ایک موثر نمونہ ہے، انہوں نے اپنے شاگردوں کو یہ وصیت بھی کی تھی کہ ان کی تجہیز و تکفین ٹھیک احکام شرعی کے مطابق کی جائے۔

معقولات کا لازمہ بسا اوقات بے دینی اور مذہب کی جانب سے بے اعتقادی و لاپرواہی ہوتی ہے، لیکن الرازی نے ثابت کر دیا کہ شریعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کو کوئی فلسفہ رد نہیں کر سکتا۔ انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ محمد عربی نبی الامی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کی ریتلی اور سنگلاخ زمین کے رہنے والے وحشی بدوؤں کو جس کتاب و حکمت کا سبق دیا اس پر کسی معقول علم کی کوئی قدیم یا جدید برہان غالب نہیں آسکتی۔ بلکہ قرآن مجید میں روحانیت اور معقولات کے دو دریائے ذخار پہلو بہ پہلو جاری ہیں اور اس کا ایک ایک لفظ ایک ایک موج گہر ریز اور ابر گہر بار ہے۔ جو کچھ یہ لکھا گیا اس کی تصدیق امام رازی کی تفسیر، تفسیر کبیر سے بخوبی ہو سکتی ہے۔

امام فخر الدین رازی امت مسلمہ کے ان چند آئمہ کرام میں سے ایک ہیں جنہوں نے اسرار شریعت اور مصالح کتب و سنت کے اظہار میں پوری سرگرمی سے حصہ لیا اور اپنے بعد آنے والوں کے لیے اس راہ پر چلنے کے لیے آسانی پیدا کر دی۔

ہر چند کہ امام رازی الاشعری مکتب فکر کے پکے متبع تھے، لیکن کم از کم اپنی جوانی کی تصنیفات میں وہ نظریہ جوہم فرد (ATOMISM) کے مخالف دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بعد ازاں انہوں نے اپنی رائے بدل دی تھی یا کم از کم نظریہ جوہر فرد کی تنقید میں پہلی سی شدت نہ رہی تھی۔ الرازی نے الاشعری کے مسئلہ صفات باری تعالیٰ پر بھی تنقید کی ہے۔ اس طرح وہ الاشعری پر تنقید کرتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔

الرازی نے دیگر مفکرین کے ساتھ ساتھ الفارابی کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا اور ابن سینا کی اشارات اور عیون الاخبار

کی شرحیں بھی لکھیں تھیں۔ فلسفے کے گہرے علم نے انہیں اس قابل بنادیا تھا کہ وہ مسائل فلسفہ اور مسائل دین میں تطبیق کر سکیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ جو الرازی کے بارے میں سخت رائے رکھتے تھے مگر انہوں نے الرازی کی اہم تصنیفات، المحصل وغیرہ کا مطالعہ کیا اور مسئلہ نبوت پر ان کے بہت سے دلائل کو قابل قبول سمجھا ہے۔

امام النووی رحمۃ اللہ علیہ (1233ء-1277ء)

تیرھویں صدی عیسوی کے ایک جلیل القدر عرب مصنف، شافعی فقیہ عالم

نام ونسب: محی الدین ابوزکریا یحییٰ بن شرف بن موری بن حسن بن حسین بن محمد بن جمعہ بن حزام الحزامی الدمشقی، ایک شافعی فقیہ اور جلیل القدر مصنف،

ولادت: امام نووی ماہ محرم 631ھ/ اکتوبر 1283ء بمقام نوا پیدا ہوئے جو دمشق کے جنوب میں علاقہ جولان میں واقع ہے۔ بچپن ہی سے ان میں قابلیت کے آثار نمایاں دیکھ کر ان کے والد گرامی نے ان کو مدرسہ الرواحیہ دمشق میں لے گئے، جہاں پہلے تو انہوں نے علم طب کا مطالعہ کیا پھر علم دین کی تحصیل کی۔ 651ء میں دمشق کے مدرسہ الحدیث الاشرفیہ میں ابوشامہ کی جگہ پر معلم مقرر ہوئے۔ ابوشامہ کا انہیں دنوں انتقال ہو گیا تھا۔ زمانہ طالب علمی سے وہ انتہائی عسرت سے بسر اوقات کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ انہوں نے معلم کی حیثیت سے تنخواہ قبول کرنے سے انکار کر دیا، ایک عالم اور صاحب عزیمت انسان کے طور پر ان کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ وہ بلا خوف وخطر سلطان بیبرس کے پاس جا پہنچے اور اس سے درخواست کی وہ اہل شام پر عائد کردہ خراج معاف کر دے اور مدرسین کے ساتھ یہ رعائت کرے کہ ان کی آمدنی میں جنگ کی وجہ سے کمی نہ آنے پائے، تاہم ان کی یہ کوشش رائیگاں گئی اور سلطان بیبرس نے امام النووی کو دمشق سے نکال دیا۔ کیونکہ اُنہوں نے اس قسم کے استحصال کے جواز کے فتوئ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ امام النووی کا یہ عظیم کارنامہ سیرت بیبرس میں محفوظ ہے۔ انہوں نے عمر بھر شادی نہیں کی اور بحیثیت مجرد 24 رجب 676ھ/ 221 دسمبر 1277ء کو نوا ہی میں اپنے آبائی گھر میں وفات پائی۔ ان کے مقبرے کا وہاں اب تک احترام کیا جاتا ہے۔ امام نووی کی اعلیٰ شہرت کو بقائے دوام حاصل ہے۔ ان کو علم حدیث پر دسترس حاصل تھی اور ان کے اصول فقہ علمائے متاخرین کی بہ نسبت زیادہ سخت تھے۔ مثال کے طور پر وہ صرف پانچ کتب احادیث کو مستند مانتے تھے اور صرحتاً سنن ابن ماجہ کو مسند امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے مساوی ہونے کا درجہ دیتے تھے۔ صحیح مسلم شریف کے ساتھ شغف رکھنے کے باوجود ان کی نظر میں صحیح بخاری شریف کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ انہوں نے صحیح مسلم شریف کی شرح بھی لکھی تھی جو پانچ جلدوں میں قاہرہ سے طبع ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے صحیح بخاری شریف کے بعض حصوں کی بھی شرح لکھی تھی۔ اس کے علاوہ ابن الصلاح کی علوم الحدیث کا خلاصہ بھی لکھا تھا۔ فقیہ ہونے کے لحاظ سے النوی کی شہرت غالباً اس سے کہیں زیادہ ہے۔ شافعی حلقوں میں ان کی تصنیف ''منہاج الطالبین'' بہت مقبول رہی ہے۔ ان کو الرافعی کے ساتھ سب سے بلند مرتبہ کا حامل امام فقہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ سولہوی صدی میں ان کی تصنیف منہاج الطالبین کی دو شرحیں تحریر کی گئیں جو شافعی فقہ کی چوٹی کی کتب میں شامل ہیں۔ منہاج میں الرافعی کی کتاب محرر کے اقتباسات شامل ہیں۔ اس کتاب کو یہ وقعت اس لیے بھی حاصل ہے کہ الرافعی اور الغزالی کے حوالے سے اس کی اسناد امام الحرمین تک پہنچتی ہیں۔

امام ابن تیمیہ (1263ء-1328ء)

مشہور عرب عالم دین، مصلح، فقیہ اور کثیر التعداد کتابوں کا مصنف

نام و نسب: تقی الدین ابوالعباس احمد بن شہاب الدین عبدالحلیم بن مجد الدین عبدالسلام ابن علی بن عبداللہ بن تیمیہ الحرانی، الحنبلی۔

ولادت: امام ابن تیمیہ دمشق کے قریب حران میں 10 ربیع الاول 661ھ/ 23 جنوری 1263ء کو پیدا ہوئے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان میں پچھلی آٹھ پشتوں سے درس و تدریس کا سلسلہ چلا آتا تھا اور سب لوگ علم و فن میں ممتاز ہو گزرے تھے۔ ابن خلکان نے اپنی تصنیف وفیات میں لکھا ہے کہ اس خاندان میں لکھا ہے کہ اس خاندان میں محمد بن عبداللہ تاتاریوں کے ناجائز مطالبات کے ڈر سے بھاگ کر دمشق میں آباد ہو گئے تھے۔ دمشق میں نوجوان احمد (ابن تیمیہ) نے اپنی توجہ علوم اسلامیہ کی طرف مبذول کی اور ابن عساکر، زینب بنت مکی جیسے عالموں کے درس میں شامل ہوتے رہے۔

مہارت تامہ: ذہبی نے لکھا ہے کہ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن، حدیث اور فقہ میں اور مناظرہ و استدلال میں سن بلوغ میں پہنچنے سے پہلے مہارت تامہ حاصل کر لی تھی اور علمائے کبار میں شمار ہونے لگے تھے۔ تذکرہ ابن قدامہ میں ہے کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے سترہ برس کی عمر میں افتاء و تصنیف کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ ابن کثیر نے بھی اپنی تصنیف النہایہ میں اتنی ہی عمر لکھی ہے۔ ابھی ان کی عمر بیس سال بھی نہ ہوئی تھی کہ انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کر لی اور 681ھ/ 1282ء میں اپنے والد کی وفات کے بعد فقہ حنبلی کے استاد مقرر ہوئے۔ وہ ہر جمعہ کو تفسیر القرآن ایک عالم دین کی حیثیت سے کیا کرتے تھے۔ علوم قرانیہ، حدیث، فقہ اور دیگر علوم دین میں مہارت کی وجہ سے انہوں نے قرون اولی کے مسلمانوں کی مضبوط روایات کی ایسے دلائل و براہین سے حمایت کی جو اگرچہ قرآن و حدیث ہی سے ماخوذ تھے مگر اب تک غیر معروف تھے، تاہم ان کے آزادانہ مناظروں کی وجہ سے دیگر راسخ العقیدہ مذہب کے بہت سے علما ان کے دشمن ہو گئے۔ ان کی عمر ابھی تیس سال نہ ہوئی تھی کہ انہیں قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا گیا، لیکن انہوں نے اس عہدے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

691ھ/ 1292ء میں انہوں نے فریضہ حج ادا کیا۔ ربیع الاول 699ھ/ دسمبر 1299ء میں قاہرہ میں انہوں نے صفات باری تعالیٰ کے متعلق حماۃ سے بھیجے ہوئے ایک سوال کا جواب دیا، جس سے شافعی علماء ان سے ناراض ہو گئے اور رائے عامہ ان کے خلاف ہو گئی اور نتیجتاً انہیں مدرس کے عہدے سے برطرف ہونا پڑا۔ تاہم اسی سال انہیں تاتاریوں کے خلاف جہاد کی تلقین کا کام سپرد کیا گیا اور اس غرض سے وہ آئندہ سال پھر قاہرہ چلے گئے۔ اس حیثیت سے وہ دمشق کے قریب شقحب کی فتح میں شریک تھے جو تاتاریوں کے خلاف حاصل ہوئی تھی۔

دور ابتلا: 1305ء میں وہ شام میں جبک کسروان کے لوگوں سے جنگ کرنے کے بعد (جن میں اسماعیلی، دروزی، نصیری اور دیگر فرقے شامل تھے) وہ 1306ء میں شافعی قاضی کے ہمراہ قاہرہ چلے گئے، جہاں وہ 22 رمضان کو پہنچے۔ اگلے دن ان قاضیوں اور نامور لوگوں کی مجلس نے جنہوں نے ان پر مشتبہ ہونے کا الزام عائد کیا تھا، سلطان کے دربار میں پانچ اجلاس کیے اور اس کے بعد امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے دو بھائیوں، عبداللہ اور عبدالرحیم کو ایک پہاڑی قلعے کے تہہ خانے میں قید کی سزا دی۔ جہاں وہ اگلے ڈیڑھ سال تک قید رہے۔ شوال 707ھ/ 1308ء میں ایک کتاب کے سلسلے میں جو انہوں نے فرقہ اتحادیہ کے خلاف لکھی تھی، ان سے باز پرس ہوئی لیکن جو دلائل انہوں نے اپنی صفائی پیش کیے ان سے ان کے دشمن یکسر لاجواب ہو گئے اور انہیں ڈاک کے ہمراہ دمشق واپس بھیجا گیا، لیکن ابھی انہوں نے اپنے سفر کی پہلی منزل طے کی تھی

کی انہیں واپس آنے پر مجبور کر دیا گیا اور محض سیاسی وجوہات کی بنا پر قاضی کے قید خانے میں 18 شوال 707 یعنی اگلے ڈیڑھ برس تک محبوس رکھا گیا۔ یہ زمانہ انہوں نے قیدیوں کو اصول اسلام سکھانے میں گزارا۔ پھر چند دنوں کی آزادی کے بعد انہیں اسکندریہ کے قلعے (برج) میں مزید آٹھ ماہ کے لیے قید کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہ قاہرہ واپس آئے یہاں اس کے باوجود کہ انہوں نے سلطان الناصر کو اپنے دشمنوں سے بدلہ لینے کے جواز کا فتویٰ دینے سے انکار کر دیا تھا، انہیں اس مدرسے میں جو اسی سلطان نے تعمیر کرایا تھا مدرس مقرر کر دیا گیا۔

ذوالقعدہ 712ھ/ فروری 1312ء میں انہیں اس فوج کے ساتھ جانے کی اجازت دی گئی جو شام جا رہی تھی، چنانچہ بیت المقدس سے ہوتے ہوئے یہاں پہنچ کر انہوں نے پھر مدرس کی جگہ سنبھال لی، لیکن جمادی الآخر 718ھ/ اگست 1318ء میں بقول ابن حجر انہیں شاہی حکم سے طلاق کی قسم، (طلاق بالیمین، یعنی یہ کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو مثلاً کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی صورت میں طلاق دینے کی قسم کھالے) کے متعلق فتویٰ دینے سے منع کر دیا گیا۔ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس میں انہوں نے اپنی طرف سے بہت سی رعایتیں دے رکھی تھیں۔ جنہیں دوسرے تین سنی مذاہب کے فقہا تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اسی حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کی بنا پر انہیں رجب 720ھ/ اگست 1320ء میں دمشق کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ پانچ ماہ اور اٹھارہ دن کے بعد سلطان کے حکم سے انہیں اس قید سے رہائی ملی۔ وہ ایک مرتبہ پھر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ یہاں تک کہ ان کے دشمنوں کو ان کے اس فتوے کا علم ہو گیا۔ جو انہوں نے دس سال پہلے اولیاء اور انبیاء کرام کے مزاروں پر جانے کے متعلق دیا تھا (710ھ/ 1310ء) چنانچہ شعبان 726ھ جولائی 1326ء میں انہیں سلطان کے حکم پر دمشق کے قلعے میں پھر نظر بند کر دیا گیا۔ جہاں انہیں ایک الگ حجرے میں رکھا گیا۔ ان کے بھائی شرف الدین عبدالرحمٰن پر اگرچہ کوئی جرم نہ تھا لیکن وہ اپنی خوشی سے بھائی کے ساتھ ہو لیے۔ جہاں 14 جمادی الاولیٰ کو ان کا انتقال ہو گیا۔ قید خانے میں حضرت امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے بھائی کی رفاقت میں قرآن مجید کی تفسیر اور اپنے بدنام کنندگان کے خلاف رسائل اور ان تمام مسائل پر مستقل کتابیں لکھنے میں مشغول ہو گئے جن کی وجہ سے وہ قید کیے گئے تھے، لیکن جب ان کے دشمنوں کو ان کی ان تصانیف کا علم ہوا تو انہیں ان کی کتابوں، کاغذ اور روشنائی سے محروم کر دیا گیا۔ جس سے انہیں شدید ترین دھچکا پہنچا۔ انہوں نے نماز اور تلاوت قرآن سے تسکین خاطر چاہی، لیکن اس علمی نقصان کے صرف بیس یوم بعد ہی وہ 20 ذوالقعدہ 728ھ/ 27 ستمبر 1328ء کو انتقال کر گئے۔ آئمۃ المحدثین شیخ یوسف المزنی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے انہیں غسل دیا اور ان کے بھائی امام شرف الدین عبداللہ کے پہلو میں مقابر صوفیاء میں عصر سے کچھ قبل دفن کر دیا گیا۔ اس دن دمشق کی دوکانیں ان کے سوگ میں بند رہیں۔ ان کا جنازہ بھی بڑی دھوم دھام سے اٹھا اور اندازہ ہے کہ صوفی قبرستان تک تقریباً دو لاکھ مرد اور پندرہ ہزار خواتین اس میں شریک تھیں۔

نماز جنازہ 4 مقامات پر ادا کی گئی، پہلے قلعے میں پھر جامع اموی دمشق میں، تیسری بار شہر سے باہر ایک وسیع میدان میں، آخری بار نماز چند مخصوص اراکین دولت نے ادا کی۔ بزاز نے لکھا ہے کہ دنیائے عرب میں کوئی ایسا شہر نہیں تھا جہاں امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کی خبر پہنچی ہو اور وہاں ان کی نماز جنازہ غائبانہ ادا نہ کی گئی ہو، قبرستان صوفیہ میں آج بھی امام صاحب کی قبر مرجع خلائق ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے پیرو تھے، مگر وہ ان کی بھی کورانہ تقلید نہیں کرتے تھے، بلکہ اپنے آپ کو مجتہد فی المذہب سمجھتے تھے۔ امام صاحب کے ایک سوانح نگار مرعی نے اپنی کتاب الکواکب میں لکھا ہے کہ چند مسائل میں امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید بلکہ اجماع کو بھی تسلیم نہیں کیا۔ اپنی بیشتر

تصانیف میں وہ قرآن وحدیث کے احکام کی لفظی پیروی کرتے تھے، لیکن اختلافی مسائل پر بحث کرتے ہوئے وہ قیاس کے استعمال کو ناجائز سمجھتے تھے چنانچہ انہوں نے ایک مکمل رسالہ اس طریق استدلال کے لیے وقف کردیا ہے۔

امام صاحب بدعت کے سخت دشمن تھے۔ انہوں نے اولیاء پرستی اور مزارات کی زیارت کی شدید مذمت کی ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ "صرف تین مسجدوں کی زیارت کے لیے سفر اختیار کرو، مسجد الحرام، بیت المقدس اور مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم شریف۔ امام صاحب نے یہاں تک لکھا ہے کہ کوئی شخص محض اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضے کی زیارت کے لیے سفر اختیار کرے تو یہ بھی ایک ناجائز فعل ہوگا (ابن حجر الہیتمی) اس کے برعکس الشعبی اور ابراہیم نخعی کی رائے کا تتبع کرتے ہوئے ان کے نزدیک کسی مسلمان کے مزار پر جانا صرف اس صورت میں گناہ ہوگا جب اس کے لیے سفر اختیار کرنا اور کسی معینہ دن جانا پڑے ان پابندیوں کے ساتھ وہ زیارت قبور کو ایک رواجی فریضہ سمجھتے تھے۔

ابن تیمیہ کے نزدیک شاعری وجہ فضیلت نہ تھی اور نہ شعر وشاعری سے انہیں کوئی تعلق تھا۔ تاہم انہوں نے کچھ اشعار بھی کہے ہیں۔ امام تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ قرآن وحدیث کی ان عبادات کی لفظی تفسیر کرتے تھے جو باری تعالیٰ کے متعلق ہیں۔ اپنی تحریر وتقریر دونوں طریقوں سے بلکہ بالسیف بھی متعدد اسلامی فرقوں، معتزلہ، کرامیہ، جہمیہ اور اشعریہ سے ٹکرلی۔ وہ اسلام کے صاحب سیف وقلم فقہا اور عالموں میں سے ایک تھے۔

امام ابن قیم جوزیہ (1291ء-1350ء)

ابن تیمیہ کے خاص شاگرد اور نامور عالم، فقیہ، مفسر ومحدث، مصنف زاد المعاد

نام ونسب: شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن ابی بکر بن ایوب بن سعد الزرعی، ان کے والد دمشق کے مدرسہ جوزیہ کے قیم (مہتمم) تھے۔ اسی بنا پر ابتداء میں انہیں ابن قیم جوزیہ کہا جاتا تھا۔ بعدازاں صرف ابن القیم کے نام سے مشہور ہوئے۔

ولادت وتعلیم: آپ 691ھ/ 1291ء میں دمشق میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ابوبکر بن ایوب علم الفرائض کے ماہر تھے جو انہوں نے اپنے والد سے سیکھا اور اپنے دور کے مشہور شیوخ اور اساتذہ سے جمیع اصناف علوم وفنون کی تحصیل کی 712ھ/ 1312ء میں جب امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ مصر سے مراجعت کر کے دمشق میں مقیم ہوئے تو قیم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور 728ھ/ 1328ء تک جب تک ابن تیمیہ نے وفات پائی متواتر ان کے پاس رہے اور ایک لمحے کے لیے بھی ان کی رفاقت نہیں چھوڑی۔

ابن تیمیہ کا رنگ: یہ اس طویل صحبت کا اثر تھا کہ ابن تیمیہ کا رنگ ان پر غالب آ گیا تھا اور وہ صحیح طور پر ابن تیمیہ کے جانشین ثابت ہوئے اور ابن تیمیہ کی وفات کے بعد ان کی کتابوں بلکہ نظریات کی نشر واشاعت ان کی بدولت ہوئی۔ مسئلہ زیارت قبور اور مسئلہ طلاق ثلاثہ میں امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے جمہور علماء کے خلاف تھی۔ امام ابن قیم ان مسائل میں اپنے استاد ابن تیمیہ کے ہم نوا تھے۔ علمائے وقت نے ان مسائل کی بنا پر کئی دفعہ ان کے خلاف بھی ہنگامے کھڑے کیے اور کئی مرتبہ انہیں بھی اپنے استاد کی طرح ہی محبوس ہونا پڑا۔ سب سے آخری بار جب ابن تیمیہ کو دمشق کے قلعے میں قید کیا گیا تو امام ابن قیم بھی ان کے ہمراہ تھے۔ چونکہ وہ ابن تیمیہ کے خاص الخاص شاگرد تھے، اس لیے انہیں خاص طور پر نشانہ ستم بنایا گیا اور اونٹ پر سوار کر کے سارے شہر میں پھرایا گیا اور بعدازاں قلعہ دمشق میں امام ابن تیمیہ سے الگ کر کے قید کر دیا گیا۔ ابن تیمیہ کی وفات کے بعد انہیں قید سے رہائی ملی، لیکن ابن تیمیہ کے مسلک کی تائید وحمایت کی وجہ سے انہیں دوبارہ پہلی سی قید وبند کی

صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔

ابن قیم تقلید شخصی کے خلاف تھے۔ بہرحال ان مسائل میں ان کا میلان اپنے استاد کی طرح ہی امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی طرف تھا اور اصول وقواعد میں بھی حنبلی تھے، لیکن فروع میں آزاد تھے۔ اپنے استاد ہی کی طرح وہ اس دور کے دیگر مسلم فرقوں، فلسفیوں، معتزلہ، جہمیہ، حشویوں اور وحدت الوجودیوں کے خلاف تھے اور علم کلام، عقائد اور تصوف کے مسائل میں سلف وصالحین کے نقطہ نظر کے حامی تھے۔ وہ بدعات کو ناپسند کرتے تھے اور مسلمانوں کو ابتدائی دور کے سادہ اسلام کی طرف لے جانا چاہتے تھے۔ عیسائیوں اور یہودیوں کے عقائد باطلہ کی تردید میں بھی انہوں نے متعدد کتابیں تحریر کیں۔

امام ابن القیم نے 60 برس کی عمر میں بروز جمعرات 13 رجب 751ھ/ 350ء کو بوقت اذان نماز عشاء وفات پائی۔ ان کی نماز جنازہ آئندہ اور بعد از نماز ظہر ادا کی گئی اور انہیں ان کے والد کے پاس دمشق میں باب الصغیر کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

تصانیف: امام ابن قیم نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے بیشتر دستبرد زمانہ کے باعث نادر الوجود ہو چکی ہیں۔ عبدالحیٔ ابن الحماد نے اپنی ایک تصنیف ”شذرات الذہب“ میں ان کی تصانیف کی جو فہرست دی ہے اس میں ان کی تصانیف کی تعداد 45 کے قریب ہے۔ جن میں سے چند یہ ہیں

(1) مصائد الشیطان

(2) زاد المعاد فی ھدی خیر العباد۔ اس کتاب کا ترجمہ رئیس احمد جعفری صاحب نے کیا تھا۔

(3) ھدی الرسول کا بھی اردو ترجمہ ہوا ہے۔ اس کا نام اسوہ حسنہ تھا اور یہ عبدالرزاق ملیح آبادی نے کیا تھا۔ بہرحال ان کی کچھ اور تصانیف کے بھی اردو ترجمے ہو چکے ہیں۔

امام سراج الدین شبلی رحمۃ اللہ علیہ (1314ء-1371ء)

ایک مشہور ومعروف فقیہ اور مصنف ”التوشیح“ وغیرہ

نام ونسب: الشبلی سراج الدین ابوحفص عمر بن اسحٰق بن احمد الغزنوی الدولت آبادی الھندی الحنفی، مشہور ومعروف فقیہ۔ وہ تقریباً (714ھ 1314ء) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے علم فقہ کی تحصیل ابوالقاسم التنوخی کے شاگردوں وجیہ الدین الدہلوی الرازی، شمس الدین الدولی الخطیب اور دیگر اساتذہ سے کی 740ھ میں وہ مصر گئے اور جمال الدین الترکمانی کے نائب ہونے کی حیثیت سے حاکم بن گئے۔ بعد از ا زلبوغا کے اثر ورسوخ سے وہ قاضی العسکر کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

• شعبان 769ء میں الترکمانی کی وفات کے بعد وہ مصر کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے اور اپنی وفات تک اس عہدے پر فائز رہے۔

امام سراج الدین شبلی میں تصوف کی طرف میلانات بھی موجود تھے۔ مکہ المکرمہ میں قیام کے دوران ان کا زیادہ میل جول خضر سے رہا اور بعد میں وہ ابن الفارض کے پیرو ہو گئے۔

ان کی معروف تالیفات وتصنیفات یہ ہیں ”التوشیح“، المرغینائی کی البدایہ کی شرح، الشامل فی الفقہ، جس میں فروع سے بحث کی گئی ہے، زبدۃ الاحکام فی اختلاف الائمۃ الاعلام، الساعاتی کی بدیع النظام فی اصول فقہ کی شرح، الخبازی کی المغنی فی الاصول کی شرح، الشیبانی الزیادات کی شرح، اپنی کتاب الجامع الکبیر کی نامکمل شرح وغیرہ۔

انہوں نے 7 رجب 773ھ/ 1371ء میں وفات پائی۔

امام سخاوی (1428ء-1497ء)

ایک مشہور عالم دین، فقیہ اور مصنف ''الضوع اللامع''

نام ونسب: شمس الدین ابوالخیر محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی بکر بن عثمان السخاوی۔

ولادت: 831ھ/1428ء میں بمقام قاہرہ پیدا ہوئے۔ اپنے آبائی وطن سخا (قریہ مصر) کی نسبت سے السخاوی کہلائے۔ مسلک کے اعتبار سے شافعی تھے۔

تعلیم وتربیت: بچپن میں قرآن مجید حفظ کرلیا تھا۔ اسلامی علوم میں بڑا رسوخ حاصل کیا۔ بقول ابن العماد، السخاوی نے فقہ، قرات، حدیث، تاریخ، علم فرائض وحساب، تفسیر، اصول فقہ اور میقات میں دسترس حاصل کی۔ چارسو سے زائد علماء سے تحصیل علم کیا وار علم کے حصول کے لیے 80 سے زائد اسلامی شہروں کا سفر اختیار کیا۔ السخاوی کے اساتذہ میں علی بن حضر الجمال، ابن ہشام الحنبلی، ابن الہمام اور ابن حجر جیسے جید علما شامل تھے۔

شہرت: امام السخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ وحدیث اور تراجم الرجال میں بری شہرت پائی اور بالخصوص حفظ حدیث میں یگانہ روزگار اور یکتائے زماں قرار پائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور السخاوی کے درمیان روایت کے دس واسطے ہیں اور بعض طریق سے سات اور آٹھ۔

حازم مکہ: السخاوی نے اپنی زندگی میں کئی مرتبہ حج کیا۔ ابن حجر کی وفات کے بعد حج کو گئے تو حرمین کے علماو مشائخ، بالخصوص ابن فہد مکی، برہان الزمزمی وغیرہ کے درسوں میں شامل رہے۔ 870ھ/1465ء میں عازم مکہ ہوئے تو وہاں پہنچ کر مسجد الحرام میں درس واملاء کا سلسلہ شروع کردیا۔ واپسی پر یہ سلسلہ درس وتدریس قاہرہ میں جاری رہا۔ السخاوی نے مختلف اوقات میں مختلف مدارس میں خدمات انجام دیں۔ دارالحدیث کاملیہ میں استاذ الکمال کی وفات کے بعد السخاوی درس حدیث دیتے رہے۔ مدرسہ الظاہریہ القدیمہ سے بھی معلم حدیث رہے۔ الامین الاقصرائی کے بعد صرغتمشیہ میں تدریس حدیث کا کام تفویض ہوا۔ بہا المشہدی کی وفات کے بعد مدرسہ برقوقیہ میں حدیث پڑھاتے رہے۔ شیخ المناوی نے مدرسہ فاضلیہ میں درس حدیث کے لیے السخاوی کو منتخب کیا۔ جب امیر شکیب الفیہ ددادار مکہ گئے تو اپنی غیر حاضری میں مدرسہ منکوتمریہ میں تدریس حدیث کے فرائض السخاوی کے سپرد کرگئے۔ 1480ء میں السخاوی ایک بار پھر حج کو گئے مگر مکہ میں کئی سال کے قیام کے باوجود مجالس املاء کا انعقاد نہ کیا۔ البتہ مدینہ منورہ میں خاص جماعت کے لیے مجالس املا منعقد کیں۔ بالآخر 16 شعبان 902ھ/اپریل 1497ء میں مدینہ منورہ ہی میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

امام السخاوی کا دائرہ تصانیف بڑا وسیع ہے۔ تاریخ وسیرت، علوم حدیث اور مسائل پر ان کی تالیفات کی تعداد 90 بتائی جاتی ہے۔ فن حدیث میں شرح التقریب النووی، بلوغ الامل بتلخیص کتاب الدارقطنی فی العلل، اقرب الوسائل بشرح الشمائل النبویہ للترمذی وغیرہ۔

السخاوی کو سفرنامے اور مشاہیر کے تراجم لکھنے کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ انہوں نے الرحلۃ الاسکندریہ وتراجمہا، الرحلۃ الحلبیہ، وتراجمہا اور دیگر کئی کتب لکھیں۔ اس کے علاوہ کئی اصحاب علم وفضل کے حالات انفرادی طور پر قلمبند کیے مثلاً الجواہر والدرر فی ترجمۃ الشیخ الاسلام ابن حجر، الاہتمام بترجمۃ الکمال ابن اہمام القول المنبی فی ترجمہ ابن عبری اور عمدۃ الناس فی مناقب سیدنا العباس کے علاوہ اپنے خودنوشت، سوانح ارشاد الاوی باسعاد الطالب والراوی للاعلام بترجمۃ السخاوی بھی قلمبند کیے۔ اس کے علاوہ نویں صدی ہجری کے مشاہیر عالم اسلام کے تراجم وحالات الضوع اللامع لاہل القرآن التاسع میں محفوظ

کر دیئے۔ یہ کام بارہ جلدوں میں ہے۔

الشیخ امام محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ (1703ء-1792ء)

نجد کے مشہور عالم، مصلح، مصنف اور واعظ تبلیغ توحید اور ردِ بدعات کی تحریک کے بانی

نام ونسب: شیخ محمد بن عبدالوہاب، نجد کے مشہور عالم دین اور مصلح: عینیہ کے قبیلہ بنوتمیم میں 1115ھ/1703ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا قبیلہ بنوتمیم علم وفضل اور دنیوی وجاہت کے اعتبار سے پورے نجد میں مشہور تھا۔ شیخ کے مقام پیدائش عینیہ کو شیخ محمد بن عبدالوہاب کی وجہ سے بلد الشیخ'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ شجرہ نسب کچھ یوں ہے شیخ محمد بن عبدالوہاب بن سلیمان بن علی۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب کی شہرت سے پہلے یہ خاندان آل مشرف کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اب اسے ''آل شیخ'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ شیخ کے والد عبدالوہاب عینیہ کے قاضی القضاۃ تھے، اور بعدازاں حریملا منتقل ہوگئے۔ ان کے دادا سلیمان بن علی اپنے دور کے نامور عالم اور علمائے نجد کے مرجع تھے۔ شیخ صاحب ابھی دس سال کی عمر کو پہنچے تھے کہ قرآن مجید حفظ کرلیا اور اپنے والد سے فقہ حنبلی کی بنیادی کتب پڑھ لیں۔ مزید یہ کہ تفسیر وحدیث کی بیشتر کتابوں کا مطالعہ کیا، اسی عمر میں انہوں نے فریضہ حج بھی ادا کیا اور دو ماہ تک مدینے میں مقیم رہنے کے بعد واپس عینیہ آگئے۔

1135ھ میں جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو مزید حصول علم کے لیے حجاز چلے گئے اور کئی علمائے کرام سے مثلاً شیخ عبداللہ بن ابراہیم بن سیف نجدی مدنی، شیخ محمد حیات سندھی اور شام کے ممتاز عالم شیخ علی داغستانی وغیرھم سے تحصیل علم کی۔

رد بدعات کا آغاز: 1139ھ/1726ء میں ان کے والد کے عینیہ سے منتقل ہونے کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو تبلیغ توحید اور رد بدعات کے لیے وقف کر دینے کا فیلہ کیا۔ چنانچہ حریملا سے درس وتدریس اور وعظ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان کے مواعظ نہایت پر اثر ہوتے تھے۔ ان کی تصنیف ''کتاب التوحید'' اُسی زمانے کی یادگار ہے۔

1740ء میں شیخ صاحب کے والد کے انتقال کے بعد وہ دعوت وتبلیغ میں پوری طرح مصروف ہوگئے۔ ان دنوں نجد میں قبائلی نظام رائج تھا۔ مختلف علاقے، مختلف قبائلی سرداروں کے زیر نگین تھے۔ خود حریملا میں دو قبیلے سرداری کے لیے پنجہ کش تھے۔ اس وجہ سے انہوں نے اپنی تبلیغ کو مزید موثر بنانے کے لیے ضروری سمجھا کہ اہل نجد کے باہمی اختلاف کو ختم کرائیں اور اس کو قبائلی نظام کی بجائے ایک امیر کی سرکردگی میں لانے کی کوشش کریں۔ اس کے لیے انہوں نے امیر عینیہ سے خط وکتابت کی۔ اس نے ان کی یہ تجویز قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی تو شیخ صاحب 1744ء میں عینیہ چلے گئے، امیر عینیہ نے بڑی گرم جوشی سے ان کا خیر مقدم کیا اور وہ بڑے احترام سے پیش آیا مزید براں اس نے اپنی ایک بھتیجی ان کے عقد میں دے دی۔ جس کی وجہ سے دونوں خاندانوں میں تعلقات مزید مستحکم ہوگئے۔ امیر عینیہ، عثمان بن محمد نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں شیخ صاحب سے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ شیخ نے امیر کو نماز باجماعت ادا کرنے کی تلقین کی اور اس کی پابندی نہ کرنے والوں کے لیے سزائیں تجویز کیں، حکام کی طرف سے جو مختلف قسم کے ٹیکس وصول کیے جاتے تھے وہ ختم کردئے گئے اور صرف ادائے زکوۃ کو باقی رکھا گیا۔

شیخ نے اس زمانے میں کچھ تبلیغی رسائل بھی تصنیف کیے، لیکن بالآخر شیخ کو عینیہ کی سکونت ترک کرنا پڑی اور قبائل میں سیاسی بے چینی پیدا ہوگئی۔ 1177یا1158ء میں شیخ نے وہاں سے درعیہ کا رخ کیا۔ درعیہ میں آل سعود حکمران تھے۔ آل سعود اور شیخ صاحب میں یہ پہلا رابطہ تھا جو استوار ہوا اور اس میں روز بروز مضبوطی پیدا ہوتی چلی گئی جس نے

آل سعود اور آل شیخ کو ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے منسلک اور وابستہ کر دیا۔

درعیہ میں وہ اپنے ایک شاگرد احمد بن سویلم کے ہاں اقامت گزیں تھے۔ یہ مکان آہستہ آہستہ دعوت توحید کا مرکز بنتا چلا گیا۔ لوگ اعلانیہ اور خفیہ آئے اور شیخ صاحب کے علم سے مستفید ہوئے، لیکن یہ صورتحال کچھ اطمینان بخش نہیں تھی۔ درعیہ کو مستقل طور پر مرکز تبلیغ بنانے کے لیے شیخ محمد بن عبدالوہاب امیر محمد بن سعود سے براہ راست بات چیت کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں امیر کے بھائیوں اور اس کی ایک بیوی مرضیٰ بنت ابی دمطان نے اہم کردار ادا کیا۔

امیر محمد بن سعود جو پہلے ہی سے نیکی اور حسن اخلاق کا حامل تھا، اپنی بیوی کی گفتگو سے متاثر ہوا اور اس کے دل میں شیخ کی عظمت بیٹھ گئی۔ بعد ازاں شیخ نے بالمشافہ گفتگو کر کے امیر کے سامنے اپنا نصب العین بیان کیا۔ امیر اس سے بے حد متاثر ہوا اور اس نے ساتھ دینے کا عہد کیا۔ اس کے بعد امیر نے شیخ کے ہاتھ پر بیعت کی اور، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور کتاب و سنت پر عمل پیرا ہونے کا یقین دلایا۔ یہ 1157ء/1745ء کا واقعہ ہے۔

اس کے ساتھ ہی قبائل میں یہ دعوت عام ہو گئی اور لوگ بیعت اور استفادے کے لیے شیخ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ جن میں اس وقت کے نامور لوگ بھی شامل تھے۔

جو لوگ حکومتی خاندان سے شیخ صاحب کی بیعت ہوئے ان میں امیر اور امیر کے تین بھائی، مشاری، ثنیان اور عیسیٰ بن قاسم اور دیگر امراء شامل تھے۔

درعیہ اور اس کے اطراف میں شیخ کی مقبولیت دیکھ کر حاکم عینیہ عثمان بن محمد اپنے گزشتہ طرز عمل پر جو اس نے شیخ کے ساتھ روا رکھا تھا بے حد شرمندہ ہوا اور شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر طالب عفو و درگذر ہوا اور اپنے ساتھ عینیہ چلنے کی درخواست کی مگر شیخ نے اسے بلطائف و دلیل ٹال دیا۔

امیر درعیہ محمد بن سعود کی شیخ سے اتنی عقیدت بڑھی کہ وہ زکوٰۃ اور دیگر ذرائع سے حاصل ہونے والی رقوم شیخ کے حوالے کر دیتا اور شیخ اسے راہ خدا میں خرچ کرتے تھے، امیر محمد کے بعد اس کے جانشین عبدالعزیز بن محمد بن سعود منصب امارت پر فائز ہوئے تو شیخ صاحب کا احترام کا جذبہ قائم رہا اور وہ بھی ان کی اجازت کے بغیر کچھ خرچ نہیں کرتے تھے۔

اب شیخ کی دعوت کا سلسلہ وسیع تر ہو گیا اور ان کی آواز نجد کی حدود سے نکل کر یمن اور دیگر مقامات تک پہنچ گئی۔ گرد و نواح کے اہل علم ان کے حلقۂ دعوت میں شریک ہونے لگے۔ ان میں یمن کے شہر صنعا کے ممتاز عالم و مجتہد امیر محمد بن اسماعیل (م 1182ھ) خصوصاً قابل ذکر تھے۔

ریاض کا حاکم دہام بن دواس شیخ اور ان کے مشن کا مخالف تھا۔ 1187ء میں درعیہ کے امیر عبدالعزیز محمد نے ریاض پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا اور اس طرح پورے نجد پر آل سعود کی حکومت قائم ہو گئی۔ مقبولیت کے ساتھ ساتھ شیخ اور اس کی تحریک کی مخالفت بھی زیادہ ہوتی چلی گئی اور مخالفین ان کی رد بدعت اور تحریک احیائے سنت کو غلط رنگ اور غلط نام دینے لگے۔ انہیں مخالفین نے شیخ صاحب کی اس تحریک کو وہابیت کا نام دیا جو بہت مقبول ہوا۔ جب وہابیت کے اثرات بڑھے تو 1818ء میں ابراہیم پاشا نے درعیہ پر حملہ کر کے جو اس تحریک کا مرکز تھا تباہ کر دیا۔ خود شیخ کی شخصیت مخصوص عقائد اور افکار کی وجہ سے متنازعہ رہی، تاہم ان کے حامی کہتے ہیں کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب عقاید و اعمال میں سلف کے پیروکار تھے۔ حدیث پر انہیں اصرار تھا۔ فقہ میں وہ امام احمد بن حنبل کے پیروکار تھے مگر ساتھ ہی مسلک حنابلہ کے خلاف بھی تھے۔ اور اس مسلک کے خلاف کوئی حدیث مل جاتی تو اس پر عمل کرتے تھے۔ صفات باری تعالیٰ میں وہ مسلک سلف کے حامی تھے اور قرآن مجید اور احادیث صحیحہ میں جو صفات باری بیان ہوئیں ہیں انہیں حرف بحرف صحیح تسلیم کرتے تھے اور ان میں تاویل کے بالکل قائل نہ

تھے۔فروع میں ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ شافعی کو صحیح طور سے شافعی اور حنفی کو صحیح طور پر حنفی بننے میں اور اپنے امام کے اصلی مسلک پر قائم رہنے اور اس کی پابندی کرنے کی دعوت دی جاتی۔ان کے حامیوں کے مطابق امام محمد بن عبدالوہاب امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم اور ان کی کتابوں سے قلبی تعلق رکھتے تھے۔

شیخ صاحب نے مسلسل پچاس برس دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دیا اور باختلاف روایت جون یا جولائی 1792ء میں وفات پائی۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب کی تحریک، وہابیت بنیادی طور پر ایک اصلاحی اور ابلاغی تحریک تھی، جس نے آگے چل کر کچھ سیاسی رنگ بھی اختیار کیا تھا۔اساسی طور پر اس کا مقصد عرب معاشرے کی اصلاح اور بدعات کا خاتمہ تھا، تاہم ضرورت کے تحت امام صاحب کو اپنی طبیعت کی شدت پسندی کی وجہ سے تشدد کا سہارا بھی لینا پڑا جس کی وجہ سے اس کی مخالفت بھی بڑی شدید ہوئی۔یہ تحریک بعدازاں نجد وعرب سے نکل کر دوسرے ممالک میں بھی اثر پذیر ہوئی۔خصوصاً برصغیر پاک وہند میں اس نے سیاسی کردار بھی ادا کیا۔یہاں اس کے معتقد خود کو اہل حدیث کہلاتے ہیں، تاہم برصغیر میں ان کو ''وہابی'' کہہ کر مخالفین نے ان کی شدید مخالفت کی اور کتابیں اور رسالے بھی تصنیف کیے گئے۔

ماخذ، محمود شکر آلوسی، تاریخ نجد، مسعود عالم ندوی، محمد بن عبدالوہاب سید سلیمان ندوی، سلاطین نجد کا مذہب، سلامن بن سحمان نجدی، الہدیہ السنیہ

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (1703ء-1762ء)

ہندوستان کے نامور عالم، محدث، فقیہ، مجتہد اور کثیر التعداد کتابوں کے مصنف

نام ونسب: ولی اللہ ابوالفیاض، قطب الدین احمد بن ابوالفیض شاہ عبدالرحیم بن شاہ وجیہ الدین بن معظم العمری الدہلوی۔آپ کا شجرہ نسب 29 واسطوں سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے جبکہ والدہ کی طرف سے حضرت موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ سے جاملتا ہے۔

ولادت وتعلیم: ان کی پیدائش سے پہلے شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ (والد) کو اشارہ ہوا تھا کہ مولود کا نام قطب الدین احمد رکھنا۔ولادت پر والد نے قطب الدین احمد کے علاوہ ولی کو بھی ان کے نام کا جز بنایا، لیکن قطب الدین نام مشہور نہ ہوسکا۔تاریخی نام عظیم الدین ٹھہرا۔آپ رحمۃ اللہ علیہ فروری 1703ء میں بوقت طلوع آفتاب موضع پھلت، ضلع مظفر نگر (بھارت) میں پیدا ہوئے۔

پانچویں سال مکتب میں بٹھادیا گیا۔سات سال کی عمر میں والد نے نماز روزہ شروع کرایا۔اسی سال کے آخر میں قرآن مجید حفظ کرلیا اور عربی اور فارسی کی تعلیم شروع کردی۔دس سال کی عمر میں شرح ملا جامی بھی پڑھ لی اور مطالعہ کتب کی عادت پڑگئی۔چودہ سال کی عمر میں شادی کردی گئی۔اس کے ایک سال بعد والد سے بیعت سلوک کی اور صوفیہ خصوصاً مشائخ نقشبند کے اشغال میں مشغول ہوگئے، اور اس سلسلے میں تعلیم اور آداب طریقت سے تعلق پیدا کرلیا۔قرآن مجید کا مادہ سادہ سا ترجمہ اپنے والد سے پڑھا اور اس پر غور وفکر کا طریقہ سیکھا۔والد شروع ہی سے ان کی راہنمائی کرتے رہے۔ایک مرتبہ جب دوستوں کے ہمراہ باغ کی سیر کے لیے گئے تو واپسی پر والد نے پوچھا ''کیا کوئی ایسی چیز حاصل ہوئی جو تجھ سے بطور یادگار باقی رہے۔اسی دوران تفسیر وحدیث، فقہ اور اصول فقہ، علم کلام، علم معانی، علم منطق وفلسفہ اور تصوف مطب وغیرہ کی تحصیل سے فارغ ہوکر باقاعدہ طور پر استاد حاصل کیں۔

جب آپ سترہ سال کے ہوئے تو آپ کے والد کا انتقال ہو گیا، ان کے بعد تقریباً بارہ سال دہلی میں درس دیتے رہے۔ 1730ء میں حج کے لیے حجاز تشریف لے گئے۔ ادائے فریضہ حج کے بعد تقریباً 14 مہینے حرمین میں رہے اور مشائخ حرمین سے کتب حدیث پڑھیں اور فقہ حنفی کی کتب کا مطالعہ بھی کیا۔

رجب 1145ھ/ دسمبر 1732ء میں واپس دہلی پہنچے اور اپنے والد کی درس گاہ واقع کوٹلہ فیروز شاہ میں درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔ حدیث پڑھنے اور پڑھانے کے بعد مراقبہ کرتے اور جو کچھ قلب پر منکشف ہوتا قلم بند کر لیتے تھے۔ آپ سے تحصیل علم کرنے والوں کی تعداد میں جب اضافہ ہوا تو درس گاہ رحیمیہ ناکافی ثابت ہوئی، تو محمد شاہ بادشاہ ہند نے کوچہ جیلان میں ایک عالی شان اور وسیع حویلی شاہ صاحب کو دے دی۔ عمر کے باقی ایام اسی حویلی میں درس و تدریس کرتے ہوئے گزارے۔ 61 برس کی عمر میں 29 محرم 1176ھ 20 اگست 1762ء کو ظہر کے وقت وفات پائی۔

اولاد امجاد: شاہ صاحب کی پہلی شادی ان کے ماموں شاہ عبیداللہ کی صاحبزادی سے اور دوسری شادی 1157ھ میں مولوی سید حامد سونی پتی کی صاحبزادی سے ہوئی۔ دوسری اہلیہ کے بطن سے چار صاحبزادے پیدا ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی۔ ان چاروں صاحبزادوں نے حضرت شاہ صاحب سے سند فراغت حاصل کی۔

علم کے مینار: حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کو برصغیر میں علم کے ایک مینار کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے کارنامے درج ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کے مختلف علمی اور فقہی طبقوں کے افکار میں مطابقت کے پہلو نمایاں کر کے ان کے درمیان صلح و آشتی پیدا کرنے کی کوشش کی اور اختلافی مسائل میں الجھے رہنے کے بجائے انہیں متفق علیہ مسائل کی طرف مائل کیا۔ تطبیق ان کا خاص فن تھا۔ مثلاً حنفی، شافعی، مالکی اور اہل حدیث کے درمیان یا صوفیائے کرام اور غیر صوفی علمائے کرام کے درمیان، یا عقائد میں معتزلہ، اشاعرہ، ماتریدیہ اور اہل حدیث کے درمیان یا فلسفہ و شریعت کے مابین قرب کی فضا پیدا کی۔ غرض انہوں نے فقہی اختلافات میں نقطۂ اعتدال و تطابق قائم کیا اور انتہا پسند فقہا کے الجھے ہوئے طریق کے مقابلے میں معتدل، صاف اور عملی طریق کو ترجیح دی۔ فرقہ وارانہ تنازعات میں غلو و تعصب کو مٹانے کی کوشش کی اور یونانی فلسفہ کے بجائے ایمانی فلسفہ (دانش ایمانی) کو فروغ دیا۔ تعلیمی نصاب کے پرانے ڈھانچے میں اصلاح تبدیلی کر کے بطور خاص اسے عقلی موشگافیوں، ضرورت معقولات اور نظری الجھنوں سے بہ حد امکان پاک کر دیا۔ حضرت شاہ صاحب کی تجویز یہ ہے کہ ابتداء میں قرآن پاک کا لفظی ترجمہ ضرور پڑھنا چاہیے۔ اس طرح حدیث کی تعلیم بھی زیادہ بحث و تمحیص کے بغیر سادہ طریق پر دینی چاہیے۔ وقت کے بادشاہوں، امراء، پیشہ وروں، لشکریوں، حکومتی اداروں اور عہدیداروں، علما و صوفیہ اور عوام کے حالات کا جائزہ لیا اور ان سب کو ان کی غلط روی کے خوفناک نتائج سے آگاہ کیا، عقیدہ و عمل کی کئی خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کی اور امیر و غریب کے درمیان جس طبقاتی کشمکش کا آغاز ہو چکا تھا، اسے رفع کرنے کی سعی میں کتاب و سنت سے اقتصادی اور معاشی نظریے پیش کیے۔

اسلامی نظریات کے مطابق صحیح حکمرانی کے اصول بیان کیے اور اسلامی نظام حکومت کی توضیح اس انداز میں کی جس سے حاکم و محکوم کے درمیان خوشگوار تعلقات پیدا ہوں اور کوئی تلخی باقی نہ رہے۔ اسرار شریعت کی توضیح میں ان جیسے عالم بہت کم نظر آتے ہیں۔ انہیں کا جاری کردہ سلسلہ درس و تدریس تھا جس نے مسلمانوں میں نئے سرے سے دین القیم کا ذوق صحیح پیدا کیا اور پاک و ہند کی سرزمین میں اشاعت علوم دین کے جتنے سلسلے جاری ہوئے، ان میں سے اکثر شاہ صاحب کے فیضان سے بہرہ یاب تھے۔

قرآن پاک کے ترجمے اور حدیث پاک کی تعلیم انہیں کی بدولت طور پر عمومی طور پر اشاعت پذیر ہوئی۔ علمی تصانیف اور تدریسی کاموں کے ساتھ طوائف الملوکی کے اس دور میں مسلمانوں کی سیاسی خدمات بسلسلہ احیائے غلبہ اسلام

ممکن حد تک سرانجام دیں چنانچہ مرہٹوں کے بڑھتے ہوئے زور کو توڑنے کے لیے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دینا اس سلسلے کا سب سے اہم واقعہ ہے۔

تصانیف: حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی تصانیف علوم دینیہ کے تقریباً ہر موضوع کا احاطہ کرتی ہیں۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن، حدیث، فقہ واصول، علم کلام، تصوف، تاریخ، سیرت، اسرار شریعت وغیرہ پر کتابیں تصنیف کیں۔

تفسیر فتح الرحمان بترجمۃ القرآن آپ کا کیا ہوا قرآن حکیم کا فارسی ترجمہ ہے۔ جس کے ساتھ ایک جامع مقدمہ بھی لکھا گیا ہے۔

الفوز الکبیر فی اصول تفسیر فارسی، اصول تفسیر پر مختصر مگر ایک پر مغز رسالہ ہے۔ تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء والمرسلین قرآن مجید میں بیان کیے گئے انبیائے کرام کے قصوں پر ایک اچھوتا تبصرہ ہے۔ تراجم بخاری جیسا کہ نام سے ظاہر ہے صحیح بخاری کے عنوانات پر کتاب ہے۔ اصول فقہ پر آپ نے انصاف فی بیان سبب الاختلاف نامی رسالہ تصنیف کیا۔ آپ کی مشہور زمانہ تصنیف ''ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء فارسی زبان میں خلفائے راشدین کی خلافت کے اثبات پر ایک مبسوط کتاب ہے۔ حضرت شاہ صاحب کی اور بھی بہت سی اہم تصانیف ہیں۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی (1842ء-1880ء)

ہند کے مشہور مجاہد، عالم دین، بہت سی علمی کتابوں کے مصنف اور بانی دارالعلوم دیوبند

نام ونسب: محمد قاسم نانوتوی، بانی دارالعلوم دیوبند، ہندوستان میں انیسویں صدی کے مشہور مجاہد، عالم، متکلم، معلم اور مناظر ومصنف

ولادت: وہ شعبان یا رمضان 1248ھ/1832ء میں نانوتہ (ضلع سہارنپور) ان کا تاریخی نام خورشید حسین تھا۔

ان کے والد شیخ اسد علی مولانا مملوک علی کے ہم درس تھے۔ اور انہوں نے شاہنامہ فردوسی تک فارسی کی تعلیم حاصل کی۔

تعلیم: مولانا محمد قاسم بچپن ہی سے ذہین، طباع، بلند ہمت، تیز طبع، وصلہ مند، جفاکش، جری اور چست وچالاک واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے آبائی قصبے کے ایک مکتب میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور بعدازاں دیوبند بھیج دیئے گئے جہاں مولانا مہتاب علی کے مکتب میں انہوں نے عربی کی ابتدائی کتب پڑھیں اس کے بعد واپس نانوتہ آ گئے۔ حسن اتفاق سے مولانا مملوک علی جو دہلی عربی کالج میں علوم شرقیہ کے مدرس تھے اور مولانا قاسم کے عزیز بھی وہ بھی نانوتہ آئے اور جب دہلی واپس جانے لگے تو مولانا قاسم کو 1844ء میں اپنے ساتھ دہلی لے گئے۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے لکھا ہے کہ مولانا قاسم مولانا مملوک علی کے رشتے میں بھتیجے تھے، مولانا مملوک علی کے ہاں انہوں نے آٹھ سال گھر پر تعلیم پائی اور ایک سال دلی کالج میں علم ریاضی کی تحصیل کی۔

علم حدیث کی تحصیل کے لیے وہ شاہ عبدالغنی مجددی کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ اپنے زمانے کے باکمال محدث تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے حاجی امداداللہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور عمر بھر ان کے عقیدت تمند رہے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی مولانا قاسم نانوتوی کے ایک سال بعد دہلی آئے تھے، دونوں نے مولانا مملوک علی اور شاہ عبدالغنی مجددی سے ایک ساتھ تعلیم پائی تھی اور دونوں ہی حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی سے بیعت ہوئے اور دونوں نے ساری عمر یک جان دوقالب بن کر بسر کی۔

تحصیل علم سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ آپ نے مولانا احمد علی سہارن پوری کے مطبع احمدی دہلی میں کتابوں کی

تصحیح کی خدمت انجام دی اس زمانے میں مولانا احمد علی بخاری شریف کی تصحیح اور اس کے حاشیے لکھنے میں مصروف تھے، پانچ چھ سیپارے آخر کے باقی تھے یہ انہوں نے تصحیح کے لیے مولانا قاسم کے سپرد کر دیئے، مولانا نے حاشیہ اس قابلیت سے لکھا کہ دیکھنے والے انہیں خراج تحسین دیئے بغیر رہ سکے۔

1853ء میں ان کی شادی ہوگئی، اس زمانے میں ترکی اور روس میں جنگ کریمیا جاری تھی۔ مسلمانان ہند ترکی کی فتح کے لیے دعا گو تھے، مولانا قاسم نے اپنی اہلیہ کے تمام زیورات سلطانی چندے میں دے دیئے۔ جنگ آزادی ہند کے دوران جب 1857ء میں تھانہ بھون سے انگریزوں کا عمل دخل جاتا رہا تو شہر کے باشندوں نے حاجی امداد اللہ کو امام بنالیا اور مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد گنگوہی ان کے مشیر قرار پائے۔

حاجی صاحب نے دیوانی اور فوجداری مقدمات کے فیصلے شریعت کے مطابق کیے۔ ستمبر میں جب دہلی پر انگریزوں کا قبضہ بحال ہوگیا تو انگریزوں نے تھانہ بھون پر حملہ کر کے تھانہ بھون پر قبضہ کرلیا اس دوران جو معرکہ لڑا گیا اس میں مولانا قاسم کو بھی سر میں گولی لگی، لیکن وہ ہر طرح محفوظ و مامون رہے۔

جہاد آزادی کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف دار و گیر کی مہم شروع کی تو بغاوت کے الزام میں مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے بھی وارنٹ جاری کر دیئے۔ حاجی امداد اللہ مہاجر چھپتے چھپاتے کراچی سے مکہ معظمہ چلے گئے اور بقیہ عمر وہیں گزار دی۔ جبکہ مولانا رشید احمد گنگوہی چھ ماہ کے لیے قید رہے اور مولانا قاسم ہر قسم کی گزند سے محفوظ رہے تاہم وہ سرکار برطانیہ کی نظر میں عمر بھر مشتبہ اور ناپسندیدہ رہے۔ 1860ء میں وہ حج پر روانہ ہوئے راستے میں جہاز پر قرآن مجید حفظ کرنا شروع کیا اور جلد ہی مکمل حفظ کرلیا۔ 1861ء میں وہ حج سے واپس آگئے اور دوبارہ تصحیح کتب کا کام شروع کر دیا۔

1857ء میں دہلی کی تباہی کے بعد جب وہاں اسلامی تعلیمات کے مراکز ویران ہوگئے تو بعض اکابر دیوبند کو خیال آیا کہ اب ہندوستان میں اسلامی تعلیمات کے بقا کے لیے ایک عربی مدرسے کا قیام ضروری ہے۔ چنانچہ ان بزرگوں کی سعی سے 15 محرم 1283ھ/مئی 1867ء میں مدرسہ عربیہ دیوبند کا قیام عمل میں آیا یہی مدرسہ بعد میں دارالعلوم دیوبند کہلایا۔ مولانا قاسم نانوتوی اس وقت میرٹھ میں مقیم تھے وہ ارباب مدرسہ کی مشاورتی کونسل کے ممبر تھے اور دیوبند آکر مدرسہ کے امور میں برابر راہنمائی کرتے تھے۔ بعدازاں 1876ء میں مدرسہ کی عمارت نو کی تعمیر کے بعد وہی اس مدرسہ کے مہتمم قرار پائے اور آخری دم تک دارالعلوم دیوبند کی تعمیر و ترقی کے لیے کوشاں رہے۔ اس درسگاہ کی عمارت پانچ سال میں مکمل ہوئی تھی مدرسے کے کاموں کے علاوہ مولانا نکاح بیوگان اور لڑکیوں کے لیے وراثت میں حصہ دلانے کی تبلیغ میں مصروف رہے۔

مولانا قاسم نانوتوی نے غمی اور شادی کی رسموں کی اصلاح کی اور اہل بدعت کے خلاف قلمی و لسانی جہاد جاری رکھا۔ اسی زمانے میں انہوں نے سرسید کو ان کی حدیث و عقائد میں آزادروی پر فہمائشی خطوط لکھے اور ان کے بعض شبہات واعتراضات کا جواب دیا۔ اس کے باوجود سرسید احمد خاں کے ساتھ ان کے تعلقات خوشگوار رہے۔

مولانا قاسم کے زمانے میں بعض لوگ اسلام پر اعتراض وطعن کے لیے میدان میں اتر آئے تھے ان میں عیسائی مشنری اور ہندو آریہ سماجی شامل تھے۔ ان کے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے مولانا بھی کمر بستہ ہوگئے اور ان کا مباحثہ 1872ء میں پادری عمادالدین اور پادری تارا چند سے دہلی میں ہوا اور وہ کامیاب رہے۔ 1876ء میں چاند پور ضلع شاہجہان پور کے ایک کبیر پنتھی تعلقہ دار نے تحقیق مذہب کے لیے ہندو پنڈتوں، عیسائی پادریوں اور مسلمان عالموں کو جمع کیا کہ وہ اپنے اپنے مذہب کی حقانیت ثابت کریں۔ اس نے اس جلسے/ مناظرے کا نام ''میلہ خدا شناسی'' رکھا۔ اس جلسے میں چنڈت دیانند

سرسوتی اور مولانا قاسم نانوتوی بھی مدعو تھے۔ مولانا قاسم نے تثلیث کے عقیدہ کو باطل اور اثبات توحید میں ایسی مدلل تقریریں کیں کہ دوست و دشمن سب کو آپ کے دلائل تسلیم کرنا پڑے اور پادریوں نے اعتراف شکست کرلیا۔ اگلے سال پھر یہ جلسہ ہوا، اس مرتبہ پنڈت دیانند نے اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی کی اور اعتراضات کیے جن کا شافی جواب مولانا قاسم نے دیا۔ تاہم اس کے بعد پنڈت دیانند نے اسلام کے خلاف اعتراض اٹھانے کی مہم شروع کردی۔ پنڈت نے رڑکی جا کر اسلام کے خلاف کچھ اعتراضات تشہیر کیے۔ اہل رڑکی نے مولانا قاسم نانوتوی کو درخواست کی کہ وہ رڑکی آکر پنڈت کی یاوہ گوئی کا جواب دیں، لیکن پنڈت خود الٹے سیدھے بہانے کرکے رڑکی سے بھاگ نکلا اور میرٹھ پہنچ گیا۔ مولانا بھی اس سے گفتگو کے لیے میرٹھ پہنچے، تاہم دیانند کو مولانا کا سامنا کرنے کی جرات نہ ہوئی اور اس نے یہاں سے بھی راہ فرار اختیار کی۔

تیسرے حج کے بعد مولانا کچھ علیل رہنے لگے مگر اس حالت میں بھی دارالعلوم دیوبند کے فروغ و ترقی اور عیسائیوں اور آریاؤں سے مناظرے جاری رکھے اور درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ یونانی علاج سے افاقہ نہ ہوا اور ڈاکٹروں کی کوئی تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی آخر کار مولانا نے 4 جمادی الاولیٰ 1297ء اور اپریل 1880ء میں وفات پائی اور دارالعلوم دیوبند ہی میں دفن ہوئے۔ ان کی زندگی کے متعلق سرسید احمد خان نے لکھا تھا کہ ”مولوی قاسم صاحب مرحوم نے اپنی کمال نیکی، دینداری، اور ورع و انکسار سے ثابت کردیا تھا کہ اس دلی کی تعلیم و تربیت کی بدولت مولوی محمد اسحٰق صاحب کی مانند اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا بلکہ چند باتوں میں ان سے بھی زیادہ......

مولانا رشید احمد گنگوہی (1829ء-1905ء)

ہندوستان کے مشہور عالم، محدث اور متعدد کتابوں مثلاً ”کوکب الدریہ“ کے مصنف

نام و نسب: مولانا رشید احمد گنگوہی بن مولانا ہدایت احمد انصاری گنگوہی۔ ان کا سلسلہ نسب والد کی طرف سے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ تک اور ودادی کی طرف سے گیارہویں پشت میں قطب عالم شیخ عبدالقدوس گنگوہی سے مل جاتا ہے۔

ولادت: ان کی ولادت 6 ذی قعدہ 1244ھ/ 1829ء کو قصبہ گنگوہ شریف میں شیخ المشائخ حضرت عبدالقدوس گنگوہی کے مزار سے متصل ایک مکان میں ہوئی۔ ان کے والد مولانا ہدایت احمد ایک جید عالم تھے اور طریقت میں حضرت شاہ غلام علی مجددی نقشبندی دہلوی سے بیعت تھے۔

پرورش: مولانا رشید احمد سات سال کی عمر میں یتیم ہوگئے۔ ان کی تربیت ان کے دادا اور ان کی والدہ نے کی جو خود ایک راسخ العقیدہ اور پرہیزگار خاتون تھیں۔

بچپن ہی سے رشید احمد میں نیکی اور عظمت کے آثار نمایاں تھے۔ وہ بہت خوش الحان تھے انہوں نے فارسی اپنے ماموں محمد تقی سے پڑھی۔ صرف و نحو کی ابتدائی تعلیم مولانا محمد بخش رامپوری سے حاصل کی۔ سترہ برس کی عمر میں دہلی گئے اور وہاں مولوی قاضی احمد الدین جہلمی کیش اگردی اختیار کی۔ اس کے بعد مولانا مملوک علی نانوتوی کی خدمت میں حاضر ہوئے جو اس وقت دہلی کالج کے مدرس اول تھے۔ 1260ھ/ میں مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی ان کے ساتھ دہلی آگئے اور ان کے ہم سبق بن گئے۔ ہم سبق و ہم جماعت ہونے سے دونوں کے درمیان ایسا قریبی تعلق پیدا ہوا کہ آخری وقت تک ہر جدوجہد میں ساتھی رہے۔ دارالعلوم دیوبند کی تاسیس و اہتمام میں بھی باہمی تعاون رہا۔ حدیث بھی شاہ عبدالغنی مجددی سے اکٹھے ہی پڑھی، تحصیل علم کے بعد مولانا رشید احمد گنگوہی، تھانہ بھون آئے اور مولانا شیخ محمد تھانوی سے بیعت ہوئے۔ انہوں نے کچھ عرصہ

وہیں ٹھہر کر مرشد ارشد کی راہنمائی میں منازل سلوک وتصوف طے کیں اور چار سلاسل ہائے تصوف کی اجازت وخلافت حاصل کی۔

1273ھ/ 1857ء میں تحریک جنگ آزادی ہند میں حصہ لینے کے الزام میں گرفتار ہوئے اور چھ ماہ تک حوالات میں رکھے جانے کے بعد رہا کردیئے گئے۔ انہوں نے تین بار حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔ 1848ء سے 1896ء تک صرف چند سال چھوڑ کر انہوں نے تقریباً پچاس برس تک گنگوہ شریف میں تفسیر وحدیث وفقہ کا درس دیا اور ان سے اپنے وقت کے جید علمانے اکتساب فیض کیا۔

1314ھ/ 1895ء میں ان کی بصارت جاتی رہی اس کے بعد تدریس کی بجائے اصلاح باطن اور تربیت مریدین میں مشغول رہے۔ مولانا رشید احمد کی زندگی سراپا سنت تھی۔ انہوں نے درس حدیث نبوی کے لیے اپنی زندگی کو وقف کردیا تھا۔ ان کے درس حدیث میں 300 سے زاید جید علمانے تحصیل علم کیا۔ جو بعد ازاں اندرون وبیرون ملک علم حدیث کی اشاعت میں مصروف رہے۔ سلسلہ طریقت کے خلفاء میں بھی بڑے سربرآوردہ علماء کے نام ملتے ہیں، مثلاً شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی، شاہ عبدالرحیم رائے پوری، اور مولانا سید حسین احمد مدنی وغیرہم۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی 1857ء میں شاملی اور تھانہ بھون کے علاقوں میں انگریزوں کے خلاف جہاد حریت کے علمبردار رہے، اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی سرپرستی میں انہوں نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں کیے۔ اسی وجہ سے یہ دونوں برطانوی دور میں معتوب ٹھہرے تاہم خدانے انہیں انگریزوں کے مظالم سے بچائے رکھا۔

مولانا رشید احمد چاروں سلاسل ہائے طریقت میں بیعت کرتے تھے، لیکن عام تعلیم چشتیہ صابریہ طریقے کی تھی۔ 12 یا 17 جمادی الاول 1323ھ کو وہ نوافل ادا کرنے حجرے میں گئے، جہاں پاؤں کی دو انگلیوں کو ناخن سے ذرا اوپر پا نیچے کسی زہریلے کیڑے نے اُنہیں کاٹ لیا۔ جس سے شدت کا بخار چڑھ گیا، ہر چند علاج کیا گیا، لیکن کوئی تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی اور باختلاف روایت 8 یا 9 جمادی الثانی 1323ھ/ 11 اگست 1905ء کو بعد نماز جمعہ وفات پائی۔

الترمذی پر ان کی تصنیف الکوکب دری کے علاوہ تذکرہ رشید میں ان کی کم وبیش 14 اور تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے۔ الکوکب الدری کے علاوہ ان کی ایک تقریر اردو میں ''انفع الشذی'' کے نام سے طبع ہو چکی ہے۔

ماخذات: مولانا عبدالحئی، نزھت الخواطر، عبدالرشید بیس بڑے مسلمان محمد ادریس نگرانی، تذکرہ علمائے حال، دائرۃ المعارف اسلامیہ اردو پنجاب یونیورسٹی، مقالہ عبدالرشید گنگوہی۔

امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ (1856ء-1921ء)

مسلک بریلویت کے بانی

المعروف بہ اعلیٰ حضرت وفاضل بریلوی، ہندوستان کے مشہور عالم شاعر، فقیہ، مفتی اور واعظ

نام ونسب: رضا خان بن نقی خان بن رضا علی خان، نسباً پٹھان، مسلکاً حنفی اور مشرباً قادری تھے۔ عالم اور صاحب تصنیف بزرگ تھے۔

ولادت وتعلیم: احمد رضا خان کی ولادت 10 شوال 1272ھ/ 14 جون 1856ء کو بریلی شریف، اترپردیش (بھارت) میں ہوئی۔ محمد نام رکھا گیا اور تاریخی نام المختار (1272ھ) تجویز کیا گیا۔ جد امجد نے احمد رضا نام رکھا، بعد ازاں خود اعلیٰ حضرت نے اپنے نام میں عبدالمصطفیٰ کا اضافہ کیا۔

فاضل بریلوی ایک عالم بے بدل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے اور رضا تخلص کرتے تھے۔ ان

کے معتقدین انہیں ''اعلیٰ حضرت'' اور ''فاضل بریلوی'' کے القاب سے بھی یاد کرتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت اکثر علوم وفنون معاصرین علما سے حاصل کیے اور وہ علوم متداولہ پر دسترس رکھتے تھے۔ بعض علوم میں انہوں نے اپنے ذاتی مطالعہ اور غور وفکر سے بھی کمال حاصل کیا۔ بیشتر علوم وفنون متداولہ مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، جدل، ھندسہ، معانی، بیان وغیرہ اپنے والد ماجد مولانا نقی خاں سے حاصل کیے۔ علاوہ ازیں انہوں نے شاہ آل رسول (م 1297ھ)، شیخ احمد بن دحلان مکی، شیخ عبدالرحمٰن مکی، شیخ حسن بن صالح مکی اور شیخ ابوالحسن احمد النوری (م 1906ء) سے بھی استفادہ کیا۔

الریاضی، جبر ومقابلہ، مناظر ومرایا، زیجات، مثلث کروی، مثلث مسطح، ہیئت الجدیدہ، زیجات، مراجات، جفر، وغیرہ ذاتی مطالعے سے حاصل کیے۔

علوم وفنون کی تحصیل سے فراغت پاتے ہی اعلیٰ حضرت، درس وتدریس، فتویٰ نویسی اور تصنیف وتالیف میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ پچاس کے قریب علوم وفنون میں کتب ورسائل ان کی یادگار ہیں۔ بے شمار تلامذہ ان سے مستفید ہوئے جن میں بعض کا شمار متبحر علما میں کیا جاتا ہے۔ مثلاً حامد رضا خاں (م 1362ھ/ 1743ء) ظفر الدین بہادری (م 1382ھ/ 1962ء) احمد اشرف گیلانی، عبدالعلیم میرٹھی، برہان الحق جبل پوری، اور مولوی امجد علی (مؤلف بہار شریعت) وغیرہم۔

1294ھ/ 1877ء میں اعلیٰ حضرت اپنے والد ماجد کے ہمراہ شاہ آل رسول مارہروی (م 1879ء) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلسلہ قادریہ میں ان کے دست مبارک پر بیعت کی۔ مختلف سلاسل طریقت کی خلافت واجازت حاصل کی۔ دوسرے سلسلوں میں چشتیہ، سہروردیہ، نقشبندیہ، بدیعیہ علویہ وغیرہ شامل ہیں۔

حجاز میں قیام: 1878ء میں پہلی بار حج بیت اللہ کے لیے والد ماجد کے ہمراہ حجاز تشریف لے گئے۔ قیام مکہ معظمہ کے دوران شافعی عالم شیخ حسین بن صالح جمل اللیل ان سے بے حد متاثر ہوئے اور بڑی تحسین وتکریم کی۔ موصوف نے اپنی تصنیف الجوھرہ المعنیۃ کی عربی شرح لکھنے کی فرمائش کی چنانچہ فاضل بریلوی نے صرف دو روز میں اس کی شرح تحریر کردی اور اس کا تاریخی نام السیرۃ الوضیہ فی شرح الجوہرۃ المعنیۃ (1295ھ/ 1878ء) رکھا۔ بعد میں تعلیقات وحواشی کا اضافہ بھی کیا۔

1905ء میں دوسری بار زیارت حرمین شریفین اور حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ اس سفر میں حرمین کے علمائے کبار نے بڑی قدر وتعظیم کی۔ علمائے مکہ نے نوٹ کے متعلق ایک استفتاء پیش کیا، جو خود علمائے حرمین کے لیے ایک عقدہ لاینحل بنا ہوا تھا۔ مولانا احمد رضا خان صاحب نے محض حافظہ کی بنا پر قلم برداشتہ، عربی میں اس کا جواب تحریر فرمایا اور اس کا تاریخی نام ''کفل الفقیہ الفاہم فی احکام قرطاس الدراھم'' رکھا۔ ہندوستان واپسی پر مندرجہ بالا جواب کا ضمیمہ تحریر فرمایا اور پھر اس کا اردو ترجمہ بھی کیا۔

کفل الفقیہ کے علاوہ ایک اور تالیف علمائے مکہ کے ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرمائی اور اس کا تاریخی نام ''الدولۃ المکیہ بالمادۃ الغیبیۃ (1905ء)۔ اس تالیف میں انہوں نے مسئلہ غیب پر محققانہ بحث کی ہے۔ علمائے حرمین نے اس پر جو تقاریظ تحریر کی ہیں ان سے اس کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

اعلیٰ حضرت کو علمائے حرمین بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ بعض علماء نے انہیں ''مجدد امت'' کے لقب سے یاد کیا۔ فن فتویٰ نویسی میں اعلیٰ حضرت احمد رضا خان اپنے معاصر علما میں ممتاز تھے۔ علامہ اقبال نے بھی ان کی فقیہانہ قابلیتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ علامہ اقبال نے ایک مجلس میں اعلیٰ حضرت کے بارے میں کہا تھا کہ ''ان کے فتاویٰ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر اعلیٰ اجتہادی صلاحیتوں سے بہرہ ور اور پاک وہند کے کیسے نابغہ روزگار فقیہہ تھے۔ انہوں نے پچاس سے زائد برس تک فتویٰ نگاری کی۔

فقہ میں جدا دیگر کتب اور فتاویٰ رضویہ کے علاوہ ان کا ایک اور علمی کارنامہ ترجمہ القرآن مجید ہے، 1330ھ/ 1911ء میں کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن کے نام سے منظر عام پر آیا اور جس کے حواشی ''خزائن العرفان فی تفسیر القرآن'' کے نام سے مولانا نعیم الدین مراد آبادی نے تحریر کیے تھے۔ یہ ترجمہ دیگر تراجم سے اس لحاظ سے ممتاز نظر آتا ہے کہ جن آیات قرآنی کے ترجمے میں ذرا سی بے احتیاطی سے حق جل مجدہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں بے ادبی کا شائبہ نظر آتا ہے اعلیٰ حضرت نے ان کے بارے میں خاص احتیاط برتی ہے۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی فن شعر میں کمال رکھتے تھے۔ ان کا ایک مصرع ہے: قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی (حدائق بخشش) ہر صنف شاعری میں طبع آزمائی کی، لیکن نعت میں خاص نام پیدا کیا، ان کے دیوان، حدائق بخشش کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اعلیٰ حضرت اردو، فارسی، عربی اور ہندی میں یکساں مہارت سے شعر کہتے تھے۔ برصغیر کے گلی کوچوں میں پڑھے جانے والے ان کے نعتیہ سلام ''مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام'' کو بھلا کون بھول سکتا ہے۔ ان کی شاعری کی عظمت کے سبھی معترف تھے۔

اعلیٰ حضرت کی زندگی کے آخری دور میں سیاست نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا تھا۔ 1919ء میں جب تحریک خلافت کا آغاز ہوا اور اگلے سال 1920ء میں ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی۔ انہوں نے ان تحاریک سے اختلاف کیا اور ایک رسالہ ''المحجۃ الموتمنہ فی آیۃ الممتحنۃ'' تحریر کیا۔ اس میں انہوں نے کفار اور مشرکین سے اختلاط اور ان کے ساتھ سیاسی اتحاد کو خطرناک قرار دیا۔ ان کے معتقدین نے جماعت رضائے مصطفیٰ کے نام سے ایک تنظیم قائم کی اور اس کے بعد آل انڈیا سنی مسلم لیگ کانفرنس کے نام سے دوسری تنظیم قائم کی گئی۔ 1940ء میں مطالبہ پاکستان کے اعلان کے بعد ان تنظیموں نے مطالبہ پاکستان کی پرزور حمایت کی۔ ترک موالات کی مخالفت کرنے کی وجہ سے بعض حلقوں نے ان پر انگریزوں کی حمایت کا غلط الزام لگایا مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ سیاست کے اس نازک دور میں مسلمانوں کے لیے جوش و خروش سے زیادہ سلامت روی کو مفید سمجھتے تھے۔

اعلیٰ حضرت نے 25 صفر 1340ھ/ 1921ء کو بوقت نماز جمعہ 2 بج کر 38 منٹ پر وفات پائی اور بریلی میں مدفون ہوئے۔

ان کے دو صاحبزادے، حامد رضا خاں اور مصطفیٰ رضا خان تھے جبکہ ان کے خلفاء کی تعداد بہت وسیع تھی جو نہ صرف برصغیر پاک و ہند بلکہ حرمین شریفین میں بھی پھیلے ہوئے تھے۔ یہ الزام بھی ان پر غلط ہے کہ انہوں نے ایک نئے فرقے کی بنیاد رکھی کیونکہ ادب کرنے والے اس دور سے پہلے بھی موجود تھے تاہم ان سے عقیدت کی بنیاد پر بریلوی کہلایا جاتا ہے۔

مولانا عبدالحئی رحمۃ اللہ علیہ (1869ء-1923ء)

ہندوستان کے ایک مشہور و ممتاز عالم دین، فقیہ، سوانح نگار اور مصنف ''نزہۃ الخواطر''

نام و نسب: مولانا عبدالحئی بن حکیم سید فخر الدین بن حسن، والد کی طرف سے حسنی اور والدہ کی طرف سے حسینی سید تھے۔ ان کے بزرگوں میں سب سے پہلے ہندوستان آنے والے شیخ الاسلام امیر قطب الدین محمد المدنی تھے، جن کا مزار کڑہ (مانکپور) میں ہے۔ امیر قطب الدین کی اولاد میں کئی اولیاء علماء اور مشائخ پیدا ہوئے ان میں شاہ علیم اللہ، حضرت خواجہ آدم بنوری اور حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی اپنے دور کے مشاہیر تھے۔

پیدائش: 18 رمضان المبارک 1286ھ/ 1869ء کو دائرہ سید علیم اللہ بیرون شہر رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ ان

کے والد حکیم سید فخر الدین علوم ظاہری میں فاضل اور یگانہ روزگار ہونے کے علاوہ اپنے وقت کے نامور شیخ طریقت اور پابند سنت بزرگ تھے۔ تقریباً چوبیس تصنیفات ان کی یادگار ہیں۔

تعلیم وتربیت: مولانا عبدالحئیؒ بچپن ہی میں نہایت سنجیدہ مزاج اور ذہین الطبع تھے اور ان میں بہت سی غیر معمولی خوبیاں شروع ہی سے فطری طور پر پائی جاتی تھیں۔ ابتدائی تعلیم ھسوہ اور رائے بریلی میں حاصل کر کے الٰہ آباد چلے گئے۔ وہاں مولانا محمد حسین الٰہ آبادی، خلیفہ حاجی امداداللہ مہاجر مکی اور دیگر علماءِ عصر سے تحصیل علم کی بعد میں فتح پور گئے اور مولانا نور محمد سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے کانپور میں بھی تعلیم پائی۔ 1301ھ میں بھوپال گئے۔ اس وقت مولوی جمال الدین مدار المہام کی توجہ سے بھوپال علما کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ایک سال قیام کے بعد وہاں سے واپس آگئے اور کچھ دنوں اپنے وطن مین قیام کے بعد مزید تحصیل علم کے لیے لکھنؤ روانہ ہوگئے۔

لکھنؤ میں انہیں مولانا سید امیر الدین ملیح آبادی، صاحب تفسیر مواہب الرحمٰن مولانا الطاف حسین اور دیگر کئی جید علما سے اکتساب فیض کیا۔ 1309ء میں لکھنو سے وطن واپس لوٹے اور شادی کے بعد کچھ دنوں تک وطن میں مقیم رہنے کے بعد ایک مرتبہ پھر بھوپال تکمیل علم کے لیے گئے۔ یہاں مفتی قاضی عبدالحق کابلی سے کتب درسیہ اور مولانا سید احمد دہلوی (سابق مدرس دارالعلوم دیوبند) سے ریاضی اور دیگر علما سے حدیث وتفسیر پڑھی۔ طب کی ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کر چکے تھے۔ شرح اسباب اور نفیسی حکیم عبدالعلی لکھنوی سے جو اس زمانے میں بھوپال میں افسر الاطباء کے عہدے پر فائز تھے پڑھی۔ طب میں مزید تعلیم کے لیے ایک بار پھر لکھنؤ گئے اور "قانون شیخ" حکیم عبدالعزیز سے پڑھا پھر لکھنؤ ہی میں حکیم عبدالولی کے ہاں مطب شروع کیا۔

مولانا عبدالحئیؒ قطب عصر مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی سے بیعت تھے۔ ان کے درس بخاری شریف میں بھی شرکت کی اور اجازت حدیث حاصل کی۔ پیرومرشد کی وفات کے بعد سلوک کے منازل انہوں نے خسر شاہ سید ضیا النبی دیگر شیوخ کی خدمت میں طے کیں۔

انہوں نے علوم ظاہری وباطنی کی مزید تکمیل کے لیے نواح دہلی، روہیل کھنڈ، سرہند، پیران کلیئر اور دوآبے کا سفر کیا اور مولانا رشید احمد گنگوہی، قاری عبدالرحمٰن پانی پتی، مولانا نذیر حسین اور دیگر علماوشیوخ سے ملاقات کی اور اجازت حدیث بھی حاصل کی۔ بعدازاں جس زمانے میں "ندوۃ العلما" کا قیام کانپور میں تھا تو انہوں نے مددگار ناظم کے طور پر کام کیا۔ مولانا عبدالحئیؒ اپنی تصنیف "نزھۃ الخواطر" کی وجہ سے مشہور ہیں۔ یہ کتاب انہوں نے اسلامی ہندوستان کے ایک ہزار سالہ دور کے پانچ ہزار اکابر علما کے حالات پر ترتیب دیئے تھے۔ ان کی دیگر تصانیف میں معارف فی النواع العلوم والمعارف، جنۃ المشرق، تلخیص الاخبار اور تذکرۃ الابرار بہت اہم ہیں۔ مولانا عبدالحئیؒ نے 10 جمادی الآخر 1341ھ/ 2 فروری 1923ء کو وفات پائی اور زاویہ علیم اللہ رائے بریلی میں مدفون ہوئے۔

مولانا اشرف علی تھانوی (1863ء-1943ء)

مشہور ہندوستانی عالم دین، صوفی، واعظ اور مفسر، صاحب بیان القرآن و بہشتی زیور وغیرہ

نام ونسب: مولانا اشرف علی تھانوی بن عبدالحق فاروقی۔ پیدائش، بمقام تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر بھارت) میں 12 ربیع الاول 1280ھ/ 9 جولائی 1863ء کو پیدا ہوئے انہوں نے تعلیم تھانہ بھون اور دیوبند حاصل کی۔ 1301ھ/ 1883ء میں دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر انہوں نے کانپور میں بطور معلم اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اسی سال انہوں نے فریضہ

حج ادا کرنے کی سعادت حاصل کی۔ مکہ معظمہ میں ان کی ملاقات حاجی امداد اللہ مہاجر کی سے ہوئی جن سے پہلے ان کا رابطہ بذریعہ خط و کتابت تھا۔ انہوں نے حاجی صاحب موصوف سے غائبانہ بیعت بھی کر رکھی تھی اور وہ ان کی شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ ملاقات کے بعد بیعت کی تجدید کی اور باقاعدہ طور پر ان کے مرید ہوگئے۔

1307ھ/1890ء میں وہ ایک بار پھر مکہ گئے اور کئی ماہ تک مسلسل حاجی امداد اللہ مہاجر کی کی خدمت میں رہے۔

1315ھ/1897ء میں انہوں نے کانپور کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہا اور اپنے آبائی وطن تھانہ بھون واپس آگئے۔

وہ ایک ممتاز فاضل، علم دین اور صوفی تھے اور انہوں نے نہایت ہی مصروف زندگی گزاری۔ ان کی مصروفیات تعلیم و تدریس، وعظ، خطابت اور تصنیف و تالیف تک محدود تھیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے وقتاً فوقتاً سفر بھی کیے۔ آپ بہت کثیر التعداد کتابوں کے مصنف تھے اور آپ کی تالیفات کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہے۔ آپ کی یہ تصنیفات زیادہ تر تفسیر، حدیث، منطق، کلام، عقائد، تصوف اور سیرت جیسے علوم کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان کی سب سے پہلی تصنیف جس کا نام ''زیر و بم'' تھا ان کے زمانہ طالب علمی کی یادگار ہے۔ اور آخری تصنیف ''البوادر والنوادر'' ہے جو 1363ھ/1945ء میں شائع ہوئی تھی۔ آپ کی اہم تصانیف میں بیان القرآن، بارہ جلدوں میں تفسیر قرآن مجید، بہشتی زیور دس حصوں میں اردو زبان میں ہے۔ ان کے فتاویٰ کا مجموعہ آٹھ جلدوں میں ہے جو ان کی وفات کے بعد مرتب ہوا تھا۔

غزالی زماں حضرت مولانا احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ (1913ء-1986ء)

حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد عصر حاضر کے برصغیر پاک و ہند کے اہل سنت کے سب سے بڑے عالم دین و محدث

نام و نسب: حضرت علامہ احمد سعید کاظمی بن حضرت سید مختار احمد کاظمی، امروہہ، بھارت ضلع مراد آباد کا ایک مشہور و معروف قصبہ ہے۔ یہ قصبہ ہمیشہ سے اہل علم اور سادات کرام کا مرکز رہا ہے۔ امروہہ کے سادات کرام میں کاظمی سادات بطور خاص زیادہ معروف ہیں۔ حضرت علامہ احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق کاظمی سادات امروہہ سے ہے۔ ان کا شجرہ نسب حضرت امام موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ سے جا ملتا ہے۔ ان کے جد امجد حضرت سید احسن دہلوی عراق سے ہجرت کر کے دہلی تشریف لائے تھے۔

سید مختار احمد کاظمی بہت خاموش طبع اور متواضع انسان تھے۔ سلسلہ عالیہ چشتیہ صابریہ کے بزرگوں سے آپ کو خاص فیض پہنچا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو پانچ بیٹوں سے نوازا تھا، جن میں سب سے بڑے سید محمد خلیل کاظمی تھے۔

ولادت و تعلیم: ابوالنجم حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی 4 ربیع الثانی 1331ھ/ بمطابق 13 مارچ 1913ء کو بروز بدھ صبح 4 بجے امروہہ، ضلع مراد آباد، بھارت میں متولد ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب 29 واسطوں سے حضرت امام موسیٰ کاظم سے اور 44 واسطوں سے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملتا ہے۔

آپ نے اپنی دینی تعلیم کا آغاز آغوش مادر سے کیا، کیونکہ آپ کے والد محترم آپ کو چھ برس کی عمر میں داغ مفارقت دے گئے تھے۔ اس کے بعد آپ کے برادر اکبر حضرت علامہ سید محمد خلیل کاظمی محدث امروہوی نے آپ کی غیر معمولی استعداد اور روحانی صلاحیتوں کو دیکھ کر آپ کی ایسی علمی و عملی، ظاہری و باطنی تربیت فرمائی کہ آپ علم و عرفان کے آفتاب بن کر چمکے اور اپنی ضیا پاشیوں سے ایک جہاں کو منور کر دیا۔ آپ نے سولہ سترہ برس کی عمر میں تمام علوم و فنون کا کامل دسترس حاصل کر لی اور 1348ھ/1929ء میں مدرسہ محمودیہ امروہہ سے سند فراغت حاصل کی۔

بیعت: حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی نے صدر الافاضل سید نعیم مراد آبادی اور حضرت مولانا نثار احمد کانپوری اور دیگر مشاہیر وقت کی موجودگی میں فخر مشائخ حضرت سید علی حسین شاہ اشرفی کچھوچھوی کے ہاتھ پر بیعت کی اور سلاسل اربعہ میں خلافت واجازت حاصل کی۔

حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی بڑے ذہین اور فطین انسان تھے۔ آپ نہ صرف رموز حقیقت سے آگاہ تھے بلکہ شریعت کے مشکل مسائل کے معانی ومفاہیم اور مصارف ومطالب بیان کرنے میں بڑا سکہ ومہارت رکھتے تھے۔ آپ کی ذات سرچشمہ علوم وفنون میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔

حضرت علامہ قبلہ کا فیض برصغیر پاک وہند میں چہار سو پھیلا۔ آپ کے تلامذہ کی فہرست بڑی طویل ہے جو اطراف واکناف عالم دین اسلام کی عظیم خدمت میں ہمہ وقت مصروف عمل ہیں۔ آپ کو سلسلہ عالیہ چشتیہ، قادریہ، اور سہروردیہ میں اجازت بیعت وخلافت حاصل تھی۔

وفات: استاذ العلماء وفضلا، آفتاب علم وحکمت علم وعمل کے پیکر حضرت سید احمد سعید کاظمی قدس سرہ نے 25 رمضان المبارک 1406ھ بمطابق 4 جون 1986ء کو بروز منگل بوقت افطاری وفات پائی۔

ملتان میں ورود: حضرت سید علامہ احمد سعید کاظمی پہلے پہل ملتان لاہور کے ایک درویش صفت بزرگ حضرت پیر سید علی احمد نصیر عالم کی دعوت پر سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نواز معین الدین چشتی کے عرس مبارک میں شرکت کے لیے ملتان تشریف لائے۔ پھر انہیں کے اصرار پر آپ نے نومبر 1935ء میں ملتان میں مستقل سکونت اختیار کی اور تادم آخر ملتان ہی میں رہے اور آج بھی سرزمین ملتان میں مدفون ہیں۔

ملتان میں درس وتدریس کا آغاز: ملتان میں تشریف آوری کے بعد حضرت علیہ الرحمہ نے اپنے گھر سے درس وتدریس کا آغاز کیا اس کے ساتھ ہی جامع مسجد فتح شیر خان گھنٹہ گھر میں آپ نے نماز فجر کے بعد درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا جو اٹھارہ سال میں مکمل ہوا۔ ملتان ہی کی ایک اور مسجد جامع مسجد چپ شاہ میں پہلے مشکواۃ شریف اور پھر بخاری شریف کا درس مکمل فرمایا اور مخالفین کی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔

جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں شیخ الحدیث: آپ کو علوم وفنون اسلامیہ میں جو ید طولیٰ حاصل تھا جب اس کی خوشبو پھیلی تو محکمہ اوقاف نے جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں علوم شرعیہ میں تحقیق وتخصیص کے لیے مختلف شعبوں کا آغاز کیا۔ جامعہ ہذا کے شعبہ حدیث میں ایک بلند پایہ محقق اور نابغہ روزگار ماہر حدیث کی ضرورت تھی جو روایت اور درایت دونوں فنون میں دسترس رکھتا ہو۔ اس عظیم منصب کے لیے محکمہ اوقاف کی نظر انتخاب آپ پر پڑی، مسلک اہل سنت کی نمائندگی کی خاطر اور آپ نے گورنر پنجاب نواب امیر محمد خان کے اصرار پر یہ عہدہ قبول فرمایا اور اگلے گیارہ سال تک اس منصب پر فائز رہے۔

مذہبی وملی خدمات: حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی کی مذہبی اور ملی خدمات روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ تحریک پاکستان میں آپ کے اکابرین ملت کے شانہ بشانہ کام کیا اور قیام پاکستان کو ممکن بنایا اور قیام پاکستان کے بعد مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کے لیے مسلم لیگ کے اجلاس میں سب سے پہلے قرارداد پیش کی۔ ملک وملت کی تعمیر کے لیے امام اہل سنت نے ہر تحریک میں بھرپور حصہ لیا چاہے وہ آئین پاکستان کی تیاری ہو یا تحریک ختم نبوت یا تحریک نفاذ نظام مصطفیٰ (1977ء) ان سب میں آپ نے بے مثال قائدانہ کردار ادا کیا۔ جمعیت علمائے پاکستان اور دعوت اسلامی کا قیام آپ کا ہی مرہون ہے۔

تصانیف: آپ نے درس وتدریس اور دیگر مصروفیات کے ساتھ ساتھ مناظرہ اور تقریر کی طرح قلم سے بھی دین متین کی خدمت کی آپ کی ہر تصانیف میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں۔

(1) ترجمۃ القرآن
(2) تفسیر البیان پارہ اول
(3) ختم نبوت
(4) مجموعہ صد احادیث
(5) حجیت حدیث
(6) میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم
(7) معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم
(8) حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم
(9) ظل النبی صلی اللہ علیہ وسلم
(10) گستاخ رسول کی سزا قتل
(11) تسکین الخواطر
(12) اسلام کا فلسفہ نماز
(13) رجم اسلامی سزا ہے۔
(14) رسالہ اثبات السماع

مفسرین کرام

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ
حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ (م114ھ/732ء)
حضرت مقابل بن سلیمان رحمۃ اللہ علیہ (م150ھ/767ء)
امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ (224ھ/839ء-310ھ/923ء)
علامہ ابواللیث سمرقندی رحمۃ اللہ علیہ (م393ھ/983ء)
امام ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ (م427ھ/1035ء)
ابن عربی الاندلسی رحمۃ اللہ علیہ (1075ء-1148ء)
محی السنۃ البغوی رحمۃ اللہ علیہ (م1117ء)
الشیخ الاکبر، ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (1165ء-1240ء)
امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ (1214ء-1273ء)
امام البیضاوی رحمۃ اللہ علیہ (1286ء-1316ء)
حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ (1301ء-1373ء)
علامہ السیوطی رحمۃ اللہ علیہ (1445ء-1505ء)
قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ (م1225ھ-1810ء)
شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (1746ء-1824ء)
علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ (1802ء-1854ء)
مولانا سید نعیم مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ (1887ء-1948ء)
مفتی احمد یار خان نعیمی رحمۃ اللہ علیہ (1906ء-1971ء)
علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (1887ء-1949ء)
مفتی محمد شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (1896ء-1976ء)
سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ (1903ء-1979ء)
پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ (1918ء-1998ء)
سید محمد مدنی اشرفی الجیلانی مدظلہ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ

رسول اللہ کے ابن عم اور ایک ممتاز صحابی رضی اللہ عنہ، محدث و مفسر قرآن، فقیہ

نام و نسب: ابو العباس، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم زاد تھے اور ان کی والدہ، ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی سگی بہن تھیں۔ دور اول کے علمائے عظام میں سے ایک، قرآن مجید کی تفسیر میں مہارت اور بصیرت کی وجہ سے انہیں امام المفسرین کہا گیا ہے۔ انہوں نے ایک ایسے وقت میں قرآن مجید کی تفسیر کا کام اپنے ہاتھ میں لیا جبکہ مسلمانوں کے معاشرے میں گہری تبدیلیاں رونما ہو جانے کی وجہ سے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ معاشرے کے نئے تقاضوں کے پیش نظر قرآن مجید کے مطالب و معانی کی تشریح کی جانے کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے وقت کے اس چیلنج کو قبول کر کے اس کام کو بڑی قابلیت اور مہارت کے ساتھ انجام دیا تھا۔

ولادت: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ہجرت سے تین سال قبل مکہ میں پیدا ہوئے جب کہ بنو ہاشم شعب ابی طالب میں محصور ہو کر انتہائی کٹھن زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ ان کی والدہ ام الفضل رضی اللہ عنہ نے ہجرت سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا اس لیے وہ پیدائش کے وقت ہی سے مسلمان تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کے مزاج میں بچپن ہی سے تحقیق علمی کا شوق اور رجحان موجود تھا۔ ان کے دل میں بہت جلد یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے استفسارات کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں معلومات فراہم کی جائے۔ ابھی نوعمر ہی تھے کہ معلم بن گئے اور حصول علم کی خواہشات رکھنے والے لوگ ان کے گرد جمع ہونے لگے۔ ان کا علم و فضل صرف ان کے حافظے تک محدود نہیں تھا بلکہ ان کے پاس تحریری یادداشتوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ چنانچہ انہوں نے عوام میں درس دینا شروع کر دیا بلکہ تعلیم کے لیے باقاعدہ جماعتیں بنا دیں اور تقریباً مقررہ اوقات میں ہفتے کے مختلف دنوں میں مختلف موضوعات، مثلاً تفسیر، فقہی مسائل، غزوات نبی صلی اللہ علیہ وسلم، تاریخ ازمنہ قبل از اسلام اور قدیم شاعری کا باقاعدہ درس دینے لگے۔ قرآن مجید کے الفاظ و محاورات کی تشریح کرتے وقت ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے الفاظ کی تائید میں قدیم عرب شاعری سے اشعار پیش کیا کرتے تھے۔ ان کے اسی طریق کار کی وجہ سے مسلمان علمائے دین کے ہاں قدیم عرب شاعری کی اہمیت تسلیم کی گئی۔ چونکہ انہیں ایک مستند عالم دین سمجھا جاتا تھا لہٰذا لوگ ان سے مختلف مسائل پر فتوے حاصل کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے بہت سے اہم فتاویٰ کی وجہ سے بھی مشہور ہیں۔ ان میں سے بعض فتاویٰ کی تائید میں انہیں بعد ازاں دلائل پیش کرنا پڑے۔ اور بعض صورتوں میں انہوں نے اپنے فیصلوں سے رجوع بھی کیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی تشریحات مطالب قرآن کو جمع کر کے خاص خاص مجموعے تیار کیے گئے جن کی اسانید ان کے بلاواسطہ شاگردوں میں سے کسی شاگرد تک پہنچتی ہیں۔ ان کے فتاویٰ بھی جمع کر لیے گئے ہیں۔ آج اس تفسیر یا تفسیروں کے متعدد مخطوطات اور مطبوعہ نسخے موجود ہیں جنہیں ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد طفولیت سے وصال نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک تقریباً آٹھ دس سال کی مدت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں بسر کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کبار صحابہ کی صحبت اختیار کی اور ان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ سننے اور یاد کرنے کا خاص اہتمام کیا۔ کتب احادیث میں ان سے تقریباً ایک ہزار چھ سو ساٹھ احادیث مروی ہیں۔ (ابن حزم، جوامع السیر)

خوش اخلاقی اور کتاب اللہ سے گہری وابستگی کی وجہ سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان کی بے حد قدر کرتے تھے اور مشکل مسائل میں ان سے مشاورت کرتے تھے اور اکثر ان کی رائے پر عمل کیا کرتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کہتے تھے کہ "اے ابن عباس رضی اللہ عنہ! تم سب سے بڑے عالم ہو۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے بارے میں یہ بھی کہا کرتے تھے کہ وہ "فتی الکہول" یعنی بوڑھوں کے جوان یا نوجوان بزرگ ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ وہ تفسیر قرآن مجید میں یوں لگتا ہے کہ شفاف پردے کے پس منظر سے غیب کی چیزیں دیکھ رہے ہیں۔" ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ وہ بہترین ترجمان القرآن ہیں۔ ابن عمر کہا کرتے تھے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کہ امت محمدیہ میں ابن عباس قرآن مجید کے متعلق سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے دعا فرمائی تھی کہ "یا اللہ! اسے کتاب و حکمت کا علم، دین کی سمجھ اور تاویل القرآن کی فہم عطا کر۔" اس کے علاوہ وہ اپنے بلند مرتبہ علمیت کے چار مزید اسباب یہ بتاتے ہیں کہ (1) خانوادہ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم میں تربیت ہونا۔ (2) کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کی صحبت (3) قوت حافظہ کے ساتھ ساتھ لغت و ادب عرب کا عالم ہونا۔ (4) اجتہاد کا مرتبہ حاصل ہونا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ صاحب قلم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب سیف بھی تھے انہوں نے اسلامی فوج

کے ساتھ بہت سے معرکوں میں بھی شرکت کی، مثلاً معرکہ مصر معرکہ افریقیہ (27ھ) معرکہ جرجان وطبرستان (30ھ) اور اس کے بہت دن بعد 49ھ میں وہ قسطنطنیہ کی مہم پر بھی گئے۔ اس مہم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ تھے۔ اس کے علاوہ معرکہ صفین (37ھ) میں وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کے ایک بازو کے سالار تھے۔ وہ خلیفہ دوم اور خلیفہ سوم کے مشیر خاص تھے مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ خلیفہ چہارم حضرت علی رضی اللہ عنہ اوران کے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بھی مشیر خاص تھے اوران کے مشوروں پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے آخری دنوں میں جب وہ اپنے مکان میں محصور کردیئے گئے تھے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کوامیر حج مقرر کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شہادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وقت وہ مدینہ میں موجود نہیں تھے۔ جب وہ مدینہ لوٹے تو انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بعدازاں انہیں بصرے کا والی مقرر کیا تھا۔ 37ھ میں معاملہ تحکیم پر دستخط کرنے والوں میں ایک یہ بھی تھے۔ تاہم اس کے بعد انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفاداری کا دم بھرنے کے باوجود حکومت بصرہ سے علیحدگی کر لی اور بصرہ سے مکہ واپس آگئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد امام الحسن رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنی فوج کا سالار مقرر کیا۔ اسی دوران انہوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے مصالحت کی کوشش کی۔ مورخین اس بات پر متفق نہیں کہ یہ کوشش انہوں نے اپنی مرضی سے کی تھی یا حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے ایما پر کی تھی۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے طویل عہد حکومت کے دوران وہ حجاز ہی میں مقیم رہے تاہم وہ کئی بار بنو ہاشم کے مفاد کی خاطر دربار دمشق گئے۔

جب حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ نے مکہ میں دعویٰ خلافت کیا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ابن الحنفیہ رضی اللہ عنہ نے ان کی خلافت کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ چنانچہ اس کی پاداش میں دونوں حضرات کو مکہ سے جلاوطن کردیا گیا اور اسی مخالفت کی بنا پر انہیں ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے قید بھی کردیا۔ المختار نے خصوصی فوجی دستہ بھیج کر انہیں رہائی دلائی۔

زندگی کے آخری ایام میں ان کی بینائی جاتی رہی تھی اور وہ طائف میں مقیم تھے، یہیں 68ھ/ 687ء میں انہوں نے وفات پائی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی نسبت خاص کی بنا پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہ سے بڑی عزت وتکریم سے پیش آتے تھے، جب وہ والی بصرہ تھے تو حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ، میزبان رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آئے اور اپنی احتیاج بیان کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ان کی میزبان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے 40ہزار درہم اور 20 غلام انہیں دیئے۔

حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ (م 114ھ/ 732ء)

مکہ معظمہ کے ایک قدیم نامور فقیہ اور مفسر قرآن

نام ونسب: اُن کے والدین نوبہ کے باشندے تھے۔ وہ یمن میں پیدا ہوئے اور مکہ میں پرورش وتعلیم پائی۔ وہ مکی خاندان ابومیسرہ بن ابی خثیم الفہری کا موالی تھا، اس نے ایک طویل عمر پائی (88 سال) بعض انہیں سو سال کی عمر کا بتاتے ہیں۔

عطاء بن ابی رباح مکہ کا وہ واحد قدیم فقیہ، مفسر اور مفتی ہے، جس کے نام کے علاوہ بھی ہمیں کچھ معلومات ملتی ہیں۔ فقہ کے جو اصول ان سے منسوب کیے جاتے ہیں ان کے تجزیئے سے ہم مستند روایات اوران میں کیے جانے والے متاخر فرض

اضافوں میں فرق کیا جا سکتا ہے۔ اپنے دوسرے معاصرین کے مروجہ طریقے کے مطابق وہ اپنی ذاتی رائے کو قیاس اور استحسان کی صورتوں میں استعمال کرنے میں کوئی تامل نہیں کرتا تھا۔ لہٰذا وہ بیانات جو بعد کے انداز فکر کی عکاسی کرتے ہوئے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ رائے کو رد کرتا تھا، جعلی قرار دیئے گئے ہیں۔ مورخین نے لکھا ہے کہ یہ بات یقین سے کہنا مشکل ہے کہ عطا نے احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور روایات صحابہ کو کس حد تک فقہی دلائل کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو غالباً صرف مرسل حدیثوں کو ہی استعمال کیا ہوگا۔ دوسری صدی ہجری کی وجہ سے عطاء کے بعض امتیازی افکار بظاہر اس کے آخری ایام ہی میں ناپسندیدہ سمجھے جانے لگے تھے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس کے بعض نوعمر معاصرین نے اس کے درس میں حاضر ہونا چھوڑ دیا تھا۔ اور یہ کہ اس کی روایت کردہ مرسل احادیث ضعیف ہیں۔ ان بیانات کی تلافی بہت حد تک اس امر سے ہو جاتی ہے کہ جب حدیث کے بارے میں محدثین کی پہلی روش تبدیل ہوگئی تو یہ کہا جانے لگا کہ عطاء کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہ سے ذاتی رابطہ حاصل تھا اور ان صحابہ کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا: تاہم خود مسلمان نقاد کہتے ہیں کہ عطاء نے حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت ام سلمہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے احادیث نہیں سنی اور وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اس کے بلاواسطہ رابطے کے بارے میں یقین نہیں کرتے۔

تاہم عطاء بن ابی رباح دیگر بزرگوں کی طرح تفسیر قرآن میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے اور ان کا نام تابعین مفسرین قرآن میں اہم ہے۔ دوسری صدی ہجری کے آغاز میں فقہ اسلامی کے تخصیص دینی مسائل کی بہ نسبت اصطلاحی حیثیت کے فقہی مسائل سے زیادہ دلچسپی رکھنے لگے تھے۔ عطاء کے مصدقہ عقائد سے اس کی تائید ہوتی ہے اور اس نے مناسک حج کا خصوصی مطالعہ، جیسا کہ بعض ماخذوں میں آیا ہے کہ محض اس لیے نہیں کیا کہ یہ مکے کے علما کا پسندیدہ موضوع تھا۔

عطاء کی شہرت اس کی زندگی ہی میں مکہ سے باہر دور دور تک پھیل گئی تھی اور حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ وہ اس کے حلقہ درس میں شامل ہوئے تھے۔ امام صاحب کا بیان اسلامی فقہ کی اصطلاحی تعلیم کے بارے میں شاید اولین مصدقہ شہادت کی حیثیت رکھتا ہے۔

محمد بن عبداللہ بن عمرو بن عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان سے روایت ہے کہ میں نے عطاء بن ابی رباح سے بہتر مفتی کوئی اور نہیں دیکھا، ان کی مجلس میں صرف اللہ ہی کا ذکر ہوتا تھا جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہوتا۔ اسی طرح معاذ بن سعید الاعدر سے مروی ہے کہ ہم لوگ عطاء کی مجلس درس میں بیٹھے تھے، ایک شخص نے کوئی حدیث بیان کی، دوسرے شخص نے درمیان سے اسے کاٹ دیا، عطا سخت ناراض ہوئے اور کہا کہ یہ کیسے اخلاق ہیں اور یہ کیسی طبیعتیں ہیں، واللہ ایک شخص ایک ایسی حدیث بیان کرتا ہے کہ جو میں اس سے زیادہ جانتا ہوں مگر میں خاموش رہتا ہوں اور اسے باور کراتا ہوں کہ گویا یہ حدیث میں نے اس سے پہلے نہیں سنی۔

حضرت مقاتل بن سلیمان رحمۃ اللہ علیہ (م 150ھ/ 767ء)

ایک نامور مفسر قرآن اور محدث، عہد تبع تابعین

نام ونسب: مقاتل بن سلیمان بن بشیر الارزدی، الخراسانی البلخی، کنیت ابوالحسن، مفسر قرآن اور محدث، جو بلخ، وسطی ایشیا میں پیدا ہوئے اور مرو، بغداد اور بصرے میں رہائش پذیر رہے۔ کچھ عرصہ ان کے بیروت میں قیام کرنے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ان کی زندگی کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ سوائے مفسر قرآن اور محدث کی حیثیت سے ان کی قوت فیصلہ کے متعلق کچھ حوالے ملتے ہیں۔ ان کے والد کی اہلیہ کا نام ام ابی عصمۃ نوح بن ابی مریم تھا جو محفوظ ہے۔ بقول ابن درید

وہ بنواسد کے موالی تھے۔ انہیں بعض جگہ مقاتل بن جدال دوز یا دوال دوز بھی لکھا گیا ہے۔ ابن حجر نے ان کے متعلق بعض غلط خیالات کی تردید اپنی کتاب ''لسان المیزان'' میں کی ہے اور واضح کر دیا ہے کہ ہمارے مقاتل یہی ہیں۔ اور دوال دوز ان کا اپنا نہیں بلکہ ان کے والد کا لقب تھا۔

مقاتل کی اہمیت بطور محدث کچھ زیادہ نہیں، کیونکہ ان پر غیر صحیح اسناد پیش کرنے کا الزام ہے۔ البتہ تفسیر قرآن میں ان کا مقام اس سے بلند ہے اگر چہ ان کی تفسیر کو بھی غیر معتبر سمجھا گیا ہے۔ سوانح نویس اگر چہ ان کی ہمہ دانی کے قصہ بیان کرتے ہیں مگر ساتھ ہی ان کی غلط بیانی کی بھی بات کرتے ہیں۔

مقاتل کی ادبی سرگرمیاں خاصی ہمہ گیر حیثیت رکھتی ہیں۔ گو کہ بیسویں صدی کے آغاز تک ان کی تصانیف کے متعلق کچھ زیادہ معلوم نہیں تھا۔ 1912ء میں ان کی تفسیر قرآن (مخطوطہ نمبر 6333) برٹش میوزیم میں دستیاب ہوئی، تاہم ایک مستشرق گولڈز ہیر کو اس کے اصلی ہونے کے متعلق شبہ ہے۔ ابن ندیم کی الفہرست میں مقاتل کی تصانیف کی ایک فہرست بھی شامل ہے۔ حاجی خلیفہ اپنی ''کشف ظنون'' میں ان میں سے چند ایک کا ذکر کرتا ہے۔ یہ تصانیف زیادہ تر علوم قرآنی کے متعلق ہیں اور قرآن مجید کی زبان اور تفسیر کو بیان کرتی ہیں، قدریہ کے خلاف ان کے ایک رسالے ''الرد علی القدریہ'' کا ذکر ملتا ہے۔ تاہم یہ بات ایک دوسری روایت سے مطابقت یا ہم آہنگی نہیں رکھتی جس کی رو سے انہوں نے ایک رسالہ جہم کے خلاف لکھا تھا اور جہم نے بھی ان کے خلاف لکھا تھا۔

ہر قسم کے محالات اور ناممکنات کے متعلق ان سے سوالات کیے جاتے تھے جن کا وہ یا تو کچھ عجیب وغریب جواب دیا کرتے تھے یا خاموش رہتے پر اکتفا کرتے تھے، چنانچہ اسی ہمہ دانی کے دعوے کی طرح جملہ ماخذ اور دیگر کتب اس بات پر متفق ہیں کہ وہ تجسیم وتشبیہ کے قائل تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں جب اس کی قطعی ممانعت تھی، مساجد میں وہ قصہ بھی بیان کرتے تھے جن کی صحت کے متعلق کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا۔ سیاست میں وہ زیدیہ فرقے کے پیرو تھے جبکہ دینی اعتبار سے وہ فرقہ مرجئہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی تفسیر الکبیر اہم ہے۔

ماخذ: اردو دائرہ المعاف پنجاب یونیورسٹی ابن الندیم، الفہرست، ابن خلکان، الوفیات، الذھبی، میزان، ابن حجر، لسان، المیزان، امام النوی تہذیب الاسماء۔

امام ابن جریر الطبری رحمۃ اللہ علیہ (839ء-923ء)

مشہور مفسر قرآن اور مورخ، تاریخ الرسل والملوک، تاریخ طبری کے مصنف

نام ونسب: ابو جعفر محمد بن جریر، ایک مفسر قرآن اور مورخ، محدث۔

پیدائش وتعلیم: صوبہ طبرستان کے پایہ تخت آمُل میں 839ء میں پیدا ہوئے۔ روایت ہے کہ انہیں چھوٹی عمر ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا، اس لیے انہوں نے صرف ساتھ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ ابتدائی تعلیم طبرستان میں پائی۔ ان کے والد ایک خوشحال انسان تھے۔ ان کی خوشحالی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ابن جریر نے اس وقت کی اسلامی دنیا کے تمام علمی مراکز کا دورہ کیا۔ علاقہ رے اور گردونواح کی سیاحت کے بعد وہ بغداد پہنچے، جہاں ان کا خیال تھا کہ وہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے اکتساب علم کریں گے، لیکن ان کی بغداد آمد کے کچھ عرصہ بعد امام حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہو گیا، کوفہ اور بصرہ کی سیاحت کے کرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر بغداد آ گئے جہاں کچھ عرصہ ان کا قیام رہا، پھر وہ مصر کی سیاحت پر چلے گئے۔ تاہم ملک شام کے شہروں میں کچھ عرصہ تحصیل علم حدیث کے لیے قیام کیا۔ ابن عساکر کے نزدیک وہ 876ء سے

877ء میں مصر میں مقیم تھے، لیکن یاقوت کی رائے یہ ہے کہ وہ مصر میں پہلی مرتبہ 867ء میں گئے تھے اور اس کے بعد ملک شام میں وارد ہوئے تھے۔

872ء میں وہ بغداد میں تھے جہاں اس وقت تک انہوں نے ایک متبحر عالم کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل کر لی تھی۔ آخری عمر بھی وہ بغداد واپس آ گئے تھے اور اپنی وفات 923ء تک سوائے طبرستان کے دو سفروں کے وہ بغداد ہی مقیم رہے۔

عالمانہ حیثیت: الطبری عالمانہ مزاج کے حامل اور اعلیٰ کردار کے مالک تھے۔ اپنی عمر کے ابتدائی ایام میں انہوں نے عرب اور اسلام کی روایات کے سلسلے میں مواد جمع کرنے کی انتہائی کوشش کی اور عمر کا باقی حصہ تعلیم و تعلم اور تصنیف و تالیف میں گذارا۔ انہوں نے مالی منعفت کو کبھی عزیز نہیں رکھا اور سرکاری عہدے قبول کرنے سے ہمیشہ انکار کرتے رہے۔ اسی وجہ سے انہیں سیر حاصل ادبی خدمات انجام دینے کے مواقع ملے۔ علم تفسیر القرآن، علم تاریخ، علم فقہ، علم اللغات، صرف ونحو، علم الاخلاق اور علم طب کی طرف انہوں نے خصوصی توجہ دی۔ مصر سے واپس آنے کے بعد دس سال تک وہ شافعی مذہب کے پیروکار رہے پھر انہوں نے اپنا ایک الگ دبستان قائم کیا جس کے پیروان کے والد کے نام پر جریریہ کہلائے مگر یہ تحریک کچھ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک سے وہ بنیادی اختلاف رکھتے تھے اور اسی وجہ سے وہ امام احمد کو حدیث شریف کا استاد مانتے تھے لیکن ان کے فقہ کے قائل نہیں تھے۔ اسی وجہ سے ان حنابلہ کی ناراضگی مول لے بیٹھے۔ حنبلیوں سے ان کی ناراضگی کی ایک اور وجہ مورخین نے قرآن مجید کی سترھویں سورۃ بنی اسرائیل کی آیۃ نمبر 81 کی تفسیر سے متعلق بتائی ہے یہ دشمنی اتنی بڑھی کہ انہیں اپنی حفاظت کیلیے اپنے مکان میں بند ہو کر رہنا پڑا کیونکہ خطرہ تھا کہ حنابلہ کا مشتعل ہجوم ان پر حملہ نہ کر دے۔ آخر محکمہ پولیس نے کاروائی کر کے انہیں جان کا تحفظ فراہم کیا تو انہیں امن نصیب ہوا۔ ان کے دشمنوں نے ان پر ملحدانہ خیالات کا الزام لگا کر انہیں قانونی ذرائع سے بھی نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔

تصانیف: الطبری کا تصنیفی کام کسی طرح بھی مکمل طور پر ہم تک نہیں پہنچا، مثلاً ان کی وہ تحریریں ہمیشہ کے لیے گم ہو چکیں ہیں جن میں انہوں نے اپنے جدید دبستان کے بنیادی اصول بیان کیے تھے۔

تفسیر: البتہ ان کی تفسیر جامع البیان فی تفسیر القران محفوظ رہ گئی ہیں۔ اس تصنیف میں انہوں نے وہ تمام قدیم مواد جمع کر دیا ہے جس سے بعد کے مفسرین استفادہ کرتے رہے، اور مستشرقین کے نزدیک یہ تفسیر تاریخی اور تنقیدی معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے۔ جو احادیث طبری نے خود جمع کیں ہیں ان کی تشریح زیادہ تر لسانی (لغات اور صرف ونحو) کے پہلو سے کی گئی ہے۔ انہوں نے ان شرائع وعقائد پر بھی، جن کا استنباط قرآن کریم سے ہوتا ہے، بحث کی ہے اور بعض جگہ تاریخی تنقید پر انحصار کیے بغیر اپنی آزادانہ رائے کا اظہار بھی کر دیا ہے۔

تاریخ طبری: ابن جریر طبری کی ایک جلیل القدر تصنیف تاریخ عالم یعنی "تاریخ الرسل والملوک ہے۔ جس کا لائیڈن (ہالینڈ) ایڈیشن اس ضخیم تصنیف کی محض تلخیص ہے اور جو اختصار کے باوجود ساڑھے بارہ جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اصل کتاب اس ایڈیشن سے تقریباً دس گنا ضخیم تھی۔

تمہید کے بعد اس تاریخ کا آغاز انبیائے کرام اور قدیم زمانے کے حکمرانوں کی تاریخ سے ہوتا ہے۔ پھر ساسانی ایرانی تاجداروں کی تاریخ بیان کی گئی ہے جس کے بعد عہد نبوی اور خلفائے راشدین کی تاریخ آتی ہے۔ اس کے بعد بنوامیہ اور بنو عباس کے عہد کا ذکر کیا گیا ہے۔

الطبری نے اپنی تاریخ عالم کے لیے ضروری مواد تحریرات اور زبانی روایات سے جمع کیا تھا جن کی فراہمی کے لیے

انہیں طویل سفر کرنے پڑے تھے۔ علامہ طبری کی یہ تصنیف اس عہد کی دوسری تواریخ سے منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی عہد اولین کی تحریروں اور اہم تاریخی مصادر کا اہم مجموعہ ہے۔ اور اس کتاب کی بدولت اسلامی عہد اولین کے عظیم مصنفین، کعب الاحبار، وہب بن منبہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، ابن شہاب زہری کی تصانیف سے اہم اقتباس ہم تک پہنچے ہیں۔ جتنا بنیادی مواد ابن جریر طبری نے اپنی اس کتاب میں اکٹھا کیا ہے کسی اور کتاب میں نہیں ملتا۔ اس طرح ان کی تفسیر بھی اہم ترین تفسیر ہے۔

ابواللیث سمرقندی رحمۃ اللہ علیہ (م 393ھ/983ء یا 396ھ/1002ء)

امام الہدیٰ، عظیم مفسر، بلند پایہ فقیہہ، زبردست مناظر اور ماہر طبیب

نام ونسب: نصر بن محمد بن ابراہیم الخطاب سمرقندی، توزی، بلخی۔ ان کا لقب الفقیہ ہے اور اسی لقب کے ساتھ وہ مشہور ہیں۔ انہیں اپنا یہ لقب بہت پسند تھا کیونکہ یہ لقب انہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں عطا کیا تھا۔ جس کا قصہ کچھ یوں ہے کہ جب وہ اپنی کتاب ''تنبیہ الغافلین'' لکھ چکے تو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک پر اسے پیش کیا، اسی رات خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی، انہوں نے خواب میں دیکھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ان کی کتاب تھماتے ہوئے فرمایا ''خذ کتابک یا فقیہ۔'' یعنی اے فقیہ! یہ لو اپنی کتاب۔'' اس کے فوراً بعد اُن کی آنکھ کھل گئی، جب کتاب پر نظر پڑی تو دیکھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں سے کچھ مقامات کی عبارتیں مٹادی تھیں۔ اس واقعہ کے بعد وہ اپنے لیے بطور تبرک یہ لقب استعمال کرنے لگے۔ ان کا لقب ''امام الہدیٰ'' بھی ہے، جبکہ کنیت ابواللیث ہے وہ نام کے مقابلے میں اپنے لقب اور کنیت سے زیادہ مشہور ہوئے۔

پیدائش و وفات: ان کی تاریخ پیدائش حتمی طور پر معلوم نہیں البتہ تذکرہ نگاروں نے اندازاً ان کا سنہ پیدائش 301ھ/ 911ء 310ھ/ 921ء کا درمیانی عرصہ قرار دیا ہے۔ کتاب النوازل میں ہے کہ انہوں نے پچپن برس عمر پائی اور ان کا انتقال 11 جمادی الآخرہ 396ھ/ یا 1002ء کو ہوا۔ بہر حال ان کی وفات کے سنہ کے بارے میں بھی مختلف رائے پائی جاتی ہے۔

علمی مقام و مرتبہ: فقیہ ابواللیث سمرقندی کو اللہ تعالیٰ نے تمام ضروری علوم وفنون میں سے وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔ تفسیر، حدیث، طب، فلسفہ سمیت کئی علوم وفنون پر کامل دستگاہ تھی۔ فقہ میں ان کو اپنے تمام معاصران پر فوقیت حاصل تھی۔ اسی وجہ سے انہیں ''ال'' کے ساتھ ''الفقیہ'' کہا جاتا تھا۔ یعنی سب سے بڑے اور کامل فقیہ، وہ مسلکاً حنفی تھے۔

اساتذہ: انہوں نے اپنے والد محمد بن ابراہیم توذی سے اور ابو جعفر ہندوانی، خلیل بن احمد قاضی سنجری جو اپنے زمانے کے شیخ الحنفیہ اور فقہ وحدیث میں فائق تھے اکتساب علم کیا تھا۔

تصانیف: انہوں نے تفسیر، فقہ، زہد ورقائق اور علم الکلام میں کئی کتب تالیف کی تھیں۔ تفسیر میں انہوں نے ''بحر العلوم'' کے نام سے ایک عظیم الشان تفسیر لکھی، جس کا ہم آگے ذکر کریں گے۔ دیگر تصانیف میں خزانۃ الفقہ، عیون المسائل، النوازل فی الفتاویٰ۔ شرح جامع الکبیر وغیرہ شامل ہیں۔

تفسیر سمرقندی: امام سمرقندی ایک ہمہ گیر شخصیت اور جامع ترین عالم تھے، مختلف موضوعات پر لکھی گئی ان کی کتب ان کی وسعت علمی کی آئینہ دار ہیں۔ ان کا سب سے اہم جو علمی کارنامہ ہے وہ قرآن کریم کی تفسیر ہے۔ اس تفسیر کا نام ''بحر العلوم'' ہے جو تفسیر سمرقندی کے نام سے بھی مشہور ہے۔

تفسیر سمرقندی مختصر مگر جامع ہے۔ امام سمرقندی اس میں صرف آیات کی تفسیر وتاویل اور اس سے متعلقہ امور پر ہی زور دیا ہے۔ غیر متعلقہ امور مثلاً نحوی، صرفی، منطقی، بلاغی، فقہی وسائل اور ان میں علما کے اختلاف ودلائل سے بالکل تعرض نہیں کیا۔ جیسا کہ دیگر مفسرین اکثر کرتے ہیں۔ تفسیر سمرقندی میں امام سمرقندی کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ ہر سورت کے شروع میں اس کی آیتوں کا ذکر کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ یہ سورت مکی یا مدنی۔ اس بابت اگر مفسرین کا اختلاف تو اس کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ پھر آیات کی تعداد بتاتے ہیں۔ بعد ازاں آیات کی تفسیر وتاویل بیان کرنے اور اس کا شان نزول بھی ذکر کرتے ہیں۔ تفسیر سمرقندی بلاشبہ ایک عمدہ، مختصر اور جامع ترین تفسیر ہے مگر کئی دیگر عمدہ تفاسیر کی طرح اس کا دامن بھی اسرائیلیات سے داغدار ہے، اگر امام سمرقندی اسرائیلیات کا ذکر کرنے کے بعد ان پر کچھ تبصرہ کرتے تو کوئی حرج نہ ہوتا مگر انہوں نے اس طرح نہیں کیا تاہم اس تفسیر کی ایک خوبی یہ ہے کہ باوجود فقیہ ہونے کے انہوں نے اپنی تفسیر میں فقہی مذاہب ودلائل وغیرہ سے بالکل تعرض نہیں کیا۔

امام ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ (م 427ھ/1035ء)

ایک مشہور امام اور مفسر قرآن، مصنف الکشف والبیان عن تفسیر القرآن

نام ونسب: احمد بن محمد بن ابراہیم ابواسحٰق النیشاپوری۔ آئمہ دین میں ایک مشہور امام اور مفسر تھے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے مشہور تصنیف تفسیر قرآن ہے جس کا عنوان الکشف والبیان عن تفسیر القرآن ہے۔ اس تفسیر پر علامہ ابن الجوزی نے اس پر بنا تنقید کی ہے کہ اس میں بالخصوص ابتدائی سورتوں کی تفسیر میں، مصنف نے ضعیف احادیث سے کام لیا ہے، لیکن شوالی کی رائے ہے کہ یہ تفسیر اس مضمون پر مفید ترین کتابوں میں سے ہے۔ کیونکہ اس میں طبری کے علاوہ تقریباً ایک سو دیگر ماخذوں سے بصیرت مندانہ طریق پر حوالے لیے گئے ہیں گو اس تصنیف کو مکمل بنانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے پھر بھی یہ تفسیر حجم میں تفسیر بیضاوی سے صرف دگنی ہے۔ یہ کتاب یاقوت کے زمانے تک وسیع پیمانے پر استعمال میں تھی۔ اس پر احمد بن المختار الرازی نے تقریباً 631ھ/1233ء میں ایک تنقید بھی لکھی تھی، لیکن اب زمانہ اُسے بھول چکا ہے اور وہ کبھی طبع نہ ہو سکی ہے۔

امام ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے مقبول تر کتاب، قصص الانبیاء موسوم بہ تاج الخصائص ہے، جو کہ دراصل ثعلبی کی تفسیر قرآن کا ہی ایک حصہ ہے مگر اس میں اس نے کچھ اضافہ کیا تھا۔ اور تفسیر کے ذیل کے طور پر معرض وجود یا معرض تحریر میں لائی گئی تھی۔ اس میں قرآن مجید میں ذکر کیے گئے تمام پیغمبروں کے قصے نہایت تفصیل سے درج ہیں۔ یہ کہانیاں قصاص کی ان ناقابل تسلیم خیال آرائیوں سے بڑی حد تک پاک ہیں جن کے کئی نمونے الکسائی کے ہاں ملتے ہیں، اس کا ایک تاتاری ترجمہ محمد امیر ابن عبداللہ الیعقوبی نے کیا تھا، چونکہ یہ تصنیف مقبول عام کے درجے کو پہنچی تھی اس لیے صحت متن کی پرواہ نہیں کی گئی۔ چنانچہ پیرس کے قلمی نسخے میں اسے الکسائی سے مخلوط کر دیا گیا ہے۔

ابن عربی الاندلسی رحمۃ اللہ علیہ (1075ء-1148ء)

مشہور اندلسی محدث ومفسر، مصنف ''احکام القرآن''

نام ونسب: ابوبکر محمد بن عبداللہ، ایک اندلسی محدث ومفسر جو اشبیلیہ SEVILL میں پیدا ہوئے (1075ء) اپنے بچپن میں اپنے والد کے ہمراہ دنیائے اسلام کے مشرق کا سفر کیا اور شام، بغداد، مکہ اور مصر کے مشہور فقہا، مثلاً الطرطوشی، اور الغزالی سے تحصیل علم کی۔ 1096ء میں حج کیا۔ جب 1099ء ان کا باپ اسکندریہ، مصر میں فوت ہو گیا تو وہ واپس اشبیلیہ چلے گئے اور وہاں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ بعد ازاں مجبوراً انہیں فاس جانا پڑا اور وہاں بھی اس نے تحصیل علم

جاری رکھی، یہاں تک کہ 543ھ/ 1148ء میں انہوں نے انتقال کیا اور فاس میں دفن ہوئے اس نے چالیس سے زائد کتابیں تصنیف کیں جن میں سے زیادہ تر اب ناپید ہیں۔ ان میں سے کئی کے نام کتابوں میں ملتے ہیں۔ اس کی سب سے اہم تصنیف ''احکام القرآن'' ہے۔ اس تفسیر کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ابن العربی نے قرآن حکیم کی تمام سورتوں کی صرف انہیں آیات کی تفسیر بیان کی ہے، جن میں احکام (COMMANDMENT) موجود ہیں۔ ایسا کرتے وقت انہوں نے یہ طریق کار ملحوظ رکھا ہے کہ وہ قرآنی سورت کا آغاز کرتے ہیں، بعدازاں آیت کا نمبر تحریر کر کے وہ ایسی آیات لکھتے ہیں جن میں ایک یا زیادہ فقہی احکام موجود ہوں۔ اس کے بعد وہ ایک ایک کر کے آیات کی ترتیب وار تفسیر بیان کرتے ہیں۔ اور اس آیات سے مستنبط ہونے والے احکام کا ذکر کرتے ہیں۔ نیز ہر آیت میں پائے جانے والے احکام بھی نمبروار بیان کرتے ہیں۔ ابن عربی کی ''احکام القرآن'' فقہی انداز کی تفسیر ہے۔ اس میدان میں یہ تفسیر بڑا اعلیٰ مقام رکھتی ہے اور فقہ مالکی کی اساسی کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ اس تفسیر کی ایک خوبی یہ ہے کہ فاضل مفسر نے اپنی تفسیر میں صحیح اور مستند روایات نقل کرنے کا خصوصی اہتمام کیا ہے۔ چنانچہ وہ اسرائیلیات سے صرف نظر کرتے ہیں اور انہیں تسلیم نہیں کرتے۔

محی السنۃ البغوی رحمۃ اللہ علیہ (م 1117ء)

مفسر قرآن، محدث اور مصنف، شافعی المذہب عالم بے بدل

نام ونسب: رکن الدین، محی السنۃ، ابو محمد الحسین بن مسعود بن محمد الفراء، شافعی مذہب کے عالم، محدث اور مفسر قرآن۔ بغ یا بغشوران کے وطن کا نام تھا جو ہرات کے قریب ایک گاؤں ہے۔ الفراء کا لقب انہیں اپنے والد کے پیشے یعنی تاجر پوستین کی وجہ سے ملا تھا۔ انہوں نے فقہ کی تعلیم قاضی الحسین بن محمد المروالروزی کی زیر نگرانی حاصل کی۔ وہ اپنے استاد کے بہت عزیز شاگرد تھے اور محدثین کی ایک جماعت سے سماعت حدیث کی۔ وہ زہد و پرہیز گاری میں مشہور تھے اور درس دیتے وقت باوضو درس دیا کرتے تھے۔ ان کی سب سے مشہور تالیف مصابیح السنۃ ہے۔ جس میں انہوں نے مضامین کے لحاظ سے ترتیب دے کر احادیث جمع کی ہیں۔ ہر باب میں پہلے وہ ''صحیح'' احادیث دیتے ہیں، یعنی وہ احادیث جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے لی گئیں ہوں اس کے بعد ''حسن'' یعنی وہ احادیث جو سنن ابی داؤد اور جامع ترمذی اور دیگر آئمہ حدیث کی کتابوں سے لی گئیں ہوں۔ عوام میں ان کی اس تصنیف کی مقبولیت بہت زیادہ ہے خاص کر اس نسخے کے جو ولی الدین (م 1342ء) نے مرتب کیا اور اس کا نام مشکوٰۃ المصابیح رکھا تھا۔ ان کی تفسیر ''معالم التنزیل'' یا تفسیر بغوی کہلاتی ہے۔

ان کی یہ تفسیر قرآن کریم بھی بہت اہم تفسیر ہے۔ اور اسی کی وجہ سے وہ مفسرین کی اعلیٰ صف میں شامل ہیں۔

البغوی کی وفات مروالروذ میں 516ھ/ 1122ء میں ہوئی۔ ابن خلکان نے ان کا سال وفات 510ھ/ 1117ء دیا ہے۔ الذھبی کہتا ہے ممکن ان کی عمر اسی سال کی ہو، لیکن السبکی کا خیال ہے کہ وہ 90 سال کی عمر پا کر فوت ہوئے تھے ان کی تالیفات کا مقصد پابند شرع لوگوں کے لیے ایسا مواد فراہم کرنا ہے جو اللہ کی رضا کے مطابق زندگی بسر کرنے میں ان کی مدد کر سکے۔

الشیخ الاکبر، ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (1165ء-1240ء)

الشیخ الاکبر، اسلامی دنیا کے مشہور عالم، صوفی، فلسفی، محدث اور مفسر قرآن

نام ونسب: شیخ ابوبکر محی الدین محمد ابن علی جو ابن العربی اور الشیخ الاکبر کے نام سے مشہور ہیں۔

ولادت وتعلیم: 17 رمضان 560ھ/ 28 جولائی 1165ء کو اندلس کے شہر مرسیہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی نسبت

الحاتمی الطائی سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا تعلق قبیلہ بنو طے کے مشہور سخی اور جواد حاتم سے تھا۔ 568ھ میں ابن عربی اشبیلیہ چلے آئے جو اندلس کا ایک معروف شہر تھا۔ یہاں اگلے تیس سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے اور مشہور علماء سے اکتساب علم کیا۔ طریق تصوف میں جن شیوخ کے زیر تربیت وہ ابتدا میں رہے ان میں سے اکثر سے ملاقات بھی ان کی اشبیلیہ ہی میں ہوئی تھی۔ 38 برس کی عمر (598ء) (1202ء) وہ دنیائے مشرق کی طرف روانہ ہوئے، جہاں سے وہ پھر کبھی لوٹ کر اپنے وطن اندلس نہ جاسکے۔ اسلامی دنیائے مشرق میں وہ سب سے پہلے مصر پہنچے اور کچھ عرصہ وہاں قیام کیا پھر مشرق قریب NEAREAST اور ایشیائے کوچک کی طویل سیر وسیاحت میں مصروف ہوگئے اور اس سلسلے میں بیت المقدس، مکہ معظمہ، بغداد اور حلب گئے۔ بالآخر انہوں نے دمشق میں مستقل سکونت اختیار کی اور دمشق ہی میں ان کا انتقال 1240ء میں ہوا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کو جبل دمشق میں دفن کیا گیا۔

متنازعہ فی شخصیت: ابن العربی کے علاوہ ملت اسلامیہ کی دوسری کوئی شخصیت نہیں جس کی وجہ سے پوری ملت اسلامیہ میں اختلاف وافتراق پیدا ہوگیا ہو۔ بعض لوگ انہیں ولی کامل اور قطب زماں سمجھتے ہیں اور علوم باطنی میں ایک ایسی سند قرار دیتے ہیں جس میں کلام نہیں۔ دوسری طرف کچھ لوگوں کے نزدیک وہ انتہائی بدترین قسم کے ملحد تھے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے بہت سے مداح جلیل القدر علماء بھی تھے جنہوں نے آپ کے عقائد کی حمایت میں کتابیں تصنیف کیں۔ مثال کے طور پر مجد الدین الفیروز آبادی، سراج الدین المخزومی، الفخر رازی، الجلال السیوطی اور عبدالرزاق الکاشانی کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ متاخرین میں سے عبدالوہاب الشعرانی کے نام کا اضافہ کرلینا کافی ہے۔

ابن عربی کے مشہور مخالفین میں رضی الدین بن الخیاط، الذہبی، ابن تیمیہ، انا بن اہاس، علی القاری، اور جمال الدین محمد بن نور الدین، صاحب کشف الغمۃ عن ھذہ الامۃ شامل تھے۔ آج بھی ابن العربی کی تصنیفات کے بارے میں اسی قسم کا متضاد رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ بعض مسلم علماء انہیں بڑی قدر اور رفعت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور طریق تصوف میں قدم رکھنے والے ہر شخص کو ان کے مطالعے کی تلقین کرتے ہیں، لیکن بعض ان کی مذمت کرتے ہیں اور اپنے پیرووں کو ان کی تصنیفات پڑھنے سے منع کرتے ہیں۔

تصنیفات ابن عربی: مولانا عبدالرحمٰن جامی نے ایک بغدادی بزرگ کے حوالے سے ابن عربی کی تصنیفات کی تعداد 500 سے زائد بتائی ہے۔ اشعرانی ان کی تعداد جامی سے تقریباً 100 کم بتاتا ہے۔ البرہان الازہر فی مناقب الشیخ الاکبر کے مصنف، محمد رجب جامی ان کی تصنیفات کی تعداد 284 بتاتے ہیں۔ اپنی وفات 632ھ سے کچھ سال پیشتر ابن عربی نے اپنی ایک عرضداشت میں اپنی کتابوں کی تعداد 251 بتائی ہے۔

ابن عربی اپنی تصانیف کا جو عظیم ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں وہ ان کے زمانے کے تمام اسلامی علوم کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ان کی بیشتر کتب کا موضوع تصوف ہے۔ اس کے علاوہ ابن عربی نے تفسیر وحدیث کے موضوعات کے علاوہ آپ نے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ادب، متصوفانہ شاعری، علوم طبیعی، بالخصوص علم ہیئت، اور علوم مخفیہ کے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا۔

ابن عربی کی مطبوعہ کتب میں الفتوحات مکیہ فی معرفت الاسرار المالکیۃ والملکیۃ۔ آپ نے اپنی یہ اہم تصنیف مکہ میں قیام کے دوران لکھی تھی۔ فصوص الحکم آپ کی دوسری اہم تصنیف ہے جو دمشق میں 627ھ میں لکھی گئی تھی، اردو زبان میں اس کتاب پر تنقید مولانا اشرف علی تھانوی نے لکھی ہے۔ بہت کم لوگوں کو اس حقیقت سے انکار ہے کہ ابن عربی ایک صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھوتے انداز فکر کے حامل فلسفی بھی تھے۔ تاہم اصل مشکل اس بات کا فیصلہ کرتے پیش آتی ہے کہ وہ زیادہ اہم صوفی تھے یا فلسفی۔ تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ایک صوفی فیلسوف تھے اور انہوں نے ایک نئے دبستان کی

تا بیس کی تھی، لیکن ان کا فلسفہ کچھ یوں ہے ترتیب سادہ اور تلفیقی ہے وہ ایک بہت بلند خیال اور گہرے صوفیانہ جذبات بھی رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کی تحریروں میں کہیں بھی جدلیاتی استدلال کا کوئی ایسا مربوط سلسلہ نہیں ملتا جو جگہ جگہ متصوفانہ جذبات کے ہیجان سے منقطع نہ ہو جاتا ہو۔ اس کے علاوہ وہ انتہا درجے کے خواب وخیال کی دنیا میں بسنے والے شخص تھے۔ ان کا فکر ان کے تخیل کے ذریعے کام کرتا تھا مگر اس میں استدلال کی ایک زیادہ گہری رو بھی جاری رہتی ہے۔

ابن عربی ایک صوفی فلسفی بھی تھے اس لیے انہوں نے اپنے تصورات کو تصوف کا لباس پہنا دیا تھا۔ ان کے اسلوب کے مبہم ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے وہ بنیادی اصول جس پر ابن عربی کے سارے متصوفانہ فلسفے کا دارومدار ہے، عقیدہ وحدت الوجود ہے۔ یہ عقیدہ مجمل طور پر ان چند الفاظ میں یہاں بیان کیا جارہا ہے۔ ''بزرگ وبرتر ہے وہ ذات جس نے سب اشیا کو پیدا کیا اور جو خود ان کا اصلی جوہر (اعیانہا) ہے نیز یہ اشعار میں بھی

''اے کہ تو نے تمام اشیا کو اپنی ذات میں خلق کیا، تو جمع کرتا ہے ہر چیز اس کو جسے تو نے پیدا کیا۔ تو وہ چیز پیدا کرتا ہے جس کا وجود تیری ذات میں (مل کر) کبھی فنا نہیں ہوتا اور اسی طرح تو ہی تنگ اور تو ہی وسیع بھی ہے۔ یہ عقیدہ وحدت الوجود کی ایک ایسی صورت ہے، جس کی رو سے تمام عالم اشیاء اس حقیقت کا محض ایک سایہ ہے جو اس کے پیچھے مخفی ہے، یعنی اس وجود کا جوہر اس شے کی آخری بنیاد جو تھی، یا ہے اور یا آئندہ ہوگی۔

ابن عربی پہلے مسلمان مفکر ہیں جنہوں نے ''الکلمہ'' (کلام الٰہی THE LOGS) اور ''انسان کامل'' کے بارے میں ایک مکمل نظریہ پیش کیا۔ ''فصوص الحکم'' اور التدبیرات الالٰہیہ کا مرکزی موضوع ہے۔ اگرچہ فتوحات مکیہ اور ان کی دیگر تصانیف میں بھی اس کے بعض پہلو معرض بحث میں آگئے ہیں، مابعد الطبیعی نقطہ نظر سے کلام الٰہی کائنات میں ایک معقول اور زندہ اصل ہے۔ یعنی وہ کسی حد تک رواقیوں کی عقل کل کے مماثل ہے، جو تمام اشیا میں جلوہ گر ہے۔ اسے ابن عربی حقیقۃ الحقائق کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ متصوفانہ اور روحانی نقطہ نظر سے وہ اسے الحقیقۃ المحمدیہ کا مترادف قرار دیتے ہیں، جس کی اعلیٰ ترین اور مکمل ترین تجلی ان تمام انسانوں میں ملتی ہے، جنہیں ہم انسان کامل کے زمرے میں شمار کرتے ہیں۔ جس میں تمام انبیاء اور اولیا اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شامل ہیں۔ انسان کامل وہ آئینہ ہے، جس میں تمام اسرار الٰہیہ منعکس ہوتے ہیں۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ (1214ء-1273ء)

علمائے اندلس میں ایک بے مثال شخصیت مصنف الجامع الاحکام القرآن

نام ونسب: ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر فرح الانصاری، اندلس کے بے مثال شہر قرطبہ سے نسبت کی وجہ سے امام القرطبی کہلائے۔ ان کا شمار ایسے علماء اور متقی لوگوں میں ہوتا ہے جو دنیا سے کم، دین اور آخرت سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔ وہ تصنیف وتالیف کے علاوہ اپنا زیادہ وقت عبادات الٰہی میں گذارتے تھے۔

ولادت واکتساب: امام قرطبی (علامہ شمس الدین قرطبی) کی ولادت 600ھ/ 1204ء میں قرطبہ میں ہوئی۔ یہاں سے پہلے اسکندریہ گئے اور پھر مصر میں سکونت اختیار کی۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے ابن رواج، ابن حمیزی، شیخ ابوالعباس احمد بن عمر قرطبی اور دیگر جید علما سے اکتساب علم کیا۔

امام ذہبی آپ کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آپ مختلف فنون میں مہارت تامہ رکھنے والے اور علم میں متبحر امام تھے۔ آپ کی تصانیف اس پر دال ہیں۔ آپ کی تفسیر کو سب سے زیادہ شہرت نصیب ہوئی۔ یہ تفسیر اپنے معنی میں کامل ہے۔ ابن فرحون نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نیک وصالح بندوں، متقی عارف علما دنیا میں زہد

اختیار کرنے والے اور ان افراد میں سے تھے۔
آپ کا انتقال مصر میں قریہ بنی خصیب میں پیر کی رات 9 شوال 671ھ بمطابق 1273ء میں ہوا اور وہیں آپ کو دفن کیا گیا۔

ان کے والد پیشے کے اعتبار سے ایک کسان تھے جو قرطبہ پر عیسائیوں کے حملے کے دوران مارے گئے تھے۔ اپنے بچپن میں امام قرطبی اپنے خاندان کی کفالت کے لیے مٹی کے برتن بنانے کے لیے مٹی ڈھوتے تھے۔ قرطبہ کے جید علما سے اکتساب علم کرنے کے بعد جب 1236ء میں قرطبہ پر عیسائی بادشاہ فرنانڈو اول نے قبضہ کرلیا تو انہیں اپنا وطن مالوف چھوڑنا پڑا۔ اسکندریہ پہنچنے کے بعد انہوں نے علم تفسیر و علم حدیث کی مزید تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد وہ قاہرہ منتقل ہو گئے اور قریہ بنی الخصیب میں اپنی باقی زندگی تصنیف و تالیف اور عبادات میں گزار دی۔

وہ اپنی سادگی اور عاجزانہ زندگی کی وجہ سے مشہور ہیں۔ 1273ء میں مصر میں ان کی قبر ایک مسجد میں منتقل کردی گئی تھی بعد از اں اس پر ایک مقبرہ تعمیر کردیا گیا۔ یہ مقبرہ 1971ء میں تعمیر کیا گیا ہے۔ امام صاحب نے اپنی جو تصانیف یادگار کے طور پر چھوڑیں ہیں ان میں شرح اسماء الحسنی، الجامع الاحکام القرآن' ایک مقبول اور نہایت مفید کتاب ہے۔ جو احکام القرآن کے موضوع پر اعلیٰ مقام رکھتی ہے اور بلاد اسلامیہ کے دینی اداروں اور جامعات میں آج بھی شامل نصاب ہے۔ اس کی خوبیوں کی نشاندہی ابن فرحون نے ان الفاظ میں کی ہے۔

''فائدہ کے لحاظ سے یہ کتاب بڑی بڑی تفاسیر میں شمار ہوتی ہے۔ اس سے قصے اور تاریخی حذف کردی گئیں اور ان کی جگہ قرآن حکیم کے احکام اور آیات سے احکام کے استنباط کے دلائل، اختلاف قراءت اور اعراب نیز ناسخ و منسوخ کو شامل کرلیا گیا ہے۔

فاضل مصنف نے اپنی کتاب کے مقدمے میں سبب تالیف اور اپنا طریقہ تفسیر تفصیل سے بیان کیا ہے اور ان شرائط کی بھی نشان دہی کردی ہے، جو مفسر نے تفسیر بیان کرتے وقت اپنے پیش نظر رکھیں تھیں۔

الجامع الاحکام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام قرطبی آیت تحریر کرنے کے بعد اسباب نزول بیان کرتے ہیں۔ نیز قرآن حکیم کے نادر اور غریب الفاظ کے معانی اور مفاہیم متعین کرتے ہیں اور ایسا کرتے وقت وہ کتب لغت سے بکثرت استشہاد کرتے ہیں۔

امام قرطبی کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ اپنی تفسیر میں باطل عقائد اور گمراہ فرقوں کا رد بھی بھرپور علمی انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اس ضمن میں معتزلہ، قدریہ، جبریہ، روافض، فلاسفہ اور غالی صوفیاء کے غلط عقائد اور باطل نظریات کا علمی پیرائے میں مضبوط دلائل سے رد کیا گیا ہے۔

امام قرطبی کا فقہی مسلک مالکی تھا، لیکن اس باب میں ان کا امتیاز یہ ہے کہ قرآنی احکام بیان کرتے وقت وہ کسی قسم کے تعصب یا جانبداری سے کام نہیں لیتے، بلکہ دلائل کے ساتھ مسائل بیان کرتے ہوئے صداقت کی جستجو میں رہتے ہیں اور جو فقہی مسلک یا رائے قرآن حکیم کے مطالب کے قریب تر ہو اس کی نشان دہی کرتے ہیں۔

اسی طرح امام قرطبی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ عدل و انصاف کا ساتھ دیتے ہیں اور مخالف رائے رکھنے والوں پر بے جا تنقید نہیں کرتے۔ کاش آج ہم بھی ان کی اس خصوصیت سے فائدہ اٹھا سکتے۔

ان کی تفسیر جامع الاحکام القرآن کو اگرچہ نمائندہ تفسیر ہونے کا درجہ حاصل ہے مگر اس کے باوجود یہ ایک طویل عرصے تک زیور طبع سے آراستہ نہ ہوسکی تھی۔ مگر شائع ہونے کے بعد اس کے کئی ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں۔

امام البیضاوی رحمۃ اللہ علیہ (1286ء-1316ء)

شیراز کے قاضی القضاۃ، مشہور شافعی فقیہ، مصنف اور صاحب تفسیر بیضاوی

نام ونسب: امام عبداللہ بن عمر بن محمد بن علی، ابوالخیر ناصرالدین شافعی مذہب سے تعلق رکھتے تھے اور شیراز کے قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز رہے۔ ان کی شہرت ایک تفسیر القرآن، قانون، فقہ، علم الاکلام اور صرف ونحو جیسے علوم پر کتابیں تصنیف کیں۔ عام طور پر ان کی تصنیفات کی بنیاد دوسرے مصنفین کی تصنیفات پر ہے۔ البتہ ان کی شہرت اسی بنا پر ہے کہ انہوں نے مختلف موضوعات پر جو کچھ لکھا ہے وہ اختصار اور ایجاز سے لکھا ہے۔ ان کی سب سے مشہور تالیف ان کی تفسیر ''انوار التنزیل واسرار التاویل'' ہے جو زیادہ تر زمخشری کی الکشاف کی تلخیص اور ترمیم شدہ صورت ہے۔ الکشاف گو بہت زیادہ علمیت کی علمبردار ہے، لیکن اس پر معتزلی نظریات کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ جن میں اصلاح پیدا کرنے کی کوشش میں البیضاوی نے بعض اوقات انہیں اپنی تصنیف میں مسترد اور حذف بھی کر دیا ہے، تاہم کہیں کہیں البیضاوی نے ان تصورات کی اہمیت کو غالباً نظر انداز کرتے ہوئے انہیں جوں کا توں بھی رہنے دیا ہے۔ اپنے مقدمے میں فاضل مفسر نے اس کے اوریجنل ہونے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ یہ لکھا ہے کہ میری مدت سے آرزو تھی کہ میں کوئی ایسی کتاب لکھوں جو ان بہترین افکار کا مجموعہ ہو جو میں نے نامور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، مقتدر علمائے تابعین اور دیگر سلف وصالحین سے حاصل کیے ہیں۔ اس کتاب میں وہ ان عمدہ نکات اور دلچسپ لطائف کو بھی شامل کرنا چاہتے تھے جو ان کے پیشروؤں نے تحقیقات سے حاصل کیے تھے۔ اس کتاب میں انہوں نے آٹھ اماموں (کیونکہ البیضاوی قراء سبعہ میں یعقوب البصری کو بھی شامل کرتے ہیں) کی بعض قراءتوں اور مستند قاریوں کی ان قراءتوں کو بھی شامل کرتے ہیں جو کسی نہ کسی قراءت سے مخصوص ہیں۔ اس کا نتیجہ ایک ایسی کتاب کی شکل میں نکلا جو ہمیشہ بے حد مقبول رہی ہے اور اسی بنا پر کئی بار شائع ہو چکی ہے۔ اس پوری کتاب یا اس کے مختلف حصوں کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ براکلمان نے ان شرحوں کی تعداد 83 بتائی ہے۔ جہاں البیضاوی نے زمخشری کے اعتزال کا رد نہیں کیا ایسی بھی دو کتابوں کا ذکر براکلمان نے کیا ہے۔

السیوطی نے الصفدی کے حوالے سے لکھا ہے کہ البیضاوی نے 685ھ/1286ء میں وفات پائی جبکہ السبکی نے ان کی وفات کا سنہ 691ھ/1292ء دیا ہے۔

البیضاوی کی دیگر مطبوعہ یا غیر مطبوعہ تصانیف میں سے ''منہاج الوصول الی علم الاصول، (فقہ)، الغایہ القصویٰ (دستاویز قانون)'' لب الباب فی علم الاعراب (صرف ونحو) مصباح الارواح اور طوالع الانوار من مطالع الانظار (علم الکلام) پر ہیں۔ انہوں نے ایک کتاب ''نظام التواریخ کے نام سے فارسی میں لکھی تھی جو 1930ء میں اردو حواشی کے ساتھ سید منصور نے حیدرآباد دکن سے شائع کی تھی۔ یہ کتاب 674ھ/1275ء تک کی تاریخ عالم سے بحث کرتی ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ (1301ء-1373ء)

ایک مشہور عرب مفسر، مورخ اور مصنف البدایہ والنہایہ

نام ونسب: اسمٰعیل بن عمر عماد الدین ابوالفداء ابن الخطیب، القرشی، البصری، الشافعی، عرب مورخ، محدث، مفسر اور مورخ۔

پیدائش: دمشق میں 710ھ/1301ء میں پیدا ہوئے۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ وہ بصرے کے قریب ایک

قریہ جدل میں پیدا ہوئے تھے۔ اور اپنے والد کے انتقال کے بعد دمشق منتقل ہوئے تھے۔ دمشق ہی میں انہوں نے اپنے استاد ابن تیمیہ کے ساتھ حکومتی اذیتیں برداشت کیں تھیں۔ دمشق ہی میں اپنی والدہ سے قرآن پاک حفظ کیا تھا اور عربی زبان کے قواعد صرف ونحو بھی اپنی والدہ سے سیکھے تھے۔

تعلیم: ابن کثیر نے فقہ کی تعلیم کمال الدین الفزاری اور کمال الدین بن قاضی الشہبہ سے حاصل کی۔ یہ دونوں علما شیخین کہلاتے ہیں۔ حافظ ابوالحجاج مزی کے قریب رہ کر سیر الرجال کے موضوع پر ان کی تصنیف ''تہذیب الکمال'' پڑھی۔ جیسا کہ پہلے ذکر آیا ابن کثیر، ابن تیمیہ کے خصوصی شاگردوں میں تھے انہوں نے موصوف سے بہت کچھ سیکھا، اُنہی کی صحبت میں رہ کر علمی، دینی اور اخلاقی تربیت حاصل کی۔ امام ابن تیمیہ کی شاگردی نے انہیں علم وفضل میں ایک امتیازی حیثیت عطا کی جس سے بہت سے دیگر علمانے استفادہ کیا۔ تاہم وہ اپنے عقائد ومسلک میں متعصب نہ تھے۔

امام ابن کثیر کو علم حدیث کے علاوہ فقہ، تفسیر اور تاریخ میں بھی درجہ کمال حاصل تھا۔ علامہ ابن العماد حنبلی لکھتے ہیں کہ تاریخ، تفسیر اور حدیث میں ان پر ریاست علمی ختم ہوگئی۔

وفات: آخر عمر میں بینائی جاتی رہی تھی۔ جمعرات 26 شعبان 774ھ/ 1373ء میں وفات پائی اور مقبرہ صوفیہ میں اپنے محبوب استاد شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے پہلو میں دفن ہوئے۔

تصانیف آپ کی تصانیف میں تفسیر قرآن العظیم آپ کی تاریخ البدایہ والنہایہ کے ساتھ سرفہرست ہے۔ حافظ سیوطی لکھتے ہیں کہ اس طرز پر کوئی دوسری تفسیر نہیں لکھی گئی۔ یہ تفسیر بالروایہ میں سب سے زیادہ مفید ہے۔

قاضی شوکانی فرماتے ہیں۔ ابن کثیر نے جو کچھ اس میں جمع کیا اور خوب محفوظ کر دیا، مذاہب نقل کیے، حدیثیں لکھیں، آثار درج کیے اور بہت ہی عمدہ اور نفیس کلام فرمایا۔ مصنف نے اس کتاب میں سب سے پہلے تفسیر القرآن بالقرآن کے اصول پر ایک آیت کی تفسیر کی جو اسی مضمون کی حامل دوسری آیات کی روشنی میں کی گئی ہے۔ پھر محدثین کی مشہور کتابوں سے اس کے بارے میں جو احادیث مروی ہیں ان کو نقل کیا اس طرح یہ تفسیر بالحدیث ہوگئی پھر ان کی اسانید در رجال پر سیر حاصل بحث کرتے اور اس کے بعد آثار صحابہ وتابعین کو لاتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر کا یہ سب سے بڑا علمی کارنامہ ہے کہ انہوں نے تفسیر وتاریخ سے اسرائیلیات کو چھانٹ کر الگ کر دیا۔ سچ یہ ہے کہ اس کام کے لیے ان جیسے ہی کسی بالغ نظر محدث کی ضرورت تھی۔ یہ اتنا بڑا کام ہے کہ اگر ان کی علمی خدمات میں صرف یہی علمی خدمت ہوتی تب بھی انہیں ایک عظیم علمی شخصیت ثابت کرنے کے لیے کافی تھی۔

البدایہ والنہایہ: امام ابن کثیر کی دوسری عظیم الشان تصنیف البدایہ والنہایہ ہے جو فن تاریخ میں ان کی بیش بہا تصنیف ہے۔ اس میں ابتدائے کائنات سے لے کر انبیائے کرام پھر سیرت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے بعد خلافت راشدہ سے لے کر اپنے عہد تک تاریخ انہوں نے رقم کی تھی۔ تاریخ سے بھی انہوں نے اسرائیلیات کو الگ کر کے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ صاحب کشف ظنون نے لکھا ہے کہ ہزار ہا سال کے وقائع جو اس میں بیان کیے گئے ہیں قابل اعتبار ہیں۔

علامہ السیوطی رحمۃ اللہ علیہ (1445ء-1505ء)

عہد مملوک کے مصر کے ایک کثیر التصانیف مصنف، متبحر عالم اور مفسر

نام ونسب: ابوالفضل عبدالرحمٰن بن ابی بکر بن محمد جلال الدین الخضیری، الشافعی، السیوطی، عہد مملوک کے مصر کا ایک کثیر التصانیف مصنف، ایرانی الاصل، ان کا خاندان پہلے بغداد میں آباد تھا اور پھر مصر آ گیا۔ یہ خاندان علامہ السیوطی سے کم از

کم 9 پشت پہلے مصر کے شہر سیوط میں آ کر آباد ہو گیا تھا اور اسی نسبت سے السیوطی کہلایا اس خاندان کے بہت سے افراد نے سرکاری ملازمتوں میں ممتاز حیثیت حاصل کر لی تھی۔

پیدائش و تعلیم: السیوطی یکم رجب 849ھ/ 3 اکتوبر 1445ء کو قاہرہ میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد مدرسہ الشیخونیہ میں مدرس تھے۔ السیوطی جب پانچ چھ برس کے ہوئے تو ان کے والد کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا۔ آٹھ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ ان کے والد کے ایک صوفی دوست نے ان کو اپنا متبنیٰ بنا لیا۔ انہیں ان کو اس وقت کے جید علما سے تعلیم دلوائی، تفسیر، حدیث، معانی، بیان اور طب کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ فریضہ حج ادا کرنے کے لیے سرزمین حجاز پہنچے اور وہاں کے علما سے بھی اکتساب علم کیا۔ قاہرہ واپس آنے پر پہلے قانونی مشیر کی حیثیت سے کام کرنے لگے پھر کسی کی سفارش سے انہیں مدرسہ الشیخونیہ میں اپنے والد کی جگہ مل گئی۔ 1486ء میں وہ اس سے بھی زیادہ اہم مدرسہ البیبرسیہ میں منتقل ہو گئے تاہم رجب 906ھ/ فروری 1501ء میں انہیں نے ان کے منصب سے علیحدہ کر دیا گیا جس کے بعد وہ دریائے نیل میں واقع ایک جزیرہ، ''الروضہ'' میں گوشہ نشین ہو گئے اور جب تین سال بعد ان کا جانشین وفات پا گیا تو انہیں دوبارہ اس عہدے پر کام کرنے کے لیے بلایا گیا مگر انہوں نے اس عہدے کو دوبارہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے 18 جمادی الاولیٰ 911ھ/ 17 اکتوبر 1505ء کو وفات پائی۔

ادبی مشاغل: السیوطی نے اپنے ادبی مشاغل کا آغاز اپنی عمر کے سترھویں سال ہی میں شروع کر دیا تھا۔ ان کے اس کام کی ایک خصوصیت ہمہ گیری ہے۔ ان کی تصانیف کی فہرست بڑی طویل ہے۔ مشہور مستشرق فلیوگل FLUGEL نے ان کی تصانیف کی تعداد 561 بتائی ہے، لیکن اس فہرست میں ضخیم کتابوں کے ساتھ ساتھ بہت سے چھوٹے چھوٹے رسالے بھی شامل ہیں۔ البتہ السیوطی نے خود اپنی تصانیف کی تعداد 300 بتائی ہے۔ السیوطی نے علوم کے تمام شعبوں پر طبع آزمائی کی ہے اور ان کی بعض تالیفات تو فی الواقع بہت بیش قیمت ہیں کیونکہ وہ بعض گم شدہ قدیم علمی کتب کی اور نیز علوم و معارف کے قیمتی ذخیروں کی خالی جگہ پر کرتی ہیں۔ ہم یہاں ان کی چند مشہور کتابوں کا ذکر کریں گے۔

ان کی سب سے اہم تصنیف ''ترجمان القرآن فی التفسیر المسند'' ہے اس میں السیوطی نے وہ تمام احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم جمع کر دیں ہیں جن کا تعلق قرآن پاک کی تفسیر سے ہے۔ قرآنی سورتوں کی شان نزول پر انہوں نے ایک الگ کتاب ''کتاب النقول فی اسباب النزول'' لکھی ہے۔ ان کی ایک مقبول عام تفسیر، ''تفسیر جلالین'' ہے۔ یہ تفسیر ان کے استاد جلال الدین محلی کے شروع کی تھی اور اسے السیوطی نے 40 دن کے اندر مکمل کیا تھا۔ اس کے بعد السیوطی نے ایک مبسوط تفسیر، مجمع البحرین و مطلع البدرین کے نام سے شروع کی تھی لیکن شاید یہ کتاب ضائع ہو گئی یا پایہ تکمیل کو نہیں پہنچی صرف اس کا مقدمہ ہم تک پہنچا ہے۔ السیوطی کی دیگر اہم تصانیف میں ''جامع المسانید'' جو جامع الکبیر بھی کہلاتی ہے۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا مجموعہ ہے۔ ایک اور کتاب ''خصائص الکبریٰ'' کہلاتی ہے اور صرف خصائص و معجزات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر مشتمل ہے۔ تاریخ کے موضوع پر ان کی تصنیف تاریخ الخلفاء بھی بہت اہم ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ (م 1225ھ-1810ء)

ہندوستان کے مشہور عالم، مفسر قرآن، صاحب تفسیر المظہری

نام و نسب: ثناء اللہ پانی پتی، قاضی، حنفی، مجددی از اولاد جلال الدین چشتی صابری پانی پتی (م 852ھ/ 1448ء) ان کا نسب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔

پیدائش وتعلیم: آپ پانی پت (مشرقی پنجاب) میں 1143ھ/1730ء کو پیدا ہوئے۔ سات سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کیا پھر علوم عقلیہ ونقلیہ کی تحصیل میں مشغول رہے اور اسی سلسلے میں دہلی گئے، جہاں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م1176ھ/1762ء) سے حدیث پڑھی۔ پھر صغیر سنی ہی میں حافظ محمد عابد لاہوری، سنامی، احمدی، نقشبندی سے علم طریقت اخذ کیا۔ ان کی وفات کے بعد اور ایک روایت کے مطابق ان کی ہدایت پر میرزا مظہر جان جاناں دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے بھی علم طریقت (احمدیہ) حاصل کیا۔

میرزا مظہر ان کے جوہر سے بہت متاثر ہوئے اور انہیں ''علم الہدیٰ'' کا لقب عطا کیا۔ میرزا مظہر جان جاناں نے ان کے حق میں ایک بار یہ بھی فرمایا کہ: اگر اللہ مجھ سے بروز حشر پوچھے گا کہ ہماری درگاہ میں کیا تحفہ لائے ہو تو میں عرض کروں گا کہ ثناء اللہ پانی پتی کو لایا ہوں۔''

تحصیل علم کے بعد ثناء اللہ وطن واپس لوٹے اور باقی عمر تصنیف وتالیف اور نشر علوم میں گزار دی۔ ان کے قلم سے بہت سی مشہور کتب نکلیں۔ فقہ واصول میں مرتبہ اجتہاد کو پہنچے۔ تفسیر وکلام وتصوف میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا، صفاء ذہن، جودت طبع، قوت فکر اور سلامت عقل کے لیے مشہور تھے۔

آپ نے پانی پت میں منصب قضا اور فصل قضایا بھی اختیار کیا اور اس مرتبے کا حق ادا کر دیا۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے انہیں ''بیہقی وقت'' کا خطاب دیا۔ قاضی ثناء اللہ نے یکم رجب 1225ھ/2 اگست 1810ء کو وفات پائی۔ خزینۃ الاصفیا میں ان کی تاریخ وفات 1216ھ درج ہے جو درست نہیں۔

تالیفات: قاضی صاحب نے تقریباً 30 تالیفات اپنی یادگار چھوڑیں جن میں کتب ورسائل شامل ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔

(1) وصیت نامہ: انہوں نے بعمر 80 سال گھریلو حالات کے مطابق چھوڑا۔

(2) تفسیر مظہری (عربی سات جلد) یہ ان کی معروف ترین تصنیف ہے جو انہوں نے اپنے پیرومرشد میرزا مظہر جان جاناں کی وفات کے بعد لکھنا شروع کی تھی اور انہیں کے نام سے معنون ہے۔ یہ تفسیر پہلے دہلی سے اور پھر حیدر آباد دکن سے دس جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس تفسیر کا رنگ محدثانہ ہے اور یہ فقہ حنفی کے مزاج کے مطابق ہے۔ متداول تفاسیر میں سے ابن جریر طبری، البیضاوی اور البغوی کی تصانیف کی طرف زیادہ اشارے ملتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی قاضی صاحب نے محمد بن اسحٰق اور الکلبی کی تالیفات پر بھی انحصار کیا ہے۔ لغوی بحث کے لیے اکثر الاخفش، ابن کیسان، الزمخشری اور الفیر وز آبادی پر اعتماد کیا گیا ہے۔ قراءت کے سلسلے میں انہوں نے مشہور قاریوں کے علاوہ ہشام (ابو ولید) کو بھی قابل اعتماد جانا ہے۔ شاہ غلام علی نے لکھا ہے کہ تفسیر مظہری قدمائے مفسرین اور تاویلات جدیدہ کا حسین امتزاج ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی دیگر اہم تصنیفات یہ ہیں۔

(3) مالابد منہ، فقہ حنفی پر فارسی زبان میں ایک اہم کتاب۔

(4) ارشاد الطالبین، تصوف پر ایک معتبر کتاب ہے۔

(5) جواہر القرآن، آیات قرآنی کا اشاریہ۔

(6) حقوق یا حقیقت الاسلام، ہر صاحب حق کا حق سالم وکامل ادا کرنے کے بارے میں بزبان فارسی ایک اہم تصنیف۔

(7) شہاب ثاقب۔

(8) تذکرۃ الموتیٰ والقبور مختصر سا فارسی رسالہ

(9) رسالہ در اباحت وحرمت سرود

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (1159ھ/1746ء-1239ھ/1824ء)

ہندوستان کے مشہور عالم دین اور مفسر، حضرت شاہ ولی اللہ کے بڑے صاحبزادے

نام ونسب: شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

پیدائش وتعلیم: 25 رمضان 1159ھ/ 11 اکتوبر 1746ء کو بوقت سحر پیدا ہوئے۔ والد بزرگوار نے عبدالعزیز نام رکھا۔ تاریخی نام غلام حلیم ہے۔ بچپن ہی میں قرآن مجید حفظ کیا اور تجوید وقراءت سیکھی۔ گیارہ سال کی عمر میں باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی۔ والد نے اپنے خلفاء میں سے ایک قابل شخص کو تعلیم کے لیے مقرر کر دیا۔ تقریباً دو سال میں شاہ عبدالعزیز نے عربی کے مختلف علوم میں بڑی سرعت سے ترقی کی۔ طبیعت میں ایسی جولانی اور تیزی پیدا ہوئی جس کی نظیر بہت کم ملتی ہے۔

پھر والد بزرگوار کے حلقہ درس میں شمولیت اختیار کی۔ اس حلقہ درس میں وہی طلبا شریک ہوتے تھے جن کے حافظے اور ذہانت کی دھوم ہوتی تھی۔ عمر عزیز کے سولھویں سال میں قدم رکھا تو تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، عقائد، منطق، کلام، ہندسہ، ہیئت، ریاضی، تاریخ اور جغرافیہ وغیرہ میں مہارت تامہ حاصل کر چکے تھے۔ لیکن ان کو خاص ذوق قرآن کریم سے تھا۔ شاہ عبدالعزیز نے خود لکھا ہے کہ والد میرے استاد کو خصوصی طور پر قرآن پڑھانے کی تلقین کرتے تھے۔

تقریر ابتدا ہی سے بہت شستہ اور فصیح تھی۔ جب کوئی مشکل مسئلہ پیش آتا تو ایسے انداز میں حل کر دیتے کہ بڑے بڑے فضلاء حیرت میں پڑ جاتے تھے۔ والد بزرگوار کی وفات پر صرف سولہ برس کی عمر میں ان کی مسند درس سنبھالی۔ اس وقت سے زندگی کے آخری سانس تک اپنا وقت درس وتدریس، تصنیف وتالیف، دعوت وارشاد، مریدوں کی تربیت اور تکمیل میں صرف کیا۔ پہلے نصیر الدین دہلی کو چراغ دہلی کا لقب ملا تھا اب کسی عالم نے ان کو ''سراج الہند'' کا لقب دیا۔

حافظہ بے مثال پایا تھا۔ اکثر غیر مشہور کتابوں سے املا صرف یادداشت کی بنیاد پر لکھواتے تھے۔ ان کے ایک معاصر، مولانا فضل امام خیر آبادی لکھتے ہیں۔ اب کچھ مدت سے بیماری کی وجہ سے کتاب بینی کی طاقت نہیں، تمام علوم وفنون عقلی ونقلی زبانی از بر ہیں۔ علم حدیث وفقہ کے اصول اور عام علوم عربیہ خاص لغت میں مشہور ہیں۔ باطنی فیوض وبرکات اور نوائے روحانی کی حدت سے علمی حقائق بیان فرماتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بحر زخار موجزن ہے۔

نظر اس درجہ حقیقت رس تھی کہ بہ نیت مباح انگریزی زبان سیکھنے کا فتویٰ دے دیا۔ حالانکہ اکثر علما شاہ صاحب کی وفات کے پچاس برس بعد بھی اس باب میں متوقف رہے۔ ہفتے میں دو مرتبہ سہ شنبہ اور جمعہ کو درس گاہ میں واعظ فرماتے تھے جس میں عوام وخواص سبھی شرکت کرتے تھے۔

اواخر رمضان 1239ھ/ 1824ء میں بیمار ہوئے مرض نے شدت اختیار کی جو نقدی پاس تھی شرعی طور پر بھتیجوں اور اقربا میں تقسیم کر دی۔ پھر وصیت فرمائی کہ میرا کفن اسی کپڑے کا ہو، جو میں پہنتا رہا، وہ گاڑھے کا کرتا پاجامہ پہنتے تھے۔ 7 شوال 1239ھ/ 5 جون 1824ء کو انتقال ہوا۔ اسّی برس عمر پائی۔

آپ کی تصانیف میں تفسیر فتح العزیز معروف بہ تفسیر عزیزی بہت معروف ہے۔ اس کی پہلی جلد ابتدا سے پارہ دوم کے ربع تک ہے۔ دوسری اور تیسری جلد آخری دو پاروں کی تفسیر ہے۔ ان کی ایک اور اہم تصنیف ''تحفہ اثنائے عشریہ'' ہے۔ بستان المحدثین بھی اہم تصنیف ہے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ سر الشہادتین (واقعہ شہادت کربلا) سید علی اکبر نے اس کتاب کا ترجمہ ''السعادۃ'' کے نام سے فارسی میں کیا ہے۔ فتاویٰ عزیزی بھی ایک اہم تصنیف ہے اس کے علاوہ بھی کئی اور

اہم تصانیف ہیں جو شائع ہو چکی ہیں۔

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ (1802ء-1854ء)

انیسویں صدی عیسوی کے مفتی بغداد اور صاحب تفسیر ''روح المعانی'' الآلوسی ایک خاندان کا نام، جس کے ارکان میں انیسویں اور بیسویں صدی میں بغداد کے بہت سے متبحر علما شامل تھے۔ آلوسی آلوس سے منسوب ہے، جو دریائے فرات کے مغربی کنارے پر ابوکمال اور رمادی کے درمیان واقع ہے۔ اپنی خاندانی روایات کے مطابق آلوسی حسنی اور حسینی سید ہیں۔ ان کے اجداد مغل فاتح ہلاکو خاں سے جان بچا کر بغداد سے آلوس بھاگ آئے تھے۔ پھر کہیں گیارہویں صدی ھ/سترھویں صدی عیسوی میں یہ خاندان واپس بغداد آیا۔ اس خاندان کے افراد میں صاحب علم کافی ہو گزرے ہیں۔ ان میں سے ایک ابوالثناء محمود شہاب الدین بن عبداللہ صلاح الدین (1802ء-1854ء) تھے۔ یہ کئی سال تک بغداد کے مفتی بھی رہے۔ وہ ایک نامور معلم، مفکر اور مناظر بھی تھے۔ ان کی بے شمار تصنیفات میں تفسیر ''روح المعانی'' سب سے اہم تصنیف ہے۔

ولادت و تعلیم: علامہ آلوسی 1217ھ/ بمطابق 1802ء کو بغداد کے محلہ کرخ میں پیدا ہوئے۔ ان کا انتقال بروز جمعہ 25 ذیقعد 1270ھ/ 1854ء کو بغداد ہی میں ہوا اور وہ کرخ ہی میں حضرت شیخ معروف کرخی کے مقبرے میں دفن ہوئے۔ آپ نے اپنے زمانے کے سرآمد روزگار علماء سے اکتساب فیض کیا، جن میں آپ کے والد علامہ عبداللہ اندلسی، شیخ خالد نقشبندی اور شیخ علی سویدی شامل ہیں۔ علم کے حریص تھے، ہر وقت اس فکر میں لگے رہتے کہ کس طرح علم میں اضافہ ہو، رات دیر گئے تک مطالعہ کرتے رہتے، اکثر یہ اشعار پڑھا کرتے تھے سھری لتنقیح العلوم الذلی من وصل غانیۃ وطیب عناق

ترجمہ علم کی گتھیاں سلجھانے کے لیے راتوں کو جاگنا مجھے پاکیزہ اور حسین دوشیزہ کے ملاپ سے زیادہ عزیز (لذیذ) ہے۔

ویسے تو علامہ آلوسی کی ہر تالیف نہایت عمدہ اور بیش قیمت ہے۔ مگر جو مرتبہ اور مقام ان کی تفسیر ''روح المعانی'' کو حاصل ہے وہ کسی اور کو نہیں۔ روح المعانی نے ہی انہیں شہرت کی اوج ثریا پر پہنچایا، اس کے مقدمے میں تالیف کا قصہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں ابھی کم عمر تھا کہ مجھے کتاب اللہ کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھانے اور اس کے عجائب میں غور وفکر کرنے، اس کے معانی سے آگہی حاصل کرنے کا اور اس کے رموز و اسرار کو سمجھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس مقصد کے لیے میں نے انتھک محنت شروع کر دی ابھی عمر عزیز کی بیسویں بہار مکمل نہ ہونے پائی تھی کہ میں قرآن مجید کے ان اسرار و رموز اور حقائق و دقائق کو لوگوں کے سامنے بیان کرنا شروع کر دیا۔

پھر رجب 1252ھ کی شب میں نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا، یہ جمعہ کی رات تھی، میں نے خواب میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے آسمان اور زمین کے لپیٹنے اور طول و عرض پر ان دونوں کو جوڑنے کا حکم دیا۔ پس میں نے اپنا ایک ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیا اور دوسرا ہاتھ پانی کے مستقر کی طرف بڑھایا۔ پھر میں فوراً جاگ اٹھا، مجھے اپنا یہ خواب بہت بڑا معلوم ہوا، میں نے اس کی تعبیر تلاش کرنے کی کوشش کی، چنانچہ پھر ایک کتاب میں مجھے تفسیر قرآن لکھنے کا اشارہ ملا چنانچہ میں اللہ تعالیٰ کی مدد سے قرآن کی تفسیر لکھنا شروع کر دی۔ اس وقت میری عمر 34 سال تھی، تفسیر کا آغاز 16 شعبان 1252ھ کو بوقت شب کیا۔ پھر یہ منگل کی شب 4 ربیع الآخر 1267ھ کو مکمل ہوگئی۔ تفسیر لکھنے میں آسانی کے لیے علامہ آلوسی نے 1263ھ میں عہدہ افتاء سے علیحدہ کر لی تھی۔ 1267ء میں وہ تفسیر مکمل کرنے کے بعد قسطنطنیہ پہنچے اور انہوں نے اپنی تفسیر سلطان عبدالمجید خاں کی خدمت میں پیش کی جنہوں نے اسے بہت پسند کیا پھر علامہ آلوسی واپس بغداد آگئے۔ ''روح المعانی'' ایک

جامع ترین تفسیر ہے، علامہ آلوسی نے پوری امانت و دیانت کے ساتھ روایۃ و درایۃ، سلف وخلف کی آراواقوال کا جامع بنانے میں بے پناہ محنت کی ہے۔ روح المعانی انیسویں صدی تک لکھی جانے والی تمام تفاسیر کا نچوڑ ہے۔

مولانا سید نعیم مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ (1887ء-1948ء)

نام ونسب: ممتاز عالم دین جن کا تاریخی نام غلام مصطفیٰ تھا۔ والد کا نام مولانا محمد معین الدین نزہت تھا۔ تدریس میں خاصا کمال حاصل تھا اور ''استاذ العلما'' کے لقب سے مشہور تھے۔ مولانا فاضل بریلوی (احمد رضا خاں) نے ان کو ''صدر الافاضل'' کا خطاب دیا تھا۔

پیدائش وتعلیم: 21 صفر 1300ھ/ یکم جنوری 1882ء کو مراد آبادی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں پائی۔ ایک عرصہ تک مولانا ابوالکلام کے رسائل ابلاغ اور الہلال میں مضامین لکھتے رہے۔ 20 برس کی عمر میں مولانا شاہ محمد سلامت اللہ رامپوری کے رسالہ ''اعلام الزکیاء'' کی تائید میں ''الکلمۃ العلیا'' لکھا۔ آپ زبردست مناظر تھے۔ امام احمد رضا خان بریلوی کے ترجمہ القرآن کنز الایمان پر تفسیری حاشیہ بنام ''خزائن العرفان'' تحریر کیا۔

سیاسی نمائندگی: 1946ء میں بنارس میں منعقدہ سنی کانفرنس میں سُنی علما میں اتحاد پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

انتقال: 67 برس کی عمر میں 18 ذوالحجہ 1367ھ/ 1948ء میں انتقال کیا۔ جامعہ نعیمیہ مراد آباد میں مزار ہے۔

1330ھ میں ان کی دستار بندی ہوئی تھی۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے انہیں اپنا وکیل مقرر کیا۔

علمائے مراد آباد کو سلسلہ قادریہ سے ایک گونہ لگاؤ اور دلچسپی رہی رہے، اس لیے یہاں کے اکثر علما سلسلہ قادریہ سے منسلک رہے ہیں۔ مولانا سید نعیم مراد آبادی نے حضرت مولانا گل محمد سے سلسلہ قادریہ سے بیعت کی تھی۔

اعلیٰ حضرت بریلوی کی خدمت میں: صدر الافاضل کا اعلیٰ حضرت بریلوی کی خدمت میں حاضر ہونا بھی ایک عجیب واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ایک بار جودھ پور کے ایک شخص ادریس نامی نے نظام الملک اخبار میں اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی مخالفت میں ایک مضمون لکھا جس میں اس نے نہایت بے ہودہ کلام اور فحش گوئی سے کام لیا۔ حضرت صدر الافاضل کو یہ مضمون دیکھ کر دلی رنج پہنچا۔ اور اُسی وقت اس خرافات کا نہایت مدلل اور پرمغز جواب تحریر فرمایا اور اسے اسی اخبار سے شائع کیا۔ جب اس واقعہ کا اعلیٰ حضرت بریلوی کو علم ہوا تو آپ نے حاجی محمد اشرف شاذلی کو لکھا کہ وہ مولانا سید محمد نعیم الدین کو لے کر بریلی آئیں۔ اس ملاقات سے آپ پر اعلیٰ حضرت کے علمی اور عملی نور کا ایسا پرتو پڑا کہ ہمیشہ ملاقات کے لیے جانے لگے اور اس علم کے دریا سے سیراب ہونے لگے۔

فن مناظرہ: حضرت صدر الافاضل کو مناظرہ میں ایسا کمال حاصل تھا کہ جب بھی کسی سے مناظرہ ہوا اللہ نے اپنے فضل وکرم سے آپ کو دشمن پر غالب کیا کوئی عیسائی آریہ، رافضی، خارجی اور قادیانی آپ کے سامنے صرف دس منٹ بھی نہیں ٹھہر سکا بلکہ ذلت شکست اٹھا کر رخصت ہوجاتا یا مقام مناظرہ تک پہنچتا ہی نہیں تھا۔ اعلیٰ حضرت نے آپ کو مناظروں کا انچارج بنادیا تھا جہاں کہیں کوئی ہندو یا عیسائی مناظرے کے لیے سر اٹھاتا تو آپ اس کی سرکوبی کے لیے صدر الافاضل کو وہاں بھیج دیتے تھے۔

جامعہ نعیمیہ مراد آباد: 1328ھ میں آپ نے مراداباد میں ایک بعدازاں اس درس گاہ کا نام جامعہ نعیمیہ رکھا گیا۔ اس ادارے میں آج ہزاروں تشنگان علم اپنی پیاس علمی بجھا رہے ہیں۔

درس وتدریس: آپ درس حدیث دیا کرتے تھے۔ فن حدیث کے دیگر علما کی طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو بلا کی

قوت حافظہ سے نوازا تھا۔

تفسیر قرآن: آپ کی تفسیر "خزائن العرفان" نکات بدیعہ سے مزین ہے۔ اس کا انداز بیان نہایت دلچسپ اور زبان نہایت عمدہ اور عام فہم ہے۔ اسی لیے آپ کی تفسیر کو ہر شخص ذوق وشوق سے پڑھتا ہے۔ اس تفسیر کے الفاظ میں وہ ادب و محبت ہے کہ پڑھنے سے دل میں ایک عجیب سا شوق اور دیدار کی تڑپ پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ کی دیگر تصانیف میں اطیب البیان، الکلمۃ العلیا، سوانح کربلا، کتاب العقائد اور دیوان ریاض نعیم شامل ہیں۔

مفتی احمد یار خان نعیمی رحمۃ اللہ علیہ (1906ء-1971ء)

صاحب تفسیر نعیمی، برصغیر پاک و ہند کے ایک حنفی عالم

نام ونسب: مولانا مفتی احمد یار خان نعیمی، بن مولانا یار محمد خان

پیدائش وتعلیم: 1906ء میں اوجھیانی ضلع بدایوں میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد مکرم مولانا یار محمد خان اور مولانا قدیر بخش، (مدرسہ شمس العلوم بدایوں) سے تعلیم حاصل کی۔ بریلی شریف گئے اور مولانا احمد رضا خاں سے بھی اکتساب فیض کیا۔ مدرسہ شمس العلوم بدایوں کے بعد مدرسہ اسلامیہ مینڈھو ضلع علی گڑھ میں بھی کچھ عرصہ تعلیم حاصل کی، پھر مراد آباد چلے گئے جہاں مدرسہ نعیمیہ میں داخلہ لے لیا۔ حضرت مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی نے جوہر قابل کو پہچان لیا اور خود تعلیم دینے لگے۔

درس وتدریس: بیس سال کی عمر میں درس نظامی کی تکمیل پر جامعہ نعیمیہ ہی میں مدرس کی حیثیت سے ان کی تقرری ہوئی۔ تدریسی فرائض کے علاوہ فتویٰ بھی جاری کرتے تھے۔ تین سال کچھوچھہ شریف میں بھی قیام رہا۔ مولانا سید ابوالبرکات احمد کی دعوت پر پاکستان تشریف لائے اور بارہ تیرہ سال دارالعلوم خدام صوفیہ اور دس برس انجمن خدام رسول میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔ مفتی صاحب نے تحریک پاکستان میں مسلم لیگ کے لیے کام کیا تھا۔ تفسیر نعیمی نعیم الباری فی انشراح البخاری، مراۃ مشکوٰۃ شریف، نور العرفان فی حاشیہ القرآن، جاالحق، علم المیراث، اسلامی زندگی آپ کی اہم تصنیفات ہیں۔ ان میں تفسیر نعیمی سب سے اہم ہے، تفسیر نعیمی کی خصوصیات خود بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں یہ تفسیر، تفسیر روح البیان، تفسیر کبیر، تفسیر عزیزی، تفسیر مدارک، تفسیر محی الدین ابن عربی کا خلاصہ ہے۔ اردو تفاسیر میں سب سے بہتر تفسیر خزائن العرفان جو حضرت مرشدی، استاذی، صدر الافاضل مولانا نعیم الدین صاحب قبلہ مراد آبادی کی ہے۔ اس کو مشعل راہ بنایا گیا ہے، گویا یہ تفسیر اس کی تفصیل ہے۔ اس میں ہر آیت کا پہلی آیت سے تعلق اور شان نزول بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ مفتی احمد یار خان نے نعیمی 1971ء میں وفات پائی۔ ان کی نماز جنازہ مولانا ابوالبرکات نے پڑھائی۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (1887ء-1949ء)

وہ مسلم عالم اور مفسر قرآن جس نے 1940ء کی دہائی میں تحریک پاکستان کی حمایت کی اور قائداعظم کی نماز جنازہ پڑھائی۔

نام ونسب: مولانا شبیر احمد عثمانی بن فضل الرحمان

پیدائش وتعلیم: 11 اکتوبر 1987 کو بجنوں اتر پردیش، بھارت میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد فضل الرحمن ایک ڈپٹی اسکول انسپکٹر تھے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی کی پیدائش کے وقت انہیں بریلی ٹرانسفر کر دیا گیا تھا۔ تاہم علامہ شبیر احمد عثمانی نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی اور وہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے خصوصی شاگرد بن گئے۔ انہوں نے 1928ء دارالعلوم دیوبند

سے اسناد حاصل کیں اور اس کے بعد 1928ء سے 1943ء تک ڈابھیل ضلع گجرات کاٹھیاواڑ میں جامع عربیہ میں درس دیا۔ آخری دور میں دارالعلوم دیوبند کے مہتمم کی حیثیت سے خدمات انجام دیں، لیکن بعض ناخوشگوار واقعات کی وجہ سے علیحدہ ہوگئے۔ پھر سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ 1919ء میں جب جمیعۃ العلماء ہند کی بنیاد پڑی تو وہ اس کی ورکنگ کمیٹی اور مجلس منتظمہ کے رکن چن لیے گئے۔ ان کے استاد حضرت شیخ الہند علامہ محمود الحسن ریشمی رومال تحریک کی پاداش میں 1916ء سے 1920ء تک مالٹا میں اسیر رہے۔ 1920ء میں وطن واپس آئے اور انہوں نے علامہ شبیر احمد عثمانی کے ہمراہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔ 1920ء ہی میں شیخ الہند کی جانب سے علی گڑھ میں خطبہ پڑھا۔ 1945ء میں انہوں نے کھل کر مسلم لیگ کی حمایت کی اور قائداعظم کا ساتھ دیا۔ اپنوں کو چھوڑا اور اس پر خار راستہ پر چل کر تکلیفیں اٹھائیں۔ لیکن ملت اسلامیہ کے چراغ کو گل نہیں ہونے دیا، یہاں تک کہ پاکستان بنا کر چھوڑا۔ قائداعظم محمد علی جناح نے پاکستان کا جھنڈا سب سے پہلے انہیں کے ہاتھ سے بلند کرایا تھا۔ انہوں نے 1949ء میں بہاولپور میں انتقال کیا مگر دفن کراچی میں اردو سائنس کالج میں کیے گئے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی کو فن تفسیر میں کمال حاصل تھا۔ ''تفسیر عثمانی'' ان کی بلند پایہ تصنیف ہے۔ 13 دسمبر 1973ء کو پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ان کی برسی سرکاری طور پر منائی گئی تھی۔ علامہ نے ستمبر 1948ء میں وفات پائی قائداعظم کے بعد ان کا نماز جنازہ پڑھایا تھا۔

مفتی محمد شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (1896ء-1976ء)

برصغیر کے ممتاز عالم دین اور مفسر قرآن اور تحریک پاکستان کے صف اول کے راہنما

نام ونسب: مفتی محمد شفیع عثمانی بن مولانا محمد یٰسین عثمانی

پیدائش و تعلیم: 1896ء میں دیوبند ضلع سہارن پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا یٰسین عثمانی اور چچا مولانا منظور احمد عثمانی سے حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور حضرت علامہ انور شاہ کاشمیری، مولانا عزیز الرحمٰن عثمانی، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی اور سید اصغر حسین دیوبندی سے حاصل کی۔

مدرس دیوبند: 1919ء میں تحصیل تعلیم سے فارغ ہو کر دارالعلوم دیوبند میں مذہب مدرس پر فائز ہوئے اور ادنیٰ سے اعلیٰ تک تمام علوم وفنون کی کتابیں بڑی کامیابی کے ساتھ زیر درس رہیں۔ طب کی تعلیم بھی حاصل کی اور فقہ وادب سے ابتداہی سے سیاست رہی۔

1922ء میں منصب افتاء پر فائز ہوئے۔ 1948ء میں کراچی آگئے اور دستور ساز اسمبلی کے بورڈ آف تعلیمات کے رکن کی حیثیت سے اسلامی دستور کی ترتیب میں مدد دی۔ اس دوران تحریک پاکستان میں بھی حصہ لیا۔ 1951ء میں کراچی میں دارالعلوم کے نام سے ایک دینی مدرسہ قائم کیا جو 1980ء کی دہائی میں کراچی میں دینی علوم کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔

وسیع مطالعہ: مفتی صاحب کا علمی مطالعہ بڑا وسیع اور گہرا تھا۔ تقریباً تمام متداول دینی علوم میں عمدہ صلاحیت کے مالک تھے۔ اور آپ نے بہت سی دینی کتب تصنیف کیں۔ آپ کی تصانیف میں سب سے ممتاز ''معارف قرآن'' ہے۔ یہ تفسیر جدید زمانے کے اعتبار سے اردو زبان کی معیاری تفسیر ہے۔ یہ تفسیر آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ ایک زمانے میں ریڈیو پاکستان سے روزانہ معارف القرآن کے اجزا نشر کیے جاتے تھے۔ مفتی صاحب کی دیگر تصانیف کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو کے لگ بھگ ہے۔ آپ کے سینکڑوں تلامذہ ہندو پاکستان کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں۔

ابتداء میں حضرت شیخ الہند محمود الحسن کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ ان کے بعد مولانا اشرف علی تھانوی سے رجوع کیا

اور خلافت حاصل کی۔ ساری عمر دینی تعلیم وتدریس وتصنیف میں گزار دی۔ شعروشاعری کا بھی ذوق تھا۔ عربی، فارسی اور اردو میں قصائد، مرثیوں اور متعدد نظموں کا مجموعہ چھپ چکا ہے۔

تحریک پاکستان کے سلسلے میں قائداعظم محمد علی جناح سے ان کی دو ملاقاتیں ہوئیں پہلی اس وقت جب 1938ء میں قائداعظم دہلی آئے تھے اور مولانا اشرف علی تھانوی نے ان سے ملاقات کے لیے تین رکنی وفد تیار کیا تھا۔ اس وفد میں مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا مفتی شفیع عثمانی شامل تھے۔ دوسری بار 1946ء میں اس وقت قائداعظم سے ملے جب مرکزی قانون ساز اسمبلی کے مسلم نمائندوں نے بھاری اکثریت سے پاکستان کے مطالبے کی حمایت کی تھی۔ اس عظیم الشان فتح پر علامہ شبیر احمد عثمانی قائداعظم کو مبارک باد دینے گئے تو مفتی صاحب بھی ان کے ہمراہ تھے۔ مفتی صاحب نے 6 اکتوبر 1976ء کو انتقال کیا۔ نماز جنازہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے خلیفہ ڈاکٹر عبدالحیٔ نے پڑھائی اور انہیں دارالعلوم کراچی کے احاطے میں سپردخاک کیا گیا۔

معارف القرآن: معارف القرآن کی خصوصیات یہ ہیں کہ یہ عوام کے لیے سادہ زبان میں لکھی گئی ہے۔ تفسیر کے متن میں فنی اصطلاحات، دقیق بحثیں اور غیر معروف اور مشکل الفاظ سے قطعی طور پر گریز کیا گیا ہے۔ اس تفسیر میں سلف و صالحین کی تفسیروں پر اعتماد کیا گیا ہے اور بے سند باتوں سے مکمل طور پر احتراز کیا گیا ہے۔ اس میں جگہ جگہ صحابہ وتبع تابعین کے تفسیری اقوال اور متقدمین کی تفسیری کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ (1903ء-1979ء)

پاکستان کے ایک ممتاز عالم دین، مفسر قرآن، مفکر، سیاست دان، بانی جماعت اسلامی

نام ونسب: سید ابوالاعلیٰ مودودی، والد سید احمد حسن مودودی۔

پیدائش وتعلیم: 25 ستمبر 1903ء کو اورنگ آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور گیارہ برس کی عمر میں مولوی کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔

صحافت: پندرہ برس کی عمر میں صحافت کا آغاز کیا۔ مدینہ بجنور، تاج جبلپور، مسلم اور الجمہوریہ جیسے اخبارات اور رسائل کی ادارات کا فریضہ انجام دیا۔ 1932ء میں ''ترجمان القرآن'' حیدرآباد دکن سے جاری کیا۔ علامہ اقبال سے مراسلت اور مشورت کے بعد 19387ء میں پنجاب منتقل ہوگئے۔

جماعت اسلامی کی تاسیس: 26 اگست 1941ء کو لاہور میں 75 افراد کے تاسیسی اجتماع میں ''جماعت اسلامی'' کی تشکیل کی اور اس کے امیر منتخب ہوگئے۔ اکتوبر 1947ء میں قیام پاکستان کے بعد لاہور میں اقامت اختیار کی۔ اکتوبر 1947ء ہی میں انہوں نے ریڈیو پاکستان سے پہلی بار تفسیر قرآن کے موضوع پر تقریر نشر کی۔ 6 جنوری 1948ء کو اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا۔ 11 مئی 1953ء کو فوجی عدالت کی طرف تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں سزائے موت کی سزا دی گئی۔ اس پر پورے عالم اسلام میں احتجاج کیا گیا تو سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا گیا۔ 29 اپریل 1955ء کو قانونی سقم کی بنا پر رہا کردیے گئے۔ تاہم صدر ایوب کے عہد میں ان کی جماعت جماعت اسلامی پر پابندی لگادی گئی۔ اس دوران تحقیق ومطالعہ وتصنیف وتالیف کے کام میں مصروف رہے۔ 1963ء میں ان پر شدید قاتلانہ حملہ ہوا لیکن وہ بچ گئے۔ 6 جنوری 1964ء کو مولانا کو گرفتار کرلیا گیا اور جماعت اسلامی کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ مولانا کو چوتھی مرتبہ 1967ء میں گرفتار کیا گیا۔

31 مئی 1970ء ان کی اپیل پر یوم شوکت اسلام منایا گیا۔ صدر ایوب کے حکومت چھوڑ دینے کے بعد دسمبر 1970ء میں ملک میں پہلی بار عام انتخابات ہوئے جس میں جماعت اسلامی نے بھی حصہ لیا، تاہم جماعت اسلامی کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

1970ء کے انتخابات کے بعد مولانا اکثر بیمار رہنے لگے اور آخر ستمبر 1979ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

مولانا مودودی ایک ہمہ گیر مقاصد کے انسان تھے، وہ زندگی بھر اسلامی اصولوں کے نفاذ کے لیے کوشاں رہے۔ وہ مسلمانوں کی نظریاتی تربیت اور اخلاقی اصلاح پر سب سے زیادہ زور دیتے تھے۔

تصنیفات: مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ایک بلند پایہ مصنف بھی تھے۔ ان کی چھوتی بڑی تصنیفات کی تعداد 80 کے لگ بھگ ہے۔

تفہیم القرآن: جس زمانے میں جیل میں رہے انھوں نے قرآن مجید کی تفسیر تفہیم القرآن کے نام سے لکھنا شروع کی تھی۔ یہ تفسیر چھ جلدوں میں مکمل ہوئی اور قرآن کریم کی نئی زمانہ جدید تفسیروں میں سے ایک ہے۔ مولانا کی دیگر اہم تصانیف میں ''کتاب الجہاد فی الاسلام'' خلافت اور ملوکیت، تفہیمات، مسئلہ جبر و قدر، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی اور اسلام کا نظام حیات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس اسلامی نقطہ نظر سے ان کا علمی میدان میں کام بہت وسیع ہے۔ اس علمی کام کے ذریعے خدمت اسلام کرنے پر اُن کو دیگر اسلامی اور شاہ فیصل ایوارڈ ملے جو انہوں نے ادارہ معارف اسلام لاہور کو دے دیے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے احیائے اسلام یا اسلام کی نشاط ثانیہ کی جو دعوت پیش کی اس کے اثرات، جہاں برصغیر کے مسلم معاشرے میں پھیلے وہیں یہ برصغیر سے نکل کر دیگر اسلامی ممالک اور معاشروں تک بھی پہنچے۔ دنیا میں مختلف اسلامی تحاریک میں ان کے افکار کو بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔

پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ (1918ء-1998ء)

پیر محمد کرم شاہ ازہری جد امجد حضرت پیر امیر شاہ

نام و نسب: مشہور عالم دین اور مفسر قرآن، ان کا سلسلۂ نسب صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ہبار سے ملتا ہے۔

پیدائش و تعلیم: 21 رمضان 1918ء۔ ابتدائی تعلیم مولانا محمد قاسم بالا کوٹی سے پائی۔ کتب متوسط علامہ مولانا محمد دین بدھوی (اٹک) سے اور انتہائی کتب فنون علامہ غلام محمود (ساکن بیلاں) سے پڑھیں۔ دورہ حدیث کے لیے صدر الافاضل مولانا نعیم مراد آبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور 1943ء میں سند فراغت حاصل کی۔ اور دستار فضیلت سے مشرف ہوئے۔ 1945ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے اور 1954ء میں جامع ازہر قاہرہ سے الشہادۃ العالمیہ اور تخصص القضاء کی ڈگریاں حاصل کیں۔ جامع الازہر قاہرہ سے فراغت کے بعد دارالعلوم محمدیہ رضویہ بھیرہ شریف میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ ماہنامہ ضیائے حرم کا اجراء کیا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ تفسیر قرآن مجید ہے جو ''ضیائے القرآن'' کے نام سے موسوم ہے۔ ضیاء القرآن 3500 صفحات اور 5 جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ تفسیر پیر صاحب نے 19 سال کے طویل عرصہ میں مکمل کی تھی۔

جسٹس پیر محمد کرم شاہ ازہری ایک عظیم صوفی بزرگ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مایہ ناز مفسر، سیرت نگار ماہر تعلیم، صحافی اور صاحب طرز ادیب اور دیگر بے شمار خوبیوں کے مالک انسان تھے۔ سیرت طیبہ کے موضوع پر ''ضیاء النبی'' ان کی مایہ

ناز تصنیف ہے جس میں انہوں نے منکرین حدیث کے جملہ اعتراضات کے مدلل جوابات دیے ہیں۔
وفاقی شرعی جج: 1981ء میں آپ بعمر 63 سال وفاقی شرعی عدالت کے جج مقرر ہوئے اور 16 سال تک اس عہدے پر فائز رہے۔

تصانیف: ضیاء القرآن، تفسیر قرآن مجید جو آپ کی سب سے اہم تصنیف ہے۔

جمال القرآن: قرآن مجید کا بامحاورہ اردو ترجمہ جسے انگریزی زبان میں بھی منتقل کیا گیا ہے۔

ضیاء النبی: 7 جلدوں پر مشتمل سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم جو عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آئینہ دار ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی تکمیل پذیر ہے۔

سنت خیر الانام: بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے نصاب میں شامل یہ کتاب سنت اور حدیث کی اہمیت اور حجیت کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔

ماہنامہ ''ضیائے حرم'': 1971ء میں آپ نے ماہنامہ ضیائے حرم کا اجراء کیا تھا یہ رسالہ ابھی تک جاری ہے۔

1974ء میں آپ نے ادارہ ضیاالقرآن پبلی کیشنز قائم کیا جس کا مقصد اسلامی مواد کو فروغ دینا ہے۔

اعزازات: ستارہ امتیاز، حکومت پاکستان نے آپ کی علمی و اسلامی خدمات کے اعتراف میں آپ کو ستارہ امتیاز سے نوازا ہے۔

مصر کے صدر حسنی مبارک نے 6 مارچ 1993ء کو دنیائے اسلام کی خدمت کے صلے میں خصوصی ایوارڈ دیا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی اعزازات آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو دیئے گئے۔

انتقال: 9 ذوالحجہ 1418ھ بمطابق 7 اپریل 1998ء بروز منگل بوقت رات طویل علالت کے بعد آپ کا انتقال ہوا۔ سجادہ نشین آستانہ عالیہ سیال شریف نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی اور آپ کی وصیت کے مطابق آپ کو آپ کے دادا جان حضرت پیر امیر شاہ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

سید محمد مدنی اشرفی الجیلانی مدظلہ

نام ونسب: سید محمد مدنی اشرفی الجیلانی، والد بزرگوار سید محمد اشرفی جیلانی، والدہ محترمہ سیدہ فاطمہ بنت سلطان المناظرین حضرت اقدس مولانا سید احمد اشرف القاب، شیخ الاسلام والمسلمین و رئیس المحققین۔

ولادت وتعلیم: یکم رجب 1357ھ/ 28 اگست 1938ء کو کچھوچھہ شریف میں پیدا ہوئے جو ضلع فیض آباد یوپی انڈیا واقع ہے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضور غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی سے ہوتا ہوا مولائے کائنات حضرت علی مرتضیٰ سے جاملتا ہے۔ یہ گھرانہ جہاں شیخ الاسلام نے آنکھ کھولی غیر معمولی طور پر روحانی اور علمی اہمیت اور افادیت کا حامل اور تصوف و طریقت معرفت وحقیقت کا مرکز رہا ہے۔ آغوش مادری کے بعد آپ نے ابتدائی تعلیم جامعہ اشرفیہ کچھوچھہ شریف میں پائی۔ پھر چودہ سال کی عمر میں دار العلوم اشرفیہ مبارک پور میں داخل ہوگئے۔ یہاں آپ نے درس نظامی کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو کی بے شمار کتب پڑھیں اور اپنے استاد حضرت حافظ ملت مولانا شاہ عبدالعزیز سے پورا اکتساب فیض کیا۔

ان کے والد گرامی جناب محدث ہند نے خود بھی ان کی تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ابھی آپ کی طالب علمی کا زمانہ تھا کہ والد گرامی قدر کا انتقال ہوگیا۔ (1381ھ) والد بزرگوار کے چہلم پر ان کی جانشینی کی دستار زیب تن کی اور اپنی تعلیم بھی جاری رکھی۔ صرف سترہ برس کی عمر میں محدث اعظم ہند کا لقب حاصل کیا۔ آپ نے اپنے ماموں جان حضرت مولانا سید

احمد اشرف اشرفی جیلانی سے بیعت خلافت حاصل کی۔

1964ء میں آپ کا نکاح سید اختر حسین کی صاحبزادی مخدومہ سیدہ شمیمہ خاتون سے ہوا۔ آپ کا نکاح آپ کے ماموں جان و پیر و مرشد نے پڑھایا۔

اپنے والد بزرگوار کی طرح حضرت نے بھی اپنی زندگی کا ہر لمحہ دین اسلام کے لیے وقف کر دیا۔ جیسا کہ جانشین محدث اعظم کو زیب دیتا تھا آپ نے ایک ہی وقت میں منقولات اور معقولات پر کامل دسترس حاصل کی اور ایک تبحر عالم ثابت ہوئے۔ آپ نے تبلیغ اسلام و خدمت مسلک حقہ کی غرض سے دنیائے خطابت میں قدم رکھا تو خود کو صف اول کے خطباء میں شمار کر دیا۔ تبلیغی مساعی اور خطابت کے جوہر دکھانے کے ساتھ ساتھ جب جب وقت ملا آپ نے اپنے نوک قلم سے بھی مسلک حقہ کی خدمت کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا اور نہایت محققانہ انداز میں شرعی مسائل کا حل پیش کیا۔ چنانچہ غزالی دوراں حضرت علامہ احمد سعید کاظمی نے آپ کی تصانیف میں سے "ویڈیو اور ٹی وی کا شرعی استعمال" پر آپ کو "رئیس المحققین" کا خطاب دیا تھا۔ 1974ء میں آپ نے برطانیہ کا تبلیغی دورہ بھی کیا تھا۔

تفسیر اشرفی: دور جدید کی تفاسیر میں تفسیر اشرفی ایک اہم ترین تفسیر ہے جو سید محمد مدنی اشرفی الجیلانی نے بہت اچھے انداز میں تحریر کی ہے۔ اردو زبان کی تفسیروں میں تفسیر اشرفی بہت مبسوط اور جامع ہے۔ اس میں عہد جدید کی دیگر تفسیروں کی طرح قابل اعتراض حصوں سے پاک ہے اور اس میں ادب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اس تفسیر کا تعارف لکھتے ہوئے جناب محمد مسعود احمد لکھتے ہیں کہ اس تفسیر میں حضرت صاحب نے قرآنی اسرار و معارف کے دریا بہا دیے ہیں۔ یہ محبان رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے لیے شبنم کی ٹھنڈک اور گستاخان رسول کے لیے نشتر کی چبھن رکھتی ہے۔

محدثین کرام

امام ابوداؤد طیالسی (133ھ/750ء-204ھ/819ء)
امام عبدالرزاق بن ہمام (م211ھ/826ء)
امام نعیم بن حماد خزاعی (م228ھ/843ء)
امام اسحاق راہویہ (متوفی 238ھ/853ء)
امام امام الداری (181ھ/787ء تا 255ھ/869ء)
امام بخاری (194ھ/809ء-256ھ/870ء)
امام مسلم (202ھ/817ء-261ھ/875ء)
امام ابن ماجہ (209ھ/824ء-273ھ/886ء)
امام داؤد بجستانی (202ھ/817ء-275ھ/889ء)
امام بقی بن مخلد اندلسی (201ھ/817ء-276ھ/889ء)
امام ترمذی (م275ھ/898ء)
امام ابوعبدالرحمن نسائی (215ھ/830ء-303ھ/915ء)
امام ابن خزیمہ (م311ھ/923ء)
الحاکم نیشاپوری (321ھ/933ء-405ھ/1014ء)
البیہقی (384ھ/994ء-458ھ/1066ء)
القاضی ابوالفضل عیاض (م نواح544ھ/1149ء)
السہیلی عبدالرحمن بن عبداللہ (م581ھ/1186ء)
شیخ عبدالحق حقی محدث دہلوی (958ھ/1551ء-1052ھ/1642ء)
شیخ الہند محمود الحسن (1268ھ/1851ء-1339ھ/1920ء)
شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلوی (1898ء-1982ء)
علامہ ارشد سعید شاہ کاظمی (1384ھ/1964ء—)

امام ابوداؤد طیالسی (133ھ/750ء-204ھ/819ء)

بلند پایہ محدث اور مسند الطیالسی کے مرتب ایرانی الاصل عالم

نام ونسب: سلیمان بن داؤد بن جارود، سلیمان نام تھا اور کنیت ابوداؤد تھی۔ آبائی وطن فارس تھا۔ بعدازاں بصرہ میں بود و باش اختیار کرلی تھی اصلاً موالی زادہ تھے۔ ان کے والدین قبیلہ قریش کے موالی تھے۔ سب سے مشہور نسبت طیالسی تھی جو طلیسان سے ہے۔

ولادت وتعلیم: 133ھ 750ء میں پیدا ہوئے۔ علامہ سمعانی نے ماہ پیدائش ربیع الاول لکھا ہے۔ امام ابوداؤد طیالسی کو دوسری صدی ہجری کا مبارک زمانہ ملا جو علم وفضل اور خیر و برکت کے لحاظ سے خیر القرآن میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس لیے انہوں نے بڑے بڑے برگزیدہ علمائے اسلام اور بڑے بلند پایہ محدثین سے استفادہ کا موقع ملا۔ ان کے بعض مشہور شیوخ کے نام یہ ہیں۔ ابان بن یزید عطار، ابراہیم بن سعد، ایمن بن نابل، جریر بن حازم، جویریہ بن عبدالحمید وغیرہم۔ علم

حدیث میں فضل وکمال کے علاوہ ان کے دوسرے علمی کمالات پردہ اخفا میں ہیں۔

غیر معمولی حافظہ: انہوں نے غیر معمولی حافظہ پایا تھا، بعض نے لکھا ہے کہ ان کو 40 ہزار احادیث زبانی یاد تھیں۔ یونس بن حبیب اصبہانی فرماتے ہیں کہ انہوں نے اصبہان میں ایک لاکھ سے زائد احادیث مبارکہ محض اپنی یادداشت سے املا کرائیں تھیں۔ صالح بن احمد عجلی کا بیان ہے کہ بصرہ میں امام ابوداؤد طیالسی اپنے زمانے کے سب سے بڑے حافظ حدیث تھے اور اس وصف میں وہ اپنے معاصرین پر فائق اور برتر تھے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ امام ابوداؤد طیالسی طویل ترین حدیثوں کو اچھی طرح اپنے حافظے میں محفوظ کر لیتے تھے۔

ثقاہت: ثقاہت میں بھی ان کا پایہ بڑا بلند تھا، علمائے جرح وتعدیل نے ان کی توثیق کی ہے۔ عبدالرحمٰن بن مہدی لکھتے ہیں کہ وہ لوگوں میں سب سے زیادہ سچے انسان تھے۔ ثقاہت ہی ان کے بلند پایہ محدث ہونے کی پہچان ہے۔''

معرفت حدیث: وہ حدیثوں کے صرف ناقل وحافظ ہی نہیں تھے بلکہ ان کی پرکھ میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ بندار کا بیان ہے کہ وہ حدیث اور معرفت حدیث میں یکتا تھے۔

وکیع جیسے نامور محدث، حدیث میں ان کی غیر معمولی واقفیت اور اور تمیز کی بنا پر ان کو جبل العلم کہتے تھے۔

اخلاق وعادات: امام ابوداؤد طیالسی کے اخلاق وعادات اور اعمال وعبادات وغیرہ کی اگرچہ تفصیل معلوم نہیں ہوسکی تاہم ان کے بعض اوصاف حمیدہ کا پتا چلتا ہے مثلاً اصبہان میں ایک لاکھ احادیث املا کرانے کے بعد جب انہیں اپنی بعض غلطیوں کا پتہ چلا تو انہوں نے ان کو برملا تسلیم کر لیا اور اپنے شاگردوں کو ہدایت کی کہ وہ ان کی تصحیح کر لیں۔ امام احمد نے بھی ان کی اس خوبی کا ذکر کیا ہے کہ اپنی غلطی پر اصرار نہیں کرتے تھے۔

وفات: مشہور روایت ہے کہ امام ابوداؤد طیالسی نے بعمر 72 سال 204ھ/819ء میں وفات پائی۔ کہتے ہیں کہ حاکم بصرہ یحییٰ بن عبداللہ بن عمر نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ بعض تذکرہ نگار اسے غلط بھی قرار دیتے ہیں۔

مسند طیالسی: مسانید کے جو مجموعے مشہور اور متداول ہیں ان میں ایک مسند ابوداؤد طیالسی بھی ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ ہم اس سے لگا سکتے ہیں کہ یہ دوسری مسندوں کے مقابلے میں سب سے قدیم تر ہے۔ یہ مسند گیارہ اجزا پر مشتمل ہے اور اس کی ترتیب میں بڑی حد تک مسانید کے عام اصول کا خیال رکھا گیا ہے۔ پہلے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم، عشرہ مبشرہ اور صحابہ کبار کی احادیث دی گئی ہیں۔ چھٹے جز میں صحابیات رضی اللہ عنہم کی مرویات کو جگہ دی گئی ہے۔ اگرچہ مسند طیالسی کی قدامت سے مورخین انکار نہیں کرتے مگر بعض محققین کے نزدیک اس مسند کو وہ شہرت نصیب نہیں ہوئی جو دوسری کتب حدیث کو حاصل ہے۔

امام عبدالرزاق بن ہمام (م 211ھ/826ء)

صاحب تصنیف محدثین میں سے ایک، ان کے فضل وکمال اور علمی عظمت کا اعتراف کیا گیا

نام ونسب: عبدالرزاق بن ہمام بن نافع، عبدالرزاق نام، ابوبکر کنیت تھی۔

خاندانی طور پر یمن کے قبیلہ حمیر سے تعلق تھا اسی وجہ سے یمنی بھی کہلاتے تھے۔

ولادت اور تعلیم: 126ھ/ 712ء میں یمن کے مشہور شہر صنعا میں پیدا ہوئے۔ بلند پایہ محدثین اور آئمہ کبار حدیث، ابن جریج، امام اوزاعی، حضرت سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، امام مالک جیسے عظیم لوگوں سے تعلیم حاصل کی۔ ان کے تلامذہ میں بھی کئی مشہور آئمہ حدیث شامل تھے۔

علمی عظمت: ان کے فضل وکمال اور علمی عظمت نے ان کی ذات کو مرجع خلائق بنا دیا تھا۔ مورخین نے لکھا کہ کسی محدث کے پاس کسی اور شخص کے پاس اس قدر لوگ سفر کر کے نہیں آئے جتنے امام عبدالرزاق کے پاس آتے تھے۔

اعتراف کمال: علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان کو مخزن علم قرار دیا ہے۔ ایک مرتبہ امام احمد سے پوچھا گیا کہ ان سے بہتر اور برتر محدث کون ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ان کے معاصرین کو بھی اعتراف ہے کہ "ہم لوگوں میں سب سے زیادہ صاحب علم عبدالرزاق ہے۔"

حفظ حدیث: ابراہیم بن عباد دیری لکھتے ہیں کہ امام عبدالرزاق کو 17000 احادیث مبارکہ زبانی یاد تھیں، ہشام بن یوسف اللہ کے ایک ہم عصر کہتے ہیں کہ "ہم لوگوں میں سب سے بہتر حافظ امام عبدالرزاق کا تھا۔

ثقاہت: آپ ایک ثقہ راوی تھے، آپ کی ثقاہت پر علما کا اتفاق ہے۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ بے شمار اہل حدیث نے ان کی ثقاہت کا اعتراف کیا ہے۔

شعر وسخن: امام عبدالرزاق اگر چہ ایک تجارت پیشہ انسان تھے اور بسلسلہ تجارت شام جاتے تھے مگر علم حدیث کے علاوہ انہیں شعر وسخن کا ذوق تھا۔

وفات: بعمر پچاسی سال 211ھ/826ء میں وفات پائی ابن سعد کے مطابق شوال کا مہینہ تھا۔

تصنیفات: امام عبدالرزاق متعدد کتابوں کے جامع ومصنف تھے۔ مگر ان کی تصنیفات میں سے اکثر معدوم و نایاب ہیں۔

ان کی تصانیف میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں۔ (1) جامع یا سنن عبدالرزاق۔ اس کی اکثر حدیثوں کی صحاح ستہ میں تخریج کی گئی ہے۔ (2) کتاب السنن فی الفقہ (3) کتاب المغازی، (4) تفسیر، شاہ ولی اللہ صاحب نے حدیث کی کتابوں کے تیسرے طبقہ میں ان کی کتب کا ذکر کیا ہے۔

نقد وجرح: بعض علما نے امام عبدالرزاق پر نقد وجرح بھی کی ہے۔ ان کی جانب شیعہ ازم سے نسبت کی جاتی ہے لیکن خود ان کا اعتراف اس سلسلے میں یہ ہے کہ "مجھے اس بات پر بھی شرح صدر نہیں ہوا کہ جناب امیر کو شیخین کرام سے افضل قرار دوں۔ ابوالازہر فرماتے ہیں کہ "عبدالرزاق نے بتایا کہ وہ شیخین کرام کی تفضیل کے قائل ہیں۔

سوء حفظ وفتور عقل: ان پر دوسرا الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ ضعیفی میں ان کی بصارت زائل ہوگئی تھی اور وہ سوء حفظ اور فتور عقل میں مبتلا ہو گئے تھے، لیکن یہ علت محض آخری دور کی حدیثوں کے لیے قادح اور مانع ہوسکتی ہے۔ اس کے پہلے کی روایات کے ثبوت واعتبار میں اس سے فرق نہیں آیا۔ آتا۔ بلکہ بعض علما نے بڑھاپے کی بھی صرف ان کی روایات کو کمزور قرار دیا ہے، جن کو وہ صرف اپنی یادداشت سے بیان کرتے تھے۔

ان پر بعض اور بھی اعتراضات کیے گئے ہیں لیکن حافظ ذہبی نے ان اعتراضات کو سراسر مہمل اور بے بنیاد قرار دیا ہے۔

امام نعیم بن حماد خزاعی (م 228ھ/843ء)

جن کی مسند قدامت کو امام احمد نے تسلیم کیا اور جن کے علم وکمال کے دشمن بھی معترف تھے۔

نام ونسب: نعیم بن حماد بن معاویہ بن حارث بن ہمام بن سلمہ بن مالک۔ ان کا قبیلہ خزاعہ سے خاندانی اور خراسان کے مشہور شہر مرو سے وطنی تعلق تھا، لیکن مصر میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔

تعلیم: انہوں نے اپنے وقت کے جن نامور علمائے اسلام سے اکتساب علم کیا ان میں ابراہیم بن سعد، ابراہیم بن

طہمان، ابوحمزہ عسکری، ابوداؤد طیالسی جیسے جید علما شامل تھے انہوں نے روح بن عبادہ سے پچاس ہزار احادیث کا سماع کیا تھا۔

طلب حدیث کے لیے اسفار: تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ انہوں نے عراق وحجاز میں ایک عرصہ قیام کر کے تحصیل وتکمیل علم کی اور پھر مصر چلے گئے اور وہاں لگ بھگ چالیس سال تک قیام کیا۔

حفظ وثقاہت: حفظ وضبط اور ثقاہت واتقان کے لیے مشہور وممتاز بہت سے ہم عصر علما نے ان کی توثیق کی ہے۔ بعض آئمہ فن نے ان کے وہم وخطا کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن اس سے ان کی علالت وثقاہت میں فرق نہیں آیا۔

علم وفضل: ان کے علم وفضل کے بھی تمام علما معترف تھے۔ علامہ ذہبی وغیرہ نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ علم و فضل میں یکتائے زمانہ تھے۔

فقہ: حدیث کی طرح علم فقہ سے بھی بڑی مناسبت تھی اور علم فرائض کے ماہر تھے اسی لیے فرائضی بھی کہلاتے تھے،

تبع سنت: حضرت نعیم بن حماد بڑے متبع سنت اور دیندار بزرگ تھے۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو سنتوں کے معاملہ میں نہایت متشدد ومتصلب تھے۔ اور اہل بدعت واہوا سے سخت متنفر اور بیزار رہتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پہلے وہ خود بھی جہمیہ فرقے سے تعلق رکھتے تھے، لیکن ابوعصمہ کے فیض سے صحبت سے جن کے یہ کاتب تھے اور جو جہمیت سے سخت متنفر تھے ان کو بھی جہمیہ اور اور اہل اہوا سے سخت تنفر پیدا ہو گیا تھا۔

قید وبند کی صعوبتیں: امام نعیم کی دینی حمیت کا ثبوت یہ بھی ہے کہ ان سے خلق قرآن کا عقیدہ جبراً قبول کرنے کے لیے کہا گیا، لیکن انہوں نے اصحاب دعوت وعزیمت کی طرح اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کے نتیجے میں ان کو قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں اور وہ مصر سے قید کر کے عراق لائے گئے اور بغداد یا سامرا میں قید کے دوران ہی ان کا انتقال ہوا۔

وفات: 12 جمادی الاول 228ھ/843ء کو انتقال کیا۔

تصنیفات: وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ان کی کتابوں میں سے دو کتابوں کے نام معلوم ہو سکے جو مندرجہ ذیل دیے جا رہے ہیں۔

(1) الفتن والملاحم: ان کی بڑی اہم اور مشہور تصنیف ہے، اور اپنے موضوع پر نہایت قدیم کتاب ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے۔

(2) مسند: اس کو قدامت کی بنا پر بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ایک عرصہ تک یہ اہل علم میں متداول رہ چکی ہے، بعض علماء اس کو سب سے قدیم مسند قرار دیتے ہیں۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ ہمارے علم کے مطابق کتب مسند میں سے سب سے پہلی تصنیف نعیم کی ہے۔ ابن خطیب نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے جامع ومرتب ہونے والی مسند ہی تھی اور سب سے پہلے انہوں نے ہی اپنی مسند مرتب کی تھی۔

امام اسحٰق راہویہ (متوفی 238ھ/853ء)

''بغداد میں دریائے دجلہ کا پل ان سے زیادہ عظیم وبرتر کسی آدمی نے عبور نہیں کیا۔'' امام احمد

نام ونسب: اسحٰق بن ابراہیم بن مخلد بن ابراہیم بن مطر بن عبداللہ بن غالب۔ اسحٰق نام اور کنیت ابویعقوب، ابن راہویہ لقب تھا۔

اسحاق کے والد ابراہیم چونکہ سفر مکہ کے دوران پیدا ہوئے تھے۔ اسی لیے انہیں راہوی یا راہویہ یعنی راستے والا کہتے تھے، اور اسی نسبت سے امام اسحٰق ابن راہویہ کہلائے۔

ولادت وتعلیم: ان کی ولادت 161ھ یا 163ھ میں ہوئی تھی۔ ان کا وطن خراسان کا شہر مرو تھا، لیکن انہوں نے نیشاپور میں مستقل سکونت اختیار کی تھی۔ انہوں نے بڑے مشہور اساتذہ کرام ابوسامہ، ابوبکر بن عیاش، ابومعاویہ، اسباط بن محمد، اسماعیل بن علیہ، بشر بن فضل، عبدالرزاق بن ہمام، عبداللہ بن مبارک، عبدہ بن سلیمان وغیرہم سے پائی۔

طلب حدیث: ابن حجر عسقلانی اور علامہ ابن عساکر نے لکھا ہے کہ آپ نے طلب حدیث کے لیے کثرت سے سفر کیے اور مختلف شہروں میں پھرے۔ خطیب نے لکھا ہے کہ حجاز، عراق، یمن اور شام وغیرہ کے مراکز حدیث کا سفر کیا اور کئی بار بغداد بھی تشریف لائے۔

علم وفضل: اسحاق بن راہویہ بلند پایہ علمائے اسلام میں سے تھے۔ معاصرین علماء اور اساطین فن نے ان کے فضل وکمال اور علمی عظمت وبلند پائیگی کا اعتراف کیا ہے۔

امام احمد بن حنبل ان کے بڑے قدردان اور مداح تھے۔ لکھتے ہیں کہ خراسان اور عراق میں ان کا کوئی ہمسر نہیں، بغداد کے اس پل کو ان سے زیادہ عظیم وبرتر کسی آدمی نے عبور نہیں کیا، گو بعض مسائل میں ہمارا اور ان کا اختلاف ہے اور اہل علم میں تو اختلافات ہوا ہی کرتے ہیں۔

شرف امامت: اسحاق بن راہویہ کا شمار ان آئمہ کرام میں ہوتا ہے جو صاحب مذہب فقہہ ومجتہد تھے مگر ان کا فقہی مقام اور اجتہادی مذہب مٹ چکا ہے، لیکن ایک زمانے میں یہ بھی مسلمانوں کا معمول بہ مسلک رہا ہے۔ امام احمد اور امام نسائی ان کے متعلق فرماتے ہیں۔ "امام من آئمۃ المسلمین"، یعنی مسلمانوں کے ایک امام یہ بھی ہیں۔

علم حدیث میں امتیاز: علم حدیث سے ان کا تعلق خاص تھا۔ اور وہ اکابر محدثین اور نامور حفاظ حدیث میں شمار کیے جاتے ہیں۔ خلیلی کا بیان ہے کہ "وہ شہنشاہ حدیث تھے۔" حدیثوں کی نشر واشاعت، درس وتدریس، حفظ وضبط اور حزم واحتیاط کے لیے ان کی ذات بڑی اہمیت اور شہرت رکھتی ہے، ذیل میں ان کی ان خصوصیات میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

حفظ وضبط: امام اسحٰق راہویہ کا حافظہ غیر معمولی اور یادداشت حیرت انگیز تھی۔ ابن حبان، خطیب بغدادی، اور ابن عساکر نے ان کی قوت حافظہ کی جامعیت کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ خراسان کے نامور حفاظ میں اسحٰق راہویہ اور ان کے بعد امام دارمی اور امام بخاری تھے۔

صدق وثقاہت: غیر معمولی قوت حافظہ کے ساتھ ان کا صدق وثقاہت بھی حد درجہ بلند ہے ابوحاتم فرماتے ہیں کہ کثیر الحفظ ہونے کے باوجود اسحٰق کا ضبط واتقاق اور غلطیوں سے محفوظ ومصئون رہنا حیرت انگیز ہے۔ خطیب بغدادی لکھتے ہیں کہ "وہ حفظ وثقاہت کے جامع تھے۔" اسی طرح وہ حزم واحتیاط میں بھی اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔

تصنیفات: محققین نے انہیں صاحب تصنیف کثیرہ لکھا ہے۔ ان کی تصنیفات میں سب سے مشہور اور اہم ان کی مسند ہے جو چھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس مسند کا ایک قلمی نسخہ علامہ سیوطی کے قلم کا لکھا ہوا جرمنی کے کرتب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ "کتاب السنن فی الفقہ اور کتاب التفسیر ان کی اہم تصانیف ہیں۔

امام امام الدارمی (181ھ/787ء تا 255ھ/869ء)

مشہور محدث اور مفسر، مؤلف المسند الجامع، سنن دارمی

نام ونسب: عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن فضل بن بہرام بن عبدالصمد خزرجی۔ نام عبداللہ، کنیت ابومحمد اور لقب دارمی تھا۔

ولادت و تعلیم: 181ھ میں خراسان کے مشہور شہر سمرقند میں پیدا ہوئے۔ قبیلہ تمیم کی ایک شاخ دارم سے تعلق تھا اس لیے دارمی کہلاتے تھے۔ امام دارمی نے جن نامور علماء و مشائخ سے استفادہ کیا ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں، احمد بن اسحاق حضرمی، حبان بن ہلال، اسود بن عامر شاذان، اشہل بن حاتم، ابو صالح کاتب، لیث بن سعد، ابو بکر حنفی، ابو المغیرہ حمصی، ابو عاصم اور جعفر بن اعوان وغیرہم۔ ان کے تلامذہ میں بھی بقی بن مخلد جیسے عظیم نام شامل ہیں۔

طلب حدیث کے لیے سفر: اس زمانے کے دستور کے مطابق امام دارمی نے بھی اس وقت کی اسلامی دنیا کے اہم مراکز حدیث تک کے سفر کیے اور عراق، شام، بغداد، مصر اور مکہ و مدینہ تک پہنچے۔ بعض علمائے رجال نے لکھا ہے کہ انہوں نے اس سلسلے میں بہت زیادہ سفر کیے اور ملکوں ملکوں کی خاک چھانی۔

حفظ، ضبط: قدرت نے ان کو ایک اچھا حافظہ عطا کیا تھا، اس لیے ان کو حفظ و ضبط کا غیر معمولی ملکہ حاصل تھا۔ عبداللہ بن نمیر جیسے بلند پایہ محدث لکھتے ہیں کہ ''دارمی حافظہ کے لحاظ سے ہم پر فوقیت رکھتے تھے۔ رجاء بن جابر مرجی کا بیان ہے کہ میں نے احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور علی بن مدینی جیسے آئمہ حدیث میں سے کسی کو بھی عبداللہ سے بڑا حافظ حدیث نہیں پایا۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ ''دارمی اپنے زمانہ کے ان مشہور حفاظ میں سے تھے جن کے بہت کم لوگ ہم سر ہوتے ہیں۔ بندار فرماتے ہیں کہ حفاظ حدیث دنیا میں چار ہیں ان میں سمرقند کے امام دارمی بھی شامل ہیں۔

ثقاہت: انہیں ایک ثقہ محدث کی حیثیت حاصل ہے اور ان کی ثقاہت، عدالت کے بھی علمائے فن اور ارباب کمال معترف ہیں۔ امام احمد ان کو خطیب صاحب صدق و ثقاہت بتاتے ہیں۔

معرفت و درایت: امام الدارمی احادیث کی معرفت و تمیز کے لیے مشہور تھے۔ روایت کی طرح درایت میں بھی ان کا مقام بلند ہے۔ رجاء بن جابر مرجی فرماتے ہیں کہ ''میں نے ان سے بڑا کسی کو علم حدیث سے واقفیت رکھنے والا نہیں پایا، احمد بن سیار کہتے ہیں کہ حدیث میں ان کی واقفیت غیر معمولی اور نظر بڑی وسیع تھی۔

فضل و امامت: ان گوناگوں کمالات نے ان کی ذات کو مرجع خلائق بنا دیا تھا اور وہ آئمہ مسلمین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ معاصر علما نے بھی ان کی حیثیت کو تسلیم کیا ہے۔ امام احمد ان کو امام اسید کے لقب سے موسوم کرتے ہیں۔ ابو سعید اشج کا بیان ہے کہ ''وہ ہمارے امام ہیں۔''

وفات: ایک روایت کے مطابق انہوں نے بعمر چہتر سال اپنے وطن سمرقند میں 8 ذی الحجہ 255ھ/ 869ء کو وفات پائی۔ امام بخاری کو ان کے انتقال کی جب خبر لی تو انہوں نے سر جھکا کر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔ سمرقند ہی میں دفن ہوئے۔

تصانیف: کتاب التفسیر: الجماع یا کتاب الجامع، یہ فقہ و احکام کی کتاب ہے۔ بعض محققین نے اس کو الجامع الصحیح کا نام بھی دیا ہے۔

سنن دارمی: یہ ان کی سب سے اہم اور مشہور تصنیف ہے۔ صحاح ستہ کے بعد حدیث کی جو کتابیں زیادہ اہم اور مستند مانی جاتی ہیں ان میں یہ کتاب بھی شامل ہے۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ اس کی اہمیت کی بنا پر محدثین اور علمائے فن نے اس کی حدیثوں کو لائق استدلال خیال کیا ہے۔

سنن دارمی پینتیس ابواب کتب (فصول) اور ایک ہزار چار سو عنوانات پر مشتمل ہے۔ عام کتب حدیث و سنن کے برعکس اس کی ابتداء بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتی ہے۔ اس فصل کے ابواب میں انہوں نے خصائص نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بیان کیے ہیں۔ اس کتاب کو سنن اور مسند دونوں کہا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ سنن میں صحابہ کے ناموں سے حدیث درج

ہوتی ہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ (194ھ/809ء-256ھ/870ء)

امام المحدثین، فارسی الاصل نامور محدث، ناقد حدیث اور صاحب الجامع الصحیح

نام ونسب: سلسلہ نسب کچھ یوں ہے، محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بروزبہ، ان کا اصلی نام محمد اور کنیت ابوعبداللہ ہے۔ ان کے جد اعلیٰ بروزبہ فارس کے رہنے والے تھے اور مذہباً مجوسی تھے، امام صاحب کے جد امجد مغیرہ اس خاندان کے پہلے شخص تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ حضرت مغیرہ امیر بخارا ایمان جعفی کے ہاتھ پر ایمان لائے تھے اسی نسبت سے جعفی مشہور ہو گئے تھے۔ یہ لقب نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا ہوا امام بخاری تک پہنچا اور اسی بنا پر امام صاحب جعفی کے لقب سے مشہور تھے۔

والد گرامی: امام صاحب کے والد اسماعیل چوتھے طبقے کے معتبر حدیث شمار کیے جاتے ہیں، اسماعیل کی ثقاہت اور مرتبہ کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام مالک اور حماد جیسے محدثین کی انہوں نے شاگردی کی تھی اور ابن مبارک جیسے شیوخ کی صحبت میں مدتوں رہے۔ اہل عراق نے ان سے اکثر حدیثیں روایت کی ہیں۔

ولادت وتعلیم: شوال 194ھ کی سترھویں تاریخ کو جمعہ کے دن امام بخاری پیدا ہوئے۔ ابھی کھیل کود کے دن ختم نہیں ہوئے تھے تمام بڑے لوگوں کی طرح یتیم ہو گئے۔ ان کی والدہ نے تنہا سرپرستی اور توجہ سے ان کی پرورش کی اسی پر ان کی آئندہ ترقی کا دارومدار تھا۔ وہ امام صاحب اور ان کے بڑے بھائی کو لے کر مکہ معظمہ آ گئیں اور وہیں امام صاحب نے نشوونما پائی اور ابتدائی تعلیم حاصل کی۔

امام صاحب نے ابتدائی تعلیم کے بعد علم فقہ پر توجہ کی اور امام وکیع اور امام ابن مبارک جیسے اساتذہ فن کی تصنیفات کا مطالعہ کیا۔ پندرہ برس کی عمر میں تعلیم فقہ سے فارغ ہو گئے تو فن حدیث کی طرف متوجہ ہوئے جو ان کی توجہ اور سرپرستی کے انتظار میں تھا۔ امام صاحب نے جن مشائخ فن حدیث سے اکتساب کیا ان کے متعلق اس قدر مسلم ہے کہ ان کا فضل وکمال اسحٰق بن راہویہ اور علی بن المدینی کے فیضان تعلیم کا زیادہ ممنون ہے۔

تبع تابعین میں محمد بن عبداللہ انصاری، ابوعاصم النبیل امام صاحب کے شیوخ میں شامل ہیں۔

قوت حافظہ: امام صاحب فطرۃً نہایت قوی الحافظہ تھے، فطرت کی اس فیاضی سے انہوں نے حدیث کی تحصیل میں بہت فائدہ اٹھایا، استاد سے جیسے ہی کوئی حدیث سنتے فوراً زبانی یاد کر لیتے۔ ابتدا میں کتابت حدیث کے سخت خلاف تھے۔ ان کا قول تھا کہ کتابت سے انسان کی فطری قابلیت کم ہو جاتی ہے اور وہ محض کتابوں پر وقت برباد کرنے کا عادی بن جاتا ہے، لیکن آگے چل کر جب ضرورت مزمانہ متقضی ہوئی تو ان کو اپنی رائے بدلنی پڑی۔

شہرت فضل وکمال: امام صاحب کے فضل وکمال کی شہرت ان کے فارغ التحصیل ہونے سے پہلے دور دور تک پھیل چکی تھی۔ حفظ حدیث میں ان کا پایہ اس قدر بلند تھا کہ بڑے بڑے محدثین مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے ان کی تیزی ذہن اور قوت حافظہ کا عام طور پر مخالفین کو بھی اعتراف ہے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس شہرت نے وہ ترقی کی کہ دور دور سے لوگ سمع حدیث کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ یوسف بن موسیٰ مرورفدی نے بصرہ میں امام صاحب کی وسعت علم اور شہرت کا پر اثر منظر دیکھا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ ایک دن کسی شخص کو بصرہ کی گلیوں میں پکارتے ہوئے سنا گیا کہ ''اے قدر دانان! ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری آج کل بسرہ کی جامع مسجد میں تشریف فرما ہیں، جو شخص سمع حدیث اور ان

کی زیارت کا مشتاق ہوا سے چاہیے کہ وہ جامع مسجد میں حاضر ہو۔'' پھر مسجد میں طالبان علم کا ہجوم اکٹھا ہوگیا۔ ایسے میں ایک ادھیڑ عمر شخص مسجد کے ایک ستون کی آڑ میں نماز پڑھ رہا تھا، معلوم ہوا کہ امام محمد بن اسماعیل بخاری یہی ہیں۔ نماز سے فراغت پر حاضرین نے درخواست کی کہ فن حدیث کے متعلق خطبہ دیں، امام صاحب نے منظور فرمایا، شہر میں اعلان کر دیا گیا کہ آج فلاں وقت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ بیان فرمائیں گے۔ اس اعلان کے بعد لوگ جوق در جوق جامع مسجد میں حاضر ہونے لگے۔ پھر امام صاحب نے کھڑے ہوکر فرمایا کہ اے اہل بصرہ آج میں تمہارے سامنے وہ حدیثیں پیش کروں گا جن کے راوی بھی تمہارے شہر کے رہنے والے ہیں مگر تم کو خبر نہیں۔ پھر امام صاحب نے جتنی حدیثیں بیان کیں سب کے رواۃ اہل بصرہ تھے۔ (تاریخ بغداد)

طلب حدیث کے لیے سفر: امام صاحب نے طلب حدیث اور زیارت علماء کے لیے دور دراز کے مقامات کے سفر کیے۔ مصر و شام میں استفادہ حدیث کے لیے دو بار گئے۔ حجاز میں متواتر چھ سال تک قیام کیا، کوفہ و بغداد جو علوم اسلامی کے مرکز تھے بار بار تشریف لے گئے۔ بصرہ میں چار بار گئے اور بعض مرتبہ پانچ پانچ برس تک قیام کیا، ایام حج میں مکہ معظمہ چلے جاتے پھر حج کر کے واپس بصرہ لوٹ آتے تھے۔

سفر نیشاپور: نیشاپور جوان دنوں علم حدیث کا ایک اہم مرکز تھا، کہ امام مسلم بن حجاج اور ان کے استاذ امام محمد بن یحییٰ اسی شہر کی خاک سے اٹھے تھے اور انہی کے علم و فضل نے نیشاپور کو چار چاند لگا دیے تھے۔ ان حالات میں امام بخاری کا نیشاپور تشریف لے جانا اور بڑے بڑے اساتذہ کی موجودگی میں اپنے فضل و کمال کا مظاہرہ کرنا ان کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے۔

امام بخاری نیشاپور تشریف لائے تو اس دھوم دھام سے ان کا استقبال کیا گیا کہ والیان ملک اور سلاطین کو بھی نصیب نہیں ہوا ہوگا۔ امام صاحب نیشاپور میں درس و تدریس میں مصروف ہوگئے۔ علما شہر اکثر اوقات ان کی مجلس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ امام محمد بن یحییٰ نے جو امام مسلم کے استاد تھے اپنے شاگردوں کو حکم دیا کہ امام بخاری کی مجلس میں حاضر ہوا کریں۔ تاہم امام محمد بن یحییٰ کو اس بات کا خیال تھا کہ امام بخاری کے نیشاپور آجانے سے ان کی محفل درس [redacted] گئی تھی مگر وہ امام سے رنجش پیدا ابھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ایک موقعہ پر جب ان کو ملنے گئے تو ایک شخص نے امام بخاری سے سوال کیا کہ یا ابا عبداللہ! جو الفاظ قرآنی ہماری زبان سے نکلتے ہیں کیا وہ مخلوق ہیں۔ امام صاحب خاموش رہے۔ اس شخص نے دوبارہ یہی سوال کیا تو امام صاحب نے فرمایا کہ قرآن کلام الٰہی ہے اور غیر مخلوق ہے۔ پھر مختصر اور جامع الفاظ میں فیصلہ دے دیا کہ کلام خدا کی ایک صفت ہے مخلوق نہیں۔

جلاوطنی اور انتقال: بخارا میں امام صاحب ایک مدت تک آرام و راحت سے رہے مگر اپنی غیور طبیعت کی وجہ سے عتاب شاہی کا شکار ہوگئے۔ شاہ بخارا نے انہیں بخارا چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ امام صاحب بخارا کے قریب واقع ایک چھوٹے سے قریہ خرتنگ میں آگئے اور آخر عمر تک وہیں رہے۔ اس جلاوطنی کا انہیں افسوس تھا اور کبھی کبھی یہ دعا کرتے تھے کہ اے رب! باوجود وسعت کے زمین میرے لیے تنگ ہوگئی ہے، اس لیے اب مجھے اٹھالے۔''

آپ کی یہ دعا بالآخر قبول ہوئی اور 256ھ/870ء میں آپ نے بمقام خرتنگ انتقال فرمایا اور عید کے دن آپ کی تجہیز و تکفین ہوئی۔

تصنیفات: امام صاحب کو زمانہ طالب علمی سے تصنیف و تالیف کا شوق تھا جو آخر عمر تک قائم رہا، انہوں نے اپنی تصنیف کتاب تاریخ کبیر مدینہ منورہ کی چاندنی راتوں میں لکھی جب آسمان پر چاند کی قدرتی قندیل روشن ہوتی تھی۔ دیگر تصانیف کے علاوہ امام صاحب کی عظیم الشان تصنیف جامع صحیح بخاری ہے جو امام صاحب نے حدیث شریف کے ذخائر کبیر

سے چھانٹ کر تالیف کی۔ صحیح بخاری کا نام "الجامع الصحیح المسند من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ ہے۔ آج قرآن کریم کے بعد دنیائے اسلام کی دوسری مقدس ترین کتاب یہی ہے۔ بخاری شریف میں دس ہزار حدیثیں ہیں جو چھ لاکھ حدیثوں سے منتخب کی گئی ہیں۔ امام بخاری پہلے شخص تھے جنہوں نے اپنی صحیح میں نہایت التزام اور صحت سے حدیثیں درج کیں ہیں اور اس معاملے میں وہ سب سے آگے ہیں۔

امام مسلم (202ھ/817ء-261ھ/875ء)

تاریخ اسلام کے ایک جلیل القدر محدث، عالم اور شہرہ آفاق مجموعہ احادیث "صحیح مسلم" کے مؤلف

نام ونسب: مسلم بن حجاج بن مسلم بن ورد بن کوشاد، اصلی نام مسلم اور کنیت ابوالحسین تھی، لقب عساکر الدین ہے۔ اگر چہ ان کا تعلق سرزمین عجم سے تھا مگر ان کا سلسلہ نسب عرب کے مشہور قبیلہ بنی قشیر سے ملتا ہے اسی بنا پر قشیری بھی کہلاتے ہیں۔

پیدائش اور طلب علم: امام مسلم تیسری صدی ہجری کے اوائل، 206ھ میں خراسان کے مشہور شہر نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں علم حدیث نے صحابہ کرام اور تابعین کے مقدس سینوں سے نکل کر ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور ہزاروں مجتہد اور امام پیدا ہو گئے تھے۔ اس لیے علم حدیث ایک مقبول علم کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ خوش قسمتی سے امام صاحب کی پیدائش ایسے شہر یعنی نیشاپور میں ہوئی جو اس زمانے میں خراسان کا مرکز حدیث تھا۔ امام صاحب نے بارہ برس کی عمر میں سماعت شروع کر دی تھی اور پوری سرگرمی سے اس مقدس فن کی طرف توجہ کی تھی۔ اس زمانہ میں اگر چہ خود خراسان میں اور نیشاپور میں اسحاق بن راہویہ اور امام ذہلی جیسے اساتذہ حدیث موجود تھے، تاہم، امام صاحب نے ان بزرگوں کو چھوڑ کر ان تمام مقامات کی خاک چھانی، جہاں جہاں علم حدیث کا جلوہ نظر آتا تھا۔ رے کے محدثین سے سماعت کی، عراق میں امام احمد بن حنبل اور ابوعبداللہ بن مسلمہ سے فائدہ اٹھایا، حجاز میں سعید بن منصور اور ابومصعب سے روائتیں حاصل کیں۔ مصر میں عمرو بن اسود اور حرملہ بن یحیٰ جو امام شافعی کے شاگرد تھے۔ بغداد میں یحیٰ بن صاعد اور محمد بن مخلد سے استفادہ کیا۔ بغداد کے سفروں کا سلسلہ آخر عمر تک قائم رہا، چنانچہ 259ھ میں بغداد کا آخری سفر کیا اس آخری سفر کے دو سال بعد آپ نے وفات پائی، آپ کی وفات 261ھ/875ء میں نیشاپور کے مضافات میں ہوئی۔

طلب حدیث کے سفر: امام مسلم نے احادیث جمع کرنے کی خاطر دور دراز کے سفر کیے۔ وہ عرب، مصر، شام اور عراق میں گئے جہاں انہوں نے معروف علمائے حدیث، مثلاً امام احمد بن حنبل، حرملہ اور اسحٰق بن راہویہ سے حدیث سماعت کی۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی تالیف صحیح مسلم کے لیے تین لاکھ احادیث کا انتخاب کیا اور ان کی چھان پھٹک کے سے اپنی صحیح ترتیب دی۔

تصانیف: ان کی دیگر تصانیف میں کتاب المنفردات والوحدان اور کتاب الکنیٰ والاسماء محفوظ ہیں۔ مگر ان کی سب سے اہم تصنیف "صحیح مسلم" ہے جو حدیث کی دوسری کتابوں سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ اس میں کتب کو ابواب میں تقسیم نہیں کیا گیا، حالانکہ صحیح البخاری میں احادیث کو تراجم کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ بایں ہمہ "صحیح مسلم" میں احادیث کی ترتیب دریافت کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہوتی کیونکہ ان کا فقہ کے تصورات سے بہت قریبی تعلق ہے جو صحیح البخاری کے عنوانات سے مماثل عنوانات کے ذریعے قائم کیا گیا ہے۔ تاہم اس کام کی تکمیل انہوں نے خود نہیں کی جیسا کہ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عنوانات الصحیح کے مختلف نسخوں میں یکساں نہیں ہیں۔ مسلم کے اور احادیث کے دیگر مجموعوں میں ایک فرق یہ

ہے کہ انہوں نے اسناد پر خاص توجہ دی ہے۔ یہاں تک کہ ان کی تصنیف میں ایک حدیث کے بعد اکثر متعدد مختلف اسانید مذکور ہیں جو اسی حدیث کی یا اس سے کسی قدر مختلف متن کی تمہید کا کام دیتے ہیں۔ امام مسلم نے اس ضمن میں جس صحت کا اہتمام کیا ہے اس کی بنا پر ان کی تعریف کی جاتی ہے، لیکن فقہی اعتبار سے البخاری کو ان پر فوقیت حاصل ہے جس کا اعتراف ان کے عقیدتمندوں مثلاً امام نووی نے بھی کیا ہے جنہوں نے صحیح مسلم کی شرح بھی لکھی تھی۔ صحیح مسلم سے مقدمہ کے علاوہ 54 عنوانات، ارکان خمسہ، نکاح، غلامی، تبادلہ مال، میراث، جہاد، قربانی، آداب ورواج، انبیا وصحابہ، قضا وقدر اور دوسرے دینی اور عاقبت کے متعلق موضوعات قائم کیے گئے ہیں۔

امام ابن ماجہ (209ھ/824ء-273ھ/886ء)

مشہور عالم، محدث، مفسر، مورخ اور سنن ابن ماجہ کے مؤلف

نام ونسب: محمد بن یزید بن عبداللہ، کنیت ابوعبداللہ، لقب ابن ماجہ۔ ماجہ بعض لوگوں نے آپ کے دادا اور بعض نے آپ کی والدہ کا نام بتایا ہے، لیکن علما تحقیق کے نزدیک یہ آپ کے والد کا لقب تھا۔ قزوین کے مشہور مورخ خلیلی کا بیان ہے کہ ماجہ یزید کا عرفی نام تھا۔ ان کا شجرہ نسب یوں بھی بیان کیا گیا ہے، محمد بن یزید بن ماجہ مگر پہلی بات زیادہ ثابت ہے۔

ولادت وتعلیم: ان کا خود کا بیان ہے کہ وہ 209ھ میں پیدا ہوئے۔ امام ابن ماجہ عجمی نژاد تھے، لیکن عرب کے مشہور قبیلہ ربیعہ سے ان کا رشتہ موالات تھا۔ اس لیے مولیٰ ربیعہ کہلاتے تھے۔ ایران کے مشہور شہر قزوین کو آپ کے وطن ہونے کا فخر حاصل ہے اسی نسبت سے آپ قزوینی بھی کہلاتے تھے۔ آپ نے تین سو سے زائد شیوخ سے تعلیم پائی۔ امام مالک اور لیث کے تلامذہ سے بھی آپ کو روایت کرنے کا شرف حاصل ہے۔ حافظ ابوالقاسم علی بن حسن نے آئمہ صحاح پر جو رسالہ تحریر کیا ہے، اس میں آپ کے مزید اساتذہ کے نام یہ دیئے ہیں۔ ابراہیم بن منذر حزامی (م236ھ) ابوبکر بن ابی شیبہ (م235ھ) ابوبکر بن ابی الدنیا بغدادی، علی بن حسن ہرثمی، علی بن سعید نسائی وغیرہم۔

طلب حدیث میں سفائر: امام ابن ماجہ کے زمانے میں محدثین اطراف عام میں پھیلے ہوئے تھے اس لیے انہوں نے حصول حدیث کے لیے مختلف ملکوں کا سفر کیا، خراسان، عراق، حجاز، مصر، شام، بصرہ، کوفہ، مکہ، رے اور بغداد وغیرہ۔ شروع میں اکیس سال کی عمر تک اپنے وطن قزوین ہی میں جو خود علم وفن کا گہوارہ اور علما ومحدثین کا بڑا مرکز تھا، حدیث اور دوسرے علوم کی تحصیل فرماتے رہے۔ 230ھ میں علم کی جستجو میں اپنے وطن سے باہر نکلے اور مختلف ملکوں کا سفر کیا۔ ابن ماجہ کا ابتدائی زمانہ ممالک اسلامیہ میں علوم وفنون کی ترقی کا زمانہ تھا۔ علم دوست خلیفہ، مامون الرشید عباسی مسند نشین خلافت تھا۔ جب وہ اپنے وطن سے نکلے تو انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث وآثار جمع کرنے کے لیے عرب، عراق، شام، مصر اور خراسان کے سفر کیے۔ آپ کی یہ رحلت علمیہ 230ھ کے بعد شروع ہوئی۔ اس وقت جا بجا اسناد وروایت کے دفتر کھلے ہوئے تھے اور بڑے زور شور سے حدیث کا درس جاری تھا۔ یہ خلیفہ واثق باللہ کا عہد تھا جو علم دوستی کی وجہ سے مامون اصغر کہلاتا ہے۔

تصانیف: ابن ماجہ کی سب سے اہم تصنیف ان کی سنن ہے جو سنن ابن ماجہ کہلاتی ہے اور صحاح ستہ میں شامل ہے۔ اس میں 4341 احادیث ہیں ان میں 3002 ایسی احادیث ہیں جو صحاح ستہ کی باقی پانچ کتابوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اور باقی 1339 حدیثیں ایسی ہیں جو زوائد ابن ماجہ ہیں۔ ابن ماجہ کی سنن کو کہتے ہیں سب سے پہلے ابوالفضل محمد بن طاہر (م507ھ) نے صحاح ستہ میں شمار کیا تھا۔ متاخرین میں سے السیوطی (م911ھ) عبدالغنی النابلسی وغیرہ نے اسے صحاح ستہ میں شمار کیا ہے۔ البتہ امام نووی، ابن صلاح، ابن الاثیر اور المزی ایسے علما اسے صحاح ستہ میں شامل نہیں کرتے یا تو وہ صحاح

خمسہ پر اکتفا کرتے ہیں اور یا بعض لوگ امام مالک کی موطاء کو صحاح ستہ کے زمرے میں شامل کرتے ہیں۔
ابن ماجہ نے ایک ضخیم تفسیر بھی مرتب کی تھی جس میں قرآن کریم کی تفسیر کے سلسلے میں احادیث و آثار کو بالاسناد جمع کیا تھا۔ ان کی تیسری تصنیف التاریخ ہے۔ یہ صحابہ کرام کے عہد سے لے کر مصنف کے زمانے تک کی تاریخ ہے۔
ابن ماجہ نے بعہد خلیفہ المعتمد علی اللہ وفات پائی۔ یاد رہے کہ بجز امام نسائی (م303ھ) تمام مصنفین صحاح ستہ نے اسی خلیفہ کے عہد میں وفات پائی تھی۔

امام داؤد بجستانی (202ھ/817ء-275ھ/889ء)

نامور محدث اور صحاح الستہ میں شامل کتاب السنن کے مرتب

نام ونسب: سلیمان نام، کنیت ابوداؤد اور شجرہ نسب یوں ہے۔ سلیمان بن اشعث بن اسحاق بن بشیر بن شداد بن عمر بن عمران۔ امام کے جد اعلیٰ کے متعلق لکھا گیا ہے کہ وہ جنگ صفین میں حضرت علی کی طرف سے شریک ہوئے تھے اور اسی جنگ میں ان کی شہادت ہوئی تھی۔

ولادت وتعلیم: امام ابوداؤد 202ھ/817ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا وطن مالوف بجستان (سیستان) خراسان کا مشہور علاقہ تھا۔ بعض لوگوں نے بصرہ کے قریب ایک گاؤں بجستان کو ان کا وطن بتایا ہے جو صحیح نہیں۔ شاید اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ امام صاحب نے اپنی عمر کے آخری حصے میں بصرہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے تحصیل علم کے سلسلے میں دور دراز کے سفر اختیار کیے اور علم وتقویٰ کے باعث شہرت حاصل کی۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ امام صاحب نے 300 کے قریب اساتذہ سے تحصیل علم کی۔ ان کے اساتذہ میں امام احمد بن حنبل، اسحاق راہویہ اور ابوثور جیسے بلند پایہ فقہائے محدثین اور یحییٰ بن معین، ہشام بن عبدالمالک طیالسی جیسے نامور ناقدین فن اور آئمہ محدثین شامل تھے۔
آپ کے تلامذہ میں صحاح ستہ کے مصنفین امام ترمذی اور امام نسائی شامل ہیں۔

سماع حدیث کے لیے سفر: امام ابوداؤد نے اپنے زمانے کے دستور کے مطابق حصول حدیث کے لیے مختلف مقامات کا سفر کیا۔ بصرہ کو اپنا مسکن بنایا، جو اس زمانہ میں علم وفن اور محدثین وفقہا کا بڑا مرکز تھا۔ کئی بار بغداد تشریف لے گئے۔ حجاز، عراق، خراسان، مصر، شام، نیشاپور، مرو اور اصبہان وغیرہ محدثین کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے استفادہ کیا۔

حفظ وضبط: امام داؤد کا حافظہ نہایت قوی اور ذہن بڑا رسا تھا۔ وہ حفظ کے اعتبار سے دنیا کے اماموں میں ایک امام تھے۔ محمد بن مخلد فرماتے ہیں کہ ابوداؤد ہزاروں حدیثوں کا مذاکرہ کرتے تھے اور جب انہوں نے سنن مرتب کی تو تمام اہل زمانہ ان کے حفظ و ماتقدم کے معترف ہوگئے، امام نووی کے مطابق جمہور اسلام کو ان کے کمال حفظ کا اعتراف ہے۔ (تہذیب التہذیب)

کمال حدیث: ابوداؤد جس عہد میں پیدا ہوئے اس وقت دنیائے اسلام کے نامور محدثین کرام سے معمور تھی۔ اس زمانے میں انہوں نے اس فن میں اتنا کمال پیدا کیا کہ آئمہ حدیث اور اساطین فن میں ان کو امتیازی کمال حاصل ہوگیا تھا اور سب نے ان کی جلالت کا اعتراف کیا ہے۔ ابراہیم عربی کہتے ہیں کہ "فن حدیث ان کے لیے اس طرح آسان ہوگیا تھا جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے لوہا نرم ہوگیا تھا۔

تصنیفات: امام صاحب کی تصنیفات میں اہم نام یہ ہیں۔
(1) کتاب الرد علی اہل القدر۔ (2) کتاب الناسخ والمنسوخ۔ (3) کتاب المسائل۔ (4) مسند مالک۔ ان کے

علاوہ کتاب فضائل قرآن کتاب شریعۃ التفسیر اور سنن ابی داؤد۔
سنن ابی داؤد: یہ چار ہزار آٹھ سو منتخب حدیثوں پر مشتمل ہے۔ امام صاحب نے اس کی ترتیب و تالیف کا کام 241ھ سے پہلے بغداد میں انجام دیا تھا۔ سنن ابی داؤد کا شمار حدیث کی امہات کتب اور صحاح ستہ میں ہوتا ہے۔ اکثر علمائے اسلام نے صحیحین کے بعد سنن ابی داؤد کو کتب حدیث میں سب سے اہم بتایا ہے۔ ابوداؤد پہلے محدث ہیں جنھوں نے ایسے مفصل حواشی بھی لکھے جن سے آپ کے شاگرد ترمذی کے لیے احادیث پر منظم طریقے پر تنقید و تبصرے کا راستہ کھل گیا تھا۔ محمد بن مخلد کہتے ہیں کہ محدثین اس کتاب کو اسی طرح بلا چون وچرا مانتے ہیں جس طرح القرآن کو عامۃ المسلمین مانتے ہیں۔

امام بقی بن مخلد اندلسی (201ھ/817ء-276ھ/889ء)

الحافظ، قرطبہ کے ایک نامور محدث، مفسر اور مصنف

نام و نسب: بقی بن مخلد بن یزید مکمل نام ہے۔ کنیت ابوعبدالرحمن تھی اور شیخ الاسلام لقب تھا۔ اندلس کے مشہور و شہر قرطبہ میں جو اس زمانے میں اسلامی علوم وفنون کا مرکز تھا اور جہاں تہذیب و ثقافت اسلامی وہاں عروج پر تھی، میں 201ھ میں پیدا ہوئے۔

تعلیم واساتذہ: امام بقی بن مخلد نے تین سے زائد اساتذہ سے اکتساب کیا۔ ان کا شمار امام احمد کے خاص اور مایہ ناز شاگردوں میں ہوتا ہے۔ ان کے شیوخ کو امام مالک، سفیان بن عینیہ، امام شافعی اور حماد بن زید جیسے جلیل القدر محدثین اور فقہا سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ اسی طرح ان کے تلامذہ کا دائرہ بھی بڑا وسیع تھا۔

طلب علم کے لیے سفائر: امام بقی بن مخلد نے علم کی تحصیل و تکمیل کے لیے مغرب و مشرق کے اکثر شہروں کا سفر کیا۔ مورخین نے ان کو کثیر الاسفار بتایا ہے۔ ابن مندہ اور حمیدی کے بیان کے مطابق رحلت اور طلب حدیث کے لیے ان کے سفر مشہور ہیں۔

علم حدیث میں مقام ومرتبہ: امام بقی نے اپنے زمانے کے دستور کے مطابق علم حدیث کی جانب زیادہ توجہ دی اور اس علم میں اتنا کمال پیدا کیا کہ ان کا شمار اکابر محدثین میں ہونے لگا۔ مورخین اور علمائے سیر نے لکھا ہے علم حدیث کی روایت و تحریر میں ان کو بڑا انہماک تھا، حفظ وضبط اور صدق وثقاہت میں بھی ممتاز تھے، علامہ ذہبی نے ان کو ثقہ حجت اور ثبت اور حافظ ابن عساکر نے الحافظ اور حمیدی نے من الحفاظ المجد چنین لکھا ہے۔ حدیث کے ضبط ونقل میں ان کی احتیاط اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ ان کو کم سنی میں سفیان ثوری کے بعد تلامذہ سے ملاقات واستفادہ کا موقع ملا تھا مگر آپ نے ان سے روایت کرنے سے احتراز کیا۔

علوم کی اشاعت: ان کا ایک بڑا علمی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ممالک مشرق سے واپسی پر سرزمین اندلس کو احادیث وروایات کی نشرواشاعت سے معمور کردیا۔ حافظ ابن عساکر کا بیان ہے انہوں نے اندلس واپس آکر اس کو علوم سے مملو کردیا۔

علم وفضل کا اعتراف: محدثین اور ارباب کمال نے امام بقی کے علمی ودینی کمالات کا اعتراف کیا ہے۔ علامہ ذہبی نے ان کو امام، احد الائمۃ الاعلام، عدیم المثال اور یکتائے روزگار لکھا ہے۔ احمد بن ابی خیثمہ لکھتے ہیں کہ جس شہر میں بقی جلوہ فرما ہوں وہاں کے کسی آدمی کو ہم لوگوں کے پاس آنے کی کیا ضرورت ہے؟ علامہ ابن حزم لکھتے ہیں کہ وہ امام احمد کے مخصوص اور ارشد تلامذہ میں تھے اور امام بخاری، مسلم اور نسائی کے ہمسر اور مثیل تھے۔

مخالفت: بعض دوسرے ارباب کمال کی طرح ان کو بھی علماو فقہا کی ایک جماعت کی مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ وہ بڑے متبع سنت تھے اس لیے آئمہ مجتہدین اور فقہا کی تقلید کی بجائے براہ راست احادیث وآثار کی پیروی کرتے تھے۔ اس

زمانے میں اندلس میں فقہ مالکی کا غلبہ تھا۔ اس لیے لوگوں کو موطاء اور اہل مدینہ کی حدیثوں سے واقفیت تھی اس کے مقابلے میں اہل عراق کے متعلق قلیل الاحادیث ہونے کا گمان عام تھا۔ اسی وجہ سے مالکی علما نے آپ پر اعتراضات کیے اور آپ کی مخالفت کی بلکہ عوام کو بھی بھڑکا دیا۔ مخالفت کے اس طوفان کی وجہ سے امام بقی کو درس وتدریس کا مشغلہ چھوڑنا پڑا۔ جب حاکم اندلس محمد بن عبدالرحمٰن کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے امام بقی اور ان کے مخالفین کو طلب کیا اور مصنف ابن ابی شیبہ کی کتب کا مطالعہ کیا پھر مخالفین کو تنبیہ کی کہ وہ امام بقی سے آئندہ کوئی تعرض نہ کریں۔

تصنیفات: آپ ایک کثیر التصانیف مصنف تھے۔ آپ کی تصانیف میں کتاب التفسیر فتاویٰ صحابہ وتابعین بہت اہم ہیں۔ مسند کبیر سب سے ممتاز اور اہم ہے۔ اس میں ایک ہزار تین سو سے زائد صحابہ کی روایت درج ہیں۔

امام ترمذی (م 275ھ/ 898ء)

مشہور محدث اور فقیہ اور صحاستہ میں ایک جامع الترمذی کے مصنف

نام ونسب: محمد نام، ابوعیسیٰ کنیت، قبیلہ بنی سلیم سے تعلق رکھتے تھے شجرہ نسب یوں ہے۔ محمد بن سورہ بن موسیٰ بن ضحاک، سلمی ترمذی یوغی وطن مالوف خراسان اور ماوراالنہر کا خطہ تھا جو ہمیشہ سے مرکز علم وفن اور ارباب کمال رہا ہے۔ بہت سے محدثین کرام اور علمائے اسلام اسی خاک سے اٹھے۔ امام ترمذی بھی اسی مردم خیز علاقے کے شہر ترمذ کے رہنے والے تھے۔ یہ شہر دریائے جیحون کے مشرقی کنارے پر بلخ کے علاقے میں کسی زمانہ میں بڑا بارونق شہر تھا۔

ولادت وتعلیم: امام موصوف 209ھ میں ترمذ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم بھی شاید اسی شہر میں پائی۔

سماع حدیث کے لیے سفر: اسلامی تعلیمات کا دوسرا بڑا ماخذ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اس کے بغیر دین کا علم مکمل نہیں ہوسکتا۔ اسی وجہ سے ہر دور میں مسلمانوں نے اس علم کو بھرپور توجہ دی ہے۔ ابتدائی چند صدیوں تک اس علم کی اشاعت اور حفاظت کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں مراکز حدیث قائم تھے۔ حجاز کے بعد عراق وخراسان کو اس علم کے باب میں خصوصی امتیاز حاصل رہا ہے۔ اکثر بڑے بڑے محدثین اسی علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سرزمین پر علم حدیث کا ذوق وشوق عام تھا۔ امام بخاری کے علم وشہرت نے اس خطہ میں اس علم کے ذوق وشوق کو مزید بڑھایا تھا۔ اسی علمی ماحول میں امام ترمذی نے آنکھ کھولی اور نشوونما پائی تھی۔ امام ترمذی کو علم حدیث کا شوق دامن گیر ہوا تو انہوں نے اس علم کے حصول کے لیے خراسان اور ماوراالنہر کے علاوہ اس وقت کی دنیائے اسلام کے دیگر مراکز حدیث تک متعدد سفر کیے اور سماع حدیث کی۔ ان کے شیوخ میں امام بخاری ومسلم کے شیوخ بھی شامل ہیں۔ انہوں نے اس دور کے ہر خرمن حدیث سے خوشہ چینی کی۔ ان کے اساتذہ میں چند ممتاز نام یہ ہیں۔ امام بخاری، مسلم امام دارمی، علی بن حجر مروزی، محمد بن نشار وغیرھم۔

قوت حافظہ: امام ترمذی کے لیے قدرت نے بھی حفظ حدیث کے تمام سامان فراہم کیے تھے۔ ایک طرف انہیں اکابر محدثین سے استفادہ کا موقع ملا دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے انہیں نہایت قوی حافظہ عطا کیا تھا۔ ابورجاء قتیبہ بن سعید بلخی انہیں شیخ الحفاظ اور محدث خراسان کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ذہبی نے انہیں امام الفقہ وحدیث لکھا ہے۔

اعتراف کمال: امام ترمذی نے یوں تو بہت سے شیوخ سے استفادہ کیا تھا، لیکن انہیں سب سے زیادہ فائدہ امام بخاری سے پہنچا۔ وہ امام بخاری کے خاص تلامذہ میں سے تھے۔ امام بخاری کے فیض اور امام ترمذی کی قوت حافظہ اور تلاش و جستجو نے انہیں امام وقت بنا دیا تھا۔ ابن حجر نے انہیں امام الحدیث لکھا ہے۔ ذہبی لکھتے ہیں کہ امام بخاری کے بعد خراسان میں

ترمذی سے بڑا کوئی محدث نہیں ہو گزرا۔

تفسیر: حدیث امام ترمذی کا خاص فن تھا مگر انہیں فن تفسیر میں بھی کمال حاصل تھا اور فقہ پر بھی دسترس رکھتے تھے۔

وفات: مشہور روایت کے مطابق امام ترمذی نے 275ھ یا 279ھ میں وفات پائی اور قریہ بوغ میں آسودہ خواب ہیں۔

تصانیف: مورخین نے لکھا ہے کہ امام ترمذی کثیر التصانیف مصنف تھے۔ تاہم ان کی صرف تین تصانیف ہم تک پہنچیں ہیں۔

(1) جامع بالسنن ترمذی، (2) شمائل ترمذی اور (3) کتاب العلل۔

ابن الندیم نے اپنی فہرست میں انہیں تین کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔

جامع ترمذی: اگرچہ کتب صحاح ستہ میں جامع ترمذی کا درجہ صحیحین کے بعد ہے لیکن اس کی خصوصیات کی وجہ سے اس کا افادہ صحاح ستہ کی تمام کتب سے زیادہ ہے۔ بعض علمانے لکھا ہے کہ جامع ترمذی بخاری و مسلم سے زیادہ فائدہ بخش ہے۔ ترمذی نے اپنی جامع میں احادیث کی ضروری شرح کر دی ہے۔ اسی طرح ان کی شمائل ترمذی بھی بہت اہم ہے اور اس کتاب میں ترمذی، اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، عادات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کیا ہے۔

امام ابو عبدالرحمٰن نسائی (215ھ/830ء-303ھ/915ء)

شیخ الاسلام، حافظ الحدیث، صاحب السنن اور علم حدیث کے مسلمہ امام

نام ونسب: نام احمد، کنیت ابو عبدالرحمٰن تھی اور سلسلہ نسب یہ ہے، احمد بن شعیب بن علی بن سنان بن بحر بن دینار۔

ولادت و تعلیم: بعض مورخین نے آپ کا سنہ ولادت 215ھ لکھا ہے اور بعض نے سنہ پیدائش 225ھ بھی لکھا ہے جو غالباً صحیح نہیں ہے۔ امام نسائی کی پیدائش اور نشو ونما خراسان میں شہر نساء میں ہوئی۔ یہ شہر اس زمانے میں مرکز علم وفن تھا، اس کی خاک سے بہت سے نامور علماء وفضلاء پیدا ہوئے اور اسی نسبت سے نسائی کہلائے۔ امام نسائی نے بعد میں اپنا وطن مالوف چھوڑ کر مصر میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ امام نسائی نے اپنے زمانہ کے بے شمار مشہور علما وشیوخ سے اکتساب فیض کیا۔ ان میں اسحٰق راہویہ، حسین بن منصور، عیسیٰ بن حماد، ابورجاء قتیبہ بلخی، محمد بن نصر مروزی اور دیگر علمائے حدیث شامل ہیں۔ آئمہ صحاح ستہ میں سے انہیں امام بخاری اور امام ابوداؤد سے بھی شرف تلامذہ حاصل ہے۔

تحصیل حدیث کے لیے سفر: امام نسائی کی ابتدائی تعلیم کے حالات نہیں ملتے، مگر اتنا معلوم ہے کہ اُس زمانہ کے دستور کے مطابق انہوں نے مختلف ملکوں اور شہروں کا سفر کیا، ابن کثیر لکھتے ہیں کہ انہوں نے دور دراز کے شہروں میں جا کر سماع حدیث کیا اور آئمہ فن اور مشائخ کبار سے ملے۔

علم حدیث میں امتیاز: علم حدیث کی تاریخ میں تیسری صدی ہجری کا زمانہ زریں عہد کہلاتا ہے۔ اس زمانہ میں ہر گھر میں علم حدیث کا چرچا تھا۔ اسلامی ملکوں میں ہر بڑا شہر اس علم کا مرکز تھا۔ اس دورزریں سے زیادہ بڑے محدثین اور کسی دور میں پیدا نہیں ہوئے۔ امام نسائی بھی اسی دور کمال میں پیدا ہوئے۔ اسی لیے انہیں بھی علم حدیث سے خصوصی شغف حاصل تھا۔ اس علم میں جو تبحر و کمال امام نسائی کے حصے میں آیا وہ ان کے معاصرین کے حصے میں نہ آسکا۔ وہ اپنے عہد کے تمام علمائے حدیث میں یکتا تھے۔

حفظ و ثقاہت: قدرت نے امام صاحب کو بلا کا حافظہ عطا کیا تھا۔ علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں کہ میں نے اپنے استاد

علامہ ذہبی سے دریافت کیا کہ حافظہ کے لحاظ سے امام مسلم اور نسائی میں کون بڑھا ہوا ہے؟ انہوں نے نسائی کا نام لیا۔ اسی طرح ان کی ثقاہت واتقان کے بھی سبھی معترف ہیں۔

عقیدہ: امام نسائی اعتقاد میں اہل سنت والجماعت کے ہم نوا تھے مگر ان پر شیعیت کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اس الزام کی صحت کی صورت کچھ یوں ہے کہ، شام بنی امیہ کا مرکز حکومت رہ چکا تھا۔ اور وہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا سب سے مضبوط قلعہ بھی تھا۔ یہاں کے تمام قبائل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حامی و مداح تھے۔ اس لیے بنی امیہ کے بعد بھی یہ اثر مدتوں قائم رہا۔ امام نسائی کے زمانے میں بھی یہی کیفیت تھی۔ امام موصوف نے اصلاح کی خاطر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مداح بیان کی تاکہ شامیوں کا ظن دور ہو جائے مگر اہل شام کے دل ودماغ پر حضرت معاویہ کا اتنا اثر تھا کہ وہ آمادہ پیکار ہو گئے اور امام صاحب کی توہین میں بھی باک نہیں کیا اور ان پر شیعیت کا الزام لگا دیا۔

وفات: امام نسائی کی موت کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مناقب لکھ کر فارغ ہوئے تو چاہا کہ جامع دمشق میں انہیں لوگوں کو سنائیں تاکہ ان کے دل سے بغض علی رضی اللہ عنہ جاتا رہے مگر ابھی انہوں نے اپنی کتاب کا تھوڑا ہی حصہ بیان کیا تھا کہ ایک شخص نے ان سے پوچھا کہ کیا انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے فضائل بھی بیان کیے ہیں؟ جب انہوں نے کہا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے فضائل ہی کہاں ہیں تو لوگ ان پر پل پڑے اور چند ضربیں ان کے خصیتین میں لگیں جن کی وجہ سے وہ نیم جان ہو گئے۔ اور یوں شامیوں کی مار پیٹ سے انہیں اتنا صدمہ پہنچا کہ اسی کے اثر سے 303ھ میں وفات پائی۔

تصنیفات: امام صاحب کی تصنیفات میں سنن النسائی سب سے اہم ہے۔ اور کتب صحاح ستہ میں جو مقبولیت صحیحین کو حاصل ہوئی ان کے بعد سنن نسائی اور سنن ابوداؤد کا مقام ہے۔ خود امام نسائی فرماتے ہیں کہ میری کتاب السنن تمام تر صحیح حدیثوں پر مشتمل ہے۔

امام ابن خزیمہ (م 311ھ/923ء)

شیخ الاسلام، امام ابن خزیمہ کا شمار اکابر محدثین اور نامور آئمہ فن میں ہوتا ہے۔

نام ونسب: نام محمد، کنیت ابوبکر، لقب شیخ الاسلام تھا۔ نسب نامہ کچھ یوں ہے۔ محمد بن اسحاق بن خزیمہ بن مغیرہ بن صالح بن بکر۔

ولادت، تعلیم ووطن: امام موصوف ماہ صفر 223ھ میں نیشاپور میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم بھی وہیں پائی۔ ان کے اساتذہ میں ابوقدامہ سرخسی، ابوکریب، احمد بن منیع، اسحاق بن موسیٰ الخطمی، بشر بن معاذ عقدی، نصر بن علی، یونس بن عبدالاعلیٰ اور دیگر علما شامل ہیں۔ امام اسحٰق راہویہ اور محمد بن حمید رازی سے بھی ان کو ملاقات اور سماع کا شرف حاصل ہے مگر اس وقت وہ بہت کم سن تھے۔ اس لیے حزم احتیاط کی بنا پر ان بزرگوں سے حدیثیں بیان نہیں کرتے۔

رحلت وسفر: اس زمانے کے دستور کے مطابق علم وفن حدیث کی تحصیل کے لیے انہوں نے مختلف مقامات کے سفر کیے بچپن میں اپنے وطن کے علما و مشائخ سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد رے، بغداد، بصرہ، کوفہ، شام، حجاز، عراق مصر اور واسط کی طرف سفر کیے۔

حفظ وثقاہت: علامہ ابن حیان کہتے ہیں کہ انہوں نے ان سے بہتر کوئی حافظ نہیں دیکھا، ابواحمد دارمی نے جواب دیا کہ "میں جس چیز کو تحریر کرتا ہوں وہ مجھے زبانی یاد ہو جاتی ہے۔ ابن حبان فرماتے ہیں کہ روئے زمین پر ان کے مانند کوئی اور

شخص نہیں جو احادیث وسنن کے صحیح الفاظ اور زیادات ان سے زیادہ یاد رکھتا ہو۔

مقام ومرتبہ: ابن خزیمہ کا شمار اکابر محدثین اور نامور آئمہ فن میں ہوتا ہے۔ احادیث پر ان کی نظر نہایت وسیع اور گہری تھی، وہ کم سنی ہی میں امام اور حافظ حدیث کی حیثیت سے مشہور ہو گئے تھے۔ ایک مرتبہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک نامور شاگرد امام مزنی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک عراقی شخص نے دریافت کیا کہ جب قرآن مجید نے قتل کی صرف دو ہی صورتیں بیان کی ہیں، عمد وخطاء تو آپ لوگ تیسری قسم شبہ عمد کو کس طرح مانتے ہیں۔ انہوں نے جواب میں ایک حدیث پیش کی۔ اس نے کہا کہ آپ علی بن زید بن جدحان کی روایت سے استدلال کرتے ہیں۔ یہ سن کر مزنی خاموش ہو گئے اور ابن خزیمہ نے جواب دیا کہ شبہ عمد کی روایتیں دوسرے طریق سے بھی مروی ہیں۔ عراقی نے کہا اور کس واسطے سے مروی ہیں؟ امام ابن خزیمہ نے فرمایا ایوب سختیانی اور خالد حزاء سے۔ اس نے ایک راوی عقبہ کے متعلق شک وتردد ظاہر کیا، معترض نے امام مزنی سے معلوم کیا کہ کیا آپ مناظرہ کر رہے ہیں؟ امام مزنی نے فرمایا کہ احادیث کے بارے میں مجھ سے زیادہ واقفیت رکھتے ہیں اس لیے میں ان کے سامنے خاموش ہو رہتا ہوں۔

حافظ ابن قیم نے لکھا ہے کہ محمد بن اسحاق بن خزیمہ امام الائمہ کے لقب سے موسوم کیے جاتے تھے اور وہ مقلد کی بجائے علم فقہ میں بھی خود مستقل امام تھے۔ ان کے معاصرین علما اور ارباب کمال نے ان کے علم وکمال کے معترف تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی مرجعیت اور شہرت عطا فرمائی تھی، امام الائمہ ان کے نام کا جز بن گیا تھا۔

وفات: 2 ذی قعد 311ھ/ 923ء کو داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے گھر کے ایک کمرہ میں دفن کیے گئے، بعد ازاں ان کے گھر کو مقبرہ میں بدل دیا گیا۔

تصنیفات: امام ابن خزیمہ ایک نامور مصنف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات کی تعداد حاکم نے چودہ سے زیادہ بتائی ہے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ ابن خزیمہ تصنیف شروع کرنے سے پہلے استخارہ کی نماز پڑھتے تھے اور بعد از استخارہ تصنیف کی ابتدا کرتے تھے۔ ان کی جن اہم کتب کے نام ملے ہیں وہ یہ ہیں۔ (1) فقہ حدیث بریرہ، اس میں حدیث کی فقاہت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ (2) کتاب التوحید والصفاۃ، یہ بڑی اہم کتاب ہے اس کا موضوع کلام وعقائد ہے۔ یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہے۔

صحیح ابن خزیمہ: یہ امام ابن خزیمہ کی سب سے اہم تصنیف ہے، اس کا شمار علم حدیث کی معتبر کتابوں میں ہوتا ہے۔ ثقہ علما اس کی حدیثوں سے استناد کرتے تھے۔ کتب صحاح کے سب سے مستند کتاب ہے۔

الحاکم نیشاپوری (321ھ/ 933ء-405ھ/ 1014ء)

ممتاز محدث اور مصنف المستدرک علی الصحیحین

نام ونسب: محمد ابن عبداللہ بن محمد، ابوعبداللہ المعروف بہ ابن البیع، ایک ممتاز محدث اور صاحب المستدرک علی الصحیحین۔

ولادت وتعلیم: (3 ربیع الاول) 321ھ/ 933ء میں پیدا ہوئے اور 3 صفر 405ھ/ 1014 عیسوی کو وفات پائی۔ انہوں نے علم حدیث کی تحصیل کے لیے اس زمانے کے مطابق مختلف ملکوں کا سفر کیا اور تقریباً دو ہزار شیوخ سے سمع حدیث کی۔ چونکہ کچھ عرصے تک وہ قاضی کے منصب پر فائز رہے اس لیے الحاکم کے عرفی نام سے مشہور ہوئے۔ انہوں نے بہت سی کتابیں بھی تصنیف کیں جن کی تعداد الذھبی نے ایک ہزار کے قریب بتائی ہے۔ ان میں سے ایک "معرفۃ علوم

الحدیث" ہے، جو علم حدیث پر ایک اہم کتاب ہے۔ الذھبی نے اپنی کتاب "تذکرۃ الحفاظ" میں انہیں امام محدثین کا خطاب دیا اور اعلیٰ درجہ حافظ حدیث بتایا ہے۔ ابن حجر نے لکھا ہے کہ الحاکم اس قدر ممتاز ہیں کہ ان کا شمار ضعیف محدثین میں نہیں کیا جاسکتا۔ بایں ہمہ ابن حجر کی رائے میں وہ بڑھاپے میں کچھ غیر محتاط ہو گئے تھے۔ ان اعتراضات کے باوجود الحاکم محدثین میں ایک بلند مقام کے حامل ہیں۔ ان کی مطبوعہ تصانیف میں سب سے اہم "المستدرک علی الصحیحین" ہے۔ دیگر کتب میں (2) المدخل فی اصول الحدیث، (3) معرفۃ علوم الحدیث۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ لندن سے 1953ء میں شائع ہوا تھا۔ ان کے علاوہ الحاکم کی "تاریخ نیشاپور" جو السبکی کے نزدیک فقہا پر مفید ترین تاریخ ہے۔ کتاب المزکی الاخیا بھی ان کی ایک مشہور کتاب ہے۔ ان کی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔

البیہقی (384ھ/994ء-458ھ/1066ء)

ایک شافعی محدث وفقیہ اور مصنف کتاب "السنن الکبریٰ"۔

نام ونسب: ابوبکر احمد بن الحسین بن علی بن عبداللہ بن موسیٰ الخسر وجردی۔

پیدائش وتعلیم: البیہقی شعبان 384ھ/ 994ء میں ایران کے شہر بیہق میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے حدیث ابوالحسن محمد بن الحسین العلوی، الحاکم ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ اور دیگر اساتذہ سے پڑھی اور اس علم کی تحصیل کے لیے بہت سے ملکوں کا سفر کیا اور ایک سو سے زائد شیوخ سے سمع حدیث کی اور استفادہ کیا۔ عقائد میں امام الشعری کے پیروکار تھے۔ اور فطرتاً کفایت شعار، متقی اور طلب علم کے دلدادہ تھے۔ آخری عمر میں نیشاپور چلے گئے اور وہاں درس وتدریس حدیث اور اپنی کتابوں کی نقل کرانے میں مشغول ہوگئے۔ بہت پرنویس تھے اور کہا جاتا ہے کہ آپ کے نوشتوں کی تعداد ایک ہزار تک پہنچتی ہے۔ ممتاز محدث ہونے کے باوجود یہ مشہور ہے کہ وہ الترمذی، النسائی اور ابن ماجہ کی تصنیفات سے آشنا نہیں تھے۔ ان کے تذکرہ نگاروں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ انہوں نے مسند امام احمد بن حنبل بھی نہیں دیکھی تھی۔ البتہ الحاکم کی "مستدرک" کا استعمال آزادی سے کیا۔ الذھبی نے لکھا ہے کہ علم حدیث میں گو البیہقی کا دائرہ علم بہت زیادہ وسیع نہیں تھا، لیکن اس کے ضمنی فنون اور علم رجال والاسانید سے خوب واقف ہونے کی وجہ سے وہ علم الحدیث پر بحث کرنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ ان کی تالیفات میں "السنن الکبریٰ" شاید سب سے زیادہ مشہور ہے، اس کی بڑی قدر ومنزلت ہوتی رہی ہے۔ السبکی نے لکھا ہے کہ تناسب، ترتیب اور عمدگی میں کوئی اور کتاب اس کی مثل نہیں ہے اس کتاب کے حواشی میں مصنف نے احادیث اور محدثین کی ثقاہت اور عدم ثقاہت کی طرف اشارہ کیا ہے اور اکثر اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ خاص خاص حدیثیں فلاں فلاں مسلم الثبوت مجموعوں میں موجود ہیں۔ البیہقی کی دوسری اہم تصنیف "کتاب المبسوط فی نصوص الشافعی" ہے۔ الذھبی نے لکھا ہے کہ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے امام الشافعی کے اصول فقہ جمع کیے مگر السبکی کی رائے میں بیہقی سب سے آخری تھے۔ امام الحرمین الجوینی بیہقی کی کتابوں جو شافعی مذہب کی تائید میں ہیں، بہت تائید کرتے ہیں۔

وفات: البیہقی نے 10 جمادی الاولیٰ 458ھ بمطابق 19 اپریل 1066ء نیشاپور میں وفات پائی۔ ان کا تابوت بیہق لایا گیا اور وہ خسروجرد میں مدفون ہوئے۔

ان کی تصنیف السنن الکبریٰ پر قاضی القضاۃ شیخ علاء الدین علی بن فخر الدین عثمان بن ابراہیم المارد ینی الحنفی المعروف با بن الترکمانی نے ایک ضخیم حاشیہ "الجوہر النقی فی الرد علی بیہقی" لکھا تھا جس میں معترضانہ اور مناقشانہ انداز اختیار کیا تھا۔

القاضی ابوالفضل عیاض (474ھ/1083ء)

عالم المغرب اور امام اہل الحدیث، ایک مشہور مالکی فقیہ اور محدث

نام ونسب: عیاض بن موسیٰ بن عیاض بن عمرون الیحصبی المالکی۔ کنیت ابوالفضل معروف بہ قاضی عیاض، مالکی فقیہ، محدث، مورخ، ماہر ادیب اور شاعر۔

پیدائش وتعلیم: سبتہ CEUETA میں 15 شعبان 474ھ بمطابق 28 دسمبر 1083ء کو پیدا ہوئے اور مراکش میں 7 جمادی الآخر 544ھ/13 اکتوبر 1149ء کو وفات پائی۔ سبتہ میں قاضی ابوعبداللہ بن عیسیٰ اور ابواسحاق بن الفاسی جیسے فقیہ عالم سے تعلیم پائی۔ بعدازاں 507ھ/1114ء میں قرطبہ چلے گئے، جہاں وہ پوری تن دہی سے بالخصوص حدیث کی تعلیم میں منہمک ہوگئے اور ابومحمد عبداللہ بن عتاب، ابوولید ابن رشد اور دیگر علماء کے درسوں میں شریک ہوتے رہے۔ پھر اندلس سے تحصیل علم کے بعد دنیائے مشرق کا رخ کیا اور مشرق میں بھی اکابر علماء سے اکتساب کیا۔ مورخین نے ان کے ساتھ کی تعداد 100 سے زائد بتائی ہے۔

وطن واپسی پر 515ھ میں سبتہ کے قاضی کے عہدے پر مامور کیے گئے جہاں ان کی انتظامی صلاحیتیں کھل کر سامنے آئیں۔ 531ھ میں وہ غرناطہ کے قاضی مقرر کیے گئے، لیکن کچھ کے بعد ان کا تبادلہ واپس سبتہ میں ہوگیا۔ الموحدوں کو خیر مقدم کہنے والوں میں وہ پیش پیش تھے، چنانچہ شیوخ الموحدون کے سامنے اظہار اطاعت کرنے کے لیے گئے، لیکن 1148ء میں جب انہوں نے دیکھا کہ الموحدون باہمی مناقشات کی وجہ سے کمزور ہوگئے ہیں تو انہوں نے سبتہ سے ہجرت کرکے مراکش میں سکونت اختیار کرلی، وہیں ان کا انتقال ہوا اور انہیں باب ایلان کے قریب دفن کیا گیا۔

تالیفات: مورخین کے مطابق انہوں 22 کتابیں تالیف کی تھیں۔ ان میں سے حسب ذیل ہم تک پہنچی ہیں۔

(1) الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح جس میں معترضین کو جواب دیے گئے ہیں۔ ایک مثالی کتاب ہے۔

(2) مشارق الانوار یا علی صحیح الآثار، یعنی موطاء امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی غیر مانوس اصطلاحات کی لغت۔

(3) ترتیب المدارک وتقریب المسالک لمعرفۃ اعلام مذہب مالک۔ مالکی مذہب کے علما کے سوانح حیات۔

(4) الکتاب الالماع الی معرفۃ اصول الروایۃ وتقیید السماع، مصطلح الحدیث کے موضوع پر کتاب۔

(5) اکمال المعلم فی شرح صحیح مسلم، شرح صحیح مسلم شریف

(6) التنبیہات المستنبطہ علی الکتب مدونہ۔ حدیث ام زرع۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور کتابیں ان کے نام معنون ہیں۔

شفا شریف: قاضی عیاض کی اس تصنیف کو علما وفضلاء نے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اسے سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ کتاب کی مقبولیت کے لیے اس سے بڑھ کر کیا سند ہوسکتی ہے کہ وہ بارگاہ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم میں مقبول ہوجائے۔ الشفاء شریف کے لیے سب سے بڑا امتیاز یہی ہے۔ قاضی عیاض کے ایک بھتیجے نے خواب دیکھا کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سونے کے تخت پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر اس پر ہیبت طاری ہوگئی۔ حضرت قاضی عیاض صاحب نے اس کی یہ کیفیت محسوس کرلی۔ اور فرمایا۔ ''بھتیجے میری کتاب شفاء کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور اسے دلیل راہ بناؤ۔ گویا یہ اشارہ تھا کہ مجھے یہ منصب وکرامت اس کتاب کی بدولت ملی ہے۔ شہرہ آفاق مورخ حاجی خلیفہ نے لکھا ہے کہ الشفاء قاضی عیاض دلوں کی شفا ہے۔

امام السہیلی عبدالرحمٰن بن عبداللہ

چھٹی صدی ہجری کے اندلس کے مشہور عالم، مفسر، محدث اور مورخ

نام ونسب: ابوزید عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن احمد السہیلی۔

ولادت: مالقہ میں 508ھ میں ہوئی جبکہ وفات مراکش میں 581ھ میں پائی۔ علامہ ذہبی کی رائے ان کے بارے میں یہ ہے کہ متعدد تصانیف کے باوجود ان کی اصل شہرت سیرت ابن ہشام کی شرح "الروض الانف" کی وجہ سے ہے۔ اس لیے "صاحب کتاب الروض الانف" ان کے تعارف کا لازمی حصہ بن گیا ہے۔ یہ سیرت ابن ہشام کی تمام شروح میں سب سے زیادہ مشہور، متداول، جامع اور محققانہ ہے۔ خود امام السہیلی کے اپنے بیان کے مطابق ان کی ذاتی تحقیق کے علاوہ ایک سو بیس کتابوں کا عطر اس میں موجود ہے۔ اور وہ علم وادب، اسماء الرجال وانساب اور فقہی ونحوی معلومات کا خزانہ ہے۔

امام السہیلی کی بینائی صرف سترہ سال کی عمر میں جاتی رہی تھی، اس کے باوجود درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور کئی اہم کتابیں تالیف بھی کیں۔

ان کی مشہور کتاب الروض الانف دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ جس میں جلد اول میں ہجرت تک کے واقعات وحالات سیرت موجود ہیں جبکہ دوسری جلد میں بعد از ہجرت کے واقعات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب یا شرح سیرت ابن ہشام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب کو علامہ السہیلی نے استخارہ کرنے کے بعد شروع کیا تھا اور اس کا املا 569ھ کے محرم میں شروع کر کے اسی سال جمادی الاولی یعنی چار پانچ ماہ میں مکمل کر لی تھی۔ امام السہیلی کی زندگی کے متعلق بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ ان کی دیگر تصانیف میں الاعلام بما ابہم فی القرآن من الاسماء والاعلام اور کتاب الفرائض اہم ہیں۔

شیخ عبدالحق حقی محدث دہلوی (958ھ/1551ء تا 1052ھ/1642ء)

دہلی کی ایک برگزیدہ شخصیت، محدث اور علوم دینی کے ممتاز عالم اور مصنف "مدارج نبوۃ"

نام ونسب: عبدالحق حقی بن سیف الدین الترک الدہلوی، البخاری قادری۔ ایک برگزیدہ شخصیت اور علوم دینی و معقولات کے بہت بڑے عالم ان کا شمار ان علوم کے نامی گرامی اساتذہ میں ہوتا ہے۔

ولادت وتعلیم: محرم 958ھ/ جنوری 1551ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کی بدولت سرزمین ہند میں علم حدیث کے مطالعے کو فروغ اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ بائیس سال کی عمر میں علوم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ کچھ عرصہ تک فیضی اور میرزا نظام الدین کی صحبت میں فتح پور رہے، لیکن پھر اس ماحول سے متنفر ہو گئے، خصوصاً فیضی سے ان کے تعلقات میں تبدیلی آئی۔ 995ھ کی ابتدا حج کے ارادے سے بندر گجرات گئے۔ تاہم، انہیں حجاز کے سفر کے لیے، بحری جہاز 996ھ میں ملا۔ انہوں نے سرزمین حجاز میں چند برس قیام کیا اور شعبان 998ھ تک وہیں قیام پذیر رہے اور علوم مذہبی اور تصوف کی مزید تعلیم وہاں کے مشہور علماء اور شیوخ سے پائی۔ دہلی واپس آنے پر انہوں نے باون مختلف علوم کا درس دیا اور ان پر کتابیں بھی تصنیف کیں۔ وہ 1028ھ/ 1619ء میں شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں حاضر ہوئے۔ جہانگیر اپنی کتاب "تزک جہانگیری" میں ان کے فضل وسعادت کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ جہانگیر اور شاہجہاں دونوں ان کی سفارش پر غریبوں اور حاجت مندوں کی حاجت روائی کیا کرتے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، شاہ عبدالمعالی کی زیارت کے لیے لاہور آئے اور تقریباً 20 دن لاہور میں قیام کیا۔ شاہ عبدالمعالی کی فرمائش پر انہوں نے "فتوح الغیب" کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا اور

شرح بھی لکھی۔

وفات: 2 ربیع الثانی 1052ھ/ 30 جون 1642ء کو انہوں نے وفات پائی۔ ان کا مقبرہ دہلی میں حوض شمسی پر واقع ہے۔ قبے کی ایک دیوار پر ایک کتبہ لگا ہوا ہے جس میں شیخ کی زندگی کے حالات کا خلاصہ تحریر ہے۔

بشیرالدین احمد نے اپنی کتاب "واقعات حکومت" دہلی میں لکھا ہے کہ شیخ صاحب کی اولاد جو دہلی میں مقیم تھی، ہر سال ان کا عرس منعقد کراتی تھی۔ ان کے صاحبزادے نورالدین نورالحق بھی درس و تدریس اور تصنیف میں اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے تھے۔

تصانیف: اپنے ایک رسالے میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی 49 تصانیف کی فہرست دی ہے جو عربی اور فارسی زبان میں ہیں۔ ان تصانیف میں ان کا ایک دیوان بھی شامل ہے۔ باقی تصانیف اہم کا ذکر درج ذیل میں دیا جا رہا ہے۔

لمحات التنقیح: یہ التبریزی کی مشکواۃ المصابیح کی عربی شرح ہے۔ فارسی زبان میں مشکواۃ کی شرح "اشعۃ لمعات" کے نام سے ہے۔

اخبار الاخیار فی اسرار ابرار: اس تصانیف میں انہوں نے اولیائے کرام کا حال درج کیا ہے جو زیادہ تر ہندوستان سے متعلق ہے۔

زبدۃ الآثار: یہ تصنیف شیخ عبدالقادر جیلانی کے حالات کے لیے مخصوص ہے جبکہ ان کی مشہور تصنیف "فتوح الغیب" کا ترجمہ انہوں نے "مفتاح الفتوح" کے نام سے کیا تھا، جبکہ زاد المتقین میں ان کے شیوخ و اساتذہ کے حالات درج ہیں۔

جذب القلوب الی دیار المحبوب: مدینہ منورہ کی تاریخ ہے جو زیادہ تر السمہودی کی تصنیف وفاء الوفا الی دار المصطفیٰ سے ماخوذ ہے۔

مدارج النبوۃ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مفصل سیرت ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔

ذکر الملوک: اس میں غوریوں کی آمد سے لے کر اکبر کے عہد تک کے تاریخی حالات اختصار سے درج ہوئے ہیں۔

شیخ الہند، محمود الحسن (1268ھ/ 1851ء-1339ھ/ 1920ء)

دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس و شیخ الحدیث، مترجم القرآن اور تحریک ریشمی رومال کے راہنما

نام و نسب: مولانا محمود الحسن بن مولانا ذوالفقار علی۔ آپ کا تعلق دیوبند ضلع سہارن پور کے عثمانی شیوخ کے ایک معزز خاندان سے تھا، جو اپنے علم و عمل، شرافت و دینداری کی وجہ سے معروف تھا۔ ان کے والد مولانا ذوالفقار علی عربی زبان کے مشہور ادیب تھے۔

ولادت و تعلیم: مولانا محمود الحسن 1268ھ/ 1851ء میں بریلی میں پیدا ہوئے۔ جہاں ان کے والد مولانا ذوالفقار علی ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ انہوں نے فارسی کی سب کتابیں اور عربی کی ابتدائی کتب اپنے چچا سے پڑھیں۔ 1283ء میں جب دارالعلوم دیوبند قائم ہوا تو مولانا محمود الحسن اس دارالعلوم کے سب سے پہلے طالب علم تھے۔ انہوں نے کتب صحاح ستہ اور بعض دیگر کتب مولانا محمد قاسم نانوتوی سے پڑھیں اور سفر و حضر میں بھی ان کے ہمراہ رہے۔ تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد بطور معلم دارالعلوم دیوبند میں پڑھانے لگے اور صدر مدرس کے عہدے تک پہنچے۔

1877ء میں اکابر علماء اور مشائخ کی معیت میں فریضہ حج ادا کیا اور زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے۔ تذکرہ نگاروں کا اتفاق ہے کہ حرمین شریفین میں جتنی مرجعیت، مقبولیت اور محبوبیت شاہ عبدالغنی مجددی کو حاصل ہوئی وہ آج

تک کسی اور عالم کو نصیب نہ ہو سکی۔ مولانا محمود الحسن نے انہیں حضرت عبد الغنی مجددی سے اجازت وسند حدیث حاصل کی اور مکہ معظمہ سے واپس آ کر حاجی امداد اللہ سے بیعت ہوئے۔

درس و تدریس: 1305ھ میں مولانا محمود الحسن دار العلوم دیو بند کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ انہوں نے اپنے تبحر علمی، فرض شناسی، تندہی اور دلسوزی سے اس کو دنیائے اسلام کی ایک مرکزی درس گاہ بنا دیا۔ ان کے زمانے میں افغانستان انڈونیشیا تک کے طالب علم دار العلوم دیو بند سے مستفید ہوتے تھے۔ ان کے درس حدیث کی خصوصیت جمع بین الاقوال الفقہا والاحادیث تھی اور یہی حضرت شاہ ولی اللہ کے خاندان کا طرز تعلیم تھا۔

جنگ عظیم اول کے اثرات: جنگ عظیم اول میں ترکی نے جرمنی کے اتحادی کے طور پر شرکت کی جس کی وجہ سے برطانیہ اور اس کے اتحادیوں نے سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کر دیئے اور اسے شدید نقصان پہنچایا۔ جس کی وجہ سے مسلمانان ہند میں سلطنت برطانیہ کے خلاف غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی اور مساجد اور خانقاہوں میں سلطنت عثمانیہ کی سلامتی اور بقا کے لیے صبح وشام دعائیں ہونے لگیں، عوام نے لاکھوں روپے چندہ کر کے انجمن ہلال احمر استنبول بھجوائے۔ مولانا محمود الحسن نے چند روز کے لیے دار العلوم بند کر دیا اور اپنے شاگردوں کے ساتھ مختلف مقامات پر جا کر مسلمانوں کو ترکوں کی مدد کے لیے آمادہ کیا۔ جنگ طرابلس اور جنگ عظیم اول کے خونیں واقعات کے بعد مولانا نے فیصلہ کیا کہ جب تک انگریزوں کا اقتدار نہ ہوگا وہ میدان عمل میں خود بھی اتریں گے اور دوسرے علما کو بھی ساتھ لیں گے۔ مولانا تمام خطرات سے بے نیاز ہو کر آگے بڑھے جس کے بعد "ریشمی رومال کی تحریک" کے واقعات پیش آئے اور مولانا کو سرزمین حجاز سے گرفتار کر کے اسیر مالٹا بنا دیا گیا۔ مالٹا میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر کے آپ تین سال بعد ہندوستان واپس آئے اور دل وجان سے تحریک خلافت میں شمولیت اختیار کی۔ آپ نے اس زمانے میں انگریز حکومت کے خلاف ترک موالات کا فتویٰ بھی جاری کیا۔

وفات: ہندوستان آنے کے بعد آپ کی صحت گرتی چلی گئی اور بالآخر آپ نے 30 نومبر 1920ء کو وفات پائی اور دار العلوم دیو بند کے پہلو میں دفن کیے گئے۔

تصنیفات: اپنی تدریسی اور سیاسی مصروفیات کے باوجود مولانا لکھنے کے لیے بھی وقت نکال لیتے تھے۔ آپ کی تصنیفات میں ترجمہ القرآن، تقریر ترمذی، حاشیہ سنن ابی داؤد، تراجم ابواب بخاری شریف شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی آپ کی تصانیف ہیں۔ آپ کو شیخ الہند کا خطاب دیا گیا تھا۔ آپ کے حلقہ درس سے سینکڑوں ہی نہیں بلکہ ہزاروں طلبا فارغ تحصیل ہو کر نکلے۔ آپ کے تلامذہ میں مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا حسین احمد مدنی مشہور ہیں۔

مولانا زکریا کاندھلوی (1898ء-1982ء)

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی، تبلیغی جماعت کی کتاب "فضائل اعمال" کے مصنف

نام ونسب: محمد زکریا کاندھلوی بن مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی، ان کے چچا مولانا الیاس کاندھلوی تھے اور مولانا محمد یوسف کاندھلوی ان کے چچا زاد بھائی تھے۔

ولادت و تعلیم: 2 فروری 1898ء کو کاندھلہ میں پیدا ہوئے۔ مظفر نگر کے ایک نیک وصالح بزرگ ڈاکٹر عبد الحئی سے ابتدائی قاعدہ بغدادی قاعدہ پڑھا۔ اپنے والد ماجد محمد یحییٰ کاندھلوی سے قرآن حفظ کیا۔ مولانا زکریا فرماتے ہیں کہ قرآن کو حفظ کرانے کا والد صاحب کا طریقہ انوکھا تھا کہ ایک صفحہ یاد کرنے کو دیتے اور فرماتے کہ اسے 100 مرتبہ پڑھو پھر چھٹی کرو۔ اس طرح مولانا نے نہایت آسانی سے قرآن پاک حفظ کر لیا۔

1328ء یعنی بارہ تیرہ سال کی عمر تک گنگوہ میں قیام رہا۔ اس دوران ان کے شفیق چچا مولانا الیاس کاندھلوی نے انہیں فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھائیں اور اردو کی کچھ کتابیں بھی پڑھائیں۔ عربی تعلیم کا سلسلہ باقاعدہ طور پر سہارنپور آ کر شروع ہوا۔ مولانا یحیٰ عام متعارف درسی کتب کے خلاف تھے۔ ان کا اپنا انداز تھا صرف ونحو کی کتابیں خاص طرز اور تراجم کر کے پڑھائیں۔ کافیہ کے ساتھ مجموعہ اربعین اور پارہ عم کا ترجمہ پڑھایا۔ اس کے بعد قصیدہ بردہ شریف اور قصیدہ بانت سعاد، قصیدہ ہمزہ بھی پڑھایا گیا۔ حضرت مولانا رشید گنگوہی کی وفات کے بعد مولانا یحیٰ کو مولانا خلیل نے اپنے مدرسہ ظاہر العلوم سہارنپور بلوالیا، یہیں مولانا زکریا نے اپنی تعلیم مکمل کی اور حدیث کا سلسلہ شروع کیا اور مکمل کیا۔

1333ء میں حضرت سہارنپوری جب حج کے سلسلے میں حجاز مقدس جانے لگے تو شیخ زکریا اور مولانا عبداللہ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ 1334ء میں والد گرامی مولانا یحیٰ کاندھلوی کا انتقال ہو گیا جس کے بعد مولانا زکریا کا تقرر مدرسہ مظاہر العلوم میں بحیثیت مدرس ہو گیا۔

شادی: مولانا یحیٰ کے انتقال کے بعد ان کی اہلیہ اور والدہ مولانا زکریا کو مستقل بخار رہتا تھا جس نے تپ دق کی شکل اختیار کر لی۔ اسی اثنا میں والدہ کے اصرار پر مولانا نے مولانا رؤف الحسن کی صاحبزادی سے شادی کر لی، پھر 1355ھ/1937ء میں پہلی بیوی کی وفات پر عقد ثانی کیا۔

حج کی سعادت: 1338ء میں مولانا محمد خلیل سہارنپوری یعنی مرشد کی معیت میں حج کے لیے روانہ ہوئے۔ مکہ معظمہ میں مولانا محب الدین سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے جلد ہندوستان روانہ ہونے کا مشورہ دیا کیونکہ شریف حسین آف مکہ ترکوں کے خلاف بغاوت کرنے والا تھا۔ مولانا نے اشارۃً کہا تھا کہ حجاز میں قیامت بپا ہونے والی ہے۔ اسی دوران مدینہ منورہ حاضری کے لیے پہنچے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسافروں کو سرِ راہ اور سرِ عام لوٹ لیا جاتا تھا۔ اور حجاز میں سخت بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ تاہم مولانا کو کوئی حادثہ پیش نہیں آیا اور مدینہ منورہ میں ایک ماہ قیام کیا۔ بعد میں سرزمین حجاز کے ہی ہو کر رہ گئے۔

وفات: 24 مئی 1982ء کو مکہ مکرمہ میں انتقال کیا اور تدفین جنت بقیع مدینہ منورہ میں ہوئی۔

تصانیف: مولانا محمد زکریا کاندھلوی کی مشہور تصنیف ''فضائل اعمال'' ہے۔ جو فضائل والی احادیث پر مبنی ہے۔ پہلے یہ تبلیغی نصاب کے نام سے ترتیب دی گئی تھی بعد ازاں اس کا نام فضائل اعمال رکھ دیا گیا۔ اس کتاب میں میں حکایات صحابہ، فضائل نماز، فضائل قرآن، فضائل ذکر، فضائل رمضان اور فضائل تبلیغ کے ابواب رکھے گئے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی مولانا محمد زکریا نے بہت سی اور اہم کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ جن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں۔ (1) اوجز المسالک الی موطا مالک۔ (2) اللامع الدراری علی جامع البخاری۔ (3) الکوکب الدری علی جامع ترمذی۔ (4) الابواب والتراجم الصحیح بخاری۔ (5) الاعتدال فی مراتب الرجال۔ (6) اسلامی سیاست۔ (7) فتنہ مودودیت۔ (8) موت کی یاد۔ (9) تاریخ مشائخ چشت (10) آپ بیتی۔ (11) جماعت تبلیغ پر اعتراضات کے جوابات۔

علامہ ارشد سعید شاہ کاظمی (1384ھ/1964ء)

امام العصر، استاذ العلماء، شیخ الحدیث، رہبر طریقت، مبلغ اسلام

نام ونسب: حضرت علامہ ارشد سعید کاظمی بن حضرت علامہ احمد سعید کاظمی بن مولانا سید مختار احمد کاظمی بن حضرت حافظ شاہ سید یوسف علی کاظمی۔ کاظمی سادات امروہہ سے تعلق ہے۔ آپ کا شجرہ نسب حضرت امام موسیٰ کاظم سے جا ملتا ہے۔ آپ کے جد امجد حضرت سید احسن دہلوی عراق سے ہجرت کر کے سرزمین ہند پر تشریف لائے تھے۔ اسی نسبت سے آپ کاظمی کہلاتے ہیں۔

ولادت و تعلیم: حضرت علامہ سید ارشد سعید کاظمی مدظلہ، 13 مارچ 1964ء بمطابق 27 شوال 1384ء کو ملتان میں پیدا ہوئے۔ چھٹی جماعت تک اسکول میں ابتدائی تعلیم پائی جبکہ قرآن پاک والدین کریمین سے پڑھا۔ استاذ القراء حضرت قاری محمد یار نقشبندی سے قرأت کی تعلیم حاصل کی۔ حضرت غزالی زماں حضرت احمد سعید کاظمی سے درس نظامی کی کتب کے ابتدائی اسباق، نحو کی مشہور کتاب ''کافیہ'' اور علم مناظرہ کی اہم کتاب ''مناظرہ رشیدیہ'' اور ''اصول حدیث'' میں مقدمہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی باقاعدہ طور پر پڑھیں۔ شرح جامی اور امام جلال الدین سیوطی کی ''جمع الجوامع'' بھی والد گرامی قدر سے پڑھیں۔ قرآن مجید کا ترجمہ ''بالاستیعاب'' اور بخاری شریف کے چند اسباق بھی انہیں سے پڑھے اور سند حدیث بھی پائی۔ سعادت مندی یہ ہے کہ غزالی زماں نے ازراہ شفقت سند حدیث حضرت داتا گنج بخش ہجویری کے مزار پر انوار پر مولانا محمد صدیق ہزاروی اور دیگر علماء کرام کی موجودگی میں مرحمت فرمائی تھی۔ قطب مدینہ حضرت مولانا ضیاء الرحمن مدنی کے صاحبزادے حضرت مولانا فضل الرحمن مدنی سے بھی سند حدیث پائی۔ استاذ العلماء مولانا مشتاق احمد چشتی اور استاذ العلماء مولانا حضرت مفتی محمد اقبال سعیدی سے بھی سند حدیث پائی۔

حسن اخلاق: حضرت علامہ سید ارشد شاہ کاظمی صاحب کی پاکیزہ زندگی کے ہر پہلو سے آپ کا حسن اخلاق جھلکتا ہے۔ آپ کے حسن تکلم، حسن کردار، حسن معاشرت اور حسن صورت سلوک سے اپنے اور بیگانے بھی متاثر ہیں اور آپ کے مدح خواں نظر آتے ہیں۔

مسلسل حاضری دیار حبیب صلی اللہ علیہ وسلم: جنوری 1988ء میں آپ پہلی مرتبہ حجاز تشریف لے گئے اور تب سے ہر سال سالانہ مسلسل حاضری کے لیے دیار حبیب صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے ہیں اور تین مرتبہ حج کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔

حضرت علامہ ارشد سعید کاظمی صاحب، شیخ الحدیث، شیخ الادب، شیخ الفقہ ہیں۔ تقریباً 29 سال سے جامعہ ہذا میں خدمت حدیث شریف میں مصروف ہیں۔

بیرونی ممالک کے سفر: تبلیغی مساعی کے سلسلے میں آپ ایران، اردن، دمشق، قطر، دبئی، شارجہ، بنگلہ دیش جیسے ممالک کا سفر کر چکے ہیں۔ جبکہ سرزمین عراق (بغداد) کا سفر تعلیمی مقصد کی تکمیل کے لیے اور سعودی عربیہ زیارت حرمین اور حج وعمرہ کی سعادت کے لیے تشریف لے گئے ہیں۔ جامعہ انوار العلوم میں تدریسی فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ آپ عوامی محافل میں ماہانہ درس قرآن مجید دیتے ہیں اور اصلاح معاشرہ اور درستی عقائد کے لیے کوشاں ہیں۔ آپ کے تلامذہ میں عصر حاضر کے بہت سے علمائے کرام شامل ہیں۔ آپ تنظیم المدارس (اہل سنت) پاکستان کے سینئر نائب صدر ہیں۔ آپ کی قیام مدارس کے سلسلے میں بھی کوششیں قابل تحسین ہیں۔ آپ ملتان اور دیگر شہروں میں بہت سے مدارس قائم کر چکے ہیں۔

تصنیف و تالیف: حضرت علامہ ارشد سعید کاظمی نے تصنیف و تالیف کے سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور آپ نے اپنی تصانیف اور تالیفات سے اہل سنت کی راہنمائی کی ہے اور عقائد باطلہ کا رد کیا ہے۔ آپ کی تصنیفات میں سے چند اہم کے نام مندرجہ ذیل دیے جا رہے ہیں۔

(1) میلاد النبی، (2) کتاب الوسیلہ، (3) بدعت، (4) تقدیر اور تدبیر، (5) زیارت قبور، (6) تسکین دل، (7) حرف آخر، (8) دعا بعد نماز جنازہ، (9) مناظرہ و مکالمہ، (10) نہایت حسین مکالمہ وغیرہم۔

حضرت علامہ جہاں ایک جید عالم دین، بہت بڑے فاضل محدث اور مفسر ہیں وہیں آپ بحر معرفت اور تصوف و طریقت کے شناور بھی ہیں۔ تصوف و طریقت کی تمام منازل آپ نے اپنے والد گرامی کی راہنمائی میں طے کی ہیں۔ آپ سلسلہ عالیہ قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ، نقشبندیہ میں بیعت کے مجاز ہیں اور بیعت کرتے ہیں۔

سیرت نگاران

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ   دیکھئے تابعین وتبع تابعین

ابان بن عثمان (م105ھ/723ء)

علامہ واقدی، (130ھ/747ء-207ھ/822ء) وہب بن منبہ (م110ھ/728ء)

ابن سعد (168ھ/784ء-230ھ/845ء)

ابن شہاب زہری (50ھ/670ء-124ھ/741ء)

موسیٰ بن عقبہ

ابن اسحٰق

ابن ہشام

یعقوبی

ابن حزم اندلسی

ابن کثیر   دیکھئے مورخ

ابن قیم   دیکھئے آئمہ وفقہائے کرام

ابن سید الناس

علامہ عبدالبر

ابن بشکوال

الشامی

علی بن برہان حلبی

عبدالحق محدث دہلوی

علامہ یوسف بن اسماعیل نبہانی

علامہ شبلی نعمانی

سید سلیمان ندوی

قاضی محمد سلیمان منصور پوری

صفی الرحمان مبارک پوری

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

سید فضل الرحمان

ڈاکٹر حمید اللہ (1908ء-2002ء)

محمد حسین ہیکل (1888ء-1956ء)

نعیم صدیقی

سید قاسم محمود

ابن شہاب زہری (50ھ/670ء-124ھ/741ء)

نام ونسب: محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن عبداللہ بن شہاب، مکی قبیلہ بنو زہرہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی بنا پر ان کا لقب ابن شہاب زہری ہے۔

ولادت ورحلت: یہ 50ھ یا 51ھ میں پیدا ہوئے، بعض روایات سال ولادت 56ھ بھی ملتا ہے۔ ان کے پردادا عبداللہ بن شہاب معرکہ بدر میں اہل مکہ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑے تھے۔ اور جنگ احد میں تین مکیوں کے

ساتھ مل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دینے کی سازش میں بھی شریک تھے اور عملاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو زخمی کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ یہ امر ان کے پر پوتے کے لیے قدرتی طور پر تکلیف دہ رہا ہوگا۔ اسی لیے جہاں وہ اس سازش کا ذکر کرتا ہے اپنے پردادا کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا۔ الزہری کے والد حضرت عبداللہ بن زبیر کے ساتھ تھے جب انہوں نے بنوامیہ کی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ مگر خود الزہری اپنے بچپن کے زمانے ہی میں 64ھ میں خلیفہ مروان سے ملے تھے اور پھر عبدالملک بن مروان کے دربار میں رسائی پائی اور بالآخر دمشق میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ دمشق کی ہجرت سے پہلے ان کے ساتھ ایک حادثہ پیش آ گیا تھا جس کا ذکر ابن سعد نے کیا ہے۔

الزہری سے غیر ارادی طور پر ایک قتل سرزد ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے گھر سے نکلے اور آبادی سے باہر خیمہ لگا کر بیٹھ گئے اور کہتے تھے کہ کسی گھر کی چھت مجھے پناہ نہیں دے سکتی۔ ایک دن حضرت علی بن الحسین رضی اللہ عنہ ان کے پاس سے گزرے اور فرمایا کہ "ابن شہاب تمہاری مایوسی تو تمہارے گناہ سے بھی زیادہ شدید ہے۔ تم اللہ سے ڈرو اور استغفار کرو اور مقتول کے ورثا کو خون بہا کی ادائیگی کا پیغام بھیجو اور اپنے گھر کو چلے جاؤ۔"

اسی بنا پر الزہری کہا کرتے تھے کہ لوگوں میں سب سے بڑا احسان مجھ پر حضرت علی بن الحسین رضی اللہ عنہ کا ہے۔

یعقوبی کے مطابق الزہری نے اپنی جوانی کے زمانے میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے لڑائی میں خلیفہ عبدالملک کو اپنی خدمات پیش کیں تھیں۔ جب خلیفہ عبدالملک نے انہیں دنوں میں حج بیت اللہ کا قصد کیا تو یہ وہ زمانہ تھا جب مکہ میں خلیفہ کے مخالفوں کی طاقت عروج پر تھی، جب لوگوں نے بیت اللہ کی زیارت پر پابندی لگنے کا گلہ خلیفہ سے کیا تو ان سے خلیفہ نے کہا تھا کہ "یہ ابن شہاب الزہری تو موجود ہے۔ اس سے پوچھو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "تین مسجدوں کی زیارت کے لیے سفر کیا جا سکتا ہے۔ ایک مسجد الحرام، دوسری مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور تیسری مسجد بیت المقدس۔" یہ حدیث معمولی سے تغیر کے ساتھ صحاح ستہ میں موجود ہے اور اسے الزہری نے سعید بن مصعب اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ بہر حال شہاب ابن زہری کو اتنی چھوٹی عمر میں بحیثیت محدث ایسا امتیاز ملنا حیران کن ہے۔

خلیفہ عبدالملک کے جانشین خلفا کے عہد میں بھی ابن شہاب زہری دمشق ہی میں مقیم رہے اور دربار خلافت سے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا گیا تھا۔ بہر حال اموی خلفا کے دربار تک ان کی رسائی مسلم ہے، ان کی ہمہ دانی بھی ضرب المثل تھی۔ اللیث کہتے ہیں کہ نہ میں نے ابن شہاب جیسا کوئی جامع علوم دیکھا نہ ان سے بڑا عالم کسی کو پایا۔ حاجی خلیفہ نے کتاب المغازی ان سے منسوب کی تھی۔

تصانیف: ابن شہاب زہری نے امویوں کی فرمائش پر کتابیں بھی لکھی تھیں اور خاص طور پر ایک کتاب سیرۃ کے موضوع پر بھی رقم کی تھی۔ لیکن ان کی کوئی مستقل تصنیف ہم تک نہیں پہنچی۔ احادیث کے مجموعوں میں "الزہریات" کے نام پر جو کچھ ملتا ہے وہ بعد کے مولفوں نے جمع کیا تھا۔ ابن سعد کے دیئے گئے اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ الزہری نے "مغازی" کو محدود معنی میں نہیں لیا تھا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیات طیبہ کی طرف توجہ مرکوز تھی۔ انہوں نے خالد کی فرمائش پر جو کتاب مرتب کی تھی اس کے لیے خود ہی لفظ "سیرۃ" استعمال کیا تھا۔ الزہری اپنی جمع کردہ روایات کو زیادہ تر اسناد کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اس لیے وہ مستند ہیں۔ 124ھ/741ء میں ابن شہاب الزہری کا انتقال اپنی جاگیر ادامی میں ہوا تھا۔

موسیٰ بن عقبہ (55ھ/675ء-141ھ/759ء)

ابن شہاب زہری کے تین نامور تلامذہ میں سے ایک جنہوں نے مغازی کے موضوع پر لکھا

نام ونسب: موسیٰ بن عقبہ بن ابی عیاش، یہ حضرت الزبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے خاندان کے آزاد کردہ غلام تھے یا زیادہ صحیح طور پر یہ حضرت الزبیر کی بیوی ام خالد کے موالی تھے۔ اس لیے ان کے اس خاندان سے روابط بہت گہرے تھے۔

سال ولادت: ان کا سال ولادت یقینی طور پر معلوم نہیں ہے۔ موسیٰ نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ کیا تم نے کسی صحابی کو دیکھا ہے؟ کہا تھا کہ میں نے جب پہلا حج کیا تو اس وقت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ مکہ میں موجود تھے اور اسی سال نجدہ الحروری (خارجیوں کا راہنما) بھی حج کے لیے آیا تھا۔

طبری نے نجدہ کی مکہ میں موجودگی کے متعلق ایک یہ روایت محفوظ کردی ہے کہ 68ھ یعنی حضرت عبداللہ بن زبیر کی خلافت کے زمانے میں میدان عرفات میں چار پھریرے اڑ رہے تھے۔ ان میں سے ایک حضرت ابن الحنفیہ اور ان کے اصحاب کا جھنڈا تھا اور ایک ابن زبیر رضی اللہ عنہ کا ان دونوں کے پیچھے نجدہ الحروری کا جھنڈا اور ان کے بائیں طرف بنوامیہ کا علم لہرا رہا تھا۔ الطبری نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اس اندھیر کے خلاف ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے بعد ہی صف آراء ہو گئے تھے۔

بنابریں اس میں شک نہیں کہ موسیٰ بن عقبہ نے 68ھ میں حج کیا ہوگا اور ان کی ولادت بہر حال 55ھ تک ہو چکی ہوگی۔ ہمیں موسیٰ کی زندگی کے بارے میں عمومی طور پر کچھ زیادہ معلوم نہیں۔ بظاہر وہ دربار بنوامیہ سے الگ تھلگ رہے اور زوال بنوامیہ کے تقریباً دس سال بعد یعنی 141ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

موسیٰ بن عقبہ کا شمار مغازی کے ماہر علما میں ہوتا ہے۔ مالک بن انس کا قول ہے کہ موسیٰ بن عقبہ سے مغازی کا علم حاصل کرو۔ اس لیے کہ وہ بھروسہ کے قابل ہیں اور ایک ثقہ انسان ہیں۔" اس قول کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ موسیٰ بن عقبہ کی کتاب المغازی ضخامت میں کم رہی ہوگی اور اس جملے میں مالک بن انس نے غالباً الواقدی کے مقابلے میں بہتر کہا ہے، کیونکہ الواقدی کی کتاب "المغازی" پر وہ تنقید کرتے تھے۔ مشہور مستشرق الوئس اسپرنگر ALOYS SPRENGER نے دمشق میں اس کتاب کا سراغ لگانے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہا تھا۔ "تاریخ الخمیس" کے مولف دیار بکری نے موسیٰ بن عقبہ کی اس کتاب سے استفادہ کیا تھا۔ تاریخ الخمیس کے کچھ اجزا دریافت ہوئے ہیں جو پرشیئن اسٹیٹ لائبریری کی ملکیت ہیں۔ اس کے عربی متن کو جرمن ترجمے کے ساتھ زخاؤ نے شائع کیا تھا۔ (1904) اس رسالے سے ظاہر ہوتا ہے کہ موسیٰ کی کتاب المغازی محدود معنوں میں مغازی پر مشتمل نہیں تھی بلکہ اس میں کم از کم، ہجرۃ کا بیان تو موجود تھا۔ طبقات ابن سعد کی تیسری اور چوتھی جلد کے اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ موسیٰ کی کتاب میں حبشہ کو ہجرت کرنے والے خواتین وحضرات کے ناموں کی فہرستیں شامل تھیں۔ اس طرح بیعت عقبہ کرنے والوں اور شرکائے جنگ بدر کے ناموں کی فہرست کی موجودگی کا بھی پتہ چلتا ہے۔

ابان بن عثمان رضی اللہ عنہ (م105ھ/723ء)

تابعی کبیر، فقیہ، محدث اور کچھ مدت کے لیے والی مدینہ، مصنف کتاب المغازی

نام ونسب: ابان بن عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان، خلیفہ ثالث کے فرزند اور تابعی کبیر، ان کی والدہ کا نام ام عمرو بن جندب بن عمرو الدوسیہ تھا۔ ابان جنگ جمل (نومبر 656ء) میں حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہمرکاب تھے، مگر جب

جنگ کا انجام خلاف توقع ہوا تو جن لوگوں نے راہ فرار اختیار کرنے میں پہل کی ان میں وہ بھی شامل تھے۔ بلکہ ان میں دوسرے تھے۔ پتہ چلتا ہے کہ اس کے بعد مجموعی طور پر انہیں کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہیں رہی۔ خلیفہ عبدالملک بن مروان نے اپنے عہد میں انہیں مدینے کا والی مقرر کر دیا تھا، وہ اس منصب پر سات سال، تین ماہ اور 13 دن فائز رہے۔ بنوامیہ کے ایک عہدے دار کی حیثیت سے انہوں نے مدینہ منورہ کے والی کی خدمات انجام دیں۔

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی حیرت انگیز واقفیت کی بنا پر ان کا شمار مدینہ منورہ کے دس عظیم فقہا میں ہوتا ہے۔ اصحاب حدیث نے متعدد سنن کی روایت ان سے کی ہے۔ کہا جاتا ہے انہیں اپنے والد کے فتاویٰ از بر تھے۔

دس فقہا مدینہ میں سے ایک:

کتاب المغازی: یاقوت نے معجم البلدان میں ایک شیعی مولف ابان بن عثمان البجلی کا تذکرہ کیا ہے۔ اس نے "المبدأ والمبعث والمغازی" نامی کتاب لکھی تھی۔ وہ اسے "صاحب المغازی" کہتا ہے، لیکن ابان بن عثمان خلیفہ ثالث کے بیٹے ہیں اور انہیں بھی مغازی میں خصوصی مہارت حاصل تھی۔

طبقات ابن سعد میں ایک مغیرہ بن عبدالرحمن کے بارے میں کہا گیا ہے یہ قابل اعتماد تھے تاہم انہوں نے بہت کم احادیث کی روایت کی ہے۔ البتہ کچھ مغازی جو انہوں نے ابان بن عثمان سے اخذ کیے تھے، کثرت سے پڑھے جاتے تھے، وہ ان کی تعلیم کی اجازت دیا کرتے تھے۔ یہ مغازی جو مغیرہ نے ابان سے روایت کیے تھے، اصلاحی معنوں میں کتاب نہیں تھے بلکہ سیرت سے متعلق اخبار کا مجموعہ تھے۔ غالباً اس مجموعے سے ہم تک کچھ نہیں پہنچا۔

بہر حال تذکرہ نگاروں نے ابان بن عثمان کا تذکرہ اس اعتبار سے کیا ہے کہ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے ایک خاص مجموعہ مغازی فراہم کیا تھا۔

ابان نقد شعر کا اچھا ذوق رکھتے تھے بلکہ بعض تذکرہ نگاروں نے تو انہیں شعر کا رسیا لکھا ہے اور ابوزناد کہتے ہیں کہ میں نے مشکل سے ان کی کوئی مجلس ایسی دیکھی ہوگی جس میں انہوں نے مدینہ کے یہودی شاعر، الربیع بن الحقیق کے اشعار نہ پڑھے ہوں۔

وہب بن منبہ (م 110ھ/728ء)

جنوبی عرب کا ایک داستان گو اور چوتھا اہم سیرت نگار اور صاحب مغازی

نام ونسب: وہب بن منبہ جنوبی عرب کے باشندے تھے اور اصلاً ایرانی نژاد تھے۔ یہ لوگ ابناء کہلاتے تھے۔ وہب کے پردادا اُسوار کا نام بھی فارسی الاصل تھا۔ وہب، ابان بن عثمان، عروہ بن زبیر اور شرجیل بن سعد کے بعد چوتھا سیرت نگار تھا۔

ولادت: اگرچہ ان کے متعلق یہ غلط فہمی بھی ہے کہ انہوں نے 10ھ میں اسلام قبول کیا تھا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی ولادت قبل از ہجرۃ ہوئی تھی مگر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہب 34ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ ان کے حالات سے مطابقت رکھتا ہے۔ صفا کے قریب ایک مقام ذماران کا مولد بتایا جاتا ہے۔ ان کے بھائیوں میں ہمام، معقل اور غیلان کا نام آتا ہے۔ وہب ایک زمانے تک اپنے وطن میں قاضی کے منصب پر فائز رہے۔ ایک موقع پر وہب کو زاہدانہ زندگی بسر کرنے والا بھی بتایا گیا ہے۔ بیس سال تک انہوں نے نماز عشاء کے وضو سے نماز فجر ادا کی تھی اور چالیس سال تک بستر پر نہیں سوئے تھے۔ 100ھ میں وہ مکہ میں موجود تھے، انہوں نے مکہ کے متعدد فقہا سے ملاقات کی، عمر کے آخری حصے میں وہ قید کر دیئے گئے تھے۔

اس کا سبب معلوم نہیں ہوتا البتہ وہ دین کی خاطر اس قید و بند پر راضی تھے۔ گورنر یمن یوسف بن عمر ثقفی کے حکم پر کسی نامعلوم سبب کی وجہ سے ان کو 110ھ میں کوڑے بھی لگوائے گئے تھے، جن سے وہ وفات پا گئے۔

وہب کو ثقہ راوی سمجھا گیا ہے کہتے ہیں وہ ابن عباس، جابر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے تھے۔ وہب سے جو مغازی منسوب ہیں ان کے علاوہ انہوں نے احادیث انبیا اور زاہدوں کے قصے بھی بیان کیے ہیں جو بنی اسرائیل کے اخبار پر مشتمل ہیں۔ قصص الانبیا کی روایات میں خاص طور پر وہب ثقہ راویوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہب نے اپنے وطن یمن کی قدیم اسطوری تاریخ ''کتاب الملوک المتوجہ من حمیر و اخبارہم وغیرہ ذالک'' بھی لکھی۔ وہب کی یہ کتابیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل کی تاریخ عرب بتاتی ہیں۔ حاجی خلیفہ نے لکھا ہے کہ انہوں نے مغازی جمع کیے تھے مگر قدیم کتب سیرۃ میں کہیں بھی ان کا حوالہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے راویوں میں نہیں آتا۔ بہر حال جرمنی کے شہر ہائیڈل برگ کی ایک لائبریری میں ان کی تصانیف میں سے ''ذخیرہ اوراق بردی'' محفوظ ہے جو ان کی کتاب المغازی کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ ہائیڈل برگ کا یہ مخطوطہ ظاہر کرتا ہے کہ وہب نے مغازی کو محدود معنوں میں استعمال نہیں کیا چنانچہ اس میں عقبہ کبریٰ کی تاریخ بھی موجود ہے، دار الندوہ میں قریش کی میٹنگ کا احوال بھی درج ہے، ہجرت کی تیاریوں کا ذکر بھی ہے، پھر خود ہجرت کا بیان ہے، رسول اللہ کے مدینہ پہنچنے اور غزوہ بنو خثیمہ کی روداد بھی ہے۔ اگرچہ ہمیں ان اوراق بردی سے کوئی ایسی نئی معلومات حاصل نہیں ہوتیں جو سیرۃ اور مغازی کے بعد لکھی جانے والی مکمل کتب میں نہیں ہیں۔ بہر حال محققین نے لکھا ہے کہ وہب اپنے رواۃ کا نام نہیں لیتے اگرچہ ان سے باالتزام اخذ کرتے ہیں۔ یہی قدیم زمانے سے عرب کے قصہ گویوں کی عادت تھی۔

علامہ واقدی (130ھ/747ء-207ھ/822ء)

مشہور عرب مورخ اور سیرت نگار، صاحب مغازی،

نام ونسب: الواقدی، ابوعبداللہ محمد بن عمر، ایک عرب مورخ اور سیرت نگار

ولادت: 130ھ/747ء میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے، الواقدی کی نسبت اس کے دادا الواقد الاسلمی کے نام سے ہے، جو مدینہ کے بنو اسلم کے ایک گندم فروش عبداللہ بن بریدہ کا غلام تھا۔ 170ھ/786ء میں جب خلیفہ ہارون الرشید حج کے لیے آیا تو اس کا تعارف مدینہ منورہ کے ایک مستعد عالم کی حیثیت سے کرایا گیا، چنانچہ جب خلیفہ اور اس کے وزیر یحییٰ برمکی نے مقامات مقدسہ کی زیارت کی تو الواقدی نے ان کے معلم (راہنما(Guide) کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اس موقع پر دربار خلافت سے جو مراسم پیدا ہوئے ان سے اس نے 180ھ میں فائدہ اٹھایا، جب اسے کچھ مالی مشکلات پیش آئیں تو وہ بغداد گیا اور وہاں سے پھر رقہ روانہ ہوگیا، جہاں ان دنوں ہارون الرشید مقیم تھا۔

وزیر یحییٰ نے اس کی بڑی مدارت کی اور اسے خلیفہ کی خدمت میں پیش کیا۔ خلیفہ اپنا مدینہ منورہ کا سفر یاد کر کے اسے تحائف سے مالا مال کر دیا۔ اس نے اپنے دربار خلافت تک پہنچنے اور وہاں اپنی مدارت کے حالات مفصل طور پر قلمبند کیے ہیں۔ یہ سب طبقات ابن سعد میں موجود ہے، تاہم یہ ذکر نہیں ملتا کہ علامہ واقدی کو خلیفہ ہارون الرشید کی طرف سے بغداد کے مشرقی حصے کی قضاۃ کا منصب بھی عطا ہوا تھا۔ یہ قصہ یاقوت نے سب سے پہلے لکھا تھا۔ البتہ خلیفہ مامون الرشید نے اُسے 204ھ میں اضافہ میں قاضی عسکر مقرر کیا تھا۔ اس کا ذکر طبری اور ابن خلکان نے کیا ہے۔ خلیفہ مامون کے ساتھ واقدی کے تعلقات نہایت گہرے تھے۔ اس نے خلیفہ کو اپنا وصی مقرر کیا تھا اور جب الواقدی 207ھ کے اختتام پر وفات پا گیا تو مامون

الرشید نے بذات خود ان فرائض کو انجام دیا۔ الواقدی نے برامکہ کے زوال کے بعد بھی یحیٰی برمکی کے ساتھ اپنی احسان مندی کے اظہار میں کبھی اخفا سے کام نہیں لیا تھا۔

تصانیف: ابن الندیم کی الفہرست میں الواقدی کی تصانیف کی جو فہرست دی ہے اور وہ یوں ہے۔

(1) التاریخ والمغازی والمبعث (2) اخبار مکہ (3) الطبقات (4) فتوح الشام (5) فتوح العراق (6) الجمل (7) مقتل حسین (8) السیرۃ (9) ازواج النبی (10) الردۃ والدار (11) حزب الاوس والخزرج (12) صفین (13) وفات النبی (14) ام الحبشہ والفیل (15) السقیفہ وبیعتہ ابی بکر (16) سیرۃ ابی بکر ووفاتہ (17) مراعی قریش والانصار فی القتائع ووضع عمر الدواوین وتصریف ومراتبھا والسابہا (18) مولد حسن والحسین (19) ضرب الدنانیر والدراھم (20) تاریخ الفقہاء (21) کتاب فی طعام النبی (22) فتوح ارمینیہ وبلاد مابین النہرین

الواقدی کی تمام تصانیف میں سے صرف کتاب ''المغازی'' بطور ایک مستقل کتاب بچ سکی ہے۔ طبقات واقدی جو 187ھ کے واقعات تک پر مشتمل ہے، طبقات ابن سعد کی اساس و بنیاد ہے۔

ابن سعد نے سیرت، مبعث اور ازواج سے معتد بہ فائدہ اٹھایا ہے۔ الطبری تاریخ الکبیر کا بکثرت حوالہ دیتا ہے جس میں لازماً 179ھ تک کے واقعات قلمبند کیے گئے تھے۔ ابن حبیش نے کتاب الردہ والدار کے بہت سے حصول کو محفوظ کر دیا ہے۔

یوم الدار سے مراد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کا دن ہے۔ محققین کے مطابق فتوح الشام اور فتوح العراق مکمل طور پر محفوظ نہیں رہ سکیں جو کتابیں ان ناموں سے موجود ہیں وہ بعد کی تصانیف ہیں۔ الواقدی نے اپنی اسناد اپنی کتاب المغازی کے شروع میں درج کیں ہیں۔ تاہم الواقدی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے میدان میں اپنے نامور پیشرو محمد بن اسحاق کا کبھی نام لے کر ذکر نہیں کرتا۔ البتہ اس کے متعلق اچھے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ کتاب المغازی الواقدی کی حدیث اور فقہ میں دلچسپی ظاہر کرتی۔ الواقدی کی جو اصل خوبی محققین نے تسلیم کی ہے یہ ہے کہ وہ معلومات کا بڑا ذخیرہ فراہم کرتا ہے اور مختلف واقعات کی تاریخیں اور متعین درج کرنے کی وجہ سے علمائے اسلام الواقدی کو تاریخ کے میدان میں مسلم اور مستند تسلیم کرتے ہیں۔

ابن سعد (168ھ/784ء-230ھ/845ء)

المعروف بہ کاتب واقدی، مشہور محدث، مورخ، تذکرہ نگار اور مصنف کتاب ''الطبقات الکبیر''

نام و نسب: ابوعبداللہ محمد بن سعد بن منیع البصری الزہری، بنی ہاشم کا مولی جو کاتب الواقدی کے عرفی نام سے مشہور ہے۔

ولادت و وفات: وہ 168ھ/784ء میں پیدا ہوا اور اس نے 4 جمادی الثانی 230ھ/16 فروری 845ء کو بغداد میں وفات پائی۔

تعلیم: اس نے فن حدیث کی تعلیم ھشیم، سفیان بن عینیہ، ابن علیہ، الولید بن مسلم اور بالخصوص محمد بن عمر الواقدی سے پائی۔

یحیٰی بن معین کے سوا عموماً اسے حفاظ حدیث ثقہ راوی قرار دیتے ہیں۔ ابن سعد نے اپنے زمانے کے علمی مراکز کے سفر کیے تھے اور وہاں کی علمی شخصیات سے بھی بھرپور استفادہ کیا تھا۔ علمائے رجال نے ان کے سب شیوخ کی عدالت پر

گواہی دی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ابن سعد نے جو کچھ سرمایہ ہمارے لیے چھوڑا ہے وہ ہر طرح لائق اعتماد ہے اور قابل استناد بھی۔

تصنیفات: ابن سعد کی تمام تصنیفات میں "الطبقات الکبیر" زیادہ مشہور ہے۔ اس کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام علیہم الرضوان اور تابعین کے حالات مؤلف کے اپنے زمانے تک لکھے ہوئے ہیں۔ حاجی خلیفہ اس کی ایک اور کتاب طبقات الصغیر کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

طبقات دراصل تراجم رجال کی تدوین کا وہ طریقہ ہے جس میں افراد کے نام ان کی پشتوں کے یا طبقات کے لحاظ سے درج کیے جاتے ہیں۔ مثلاً طبقہ محدثین، طبقہ فقہا، طبقہ مفسرین وغیرہ یا انہیں شہروں کی رعایت میں تقسیم کیا جاتا ہے مثلاً کوفی، بصری، شامی اور مدنی وغیرہ۔

کتاب الطبقات الکبیر جسے عام طور پر "طبقات ابن سعد" کہا جاتا ہے ایک ضخیم کتاب ہے۔ ابن سعد نے اپنی طبقات کی پہلی دو جلدوں کو سیرۃ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وقف کیا تھا۔ کائنات کی تخلیق کا بیان سیرۃ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا دیباچہ ہے۔ اس میں آفرینش عالم کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ پھر انبیائے کرام کے حالات دیئے ہیں۔ اس کے بعد سیرت النبوی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ نسب کی اہم شخصیتوں کے احوال کے ساتھ دی گئی ہے۔ اسی وجہ سے طبقات نہ صرف سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا قدیم ماخذ ہے بلکہ صدر اسلام کی پوری معاشرت کی معلومات کا خزانہ ہے۔

ابن اسحاق (م150ھ/ 767ء)

مشہور عرب محدث، مورخ اور کتاب المبتداء، کتاب المغازی اور کتاب الخلفا کا مصنف

نام ونسب: محمد بن اسحٰق ابن یسار کے دادا یسار کو 12ھ/ 633ء میں عراق کے مقام عین التمر کے ایک گرجا گھر سے گرفتار کر کے مدینہ لایا گیا تھا جہاں وہ عبداللہ بن قیس کے قبیلے کا موٰلی بن گیا تھا۔

پیدائش: محمد بن اسحاق تقریباً 85ھ میں مدینہ میں پیدا ہوئے اور 150ھ یا 151ھ/ 767ء میں انہوں نے بغداد میں وفات پائی۔ ان کی والدہ ایک اور آزاد کردہ غلام کی بیٹی تھیں۔ ابن اسحٰق فن سیرت پر پہلی جامع کتاب کے مصنف ہیں۔ ابن اسحٰق کا تعلق راویوں کی اس دوسری نسل سے ہے جن میں الزہری، عاصم بن عمر بن قتادہ اور عبداللہ بن ابوبکر خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے عنفوان شباب میں قدم رکھتے ہی خود کو روایت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعے کے لیے وقف کردیا تھا کیونکہ وہ تیس سال کی عمر میں وہ یزید بن حبیب سے کسب فیض کے لیے مصر چلے گئے تھے، وہاں انہیں سند کا درجہ حاصل ہوگیا کیونکہ بعدازاں یہی یزید حدیث کے سلسلے میں ابن اسحٰق سے استناد کرنے لگا۔ مدینہ واپسی کے بعد انہوں نے اس تمام لوازمے کی ترتیب وتدوین کے کام کا آغاز کیا جو وہ اکٹھا کرچکے تھے۔ الزہری سے جو 123ھ میں مدینہ میں تھے مروی ہے کہ مدینہ میں "علم" کبھی کم نہیں ہوگا جب تک ابن اسحٰق جیسے لوگ یہاں سلامت ہیں اور انہوں نے ابن اسحٰق سے رسول اللہ کے مغازی کی تفاصیل بڑے ذوق وشوق سے حاصل کیں تھیں۔ مگر بدقسمتی سے ابن اسحٰق حضرت مالک بن انس سے دشمنی مول لے بیٹھے (بحوالہ حاجی خلیفہ) جن کے علمی کام سے انہیں ایک طرح کا تنفر تھا اور یوں جلد ہی ابن اسحٰق کی تحریروں اور خود ان کی استقامت پر سوال اٹھنے لگے۔ اغلب ہے کہ سنن پر ابن اسحٰق کی گم شدہ کتاب مالک کے غیظ کا سبب بنی ہے کیونکہ یہ فقہ کے میدان میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات وسنن پر مبنی ہوگی اور اسی لیے اختلافات بڑی شدت سے محسوس کیے گئے ہوں گے۔ اسی وجہ سے ان پر شیعی اور قدری ہونے کا الزام لگایا گیا۔ بہر حال ابن اسحٰق کو یا مدینہ چھوڑ دینے پر مجبور

کر دیا گیا یا وہ اپنی مرضی سے ہجرت کر گئے۔ کوفہ اور رے میں کچھ قیام کے بعد وہ مستقل طور پر بغداد میں سکونت پذیر ہو گئے اور خلیفہ المنصور کے متوسلین میں شامل ہو گئے اور انہیں اپنی مدونہ احادیث کا ایک نسخہ بخشش کی امید پر پیش کیا تھا۔

سیرت: یہ بات بھی یقینی ہے کہ ابن اسحٰق کی ''سیرت الرسول اللہ'' کا صحیح معنوں میں کوئی بھی حریف نہیں گو اس سے پہلے متعدد کتب مغازی موجود تھیں۔ اگرچہ مغازی کو سیرت کی شکل دینے والے ابن اسحٰق کی کتاب کا نام بھی ''کتاب المغازی'' ہی ہے مگر یہ تین حصوں میں تقسیم کی گئی ہے یعنی ''المبتداء''، ''المبعث'' اور ''مغازی'' اس لیے کہ اس میں اسلام سے پہلے نبوت کی تاریخ بھی ہے اور رسول اللہ کے ایام شباب اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کی تفصیل بھی بیان ہوئی ہے۔ آخر میں مدنی زندگی کا حال بھی ہے۔ یہ کتاب ہم تک اپنی اصلی اور مکمل سورت میں نہیں پہنچی۔ اس کا ایک مخطوطہ قسطنطنیہ کی کوپرلولائبریری میں محفوظ ہے مگر جب اس کا بغور معائنہ کیا گیا تو یہ بھی ابن ہشام ہی کا نسخہ نکلا۔ البتہ الطبری اور دوسرے مورخوں کے ہاں ابن اسحٰق کے جو اقتباسات ملتے ہیں اگر ان کا تقابلی مطالعہ نسخہ ابن ہشام سے کیا جائے تو ہمیں اصلی کتاب کی اصل صورت کا اندازہ کرنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔

ابن اسحٰق نے کتاب المبتدا میں کائنات کی ابتدا کا ذکر کیا ہے۔ جبکہ مبعث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی حالات ہجرت تک مذکور تھے اور کتاب المغازی میں غزوات اور سریات کا ذکر ہے۔ قرہ باشق KARABACEK نامی محقق کا خیال تھا کہ اسے ابن اسحٰق کی سیرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل متن کا ایک ورق قرطاس پر لکھا ہے رائنر RAINER کے مجموعے میں مل گیا ہے جیسا کہ کوپرلولائبریری میں ابن اسحٰق کی مزعومہ کتاب المغازی ابن ہشام کی تلخیص ثابت ہو چکی ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ ابن اسحٰق کی اصل کتاب الماوردی کے زمانے تک محفوظ تھی کیونکہ انہوں نے اپنی کتاب ''احکام سلطانیہ'' میں کتاب المغازی سے کچھ روایات نقل کیں ہیں جو محفوظ ہو گئی ہیں۔

ابن ہشام (م 218ھ/833ء)

مشہور عربی نحوی اور سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مصنف

نام ونسب: ابو محمد، عبدالملک بن ہشام بن ایوب الحمیری، البصری، ایک عرب نحوی جو بصرے میں پیدا ہوا اور مصر کے شہر فسطاط میں 13 ربیع الثانی 218ھ/8 مئی 833ء کو وفات پائی (بعض نے سنہ 213ھ دیا ہے)

ابن ہشام کی تاریخ پیدائش کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ ابن ہشام اور مشہور محدث اور سیرۃ نگار ابن شہاب زہری کے درمیان کتنے واسطے تھے اس کا پتہ نہیں چلتا تاہم یہ بات عیاں ہے کہ ان کے درمیان ایک سے زائد واسطے تھے۔ امام زہری مشہور سیرۃ نگار ابن اسحٰق کے شیخ تھے۔ جبکہ ابن ہشام نے سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم براہ راست ابن اسحٰق سے بھی حاصل نہیں کی۔ جن کا انتقال 151ھ میں ہوا تھا بلکہ ابن اسحٰق کے شاگرد زیاد بکائی (م 183ھ) سے روایت کی ہے۔ گویا ابن ہشام اور امام زہری کے درمیان دو واسطے پائے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے محققین نے اندازاً ابن ہشام کا سن پیدائش 120ھ کے لگ بھگ قرار دیا ہے۔

دوسری صدی ہجری کا زمانہ علمی وادبی نقطہ نگاہ سے اسلامی تاریخ کا عہد زریں مانا جاتا ہے۔ اس عہد کے علمی مراکز میں بصرہ کو امتیازی مقام حاصل ہے۔ اس زمانے کے بصرہ میں گھر گھر علم وادب کا چرچا تھا، تابعین اور تبع تابعین کا چشمہ فیض رواں تھا۔ بصرہ میں تفسیر وحدیث، لغت ونحو اور انساب واخبار کے آئمہ واساطین جمع تھے۔ عمرو بن العلاء (م 154ھ) حضرت سفیان ثوری (م 261ھ) اصمعی (م 213ھ) غرض اس شہر میں ہر عالم اپنے فن کا امام تھا۔

ابن ہشام نے اسی شہر علم اور اسی عہد زریں میں آنکھیں کھولیں، ہوش سنبھالا، شہر کے نامور علما کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ درس و مذاکرہ کی مجلسوں میں شریک ہوئے اور مروجہ علوم وفنون میں مہارت حاصل کی۔ ابن ہشام کی ایک تصنیف کتاب التیجان کے مطالعے سے ابن ہشام کے گھرانے کی علمی دلچسپیوں کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے۔ ابن ہشام نے اپنے باپ اور دادا ایوب کی مسندوں سے جو روائتیں نقل کیں ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں تاریخ اور قصص سے خاص لگاؤ تھا۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تاریخ وقصص کا ذوق ابن ہشام کو ورثہ میں ملا تھا۔ اس دور کے مطابق علوم کے لیے ابن ہشام نے بھی اس زمانے کے دوسرے علمی مراکز تک سفر بھی کیے ہوں گے۔ اس لیے کہ اس کے شیوخ میں کوفی اور مدنی علما بھی ہیں۔ البتہ یہ پتہ نہیں چلتا کہ انہیں مصر کا سفر کب پیش آیا اور وہ کیا اسباب تھے جن کی بنا پر ابن ہشام کو بصرہ کو خیر آباد کہنا پڑا اور مصر میں مکمل اور مستقل سکونت اختیار کرنا پڑی۔ کتاب التیجان میں ابن ہشام نے امام مصر، لیث بن سعد سے اپنی ملاقات کا ذکر بھی کیا ہے۔ مصر میں ابن ہشام نے اپنی سیرت کا درس دیا اور یہیں انہیں وہ سعادت مند شاگرد ملے جنہوں نے سیرت کی اشاعت کی اور آخر انہوں نے مصر ہی میں وفات پائی۔

تصنیفات: (1) تہذیب سیرۃ ابن اسحٰق، یہی کتاب ہی سیرت ابن ہشام کے نام سے مشہور ہوئی۔ اسی کتاب نے ابن ہشام کو شہرت عام اور بقائے دوام عطا کی۔ ابن ہشام نے یہ ابن اسحٰق کے شاگرد زیاد بکائی سے روایت کی ہے جو ابن اسحٰق کے تلامذہ میں سب سے زیادہ مشہور تھا اور جس کی روایات کو سب سے زیادہ مستند تسلیم کیا گیا ہے۔

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیاد بکائی کی شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ اس کے حصول کے لیے وہ اپنا گھربار فروخت کر کے ابن اسحٰق کے ساتھ ہو لیے تھے اور ان کے ساتھ رہ کر ان سے مغازی کی دو بار سماعت کی تھی۔

ابن ہشام نے سیرت ابن اسحٰق میں جو تبدیلیاں کیں انہیں ہم تلخیص و تدوین جدید کا نام دے سکتے ہیں۔ ان تبدیلیوں کی اتنی اہمیت ہے کہ اگر ہم ابن ہشام کے اس عظیم کارنامے کا جائزہ لیں تو یہ کسی طرح بھی ابن اسحٰق کے کارنامہ سے کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ ابن ہشام نے ابن اسحٰق کی روایات کو ہی نقل نہیں کیا بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر انہیں وجوہ سے بہت سے مقامات پر متن کے الفاظ میں بھی ترمیم کی جس نے اس کتاب کو شاہکار بنا دیا ہے۔ ابن ہشام کی ایک دوسری اہم تصنیف کتاب التیجان فی ملوک حمیر ہے جو سیرت کے بعد اہم کتاب ہے۔

یعقوبی (م 284ھ/ 897ء)

مشہور عرب سیرت نگار، مورخ اور جغرافیہ نویس اور تاریخ یعقوبی کا مصنف

نام ونسب: احمد بن ابو یعقوب بن جعفر بن وہب بن واضح الکاتب۔ یہ اپنی نسبت یعقوبی کے ذریعہ زیادہ معروف تھے۔ ان کی تالیف ''تاریخ یعقوبی'' کے مخطوطے پر ''الکاتب العباسی'' تحریر ملتا ہے، جس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ فن روایت میں اعلیٰ مقام رکھنے کے ساتھ ساتھ غالباً کسی عباسی خلیفہ کا کاتب تھا۔ یاقوت حموی نے اپنی کتاب معجم الادباء میں یعقوبی کا سنہ وفات 284ھ/ 897ء بتایا ہے اور لکھا ہے کہ وہ ایک کثیر التصانیف مصنف تھا۔ یعقوبی کا والد خلیفہ المنصور کے ایک مولیٰ واضح کی اولاد سے تھا۔ اپنے مورث کی طرح جو مصر کا والی تھا اور ادریس بن عبداللہ کو فخ میں 169ھ/785ء میں شکست کھانے کے بعد پناہ دینے کے جرم میں جان سے مارا گیا تھا، ہمارا مصنف بھی امامیہ کے معتدل موسوی فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے جوانی ارمینیہ میں اور خراسان میں آل طاہر کی ملازمت میں گزاری، جس کے کارناموں کا ذکر اس نے ایک خصوصی تصنیف کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی تاریخ عالم جس میں 259ھ/ 872ء تک کے حالات مرقوم ہیں بلاد

مشرق میں اپنے قیام کے دوران ہی میں لکھی تھی۔ اس کتاب میں مختلف اقوام عالم کا احوال قلمبند کرنے کے بعد آخر میں قبل از اسلام عربوں کے حالات دیئے گئے ہیں۔ دوسرے کے حصے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے 256ھ/872ء تک کی اسلامی تاریخ مذکور ہے۔ کتاب سے شیعی میلان عیاں ہے۔ تاریخ یعقوبی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اہم ترین واقعات تاریخ اسلام کا حساب ہیئت و نجوم کے اعتبار سے بھی بالالتزام دیتا ہے۔ یہ طریقہ اس نے سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مواد کے لیے بھی اپنایا ہے۔ بہر حال سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ اس کی تاریخ کا اہم حصہ ہے۔

مورخ یعقوبی نے عرب کی تاریخی روایات کے مطابق اپنی معلومات سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اہم راویوں اور اخباریوں کا مختصر ذکر بھی کتاب کے مقدمہ میں کیا ہے۔

ابن حزم اندلسی (384ھ/994ء-456ھ/1064ء)

اندلسی عرب فاضل، مشہور عالم دین، مورخ، سیرت نگار، شاعر اور جمہرۃ الانساب کا مصنف

نام و نسب: ابو محمد علی بن احمد بن سعید ابن حزم، ایک اندلسی عرب فاضل جسے کئی علوم و فنون پر دسترس حاصل تھی۔

ولادت و تعلیم: ابن حزم 384ھ کے ماہ رمضان کے آخری دن یعنی 7 نومبر 994ء کو قرطبہ میں پیدا ہوا تھا۔ ابن حزم کا خاندان کورہ لبلہ NIEBLA کے موضع منت لیشم میں رہتا تھا۔ اس کے پردادا نے عیسائیت چھوڑ کر اسلام قبول کیا تھا۔ اس کے والد نے جو منصور الحاجب اور اس کے بیٹے مظفر کا وزیر تھا... اپنا سلسلہ نسب یزید بن ابی سفیان کے ایک آزاد کردہ غلام سے جا ملایا۔ ایک اعلیٰ عہدہ دار کے بیٹے کی حیثیت سے قدرتی طور پر ابن حزم نے بڑی اعلیٰ تعلیم پائی۔ وہ اپنے ایک استاد عبد الرحمٰن بن محمد بن ابی یزید کا خصوصی طور پر ذکر کرتا ہے جس سے اس نے تحصیل علم کی۔

بنو عامر کا تختہ حکومت جس انقلاب نے الٹ دیا تھا اس سے ابن حزام اور اس کے باپ کی حیثیت میں نمایاں فرق آیا، اور دوسری حکومت کے آنے کے بعد ان دونوں کو بہت سے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے اس کو بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا، غیر معمولی ذہانت، بلا کا حافظہ اور حاضر دماغی، چنانچہ اس نے مختلف علوم میں بہت جلد مہارت تامہ حاصل کر لی تھی۔ قرطبہ کی سیاسی شورشوں کے بعد ان کے والد نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور 402ھ میں وفات پائی۔

والد کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد ابن حزم بھی قرطبہ چھوڑ کر میریہ چلے گئے مگر وہاں بھی سکون نصیب نہ ہوا اور مریہ کے حاکم نے ان پر اموی سلطنت کے احیا کا الزام لگا کر جلاوطن کر دیا۔ جلاوطنی ان کے لیے کچھ زیادہ صبر آزما ثابت نہیں ہوئی اور وہ بلنسیہ کے حاکم عبد الرحمٰن بن محمد کے دست راست بن گئے۔ غرناطہ کی مہم میں عبد الرحمٰن کو شکست ہوئی اور وہ قتل کر دیا گیا جبکہ ابن حزم کو دشمنوں نے قید کر دیا۔ ایک مدت تک قید رہنے کے بعد جب رہا ہوئے تو واپس قرطبہ پہنچے اور اپنی علمی مصروفیات میں منہمک ہو گئے۔ 414ھ میں اہل قرطبہ نے المستظہر کو خلیفہ بنایا تو ابن حزم اس کے وزیر بن گئے۔ مگر وہ جلد ہی قتل کر دیا گیا اور یہ ایک بار پھر جیل پہنچ گئے۔

اس کے بعد ابن حزم: یاقوت کے بیان کے مطابق ہشام المعتد باللہ (418ھ-422ھ) کے عہد میں وزیر رہے۔ اس کے بعد سیاست سے کنارہ کش ہو کر تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ بہر حال ان کی سیاسی زندگی میں کوئی حربہ ایسا نہیں تھا جو ان کے خلاف ان کے مخالفین نے استعمال نہ کیا ہو۔ قید و بند اور جلاوطنی کی صعوبتیں برداشت کرنے کے ساتھ ان کی زندگی میں جو سب سے زیادہ روح فرسا اور شرمناک سانحہ، اشبیلیہ کے حکمران معتضد بن عباد (434ھ-461ھ) کے عہد میں پیش آیا۔ اس ظالم نے ابن حزم کی بہت سی تصنیفات کو نذر آتش کر دیا اور بر سر عام ان کی کتابیں پارہ پارہ کر دی گئیں، اس کے

بعد ابن حزم اپنے آبائی گاؤں میں خانہ نشین ہو گئے اور انہوں نے 28 شعبان 456ھ/12 اگست 1064ء کو وفات پائی۔

تصانیف: ابن حزم کی سب تصانیف میں ان کی سیرت کے موضوع پر لکھی گئی کتاب ''جوامع السیرۃ'' اہم ترین ہے۔ اس کی وجہ تالیف اپنے طلبہ کو ایک ایسی جامع اور مختصر کتاب سیرت مرتب کر کے دینا تھا جس سے استفادہ آسان ہو۔ ابن حزم لکھتے ہیں کہ ''جو شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا بغور مطالعہ کرے گا وہ لامحالہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق پر مجبور ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت گواہی دیتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حقیقت میں اللہ کے رسول ہیں۔'' ''جوامع السیرۃ'' سیرت کے موضوع پر اس وجہ سے ایک اہم ترین کتاب ہے کہ اس کا مصنف سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے غیر معمولی دلچسپی رکھتا تھا اور اس نے اپنے مطالعہ سیرت کا نچوڑ اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ اسی طرح ابن حزم کی تاریخ نگاری کی خصوصیات سے بھی کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ جوامع السیرۃ ابن حزم کی سیرت نگاری اور تاریخ نگاری کا حسین امتزاج ہے۔

علامہ عبدالبر (368ھ/978ء-463ھ/1071ء)

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے حفاظ کبار میں سے ایک جو دقت نظر، تحقیق اور احتیاط کے لیے مشہور تھے۔

نام ونسب: امام ابو عمر یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر بن عاصم النمری۔

ولادت: علامہ ابن عبدالبر 14 ربیع الاول 368ھ کو بروز جمعہ قرطبہ میں پیدا ہوئے۔ ایک علمی گھرانے میں پرورش پائی۔ ان کے والد کا شمار قرطبہ کے فقہا و محدثین میں ہوتا تھا۔ انہوں نے بچپن ہی سے بیٹے کو دینی تعلیم دلائی۔ والد کے انتقال کے وقت علامہ ابن عبدالبر کی عمر صرف تیرہ سال تھی۔ والد کے انتقال کے بعد انہوں نے انتہائی جانفشانی اور استقلال سے علم حاصل کیا اور اپنے دور کے فقہ و حدیث کے جید علماء سے استفادہ کیا۔ ان کے اساتذہ میں ابو عمر ابن المکوی، ابن الفرض، عبدالوارث بن سفیان، خلف بن قاسم، ابو محمد عبداللہ اور دیگر اہم شخصیات شامل ہیں۔

پانچویں صدی کے آغاز ہی میں ابن عبدالبر کا شمار قرطبہ کے نامور علماء میں ہونے لگا تھا۔ پھر جلد ہی اس شہر کے سیاسی حالات خراب ہو گئے اور فتنوں کی آگ بھڑک اٹھی۔ اموی حکومت کا قصر زمین بوس ہو گیا اور اندلس میں طوائف الملوکی قائم ہو گئی۔ اندلس کا ہر بڑا شہر اس عہد میں ایک خود مختار حاکم کے زیر نگیں آ گیا۔ قرطبہ کے مسلسل خلفشار کی وجہ سے وہاں کے بہت سے علمانے ہجرت کی۔ دیگر شہروں کے امیروں نے ان علما کا اپنے درباروں میں خیر مقدم کیا۔ قرطبہ کو خیر باد کہنے والوں میں علامہ حافظ عبدالبر بھی تھے جنہوں نے قرطبہ سے نکل کر بطلیوس کا رخ کیا تھا۔ بطلیوس میں بنو الافطس کی حکمرانی تھی۔ وہ علامہ سے بڑے پرتپاک انداز میں پیش آئے اور ان کا بڑا اعزاز و اکرام کیا۔ وہاں سے پھر علامہ مشرقی اندلس چلے گئے جہاں کا حکمران مجاہد علما سے محبت کرتا تھا۔ علامہ نے بلنسیہ اور دانیہ میں قیام کیا۔ مجاہد نے انہیں اپنے ''۔۔۔ ین'' میں ملازمت دی، مجاہد کے بعد اس کے بیٹے علی بن مجاہد نے انہیں اس عہدے پر قائم رکھا۔ پھر ایک حادثہ پیش آیا۔ ابن عبدالبر کو صاحبزادے علی نے ایک پیغام دے کر اشبیلیہ بھیجا۔ امیر اشبیلیہ معتضد نے ان کا خیر مقدم کرنے کی بجائے انہیں قید کر دیا۔ آخر ابن عبدالبر خود معتضد کے پاس اس کی شان میں قصیدہ لکھ کر لے گئے اور رحم کی درخواست کی چنانچہ معتضد نے انہیں رہا کر دیا اور وہ دانیہ واپس آ گئے۔ مگر اپنے بیٹے کے انتقال کی بنا پر ابن عبدالبر نے دانیہ سے شاطبہ کا رخ کیا اور وہیں بعمر 95 سال 463 میں انتقال کیا۔ درازی عمر کے سبب انہیں اپنے بیٹے اور بہت سے شاگردوں کی مفارقت کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ مثلاً ابن حزم ان سے تقریباً 20 سال چھوٹے تھے انہوں نے سات سال قبل وفات پائی۔

تصانیف: فقہ اور حدیث پر ابن عبدالبر کی ایک کتاب ''تمہید مافی الموطاء من المعانی والاسانید'' ہے۔ اس کتاب

کے بارے میں ابن حزم کی رائے ہے کہ ''فقہ حدیث کے موضوع پر اس سے بہتر کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ دیگر علما کی نظر میں ابن عبدالبر کی دیگر تصانیف بھی خود ان کی عظمت کی گواہ ہیں ان کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ان کی الاستیعاب فی معرفتہ الاصحابہ بھی اہم کتاب ہے۔

الدرر فی اختصار المغازی والسیر: سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر ابن عبدالبر نے یہ کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب کے مقدمہ میں انہوں نے لکھا تھا کہ ''یہ کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اس کے بعد کے حالات و واقعات پر لکھی ہے اور موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحٰق کی سیرت النبی کو ماخذ بنایا ہے۔ ان کے اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کرنے کی وجہ یا مقصد سیرت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک مختصر تصنیف پیش کرنا تھا۔ مگر اس کتاب کی قدر و قیمت اتنی تھی کہ جب ابن حزم نے اپنی جوامع السیرۃ لکھنے کا ارادہ کیا تو ''الدرر'' کو مشعل راہ بنایا۔ جوامع السیرۃ میں ابن عبدالبر سے ان کی مطابقت صاف نظر آتی ہے۔ چونکہ علامہ ابن عبدالبر کا شمار حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کبار حفاظ میں ہوتا تھا جو وقت نظر، تحقیق اور احتیاط میں مشہور تھے اور یہی اصول اس کی سیرت میں بھی کارفرما نظر آتے ہیں۔

ابن بشکوال (494ھ/1101ء-578ھ/1183ء)

معروف اندلسی تذکرہ نگار، سوانح نگار اور سیرت نگار اور بہت سی کتابوں کا مصنف

نام ونسب: ابوالقاسم خلف بن عبدالملک ابن مسعود بن موسیٰ بن بشکوال بن یوسف بن واحد الانصاری

ایک عرب تذکرہ نگار جس کا خاندان بلنسیہ کے قرب وجوار (مشرقی اندلس) میں شورویون کے مقام پر رہتا تھا۔

ولادت وتعلیم ووفات: وہ 3 ذوالحجہ 494ھ بمطابق 29 ستمبر 1101ء کو قرطبہ میں پیدا ہوا، اس نے قرطبہ اور اشبیلیہ میں حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے ملک کی تاریخ کا وافر علم حاصل کیا اور کچھ عرصے تک قاضی ابوبکر ابن العربی کے نمائندے کے طور پر اشبیلیہ کے ایک محلّہ کا قاضی رہا۔ آٹھویں رمضان 578ھ/5 جنوری 1183ء کو منگل اور بدھ کی درمیانی رات میں اس کا انتقال ہوا۔ حاکم قرطبہ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔ اس کے اہم اساتذہ کے نام یہ ہیں۔ ابو محمد بن عتاب، ابوولید ابن رشد، ابوبکر ابن العربی وغیرہم۔ اس کے شاگردوں میں جو سب کے سب اس کی زندگی میں وفات پاگئے تھے، ابوبکر بن الخیر اور ابوالقاسم قنطری کے نام اہم ہیں۔

ابن بشکوال کو عربی سوانح نگاروں میں خاص شہرت اور امتیاز حاصل ہے اور ابن الابار کی رائے میں وہ قرطبہ میں علم حدیث پر آخری سند سمجھا جاتا تھا اور اندلس (اسپین) کی تاریخ پر سب سے زیادہ مستند مولف تھا۔ سیرت نگاری کے حوالے سے اس کی کتاب ''القربۃ الی رب العالمین فی الصلوۃ علی سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم'' کو یقیناً قابل ذکر قرار دیا جاسکتا ہے۔

تصانیف: سید پچاس کے قریب تصنیفات ابن بشکوال کی طرف منسوب کی جاتی ہیں، لیکن ان میں سے ہم تک صرف دو پہنچی ہیں۔ کتاب الصلۃ فی تاریخ آئمۃ الاندلس جو اندلس کے عربی علما و فضلا کے اسما کی معجم ہے۔ جبکہ دوسری ''قربتہ الی رب العالمین'' ہے جو سیرت کے موضوع پر ایک اہم کتاب ہے۔

ابن سیدالناس (661ھ/1263ء-734ھ/1334ء)

مشہور اندلسی عرب سوانح نگار مصنف ''عیون الاثر''

نام ونسب: فتح الدین ابوالفتح محمد بن ابوبکر محمد بن محمد بن احمد الاندلسی المعروف بہ ابن سیدالناس

ولادت ووفات، تعلیم: ابن سید الناس کی ولادت 661ھ یا 671ھ میں قاہرہ مصر میں ہوئی۔ قاہرہ اور دمشق میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ قاہرہ کے مدرسہ الظاہریہ میں استاذ الحدیث مقرر ہو گیا۔ علم حدیث کی ابتدائی تعلیم اپنے والد اور ابن دقیق العبد سے حاصل کی اور نحو ابن النحاس سے۔ علمی اسفار کے ذریعہ مختلف علوم و معارف میں مہارت بہم پہنچائی۔ نظم و نثر دونوں میں کمال حاصل کیا۔ متعدد تصانیف ان کی یادگار ہیں۔ ابن سید الناس نے 734ھ/1334ء میں وفات پائی۔

سیرت نگاری: البتہ سیرت نگاری کے حوالہ سے ان کی اہم ترین تصنیف اور ان کی شہرت کا باعث کتاب ''عیون الاثر'' فی فنون المغازی والشمائل والسیر'' ہے۔ یہ ایک بڑی اور ضخیم کتاب ہے اور دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ (یعنی سیرۃ الکبریٰ) جبکہ اس کا خلاصہ ''نور العیون'' کے نام سے کیا (سیرۃ الصغریٰ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں قصائد بھی لکھے اور ان کی شرح بھی کی۔ ان کا مشہور قصیدہ ''بشریٰ الحبیب فی ذکریٰ الحبیب'' ہے۔ جہاں تک عیون الاثر کا تعلق اس کا بنیادی موضوع ظاہر ہے سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ یہ ایک جامع اور متین کتاب اور معتبر اور مستند روایات پر مشتمل ہے۔ جو کچھ لکھا ہے محدثین کے طریقے پر سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اور کتاب کے آخر میں بھی تمام اسانید اور ان کے مراجع واضح کر دیئے ہیں۔

کتاب کی پہلی جلد میں دیباچہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب کے بیان سے لے کر بعثت اور ہجرت، مدنی زندگی اور غزوہ احد تک کے حالات دیئے گئے ہیں۔ دوسری جلد میں غزوہ احد کے بعد کی مدنی زندگی کے واقعات و حالات کا ذکر ہے۔ مثلاً واقعہ رجیع، بیئر معونہ، غزوہ الخندق، صلح حدیبیہ، فتح مکہ، غزوہ تبوک، حجۃ الوداع وغیرہ۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد، اعمام ازواج، خدام، موالی، صفات اور شمائل بیان کیے گئے ہیں۔

الحافظ علامہ ابن کثیر (701ھ/1301ء-774ھ/1373ء)

امام ابن تیمیہ کے عزیز شاگرد، ان کے ہم مسلک اور جہاد سیف وقلم میں قلم کی حد تک ان کے شریک کار الحافظ علامہ ابن کثیر آٹھویں صدی ہجری کے بڑی شامی علماء میں سے ہیں۔ وہ امام ابن تیمیہ کے عزیز ترین شاگرد تھے۔ ان کو فقہ، حدیث، تفسیر اور علم تاریخ و سیرت اور تراجم کے فنون میں کامل دستگاہ حاصل تھی۔ ان کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد چونتیس تک پہنچتی ہے۔ ان کی تفسیری عظمت ان کی تفسیر القرآن الکریم سے اور تاریخی شہرت ان کی تاریخ البدایہ والنہایہ سے عیاں ہے۔ یہ دونوں اپنے موضوعات پر بڑے مبسوط اور عظیم علمی کام ہیں۔

سیرت نگاری: ان کی تصنیفات میں سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کی مختصر اور مطول دو کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے اور خود انہوں نے بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ ایک کتاب کو ''سیرۃ الصغیر'' یا ''الفصول فی اختصار سیرۃ الرسول'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جبکہ ان کی کتاب سیرت دراصل ان کی کتاب ''البدایہ والنہایہ'' کا تقریباً ایک تہائی حصہ پر مشتمل ہے۔ چنانچہ عام مسلمان مورخین کے برعکس ابن کثیر نے اپنی عام تاریخی کتاب کے مفصل ترین سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ میں ''متعلقات سیرت'' کے طور پر چار اجزاء ''شمائل ودلائل'' و ''خصائص'' وفضائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اضافہ کا ارادہ کیا تھا تاہم یہ ابواب کتاب میں شامل نہیں ہیں البتہ دلائل نبوت کے باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ فضائل ضرور بیان کیے ہیں، لیکن وہ سیرت کے بعد اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بیان نہیں کر سکے۔ بہر حال شمائل اور دلائل کا حصہ بھی 300 کے قریب صفحات پر مشتمل ہے۔ اسلامی علوم فنون کی تاریخ میں یہ مواد یا حدیث کی کتابوں کے بعض ابواب یا سیرت کی ضمنی فصول پر مشتمل ہے۔ تاہم ابن کثیر چونکہ ایک بلند پایہ محدث تھے اور سیرت سے متعلقہ مواد کو صحیح احادیث کی روشنی میں پرکھ چکے تھے

اس لیے یہ مستند ہے۔ بہر حال ابن کثیر کی یہ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عظیم دائرہ کار اور وسیع ذخیرہ معلومات کے لحاظ سے انفرادی حیثیت کی مالک ہے۔ جس میں سیرت، شمائل اور دلائل کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

الشامی (م942ھ/1535ء)

دسویں صدی ہجری کے نامور محدث، شہرہ آفاق سیرت نگار اور مورخ، مصنف سبل الهدیٰ والرشاد في سيرة خير العباد

نام ونسب: شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن یوسف بن علی بن یوسف الدمشقی۔ دسویں صدی ہجری کے نامور محدث، شہرہ آفاق سیرت نگار اور مورخ۔ شام کے باشندے تھے مگر شام کو خیر باد کہہ کر مصر چلے آئے اور البرقوقیہ میں سکونت اختیار کی، اپنی وفات 942ھ/1535ء تک وہ یہیں قیام فرما رہے اور پھر واپس شام نہیں گئے۔

تصانیف: ان کی تصانیف میں مندرجہ ذیل کتب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (1) ''سبل الهدیٰ والرشاد في سيرة خير العباد'' جو عام طور پر سیرۃ شامیہ کے نام سے مشہور ہے۔ مصنف نے سینکڑوں کتب کے مطالعے کے بعد بڑی محنت اور تحقیق سے مرتب کی۔ یہ چار جلدوں میں ہے اور کئی کتب خانوں میں اس کے مخطوطے محفوظ ہیں۔ (2) عقود الجمان ہے في مناقب ابي حنيفة النعمان۔ اس کتاب میں مصنف نے بڑی شرح وبسط کے ساتھ امام ابوحنیفہ کے حالات ومناقب بیان کیے ہیں۔ (3) مطلع النور في فضل الطور (4) الاتحاف بتمييز ما تبع فيه البيضاوي صاحب الكشاف (5) عين الاصابه في معرفة الصحابه (6) الجامع الوجيز الخادم للغات القرآن العزيز (7) مرشد السالك الى الفية ابن مالك۔ (8) اتحاف الراغب الواعي في ترجمة الاوزاعي (9) الفوائد المجموعة في الاحاديث الموضوعة (10) الفضل المبين في الصبر عند فقد البنات والبنين

علامہ نور الدین ابن برہان الدین حلبی (975ھ-1044ھ)

دسویں اور گیارہویں صدی ہجری کے ایک نہایت جلیل القدر اور صاحب عظمت عالم

نام ونسب: آپ کا اصل نام علی بن ابراہیم بن احمد بن علی بن عمر المعروف بہ نور الدین ابن برہان الدین حلبی قاہری، شافعی ہے۔ علمی شخصیت ہونے کی وجہ سے آپ کو امام کبیر اور علامہ زماں کہا جاتا تھا۔ ان کے وسیع علم اور مطالعہ کی وجہ سے ہی ان کو علم کا بے کراں سمندر کہا جاتا تھا۔ دور دراز کے شہروں سے لوگ آپ کے پاس علم کی پیاس بجھانے کے لیے آتے تھے اور سیراب ہو کر جاتے تھے۔

شیخ سلطان مزاحی ان کے دور کے ایک زبردست عالم تھے مگر جب کبھی ان کے پاس علامہ حلبی کا گذر ہوتا تو اپنے درس سے اٹھ کر نہایت پرتپاک استقبال کرتے تھے۔ علامہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے اور اپنی مسند خاص پر علامہ کو بٹھاتے تھے۔

علامہ حلبی کے تلامذہ کی تعداد بھی وسیع تھی۔ مخصوص تلامذہ میں شیخ النور الشبر، شیخ شمس محمد الوسی اور شیخ شمس محمد الخریزی شامل تھے۔

تصانیف: آپ بہت سی بلند پایہ کتابوں کے مصنف ہیں جو مقبول خاص و عام ہوئیں آپ کی سب سے عظیم تصنیف سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر ''سیرت الحلبیہ'' ہے۔ جس کا مکمل نام ''انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون'' ہے۔ یہ کتاب تین جلدوں میں ہے اور شیخ محمد شامی کی ''سیرت شامی'' اور سید الناس کی ''عیون الاثر'' کا خلاصہ ہے مگر علامہ حلبی نے اس میں بڑے مفید اور مستند اضافے فرمائے ہیں۔ آپ کی یہ تالیف بے حد مقبول و مشہور ہوئی اور بڑے بڑے جید علما نے اسے سراہا۔

اس کے علاوہ آپ نے متعدد کتابوں پر حاشیے لکھے جن میں سے کچھ یہ ہیں۔ ''منہج القاضی ذکریا شرح منہاج از

شیخ جلال محلی، شرح ورقات ابن امام کاملیہ، شرح التصریف از شیخ سعد وغیرہ۔
علامہ حلبی 975ھ میں مصر میں پیدا ہوئے اور انہوں نے انہتر سال کی عمر پائی۔ آپ کا انتقال 1044ھ میں بروز ہفتہ شعبان کی آخری تاریخ کو ہوا۔ مصر میں قبرستان مجاورین میں دفن ہوئے (خلاصۃ الاثر)

عبدالحق حقی محدث دہلوی (958ھ/ 1551ء-1052ھ/ 1642ء)

دہلی کے محدثین کرام میں اولین اور مصنف کتاب سیرۃ "المدارج النبوۃ"

نام ونسب: عبدالحق بن سیف الدین ترک دہلوی۔ آپ کے آباؤ اجداد بخارا سے بعہد سلطان علاؤ الدین خلجی (1296ء) میں ہندوستان آئے تھے۔ سلطان خلجی نے آغا محمد ترک کو جو اس خاندان کے جداعلیٰ تھے اپنے امراء میں شامل کرلیا تھا۔ آغا محمد ترک کے پرپوتے کے دو بیٹے تھے، شیخ سعد اللہ اور شیخ سیف الدین۔ شیخ سیف الدین بڑے نامور ہوئے۔ انہی کو اللہ تعالیٰ نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی جیسا عظیم فرزند عطا فرمایا۔

ولادت وتعلیم: حضرت عبدالحق محدث دہلوی کی ولادت دہلی میں 958ھ/ 1551ء میں ہوئی۔ اپنے والد کے زیر سایہ تعلیم وتربیت حاصل کی، انہیں سے قرآن پاک کی ابتدائی تعلیم سے بہرہ ور ہوئے۔ فارسی اور عربی زبانیں بھی انہوں نے اپنے والد سے سیکھیں۔ صرف اٹھارہ برس کی عمر میں آپ تمام علوم عقلیہ ونقلیہ سے فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔

علوم باطنی: علوم ظاہری کے ساتھ آپ نے علوم باطنی کی طرف بھی توجہ دی۔ عبادت وریاضت میں بھی مشغول رہے۔ بعمر اڑتیس سال مکہ مکرمہ پہنچے اور محدثین مکہ سے صحیح بخاری ومسلم کی تدریس کا شرف حاصل کیا۔

مدینہ حاضری: حضرت شیخ عبدالحق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق صادق تھے۔ دیار حبیب میں ننگے پاؤں چلتے تھے اور بارگاہ رسالت میں حاضری دیتے تھے۔ مدینہ منورہ میں قیام کے دوران آپ 4 مرتبہ زیارت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مشرف ہوئے۔ تین سال حجاز مقدس میں قیام کے بعد آپ وطن واپس آئے۔ ہندوستان میں اس وقت اکبر اعظم نے دین الٰہی کا شوشہ چھوڑا ہوا تھا۔ آپ نے اس بدعت کی اصلاح کے لیے ایک دارالعلوم کی بنیاد رکھی۔ آپ نے بعمر 94 سال 1052ھ میں بعہد شاہجہاں وفات پائی۔

تصانیف: آپ کی تصانیف کی تعداد 60 بتائی جاتی ہے جن میں "مدارج النبوت" کو خصوصی اہمیت حاصل ہے جو سیرت کی ایک اہم کتاب ہے۔ آپ کی دیگر تصانیف میں اخبار الاخیار اور جذب القلوب الی دیار المحبوب، اشعۃ اللمعات اور آداب الصالحین اہم ہیں۔ دیکھیے محدثین کرام۔

علامہ محمد یوسف بن اسماعیل نبہانی (1265ھ/ 1849ء-130ھ/ 1931ء)

چودہویں صدی ہجری کی نادر روزگار ہستی جس نے قلمی میدان میں وہ عظیم تصانیف چھوڑیں جو آنکھوں کو نور عطا کرتی ہیں

نام ونسب: علامہ یوسف بن اسماعیل بن یوسف بن اسمٰعیل بن محمد ناصر الدین نبہانی، آپ کے والد ماجد ایک جید عالم دین تھے۔

ولادت وتعلیم: علامہ یوسف نبہانی 1265ھ/ 1849ء میں نبہان نامی فلسطین کے ایک قصبے میں پیدا ہوئے۔ اسی نسبت سے آپ نبہانی کہلائے۔ علامہ موصوف نے ناظرہ قرآن کریم اپنے والد ماجد سے پڑھا۔ 1283ھ میں جب آپ 17 برس کے تھے تو مزید تحصیل علم کے لیے مصر کی شہرہ آفاق درس گاہ جامع الازہر میں داخل ہو گئے۔ یہاں ساڑھے چھ برس کی

محنت شاقہ کے بعد آخر علوم عقلیہ ونقلیہ میں درجہ کمال تک پہنچے۔ رجب 1289ھ میں سند فراغت حاصل کی۔ آپ کے تمام اساتذہ بڑے لائق وفائق تھے، لیکن شیخ ابراہیم سقا شافعی نے جو ایک یگانہ روزگار عالم تھے آپ پر خصوصی توجہ فرمائی۔

منصۂ شہود پر: علامہ یوسف نبہانی ایک جید عالم دین اور یگانہ روزگار شخصیت کے طور پر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے۔ آپ ایک زبردست مقرر، اہل قلم اور بے بدل مصنف تھے۔ ان مذکورہ کمالات کے ساتھ ساتھ سچے عشق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی سرشار تھے۔ موصوف کی تمام تصانیف اس امر کا ایک زندہ ثبوت ہیں اور تمام تر عشق کے جذبے سے سرشار ہو کر لکھی گئی ہیں۔ علامہ نبہانی بیروت میں عہدہ قضاء پر بھی فائز رہے اور بیروت کی سرکاری لائبریری کے منتظم اعلیٰ بھی رہے۔ ان مصروفیات کے باوجود بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضری کی سعادت بھی حاصل کرتے رہتے تھے اور اپنے دل میں عشق محبوب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم کو بسائے رہتے تھے۔ فقیہ اعظم حضرت مولانا محمد شریف کوٹلوی اعلیٰ حضرت احمد رضا خان کے خلیفہ تھے ان کے والد نے انہیں ایک خط میں علامہ نبہانی کے متعلق لکھا تھا کہ مدینہ منورہ میں زیارت گنبد خضریٰ اور حاضری بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوران ایک باریش نورانی چہرے والے بزرگ نظر آئے جو قبر انور کی جانب منہ کر کے دو زانو بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے۔ تعارف پر معلوم ہوا کہ یہ بزرگ علامہ یوسف نبہانی تھے۔

حضرت علامہ یوسف نبہانی نے فاضل بریلوی کی تصنیف "الدولۃ المکیہ" پر زوردار تقریظ لکھی تھی اور اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے توسل سے بارگاہ ایزدی میں دعا کرتے ہیں کہ اس کتاب کے مصنف جیسے صاحب علم زیادہ سے زیادہ پیدا کرے جو آئمہ اعلام ہوں، اسلام کے حامی ہوں بقول اعلیٰ حضرت کے خلیفہ حضرت مولانا ضیاالدین مہاجر مدنی، حضرت علامہ یوسف نبہانی کی اہلیہ محترمہ کو چوراسی مرتبہ سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بحالت خواب کا شرف حاصل ہوا۔ علامہ موصوف جو شمع رسالت صلی اللہ علیہ وسلم پر پروانہ وار نثار تھے، ان کی حالت وکیفیت بیان کرنے سے الفاظ قاصر ہیں۔ علامہ کی وفات کے بارے میں مولانا مہاجر مدنی رقم طراز ہیں کہ "جواہر البحار" کی تصنیف کے کچھ عرصہ بعد علامہ موصوف کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے "جواہر البحار" کو بہت پسند فرمایا اور از راہ لطف وکرم علامہ کو سینے سے لگایا۔ علامہ بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں عرض گزار ہوئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم! اب جدائی کا صدمہ برداشت کرنے کی تاب نہیں رہی۔" آخر اسی حالت میں آپ کا وصال ہو گیا اور آپ کی درخواست بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں قبول ہوئی۔ آپ نے 1350ھ/ 1931ء میں وفات پائی۔

تصانیف: علامہ موصوف نے بے شمار کتب تصنیف فرمائیں جن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں۔ (1) الفتح الکبیر فی ضم الزیادہ، یہ چودہ ہزار احادیث کا ذخیرہ ہے۔ (2) قرۃ العینین علی منتخب الصحیحین، یہ تین ہزار احادیث صحیحہ کا مجموعہ ہے۔ (3) جواہر البحار فی فضائل نبی المختار صلی اللہ علیہ وسلم، چار ضخیم جلدوں میں فضائل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم الشان مجموعہ۔ (4) وسائل الاصول الی شمائل الرسول۔ (5) حجۃ اللہ علی العالمین فی معجزات سید المرسلین کے علاوہ بھی بہت سی اہم تصانیف ہیں جو آپ سے منسوب ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی (1274ھ/1858ء-1333ھ/1914ء)

ہندوستان کے مشہور صاحب طرز انشا پرداز، سوانح نگار، نقاد، عالم، متکلم اور سیرت نگار

نام ونسب: محمد شبلی، شبلی نعمانی بن شیخ حبیب اللہ، نعمانی انہوں نے امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت سے بوجہ

عقیدت اختیار کیا تھا۔ سلسلہ نسب ایک نومسلم راجپوت شیخ سراج الدین (سابق شوراج سنگھ) تک پہنچتا ہے۔ ان کے والد شیخ حبیب اللہ ایک متمول تاجر، خوشحال زمیندار اور وکیل تھے۔

ولادت وتعلیم: علامہ شبلی نعمانی کی ولادت 1858ء میں بندول ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی۔ وہیں ان کی تعلیم قدیم طرز پر ہوئی۔ اساتذہ میں سب سے زیادہ مولانا محمد فاروق چڑیا کوٹی (منطق اور معقولات کے استاد) اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری (ادب عربی کے استاد) سے متاثر تھے۔

عملی زندگی: علمی اور ادبی مشغلہ اختیار کرنے سے پہلے شبلی نے یکے بعد دیگرے نقل نویسی، قرق امینی، نیل سازی اور وکالت کی طرف توجہ کی مگر طبعی مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے ان کاموں میں دل نہیں لگا۔ تاآنکہ 1883ء علی گڑھ کالج میں عربی کے پروفیسر (اسٹنٹ) مقرر ہوئے اور سرسید احمد خاں کے رفقا میں شامل ہو گئے اور علمی مشاغل اختیار کر لیے جو ان کی طبع کے عین مطابق تھے۔

حالات ووفات: علامہ شبلی کی زندگی کے اہم واقعات کچھ یوں ہیں۔ 1883ء میں اعظم گڑھ میں ایک نیشنل اسکول کا قیام، ندوۃ العلما کی تحریک اور ترقی، حیدرآباد میں قیام (1901 تا 1905ء) اور سررشتہ علوم وفنون اور انجمن ترقی اردو کی نظامت (جنوری 1903ء)۔ دارالعلوم ندوۃ کی معتمدی (1905ء تا 1913ء) الندوہ یعنی ندوۃ العلما کے رسالے کی ادارت (1904ء تا 1912ء) تمغہ مجیدی کا حاصل ہونا۔ پاؤں کے زخمی ہونے کا حادثہ (17 مئی 1907ء) تعلیمی اور سیاسی کاموں کے علاوہ دارالمصنفین کی تجویز جس کے اکثر مراحل طے ہو چکے تھے کہ بتاریخ 18 نومبر 1914ء ان کا انتقال ہو گیا۔

تصانیف: علامہ شبلی کی بیشتر تصانیف علم کلام، تاریخ ادب اور تاریخ سے متعلق ہیں۔ سرسید احمد خان کے زیراثر انہوں نے ٹھوس علمی تصانیف کی طرف توجہ کی۔ وہ 1883ء سے 1898ء تک مدرسۃ العلوم کے استاد رہے۔ اس زمانے کی یادگار ایک مثنوی "صبح امید" اور المامون، مامون الرشید کی زندگی اور کارنامے ہیں۔ اس کتاب کی آمدنی کالج کے لیے وقف تھی۔ الجزیہ اور کتب خانہ اسکندریہ 1898ء میں شائع ہوئے۔ 892!ء میں شبلی نے شام، مصر اور ترکی کی سیاحت کی اور سفرنامہ شام وروم کے نام لکھا اور اپنے اس سفر کے مشاہدات قلمبند کیے۔ 1893ء میں انہوں نے سیرۃ النعمان کے نام سے حضرت امام ابوحنیفہ کی سیرت لکھی۔ اور الفاروق لکھ کر ایک اور علمی کارنامہ انجام دیا۔

علامہ شبلی کا زمانہ قیام حیدرآباد تصنیفی اعتبار سے امتیازی ہے۔ اسی دور میں انہوں نے علم کلام کی تشکیل جدید کی چنانچہ الغزالی 1902، علم الکلام 1903، الکلام 1904 اور سوانح مولانا روم اسی زمانے کی تصانیف ہیں۔ ان کے علاوہ ایک ادبی تنقیدی کتاب موازنہ انیس ودبیر بھی حیدرآباد ہی میں لکھی تھی۔

1904ء سے 1914ء کا زمانہ علامہ شبلی کی زندگی میں ذہنی پریشانیوں کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں انہیں بہت کم اطمینان نصیب ہوا تاہم یہ زمانہ بھی تصنیفی اعتبار سے کچھ کم نتیجہ خیز نہیں تھا اسی زمانے میں انہوں نے تاریخ شعرالعجم کے نام سے پانچ جلدوں میں لکھی۔

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ندوۃ العلما سے علیحدگی کے بعد انہوں نے 1913ء میں اپنی زندگی کی اہم ترین تصنیف "سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کی تالیف اور تدوین پر توجہ دی مگر ابھی پہلی جلد بھی نہیں مکمل کر پائے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی یہ تصنیف چھ جلدوں میں مکمل ہونا تھی۔ پہلی جلد کے علاوہ باقی سارا کام ان کے ترتیب دیئے ہوئے خاکے کے مطابق ان کے لائق شاگرد علامہ سلیمان ندوی نے مکمل کیا۔ اس کی تکمیل میں ان کا ہاتھ مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا حمیدالدین نے بٹایا۔

اردو نثر میں علامہ شبلی کو بلند مقام حاصل ہے۔ ان کی نثر میں دبستان سرسید کی نثر کی اکثر خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مگر ان کے نثری اسلوب کی اہمیت دراصل ان کے چند انفرادی خصائص کے سبب ہے۔ ان کی تحریروں میں بڑا اعتماد علی النفس اور وثوق یقین پایا جاتا تھا۔

سید سلیمان ندوی (1302ھ/1884ء-1373ھ/1953ء)

برصغیر پاک و ہند کے مشہور عالم، صاحب انشا پرداز، سیرت النبی اور ارض القرآن کے مؤلف

نام ونسب: سید سلیمان ندوی کا تعلق دیسنہ ضلع پٹنہ، صوبہ بہار کے زیدی سادات سے تھا۔ اس خاندان میں قابل قدر علما اور اطبا سو گزرے تھے۔

ولادت: ضلع پٹنہ میں 23 صفر 1302ھ/ 22 نومبر 1884ء کو پیدا ہوئے۔ گھر پر ابتدائی تعلیم پائی پھر کچھ دن پھلواری شریف اور دربھنگہ میں بھی تحصیل علم کے لیے رہے۔ مدرسہ امدادیہ دربھنگہ کی انجمن طلبہ میں ایک تحریر پڑھی تو اساتذہ نے خوب داد سے نوازا۔ یہ تحریر بعد ازاں پٹنہ کے مشہور ہفتہ وار اخبار الپنچ میں شائع ہوئی۔

1901ء میں دار العلوم ندوہ، لکھنو میں داخل ہوئے اور وہیں تعلیم کے ساتھ ساتھ ادبی اور علمی ذوق کی جلا پائی۔ شعر وسخن کی مشق بھی کی۔ اسی زمانے میں نواب محسن الملک ندوہ تشریف لائے تو انہوں نے ان کی مدح میں ایک عربی قصیدہ کہا جس سے نواب صاحب بڑے محظوظ ہوئے۔

1904ء میں مولانا شبلی ندوہ معتمد ہو کر لکھنو آئے تو سید سلیمان نے اپنی خوشی کا اظہار ایک فارسی قصیدے میں کیا۔ مولانا شبلی جوہر شناس تھے چنانچہ انہوں نے سید سلیمان کو اپنے دامن تربیت میں لے لیا۔ مولانا شبلی کے پاس مصر و شام کے عربی رسائل بکثرت آتے تھے۔ سید صاحب برابر ان کا مطالعہ کرتے رہے، جس سے جدید عربی کا ذوق پیدا ہو گیا اور جدید عربی کے اچھے ادیب بن گئے۔ 1906ء میں جلسہ دستار بندی میں ایک فصیح تقریر عربی زبان میں کی جس سے حاضرین محو حیرت رہ گئے۔ مولانا شبلی نے نہایت خوشی میں اپنی نشست سے اٹھ کر اپنا عمامہ اتار کر اپنے اس لائق شاگرد کے سر پر رکھ دیا۔

1908ء میں دار العلوم ندوہ میں سید سلیمان علم کلام اور جدید عربی زبان کے استاد مقرر ہوئے اور اسی درس و تدریس کے زمانے میں عربی زبان کی دو ریڈریں "دروس الادب" کے نام سے لکھیں۔ 1912ء میں عربی زبان کے جدید الفاظ کی ایک لغت "لغات جدیدہ" کے نام سے ترتیب دی۔ جواب بھی اسی طرح کارآمد ہے۔ 1912ء میں مولانا ابوالکلام کی دعوت پر ان کے جریدے الہلال کی ادارت میں شامل ہو گئے۔ اگست 1913ء میں کانپور میں مسجد کے انہدام کا واقعہ پیش آیا جس میں نہتے مسلمانوں پر بڑی بے دردی سے گولیاں چلائی گئیں۔ اس خونی سانحے پر سید سلیمان نے الہلال میں "مشہد اکبر" کے عنوان سے ایک درد انگیز مضمون لکھا۔ جو قومی حمیت میں ڈوب کر لکھا گیا تھا اس لیے انگریز حکومت نے اس مضمون کو ضبط کر لیا۔ 1913ء میں بمبئی یونیورسٹی کے ماتحت دکن کالج پونا میں السنہ الشرقیہ کی پروفیسری قبول کی۔ اسی دوران اپنی مشہور تصنیف ارض قرآن پر کام شروع کیا۔ اس میں ارض قرآن کا جغرافیہ، اقوام عرب کے سیاسی، تاریخی، نسبی اور تمدنی حالات پر بحث کی گئی ہے اور قرآن مجید سے مطابقت دکھائی گئی۔

1914ء میں مولانا شبلی کا انتقال ہونے کے بعد ان کی وصیت کے مطابق پونا کو چھوڑا اور اعظم گڑھ چلے آئے۔ جہاں دار المصنفین کی بنیاد رکھی۔ گویا بغداد کے دار الحکمت کا تخیل اعظم گڑھ میں عملی طور پر نمودار ہو گیا۔ اس ادارے کے علمی کاموں سے ابھی تک علمی دنیا روشن ہے۔ اس دوران دار الندوۃ کے معتمد تعلیمات مقرر ہوئے اور یہ خدمت 1950ء تک

انجام دیتے رہے۔ 1918ء میں اپنے استاد کی سیرۃ النبی کی جلد اول کو مکمل کر کے شائع کیا اسی سال ارض قرآن کی دوسری جلد بھی شائع ہوگی۔

1919ء میں خلافت تحریک کے چلنے پر اس میں شرکت کی اور 1920ء میں خلافت تحریک کا جو وفد یورپ گیا اس میں شمولیت اختیار کی۔ یورپ کے سفر پر جانے سے پہلے اپنے استاد مرحوم کی سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری جلد شائع کی۔ اس کتاب کی تیسری جلد 1924ء میں شائع ہوئی، اس جلد میں معجزے کی حقیقت پر مبسوط تبصرہ کیا گیا ہے۔ 1950ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ پاکستان میں ان کا بڑی خوشدلی سے خیر مقدم کیا گیا۔ جمعیۃ علمائے اسلام کے صدر اور دیگر کئی اعزازی عہدوں پر مامور کیے گئے۔ 1932ء میں سیرت النبی کی چوتھی، 1935ء میں پانچویں اور 1939ء میں چھٹی جلد شائع کی۔ 22 نومبر 1953ء کو وفات پائی۔

قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری (1867ء-1930ء)

ہندوستان کے ممتاز عالم دین، رحمۃ للعالمین اور متعدد کتابوں کے مصنف

نام ونسب: قاضی محمد سلیمان سلمان منصور ابن قاضی احمد شاہ۔ اردو زبان میں سیرت پاک پر مشہور ومقبول کتاب ''رحمۃ للعالمین'' کے مصنف ہیں۔ ان کے والد قاضی احمد شاہ ریاست پٹیالہ میں نائب تحصیلدار تھے۔

ولادت وتعلیم: قاضی محمد سلیمان 1867ء میں منصور پور، ریاست پٹیالہ، بھارت میں پیدا ہوئے، انہوں نے قرآن مجید کے علاوہ عربی کی بعض کتابیں اپنے والد سے پڑھیں۔ بعد ازاں انہوں نے 5-1884ء میں منشی فاضل کا امتحان، مہندرا کالج پٹیالہ سے پاس کیا اور پنجاب یونیورسٹی میں اول پوزیشن حاصل کی۔ اس کے بعد وہ ریاست پٹیالہ کے مختلف محکموں تعلیم، مال اور دیوانی میں کام کرتے رہے تا آنکہ سیشن جج کے عہدے سے پنشن یاب ہوئے۔ انہوں نے مسلمانوں کی تعلیمی زبوں حالی دور کرنے کے لیے ایک مسلم ہائی اسکول کی بنیاد رکھی۔

وفات: قاضی محمد سلیمان سلمان نے 30-29 مئی 1930ء کو بحری جہاز پر وفات پائی وہ دوسری مرتبہ فریضہ حج ادا کر کے واپس وطن لوٹ رہے تھے۔ بقول سلیمان ندوی مرنے کے بعد بھی ان کے قلم کا خیر جاری ہے۔

علمی مقام: قاضی محمد سلیمان بلند پایہ محقق وعالم تھے۔ کتب سماوی بالخصوص انجیل مقدس پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ مسلمانوں کی دینی ودنیاوی بھلائی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ وہ مرنجان مرنج اور صلح جو مزاج کے مالک تھے اس لیے ہر طبقے اور ہر جماعت میں یکساں مقبول تھے حتیٰ کہ وہ مسلک اہل حدیث تھے مگر اہل سنت والجماعت بھی ان کا مکمل احترام کرتے تھے۔

تصانیف: قاضی محمد سلیمان نے سیرت پاک اور دفاع اسلام میں بہت سی کتب تصنیف کیں۔ ان کی تصانیف کا اسلوب بیان، سلیس، سادہ، اثر انگیز اور دلآویز ہے۔ ان کی سب سے اہم کتاب رحمۃ للعالمین ہے جو برصغیر میں ممتاز ومقبول ہوئی۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ دیگر کتب میں تاریخ المشاہیر، سبیل الرشاد، سفر نامہ حجاز، غایت المرام اور بدالبدور المعروف بہ اصحاب بدر ہے۔

محمد حسین ہیکل (1888ء-1956ء)

ولادت وتعلیم: محمد حسین ہیکل مصر کے قریہ کفر غنام، مدینہ المصورہ میں 20 اگست 1888ء کو پیدا ہوئے۔ انہوں نے

بی۔اے کی ڈگری قانون میں 1909ء کو لی اور پیرس کی ساربون یونیورسٹی سے 1912ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پیرس میں زمانہ طالب علمی کے دوران انہوں نے مصر کا پہلا عربی ناول زینب لکھا۔ مصر واپس آنے پر 10 سال وکیل کے طور پر کام کرتے رہے۔ اس کے بعد میدان صحافت میں قدم رکھا اور اخبار السیاسہ کے ایڈیٹر ان چیف منتخب ہو گئے۔ 1937ء میں وہ محمود پاشا کی حکومت میں وزیر داخلہ مقرر ہوئے۔ اس کے بعد وزیر تعلیم کے طور پر کام کرتے رہے اور انہوں نے کئی ایک تعلیمی اصلاحات متعارف کرائیں۔ وہ سینئر صحافی محمد عبدہ سے بہت متاثر تھے۔

تصنیفات: 1914ء میں انہوں نے پہلا مصری ناول "زینب" لکھا۔

1929ء میں انہوں نے اہم مصری شخصیات کی سوانح عمریاں لکھیں۔

1933ء میں "حیات محمد" اپنی مشہور زمانہ سیرت کی کتاب مکمل کی۔

1944ء میں "سیدنا الفاروق عمر" لکھی۔

1951ء میں مصری سیاسی یادداشتیں مرتب کی۔

1964ء میں THE ISLAMIC EMPIRE AND SACRED PLACES شائع ہوئی۔

محمد حسین ہیکل نے 8 دسمبر کو وفات پائی۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ (1326ھ/1908ء-1423ھ/2002ء)

نام ونسب: ڈاکٹر حمید اللہ

پیدائش وتعلیم: ڈاکٹر محمد حمید اللہ 16 محرم الحرام 1326ھ/19 فروری 1908ء کو حیدر آباد دکن، بھارت میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وتربیت کے مختلف مراحل طے کرنے کے بعد جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے شعبہ دینیات میں داخلہ لیا اور ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ روانہ ہو گئے۔ 1932ء میں بون یونیورسٹی جرمنی سے اسلام کے بین الاقوامی قوانین پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈی فل کی ڈگری صرف دس ماہ کے قلیل عرصے میں حاصل کی۔ 1933ء میں سوربون یونیورسٹی پیرس سے عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافت راشدہ میں سفارت کاری کے عنوان پر تحقیقی مقالہ سپرد قلم کرنے کے بعد ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ وطن واپسی پر ڈاکٹر صاحب نے کچھ عرصہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں معلمی (پروفیسری) کے فرائض ادا کیے۔ یورپ جانے پر جرمنی اور فرانس کی یونیورسٹیوں میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ فرانس نیشنل سنٹر آف سائنٹفک ریسرچ سے اگلے بیس سال تک وابستگی رہی۔ یورپ اور ایشیا کی کئی اہم یونیورسٹیوں میں ڈاکٹر صاحب نے لیکچر دیے۔ ڈاکٹر صاحب مشرقی زبانوں میں عربی، فارسی، ترکی اور اردو پر عبور رکھتے تھے۔ جبکہ مغربی زبانوں میں آپ کو انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور اطالوی زبان پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ آپ نے اہل یورپ کو اسلام کی تعلیمات سے آشنا کرنے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کی صحیح تصویر پیش کرنے کے لیے یورپی زبانوں میں متعدد کتابیں تصنیف کیں اور سینکڑوں مقالات لکھے۔ فرانسیسی زبان میں آپ نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا اور اسی زبان میں دو جلدوں پر مشتمل سیرت پاک ترتیب دی جس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اسی طرح انگریزی میں آپ کی سیرت پر کتاب "محمد الرسول اللہ" بھی بہت مقبول ہوئی۔

1948ء میں ڈاکٹر حمید اللہ دولت آصفیہ حیدر آباد دکن کے نمائندے کی حیثیت سے اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل سے شرکت کے لیے نیویارک میں تھے کہ سقوط حیدر آباد کا واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد وہ واپس بھارت نہیں گئے بلکہ پیرس میں

مستقل قیام کیا اور وہیں تحقیق علمی میں مصروف رہے۔

وفات: ڈاکٹر محمد حمید اللہ اشاعت علم نافع میں مصروف تھے کہ 17 دسمبر 2002ء کو امریکی ریاست فلوریڈا کے شہر جیکسن وائل میں بحالت نیند وفات پائی۔ آپ نماز فجر کی ادائیگی کے بعد سوئے ہی تھے کہ پیغام اجل آگیا۔ آپ کی عمر 95 برس تھی۔ 18 دسمبر کو بعداز دوپہر چیپل ہل CHAPAL HILL نامی گرجے کے ملحقہ قبرستان میں مدفون ہوئے۔

تصنیفات: تذکرہ نگاروں نے ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تصنیفات کی تعداد 175 سے زائد بتائی ہے، جن میں کچھ کتابیں آپ نے اردو زبان میں بھی تحریر کی تھیں۔ آپ کی چند اردو کتابوں کے نام یہ ہیں۔

(1) عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے میدان جنگ
(2) عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نظام حکمرانی
(3) عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا نظام تعلیم
(4) امام ابوحنیفہ کی تدوین اسلامی قانون
(5) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی
(6) قانون بین الممالک کے اصول اور نظیریں
(7) خطبات بہاولپور
(8) ترجمہ مقالات گارساوتاسی

آپ کی جن تصنیفات کے عربی اور یورپی زبانوں سے اردو میں تراجم کیے گئے ان کے چند نام یہ ہیں۔

(1) سیاسی وثیقہ جات (الوثائق سیاسیہ للعہد نبوی کا اردو ترجمہ)
(2) محمد رسول اللہ (انگریزی زبان سے نذیر حق صاحب کا کیا ہوا اردو ترجمہ)
(3) سیرۃ ابن اسحٰق (اردو ترجمہ از نور الٰہی ایڈوکیٹ)

مولانا نعیم صدیقی (1916ء-2002ء)

جماعت اسلامی کے بانی رکن اور ایک پاکستانی عالم، "محسن انسانیت" کے مصنف

نام ونسب: اصلی نام فضل الرحمٰن، قلمی نام نعیم صدیقی تھا۔

پیدائش وتعلیم: 4 جون 1916ء کو چکوال میں پیدا ہوئے اور 25 ستمبر 2002ء کو وفات پائی۔ تعلیم کے بعد 1941ء میں جماعت اسلامی سے وابستگی اختیار کی، متعدد اخبارات اور رسائل کے مدیر رہے۔ جن میں ماہنامہ سیارہ اور ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور اہم ہیں۔

1953ء اور 1964ء میں قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔

تصانیف: کثیر التعداد مصنف تھے۔ ان کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ شعری مجموعوں میں شعلہ خیال (1954ء) خون آہنگ (1966ء) اور "پھر ایک کاروان لٹا" (1967ء) اہم ہیں۔ ادبی نگارشات میں ذہنی زلزلے (افسانے اور خاکے) 1945ء ٹھنڈی آگ (افسانے) 1957ء دفتر بے معنی (طنز ومزاح) 1955ء۔ سیرت وسوانح میں "محسن انسانیت" بے مثال کتاب ہے۔ یہ 1960ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ "مولانا مودودی ایک تعارف" 1963ء، تاریخ، سیاسیات میں "معرکہ دین وسیاست" عباسی دور میں (1962ء) امریکہ کا صدارتی نظام (1961ء) اسلامی

تحریک دوسری تحریکوں مقابل (1958ء) اسلامی اصول انتخاب۔ اسلامی معاشیات اور سوشلزم میں معاشی ناہمواریوں کا اسلامی حل (1951) معروف و منکر (1955ء) رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور نعت رسول (1960ء) اقبال اور نظریہ پاکستان (1963) اقبال مغربی مادیت اور پاکستان (1969ء) اہم ہیں۔ان کے علاوہ چند نظموں کا انگریزی ترجمہ بھی کیا جن کا تعلق کشمیر اور یروشلم سے ہے۔دی وونڈ اسپیک، ''وہ سورج بن کر ابھرے گا'' وغیرہ۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری

نام ونسب: صفی الرحمٰن بن عبداللہ بن محمد اکبر بن عبدالمومن بن فقیر اللہ مبارک پوری اعظمی۔

پیدائش وتعلیم: 16 جون 1943ء کو موضع حسین آباد، مبارکپور ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔بچپن میں قرآن مجید کا کچھ حصہ اپنے دادا اور چچا سے پڑھا۔1948ء میں مدرسہ دار التعلیم مبارکپور میں داخل ہوئے۔وہاں چھ سال میں پرائمری درجات اور مڈل کورس کی تعلیم مکمل کی۔جون 1954ء میں مدرسہ احیا العلوم مبارکپور میں داخل ہوئے اور وہاں عربی زبان و قواعد نحو وصرف اور بعض دوسرے اسلامی فنون کی تعلیم حاصل کی۔دو سال بعد مدرسہ فیض عام مئو میں داخل ہو کر پانچ سال تعلیم حاصل کی اور تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ اور اصول فقہ پر دسترس پائی۔جنوری 1961ء میں سند فراغت اور تدریس وافتا کی اجازت مل گئی۔اسی دوران الٰہ آباد بورڈ کے امتحانات مولوی اور عالم بھی دیئے اور ناگ پور میں درس وتدریس اور تقریر و خطابت کا شغل اختیار کیا۔مارچ 1963ء میں مدرسہ فیض عام کے ناظم اعلیٰ نے مجھے تدریس کی دعوت دی مگر دو سال بعد وہاں سے علیحدگی ہوگئی۔مدرسہ دار الحدیث مئو میں نائب صدر مدرس تعلیمی امور پر بھی فائز رہے۔پھر ان کو مدرسہ فیض عام سیونی، مدھیہ پردیش میں صدر مدرس کے طور پر تقرری مل گئی۔سیونی میں چار سال درس وتدریس کی خدمات انجام دیں۔1972ء میں دار التعلیم مبارک پور میں تعلیمی انتظامات اور تدریس کے فرائض سنبھال لیے۔پھر اکتوبر 1974ء میں جامعہ سلفیہ میں تقرر ہوگیا۔

تالیفات: (1) المصابیح فی مسالۃ التراویح للسیوطی کا اردو ترجمہ (2) صحف یہود ونصاریٰ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بشارتیں (3) تذکرہ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب اور ''الرحیق المختوم'' رابطہ عالم اسلامی کے مقابلہ سیرت نویسی 1396ء میں تصنیف کی۔آپ کی اس تصنیف نے اس مقابلہ میں اول انعام حاصل کیا۔

سید قاسم محمود (1928ء-2010ء)

پاکستان کے مشہور انسائیکلوپیڈیسٹ، افسانہ نگار، مترجم اور سوانح نگار

نام ونسب: سید قاسم محمود

پیدائش وحالات: 17 نومبر 1928ء کو کھرکھودہ ضلع روہتک میں پیدا ہوئے۔ پرائمری و مڈل کے امتحانات پنجاب بھر میں اول پوزیشن سے پاس کیے۔1946ء میں ہمدرد دواخانہ دہلی میں ملازمت کر لی۔پھر 1947ء میں انبالہ ڈویژن سے میٹرک کا امتحان اول پوزیشن میں پاس کیا۔1948ء میں ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور تلاش معاش میں محکمہ بجلی کے لائن مینوں نے سیڑھی برادر سے لے کر چپراسی گیری تک کی۔1950ء میں پنجاب یونیورسٹی میں بطور کلرک ملازم ہوگئے اور شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے دفتر میں علامہ محمد شفیع کے ساتھ رہے۔1951ء میں حکومت پنجاب کی مجلس دفتری زباں میں بطور مترجم ملازمت کر لی۔1956ء میں افسانہ نگاری اور تصنیف وتالیف کا آغاز کیا تاہم مختلف جز وقتی

نوکریاں بھی کرتے رہے۔ 1957ء میں نائب مدیر ہفت روزہ "لیل ونہار" مقرر ہوئے اور فیض صاحب اور سید سبط حسن کے ساتھ کام کرنے کا موقع میسر آیا۔ 1964ء میں مدیر اعلیٰ ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ بنے اور قرآن نمبر اور رسول نمبر ان کی سربراہی میں مرتب ہوئے۔

1963ء میں مدیر ماہنامہ "ادب لطیف" مقرر ہوئے اور اردو انسائیکلو پیڈیا (فیروز سنز) کے مدیر بنے۔ 1969ء تا 1972ء مینار پاکستان کمیٹی کے رکن بنے اور خدمات انجام دیں۔ 1970ء میں اردو زبان کا سب سے بڑا انسائیکلو پیڈیا "معلومات" قسط وار جاری کیا۔ 1971ء تا 1975ء دوبارہ سیارہ ڈائجسٹ کے ایڈیٹر رہے۔ 1975ء میں مکتبہ شاہکار لاہور قائم کیا اور شاہکار جریدی کتب کا اجراء کیا۔ 1976ء میں حکومت پنجاب کی مجلس دفتری زباں کی طرف سے دفتر اصطلاحات کی لغت مرتب کی۔ 1979ء میں پندرہ روزہ "قافلہ" جاری کیا اور مارشل لاء کے زیر عتاب آ گئے جس کی بنا پر کراچی ہجرت کرنا پڑی۔ کراچی میں اسلامی انسائیکلو پیڈیا کو ایک جلد میں شائع کیا اور دیگر علمی کام بھی شائع کیے۔ 1997ء میں انسائیکلو پیڈیا پاکستان شائع کیا اور 2004ء تا 2010ء سیرۃ النبی کا انسائیکلو پیڈیا مرتب کیا جو ایک بڑا کام ہے۔ ان کی یہ آخری تصنیف ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی ہے۔

حفاظ کرام

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ دیکھیے صحابہ کرام

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ (م 21ھ/642ء)

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ (م 34ھ/655ء)

حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ (م 23ھ/644ء)

قتادہ بن دعامۃ السدوسی (م 117ھ/736ء)

العبادی (م 375ھ/985ء-458ھ/1066ء)

حافظ جلال الدین السیوطی دیکھیے مفسرین کرام

مولانا رحمت اللہ کیرانوی (1233ھ/1818ء-1308ھ/1890ء)

سید قطب شہید (1906ء-1966ء)

شیخ عبدالرحمٰن السدیس

حضرت معاذ بن جبل رجی اللہ عنہ (م 18ھ/639ء)

سالم مولائے ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ (م 12ھ/632ء)

حضرت تمیم بن اوس داری رضی اللہ عنہ

حافظ ابوالشعثا الازدی العمانی (21ھ/642ء-103ھ/721ء)

عباد بن سلیمان الصیمری (م 250ھ/864ء)

میر سید علی ہمدانی (714ھ/1314ء-786ھ/1381ء)

خواجہ حافظ جمال ملتانی (م 1220ھ/1776ء)

عبدالعلیم صدیقی (1893ء-1954ء)

شیخ ڈاکٹر یوسف القرضاوی

سعود الشریم

حضرت معاذ بن جبل رجی اللہ عنہ (م 18ھ/639ء)

ایک ممتاز صحابی، حافظ القرآن میں سے ایک اور عامل یمن

نام ونسب: حضرت معاذ بن جبل بن عمرو بن اوس الانصاری الخزرجی۔ کنیت ابوعبدالرحمٰن؛ ایک جلیل القدر صحابی اور مدینہ منورہ کے رہائشی تھے۔ عالم شباب میں مسلمان ہوئے۔ 72 اہل مدینہ کے ساتھ مکہ المکرمہ میں آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت عقبہ میں شرکت کا اعزاز حاصل کیا۔

بعد از ہجرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور حضرت معاذ بن جبل میں رشتہ مواخاۃ قائم فرمایا۔ بیس برس کی عمر میں غزوہ بدر میں شرکت کی اور اصحاب بدر میں سے ایک ٹھہرے۔ اس کے بعد کے غزوات میں بھی حصہ لیا۔ قرآن مجید کے مستند قاری اور حافظ تھے۔ ان صحابہ کرام میں سے ایک تھے جنہیں قرآن مجید زبانی یاد تھا۔ عہد صحابہ کے جید عالموں میں سے ایک تھے۔ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بعض دیگر صحابہ کے ساتھ انہیں قرآن مجید جمع

کرنے کا شوق حاصل ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چار اصحاب یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ سے قرآن سیکھو۔"

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا شمار عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مفتیوں میں ہوتا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے بعد غزوہ حنین کے لیے روانہ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو مکہ مکرمہ میں اپنے پیچھے چھوڑ گئے تاکہ وہ اہل مکہ کو دین اسلام اور قرآن مجید کی تعلیم دیں۔ بعدازاں وہ یمن کے علاقہ الجند میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مبلغ بنا کر بھیجے گئے۔ ان کی تبلیغی مساعی کے نتیجے میں یمن کے سردار اور سربرآوردہ شخصیات نے اسلام قبول کیا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو عامل یمن بنا کر بھیجا تو نصیحت فرمائی کہ لوگوں کے لیے آسانی مہیا کرنا، مشکلات پیدا نہ کرنا۔ انہیں خوشی اور مسرت کا پیغام دینا اور کوئی ایسی بات نہ کرنا جس سے انہیں دین سے نفرت ہو جائے۔ نیز معاملات قضا میں کتاب وسنت کی اطاعت کے ساتھ ساتھ نئے مسائل کے حل کے لیے اجتہاد کی اجازت بھی عطا فرمائی۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت یمن میں تھے، مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مدینہ منورہ واپس آ گئے۔ وہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشیران خاص میں شامل تھے۔ جناب امیر المومنین، ان کے علم وفضل اور فقاہت کی وجہ سے ان کے مشوروں کو بڑی اہمیت دیتے اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایک مرتبہ امیر المومنین نے یہاں تک فرمایا کہ اگر معاذ رضی اللہ عنہ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مقام جابیہ پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ جسے بھی دینی اور فقہی مسائل سیکھنے ہوں وہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر سیکھے۔

فتوحات شام کی مہمات میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ ان کی وفات کے بعد آپ نے لشکر کی قیادت بھی سنبھالی تھی، لیکن باختلاف روایت صرف 38 برس کی عمر میں 18ھ میں اردن کے نواح میں پھیلنے والی وبا، طاعون عمواس کے دوران وفات پائی اور قصیر المعینی میں دفن ہوئے۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بڑے خوش اخلاق، کریم النفس، خوش بیان خوبرو اور شیریں کلام تھے۔ ان سے 157 احادیث مروی ہیں۔ ان کی فضیلت بیان کرنے کے لیے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف یہ ارشاد ہی کافی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "معاذ امام العلماء یوم القیامۃ برتبا۔

ترجمہ: "معاذ کو قیامت کے دن علمائے کرام کی پیشوائی حاصل ہوگی اور ایک بڑا درجہ ان کو ملے گا۔"

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ (م 21ھ/642ء)

ان چار عظیم صحابہ کرام میں سے ایک شخصیت جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن سیکھنے کا حکم دیا تھا نام ونسب: ابی بن کعب قیس بن عبید، ان کا تعلق خزرج کی شاخ بنونجار سے تھا۔ بڑے عالم اور قرات کے استاد تھے۔ اسلام سے پہلے یہود کے بڑے بڑے علما میں شامل تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ ان چھ صحابہ کرام میں سے ایک تھے جنہوں نے زمانہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں قرآن حفظ کیا تھا۔ فقہا صحابہ میں بھی شامل تھے اور عہد نبوی میں انہیں فتاویٰ جاری کرنے کی اجازت تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ابوالمنذر کی کنیت عطا کی تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوالطفیل۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سیدالانصار کا خطاب بھی دیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا تھا

کہ "اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں قرآن سناؤں۔"

غزوہ بدر، احد اور خندق وغیرہ میں شریک رہے۔ کتب حدیث میں ان سے 164 احادیث مروی ہیں۔ یہ نحیف قد وقامت کے بشر تھے۔ ان کی ریش مبارک اور سر کے بال سفید تھے۔ 21 ہجری میں وفات پائی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ترتیب وتدفین قرآن میں شامل تھے۔

سالم مولائے ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ (م 12ھ/632ء)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چار صحابہ سے قرآن سیکھنے کا حکم دیا ان میں سے چوتھے۔

نام ونسب وحیثیت: ابن سعد نے لکھا ہے کہ سالم ابن معقل اصطخر شبیۃ بنت یعار انصاریہ کے مولی (آزاد کردہ غلام) تھے۔ سالم کو شبیۃ بنت یعار نے آزاد کر دیا تھا۔ اس لیے بنی عبید کے انصار میں ان کا ذکر ہوتا ہے۔ ابو حذیفہ کے ساتھ موالات کی بجہ سے وہ مہاجرین میں بھی شمار ہوتے ہیں۔ موالات یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کے ہاتھ پر ایمان لائے یا ایمان لانے کے بعد اس سے اپنا تعلق وابستہ کرلے اور اسے اپنا وارث بنالے۔

سالم رضی اللہ عنہ ابن معقل نے حضرت ابو حذیفہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا اور انہیں سے وابستگی رکھی تھی۔ ابو حذیفہ نے اسے اپنا متبنیٰ بنالیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ سالم بن ابی حذیفہ کہلاتے تھے۔ جب متبنیٰ کے بارے میں آیت ادعوھم لآبائھم نازل ہوئی تو حضرت ابو حذیفہ کی بیوی سہلہ بنت سہیل بن عمر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ سالم تو ہمارے پاس بیٹے کی طرح تھے اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ انہیں ان کے والد کے نام سے نہ پکاریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم اسے پانچ مرتبہ اپنا دودھ پلا دو تو وہ تمہارے پاس بغیر پردہ کے آسکیں گے، انہوں نے ایسا ہی کیا حالانکہ وہ عمر میں اس وقت بڑے تھے۔

ابو حذیفہ نے اپنی ایک بھتیجی فاطمہ بنت الولید سے ان کا نکاح کرا دیا۔ جب وہ جنگ یمامہ میں شہید ہوئے تو حضرت ابو بکر نے ان کی میراث ان کی مولاۃ (انصاریہ) کے پاس بھجوائی، اس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھجوائی تو تب بھی انہوں نے انکار کر دیا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مال کو بیت المال میں داخل کرا دیا۔

ابو کعب القرظی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ آنے سے پہلے سالم مولائے ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ قبا میں مہاجرین کی امامت کرتے تھے۔ ان میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی شامل ہوتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ سالم مولائے ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ مکہ سے مہاجرین کی امامت کرتے ہوئے مدینہ ائے تھے اس لیے کہ وہ سب سے زیادہ قرآن جانتے تھے اور اولین حفاظ قرآن میں شامل تھے۔

جنگ یمامہ میں جب مسلمانوں کو شکست ہوئی تو سالم مولائے ابی حذیفہ کے پاس مہاجرین کا علم تھا۔ انہوں نے اپنے لیے خود قبر کھودی اور اس شدت سے جنگ کی کہ اللہ کی راہ میں شہید ہوگئے۔ یہ واقعہ 12ھ خلافت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پہلے سال میں پیش آیا۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ (م 34ھ/655ء)

مدینہ منورہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مقرر کردہ 12 نقباء میں سے ایک

نام ونسب: عبادہ بن صامت، کنیت ابو الولید تھی، انصاری تھے، نہایت متقی اور پرہیز گار صحابی تھے۔ انصار کے اس

اولین گروہ میں شامل تھے جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست حق پرست پر بیعت عقبہ کی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے پہلے مدینہ منورہ میں خاندان نوافل کا نقیب مقرر کیا۔ ہجرت کے بعد غزوات میں بھرپور شرکت کی۔ قرآن مجید کے حفاظ اور معلمین میں سے ایک تھے۔ شام کی فتح کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور ابوالدرداء کو وہاں بھیجا تاکہ وہاں کے لوگوں کو قرآن مجید اور دین کی تعلیم دیں۔ چنانچہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے حمص میں قیام کیا۔ ابوالدرداء نے دمشق میں اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فلسطین میں قیام کیا اور لوگوں کو قرآن سکھایا، بعدازاں حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ بھی فلسطین منتقل ہو گئے۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے فتح مصر کے لیے جب بارگاہ خلافت سے کمک طلب کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کو ایک ہزار فوجیوں کا افسر بنا کر مصر بھیجا۔ مصر پہنچنے پر حضرت عمرو بن العاص نے حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کا نیزہ لے کر اپنا عمامہ اس پر لگا کر علم بنا کر حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کو واپس کر دیا اور کہا کہ آج سے سپہ سالار فوج آپ ہیں، چنانچہ پہلے ہی حملہ میں مصر فتح ہو گیا۔

اپنے علم و فضل کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں فلسطین کے قاضی بھی مقرر کیے گئے تھے۔ جب حضرت ابوعبیدہ گورنر شام بنائے گئے تو انہوں نے حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کو حمص میں اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے لاذقیہ کو فتح کیا اور اس محاذ پر ایک نئی جنگی چال سے کام لیا۔ آپ نے بڑے بڑے گڑھے کھدوائے اور اپنے سواران میں چھپا دیئے تھے۔ آپ صاحب علم صحابہ کرام میں سے تھے اور اصحاب صفہ کو درس دیا کرتے تھے۔

حضرت تمیم بن اوس داری رضی اللہ عنہ

ایک رکعت میں پورا قرآن ختم کرنے والے حافظ قرآن صحابی رسول رضی اللہ عنہم و صلی اللہ علیہ وسلم

نام و نسب: تمیم بن اوس بن داری۔ آپ کے کسی جد اعلیٰ کا نام دار تھا اسی نسبت سے داری کہلائے۔ کنیت ابورقیہ تھی۔ پہلے عیسائی تھے 9 ہجری میں ایمان لائے۔ آپ رات کے وقت صرف ایک رکعت میں قرآن مجید ختم کیا کرتے تھے۔ آپ نے پہلی بار مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں چراغاں کیا تھا۔ مدینہ منورہ میں مستقل قیام رہا، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد شام چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔

بڑے عابد و زاہد تھے۔ تہجد کی نماز میں ایک ہی آیت بار بار پڑھتے رہتے حتیٰ کہ سویرا ہو جاتا تھا۔ روایت ہے کہ ایک رات تمیم داری کی آنکھ نہ کھلی اور تہجد کی نماز قضا ہو گئی تو وہ اس کے کفارے میں سال بھر تک رات کو سوئے ہی نہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ادائیگی نماز کے دوران پہننے کے لیے ایک ہزار درہم کا ایک جوڑا خریدا تھا۔ آپ نے ہی سب سے پہلے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں چراغ جلایا تھا۔ آپ ہی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دجال اور جساسہ والی روایت مذکور ہے۔

حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ (م 23ھ/644ء)

عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے حفاظ قرآن میں سے ایک اور صاحب قرأت صحابی

نام و نسب: قتادہ بن نعمان ابن زید بن عامر بن سواد بن ظفر۔ ان کی والدہ انیسہ بنت قیس بن عمرو ابن عبید۔ خزرج کی شاخ بنو نجار سے تعلق تھا۔ کنیت ابوعمر تھی۔

بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر اسلام قبول کیا۔ قتادہ رضی اللہ عنہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تیر اندازوں میں

بیان کیے گئے ہیں۔ وہ غزوہ بدر و احد میں شامل تھے۔ جنگ احد کے موقع پر ان کی آنکھ میں دشمن کا ایک تیر آلگا جس سے آنکھ کا ڈھیلا نکل کر رخسار پر آ گیا۔ حضرت قتادہ بن نعمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس ایک عورت ہے جسے میں چاہتا ہوں اگر وہ میری آنکھ کا یہ حال دیکھے گی تو مجھ سے نفرت کرے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ڈھیلے کو اپنے دست مبارک سے اس کے مقام پر لوٹا دیا۔ آنکھ پہلے جیسے ہوگئی اور بینائی بھی واپس لوٹ آئی اور قوت بصارت پہلے سے بہتر ہوگئی۔ اس کے بعد وہ تمام غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب رہے۔ غزوہ فتح میں بنی ظفر کا جھنڈا انہیں کے پاس تھا۔

طبقات ابن سعد میں ہے کہ قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ نے 23ھ میں انتقال کیا۔ ان کی نماز جنازہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔ قرآن مجید کے حافظ تھے اور قرأت میں ایک مقام رکھتے تھے۔

حافظ ابوالشعثا الازدی العمانی (21ھ/642ء-103ھ/721ء)

اباضی (خوارج) فرقے کا مشہور حافظ، محدث اور فقیہ

نام ونسب: جابر بن زید، ابوالشعثاء الازدی العمانی۔ اباضی (خوارج) فرقے کا مشہور محدث، حافظ اور فقیہ۔ وہ 21ھ/642ء میں نزوئی، عمان میں پیدا ہوا اور ایک روایت کی رو سے عبداللہ بن اباض کی وفات پر بصرے کی اباضی جماعت کا سربراہ تسلیم کیا۔ اس نے اپنے پیشرو کی امویوں سے دوستانہ مراسم قائم رکھنے کی روش کو برقرار رکھا۔ اس کے تعلقات اموی گورنر عراق الحجاج سے بھی بہت اچھے تھے، جس نے ازارقہ کو دبانے کے لیے انتہائی جبر وعفوہت سے کام لیا تھا، یہاں تک کہ الحجاج کے توسط سے اسے بیت المال سے وظیفہ بھی ملتا تھا۔ البتہ پہلی صدی ہجری کے اختتام کے قریب اسے کئی ایک اباضی سرداروں کے ساتھ جزیرہ عرب کے جنوبی کونے میں جلاوطن کردیا گیا تھا۔ کیونکہ عامل بصرہ انہیں بعض سیاسی امور پر اختلاف تھا۔ اس کی تاریخ وفات سے بعض مورخ متفق نہیں اور بعض اس کی وفات 93ھ میں اور بعض 103ھ میں بتاتے ہیں۔

علم وفضل: بصرے میں اس کے علم وفضل کی دھوم تھی اور قرآنی علوم کے بارے میں اس کے اقوال کو مستند سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی عدم موجودگی میں اسی سے فتویٰ طلب کیا جاتا تھا۔ وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ذاتی دوست اور ان کے متبعین میں سب سے زیادہ مشہور تھا۔ اس نے اپنا ایک دیوان بھی مرتب کیا تھا اور روایات اور رسومات کا قدیم ترین مجموعہ بھی غالباً اسی کی تصنیف ہے۔

اصحاب الرائے نے اسے اکثر اصل المذھب یا عمدۃ الاباضیہ کے نام سے یاد کیا ہے۔ اباضی عقائد کی باقاعدہ تشکیل وتنظیم میں اس کا بڑا حصہ ہے۔ راسخ العقیدہ مسلمان بھی ایک محدث اور حافظ قرآن کی حیثیت سے اس کی اہمیت کے قائل ہیں۔

قتادہ بن دعامۃ السدوسی (م 117ھ/736ء)

بصرہ کے ایک صاحب کمال اور جامع العلوم حافظ نابینا تابعی بزرگ

نام ونسب: قتادہ بن دعامۃ السدوسی، کنیت ابوالخطاب البصری۔ بصارت سے محروم ہونے کے باوجود ایک بڑے صاحب کمال اور جامع العلوم بزرگ تھے۔ وہ جلیل القدر تابعی عالم، حافظ قرآن مفسر قرآن، محدث اور فقیہ تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ماہر الانساب واخبار واشعار تھے۔ عربیت اور لغت کے مستند امام تسلیم کیے جاتے تھے۔ لوگ روزانہ ان کے پاس

علمی، لغوی اور ادبی سوالات و مسائل پوچھنے کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ بھی انہیں ''احفظ اہل بصرہ'' کے نام سے یاد کرتے تھے اور ان کے حافظے کی داد دیتے تھے۔ بعض نے انہیں ''احفظ الناس'' بھی کہا ہے۔ قوت حافظہ کا یہ عالم تھا کہ جو سنتے، فوراً یاد ہو جاتا، چنانچہ صحیفہ جابر کو ایک ہی مرتبہ سن کر ازبر کر لیا تھا۔

اساتذہ و شیوخ: ان کے اساتذہ اور شیوخ میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ، حضرت ابو سعید خدری، سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ، حسن البصری اور محمد بن سیرین ایسے صحابہ کرام اور تابعین شامل تھے۔

علم و فضل: نابینا ہونے کے باوجود ان کا شوق تحصیل علم تیز سے تیز تر ہوتا رہا۔ مستزاد یہ کہ قوت حافظہ کے وفور نے ان کے علم و فضل کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ ان کے مشہور تلامذہ میں ایوب سختیانی، حماد بن مسلمہ، ہمام بن یحیٰی، الاوزاعی معمر جیسے جید عالم شامل تھے۔

امام ابن جریر الطبری اور دیگر مفسرین نے ان کے تفسیری نکات و اقوال اپنی تفسیروں میں محفوظ کر دیئے ہیں جو انہوں نے زیادہ تر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اخذ کیے تھے۔ بصرے میں ان کا فتویٰ بھی چلتا تھا، لیکن ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جو مسئلہ معلوم نہ ہوتا، صاف کہہ دیتے تھے کہ مجھے اس کا علم نہیں، اگر کوئی اصرار بھی کرتا تو فرماتے، میں نے چالیس برس میں اپنی رائے سے کسی مسئلے کا جواب نہیں دیا۔ ان کی وفات بعارضہ طاعون ستاون برس کی عمر میں واسط میں ہوئی تھی۔

عباد بن سلیمان الصیمری (م 250ھ/864ء)

بصرے کا ایک نامور حافظ و معتزلی عالم

نام و نسب: بصرے کا ایک معتزلی عالم اور حافظ القرآن۔ وہ ہشام بن عمرو الفوطی (جو نویں صدی عیسوی کے پہلے ربع میں تھا) کا ہم عصر اور شاگرد تھا اور اپنے باپ کی طرح بصری مکتب فکر (ابو الہذیل کے متبعین) کے عام رجحان پر تنقید کیا کرتا تھا اور اس کے جواب میں ابو الہذیل کے جانشین، الجبائی اور ابو ہاشم سے اپنی تنقید کا ہلف بناتے تھے۔ اس کے مخصوص نظریات کے متعلق ہماری معلومات الاشعری کے مقالات سے ماخوذ ہیں۔

وہ اللہ تعالیٰ اور انسان کے امتیاز پر زور دیتا ہے۔ لیکن تسلیم کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بھی ان معنوں میں ایک شے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ''غیر'' ہے۔ (محل مذکور ص 519) (بحوالہ اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ جلد 12) اسے اس بات پر اصرار تھا کہ اللہ ازلی ہے اور اسی بنا پر وہ عارضی دنیوی اشیا سے بے نیاز ہے۔ خدا ازل سے سمیع و بصیر نہیں کیونکہ اس صورت میں ایسی آوازوں اور چیزوں کا وجود بھی تسلیم کرنا پڑے گا جنہیں خدا ازل سے دیکھ اور سُن رہا تھا۔ وہ ''سب چیزوں سے پہلے'' نہیں ہے۔ کوئی حادثہ (مثلاً ایک مافوق الفطرت واقعہ) اپنی عارضی نوعیت کی وجہ سے وجود باری تعالیٰ کا ثبوت مہیا نہیں کر سکتا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے اس امتیاز کی داغ بیل ڈالی جسے بعد از اں راسخ العقیدہ علما کرام نے اپنا لیا۔

وہ اپنے معتزلی فلسفہ میں اس بات پر بہت مصر تھا کہ خدا کوئی ایسی بات نہیں کرتا جو کسی لحاظ سے بھی بری ہو بلکہ وہ اس کا بھی منکر تھا کہ خدا نے کفر کو برا (قبیح) بنایا ہے۔ اس عقیدہ تھا کہ جہنم میں بدکاروں کو جو عذاب خدا کی طرف سے ہوگا وہ بھی برا نہیں۔

العبادی (م 375ھ/985ء-458ھ/1066ء)

ایک مشہور شافعی فقیہ، حافظ اور ہرات کے قاضی اور دیگر کتابوں کا مصنف

نام و نسب: ابو عاصم محمد بن احمد بن محمد بن عبداللہ بن عباد۔ ان کو عموماً قاضی الہروی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ایک مشہور شافعی فقیہ۔ جو 375ھ/985ء میں ہرات میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ہرات اور نیشا پور سے تعلیم حاصل کی اور پھر وسیع پیمانے پر سیر سیاحت کی، جس کے دوران وہ متعدد علما عصر سے ملے۔ بالآخر وہ ہرات کے قاضی کے عہدے پر فائز ہوئے اور وہیں ان کا انتقال 458ھ/1066ء میں ہوا۔ وہ اپنے خلق اور ادق طرز بیان کی وجہ سے بدنام تھے۔ ان کی تصانیف میں سے جنہیں السبکی نے شمار کیا ہے، صرف یہ موجود ہیں۔

(1) طبقات الشافعین (2) ادب القضاء اس کی شرح ان کے شاگرد ابوسعد بن احمد بن ابی یوسف الھروی نے کی تھی۔ جس کا نام "الاشراف اعلیٰ غوامض الحکومۃ" تھا۔

میر سید علی ہمدانی (714ھ/1314ء-786ء1381ء)

سلسلہ کبرویہ سے تعلق رکھنے والے سید الاولیاء ایک ایرانی صوفی بزرگ جو کشمیر آ گئے تھے

نام ونسب: میر سید ہمدانی بن شہاب الدین بن محمد۔ ان کے والد ہمدان (ایران) کے حاکم اور امیر تھے۔

ولادت: میر سید علی ہمدانی 12 رجب 714ھ کو ہمدان میں پیدا ہوئے اور انہوں نے 786ھ میں ختلان میں وفات پائی۔ حافظ قرآن اور ماہر علوم ظاہر وباطنی تھے۔

ابتدائی تعلیم: انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے خالو سید علاؤالدین اور ایک بزرگ شرف الدین مزدقانی سے حاصل کی۔

داخلہ طریقت: آپ شیخ تقی الدین دوستی کے مرید تھے بعد میں شرف الدین محمود مزدقانی کے ہاتھ پر بیعت کی۔
جب آپ اپنے پیر ومرشد حضرت شرف الدین مزدقانی کے پاس آئے تو چونکہ آپ حاکم ہمدان کے بیٹے تھے تو مرشد نے کہا اگر آپ بحیثیت آقا آئے ہیں تو میں خدمت کے لیے تیار ہوں اور اگر آپ بحیثیت خادم آئے ہیں تو پھر اس خانقاہ کے خاکروب کی حیثیت وقف کر دیں۔ آپ کو مرشد نے دنیا کی سیاحت اور مختلف اولیائے کرام سے فیض حاصل کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔

کشمیر آمد: سید علی ہمدانی سات سو مبلغین، ہنرمند اور فن کاروں کی ایک جماعت کے ساتھ کشمیر پہنچے تھے۔ جس کے بعد اس کشمیری ثقافت کا آغاز ہوا جو آج بھی جدید کشمیر کی شناخت ہے، انہوں نے وادی کشمیر، لداخ، بلتستان میں سب سے پہلے اسلام کی تبلیغ کی اور کشمیری ثقافت اور معیشت کو بھی ترقی دی۔ آج بھی ان کی درگاہ جو خانقاہ معلی کے نام سے مشہور ہے مخلوق خدا کے لیے مشعل ہدایت کا کام کر رہی ہے۔ انہوں نے کئی کتابیں بھی تصنیف کی تھیں۔ شاعر مشرق نے ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر کچھ اشعار کہے ہیں جن سے عقیدت جھلکتی ہے۔

ع سید السادات، سالار عجم — دست او معمار تقدیر امم
تا غزالی درس اللہ ہو گرفت — ذکر و فکر از دودمان او گرفت
مرشد آن کشور مینو نظیر — میر درویش و سلاطین را مشیر
خطہ را آن شاہ دریا آستین — داد علم و صنعت و تہذیب و دین
آفرید آن مرد، ایران صغیر — با ہنرہای غریب و دلپذیر
یک نگاہ او کشاید صد گرہ — خیز و تیرش را دل رائی بدہ

(علامہ اقبال)

خواجہ حافظ محمد جمال ملتانی (م 1220ھ/1776ء)

صاحب سیف وقلم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہر تیر انداز بھی تھے۔

نام ونسب: خواجہ حافظ محمد جمال ملتانی ولد خواجہ محمد یوسف ولد خواجہ عبدالرشید اعوان۔ آپ کے دادا جہلم سے ملتان آ بے تھے۔

ولادت وتعلیم: خواجہ حافظ جمال صاحب کی تاریخ ولادت اور ابتدائی حالات زندگی پر مکمل تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے، صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ خواجہ نور محمد مہاروی کے مرید تھے اور انہیں سے آپ نے ظاہری و باطنی تعلیم حاصل کی تھی۔ آپ کے تذکرہ نگاروں کے مطابق آپ کمال باطنی اور تہذیب اخلاق وکمالات سے آراستہ تھے، باریک ودقیق مسائل کا مکمل اور شافی جواب دیتے تھے۔ مسئلہ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ شیخ ابن عربی اور مولانا جامی کی تصنیفات پر عبور رکھتے تھے۔ جب کبھی ان پر گفتگو کرتے فصاحت اور بلاغت کے دریا بہا دیتے تھے۔ حافظ صاحب نے اپنا مدرسہ بھی قائم کیا تھا جہاں وہ درس و تدریس کرتے اور چشتیہ سلسلہ کی بیعت لیتے تھے۔ آپ کی مہر پر ''ان اللہ جمیل یحب الجمال'' کے الفاظ کندہ تھے۔ طبعاً پاکیزہ تھے اور پاکیزگی کا یہ عالم تھا کہ وضو کی جگہ اور برتن کو بھی پاک رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اعلیٰ درجہ کے متقی اور پرہیزگار تھے۔ یتیم کے کنوئیں سے بھی اپنے گھوڑے کو پانی نہ پلاتے تھے۔ مقروض سے کوئی نذرانہ قبول نہیں کرتے تھے۔ آپ صاحب سیف وقلم تھے اور آپ کے خرمن میں تیغ وقلم ایک ہی سائے میں تربیت پاتے تھے۔ صاحب علم وفراست ہونے کے باوجود آپ شمشیر وسپر سے بھی بیگانہ نہیں تھے۔ اور تیر اندازی کے ماہر تھے اور اس کی تربیت بھی دیتے تھے۔ حافظے کے بھی بڑے قوی تھے اور بہت سے علوم کے بھی ماہر تھے۔

انُ کے زمانے میں جب ملتان پر سکھوں نے حملے تیز تر کردیے تو آپ دفاع ملتان میں شامل ہوگئے اور ایک حملے کے دوران قلعہ کے ایک برج پر بیٹھ کر تیر اندازی سے سکھوں پر حملہ کرتے رہے۔ سکھوں کے ملتان پر تیسرے بڑے حملے کے دوران آپ ملتان سے باہر تھے حملہ کی اطلاع ملتے ہی واپس آگئے۔ چوتھی مرتبہ حملہ ہوا تو لوگ ملتان چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ آپ نے لوگوں کو بھاگنے سے منع کیا اور فرمایا کہ کفار سے جنگ کرنا فرض ہے مگر اب تو بقا کا سوال ہے اس لیے اب یہ فرض عین ہے۔ اس لیے بھاگنا نہیں چاہیے۔

حاکم ملتان نواب مظفر خان آپ کا ہم عصر تھا اور آپ کا بے حد احترام کرتا تھا اور دفاعی معاملات میں آپ سے مشاورت کرتا تھا۔

آپ کے چار مریدین خاص تھے، خواجہ خدا بخش ملتانی، قاضی عیسیٰ خان پوری، منشی غلام حسن شہید اور مولوی زاہد شاہ آپ کے ملفوظات بھی انہیں مریدین باصفا نے اپنی تصنیفات میں جمع کیے ہیں۔ آپ نے 5 جمادی الاول 1220ھ/ 1776ء کو اس دار فانی سے کوچ کیا۔ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق اپنے حجرے میں دفن ہوئے۔ ان کا مزار آج بھی مرجع خلائق ہے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی (1233ھ/1818ء-1308ھ/1890ء)

مناظر بے بدل، عیسائیت کے تابڑ توڑ حملوں سے ملت اسلامیہ کا دفاع کرنے والے پاسبان

نام ونسب: رحمت اللہ کیرانوی بن مولوی خلیل اللہ کیرانوی۔ حافظ رحمت اللہ کیرانوی اسلام اور اہل سنت کے

بڑے پاسبانوں میں سے تھے۔ انیسویں صدی میں جب ہزاروں یورپی مشنری، انگریزوں کی پشت پناہی کی وجہ سے ہندوستان میں مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ حافظ رحمت اللہ کیرانوی اور ان کے ساتھی مناظروں اور تقریروں اور پمفلٹوں کے ذریعے اسلامی عقاید کے دفاع میں مصروف تھے۔ 1270ھ بمطابق 1854ء یعنی جنگ آزادی ہند سے تین سال قبل رحمت اللہ کیرانوی نے آگرہ میں پیش آنے والے ایک معرکۃ الآرا مناظرہ میں عیسائیت کے مشہور یورپی مبلغ پادری فنڈر کو شکست فاش دی تھی۔

جنگ آزادی 1857ء کیرانوی صوفی شیخ حضرت حاجی امداد اللہ مکی (مہاجر مکی) کی قیادت میں انگریزوں کے ساتھ تھانہ بھون میں جہاد میں شامل اور شاملی کے بڑے معرکہ میں بھی شریک ہوئے۔ انگریزوں کی فتح کے بعد کیرانوی دیگر مجاہدین کی طرح ہجرت کر کے حجاز چلے گئے۔ یہاں آپ نے پادری فنڈر کی کتاب ''میزان الحق'' کا جواب ''اظہار الحق'' تحریر فرمایا۔

حجاز سے سلطان ترکی کی دعوت پر قسطنطنیہ گئے اور وہاں عیسائیوں سے مناظرے کیے۔ قسطنطنیہ (استنبول) سے ہی آپ کی تصنیف ''اظہار الحق'' شائع ہوئی۔ قسطنطنیہ کے مناظروں اور اظہار الحق کے متعلق معلومات مشہور مستشرق گارساں و تاسی کے مقالات میں موجود ہے۔

مکہ میں حافظ کیرانوی نے ایک نیک خاتون بیگم صولت النسا کے فراہم کردہ عطیئے سے ایک مدرسہ صولتیہ قائم کیا جو حجاز مقدس میں اصول و مسلک اہل سنت اور فروع میں حنفی فقہ پر چلنے والوں کا نمائندہ مدرسہ ہے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے 1308ھ/1890ء میں مکہ میں وفات پائی اور جنت المعلیٰ میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے جوار میں دفن ہوئے۔

عبدالعلیم صدیقی (1893ء-1954ء)

عبدالعلیم صدیقی مولانا شاہ احمد نورانی کے والد اور ایک بلند پایہ عالم

نام و نسب: محمد عبدالعلیم صدیقی قادری بن قاضی مفتی شاہ عبدالحکیم صدیقی قادری۔

پیدائش و تعلیم: محمد عبدالعلیم صدیقی قادری 15 رمضان 1310ھ بمطابق 3 اپریل 1893ء بھارت کے شہر میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ معروف ادیب و شاعر حضرت مولانا اسمٰعیل میرٹھی ان کے چچا تھے۔ شاہ عبدالعلیم نجیب الطرفین صدیقی تھے۔ چنانچہ آپ کا سلسلہ نسب 36 پشتوں کے بعد حضرت محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ آپ کے مورث اعلیٰ حضرت مولانا قاضی حمید الدین صدیقی خجندی 1525ء میں مشہور فاتح ظہیر الدین بابر کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے تھے۔ ان کے بعد بھی اس خاندان کے بہت سے افراد قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز رہے۔

آپ نے اردو، عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی اپنے والد محترم سے حاصل کی۔ صرف چار سال کی عمر میں قرآن مجید ناظرہ ختم کیا اور صرف سات سال کی عمر میں قرآن پاک کو مکمل طور پر حفظ کر لیا۔ بعد ازاں مدرسہ عربیہ اسلامیہ میرٹھ میں داخل ہوئے۔ 3 جمادی الاول بمطابق اگست 1904 کو والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو بقیہ تعلیم و تربیت آپ کے بھائی علامہ احمد مختار صدیقی نے کی۔ اس کے بعد انہوں نے مدرسہ قومیہ عربیہ میرٹھ میں داخلہ لیا اور 1326ء میں امتیازی پوزیشن سے درس نظامی کی سند لی۔ دینیات کے موضوع پر نیشنل عربیک انسٹی ٹیوٹ اور پھر وکالت کا امتحان پاس کر کے الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی ڈگری لی۔ میرٹھ کے مشہور حکیم احتشام الدین سے علم طب کی تعلیم حاصل کی۔

کالج سے بی اے کرنے کے دوران اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی سے اکتساب فیض کرتے رہے۔ انہیں کے دست حق پرست پر بیعت کی اور خلافت واجازت سے نوازے گئے۔ اُنہی کے ایما پر اپنی زندگی تبلیغ اسلام کے لیے وقف کردی اور اپنے نجی خرچ پر پیغام اسلام دنیا کے کونے کونے میں پہنچایا۔ وہ دنیا کی متعدد زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ 1951ء میں پوری دنیا کا تبلیغی دورہ کیا۔ اس دوران انگلستان، فرانس، اٹلی، گیانا، سعودی عرب، ٹرینی ڈاڈ، ٹوباگو، امریکہ، کینیڈا، فلپائن، سنگاپور، ملائیشیا، تھائی لینڈ، انڈونیشیا اور سری لنکا کا سفر کیا اور تمام مذاہب کے لوگوں کو دعوت اسلام دی اور ہر زبان میں اسلام کا لٹریچر شائع کرایا۔ بانی پاکستان قائداعظم، مراکش کے غازی عبدالکریم، فلسطین کے مفتی سید امین الحسینی، اخوان المسلمون کے سربراہ حسن البناء اور دنیا اور بڑی شخصیات سے ملے۔ انہوں نے متعدد ممالک میں مساجد بھی تعمیر کرائیں جن میں حنفی جامع مسجد کولمبو، سلطان مسجد سنگاپور اور جاپان میں بھی ایک مسجد کی تعمیر شامل ہے۔ علاوہ ازیں عربی یونیورسٹی ملائیشیا، پاکستان نیوز مسلم ڈائجسٹ ٹرینی ڈاڈ مسلم اینوول کی بنیاد رکھی۔ 1949ء میں سنگاپور میں تنظیم بین المذاہب قائم کی۔ 1946ء میں آل انڈیا کانفرنس بنارس میں شرکت کی اور اعلانیہ طور پر پاکستان کے قیام کی حمایت کی۔ وہ نہ صرف حافظ قرآن ومبلغ اسلام تھے بلکہ ایک اعلیٰ پایہ کے مصنف بھی تھے۔ آپ کی تصنیفات میں ''ذکر حبیب''، کتاب تصوف بہار شباب، احکام رمضان، اسلام کی ابتدائی تعلیمات مکالمہ جارج برنارڈ شاہ اور مرزائی حقیقت کا اظہار شامل ہیں۔ 1954ء میں مدینہ منورہ میں انتقال کیا اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

سید قطب شہید (1906ء-1966ء)

عالم اسلام کے عظیم مفکر، داعی اور مفسر قرآن اور مصنف ''معالم عد الطریق''

نام ونسب: سید قطب کا اصل نام سید ہے جبکہ خاندانی نام قطب ہے۔ ان کے آباؤاجداد اصلاً جزیرۃ العرب کے رہنے والے تھے۔ ان کے بزرگ وہاں سے ہجرت کرکے بالائی مصر کے علاقے میں آباد ہوگئے تھے۔ سید قطب کی پیدائش 9 اکتوبر 1906ء کو مصر کے ضلع السیوط کے موشا نامی گاؤں میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں اور بقیہ تعلیم قاہرہ یونیورسٹی سے حاصل کی اور بعدازاں اسی یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوگئے۔ کچھ دنوں بعد وزارت تعلیم کے انسپکٹر آف اسکولز کے عہدے پر فائز کیے گئے۔ اس کے بعد اخوان المسلمون سے وابستہ ہوگئے اور آخری دم تک ان کی یہ وابستگی قائم رہی۔

ادبی خدمات: سید قطب شہید مصری معاشرے میں ایک ادیب کی حیثیت سے ابھرے۔ سیاسی اور اجتماعی نقاد کے عنوان سے انہوں نے نام پیدا کیا۔ ان کی اہم ترین تصنیف قرآن کریم کی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' ہے۔ اس کا ترجمہ اردو اور دوسری عالمی زبانوں میں ہو چکا ہے۔

گرفتاری: جمال ناصر کے تاریک دور آمریت میں کئی بار آپ کو گرفتار کیا گیا اور پابند سلاسل رکھا گیا۔ دراصل اخوان المسلمون سے آپ کی وابستگی حکومت کو بہت کھٹکی جو اخوان المسلمون کے خلاف تھی۔

ثابت قدمی: جمال ناسر کے عہد میں جب آپ کو گرفتار ہوئے 18 سال ہو چکے تو حکومت مصر نے یہ پیشکش کی کہ اگر آپ یہ لکھ دیں کہ میں نے مصری حکومت سے معافی طلب کرلی ہے تو آپ کو رہا کردیا جائے گا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ لوگ مجھے باطل سے معافی مانگنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اگر میری گرفتاری قدرت کی طرف سے ہے تو میں اس میں خوش ہوں اور اگر میری گرفتاری باطل کی طرف سے ہے تو میں باطل سے رحم کی بھیک مانگنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں۔''

شہادت: بالآخر اسلام کے اس عظیم مفکر، داعی اور مفسر قرآن کو ان کی شہرہ آفاق کتاب ''معالم عد الطریق'' لکھنے پر

مصری حکومت کے خلاف سازشیں کرنے کے بے بنیاد الزام میں گرفتار کرایا گیا اور 25 اگست 1966ء کو اسی الزام میں پھانسی دے دی گئی۔

تصانیف: آپ کی چند اہم تصانیف کے نام درج ذیل دیئے جا رہے ہیں۔

(1) طفل من القریہ (گاؤں کا بچہ)

(2) مدینۃ المسحور (سحرزدہ شہر)

(3) التصویر الفنی فی القرآن

(4) مشاہد القیامۃ فی القرآن

(5) معالم عدالطریق

(6) المستقبل لھذا الدین

(7) ھذاالدین

(8) فی ظلال القرآن (تفسیر القرآن)

ان کے علاوہ بھی آپ نے کئی اور کتب بھی تحریر کی تھیں۔

شیخ ڈاکٹر یوسف القرضاوی

مصر کی تحریک اخوان المسلمون کے راہنما اور عالم اسلام میں عصر حاضر کے ایک بڑے عالم

نام ونسب: یوسف القرضاوی، مصر سے تعلق رکھنے والے ایک ممتاز عالم

پیدائش: 9 ستمبر 1926ء کو مصر میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم پائی۔

مصر واپسی: اپنی 30 سالہ جلاوطنی کے بعد فروری 2011ء میں قاہرہ واپس لوٹے اور التحریر چوک میں تقریباً 10 لاکھ لوگوں کے ایک اجتماع سے نماز جمعہ کے وقت خطاب کیا۔ اپنے اس خطاب میں وہ مصر کے تمام طبقات بشمول قبطی COPTS اور فوج سے بھی مخاطب تھے اور انہوں نے سول حکومت کے قیام کے لیے تمام گروہوں میں اتحاد قائم کرنے کی اپیل کی۔

شیخ یوسف القرضاوی الجزیرہ ٹیلی ویژن نیٹ ورک پر نشر کیے جانے والے ایک پروگرام ''الشریعہ والآیہ SHARIA AND LIFE کی وجہ سے مشہور ہیں جو پوری دنیا میں تقریباً 60 ملین لوگ دیکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ISLAM ON LINE نامی ویب سائٹ پر بھی وہ ایک بڑے عالم کے طور پر پائے جاتے ہیں۔

شیخ القرضاوی اپنے زمانہ طالب علمی میں اخوان المسلمون کے راہنما حسن البنا سے ملے تھے اور آج بھی ان سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ القرضاوی نے مصر کی مشہور یونیورسٹی الازہر یونیورسٹی کے شعبہ دینیات سے تعلیم پائی ہے اور 1953ء میں گریجویشن مکمل کی تھی۔ 1962ء میں شیخ صاحب کو الازہر یونیورسٹی نے قطر میں ایک انسٹی ٹیوٹ آف ریلجس اسٹڈیز بھجوادیا تھا۔ علامہ قرضاوی نے 1973ء میں زکوٰۃ پر تھیسس لکھ کر اپنی PHD کی ڈگری حاصل کی تھی۔

1977ء میں القرضاوی نے قطر یونیورسٹی میں شریعہ فیکلٹی کی بنیاد رکھی۔ علامہ قرضاوی نے مصر کے شاہ فاروق اور کرنل جمال ناصر کے عہد حکومت میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں اور 1961ء میں وہ جلاوطن ہو کر قطر آ گئے تھے۔

علامہ القرضاوی نے عرب دنیا میں 2011ء میں آنے والے انقلابات کی حمایت میں فتویٰ جاری کیا تھا۔

شیخ عبدالرحمٰن السدیس

مسجد الحرام مکہ کے اماموں کے سربراہ اور حافظ وقاری

نام ونسب: شیخ عبدالرحمٰن السدیس

پیدائش وتعلیم: الریاض میں 10 فروری 1960ء کو پیدا ہوئے اور صرف بارہ سال کی مدت میں قرآن مجید حفظ کیا۔ ریاض یونیورسٹی سے شریعت کی تعلیم حاصل کی۔ ام القریٰ یونیورسٹی میں بھی زیر تعلیم رہے۔ شیخ عبدالرحمٰن السدیس اپنے خطبات کی وجہ سے بھی مشہور ہیں۔ ان کی آواز میں تلاوت قرآن پوری دنیا میں آسانی سے دستیاب ہے۔ جس کی وجہ سے پوری دنیا کے مسلمان ان کی آواز سے واقف ہیں۔

عبدالرحمٰن السدیس نے اپنے خطبات میں یہ امر بھی واضح کیا ہے کہ اسلام ''دھماکوں اور دہشت گردی کے خلاف ہے اور اس قسم کی انتہا پسندانہ کارروائیوں کی اجازت نہیں دیتا بلکہ مسائل کو حل کرنے کے لیے مذاکرات کرنے کا راستہ دکھاتا ہے۔''

السدیس نے صرف 22 سال کی عمر میں 1984ء میں مسجد الحرام میں امامت کا آغاز کیا تھا اور مسجد ھذا میں انہوں نے اپنا پہلا خطبہ جولائی 1984ء میں دیا تھا۔

1991ء سے 2006ء تک انہوں نے شیخ سعود الشریم کی شراکت میں حرم شریف میں نماز تراویح پڑھائی ہے۔

2005ء میں شیخ السدیس کو دوبئی انٹرنیشنل ہالی قرآن ایوارڈ کی طرف سے انہیں اس سال کی 9 ویں بڑی شخصیت قرار دیا گیا تھا۔ دوبئی میں اپنا ایوارڈ وصول کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ اسلام سادگی، ہم آہنگی اور مہربانی کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ 2010ء سے 2012ء تک انہوں نے بھارت، پاکستان، ملائیشیا اور انگلستان کے دورے کیے اور مختلف سیمیناروں سے خطاب کیا اور اسلامی تہذیب کو عصر حاضر کے چیلنجوں کا سامنا کرنے کے موضوع پر خطبات دیے تھے۔

سعود الشریم

خطیب وامام مسجد الحرام المکہ اور تلاوت قرآن مجید کے لیے مشہور

نام ونسب: سعود ابن ابراہیم بن محمد الشریم

پیدائش وتعلیم: 19 جنوری 1966ء کو پیدا ہوئے۔ الشریم نے ابتدائی تعلیم ارین ایلمنٹری اسکول سے حاصل کی اور پھر ماڈرن اسکول آف سیکنڈری ایجوکیشن اور پھر ایریموک نارتھ ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ سیکنڈری اسکول میں تعلیم پانے کے ساتھ ساتھ انہوں نے قرآن مجید کو حفظ کیا اور 1983ء میں سیکنڈری اسکول سے گریجویشن مکمل کی۔ اس کے بعد انہوں نے امام محمد بن سعود یونیورسٹی الریاض میں داخلہ لیا اور 1988ء تا 1989ء وہاں زیر تعلیم رہے۔ 1992ء میں انہوں نے ماسٹر ڈگری حاصل کی اور پھر 1995ء ام القریٰ یونیورسٹی سے PHD کی ڈگری حاصل کی۔

1991ء میں وہ امام اور خطیب کی حیثیت سے شاہ فہد کے حکم پر مسجد الحرام المکہ سے وابستہ ہو گئے۔ 1992ء میں انہیں ہائی کورٹ مکہ کا جج مقرر کیا گیا۔ 1993ء میں انہیں مسجد الحرام میں تدریس کی اجازت دی گئی اس کے علاوہ وہ 1995ء سے ام القریٰ یونیورسٹی مکہ میں پروفیسر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ بعد ازاں انہیں شریعہ فیکلٹی کا ڈین بھی بنا دیا گیا۔ 2010ء میں انہیں فقہ اسلامی کا خصوصی پروفیسر مقرر کیا گیا اور تا حال وہ سعودی عرب میں خدمات انجام دے

رہے ہیں۔ سعود الشریم کے خاندان کا تعلق سعودی عرب کے بنوزید قبیلے سے ہے۔ سعودی عرب کے ایک روزنامہ "الوطن" کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے بتایا تھا کہ ان کی کامیابیوں کے پیچھے ان کی والدہ اور بیوی کا ہاتھ ہے۔

عمر خضر

حافظ عمر خضر کینیڈا کے ایک مسلمان شہری جنہیں گوانتاناموجیل میں قید کیا گیا

O

بہادران اسلام

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابی جہل
حضرت مالک بن بن عوف رضی اللہ عنہ (حیات بوقت فتح دمشق)
حضرت ابوعبیدہ بن الجراح (م 18ھ/639ء)
الباھلی، عبالرحمٰن بن ربیعہ (خلافت فاروقی کا فاتح ترکستان)
حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ (م 54ھ/673ء)
مالک بن الاشتر النخعی (م 37ھ/658ء)
حسان بن النعمان الغسانی (م 86ھ/705ء)
عمر بن حفص (م 154ھ/771ء)
سلطان الپ ارسلان (1029ء-1072ء)
اسامہ بن مرشد (488ھ/1095ء-584ھ/1188ء)
عمادالدین زنگی (521ھ/1127ء-541ھ/1146ء)
ارطغرل (م 680ھ/1281ء)
احمد پاشا خائن (م نواح 931ھ/1524ء)
محمد علی پاشا (1769ء-1849ء)
عقبہ بن نافع (م 63ھ/683ء)
عبداللہ بن علی (م 147ھ/764ء)
عمر بن حفصون (م 306ھ/918ء)
یوسف بن تاشفین (1019ء-1106ء)
عبدالمومن بن علی (558ھ/1163ء)
جلال الدین خوارزم شاہ (628ھ/1231ء)
اورنوس غازی (م 820ھ/1417ء)
احمد پاشا بونیوال (م 1160ھ/1747ء)
عبدالکریم، ریف غازی (1880ء-1963ء)

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابی جہل (م 634ء/13ھ)

دشمن اسلام، ابوجہل کا فرزند جو اپنے باپ کے برعکس وفادار اسلام تھا

نام ونسب: عکرمہ بن ابی جہل، عمرو بن ہشام المغیرہ المخزومی۔ مکہ کا مشہور شہسوار جو بدر، احد، خندق کے غزوات میں مسلمانوں کے خلاف لڑا۔ احد میں مسلمانوں کو گھیرے میں لینے میں اس کا بڑا ہاتھ تھا۔ فتح مکہ کے دن بھی لشکر لے کر مزاحمت کی۔ شکست کھا کر جان بچانے کے لیے یمن چلا گیا۔ اس کی بیوی ام حکیم مسلمان ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور شوہر کے لیے معافی کی خواستگار ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی درخواست قبول فرمائی۔ ام حکیم خاوند کو تلاش کر کے لائی عکرمہ مسلمان ہو گیا۔ آنحضرت نے اس کے لیے دعائے مغفرت فرمائی اور اس کے

ایمان پر اظہار اعتماد فرمایا۔ عکرمہ نے بھی اسلام کو دل سے قبول کیا اور عہد کیا کہ جتنا روپیہ اسلام کی مخالفت میں خرچ کیا تھا، اتنا ہی اسلام کی نصرت کے لیے خرچ کروں گا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں مرتدین کے خلاف کارروائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ان کی بیخ کنی کی اور عراق وروم کی جنگوں میں عکرمہ نے بڑی گرم جوشی اور بہادری سے حصہ لیا۔ مسیلمہ بن کذاب کے خلاف لڑی جانے والی جنگ یمامہ میں اہم کردار ادا کیا۔

معرکہ یرموک کے دوران جب میدان کارزار انتہائی گرم تھا حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے بلند آواز سے کہا کون ہے جو میرے ہاتھ پر موت کی بیعت کرے؟ اسی وقت حضرت ضرار بن ازور رضی اللہ عنہ اور دیگر چار سو افراد نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی کہ یا تو ہم شہید ہو جائیں گے یا فتح مند ہو کر نکلیں گے۔ اس کے بعد حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں یہ جماعت بھوکے شیروں کی طرح رومیوں کے لشکر میں گھس گئی۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ چشم فلک نے آج تک نہ دیکھے تھے۔ آخر رومیوں کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے مگر خود بھی اسی معرکہ میں جام شہادت دیگر تین ہزار بہادر مسلمانوں کے ساتھ نوش کیا۔

حضرت مالک بن بن عوف رضی اللہ عنہ (حیات بوقت فتح دمشق 635ء)

صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مشہور جنگ آزما عرب سردار

سرور کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ صحابی ایک مدت تک اسلام کے خلاف جنگ آزما رہا مگر آپ نے صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تالیف قلب فرمائی اور وہ اسلام لے آیا۔

نام ونسب: حضرت مالک بن عوف رضی اللہ عنہ اپنا شجرہ نسب نصر بن معاویہ کے سلسلے سے بنو ہوازن کے طاقتور قیسی قبیلہ کے مورث اعلیٰ سے ملاتے ہیں۔ ہمیں ان کی زندگی کے حالات کا جنگ حنین سے پہلے پتہ نہیں چلتا۔ اسی جنگ میں انہیں دھندلی سی شہرت حاصل ہوئی تھی۔ مورخین یہ تسلیم کرتے ہیں کہ بچپن ہی سے وہ بہادر تھے۔ 8ھ میں جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ایک بڑی فوج لے کر مکہ پر چڑھائی کی تیاریاں کر رہے تھے تو اس خبر نے طائف اور جبال مرات پر رہنے والوں کو پریشان کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ مکہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بالضرور ان کے ملک پر بھی قبضہ کریں گے۔ اسی وجہ سے مالک بن عوف رضی اللہ عنہ نے تمام قیسی قبائل کو اکٹھا کر لیا جو نجد وحجاز کی سرحدوں پر رہتے تھے اور وہ مسلمانوں کے خلاف ایک متحدہ فوج اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو گئے جو بنو ہوازن کی فوج تھی۔

بنو ثقیف نے بھی اپنی فوج کو اس متحدہ لشکر میں شامل کر دیا مگر اس بڑے اتحاد کے باوجود جنگ حنین میں انہیں شکست ہوئی۔ سپہ سالار مالک بن عوف بدقسمتی سے عورتوں، بچوں اور جانوروں کے ریوڑوں تک کو میدان جنگ میں لے آیا تھا۔ حنین کے میدان میں شکست کے بعد لیہ اور طائف میں پناہ لی۔ جب محاصرہ طائف سے اسلامی لشکر واپس چلا گیا اور جعرانہ کے مقام پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مال غنیمت تقسیم فرمایا تو بنو ہوازن کے وفد کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مالک اسلام لے آئے تو اس کا خاندان اور مال واپس کر دوں گا اور ایک سو اونٹ اسے عطا بھی کیے جائیں۔ آخر طائف میں ہزیمت خوردگی کی ذلت نہ برداشت کرتے ہوئے مالک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام لے آئے اور انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں فتوحات شام میں حصہ لیا تھا۔

حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ (م 18ھ/ 639ء)

امین الامۃ، عشرہ مبشرہ میں شامل مشہور صحابی رسول اور فاتح شام

نام ونسب: ابوعبیدہ، عامر بن عبداللہ بن الجراح رضی اللہ عنہ، لقب امین الامۃ۔ ان کی والدہ کا نام امیمہ بنت غنم بن جابر تھا۔ ان کے والد عبداللہ بحالت کفر غزوہ بدر میں خود انہیں کے ہاتھوں مقتول ہوئے (اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی) ماں مسلمان ہوگئی تھیں اور ان کا شمار صحابیات میں ہوتا ہے۔

بروایت علامہ واقدی غزوہ بدر میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی عمر اکتالیس سال تھی، لہٰذا آغاز اسلام میں وہ 28 سال کے تھے اور گویا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہم سن تھے۔ ان کا شمار ان صحابہ میں ہوتا ہے جو اپنی کنیت سے مشہور ہوئے (الاستیعاب)

وہ سابقون الاولون اور عشرہ مبشرہ میں ہیں اور ان کے لقب امین الامۃ کا ذکر صحیح بخاری میں موجود ہے۔ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دعوت پر اسلام لائے تھے۔ یہ امر بھی کہ وہ ہجرت حبشہ ثانی میں شریک تھے محل نظر ہے، انہوں نے مکہ المکرمہ میں رہ کر وہ سب اذیتیں برداشت کیں جو سابقون الاولون کو کفار مکہ کے ہاتھوں پہنچیں۔ مدینہ ہجرت فرمائی تو حضرت کلثوم بن ہدم کے ہاں قیام فرمایا۔ صحیح بخاری میں ان کا نام اگرچہ اصحاب بدر میں شامل نہیں لیکن علامہ ابن البر کا یہ بیان نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت ابوعبیدہ نے بدر وحدیبیہ میں شرکت کی تھی کیونکہ حدیبیہ کے صلح نامے میں بطور گواہ ان کے دستخط ثبت تھے۔ 9ھ میں جب وفد نجران یمن واپس گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تبلیغ اسلام اور صدقات کی وصولی کے لیے اُس وفد کے ساتھ روانہ کیا۔ یہی موقع تھا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں امین الامۃ کا لقب عطا کیا تھا۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں خلافت کا سوال اٹھا تو حضرت ابوعبیدہ شیخین کریمین کے ساتھ تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ "تم لوگ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ یا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ میں سے کسی بیعت کرلو" میں تمہارے لیے ان دو شخصوں میں سے کسی ایک کو چن لینا پسند کرتا ہوں" پھر جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت پر اجماع ہوا تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے ان کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہی۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بڑھ کر پہلے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔

محاذ شام پر: 13ھ کے آغاز میں جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے شام پر لشکر کشی کی تو حضرت ابوعبیدہ نے بھی سات ہزار سپاہیوں کے ساتھ معرقہ کے راستے شام کا رخ کیا (الطبری) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ انہیں حمص کی فتح کے لیے نامزد فرمایا تھا اور تھوڑی دور تک پیدل چل کر ان کی مشایعت بھی کی تھی۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے یرموک سے گذرتے ہوئے اول بصریٰ کو محاصرے میں لے لیا پھر ادائیگی جزیہ پر صلح کر کے دمشق روانہ ہوئے جہاں سب اسلامی فوجیں جمع ہو رہی تھیں۔ تاکہ قیصر کی جنگی تیاریوں کا مقابلہ کریں۔ اس موقع پر پہلے اجنادین کا معرکہ پیش آیا، جس میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ بھی حضرت ابوعبیدہ کے ساتھ شریک تھے۔ رومیوں کو شکست فاش دے کر مسلمانوں نے دمشق کا محاصرہ کرلیا۔ یہ محاصرہ جاری تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ صدیق نے وفات پائی۔ دمشق کے محاصرے کے دوران جب ایک روز حضرت خالد رضی اللہ عنہ کمند کے ذریعے فصیل شہر پر چڑھ گئے تو حضرت ابوعبیدہ دمشق کے دروازے پر فوج لیے کھڑے تھے۔ جب حضرت خالد نے فصیل سے اتر کر شہر کا دروازہ کھولا تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ شہر میں داخل ہوگئے۔ اہل شہر نے جب یہ نظارہ دیکھا تو باقی دروازے بھی کھول دیئے اور اطاعت تسلیم کرلی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسند خلافت سنبھالتے ہی حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو معزول کر دیا اور حضرت ابوعبیدہ کو شام کا سپہ سالار اعلیٰ مقرر کیا۔ 18ھ میں طاعون عمواس کے

دوران حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے وفات پائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس وباء سے بچانے کے لیے انہیں یہ محاذ چھوڑنے کا حکم دیا تھا مگر وہ تقدیرِالٰہی پر شاکر رہتے ہوئے وہیں وفات پا گئے۔

الباھلی، عبدالرحمٰن بن ربیعۃ (خلافت فاروقی کا فاتح ترکستان) (م 652ء)

خلافت فاروقی میں ترکستان کے بعض علاقوں کا فاتح

الباھلی معروف بہ ذوالنور، خلافت فاروقی میں ترکستان کے بعض علاقوں کا فاتح

نام ونسب: عبدالرحمٰن بن ربیعہ الباھلی، یعنی بنو باھلہ کا فرد، ایک عرب سپہ سالار، جسے ذوالنور (الطبری) اور بقول ابن الاثیر اس کی تلوار کے نام پر ذوالنون کہتے تھے۔ وہ سراقہ بن عمرو کے مقدمۃ الجیش کا سالار تھا جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے 642ء بمطابق 26ھ میں دربند (باب الابواب) کی مہم پر بھیجا تھا۔ مسلمان جب پہلی بار تفقاز میں لشکر لے کر گئے تو ان کی پیش قدمی کے سلسلے میں جو اہم واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ عبدالرحمٰن بن ربیعہ الباہلی اور دربند کے ایرانی کمانداری کی باہمی ملاقات کے متعلق ہے جس نے اطاعت قبول کرلی تھی۔ الطبری نے اپنی تاریخ میں اس معاہدے کا متن بھی درج کیا ہے جو ایرانی سپہ سالار اور اہل آرمینیا کے ساتھ طے پایا تھا۔ اس پر عبدالرحمٰن الباہلی اور اس کے چھوٹے بھائی سلمان بن ربیعہ کی گواہی درج ہے۔ اسی سال سالار اعظم سراقہ فوت ہوگیا اور اس کی جگہ دربار خلافت کی طرف سے عبدالرحمٰن بن ربیعہ الباھلی کو سپہ سالار بنا گیا۔ اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے خزرترکوں کے مقابلے کے لیے آگے بڑھنے کا حکم ملا۔ اس نے کوہ قاف کے مشرقی درّوں کی راہ سے بلنجر کی طرف پیش قدمی کی جس پر آئندہ چند سالوں کے دوران کئی بار یلغار کی گئی۔ 652ء میں وہ پھر خزریہ میں بلنجر کا محاصرہ کرتا ہوا نظر آیا۔ شہر کے نواح میں تیز جھڑپوں کے بعد خزروں نے شہر سے باہر نکل کر دھاوا بول دیا اور اس حملے کے دوران مزید فوج بھی ان سے آملی۔ اس معرکہ آرائی میں مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ عبدالرحمٰن اپنے آدمیوں کو للکارتا ہوا مارا گیا۔ اس کے بعد اس کے بھائی سلمان نے علم سنبھالا اور بقیۃ السیف میں سے بعض کو باب ابواب کی طرف لے آیا۔ کہا جاتا ہے دشمنوں نے عبدالرحمٰن باھلی کی لاش کو محفوظ رکھا اور اسے بارش کے لیے دعا کرتے وقت وہ سامنے رکھتے تھے۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ (م 54ھ/673ء)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنیٰ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے بیٹے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے صحابی

نام ونسب: اسامہ بن زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بن شرجیل الکلبی الہاشمی۔ کنیت ابومحمد اور ابوزید تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب افراد میں سے ایک تھے۔ ان کی والدہ حضرت برکۃ، ام ایمن رضی اللہ عنہا تھیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی گود میں کھلایا تھا۔ جبکہ والد، حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنیٰ تھے، گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت کا شرف انہیں اپنے والدین سے ورثے میں ملا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اسلام ہی میں آنکھ کھولی اور کفر وشرک کی آلودگیوں میں کبھی ملوث نہیں ہوئے۔ بقول ابن حجر آپ رضی اللہ عنہ جانتے تھے تو صرف اسلام۔ فتح خیبر کے بعد آپ رضی اللہ عنہ کا وظیفہ مقرر ہوگیا تھا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خیبر سے آمدنی کا جو حصہ ملتا تھا اسی میں سے آپ رضی اللہ عنہ کو بھی حصہ دیا جاتا تھا۔

غزوہ احد پیش آیا تو آپ کی عمر دس گیارہ برس تھی اس لیے جہاد کی اجازت نہیں ملی مگر آپ رضی اللہ عنہ جہاد میں شرکت کے متمنی تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ میں داخل ہوئے آپ کے جلو میں دیگر صحابہ

کے ساتھ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔

11ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو اس جیش کا سردار مقرر فرمایا جو موتہ میں حضرت زید اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد تیار کیا گیا تھا۔ جس کا مقصد شامیوں پر دھاک بٹھانا تھا۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی نوعمری کی وجہ سے آپ کی سرداری پر بعض صحابہ نے اعتراض کیا تو باوجود علالت کے سرور کائنات گھر سے باہر تشریف لائے اور حضرت اسامہ کے حق میں خطبہ دیا اور اپنے ہاتھ سے علم تیار کر کے ان کو عطا فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے یہ جیش حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں روانہ کیا گیا اور انتہائی کامیاب رہا۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ بعہد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ 54ھ میں وفات پائی۔ آپ رضی اللہ عنہ فضائل بہت زیادہ ہیں اور آپ سے متعدد حدیث مروی ہیں۔

مالک بن الاشتر النخعی (م 37ھ/658ء)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک پر جوش حامی اور بہادر میدان صفین

نام ونسب: مالک بن حارث النخعی، الاشتر کے معنی عربی زبان میں الٹے پپوٹوں والے کے ہیں۔ اس کا یہ عرفی نام اس لیے پڑا کہ جنگ یرموک (15ھ/636ء) میں آنکھ پر زخم لگنے کی وجہ سے ان کی آنکھوں کے پپوٹے الٹ گئے تھے۔

قبیلہ نخع خاندان مذحج کی ذیلی شاخ ہے۔ جب کوفہ آباد کیا گیا تو اسی قبیلے نے وہاں سکونت اختیار کر لی۔ اسی وجہ سے ابن حجر نے الاشتر کو کوفی لکھا ہے، جہاں اس کا اچھا خاصا اثر ورسوخ تھا۔ تاریخ میں اس بہادر شخصیت کی ولادت اور عمر کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ حضرت عثمان کے عہد میں جو فتنہ رونما ہوا اس سے پہلے الاشتر کا ذکر خاص طور پر صرف واقعہ یرموک ہی کے سلسلے میں ملتا ہے۔ جس میں اپنی بے مثال بہادری اور دلیری کی وجہ اسے بڑا امتیاز حاصل ہوا تھا۔

الاشتر کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں حکومت کے خلاف متواتر شورش بپا رکھی تھی۔ اسی سلسلے میں جب الاشتر اور اس کے ساتھیوں نے والی کوفہ سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک پر تشدد مظاہرہ کیا تو انہیں شام جلاوطن کر دیا گیا مگر کوفہ میں شورش جاری رہی۔ الاشتر ان لوگوں میں بھی شامل تھا جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ کیا تھا، بلکہ اس کا نام قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ میں بھی لیا جاتا ہے۔ الاشتر کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے والہانہ عقیدت تھی وہ ان کی حمایت میں ہمیشہ سینہ سپر رہتا تھا۔ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ جمل اور جنگ صفین دونوں میں شامل تھا۔ جنگ صفین میں خاص طور پر اس نے بے مثال بہادری کا مظاہرہ کیا وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج کا سالار تھا اور میمنہ کا قائد تھا۔ اگرچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کو خود منع نہ فرماتے تو وہ لشکر شام کو شکست دینے ہی والا تھا۔ جسمانی اعتبار سے بھی الاشتر بہت مضبوط جسم کا مالک تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے مصر کا والی مقرر کر کے مصر روانہ کیا تھا۔ اسے مصر جاتے ہوئے زہر خورانی سے ہلاک کر دیا گیا تھا۔

عقبہ بن نافع (م 63ھ/683ء)

علامہ اقبال نے اپنے ایک شعر میں اس مجاہد شخصیت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا

ع دشت تو دشت دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

نام ونسب: عقبہ بن نافع بن عبد قیس القرشی الفہری۔ پہلی صدی ہجری کے نامور سپہ سالار جنہوں نے شمال افریقہ

میں ابتدائی عرب فتوحات کو استوار اور محکم بنا کر بربری مقاومت کا قلع قمع کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن ایک پر آشوب زندگی گزارنے کے بعد بالآخر افریقی بغاوت پسندوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا۔ آپ نے وحشی درندوں اور سانپوں بھرے جنگل میں القیر وان تعمیر کیا تھا۔

عقبہ کی زندگی کے حالات کے بارے میں مورخین نے خاصی معلومات فراہم کی ہیں، لیکن شمالی افریقہ میں اسلام کی توسیع سے متعلق دوسری باتوں کی ان معلومات کو بھی احتیاط سے قبول کرنا ضروری ہے، یہ متاخر روایات سے ماخذ ہیں۔

عقبہ کی ولادت اس کے سوانح حیات کے مطابق عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری سالوں میں ہوئی۔ وہ اپنی والدہ کی طرف سے نامور فاتح مصر، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بھانجے تھے۔ انہی نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ پیشتر ان کو عساکر افریقیہ کا سردار اعلیٰ مقرر کیا تھا۔ ان کی وہ عسکری مہم 50ھ/670ء میں پیش آئی جس کے دوران انہوں نے صوبہ بیزاسین BYZACENE کے وسط میں القیر وان کے فوجی قلعے کی بنیاد رکھی۔ تاہم ابن مخلد الانصاری نے 53ھ/675ء میں عقبہ کو اس کے عہدے سے معزول کر دیا۔ دربار خلافت میں اس بدسلوکی کی شکایت کے نتیجے میں ان کو ان کے عہدے پر بحال کر دیا گیا (682ء) اس دوران عقبہ نے اپنی پہلی عسکری مہم سے بھی شاندار مہم کا اہتمام کیا مگر بعد از اں دشمنوں کی ایک جمعیت نے بغاوت کر کے عقبہ اور اس کے ساتھیوں کو جب ان کے ساتھ ایک مختصر فوج تھی، صحرا کے کنارے مقام تہودہ پر آگھیرا اور 63ھ/683ء میں وہ اپنے تین سو ہمراہیوں سمیت بہادرانہ لڑتے ہوئے شہید ہو گئے ان کے مزارات آج بھی اسی مقام پر موجود ہیں اور یہ مقام ان کے نام پر سیدی عقبہ کہلاتا ہے۔

حسان بن النعمان الغسانی (م86ھ/705ء)

شاہان غسان کی اولاد میں سے ایک نامور بہادر مسلمان مدبر اور سپہ سالار، فاتح قرطاجنہ

نام ونسب: حسان بن نعمان الغسانی، ایک نامور مسلمان جرنیل، مدبر اور سیاست دان، اسلامی فتوحات کے سلسلے میں ان کا شمار مشاہیر فاتحین میں ہوتا ہے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں افریقہ کے والی رہے۔ خلیفہ عبدالملک بن مروان کے زمانے میں والی مصر مقرر ہوئے۔ جب 76ھ/695ء میں مشہور فاتح اور والی افریقیہ زہیر البلدی شہید ہو گئے تو افریقیہ میں شورش بپا ہو گئی۔ خلیفہ عبدالملک نے حسان بن نعمان غسانی کو حکم دیا کہ وہ فی الفور افریقیہ پر لشکر کشی کر کے اس شورش کو فرو کرے۔ چنانچہ حسان 78ھ میں ایک لشکر جرار لے کر سرزمین افریقیہ پر حملہ آور ہوئے۔ انہوں نے سب سے پہلے شہر قرطاجنہ پر جو ابھی بازنطیوں کے قبضے میں تھا، حملہ کر کے اسے فتح کیا، لیکن وہاں کے باشندوں میں سے کچھ لوگ صقلیہ اور اندلس کی طرف بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ ادھر قیروان میں کچھ دن ستانے کے بعد حسان افریقیہ کی ملکہ کاہنہ پر حملہ کرنے کی غرض سے جبل اور اس کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے وادی مسکیانہ میں فروکش ہوا۔ ملکہ کاہنہ کی فوج سے بڑا سخت مقابلہ ہوا جس میں مسلمانوں کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا جس کے بعد عارضی طور پر حسان کو پسپا ہونا پڑا۔ 698ء میں مسلمانوں نے دوبارہ قرطاجنہ کو فتح کرایا اور ایک بار پھر حسان نے ملکہ کاہنہ کے خلاف عسکری مہم کا آغاز کیا۔ اس مرتبہ بھی بڑے گھمسان کا رن پڑا اور ملکہ کاہنہ کی فوج میدان چھوڑ کر بھاگ اٹھی خود ملکہ کاہنہ کو قتل کر دیا گیا۔ بربر قبائل نے حسان کے لیے بارہ ہزار مجاہدین فراہم کر کے امان طلب کی۔ اس علاقے کا انصرام میں انتظام کرنے کے بعد حسان فارغ ہوئے ہی تھے کہ مصر کے والی عبدالعزیز نے انھیں دفعتاً معزول کر دیا اس کے بعد انہوں نے کوئی سرکاری عہدہ قبول نہ کیا البتہ رومیوں کے خلاف لڑتے ہوئے وہ 86ھ/705ء میں شہید ہو گئے۔

عبداللہ بن علی (م 147ھ/764ء)

عباسی خلیفہ السفاح اور المنصور کا چچا اور آخری اموی خلیفہ کے خلاف لڑنے والا بہادر

نام ونسب: عبداللہ بن علی، خلیفہ ابوالعباس السفاح اور خلیفہ ابوجعفر المنصور کا چچا، عبداللہ بن علی آخری اموی خلیفہ مروان ثانی کے خلاف بنوعباس کی جدوجہد میں سب سے بڑھ چڑھ کر سرگرم حصہ لینے والوں میں سے ایک بہادر جرنیل تھا۔

وہ معرکہ زاب کبیر کی فیصلہ کن جنگ میں، جس میں مروان ثانی اپنا تاج وتخت کھو بیٹھا، عباسی فوج کا سالار اعلیٰ تھا۔ جب مروان میدان چھوڑ کر بھاگا تو عبداللہ نے اس کا تعاقب کیا اور بسرعت دمشق پر قبضہ کر کے فلسطین کی طرف بڑھا۔ وہاں سے اس نے بھاگتے ہوئے اموی خلیفہ کا مصر تک تعاقب کیا۔ وہ خاندان بنوامیہ کے خلاف اپنی تلوار کو بے نیام رکھنے میں اپنے بھائی داؤد بن علی سے زیادہ بے رحم تھا۔ اس نے بنوامیہ کے کلی استیصال میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ اس نے فلسطین میں پناہ لینے والے بنوامیہ کے افراد کو موت کے گھاٹ اتارا جس سے نئے حکمران خاندان کے خلاف ایک بغاوت پھوٹ نکلی جسے عبداللہ نے 132ھ/750ء میں فرو کیا۔ بعدازاں عبداللہ والی شام کی حیثیت سے نئے حکمران خاندان کی بقا کے لیے خطرے کا موجب بن گیا۔ السفاح کی وفات پر اس نے خلافت کا دعویٰ کر دیا، جس کی بنیاد اس پر تھی کہ اس نے بنوامیہ کے خلاف جنگ کے دوران اہم خدمات انجام دی تھیں۔ اس کا یہ دعویٰ بھی تھا کہ خلیفہ السفاح نے اسے اپنے بعد خلیفہ بنانے کا وعدہ کیا تھا جب اسے پتہ چلا کہ خراسان کے والی ابومسلم نے المنصور کی خلافت کی حمایت کا اعلان کر دیا ہے تو وہ ابومسلم کے مقابلے پر اترا مگر ابومسلم نے اسے نصیبین کے مقام پر شکست دی، بعدازاں عبداللہ کو خلیفہ المنصور کے حکم پر گرفتار کر لیا گیا اور سات سال تک زندان میں قید رہنے کے بعد اس پر ایک مکان گرا کر اسے ہلاک کر دیا گیا۔

عمر بن حفص (م 154ھ/771ء)

خلیفہ المنصور عباسی کا ایک معروف سپہ سالار اور افریقیہ کا والی

نام ونسب: ابوجعفر، عمر بن حفص، اسے خلیفہ المنصور عباسی نے 151ھ/768ء میں صوبہ افریقیہ کا گورنر مقرر کیا تھا۔ اس کا ایک چچا المہلب بن ابی صفرہ نے خلیفہ عبدالملک بن مروان کے عہد میں خراسان کے گورنر کی حیثیت سے بڑی شہرت پائی تھی۔ عمر بن حفص بھی، جو بہادری میں مشہور تھا اور مشرقی صوبوں میں فوجی سپہ سالار رہ چکا تھا۔

عمر بن حفص جب خلیفہ کی طرف سے افریقیہ کا گورنر نامزد ہوا تو پانچ سو سوار اپنے ساتھ لایا۔ اس نے اپنی ہوشیاری سے جلد ہی اہل قیروان کے دل موہ لیے۔ جب خلیفہ المنصور نے اسے حکم دیا کہ وہ طبنہ کے قدیم شہر کے دفاعی استحکامات کو مضبوط کرے جو افریقیہ کی مغربی سرحد پر واقع تھا اور جنگی لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ عمر اس کام کے لیے فوج کا بڑا حصہ لے کر وہاں چلا گیا تو مخالف بربروں نے افریقیہ کو خالی پایا تو بغاوت کر دی اور عمر کے نائب حبیب المہلبی کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد الجنید بن بشار نے سرکاری فوج کی قیادت سنبھالی اور عمر بن حفص سے کمک طلب کی۔ کمک آنے کے باوجود اسے شکست ہوئی اور بغاوت عام شروع ہوگئی۔ جلد ہی عمر بن حفص کو بھی طبنہ میں بہتر ہزار مخالف فوج نے گھیر لیا۔ مگر اس نے چار ہزار درہم کی رقم دشمنوں کو رشوت دے کر ان کا زور توڑ دیا۔ ابھی عمر طبنہ ہی میں تھا کہ اسے قیروان کی نازک صورتحال کا پتہ چلا۔ یہ شہر آٹھ ماہ سے محصور تھا۔ عمر سات سو سپاہیوں کے ساتھ قیروان کے محصورین کو سامان رسد پہنچانے میں کامیاب ہوگیا پھر اس نے قیروان کے قلعے سے باہر نکل کر محاصرین پر حملہ کر دیا اور خلیفہ کی طرف سے بھیجی جانے والی کمک کا بھی انتظار نہیں

کیا اور دشمنوں پر دیوانہ وار ٹوٹ پڑا اور نتیجتاً 10 ذوالحجہ 154ھ/ 27 نومبر 771ء کو بہادرانہ لڑتے ہوئے مارا گیا۔

عمر بن حفصون (م 306ھ/918ء)

اندلس کے اموی حکمرانوں کے خلاف ایک طویل بغاوت کا قائد

اندلس کی مشہور بغاوت کا قائد جس نے نویں صدی کے اواخر میں سالہا سال تک قرطبہ کے اموی حکمرانوں کو ناکوں چنے چبواتا رہا اور بالآخر خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث الناصر نے اسے مغلوب کیا اتے ہیں اس نے عیسائیوں کے خلاف بھی مہمات میں حصہ لیا تھا۔

اس کا پورا نام عمر بن حفص بن عمر بن جعفر المعروف بہ جعفر الاسلامی تھا کیونکہ وہ عیسائی سے مسلمان ہوا تھا۔ وہ اپنے آپ کو کاؤنٹ الفانسو نامی عیسائی امیر کی اولاد بتاتا تھا۔ عمر بن حفصون ابتدائی عمر سے ہی اپنی تندی مزاج کی وجہ سے مشہور تھا جب اس نے اپنے ایک ہمسائے کے خلاف کوئی اقدام کیا تو اس کے نتیجے میں اسے افریقیہ کی طرف فرار ہونا پڑا تھا پھر جیسے ہی وطن واپس لوٹا تو اس نے قرطبہ کے اموی امیر کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس نے اپنے چند ہم خیال لوگوں کی ایک جماعت فراہم کر لی اور ایک ویران قلعے کی مرمت کر کے اسے اپنا مستقر بنالیا۔ ابن حفصون نے جلد ہی اس پہاڑی علاقے پر قبضہ کر لیا جو الجنفر اء تک پھیلا ہوا تھا۔ اموی امیر محمد بن عبدالرحمٰن نے اسے مطیع کرنے کے لیے ایک باقاعدہ عسکری مہم تیار کی اور عمر بن حفصون نے اطاعت قبول کر لی مگر یہ اطاعت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی اور جلد ہی اس نے دوبارہ بغاوت کر دی اور وہ اندلس کے جنوب میں ایک قومی تحریک کا سرگرم حامی تصور کیا جانے لگا۔ اور اس علاقے کے سارے سرکش لوگوں کا سرغنہ بن گیا۔ 273ھ/ 886ء میں امیر محمد نے وفات پائی اور ابن حفصون نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر تحریک مزاحمت کی تنظیم شروع کر دی۔ نئے امیر نے بھی ابن حفصون کے خلاف مہمات بھیجیں مگر ابن حفصون مستحکم تر ہوتا چلا گیا اور اس کا مقبوضہ علاقہ قرطبہ سے ایک دن کی مسافت پر تھا۔ کہیں جا کر عبدالرحمٰن ثالث الناصر نے اسے رندہ میں محصور کر دیا اور آخر وہ اطاعت قبول کرنے پر مجبور ہو گیا اس نے عیسائیوں کے خلاف بھی کام کیا تھا۔

سلطان الپ ارسلان (1029ء-1072ء)

نہایت دلیر، نیک دل اور نڈر حکمران جس نے شہنشاہ قسطنطنیہ کو قید کر لیا تھا

نام ونسب: الپ ارسلان، سلطنت سلجوقیہ کے بانی طغرل کا بھتیجا اور جانشین تھا۔ اس کا شجرہ نسب کچھ یوں ہے، الپ ارسلان محمد بن داؤد بن میکائیل بن سلجوق۔ اپنے چچا کے بعد تخت نشین ہوا۔ بازنطینی سلطنت کے صوبہ آرمینیا پر قبضہ کیا (1064ء) اس کے خلاف جوابی کاروائی کرتے ہوئے شاہ روم بہت بڑی فوج لے کر قسطنطنیہ سے شام پر حملہ آور ہوا اور شہر منبج کو لوٹ کر اور اس کے باشندوں کو تہ تیغ کر کے قحط سالی کے سبب واپس ہوا مگر اگلے سال قیصر نے اٹلی، یونان، روس، جرمنی اور آسٹریا کے ساتھ اتحاد کر کے ایک بڑا لشکر تشکیل دیا اور اس عزم سے دنیائے اسلام کی طرف بڑھا کہ وہ اب دارالسلام بغداد کو فتح کیے بغیر واپس نہیں جائے گا۔ اس مقصد کے لیے اس نے تالیف قلوب، ترغیب وتحریص سے فراہمی فوج میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور اہل یورپ کے حوصلے ہر طرح سے بڑھائے۔ جب یہ ٹڈی دل لشکر اسلامی علاقہ میں داخل ہوا تو سلطان الپ ارسلان عیسائی افواج کی کثرت سن کر حیران رہ گیا اور دشمن کے قریب پہنچ جانے کی وجہ سے اپنی فوجوں کو منظم نہ کر سکا۔ صرف پندرہ ہزار شہسوار لے کر بے شمار عیسائی لشکر کا مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ ملازگرد MANZIKERT کے

مقام پر گھمسان کا رن پڑا۔ قیصر روم، شاہ رومانوس چہارم کو شکست ہوئی اور سلطان نے اسے قید کر لیا۔ اس جنگ سے پہلے قیصر نے انتہائی متکبرانہ انداز میں سلطان کی صلح کی پیشکش ٹھکرا دی تھی۔

سلطان الپ ارسلان کی موت بھی ایک حادثاتی موت تھی۔ سلطان نے اپنے ایک باغی کو دربار میں سزا دینا چاہی تو وہ باغی سلطان پر حملہ آور ہو گیا اور سلطان کو چھری سے وار کر کے زخمی کر دیا۔ سلطان اسی مہلک زخم سے چند روز بعد راہی عدم ہوا (1072ء) مگر سلطان کی بہادری تاریخ عالم میں کبھی بھلائی نہیں جائے گی کہ بہت بڑی یورپی فوج کو صرف چند سو شہسواروں کے ساتھ شکست دینا اس کا عظیم ترین کارنامہ ہے۔

یوسف بن تاشفین (1019ء-1106ء)

اسلامی اندلس کی عمر 400 سال دراز کرنے والا نامور سلطان فاتح

نام و نسب: یوسف بن تاشفین، المرابطون کا طاقتور جرنیل تھا۔ مغرب کے مرابطی لشکر کی کمان اور دوسرے معاملات کا انصرام المرابطی سردار ابوبکر بن عمرؒ نے یوسف بن تاشفین کے سپرد کر دیا تھا۔ ابوبکر یوسف پر اتنا مہربان تھا کہ اس نے اپنی بیوی زینب کو طلاق دے کر اس کے حبالہ عقد میں دے دی تھی۔ یہ خاتون غیر معمولی طور پر باشعور، باہمت اور حسین و جمیل تھی۔ وہ جلد ہی اپنے شوہر یوسف پر حاوی ہو گئی اور نوزائیدہ مرابطی سلطنت پر اس کے بڑے خوشگوار اثرات مرتب ہوئے۔ یوسف بن تاشفین نے المغرب الاقصیٰ میں اپنی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ اُنہی دنوں مسلم اندلس کے ملوک الطوائف خصوصاً امیر اشبیلیہ معتمد بن عباد عیسائی حکمران الفانسو ششم کی دھمکیوں اور اقدامات سے بڑا پریشان تھا۔ اس نے یوسف بن تاشفین کو اپنی مدد کے لیے اندلس آنے کی دعوت دی۔ یوسف بن تاشفین ایک بھاری لشکر لے کر اندلس پہنچ گیا جہاں اس نے زلاقہ کے میدان میں 12 رجب 479ھ/23 اکتوبر 1086ء کو الفانسو ششم کو شکست فاش دی جس سے اندلس پر اسلامی اقتدار کی عمر مزید 400 سال تک بڑھ گئی۔

بعض مورخین کے مطابق اس فتح کے بعد یوسف بن تاشفین نے اپنے لیے امیر المومنین کا لقب اختیار کر لیا تھا۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ مرابطی حکمران امیر المسلمین کہلاتے تھے اور جہاں تک خلافت کے دینی معاملات کا تعلق ہے، وہ بغداد کے عباسی خلیفہ کو امیر المومنین تسلیم کرتے تھے، خلیفہ عباسی نے انہیں خلعت بھی عطا کی تھی۔ اندلس کے ملوک الطوائف جن میں المعتمد بھی شامل تھا یوسف کے خلاف سازشیں کرنے لگے جس پر یوسف نے انہیں ملک بدر کر دیا۔ یوسف بن تاشفین نے 500ھ/1106ء میں وفات پائی۔

اسامہ بن مرشد (488ھ/1095ء-584ھ/1188ء)

صاحب سیف و قلم، ایک بہادر اور جنگ آزمودہ عرب شاہسوار، ادیب و شاعر

نام و نسب: اسامہ بن مرشد بن علی بن مقلد بن نصر بن منقذ الشیرزی، الکنانی، ایک جنگ آزمودہ عرب شاہسوار اور ادیب و شاعر جو 488ھ/1095ء میں بمقام شیزر SIZARA پیدا ہوا۔ یہ جگہ ملک شام میں حماۃ کے شمال میں واقع ہے۔ اس خاندان کا مورث اعلیٰ ایک کنعانی عرب منقذ تھا۔ اسامہ کی پیدائش سے چار برس پہلے صلیبیوں نے یروشلم پر قبضہ کر لیا تھا، لیکن اس کی وفات سے ایک سال پہلے سلطان صلاح الدین ایوبی نے اسے دوبارہ فتح کر لیا۔ عمر بھر فرنگیوں کے ساتھ اس کے تعلقات کبھی دوستانہ اور کبھی معاندانہ رہے۔ پندرہ برس کی عمر میں اُسے شیزر کی حفاظت کے لیے ٹینکرڈ کی فوجوں

سے مقابلہ کرنا پڑا جو براستہ انطا کیہ حملہ آور ہوئی تھیں۔ اپنے والد کی تقلید میں جو ایک مجاہد ہی نہیں بلکہ ایک شکاری بھی اور ایک خطاط بھی تھے۔ اسامہ نے اپنا وقت جہاد بالسیف کے ساتھ ساتھ تحصیل علم وادب پر بھی صرف کیا۔ وہ نو برس تک موصل کے اتا بک زنگی کی فوج میں رہا لیکن اپنے والد کے انتقال کے بعد 531ھ میں اسے شیزر چھوڑنا پڑا۔ کیونکہ اس کا چچا، عزالدولہ ابوالعسا کر شیزر کا حاکم ہوا تو اس کی حربی شہرت کی بنا پر اس سے حسد کرنے لگا۔ چنانچہ اسامہ نے چھ سال دمشق میں بوری حکمرانوں کے پاس گزارے۔ جب حکومت یروشلم سے تعلقات بہتر ہوئے تو اس کی شناسائی فرنگیوں سے بڑھ گئی۔ اس کے بعد وہ دمشق سے مصر چلا گیا مگر دس برس کے بعد اسے مصر بھی چھوڑنا پڑا۔ دمشق میں دوبارہ نورالدین زنگی کے دربار میں اُسے جگہ مل گئی اور اس سلطان کے ساتھ وہ کئی معرکوں میں بھی عیسائیوں کے خلاف لڑا۔ اسامہ نے ایک مجاہد کے ساتھ ساتھ ایک شاعر وادیب کی حیثیت سے بھی شہرت پائی۔ اس کا دیوان دو جلدوں میں ہے۔ اس کی بہت سی دیگر کتب بھی مشہور ہیں۔ اس نے 1188ء میں وفات پائی۔

عبدالمومن بن علی (558ھ/1163ء)

تحریک الموحدین کے قائد مہدی ابن تومرت کا دست راست اور جانشین

نام ونسب: عبدالمؤمن بن علی بن علوی بن یعلی الکومی ابومحمد، توحید کی اصلاحی تحریک، یعنی تحریک الموحدین کے قائد مہدی بن تومرت کا جانشین اور خاندان بنومؤمن کا بانی، جس نے المغرب میں چھٹی صدی ہجری نے افریقیہ، مراکش اور اندلس میں المرابطون کی جگہ لی۔

عبدالمؤمن ایک مستعرب بربر قبیلے کا جس کا نام کومیہ تھا، ایک معمولی طالب علم تھا۔ اس نے ابن تومرت کے آل نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کے دعوے پر غور خوض کر کے افریقی شہر بجایہ کے نواح میں واقع ملالہ میں ابن تومرت سے ملا جو اس وقت فقیہ سوسہ کہلاتا تھا۔ ابن تومرت نے اسے اپنے مریدوں میں شامل ہونے پر آمادہ کرلیا۔ اس دن سے لے کر مہدی کی وفات تک عبدالمؤمن نے اپنے پیر و مرشد کی حمایت میں حد درجہ سرگرمی دکھائی۔ وہ اس جماعت کی جملہ عسکری مہمات میں شامل ہوا اور الموحدون کی عسکری کونسل میں اسے بڑا دخل حاصل ہوگیا۔

حکمران کی حیثیت سے عبدالمومن کی زندگی کا اہم دور اس وقت شروع ہوا جب 1133ء میں اس کی جانشینی کا اعلان کیا گیا۔ جانشینی کے بعد پہلا مرحلہ یہ تھا کہ مراکش کی ساری سرزمین کو الموحدون کے لیے حاصل کیا جائے۔ فتوحات کا یہ سلسلہ طویل اور دشوار ثابت ہوا۔ مراکش کا صدر مقام، فاس 540ھ/1146ء میں نو ماہ کے طویل محاصرے کے بعد فتح ہوا اس کے بعد مکناسہ اور سلا کی باری تھی۔ وہ وہ علاقہ جسے افریقیہ کہتے ہیں آٹھ سال کی جدوجہد کے بعد فتح ہوا۔ جزیرہ نما اندلس میں الموحدون کے قدم تلمسان کی فتح کے بعد جمنا شروع ہوگئے۔ اندلس کے حالات اس عہد میں ایسے تھے کہ عبدالمؤمن کو آبنائے جبل الطارق کو عبور کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ 1162ء میں وہ واپس مراکش آیا اور دوبارہ اندلس لشکر کشی کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ اس نے ایک طویل اور تکلیف دہ علالت کے بعد 558ھ/1163ء میں وفات پائی۔

عمادالدین زنگی (521ھ/1127ء-541ھ/1146ء)

موصل کا اتابک اور سلجوقی دور کا ایک ممتاز والی

نام ونسب: عمادالدین بن قاسم الدولہ آق سنقر بن عبداللہ، موصل کا اتابک اور اسلجوقی دور کا ایک ممتاز ترین

امیر۔ اس کا باپ سنقر الحاجب سلطان ملک شاہ کی ملازمت میں ایک ترکی غلام تھا، جسے ملک شاہ نے حلب کا شہر بطور جاگیر عطا کیا تھا، لیکن جب ملک شاہ کی وفات پر آق سنقر نے اس کے بھائی تتلش کے خلاف بغاوت کی تو اسے قید کر کے 1094ء میں قتل کروا دیا گیا۔ اور زنگی سے جس کی عمر صرف دس سال تھی اس کے والد کی جاگیر چھین لی گئی۔ موصل کے بعد کے حاکموں کے دربار میں زنگی نے کئی بار امتیاز حاصل کیا اور اس کے سلسلے میں اسے واسط کا حاکم بنا دیا گیا۔ ادھر اس کا حامی امیر آق سنقر البرسقی موصل کا حکمران بنا دیا گیا مگر اسے ملاحدہ نے خنجر سے ہلاک کر دیا۔ تو اس کا ایک نابالغ بیٹا اس کی جگہ موصل کی حکومت کا دعوے دار ہوا مگر زنگی کو موصل کا اتابک مقرر کر دیا گیا۔ سلطان محمود سلجوقی نے اپنے دو بیٹوں کو تعلیم کے لیے اس کے سپرد کیا اور اسے اتابک کا خطاب دیا۔ زنگی نے اپنے عقلمندی سے اپنا اقتدار دوسرے علاقوں پر بھی قائم کر لیا۔

1137ء میں حمص کا کئی ماہ کا بیکار محاصرہ کرنے کے بعد زنگی نے قلعہ بحرین پر حملہ کیا۔ مسیحی سپہ سالار نے یروشلم کے شاہ فلک FULK سے امداد طلب کی لیکن خود فلک کو بھی ہزیمت ہوئی اور اہل شہر نے اطاعت اختیار کر لی۔ پھر اچانک ایک نیا دشمن شہنشاہ قسطنطنیہ یوحنا ثانی زنگی کے خلاف میدان میں کود پڑا مگر زنگی نے بہادری سے مدافعت کی تو شہنشاہ انطاکیہ واپس لوٹ گیا۔ زنگی نے اس کا تعاقب کر کے اس کے بہت سے سپاہی قید کر لیے اور بہت سا مال غنیمت بھی حاصل کیا۔ اسی سال دمشق کے حاکم نے حمص کا شہر بھی زنگی کے حوالے کر دیا، لیکن زنگی تو خود دمشق پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ 1139ء میں اس نے دمشق کا محاصرہ کر لیا۔ بہت سی فتوحات حاصل کرنے کے بعد زنگی کو بعض مملوکوں نے قتل کر دیا۔

جلال الدین خوارزم شاہ (628ھ/1231ء)

سلطان محمد خوارزم شاہ کا بڑا بیٹا اور چنگیز خان کا مدمقابل

نام ونسب: جلال الدین بن محمد خوارزم شاہ، محمد خوارزم شاہ کا سب سے بڑا بیٹا اور اس خاندان کا آخری حکمران۔ اس کا ذاتی نام منکبرتی تھا۔ سلطان محمد خوارزم شاہ نے دراصل اپنے سب سے چھوٹے بیٹے قطب الدین ازلغ شاہ کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ لیکن اس کے جلد وفات پا جانے کی وجہ سے اپنی وصیت جلال الدین کے حق میں بدل ڈالی۔ تاتاری حملہ خوارزم کے بعد جلال الدین نے دارالحکومت چھوڑ کر افغانستان کی راہ لی۔ تاتاریوں نے خراسان کی سرحد کے ساتھ ساتھ نگہبانی کرنے والے دستے متعین کر دیئے تھے، لیکن جلال الدین اس گھیرے کو نہایت بہادری سے توڑ کر نکل جانے اور غزنہ پہنچ جانے میں کامیاب ہو گیا۔ جہاں ساٹھ ہزار ترکوں اور خوارزمیوں پر مشتمل ایک لشکر اس کی قیادت کا منتظر تھا۔ چری کار کے شمال مشرق میں پروان کے مقام پر اس نے ایک تاتاری لشکر کو شکست دے کر یہ ثابت کر دیا کہ تاتاری ناقابل شکست نہیں ہیں۔ مگر تاتاریوں سے مقابلہ کرنا آسان نہیں تھا اور خود چنگیز خاں اپنی فوج کی کمان کرتا ہوا جلال الدین اور اس کی فوج کا تعاقب کرتا رہا، ایک شکست کے بعد جب تقریباً نصف فوج اس کی ساتھ چھوڑ گئی تو چنگیز خاں نے اسے دریائے سندھ کے کنارے جا لیا۔ جلال الدین نے مردانہ وار مقابلے کے بعد اپنے گھوڑے کو دریا میں ڈال دیا اور اس طرح بچ کر نکل گیا، کوہستان نمک کے ایک چھوٹے سے راجہ کو شکست دینے کے بعد جلال الدین سندھ کے حکمران ناصر الدین قباچہ کے خلاف نبرد آزما ہوا پھر ہندوستان میں تین سالہ قیام کے بعد اس نے عراق عجم جانے کا فیصلہ کیا۔

تاتاری بھی قدم قدم پر سائے کی طرح اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ گیارہ سال تک انتہائی بہادری سے وہ تاتاریوں کے خلاف نبرد آزما رہا۔ ایک رات تاتاریوں نے اس کے پڑاؤ واقع میافارقین پر شب خون مارا۔ وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا مگر اسے کسی نے راہ میں قتل کر دیا۔

ارطغرل (م680ھ/1281ء)

ترکی کے عثمانی خاندان اور سلطنت عثمانیہ کے بانی عثمان اول کا باپ

نام ونسب: ارطغرل بن سلیمان بن شاہ، ترکی شاہی خاندان اور سلطنت عثمانیہ کے بانی عثمان اول کا والد۔ قدیم ترین روایت کے مطابق، جو عاشق پاشازادہ کی تصنیف کے مطابق اس نے خانہ بدوش ترکمان گھرانون کے ساتھ ایشیائے کوچک کی طرف نقل مکانی کی تھی۔ ایشیائے کوچک میں سلطان علاؤ الدین سلجوقی نے اسے قرہ جہ حصار اور بیلہ جک BILEDJIK کے درمیان سوگود SOGUD کا ضلع بطور چراگاہ عطا کیا تھا۔ قرہ جہ حصار اور بیلہ جک اس وقت تک بازنطینیوں کے قبضے میں تھے، لیکن وہ علاؤ الدین کو خراج ادا کرتے تھے۔ ارطغرل نے اپنی ذاتی بہادری کی بنیاد پر علاؤ الدین سلجوقی کی طرف قرہ جہ اور بیلہ جک فتح کیے اور وہ برابر تاتاریوں سے بھی سلطان علاؤ الدین کی مملکت کے دفاع کے لیے لڑتا رہا۔ وہ سلطان علاؤ الدین کیقباد ثانی کے عہد تک زندہ رہا۔ اس نے بعمر 90 سال680ھ/ 1281ء میں وفات پائی۔

اس کی زندگی کے بارے میں جو روایات محققین نے قابل وثوق سمجھی ہیں وہ یہ ہیں کہ ارطغرل اپنے ترکمان قبیلے کے ہمراہ سوگود میں قونیہ کے سلجوق سلطان کے سرحدی گورنر یا امیر کی حیثیت سے متمکن ہوا، نیز یہ کہ وہ تاتاریوں کے خلاف اپنے آقا کے ساتھ جنگوں میں شریک رہا اور کبھی کبھی اس کی طرف سے بازنطینی علاقوں پر بھی تاخت کرتا رہا۔

اورنوس غازی (م820ھ/1417ء)

ایک ترک بہادر، جانباز اور سپہ سالار

نام ونسب: غازی اورنوس کا نام تاریخ میں اس وقت سامنے آیا جب قرہ سی کی امارت پر ترکوں نے قبضہ کیا (1335ء)۔ سلطان اورخان نے یہ امارت اپنے سب سے بڑے بیٹے سلیمان پاشا کو عطا کیا، جس کی ملازمت میں دیگر ترک امراء کے ساتھ غازی اورنوس بھی تھا۔ مورخین نے غازی اورنوس کے والد کا نام عیسیٰ بیگ بتایا ہے۔ جو آگے چل کر ''پرگی'' کے نام سے اس لیے موسوم ہوا کہ اس کی وفات اسی نام کے گاؤں میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد کئی مہمات میں اورنوس کی شمولیت کا سراغ ملتا ہے۔ مثلاً جب گیلی پولی کے قریب قلعہ قونیر حصاری میں حاضری ایل بگی کے ساتھ اس کا تقرر ہوا تو اس نے دیموتقہ DIMETOKA کے علاقے پر حملے کیے اور کیشان کو تسخیر کیا اور ایپصالہ کو تاراج کر کے ذاتی طور پر بڑا نام پیدا کیا۔ اورخاں کی وفات کے بعد اورنوس نے حاجی ایل بگی کے ساتھ مل کر اس معرکے میں حصہ لیا جس میں مراداول نے ادرنہ پر قبضہ کیا تھا۔ اس کے بعد مراداول نے اسے فوراً شہر ایپصالہ اور کوملجنہ جو تراکیا THRAEE میں واقع ہے قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا اور وہ مفتوحہ علاقوں کا اُج بیگی مقرر ہوا۔

وہ سیرپ صیندغی SIRP-SINDIGHI کی لڑائی میں بھی موجود تھا۔ پھر 1371ء میں جنگ چرنومن میں بھی شریک رہا جو اہل سربیا اور ان کے حلیفوں کے لیے بڑی تباہ کن ثابت ہوئی اور اس سے ترکوں کے لیے فتح مقدونیہ کی راہ ہموار ہوگئی۔ 1372ء میں اورنوس کو فرجک فتح کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ اس نے اس مہم میں بہت سے علاقے فتح کیے۔ سلطان نے انعام کے طور پر اسے سیرس کا اُج بیگی مقرر کیا۔ اس کے بعد بھی وہ مختلف معرکوں میں شریک رہا اور آل عثمان کے جنگجو اشراف کے چار خاندانوں میں اس کا خاندان بھی شامل تھا۔

احمد پاشا خائن (م نواح 931ھ/ 1524ء)

عثمانی سلطان سلیمان قانونی کا وزیر اور سپہ سالار اعلیٰ

نام ونسب: احمد پاشا خائن، وزیر دولت عثمانیہ، اصلاً گرجستانی تھا۔ احمد پہلے پہل سلیم اول کے محل میں ایچ اوغلانی کی حیثیت سے داخل ہوا۔ بعدازاں اسے فوج میں امیر آخور مقرر کیا گیا اور اس نے 1517ء میں مملوکوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ وہ 1519ء میں رومیلی کا بیگلر بیگی مقرر ہو گیا۔ سلیمان اول نے بلغراد پر جو حملہ کیا اس میں احمد کی تجویز منظور کی گئی چنانچہ اس نے بوغوردلن کو تسخیر کر لیا (1521ء) اور سیرمیہ SYRMIA پر حملہ کر دیا۔ بلغراد کے محاصرے میں حسن خدمات کے صلے میں سلطان نے اسے وزیر دیوان مقرر کر دیا۔ روڈس کی مہم میں وہ سپہ سالار کی حیثیت سے روڈس کے ساحل پر اترا اور اس نے بڑی کامیابی سے اس شہر کا محاصرہ کیا۔ اس کے بعد اس نے سینٹ جان کے سورماؤں (KNIGHTS) سے قلعہ حوالے کر دینے کی شرطیں طے کیں (21 دسمبر 1522ء) صدر اعظم پیری محمد شاہ کی معزولی میں احمد پاشا کا ہاتھ تھا اور اسے امید تھی کہ اسے صدر اعظم مقرر کر دیا جائے گا مگر آئین کی رو سے یہ عہدہ ابراہیم کو مل گیا۔ اس فیصلے سے مایوس ہو کر اس نے سلطان سے درخواست کی کہ اسے مصر کا گورنر مقرر کر دیا جائے۔ اس نے مصر جا کر مملوکوں کی بغاوت کو فرد کیا مگر سلطان ابراہیم کے زیر اثر تھا اس لیے اس نے قرہ موسیٰ کو گورنر مصر مقرر کیا اور اسے حکم دیا کہ وہ احمد کو قتل کر دے۔ جب احمد کو یہ معلوم ہوا تو اس نے مصر کے خود مختار سلطان ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ اس نے نے بیرونی مسیحی طاقتوں سے ترکوں کے خلاف مدد مانگی۔ سلطان سلیمان نے الیاس پاشا کی قیادت میں ایک لشکر اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ اس پر حمام میں قاتلانہ حملہ ہوا مگر اس نے بچ کر قبیلہ بنو بکر کے بدویوں کے پاس پناہ لی مگر انہوں نے اسے سلطان کے حوالے کر دیا۔

احمد پاشا بونیوال (م 1160ھ/ 1747ء)

ایک نومسلم ہسپانوی اور بعدازاں ترکیہ کا سپہ سالار فوج

نام ونسب: وہ پہلے ہسپانوی کاؤنٹ تھا اس کا نام کلاڈ الیگزنڈر کونٹ ڈی بونیوال تھا۔ 1704ء میں جب اسپین میں جنگ تخت نشینی کا آغاز ہوا تو اس نے فرانسیسی فوج میں بہت نمایاں خدمات انجام دیں، لیکن اسی دوران اسے خیال گزرا کہ اس کی ہتک کی گئی ہے۔ چنانچہ وہ یہ تعلق ختم کر کے فریق ثانی سے جا ملا اور تھوڑے ہی دنوں میں ایک سپہ سالار کی حیثیت سے پورے یورپ میں مشہور ہو گیا۔ اس نے سیوائے کے شہزادے یوجین کے ماتحت اپنے ہی ہم وطنوں کے خلف متواتر کئی معرکوں میں شرکت کی۔ پیٹر واردین PETER WADEIN کے معرکے (1716ء) میں وہ زخمی ہوا اور اس سے اگلے سال وہ بلغراد کے محاصرے میں شریک تھا۔ آخر میں وہ شہزادہ یوجین سے بھی ناراض ہو گیا اور کوئی ایک سال قید رہنے کے بعد وہ وینس بھاگ آیا جہاں اس نے کوشش کی کہ آسٹریا کی مخالف طاقتوں میں سے کوئی اسے ملازم رکھ لے مگر ناکام رہا، اب اس نے اپنی خدمات ترکی سلطان احمد ثالث کو پیش کر دیں اور 1729ء رغوسہ کے راستے سفر کر کے وہ بوسنہ سرائے پہنچا جہاں اس نے اسلام قبول کیا۔ اور اپنا نام احمد رکھا۔ محمود اول کی تخت نشینی کے بعد وہ پہلے تو گومولجن واقع تھریس میں مقیم رہا۔ جہاں اسے روزینہ ملتا تھا۔ پھر ستمبر 1731ء میں اسے وزیر اعظم طوپال عثمان پاشا نے طلب کیا تاکہ ترکی افواج کی تربیت یورپی طرز پر کی جا سکے۔ عثمان پاشا کے جانشین حکیم اوغلو پاشا نے اس سے پولینڈ کے مسئلہ تخت نشینی کے سلسلہ میں مشورہ کیا کہ باب عالی کی اس معاملے میں حکمت عملی کیا ہونی چاہیے۔ جنوری 1735ء اس کے عہدے میں ترقی ہوئی مگر بعدازاں وہ زوال کا شکار ہو گیا اور اسے سپہ سالاری سے برطرف کر دیا مگر پھر بحال کر دیا گیا۔ اس نے 1747ء میں وفات پائی۔

محمد علی پاشا (1769ء-1849ء)

مصر کا مشہور حکمران اور نائب السلطنت جس سے ترکی کے حکمران خائف تھے

نام ونسب: محمد علی پاشا کا تعلق البانوی نسل سے تھا۔ وہ 1769ء میں مقدونیہ کے شہر قوالہ میں پیدا ہوا۔ وہ پہلے تمباکو کی تجارت کیا کرتا تھا پھر ایک بک باشی کے طور پر وہ اس البانوی فوج میں بھرتی ہو گیا جو 1792ء میں ترکوں کے ساتھ مصر میں اتری اور جسے ابقوبیر کے مقام پر نپولین بونا پارٹ نے شکست دی تھی۔ 25 جولائی 1800ء میں اسے مصر میں ایک بااثر فوجی عہدہ حاصل ہوا اور پھر صرف ایک سال بعد ہی وہ جنرل کی حیثیت سے مملوکوں کے خلاف لڑا۔ خورشید پاشا کی گورنری کے دور میں محمد علی قاہرہ کے باشندوں اور وہاں کے روحانی پیشواؤں میں مقبول ہوا اور انہیں بڑی کامیابی کے ساتھ خود خورشید پاشا کے خلاف اپنی سازشوں میں استعمال کرنے لگا۔ 1903ء میں خورشید پاشا کو مصر سے جانا پڑا جس کے بعد قاہرہ کا قلعہ محمد علی کے قبضے میں آ گیا اور حکومت ترکی مصر پر اپنا ضبط قائم نہ رکھ سکی۔ جس کے بعد اسے محمد علی کے خود اختیار کردہ (نومبر 1805ء مصر کے حاکم الاعلیٰ کے مرتبے کو تسلیم کرنا پڑا۔ باب عالی کو اندرونی اور بیرونی مشکلات نے اتنی فرصت نہ دی کہ وہ محمد علی کے خلاف کوئی کارروائی کرے اور محمد علی بلاشرکت غیرے 1805ء سے 1849ء تک مصر پر حکومت کرتا رہا۔ محمد علی نے قاہرہ کو مستحکم کیا اور انگریزوں کو بھی رشید کے مقام پر شکست دی۔ انگریزی بحری بیڑے کے چلے جانے کے بعد محمد علی نے مصر میں انتظامی وانصرامی اقدامات شروع کر دیئے جن کی بدولت مصر کی اقتصادی حالت بہتر ہوئی، 1818ء میں حجاز پر وہابی قبضے کے بعد سلطان ترکی اسے اس فتنے پر قابو پانے کا کہا تو اس نے نجد وحجاز پر قبضہ کر لیا۔ انہیں دنوں یونان میں ترکوں کے خلاف بغاوت ہوئی تو محمد علی نے اس بغاوت کو بھی فرو کر دیا مگر بعد ازاں سلطان محمود ثانی سے اس کے اختلافات ہو گئے اور 1831ء میں اس نے بغاوت کر دی، مگر مصر کے لیے وہ ایک بہترین حکمران ثابت ہوا۔

عبدالکریم ریف غازی (1880ء-1963ء)

مراکش پر ہسپانوی انتداب کے خلاف لڑی جانے والی مراکش کی جنگ آزادی کا راہنما

نام ونسب: عبدالکریم، ریف غازی، مراکش کی جنگ آزادی کے راہنما اور بربر قبیلہ کے سردار تھے۔ 1912ء میں رفانس نے جب مراکش پر قبضہ کر کے اسے اپنی زیر حفاظتی ریاست بنانے کا اعلان کیا تو اس کے ایک حصے پر فرانسیسی اور دوسرے حصے پر ہسپانوی قابض ہو گئے۔ اپنے ملک کی آزادی کے لیے اہل مراکش نے امیر عبدالکریم کی قیادت میں ہسپانوی ناجائز قبضے کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ 1921ء میں ہسپانوی جنرل سلاسٹر کی 2 لاکھ باقاعدہ تربیت یافتہ فوج اور امیر عبدالکریم کے صرف دس ہزار ریفی مجاہدین کے درمیان ملیلہ کے قریب پہلا معرکہ لڑا گیا جس میں اسلحہ کی زیادتی اور فوج کی زیادہ تعداد کے باوجود اسپین کو شکست ہوئی۔ چنانچہ امیر عبدالکریم نے مراکش کے علاقے ریف میں ایک آزاد جمہوری ریاست قائم کر لی۔ فرانس اور ہسپانیہ دونوں نے مشترکہ طور پر امیر عبدالکریم اور ان کے مجاہدوں کے خلاف محاذ قائم کر کے ریف پر حملہ کر دیا۔ ادھر ان دونوں مغربی طاقتوں نے اقوام میں پھوٹ ڈالنے والی اپنی پرانی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے ریف کے بعض قبائلی شیوخ کو رشوت دے کر انہیں امیر عبدالکریم کے خلاف اکسایا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 26 مئی 1926ء کو انہوں نے فرانسیسیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ حکومت فرانس نے امیر عبدالکریم کو بحر ہند کے ایک جزیرے میں نظر بند کر دیا جہاں سے جنگ عظیم دوم کے آغاز میں فرانسیسی حکومت نے انکو واپس لانے کا فیصلہ کیا، لیکن سویز کی بندرگاہ پر ان کے جہاز کے لنگر انداز ہوتے ہی انہوں نے مصر میں سیاسی پناہ لے لی اور وہیں 1963ء میں انتقال کیا۔ اگر مغربی عیار اپنی روایتی سیاست سے کام نہ لیتے تو امیر عبدالکریم ریف کی جمہوریہ کو ضرور آزاد رکھنے میں کامیاب ہو جاتے۔

آئمہ اثنا عشریہ

حضرت علی کرم اللہ وجہہ	دیکھیے خلفائے راشدین
حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ	دیکھیے ''عظیم قائدین''
حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ	دیکھیے ''عظیم قائدین''
حضرت امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ	دیکھیے ''تابعین و تبع تابعین''
حضرت امام باقر رحمۃ اللہ علیہ (م114ھ/732ء)	
حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ	حضرت امام موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ
حضرت امام علی رضا رحمۃ اللہ علیہ	حضرت امام تقی رحمۃ اللہ علیہ
حضرت امام النقی رحمۃ اللہ علیہ	حضرت امام حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ
حضرت امام مہدی رحمۃ اللہ علیہ	

حضرت امام محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ (م114ھ/732ء)

امام حسین رضی اللہ عنہ کے پوتے، مشہور عالم، محدث اور محقق، اثنا عشریہ کے پانچویں امام

نام و نسب عالی: محمد بن علی بن حسین بن علی رضی اللہ عنہ، آپ کی کنیت ابوجعفر اور آپ کے القاب کثیر تھے جن میں باقر، شاکر اور ہادی زیادہ معروف ہیں۔

ولادت باسعادت: حضرت امام محمد باقر یکم رجب 57ھ کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ آپ مختون، ناف بریدہ اور تمام آلائشوں سے پاک متولد ہوئے۔

واقعہ کربلا: آپ رحمۃ اللہ علیہ کی عمر ابھی اڑھائی سال کی تھی کی تھی کہ آپ کو اپنے عظیم المرتبت دادا، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ وطن عزیز مدینہ منورہ چھوڑ کر خارزار کربلا کا سفر کرنا پڑا۔ آپ واقعہ کربلا کے مصائب کے امین بھی تھے اور کوفہ و شام کے درباروں کا حال بھی آپ نے دیکھا۔ ایک سال شام میں قید رہے پھر 62ھ میں مدینہ منورہ واپس آئے۔ جب آپ کی عمر چار برس کی تھی تو ایک دن آپ ایک کنوئیں میں گر گئے مگر کنوئیں سے نکلنے پر نہ آپ کے جسم مبارک کو پانی نے چھوا تھا اور نہ ہی آپ کا لباس ہی بھیگا تھا۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن جب حضرت امام حسین رضی اللہ

عنہ کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی خاص حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جابر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اے جابر! میرے اس فرزند کی نسل سے ایک بچہ پیدا ہوگا جو علم وحکمت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا ہوگا۔ اے جابر تم اس کا زمانہ پاؤ گے، جب اس سے ملنا تو اسے میرا سلام کہہ دینا۔ اسی وقت سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اس پرمسرت ساعت کا انتظار شروع کردیا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق اس بچہ سے ملاقات ہوگی۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی بینائی جاتی رہی مگر انتظار باقی تھا پھر وہ مبارک لمحہ آپہنچا۔ راوی کا بیان ہے کہ ہم حضرت جابر کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں امام زین العابدین رضی اللہ عنہ تشریف لائے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ آپ کے فرزند امام محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔ امام زین العابدین نے اپنے فرزند کو فرمایا کہ چچا جابر بن عبداللہ انصاری کے سر کو بوسہ دو۔ انہوں نے جب تعمیل ارشاد کی تو حضرت جابر نے ان کو سینہ سے لگایا اور کہا کہ ابن رسول اللہ آپ کو آپ کے جد نامدار، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام فرمایا ہے۔ امام صاحب نے فرمایا اے جابر ان (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اور آپ پر بھی سلام ہو۔

حضرت امام باقر کے مشورے پر اسلامی سکہ کا اجراء: عبدالملک بن مروان نے 75ھ میں امام محمد باقر علیہ السلام کے صلاح مشورے پر اولین اسلامی سکہ کا اجرا کیا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ قیصر روم نے خلیفہ عبدالملک کو دھمکی دی تھی کہ اگر تم نے درہم ودینار پر رومی ٹریڈ مارک کو اپنے ملک میں رائج نہ رہنے دیا تو میں تمہارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کر کے اور درہم ودینار پر نقش کرا کے تمام ممالک اسلامیہ میں رائج کر دوں گا" عبدالملک کو پریشانی لاحق ہوئی تو اس نے دیگر علما وفضلا سے اس بارے میں مشاورت کی تو اس کے وزیر ابن زنباع نے کہا کہ اے خلیفہ تو بہتر جانتا ہے کہ ایسے موقع پر اسلام کی مشکل کشائی کون کرسکتا ہے؟ خلیفہ نے اسے کہا کہ خدا تمہیں سمجھے آخر بتاؤ تو سہی کہ وہ کون ہے؟ وزیر نے کہا حضور! میں فرزند رسول صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت امام باقر رحمۃ اللہ علیہ کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ عبدالملک نے "قال صدقت" کہہ کر اس کی تصدیق کی اور امام صاحب کو بلا بھیجا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ سب نے خلیفہ کو مشورہ دیا کہ اسلامی سکہ کا اجرا کرے۔

لیکن عبدالملک کا بیٹا ولید بن عبدالملک جب برسر اقتدار آیا تو حالات بدل گئے اور بنوامیہ ایک بار پھر دشمنانہ روش پر آ گئے۔

علمی حیثیت: امام محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ کی علمی حیثیت بہت بلند ہے اور اس کا احاطہ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ آپ علم و زہد وشرف میں ساری دنیا پر فوقیت رکھتے تھے۔ آپ علم القرآن، علم حدیث، علم الآثار، علم السنن میں اپنے عہد کے تمام علما میں یکتا تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق "باقر العلوم" تھے۔ آپ امام ابوحنیفہ کے اساتذہ کرام میں سے تھے اور آپ سے اور آپ کے صاحبزادے امام جعفر صادق سے امام ابوحنیفہ نے اکتساب فیض کیا تھا۔ خلفائے بنوامیہ میں سے ہشام بن عبدالملک کو آپ سے عداوت تھی۔ مورخین کے مطابق اسی نے آپ کو زہر دلوا کر شہید کروایا تھا۔ آپ نے 7 ذوالحجہ 114ھ/732ء کو انتقال فرمایا۔

حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ (83ھ/702ء-148ھ/765ء)

شیعہ اماموں میں سے چھٹے امام اور مشہور عالم دین اور بزرگ

نام ونسب عالی: آپ کا اسم گرامی جعفر اور آپ کی کنیت ابوعبداللہ ابواسماعیل اور آپ کے القاب، صادق، صابر اور فاضل تھے۔ آپ بڑے ثقہ، فقیہہ اور حافظ تھے، امام مالک اور امام ابوحنیفہ کے شیخ (حدیث) تھے۔ امام سفیان ثوری،

سفیان بن عینیہ، امام ابوحنیفہ، ایوب بجستانی آپ کے تلامذہ میں سے تھے۔

ولادت باسعادت: آپ کی ولادت 83ھ میں ہوئی اس وقت عبدالملک بن مروان خلیفہ وقت تھا۔آپ نے کل آٹھ خلفائے بنوامیہ کا زمانہ پایا۔آپ نے عباسی خلیفہ المنصور کے عہد میں وفات پائی کہتے ہیں اسی کے ایما پر آپ کو زہر دیا گیا تھا۔امام صاحب چودہ سال اپنے دادا امام زین العابدین اور چونتیس سال اپنے والد امام محمد باقر اور ستائیس سال حضرت قاسم (107ھ/725ء) اپنے نانا کے سایہ تربیت میں رہے۔اس طرح انہیں ان تینوں سرچشمہ فیضان سے سیراب ہونے کا موقع ملا۔جس وقت حضرت جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے مدینہ منورہ تجلی علم وعرفان سے بقعہ نور بنا ہوا تھا۔بلاد اسلامیہ سے علما وفضلاء اس آستانے پر کسب علم وفیض کے لیے آتے تھے۔اکابر تابعین حدیث روایت کرتے تھے۔امام صاحب سن رشد کو پہنچتے ہی اس مرتبہ عالی پر فائز ہوئے کہ چہار سو سے علما وفضلاء ان کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اکتساب علم کرتے تھے۔لوگ آپ کی امامت وجلالت اور عظمت وسیادت کو تسلیم کرتے تھے۔علم حدیث کے علاوہ امامیہ کے نزدیک فقہ میں بھی امام جعفر صادق کا پایہ بہت بلند ہے۔وہ صاحب منہاج اور مجتہد ہیں۔علم کیمیا، طب، فال اور جفر وغیرہ کے علوم بھی آپ کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔امام جعفر کی طرف کچھ اشعار اور بہت سی کتابیں بھی منسوب کی جاتی ہیں جن کی تعداد پانچ سو تک پہنچ جاتی ہے۔مشہور کیمیادان جابر بن حیان مورخین کے مطابق ان کے شاگرد تھے۔

امام جعفر صادق اپنی پوری زندگی سیاست میں حصہ لینے مجتنب رہے آپ نے اپنی تمام تر صلاحیتیں علم کی نشر و اشاعت اور نیکی وتقویٰ کے پھیلانے میں صرف کردیں۔اور اپنا سارا وقت عبادت اور خدمت خلق میں لگا دیا۔امام موصوف حکام وقت سے الجھنا بھی پسند نہیں فرماتے تھے۔عباسی خلیفہ منصور کا گمان یہ تھا کہ امام جعفر صادق عباسیوں کے خلافت سے خوش نہیں۔بایں ہمہ امام موصوف نے کبھی کسی سے امر خلافت میں کوئی تنازعہ نہیں کیا (الملل والنحل)

فرض یہ کہ امام جعفر صادق سیاست سے دور ہی رہے۔اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ بعد میں لوگوں نے ان کی طرف سے ایسے بہت سے اقوال وملفوظات بلکہ تحریریں تک منسوب کردیں جو ان کی شان سے مطابقت نہیں رکھتیں۔امام جعفر صادق نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ مدینہ منورہ میں بسر کیا، گو عباسیوں کے طلب واصرار پر انہیں بعض دفعہ سرکاری بدگمانیوں کے ہجوم میں عراق جانا پڑا اور بعض دفعہ وہاں قیام بھی خاصا طویل رہا، تاہم عراق میں آپ نے مستقل سکونت اختیار نہیں کی۔آپ کی وفات مدینہ منورہ ہی میں 148ھ/765ء میں ہوئی۔انہیں جنت البقیع میں اس روضہ میں دفن کیا گیا جس میں ان کے والد امام محمد باقر، دادا امام زین العابدین اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ مدفون تھے۔

بیسویں صدی میں امام حسن رضی اللہ عنہ کا یہ مقبرہ جنت البقیع کے دیگر مقدس مقابر کے ساتھ سعودی حکومت نے 1926ء میں مسمار کردیا تھا۔اثناعشریہ کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ آپ کی وفات کا سبب زہر خورانی تھا جو خلیفہ المنصور کے عہد میں انگور کے دانے میں دیا گیا تھا۔خلیفہ المنصور نے ایک مرتبہ آپ کو اپنے دربار میں طلب کیا اور بابل سے جادوگروں کا ایک گروہ بھی بلایا جنہوں نے مصنوعی شیر تیار کیے۔جب آپ وہاں پہنچے تو آپ کو غصہ آگیا۔آپ نے ان شیروں کو حکم دیا کہ اپنے بنانے والوں کو نگل لیں ان شیروں نے آپ کے حکم کی تعمیل میں ان کو نگل لیا۔

حضرت امام موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ (128ھ/745ء-183ھ/796ء)

اثناعشریہ کے ساتویں امام اور اپنے وقت کے نامور عالم وفاضل بزرگ

نام ونسب عالی: امام موسیٰ الکاظم بن امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ بن امام باقر بن امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ

بن امام حسین رضی اللہ عنہ بن حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب بن عبدالمطلب بن ہاشم، آپ کی کنیت ابوالحسن، ابوابراہیم، ابوعلی اور ابوعبداللہ تھی، آپ کے القاب کاظم، عبد صالح، نفس ذکیہ، صابر تھے۔ شہرت عامہ کاظم ہے۔

پیدائش: حضرت امام موسیٰ الکاظم 7 صفر المظفر ف 128ھ بمطابق 10 نومبر 745ء کو مقام ابواء میں جو مکہ اور مدینہ کے درمیان ہے پیدا ہوئے مگر مدینہ منورہ میں قیام تھا۔ عباسی خلفا کا زمانہ پایا۔ 158ھ میں خلیفہ مہدی متمکن مسند خلافت ہوا۔ شروع میں آل محمد کے ساتھ اس کا سلوک معتدل تھا، لیکن یہ اعتدال زیادہ عرصہ قائم نہ رہا۔ سادات عالیہ میں سے اس نے حضرت امام موسیٰ کاظم کو مدینہ سے بغداد طلب کیا۔ اسی طلبی کا مقصد آپ کو قتل کروانا تھا۔ بغداد پہنچتے ہی آپ کو قید کر دیا گیا۔ ایک رات خلیفہ مہدی نے خواب میں امیر المومنین حضرت علی کو دیکھا۔ آپ مہدی کو فرما رہے تھے "فھل عسیتم ان تولیتم ان تفسدوا فی الارض......

ترجمہ اگر تم حاکم بن جاؤ تو قریب ہو اس امر کے کہ زمین میں فساد کرنے لگو اور رشتوں کو منقطع کر دو۔"

خلیفہ مہدی نے خواب سے بیدار ہوتے ہی اپنے وزیر ربیع کو طلب کیا اسے خلیفہ پہلے حضرت امام موسیٰ کاظم کے قتل کا حکم دے چکا تھا۔ آدھی رات کو اپنی طلبی پر ربیع ڈر گیا مگر مہدی نے اسے حضرت موسیٰ کاظم کو بلانے کا حکم دیا۔ جب امام وہاں پہنچے تو مہدی نے معانقہ کے بعد انہیں بتایا کہ امیر المومنین نے انہیں یہ آیت سنائی ہے۔ کیا آپ مجھ کو یقین دلا سکتے ہیں کہ آپ یا آپ کی کوئی اولاد خلافت عباسیہ کے خلاف خروج نہ کرے گی۔ امام صاحب نے فرمایا کہ "ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔" اس پر مہدی نے انہیں مدینہ منورہ بھیجنے کا حکم دیا مگر عباسیوں کے تشدد کا یہ سلسلہ یہیں ختم نہ ہوا بلکہ 173ھ میں جب ہارون الرشید حج کر کے واپس آنے لگا تو امام صاحب کو ساتھ لے آیا اور ایک بار پھر قید میں ڈال دیا۔ قید خانہ میں آپ قید سے دوچار تھے اور آپ پر ہر قسم کی سختیاں کی جا رہی تھیں۔ ناگاہ ہارون نے بھی ایک خواب دیکھا اور آپ کو رہا کر دیا۔

ابن حجر مکی نے بحوالہ علامہ مسعودی لکھا ہے کہ ایک رات ہارون کو خواب میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نظر آئے کہ آپ ایک تلوار اٹھائے ہوئے ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ہارون کو حکم دیا کہ "میرے فرزند کو رہا کر دو ورنہ ہم ابھی تجھے کیفر کردار تک پہنچا دیں گے۔" اس خواب کو دیکھتے ہی ہارون نے آپ کی رہائی کا حکم دے دیا اور کہا کہ اگر آپ یہاں رہنا چاہیں تو رہیے اور مدینہ جانا چاہتے ہیں تو تشریف لے جائیے۔ مگر بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ عداوت بنی فاطمہ کا جذبہ ہارون میں یحییٰ بن عبداللہ کی مخالفت سے ایک بار پھر بیدار ہو گیا۔ انہیں دنوں 179ھ میں ہارون عمرہ رمضان کر کے مدینہ منورہ پہنچا اور روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت امام موسیٰ کاظم کو گرفتار کروایا اور بصرہ میں قید کر دیا۔ مگر جلد ہی بغداد بلا بھیجا اور قید خانے میں آپ کو زہر دے دیا گیا۔ مولانا جامی نے شواہد نبوت میں لکھا ہے کہ زہر کھانے کے بعد امام صاحب تین دن تک تڑپتے رہے۔ آپ کی وفات 183ھ میں ہوئی۔

حضرت امام علی رضا رحمۃ اللہ علیہ (148ھ/765ء-203ھ/818ء)

سلطان العرب والعجم وامام ثامن ضامن، اثناعشریہ کے آٹھویں امام

نام ونسب عالی: امام علی بن موسیٰ بن جعفر بن محمد باقر رضی اللہ عنہ۔ یاد رہے آپ آل محمد میں کے تیسرے "علی" تھے۔ آپ کی کنیت ابوالحسن تھی اور القاب صابر، زکی، ولی، رضی اور وصی تھے اور مشہور ترین لقب رضا تھا، علامہ طبری نے لکھا ہے کہ آپ کو رضا اس لیے کہتے کہ آسمان وزمین میں خداوند عالم، رسول اکرم اور آئمہ طاہرین نیز تمام مخالفین اور موافقین آپ سے راضی تھے۔ (اعلام الوریٰ)

ولادت باسعادت: آپ بتاریخ 11 ذی قعد 148ھ/765ء بروز جمعرات، مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ سیدہ ام البنین نجمہ نکتم مرسیہ سے روایت ہے کہ جب یہ فرزند شکم میں تھا تو مجھے حمل کی کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔

امام رضا رحمۃ اللہ علیہ نے ابتدائی تعلیم وتربیت اپنے والد امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ اور شفیق والدہ کی آغوش میں پائی۔ مدینہ منورہ کے محدثین واصحاب کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا رہا، تقریباً بیس سال کے تھے جب تعلیم کتاب وسنت دینا شروع کی اور لوگوں میں ابوالحسن ثانی مشہور ہوگئے۔ 183ھ میں جب والد حضرت موسیٰ کاظم نے رحلت فرمائی تو منصب امامت کی ذمہ داریاں آپ نے سنبھال لیں۔ اجداد کرام کی تعلیم وہدایت کا سلسلہ ان کی ذات میں مرتکز ہوگیا۔ سینکڑوں حضرات نے قرآن وحدیث وفقہ وعلوم اسلامی کی روایت آپ سے کی ہے۔

مدینہ منورہ میں حضرت امام کے غلاموں کو آزاد کرنے اور غربا کی خبر گیری کرنے کے چرچے تھے۔ کسی نے سوال کرتے ہوئے عرض کیا ''مجھے اپنی مروت (حوصلہ مندی) کے مطابق کچھ عطا فرمائیں۔ آپ نے فرمایا ممکن نہیں۔ اس نے کہا پھر میری مروت کے مطابق۔ تو غلام کو حکم دیا کہ دوسو دینار اسے دے دو۔''

یسع بن حمزہ آپ کی محفل میں حاضر تھے، ایک عظیم مجمع امام صاحب سے حرام وحلال کے مسئلے پر درس لے رہا تھا۔ اتنے میں ایک شخص آیا اس نے سلام کیا اور عرض کیا کہ حج سے آرہا ہوں، میرا روپیہ اور سامان سب کچھ ضائع ہوگیا ہے اگر مناسب سمجھیں تو وطن واپسی کا انتظام کردیں۔ آپ نے اسے دوسو دینار عطا فرمائے اور کہا اسے تبرک سمجھو۔

ترک مدینہ: 200ھ تک امام علی رضا مدینہ میں رہے۔ بعد ہارون کے جب مامون کا عہد شروع ہوا تو مامون نے آپ کو خراسان طلب فرمایا۔ تو آپ نیشاپور میں قیام کے بعد سنا آباد پہنچے۔ خراسان میں مرو مامون الرشید کا مستقر تھا۔ اس سفر میں امام علی رضا جہاں بھی گزرے لوگوں نے آپ کا شایان شان استقبال کیا مگر نیشاپور کے لوگوں نے آپ کا خصوصی احترام کیا۔ فقہارے وقم نے اس زمانے میں امام صاحب سے بکثرت استفادہ کیا۔ طوس میں حضرت امام کی تشریف آوری سے علوم آل محمد کا چشمہ ابل پڑا اور طلبا اور علما نے بڑی تعداد میں استفادہ کیا۔

ولی عہد کے طور پر نامزدگی: مامون الرشید نے بھی امام کا شاہانہ خیر مقدم کیا اور بڑے احترام سے شرف میزبانی کے فرائض ادا کیے۔ مامون الرشید امام صاحب کی عظمت کا اس حد تک قائل ہوگیا کہ اس نے امام صاحب کو ولی عہد نامزد کردیا۔ امام صاحب بھی اتمام حجت کے طور پر راضی ہوگئے۔ مگر خاندان بنی عباس کو بڑا ناگوار گزرا۔ ادھر مامون الرشید نے اپنی بیٹی ام حبیب بھی آپ رحمۃ اللہ علیہ سے بیاہ دی۔ ادھر عباسیوں نے مامون کو بے دخل کرکے اس کی جگہ پر ابراہیم بن مہدی کو خلیفہ بنانے کا اعلان کردیا اور امام صاحب کی ولی عہدی پر بغداد میں بغاوت ہوگئی۔ ظاہر ہے معاملہ مامون کی حکومت کا تھا اس لیے مورخین کے مطابق مامون امام صاحب کے ساتھ مرو سے بغداد جاتے ہوئے جب طوس کے مقام پر پہنچا تو اس نے انگور کے دانے میں آپ کو زہر دلوایا جس کے اثر سے 17 صفر 203ھ میں آپ کی وفات ہوگئی۔

ع مماثلت ہے، بہت کربلا و مشہد میں وہ آزمائشِ صبر اور یہ امتحان رضا

(100 برتھاریانی)

حضرت امام تقی رحمۃ اللہ علیہ

علم وفضل، ادب وحکمت میں امام محمد تقی رحمۃ اللہ علیہ کو وہ کمال حاصل تھا جو کسی کو نہ ہوا

نام ونسب عالی: حضرت امام رضا رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کا نام محمد رکھا تھا۔ یوں محمد بن علی بن موسیٰ بن جعفر بن محمد

باقر بن امام زین العابدین۔ آپ کی کنیت ''ابو جعفر'' اور القاب جواد، امین قانع اور مرتضٰی ہیں۔

ولادت باسعادت: حضرت امام محمد تقی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت باسعادت 195ھ ہوئی۔ اس وقت تخت خلافت پر امین بن ہارون الرشید متمکن تھا۔ 198ھ میں مامون الرشید مسند خلافت پر بیٹھا۔ جب امام رضا رحمۃ اللہ علیہ کو مامون نے خراسان بلا بھیجا تو آپ والد کی شفقت اور محبت سے محروم ہو گئے۔ اپنے والد سے ایسے جدا ہوئے کہ پھر زندگی میں ان سے ملاقات کا موقع نہ ملا۔

بغداد آمد و مناظرہ: امام محمد تقی رحمۃ اللہ علیہ کی عمر صرف نو برس تھی جب انہیں مامون الرشید نے دعوت دے کر بغداد بلا لیا۔ بنی عباس کو یہ بھلا کیسے برداشت تھا۔ انہوں نے مامون کے بھائی موتمن کی ولی عہدی کا اعلان پہلے ہی کروا دیا تھا۔ اب مامون کا یہ ارادہ تھا کہ وہ امام محمد تقی کو اپنا داماد بنائے انہیں کس طرح گوارہ ہو سکتا تھا۔ وہ ایک وفد کی شکل میں مامون کے پاس آئے اور کہا کہ امام رضا کے بیٹے ''محمد'' ابھی کم سن ہیں آپ کا ایک بچے کو بڑے بڑے علما پر ترجیح دینا مناسب اور زیبا نہیں۔ مامون نے ان کے اعتراضات کا جواب یہ دیا کہ ''محمد'' کمسن ضرور ہیں مگر اوصاف و کمالات میں وہ اپنے باپ کے پورے جانشین ہیں۔ عالم اسلام کے بڑے بڑے علما ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگرچہ مامون کا یہ جواب انتہائی منصفانہ تھا مگر ان لوگوں کی تسلی نہیں ہوئی اور انہوں نے اس وقت بغداد کے سب سے بڑے عالم یحییٰ بن اکثم کو امام محمد تقی سے بحث کے لیے منتخب کیا۔ مامون نے اس مناظرہ کا انعقاد کیا۔ اس مناظرے میں ارکان دولت اور معززین کے علاوہ 900 نشستیں محض علمائے کرام کی تھیں۔ یحییٰ نے امام صاحب سے حالت احرام میں شکار کرنے کا حکم دریافت کیا تو آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا بڑا با تشفی جواب دیا مگر امام صاحب کی طرف سے پوچھے گئے سوال کا وہ جواب نہ دے سکا۔ اس پر سامعین نے یک زبان ہو کر اعتراف کیا کہ ابو جعفر محمد بن علی رحمۃ اللہ علیہ کا کوئی مثل نہیں۔

شہزادی ام الفضل سے نکاح: مامون آپ کا گرویدہ ہو گیا اور ذرا تاخیر کیے بغیر امام صاحب کا نکاح اپنی بیٹی ام الفضل سے اسی جلسہ میں کر دیا۔ نکاح کے ایک سال بعد تک امام صاحب بغداد میں مقیم رہے پھر اپنی زوجہ ام الفضل کے ساتھ واپس مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ ام الفضل کے ہوتے ہوئے بعد ازاں آپ رحمۃ اللہ علیہ حضرت عمار یاسر کی نسل سے ایک محترم خاتون کے ساتھ بھی عقد فرمایا۔ یہی خاتون امام علی نقی کی ماں ہوئیں۔ ''شواہد نبوت'' میں مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں کہ امام محمد تقی رحمۃ اللہ علیہ کے لیے زمین کی طنابیں کھینچ کر اسے سمیٹ دیا گیا تھا اس لیے آپ جہاں چاہتے چشم زدن میں پہنچ جاتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ شام میں اس مقام پر پہنچے جہاں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا بریدہ سر مبارک لٹکایا گیا تھا۔ وہاں آپ نے ایک شخص کو عبادت میں مشغول پایا آپ اسے ہمراہ لے چلے وہ شخص ابھی ایک قدم بھی نہیں چلا تھا کہ سامنے کوفہ کی مسجد آ گئی وہاں سے مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ جا پہنچے۔ غرض اس شخص کو واپس آپ نے شام پہنچا دیا مگر اس کی حیران کن باتیں سن کر والی شام نے اسے قید کر دیا جب اس نے کہا کہ وہ بے گناہ ہے اسے رہا کیا جائے تو والی شام نے اسے کہا کہ جس شخص نے تجھے شام سے کوفہ، مدینہ اور مکہ اور شام واپس پہنچایا اسی سے اپنی رہائی کے لیے رجوع کر۔ دوسرے دن وہ شخص اس قید خانے سے غائب پایا گیا۔

مامون کے بعد جب معتصم خلیفہ بنا تو اس کے دل میں امام تقی سے پرخاش تھی اس نے اپنی خلافت کے دوسرے سال ہی امام محمد تقی رحمۃ اللہ علیہ کو مدینہ سے بغداد جبراً بلوا بھیجا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ جب مدینہ سے چلنے لگے تو اپنے فرزند امام علی نقی کو اپنا وصی اور خلیفہ قرار دیا اور آثار جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ان کے حوالے کر دیئے۔ معتصم نے آپ کو بغداد میں قید کر دیا جہاں آپ نے ذی قعدہ 220ھ میں انتقال کیا۔ مولانا جامی نے لکھا ہے کہ آپ کی وفات زہر خورانی سے ہوئی۔

آپ کی تدفین آپ کے جد نامدار حضرت امام موسیٰ کاظم کے پہلو میں ہوئی۔ آپ کی تدفین کے بعد بغداد کا یہ مقام "کاظمین" کہلانے لگا اور آج بھی کاظمین کہلاتا ہے اور مرجع خلائق ہے۔

حضرت امام علی نقی رحمۃ اللہ علیہ (214ھ/827ء-254ھ/868ء)

امام منصوص، معصوم اعلم زمانہ اور افضل کائنات، سخاوت وطہارت

نام ونسب عالی: آپ کا اسم گرامی علی اور آپ کے والد گرامی قدر کا نام محمد تقی تھا۔ آپ کی کنیت ابوالحسن تھی اور القاب بہت کثیر ہیں جن میں نقی، ناصح، متوکل مرتضیٰ اور عسکری شامل ہیں۔

ولادت باسعادت و جانشینی: آپ رجب 214ھ میں پیدا ہوئے تو اس وقت خلیفہ مامون عباسی کا عہد تھا۔ مامون الرشید کے انتقال کے بعد جب معتصم باللہ خلیفہ ہوا تو اس نے امام تقی کو بغداد بلوا کر قید خانے میں ڈال دیا جب امام تقی مدینہ سے روانہ ہونے لگے تو آپ نے اپنے فرزند حضرت امام علی نقی کو اپنا جانشین مقرر کیا اور خاندانی تبرکات ان کے سپرد کر دیئے بعد ازاں قید میں ان کی وفات ہو گئی۔

متوکل عباسی کی تخت نشینی: حضرت امام نقی رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ ہی میں تھے۔ کہ ذی الحجہ 222ھ میں ابوالفضل جعفر متوکل عباسی تخت خلافت پر متمکن ہوا۔ اس نے اپنی تخت نشینی کے بعد وہ حرکتیں شروع کر دیں جنھوں نے یزید بن معاویہ کو بھی شرما دیا۔ متوکل کے متعلق مورخ نے لکھا ہے کہ یہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد سے بغض رکھتا تھا۔ اس نے شاعر ابن سکیت کی محض اس جرم میں کہ اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادوں کو متوکل کے بیٹوں سے ارفع و اعلیٰ کہا تھا، زبان گدی سے کھنچوا دی تھی۔ متوکل کے عہد کا بدترین اور سیاہ کارنامہ آل محمد کی قبروں کو مسمار کرانا ہے۔ سادات کرام اس کی دشمنی اور عداوت کی وجہ سے جلاوطن ہو گئے۔ کربلا کے روضے جو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بنوائے تھے اور ان کے اردگرد کے مکانات وغیرہ کو اس نے منہدم کرا دیا۔ 236ھ میں متوکل نے حکم جاری کیا کہ کوئی مزار حیدر کرار اور ان کی اولاد...... کی زیارت کو کوئی نہ جائے۔ متوکل کی اس حرکت سے مسلمانوں کو سخت صدمہ پہنچا۔ اہل بغداد نے اس کی ہجو کی۔ متوکل نے مذہب معتزلہ چھوڑ کر شافعی مذہب اختیار کیا۔ امام حسین رضی اللہ عنہ کے روضہ زیارت پر جانے کو ممنوع قرار دیا۔ پھر یہاں تک بڑھا کہ ایک نومسلم یہودی کو حکم دیا کہ کربلا جا کر "امام حسین رضی اللہ عنہ" کی قبر کا نشان تک مٹا دو۔ اس یہودی نے قبر انور کو مسمار کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ اس نے نہر کاٹ کر قبر انور پر پانی چھوڑنے کی کوشش کی مگر پانی اس مقام پر جاری نہ ہو سکا۔

ادھر متوکل اپنے نئے دارالحکومت سامرہ کی تعمیر میں مصروف ہونے کی وجہ سے اپنے عہد کے دس سال تک امام نقی اور دیگر سادات کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکا۔ اس نے 236ھ میں قبر انور امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ بے ادبی کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا تو ان کی اولاد کو گزند پہنچانے کے درپے ہوا۔ 243ھ میں اس نے حاکم مدینہ عبداللہ بن محمد کو خفیہ حکم بھیجا کہ فرزند رسول صلی اللہ علیہ وسلم، امام نقی کو ستانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے۔ حاکم مدینہ نے آپ کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کر دیں اور متوکل کو آپ کے خلاف جھوٹی شکایات بھیجنی شروع کر دیں۔ امام صاحب نے ایک خط متوکل کو لکھا جس میں حاکم مدینہ کی ظلم آفرینی کا مفصل ذکر کیا۔ متوکل نے آپ کو لکھا کہ آپ بغداد تشریف لے آئیے پھر ایک لشکر یحییٰ بن ہرثمہ کی قیادت میں ان کو لانے کے لیے مدینہ بھیج دیا۔ پھر امام نقی کو اس طرح دھوکہ سے بلا کر جبراً آپ کو سامرہ میں نظر بند کر دیا۔ مگر آپ اس حالت میں بھی فرائض امامت ادا کرتے رہے۔ ادھر حاسدین نے متوکل کو آپ کے خلاف اکسایا کہ وہ

243ھ میں آپ کی خانہ تلاشی پر آمادہ ہوگیا۔اس کے سپاہی امام صاحب کو گرفتار کر کے اس کے سامنے لائے۔اس نے آپ کو کچھ اشعار پڑھنے پر مجبور کیا جب آپ نے اشعار پڑھے تو وہ اتنا متاثر ہوا کہ اس نے آپ کو واپس بھجوا دیا۔متوکل کو ایک پھوڑا نکلا جو لا علاج تھا،امام صاحب نے اس کا علاج کر دیا وہ رو بصحت ہوگیا مگر آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی سے باز نہ آیا اس نے 247ھ میں امام حسین رضی اللہ عنہ کی قبر کو مسمار کرانے کی دوبارہ کوشش کی مگر اس دوران قتل کر دیا گیا۔اس کے بعد جب المعتز برسر اقتدار آیا تو اس نے امام صاحب کو زہر دلوا کر شہید کروا دیا۔(254ھ)

حضرت امام حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ (260ھ/873ء)

اثنا عشریہ کے گیارہویں امام،اعلم زمانہ اور افضل کائنات

نام ونسب عالی: نام حسن بن علی نقی بن محمد تقی،کنیت "ابومحمد" تھی اور اپ کے القاب بے شمار ہیں جن میں عسکری، ہادی،زکی اور ابن رضا زیادہ مشہور ہیں۔آپ عباسی خلفاء کے نئے دار الحکومت سامرا کے جس محلے میں رہتے تھے اس کا نام عسکر تھا اس مقام پر خلیفہ معتصم باللہ نے لشکر جمع کیا تھا اسی وجہ سے یہ "عسکر" کہلاتا تھا۔

ولادت باسعادت: آپ کی ولادت 232ھ میں اس وقت ہوئی جب واثق باللہ مسند نشین خلافت تھا۔پھر 233ھ میں متوکل خلیفہ ہوا جو بقول مورخین (تاریخ ابن الوردی) حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد سے سخت بغض وعناد رکھتا تھا۔اسی نے 236ھ میں امام حسین رضی اللہ عنہ کے روضہ کی زیارت کو جرم قرار دیا تھا اور اسی نے جبراً امام نقی کو جبراً مدینہ منورہ سے سامرا طلب کیا تھا۔معتز باللہ وہ عباسی خلیفہ جس نے مورخین کے مطابق امام علی نقی کو زہر دلوا کر شہید کیا تھا۔

چار ماہ کی عمر میں منصب امام: حضرت حسن عسکری کی عمر صرف چار ماہ کے قریب تھی جب آپ کے والد حضرت امام نقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بعد منصب امامت کی وصیت فرمائی اور فرمایا کہ میرے بعد یہی میرے جانشین ہوں گے۔جب آپ رحمۃ اللہ علیہ کی عمر چار برس کی ہوئی تو خلیفہ متوکل عباسی نے امام نقی رحمۃ اللہ علیہ کو جبراً سامرا بلا لیا۔آپ اپنے والد کے ہمراہ صرف چار برس کی عمر میں عازم عراق ہوئے اور وہیں رہنے لگے۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ اپنے عظیم الفکر اجداد ہی کی طرح تدبر قرآنی اور عروج فکر میں خاص مقام رکھتے ہیں۔اسی وجہ سے اپنے اجداد ہی کی طرح شاہان وقت کا سلوک اور طرز عمل بھی ان کے ساتھ ویسا ہی تھا۔شاہان آپ سے بھی بغض وعناد رکھتے تھے۔مولانا جامی لکھتے ہیں کہ جب مستنصر خلیفہ ہوا اور اس کے بعد المستعین کا عہد خلافت آیا تو اس نے ایک شہ زور گھوڑا خریدا لیکن وہ اس درجہ سرکش نکلا کہ اس نے بڑے بڑوں کو سواری نہ دی۔جو اس کے قریب جاتا وہ اسے زمین پر دے مارتا اور اپنی ٹاپوں سے کچل دیتا۔ایک خلیفہ المستعین کے ایک دوست نے اسے رائے دی کہ امام حسن عسکری کو بلا کر اس گھوڑے پر سوار کرائیں اگر وہ کامیاب ہوگئے تو گھوڑا رام ہو جائے گا اور اگر گھوڑے نے انہیں کچل ڈالا تو تیرا مقصد حل ہو جائے گا۔لیکن جب امام صاحب اس گھوڑے کے پاس پہنچے تو اس نے سرکشی نہ کی اور خلیفہ کو یہ گھوڑا امام حسن عسکری کے حوالے کرنا پڑا۔

امام حسن عسکری نے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی،لیکن اپنی امامت کے (تقریباً پونے) چھ برسوں کے دوران میں وہ مسلسل حکومت کی زیر نگرانی رہے اور ایک مرتبہ خلیفہ المعتمد نے کچھ عرصے کے لیے انہیں قید بھی کر دیا تھا۔

یہ گیارھویں امام (حسن العسکری) یکم ربیع الاول 260ھ 873ء کو علیل ہوگئے اور سات دن کی علالت کے بعد انتقال فرما گئے اور اپنے گھر واقع سامرا میں اپنے والد ماجد کے پہلو میں مدفون ہوئے۔شیعہ علما لکھتے ہیں کہ علالت کے دوران

میں خلیفہ المعتمد نے امام صاحب کی خدمت کے لیے اپنے خادم اور طبیب بھیجے اور معزز علویوں اور عباسیوں کی خاصی تعداد ان کی عیادت کے لیے آتی رہی۔ متاخر شیعی کتابوں میں خلیفہ معتمد یا معتز باللہ پر امام کو زہر دلوانے کا الزام لگایا گیا ہے۔ گیارہویں امام کی وفات پر ان کی اولاد کے مسئلے پر شیعیوں میں مزید اختلافات پیدا ہوئے۔ بعض کے مطابق انہوں نے محمد نام کی ایک نرینہ اولاد چھوڑی تھی جبکہ بعض اس سے انکار کرتے ہیں۔

حضرت امام مہدی رحمۃ اللہ علیہ (255ھ/868ء)

مہدی آخرالزماں امام زمانہ، حضرت امام محمد مہدی رحمۃ اللہ علیہ سلسلہ امامت کی بارھویں کڑی ہیں

نام ونسب: محمد بن حسن بن علی بن محمد بن علی ابن موسیٰ ابن جعفر بن محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔ امام احمد بن حنبل سے روایت ہے کہ اس سلسلہ نسب کے اسماء کو کسی مجنون پر دم کیا جائے تو اسے یقیناً شفا ہوگی۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ نسب ماں کی طرف سے حضرت شمعون بن حمون الصفا وصی حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ آپ کی والدہ کا اسم گرامی نرجس خاتون ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور لقب "مہدی" ہے۔ آپ کی کنیت "ابوالقاسم" اور ابوعبداللہ تھی۔

ولادت باسعادت: مورخین کا اتفاق ہے کہ آپ کی ولادت باسعادت 15 شعبان 255ھ کو ہوئی۔ کتاب شواھد نبوت اور وفیات الاعیان اور روضہ الاحباب میں ہے کہ آپ مختون اور ناف بریدہ پیدا ہوئے تھے۔

حضرت امام مہدی کا زمانہ غیبت: بادشاہ وقت خلیفہ معتمد بن متوکل عباسی جو اپنے آبا و اجداد کی طرح ظلم وستم کا عادی تھا۔ اس کے کانوں میں حضرت مہدی کی ولادت کی خبر پڑ چکی تھی۔ اس نے شہادت امام حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ کے بعد امام صاحب کو بھی گرفتار کرنا چاہا۔ امام صاحب بحکم خدا 23 رمضان 259ھ کو سرداب جا کر غائب ہوگئے۔ اکابر علمائے اہل سنت، مولانا جامی، امام عبدالوہاب شعرانی، شیخ ابن عربی، شیخ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم اس بات پر متفق ہیں کہ امام حسن عسکری نے آپ کی والدہ بادشاہ وقت کے خوف سے پوشیدہ رکھی اور یہ کہ آپ آخری زمانہ میں ظہور وخروج فرمائیں گے۔ علامہ جواد ساباطی نے "براہین ساباطیہ" میں لکھا ہے کہ امام مہدی اولاد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہ سے ہیں اور وہ 255ھ میں پیدا ہوکر کچھ عرصہ بعد غائب ہوگئے تھے۔ آپ اسی طرح زندہ وباقی ہیں جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت خضر علیہ السلام اور حضرت الیاس علیہ السلام۔

امام محمد مہدی کی روپوشی کا زمانہ مورخین نے دو حصوں میں منقسم کیا ہے:

غیبت صغریٰ: 260ھ/873ء تا 329ھ/940ء۔ اس عرصے میں انہوں نے حسب ذیل وکلاء اور نمائندگان کے ذریعے اپنے احکام وفرامین اپنے ماننے والوں اور عقیدت مندوں تک پہنچائے۔ (1) عثمان بن سعید عمر والاسدی (م 300ھ/914ء) ابوجعفر محمد عثمان (م 304ھ/916ء) حسین بن روح (م 326ھ/937ء) اور آخر میں علی بن محمد سمری (م 329ھ/940ء) ان نمائندگان کے علاوہ بھی آپ کے کئی اور نمائندے بھی بغداد کے علاوہ کوفہ، اھواز، ھمدان، رے اور نیشاپور میں پھیلے ہوئے تھے۔

بغداد کے نوابین اربعہ کی وساطت سے دینی معاملات ومسائل لوگوں تک پہنچتے اور اثناعشریہ کے علما انہیں چاروں کے ذریعے امام صاحب سے رابطہ رکھتے تھے، خط لکھتے، مسائل پوچھتے اور کبھی کبھی حاضر خدمت ہوکر زیارت بھی کرتے تھے۔

غیبت کبریٰ: علی بن محمد سمری کی وفات سے چھ دن پہلے امام مہدی نے ان کو خط کے ذریعے ہدایت دیدی تھی کہ وہ اپنے بعد کسی کو اپنا نائب مقرر نہ کریں کیونکہ اب غیبت کبریٰ کا دور شروع ہو رہا ہے اور یہ بھی حکم دیا کہ امت کے نظام فکر وعمل

کے لیے "ہمارے بعد یہیں سے رجوع کیا جا سکے کہ امام ان پر حجت ہیں اور وہ تم پر حجت ہیں۔"
اہل تشیع کے نزدیک گیارہویں امام کا عقیدہ اس تاریخی حقیقت پر استوار ہے کہ امام حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے فرزند امام مہدی آخر الزماں کی ولادت کے بعد انہیں اپنا جانشین بنایا اور ان کی امامت پر نص کی۔ بارھویں امام ایک مدت تک لوگوں کے سامنے فرائض امامت بھی انجام دیتے رہے اس کے بعد وہ عام لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

شہدائے اسلام

حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا...... اسلام کی اولین شہید خاتون (شہادت ۔ 5 نبوی)
حضرت یاسر رضی اللہ عنہ...... (شہادت...... اندازاً 6 نبوی)
حضرت خبیب رضی اللہ عنہ بن عدی (شہادت 4ھ/626ء)
حضرت مبشر رضی اللہ عنہ بن عبدالمنذر (شہادت 2ھ/624ء)
حضرت عبداللہ بن طارق رضی اللہ عنہ (شہادت 4ھ/626ء)
حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ بن ابی عامر (شہادت 3ھ/625ء)
سیدالشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب (شہادت 3ھ/625ء)
سیدالشہداء حضرت جعفر طیار بن رضی اللہ عنہ بن ابی طالب (شہادت 8ھ/629ء)
الحر بن یزید الریاحی (شہادت 61ھ/680ء)
شیر میسور، سلطان ٹیپو شہید (شہادت 1799ء)
شاہ اسمٰعیل شہید (شہادت 1831ء)
غازی علم الدین شہید (شہادت 1929ء)
میجر عزیز بھٹی (شہادت 1965ء)
راشد منہاس (شہادت 1971ء)
کیپٹن کرنل شیر خان شہید (شہادت 1999ء)
سلطان سراج الدولہ (شہادت 1756ء)
شہید تیتو میر (شہادت 1831ء)
سید احمد شہید دیکھئے "عظیم قائدین" (شہادت 1831ء)
کیپٹن محمد سرور شہید (شہادت 1948ء)
سرفراز احمد رفیقی (شہادت 1965ء)
میجر شبیر شریف شہید (شہادت 1971ء)

ام عمار حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا (شہادت سنہ 5 نبوی)

اسلام کی شہید اولین جو بربریت قریش کا شکار ہوگئیں

نام ونسب: حضرت سمیہ بنت خیاط۔ یہ ابوجہل کے چچا ابوحذیفہ بن مغیرہ کی باندی تھیں۔ جب جبل فاران کی چوٹیوں پر اسلام کا آفتاب طلوع ہوا تو یہ خاتون اسلام لانے والی سات اولین شخصیات میں شامل تھیں۔ ان کا نکاح حضرت یاسر رضی اللہ عنہ سے کر دیا گیا تھا۔ انہیں کے بطن سے حضرت عمار رضی اللہ عنہ بن یاسر پیدا ہوئے۔ انہیں دین حق سے برگشتہ کرنے کے لیے قریش نے گوناگوں عذاب دیئے مگر ان کے قدم ثبات میں کوئی لغزش نہ آئی۔ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے

چھٹے سال تک خاندان حضرت یاسر رضی اللہ عنہ نے تمام ظلم وستم نہایت صبر وتحمل سے برداشت کیے۔ ایک دن اسلام کے سب سے بڑے دشمن، ابوجہل نے اس بے کس اور مظلوم خاتون کے جسم کے نازک مقام پر برچھی مار کر شہید کر دیا۔ مورخین جن میں علامہ مخدوم محمد ہاشم سندھی شامل ہیں۔ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کی شہادت کا واقعہ چھٹے سال نبوت کا لکھا ہے۔ طبقات ابن سعد میں ابن سعد اور مورخ ابن اثیر نے حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو اسلام کی اولین شہید قرار دیا ہے۔

حضرت یاسر بن عامر رضی اللہ عنہ (شہادت اندازاً 6 نبوی)

سابقون الاولون مین سے ایک عظیم مگر مظلوم صحابی جنھیں قریش نے شہید کر دیا

نام ونسب: حضرت یاسر بن عامر رضی اللہ عنہ کا تعلق یمن کے مالک قبیلہ کی شاخ مذحج سے تھا۔ وہ اور ان کے دو بھائی، الحارث بن عامر اور مالک بن عامر اپنے ایک چوتھے بھائی کو ڈھونڈتے ہوئے یمن سے مکہ آئے، حارث اور مالک تو واپس یمن چلے گئے مگر یاسر رضی اللہ عنہ مکہ میں مقیم ہوگئے، انہوں نے ابوجہل کے چچا، ابوحذیفہ بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخذوم سے محالفہ کرلیا اور ابوحذیفہ نے اپنی ایک کنیز حضرت سمیہ بنت خیاط سے ان کا نکاح کر دیا، ان سے حضرت عمار بن یاسر پیدا ہوئے۔ (566ء)۔ حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کے دو اور بیٹے حریث اور عبداللہ بھی تھے مگر اس کا سراغ نہیں ملتا کہ وہ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھے یا نہیں۔ حریث جواں کے تینوں بیٹوں میں بڑا تھا۔ 610ء میں اسے بنوالدیل نے قتل کر دیا تھا۔

قبول اسلام: حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ میں صہیب بن سنان سے دار ارقم کے دروازے پر ملا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دار ارقم میں تشریف رکھتے تھے۔ پھر ہم دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کرلیا۔ اس کے بعد حضرت کے صاحبزادوں عبداللہ اور عمار رضی اللہ عنہ اور ان کی والدہ سمیہ رضی اللہ عنہا نے اسلام قبول کرلیا۔ آغاز اسلام 615ء میں جب قریش نے مکہ کے ان لوگوں پر ظلم وستم کا آغاز کیا جو کمزور تھے یا جنھیں کسی قبیلے کی پشت پناہی حاصل نہیں تھی تو یاسر رضی اللہ عنہ اور ان کا خاندان بھی جب ابوحذیفہ بن مغیرہ کی موت کے بعد بے سہارا ہو گیا تو خود بنی مخذوم نے ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ دیئے اور ان پر دباؤ ڈالا کہ وہ اسلام سے منحرف ہو جائیں۔

حضرت یاسر رضی اللہ عنہ اور ان کے اہل خانہ کو دوپہر کی سخت دھوپ میں کھڑا کر کے عذاب دیا جاتا تھا اور آگ میں بھی جلایا جاتا تھا۔ جب کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو آگ کا عذاب دیئے جانے کے وقت ان کے پاس سے گزرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ''یانارکونی برداً وسلاماً علیٰ عمارٗ''

ترجمہ: اے آگ تو عمار پر برد وسلام ہو جا جیسا کہ تو ابراہیم علیہ السلام پر ہوگئی تھی۔ اسی ظلم وستم کے زمانہ میں ابوجہل نے برچھی مار کر حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو شہید کر دیا تھا۔

اسی دور ابتلائے اسلام والمسلمین میں حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کو بھی شہید کر دیا گیا۔ چونکہ حضرت یاسر رضی اللہ عنہ مکہ میں ایک اجنبی تھے اور ابوحذیفہ بن مغیرہ کے بعد ان کا کوئی حلیف نہیں تھا اس لیے اہل مکہ نے انہیں اپنے مظالم کا تختہ مشق بنالیا تھا۔ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو اسلام کی اولین شہید ہونے کا اعزاز حاصل ہے تو مورخین کے مطابق حضرت یاسر رضی اللہ عنہ اسلام کے دوسرے شہید کے رتبے پر فائز ہیں مگر اس کے ساتھ ہی مورخین جن میں ابن سعد، ابن اسحٰق اور طبری شامل ہیں ان کی شہادت کا کوئی ذکر نہیں مگر نہ ہی انہیں ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ کرنے والے صحابہ کرام علیہم الرضوان میں شامل کیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ پہلے ہی شہید کر دیئے گئے تھے۔

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ بن عدی (شہادت 4ھ/626ء)

نام اسلام اور بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر فدا ہو جانے والے ایک نامور صحابی رضی اللہ عنہ

نام ونسب: حضرت خبیب رضی اللہ عنہ بن عدی الانصاری الاوسی اسلام کے اولین شہیدوں میں سے ہیں۔ وہ اسی تبلیغی وفد میں شامل تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفر 4ھ میں قبیلہ عضل اور قارہ کے چند معززین کی درخواست پر ان قبیلوں کے لوگوں کو اسلام سکھانے کے لیے بھیجا تھا۔ جب دس صحابہ کرام علیہم الرضوان کی یہ چھوٹی سی جماعت مکہ المکرمہ اور عسفان کے درمیان الرجیع کے مقام پر پہنچی تو غداری کر کے بنولحیان کے دوسو آدمیوں نے جن میں ایک سو تیر انداز بھی شامل تھے، سوچے سمجھے منصوبے کے تحت انہیں گھیر لیا۔ نرغے میں گھری ہوئی اس چھوٹی سی جماعت کے قائد، حضرت عاصم بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ نے انتہائی جرات و بہادری سے کام لیتے ہوئے قلیل تعداد اور ناسازگار حالات کے باوجود مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا، بعض مورخین کے مطابق اس جماعت قیادت مرثد بن ابی مرثد غنوی رضی اللہ عنہ کے سپرد تھی۔ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ اور چھ دوسرے افراد کفار کا مقابلہ کرتے ہوئے مردانہ وار شہید ہو گئے، مگر حضرت خبیب رضی اللہ عنہ، حضرت زید رضی اللہ عنہ بن الدثنہ اور ایک تیسرے صحابہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن طارق نے کفار کے امن و سلامتی کے وعدوں پر اعتبار کرتے ہوئے ہتھیار ڈال دیئے۔ تاہم کفار نے بدعہدی کی اور تینوں صحابیوں کو گرفتار کر کے مکے لے چلے۔ راستے میں مرالظہر ان کے مقام پر حضرت عبداللہ بن طارق نے اپنے ہاتھ آزاد کر کے تلوار تھام لی، مگر کفار نے انہیں پتھر مار کر شہید کر دیا اور باقی دو صحابیوں کو مکہ میں لے جا کر فروخت کر دیا۔ حضرت خبیب کو الحارث بن عمر بن نوفل کے ورثا کے سپرد کر دیا گیا۔ ان لوگوں نے انہیں سولی پر لٹکا کر بے بسی کی حالت اس بات کا انتقام لینے کے لیے شہید کر دیا کہ انہوں نے جنگ بدر میں الحارث کو قتل کر دیا تھا۔

سولی پر لٹکائے جانے سے پہلے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے دشمنوں سے اجازت لے کر دو رکعت نماز ادا کی جو شہدا کے لیے سنت بن گئی۔ کہا گیا ہے کہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے وقت شہادت یہ دو شعر پڑھے:

والست ابالی حین اقتل مسلما
علی الی شق کان فی اللہ مضجعی
وذالک فی ذات الا لہ وان یشا
یبارک علیٰ اوصال شلو ممرع

ترجمہ: ''جب میں اسلام کی خاطر شہید ہوتا ہوں تو مجھے اس بات کی پرواہ نہیں کہ میرے جسم سے کیا سلوک کیا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ میرے بریدہ اعضا پر بھی رحمت نازل کرے گا۔

ان شعروں کے علاوہ انہوں نے کافروں کے لیے بددعا کی تھی جو آج تک کتب تاریخ میں محفوظ ہے۔ ابوسفیان اور اس کا کم سن بیٹا معاویہ اس موقع پر موجود تھے۔ ابوسفیان نے اس بددعا کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنے بیٹے معاویہ کو وہاں سے ہٹا لیا تھا۔

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے اللہ سے یہ التجا بھی کی تھی کہ وہ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حادثے سے مطلع کر دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع دی تھی۔ سعید بن عامر کو جب حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ یاد آ جاتا تو اس پر دیر تک غشی طاری رہتی تھی۔

حضرت مبشر رضی اللہ عنہ بن عبدالمنذ ر رضی اللہ عنہ (شہادت 2ھ/624ء)

شہدائے بدر میں سے ایک، جنہوں نے اسلام کے نام پر شہادت قبول کی

نام ونسب: مبشر بن عبدالمنذ ر ابن رفاعہ بن زنبر بن امیہ بن زید، ان کی والدہ نسیبہ بنت زید بن صبیعہ بن زید بن مالک تھیں ان کی کوئی پسماندہ اولاد نہیں تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مبشر بن عبدالمنذ ر اور عاقل بن ابی البکیر کے درمیان عقد مواخاۃ کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ عاقل بن ابی بکیر اور مجذر ابن زیادہ کے درمیان آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقد مواخاۃ کیا تھا۔ مبشر بن عبدالمنذ ر غزوہ بدر میں شریک ہوئے اور اسی روز جام شہادت نوش کیا۔ آپ رضی اللہ عنہ کو ابوثور نامی مکی نے شہید کیا تھا۔

سائب بن ابی لبابہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مبشر بن عبدالمنذ ر کا حصہ لگایا اور معن بن عدی ہمارے پاس ان کا حصہ لائے تھے۔

مبشر رضی اللہ عنہ بن عبدالمنذ ر کے سگے بھائی مشہور صحابی ابولبابہ تھے جن کو غزوہ بدر کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عامل مدینہ بنایا تھا۔ بعدازاں انہیں غزوہ بدر میں شریک صحابہ کے برابر مال غنیمت کا حصہ عطا فرمایا تھا۔ ابولبابہ سے جب غزوہ بنی قریظہ میں اس گناہ کا ارتکاب ہوا کہ انہوں نے بنی قریظہ کو اس راز سے آگاہ کر دیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں قتل کروادیں گے۔ اس کی سزا کے طور پر ابولبابہ نے خود کو مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ستون سے باندھ لیا تھا اور وہ اس وقت تک بندھے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی تھی۔

حضرت عبداللہ بن طارق رضی اللہ عنہ (شہادت 4ھ/626ء)

شہدائے رجیع میں سے وہ بہادر جس نے اپنے ہاتھ کھول کر دوبارہ دشمنوں پر حملہ کر دیا تھا

نام ونسب: عبداللہ بن طارق رضی اللہ عنہ بن عمرو بن مالک بن تیم بن شعبہ بن سعداللہ بن فران بن بلی بن عمرو بن الحاف بن قضاعۃ۔

حضرت عبداللہ بن طارق رضی اللہ عنہ بدر واحد میں شریک ہوئے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو غزوہ الرجیع میں روانہ ہوئے۔ بنی لحیان کے مشرکین سے انتہائی بہادری سے لڑے مگر ان کے امن وسلامتی کے وعدے پر ہتھیار ڈال دیئے۔ مشرکین نے انہیں گرفتار کر کے ایک رسی سے باندھا کہ حضرت خبیب بن عدی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مکہ لے جائیں جب مراالظہر ان کے مقام پر پہنچے تو حضرت عبداللہ بن طارق رضی اللہ عنہ انتہائی جرائت سے کام لیتے ہوئے اپنے ہاتھ رسی سے آزاد کر لیے اور تلوار نکال لی، لوگ ان کے پاس سے ہٹ گئے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے مشرکین پر حملہ کر دیا اور وہ ادھر ادھر ہونے لگے۔ پھر مشرکین نے انہیں پتھر مار کر شہید کر دیا۔ ان کی قبر مراالظہر ان میں واقع تھی۔ یاد رہے کہ واقعہ یوم رجیع ہجرت کے چھتیس ماہ بعد صفر المظفر 4ھ میں پیش آیا تھا۔

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ بن ابی عامر (شہادت 3ھ/625ء)

وہ شہید اسلام جنہیں غسل الملائکہ نے دیا، ایک عظیم صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم

نام ونسب: حنظلہ رضی اللہ عنہ بن ابی عامر عبد عمرو بن صیفی الاوسی، لقب غسیل الملائکہ۔

ان کے والد ابی عامر نے زمانہ جاہلیت میں رہبانیت اختیار کر لی تھی اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو وہ بھاگ کر مکہ چلا گیا اور قریش مکہ سے جا ملا، غزوہ احد میں کفار مکہ کی طرف سے شریک ہوا۔ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ بھی اسلام لا کر غزوہ احد میں شریک ہوئے۔ دوران جنگ وہ ابوسفیان کو قتل کرنے والے تھے کہ ایک دشمن نے انہیں مہلک طور پر زخمی کر دیا۔ ان کی شہادت کی خبر سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "فرشتے ان کو غسل دے کر تدفین کے لیے تیار کریں گے۔" اس طرح وفات کے بعد ان کو غسیل الملائکہ کا لقب ملا۔ وہ دوسرے شہدائے احد کے ساتھ دفن کیے گئے۔

سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ (شہادت 3ھ/625ء)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور صحابی، جنگ احد میں جام شہادت نوش کیا

نام ونسب عالی: حمزہ رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب بن ہاشم، حضرت عبدالمطلب اور ہالہ بنت وہب کے بیٹے تھے۔ بحیثیت چچا انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی کے لیے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے والد خویلد بن اسد کے ساتھ بات چیت میں حصہ لیا تھا اور اسلام قبول کرنے کے بعد اسلام کے سب سے بہادر اور دلیر حامیوں میں سے ہو گئے۔ غزوہ بدر اور احد میں شرکت کر کے خوب داد شجاعت دی۔ انہوں نے ابوجہل کے توہین آمیز سلوک کے خلاف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدافعت کی۔ یہودیوں کے قبیلہ بن قینقاع کے خلاف کارروائی میں حصہ لیا اور ساحل سمندر کی طرف العیص کے مقام پر تیس مہاجر مجاہدین کے ساتھ ایک عسکری مہم کی قیادت کی۔ راستے میں ابوجہل کے ساتھیوں سے ان کی مڈبھیڑ ہو گئی، لیکن مجدی ابن عمرو الجہینی کی مداخلت کی بدولت طرفین میں جنگ نہ ہوئی۔ حضرت حمزہ نے غزوہ بدر میں بھی اپنی بہادری کے جوہر دکھائے، کئی مشرکین پر مبارزت میں فوقیت حاصل کی، لیکن اگلے سال یعنی 3ھ میں جب وہ غزوہ احد میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھا رہے تھے تو حبشی غلام وحشی نے تاک کر ان پر حربہ سے حملہ کیا اور شہید کر دیا۔ وحشی کو یہ لالچ دیا گیا تھا کہ اس کے صلے میں اسے آزاد کر دیا جائے گا۔ یہ لالچ اسے ہند بنت عتبہ نے دیا تھا جو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ سے اپنے والد اور بھائی کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس کی انتقام کی آگ اس قدر شدید تھی کہ اس نے شہادت کے بعد حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش کا وحشیانہ طور پر مثلہ کیا اور ان کا کلیجہ تک چبا ڈالا۔ یہ واضح طور پر زمانہ جاہلیت کی عداوت کا اعادہ تھا۔

حضرت جعفر الطیار رضی اللہ عنہ (شہادت 8ھ/629ء)

ذوالجناحین، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچیرے بھائی، مشہور صحابی اور شہید جنگ موتہ

نام ونسب عالی: حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، کنیت ابوعبداللہ، والدہ کا نام حضرت فاطمہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سگے بھائی اور ان سے دس سال بڑے تھے۔ جن دنوں حضرت ابوطالب تنگدست ہو گئے تھے تو انہوں نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو ان کے چچا عباس رضی اللہ اپنے گھر لے گئے تا کہ اپنے بھائی کی اعیال داری کا بوجھ کچھ کم کر سکیں۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عقیل رضی اللہ عنہ کو اپنی کفالت میں لے لیا۔ تھوڑے ہی دن بعد حضرت جعفر رضی اللہ عنہ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ سابقون الاولون میں ان کا نام چوبیسواں یا اکتیسواں تھا۔

ہجرت حبشہ: حضرت جعفر رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے کفار مکہ کی ستم رانیوں سے تنگ آ کر حبشہ

کی طرف ہجرت کی تھی۔ ان کا نام حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والوں کی دوسری فہرست میں تھا۔ ان کی زوجہ حضرت اسمارضی اللہ عنہا بنت عمیس بھی ان کے ساتھ اس ہجرت میں شریک تھیں۔ جب قریش نے سنا کہ ہجرت حبشہ کرنے والے مسلمان امن وسکون کی زندگی بسر کر رہے ہیں تو انہوں نے ابوربیعہ، ابن المغیرہ المخزومی اور عمرو بن العاص کو اپنا سفیر بنا کر شاہ حبشہ کے دربار میں بھیجا تا کہ مہاجرین کو واپس لاسکیں۔

اس پر شاہ حبشہ نے مسلمانوں کی طرف سے حضرت جعفر کو اپنے دربار میں طلب کیا اور انہوں نے عربوں کی جہالت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر ایک فصیح وبلیغ تقریر کی اور سورہ مریم کی چند آیات بھی تلاوت فرمائیں۔ جنہیں سن کر شاہ حبشہ نے قرآن مجید کو تورات اور انجیل کی طرح ایک الہامی کتاب تسلیم کیا اور سفرائے قریش کو بے نیل ومرام واپس کر دیا۔

حضرت جعفر 5ھ تک حبشہ ہی میں مقیم رہے اور اس وقت مدینہ منورہ پہنچے جب مسلمانوں نے خیبر پر قبضہ کرلیا۔

حضرت جعفر عین فتح خیبر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت محبت سے انہیں گلے سے لگایا اور ان کی پیشانی کو چوم کر فرمایا "میں نہیں جانتا کہ مجھے جعفر کے آنے سے زیادہ خوشی ہوئی ہے یا خیبر کی فتح سے؟

فتح مکہ کے موقع پر حضرت حمزہ کی صاحبزادی امامہ رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی کفالت میں دیا کیونکہ ان کی زوجہ حضرت اسماء امامہ کی سگی خالہ تھیں۔

شہادت: جمادی الاولی 8ھ/ 629ء میں غزوہ موتہ پیش آیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قاصد حارث بن عمیر رضی اللہ عنہ کے قتل کیے جانے کا قصاص لینے کے لیے تین ہزار فوج کو شام کی طرف روانہ فرمایا تھا اور اس کا سپہ سالار حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا۔ ساتھ ہی فرمایا کہ اگر حضرت زید رضی اللہ عنہ شہید ہو جائیں تو ان کے جانشین حضرت جعفر رضی اللہ عنہ ہوں اور وہ بھی شہید ہو جائیں تو فوج کی کمان حضرت عبداللہ بن رواحہ کریں۔ موتہ کے مقام پر جب رومیوں سے جنگ ہوئی تو حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے جام شہادت نوش کیا اور علم حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے سنبھالا اور دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے، دشمنوں نے انہیں نرغہ میں لے لیا ان کا تمام بدن اس دوران زخموں سے چھلنی ہو گیا مگر انہوں نے علم کو سرنگوں ہونے نہ دیا۔ بالآخر شہید ہو کر گرے۔ ان کے بعد عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ بھی شہید ہو گئے تو فوج کی کمان حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے سنبھال لی اور مسلمانوں کو بحفاظت بچالائے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ کو ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ان کی شہادت کی خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دی اور ساتھ ہی بشارت دی کہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے دونوں بازوؤں کی جگہ اللہ نے انہیں نئے باز وعطا فرمائے ہیں اور وہ جنت میں محو پرواز ہیں۔ یس پر آپ کو طیار کا لقب عطا فرمایا۔

الحر بن یزید ریاحی (شہادت 61ھ/680ء)

عبیداللہ بن زیاد کا سالار لشکر اور بعد ازاں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی طرف سے کربلا کا شہید اولین

نام ونسب: الحر بن یزید بن ناجیہ بن قعنب بن عتاب بن الحارث بن عمرو بن ھمام الریاحی۔ اس فوج کے ہراول دستے کا سالار جو عراق کے والی عبیداللہ بن زیاد نے حضرت امام حسین بن علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے کے لیے بھیجی تھی۔ حضرت امام اس دوران اپنے عزیزوں اور اہل خانہ کے ساتھ کوفہ کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ حر کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ امام

حسین رضی اللہ عنہ کا تعاقب کرکے اور انہیں گھیر کر کوفے میں عبیداللہ کے پاس لے آئے۔ اسے جدال اور قتال سے منع کیا گیا تھا۔ اس حکم کی تعمیل میں وہ امام حسین رضی اللہ عنہ کے کیمپ کے قریب رہا اور انہیں مدینہ واپس نہ جانے دیا۔ آخر کار وہ اس بات پر راضی ہو گیا کہ امام حسین رضی اللہ عنہ کوفے کا ارادہ ترک کرکے کسی دوسری طرف نکل جائیں۔ ابتدا میں امام حسین رضی اللہ عنہ اور حر کے تعلقات مخالفانہ نہیں تھے اور وہ امام حسین رضی اللہ عنہ کی امامت میں نمازیں بھی ادا کرتا تھا اور یہ بھی کہہ دیتا تھا کہ اسے ان خطوط کا کوئی علم نہیں جو اہل کوفہ نے امام حسین رضی اللہ عنہ کو ارسال کیے ہیں۔

عبیداللہ کے نئے احکام کی تعمیل میں 2 محرم 61ھ/2 اکتوبر 680ء کو اس نے امام حسین رضی اللہ عنہ کو کسی آباد جگہ پر جانے سے روک دیا بلکہ اس حد تک مجبور کیا کہ وہ کربلا کے بے آب و گیاہ میدان میں خیمہ زن ہو جائیں۔

جب عبیداللہ نے عمر بن سعد کو لشکر کا امیر بنا کر بھیجا تو اس نے امام حسین رضی اللہ عنہ کی تجاویز کو رد کرتے ہوئے ان سے جنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ عین اس وقت حر کو احساس ہوا کہ امام حسین حق پر ہیں اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ امام حسین رضی اللہ عنہ کے لشکر سے جا ملے گا۔ اگرچہ وہ جانتا تھا کہ ان کی حالت کمزور ہے۔ حر نے اظہار افسوس اور اپنے تھوڑے سے ساتھیوں کو لے کر وہ امام حسین رضی اللہ عنہ کے ہمراہیوں سے آملا۔ امام حسین رضی اللہ عنہ نے دعا فرمائی کہ اے خدا اس کی مغفرت کر دے۔

پھر 10 محرم کو حر نے خوب داد شجاعت دی اور عمر بن سعد کے لشکر کے دو سپاہیوں کو قتل کر دیا، آخر میں خود شہادت سے سرفراز ہوا۔

حر کی توبہ، اس جنگ میں دلیری اور سرفروشانہ موت کی روایت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کی داستان کا جز بن چکی ہے۔

شیر میسور، ٹیپو سلطان شہید (شہادت 1799ء)

وہ شہید ملت کہ اگر کامیاب ہو جاتا تو ہندوستان پر انگریز قابض نہ ہوتے

نام و نسب: فتح علی، ٹیپو سلطان بن حیدر علی، والدہ فاطمہ معروف بہ فخر النساء۔

پیدائش: 10 نومبر 1750ء 20 ذی الحجہ 1163ھ، بروز جمعہ دیون ھلی (بنگلور سے 20 میل شمال میں) کو پیدا ہوا۔ اس کا نام ایک بزرگ ٹیپو مستان کے نام پر ٹیپو رکھا گیا۔ دسمبر 1782ء میں اپنے والد سلطان حیدر علی کا جانشین ہوا۔ ارکاٹ کے میدانوں میں انگریزوں سے مصروف جنگ رہا۔ انگریزوں نے کئی شکستیں کھا کر سلطان ٹیپو سے صلح کر لی۔ 1783ء میں سلطان کا لقب اختیار کرکے اپنی باقاعدہ بادشاہی کا اعلان کیا جس کی وجہ سے ہمسائے ان کے دشمن ہو گئے مرہٹوں اور نظام سے لڑائیوں پر انگریزوں نے خلاف معاہدہ اس کا ساتھ نہ دیا بلکہ خود مخالفوں کا جتھا تشکیل دے کر تیسری جنگ میسور چھیڑ دی، ٹیپو کو مجبوراً بہت سا علاقہ دشمنوں کے حوالے کرنا پڑا۔ (1792ء) آخر میں لارڈ کارنوالس نے دھوکے سے اس کے بیٹوں کو یرغمال بنا کر سلطان سے کواگ کا علاقہ بھی لے لیا۔ ادھر ٹیپو انگریزوں کا جانی دشمن بن گیا اور اس نے فرانسیسیوں سے دوستی کر لی۔ اس نے سلطان ترکی، امیر افغانستان اور ہندوستان کے دیگر والیان ریاست سے سفارتی روابط قائم کرنے کی کوشش کی مگر سلطان کی کوششوں کے مقابلے میں انگریزوں کی اس کے سازشیں کامیاب زیادہ کامیاب ہو گئیں۔ انہوں نے خود ٹیپو کے بہت سے امراء اور وزراء ساتھ ملا لیے اور بھاری جنگی اتحاد بنا کر ٹیپو سلطان کے خلاف فوج کشی کی مگر سلطان ان کی اطاعت اختیار کرنے کے لیے تیار نہ ہوا اور مئی 1799ء میں دلیری سے میدان جنگ میں داد شجاعت دیتے

ہوئے شہید ہو گیا۔

میر نثار علی تیتو میر (شہادت 1831ء)

بنگال میں انگریزوں اور ظالم ہندو زمینداروں کے خلاف جہاد کا علمبردار

نام ونسب: سید میر نثار علی تیتو میر بن سید میر حسن علی۔ والدہ، عابدہ رقیہ خاتون۔

پیدائش: موضع چاند پور کے پرگنہ 24 میں 1782ء میں پیدا ہوا۔ حافظ قرآن تھا اور پہلوانی بھی کرتا تھا۔ 1819ء میں حج پر گیا جہاں سے واپسی پر وہ سید احمد بریلوی سے بیعت کی اور تبلیغ کا فریضہ ادا کرنے لگا۔ اس کے نزدیک اگر کسی مسلمان پر ظلم ہو تو اس کی مدد کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ جب اس کے علاقے کے ایک ہندو زمیندار کرشن دیورائے، مسلمانوں کی داڑھیوں، مسلمان ناموں اور مسجدوں پر بھاری ٹیکس عائد کیا تو تیتو میر نے اس کی شدید مخالفت کی اور اس کے خلاف مسلح جدوجہد شروع کر دی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو لاٹھی چلانے کی تربیت دی۔ اس کی ان عسکری تیاریوں کی وجہ سے ہندو زمیندار نے انگریزوں سے مدد طلب کی۔ ادھر تیتو میر نے ایک مضبوط قلعے کو اپنا مستقر بنا کر اس ہندو زمیندار کو شکست دی۔ پھر پورا پرگنہ 24 اور نادیا اور مرید پور کے ضلعے کے ضلعے اس کے زیر اقتدار آ گئے۔ اسی دوران اس نے ایک گاؤں میں بانسوں کا ایک قلعہ تعمیر کیا اور انگریزی حکومت کے اختتام اور مسلم سلطنت کے آغاز کا اعلان کر دیا۔ اس نے کئی بار ضلع کے حکام اور کلکتہ کی فوج کو نیچا دکھایا۔ آخر وائسرائے ہند لارڈ بینٹنگ نے جدید اسلحے سے لیس ایک باقاعدہ فوج اس کے خلاف بھیجی جس نے تیتو میر کے قلعے کو تباہ کر دیا۔ 19 نومبر 1831ء کو 49 سال کی عمر میں وہ اپنے متعدد ہمراہیوں کے ساتھ انگریزوں کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہو گیا۔

شاہ اسمٰعیل شہید (شہادت 1831ء)

ہندوستان کے مشہور عالم و مصلح سید احمد شہید کے رفیق جہاد

نام ونسب: شاہ محمد اسمٰعیل ابن شاہ عبدالغنی بن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ شاہ عبدالغنی حضرت شاہ ولی اللہ کے چوتھے بیٹے تھے۔

پیدائش وتعلیم: 12 ربیع الثانی 1193ھ/ 29 اپریل 1779ء کو پیدا ہوئے۔ قرآن مجید کے علاوہ انہوں نے صرف ونحو کی درسی کتابیں اپنے والد ماجد سے پڑھیں۔ آٹھ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ ان کے والد کی وفات کے بعد شاہ عبدالقادر نے بھتیجے کو بیٹا بنا کر اس کی تعلیم وتربیت خود کی۔

خداداد استعداد کی بنا پر پندرہ سولہ سال کی عمر میں تعلیم سے فارغ ہو گئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے اصلاح وارشاد کا کام شروع کر دیا۔ اسی دوران 1818ء میں سید احمد بریلوی دہلی پہنچے تو انہوں نے سید صاحب کا دامن یوں مضبوطی سے تھام لیا کہ جیتے جی نہیں چھوڑا اور سید صاحب کے حکم پر ہی مہمات جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ پھر سید صاحب نے 1241ھ میں بہ قصد جہاد دارالحرب ہند سے ہجرت کی تو شاہ صاحب مہاجرین ومجاہدین کے اولین قافلے میں شریک تھے۔ پہلے سکھوں سے لڑائیاں شروع ہوئیں جو پنجاب پر قابض تھے اور علاقہ سرحد پر حملے کرتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ علاقہ سرحد میں مقاصد اسلامیہ کے احیا اور قبائل کے اتحاد وتنظیم کے لیے سرگرمی سے کام کیا۔ آخری معرکہ سکھوں کے ساتھ بالا کوٹ کے مقام پر پیش آیا۔ اس معرکے میں جہاں مجاہدین کی ایک بڑی تعداد نے جام شہادت نوش کیا، انہی شہدا میں شاہ اسمٰعیل بھی

شامل تھے۔ ان کے سر یا کنپٹی پر گولی کا نشان تھا۔ اس معرکے میں وہ بھری ہوئی بندوق کندھے پر تھامے اور شمشیر برہنہ ہاتھ میں لیے دشمنوں کی صفوں میں گھس گئے اور جام شہادت نوش کیا۔ ان کو ایک علیحدہ قبر میں دفن کیا گیا تھا۔ ان کی تصنیف ''تقویت الایمان'' بڑی مشہور واہم ہے۔

سید احمد شہید (شہادت 1831ء)

انیسویں صدی کے نصف اول میں ہندوستان کے عالم باعمل، مصلح ومجاہد۔

نام ونسب: دیکھیے ''عظیم قائدین''۔

غازی علم الدین شہید (شہادت 31 اکتوبر 1929ء)

لاہور کا ایک نوجوان جس نے عصمت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بہادرانہ طور پر جان دے دی۔

نام ونسب: لاہور کا عہد برطانوی ہند کا ایک نوجوان جو تعلیم یافتہ بھی نہیں تھا۔ مگر اس کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت کے لیے قربانی کا جذبہ اور محبت تھی۔ 1920ء کی دہائی میں راج پال نامی ایک جنونی ہندو نے جو ایک آریہ سماجی تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے متعلق ایک نازیبا کتاب ''رنگیلا رسول'' چھاپ دی، جس پر اس کے خلاف مقدمہ ضرور چلا مگر برطانوی ہند کے ضابطہ قوانین میں اس گھناؤنے جرم کے لیے کوئی سزا موجود نہ ہونے کی بنا پر اسے بری کر دیا گیا۔ جس پر غازی علم الدین جیسے محب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور خود راج پال کا معاملہ طے کر دینے کا فیصلہ کیا اور 6 اپریل 1929ء کو راج پال کی دوکان پر پہنچ کر اس پر چھریوں کے وار کر کے اُسے جہنم رسید کر دیا اور موقع پر اپنی گرفتاری پیش کر دی۔

ہائی کورٹ نے اسے اس جرم پر سزائے موت کی سزا دی جو پریوی کونسل نے بھی بحال رکھی۔ مسلمانان ہند نے قائداعظم جیسے عظیم وکیل کو اُس کا کیس سونپا جس پر قائداعظم نے غازی علم الدین کو ہدایت دی کہ وہ اس قتل سے انکاری ہو جائے مگر غازی نے یہ ہدایت یہ کہہ کر ٹھکرا دی کہ وہ اپنے اس عظیم کارنامے سے کسی پر انکاری نہیں ہو سکتا۔ 31 اکتوبر 1929ء کو اسے انگریز حکومت نے میانوالی جیل میں پھانسی دے دی۔ اس کی میت کو لاہور لانے کے لیے زبردست مظاہرے شروع ہو گئے چنانچہ 6 نومبر کو اس کی میت لاہور میں مسلمانوں کے حوالے کر دی گئی۔ چاند ماری کے میدان میں لاہور کے لاکھوں آدمیوں نے اس عظیم شہید کی نماز جنازہ ادا کی اور اسے قبرستان میانی صاحب میں دفن کر دیا جہاں اس کی قبر آج بھی مرجع خلائق ہے۔ احقر کو اس عظیم شہید کی تربت پر حاضر ہونے کا شرف حاصل ہے۔

کیپٹن محمد سرور نشان حیدر (شہادت 1948ء)

پاکستان واسلام کے نام پر قربان ہونے والا پاک فوج کا ایک مجاہد

نام ونسب: کیپٹن محمد سرور

وطن کمپنی کے سگنل آفیسر تھے۔ ان کی کمپنی کشمیر کی پہلی جنگ میں بھیجی گئی، محاذ پر پہنچ کر کیپٹن سرور نے جب اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ دشمن نے ایک بلند پہاڑی پر کفیہ خفیہ قبضہ کر کے حفاظتی مورچے بنا لیے ہیں، جہاں سے وہ پاکستانی فوج کی نقل وحرکت پر نگاہ رکھتے ہوئے حملہ بھی باآسانی کر سکتا ہے۔ کیپٹن نے دشمن کو اس اہم پہاڑی سے ہٹانے کا

فیصلہ کیا۔ یہ کام کوئی آسان کام نہیں تھا بلکہ بڑی جان جوکھوں کا کام تھا۔ چنانچہ انہوں نے رات کی تاریکی میں دشمن پر حملے کا منصوبہ بنایا اور پھر خود اپنے جوانوں کو لے کر اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے آگے بڑھے۔ ادھر دشمن کو رات کی تاریکی کے باوجود ان کی نقل وحرکت کا علم ہو گیا۔ چنانچہ مقابل سے بھی گولیاں آنے لگیں، لیکن کیپٹن سرور کلدار توپ اپنے کندھے پر لیے رینگتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ دشمن کی آتش بازی بھی تیز تر ہو گئی۔ تاہم ان کی پیش قدمی نہ رکی اور ایک دستی بم سے انہوں نے دشمن کی کلدار توپ کو خاموش کر دیا، اس کے بعد خود زخم کھاتے ہوئے دشمن کے خاردار تاروں کے حلقے تک پہنچ گئے۔ شدید زخمی ہو جانے کے باوجود گولیاں بھی چلائے جاتے تھے اور خاردار تار بھی کاٹتے جاتے تھے۔ اس طرح انہوں نے راستہ صاف کر دیا اور پاکستانی جوان اپنے سالار کی بہادری کو دیکھ کر جوش کے عالم میں بجلی کی سی تیزی سے دشمن پر ٹوٹ پڑے اور دشمن کو بھگا کر اس پہاڑی پر قبضہ کر لیا مگر اس اثنا میں کیپٹن خود شہادت پا چکے تھے۔ وہ پاکستانی فوج کے پہلے مجاہد تھے جنہیں نشان حیدر بعد از شہادت دیا گیا۔

• میجر راجا عزیز بھٹی شہید (شہادت 1965ء)

پاک فوج کے تیسرے ''جواں مرد'' جنہیں نشان حیدر دیا گیا

نام ونسب: میجر عزیز بھٹی کی زندگی کا ابتدائی دور ہانگ کانگ میں گزرا جہاں ان کے والد راجا عبداللہ بھٹی ملازم تھے۔ 1945ء میں وہ اپنے گاؤں لاڈیاں ضلع گجرات واپس آئے۔ پہلے فضائی فوج میں بھرتی ہوئے پھر 1948ء میں پیدل فوج کو ترجیح دی اور تربیت کے لیے کاکول اکیڈمی میں داخلہ لیا۔

1950ء میں فوجی قواعد وتربیت کی تکمیل پر ان کو اعزازی شمشیر اور سونے کا تمغہ امتیاز عطا ہوا۔ پھر انہوں نے مختلف مقامات پر مزید فوجی تربیت حاصل کی اور کینیڈا کے اسٹاف کالج میں بھی زیر تربیت رہے۔ جرمنی میں جرمن زبان کا نصاب بھی پورا کیا۔ کوئٹہ، سیالکوٹ اور جہلم بھی رہے۔

6 ستمبر 1965ء کو جب بھارت نے اچانک لاہور پر حملہ کر دیا۔ اسی دن صبح سویرے انہیں اس محاذ پر دفاع کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اگرچہ ان کے پاس فوج بہت کم تھی مگر انہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے دشمن کے تمام حملوں کو ناکام بنا دیا۔ تاہم اس دوران وہ خطروں سے کھیلتے رہے۔ اور آرام وخوراک سے بے نیاز ہو گئے۔ کمانڈنگ آفیسر نے انہیں بلا کر دو مرتبہ آرام کرنے کا مشورہ دیا مگر میجر محاذ پر ڈٹے رہے۔ پھر جب حکم ملا کہ پاکستانی فوج بی آر بی نہر کے دائیں کنارے پر آجائے تو انہوں نے اپنے جوانوں کو پہلے دائیں کنارے پر بھیجا اور خود سب سے آخر میں وہاں پہنچے۔ دائیں کنارے پر محاذ کا معائنہ کرتے ہوئے اور دشمن کی نقل وحرکت کا جائزہ لیتے ہوئے 12 ستمبر کو صبح 91/2 بجے دشمن کا ایک گولہ ان کے شانے پر لگا اور وہ شہید ہو گئے۔ وہ پاک فوج کے تیسرے جواں مرد تھے جنہیں نشان حیدر سے نوازا گیا۔

سرفراز احمد رفیقی شہید (شہادت 1965ء)

پاکستان ایئر فورس کا وہ اسکواڈرن لیڈر جس نے انتہائی مشکلات میں بھی اپنے فرائض ادا کیے

نام ونسب: سرفراز احمد رفیقی، اسکواڈرن لیڈر، ہلال جرأت۔

1965ء کی پاک وبھارت جنگ میں اس نے صرف تین طیاروں کے ساتھ ہلواڑہ کے بھارتی ایریبس پر حملہ کیا۔ انہیں معلوم تھا کہ نشانے پر پہنچنے اور واپس آنے میں شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا، لیکن یہ جوانمرد مجاہد مشکلات سے ذرا

نہ گھبرایا اور نہ ہی فرائض کی ادائیگی میں اسے کوئی خوف اور ہچکچاہٹ محسوس ہوئی، رفیقی کو ہلواڑہ جاتے ہوئے بھی راستے میں بھارتی طیاروں نے روکنے کی کوشش کی مگر وہ اپنے پختہ عزم کے ساتھ ہلواڑہ کا بھارتی ایربیس تباہ کرتے رہے۔

اس کے بعد دشمن کے دس طیاروں نے اس چھوٹے سے فضائی دستے کو گھیر لیا۔ اسکواڈرن لیڈر رفیقی نے ایک ہی فائر میں دشمن کے ایک طیارے کے پرخچے اڑا دیئے مگر جب دوسرے فائر کے لیے ہاتھ بڑھایا تو پتہ چلا کہ آتش بار توپ خراب ہو چکی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اب دفاعی پوزیشن اختیار کر لی مگر میدان چھوڑ کر بھاگنا انہیں گوارہ نہ ہوا۔ اس مقابلے میں آخر دشمن نے ان کا طیارہ تباہ کر دیا اور انہوں نے شہادت پائی مگر وہ ولولہ انگیز قیادت وشجاعت اور ادائے فرض کی ایک زندہ و جاوید مثال اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔

راشد منہاس (شہادت 1971ء)

پاکستان کا سب سے کم عمر مجاہد جس نے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا

نام ونسب: راشد منہاس 17 فروری 1951ء کو پیدا ہوا 1968ء میں اس نے پاک فضائیہ میں ایک پائیلٹ کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی۔ تربیت کے تین سال انتہائی خوشگوار گزرے اور وہ تنہا جیٹ طیارہ اڑانے کی منزل کو پہنچ گیا۔

20 اگست 1971ء کو جب اس نے دوسری مرتبہ تنہا پرواز کرنے کے لیے تقریباً صبح گیارہ بج کر چھبیس منٹ پر اپنے طیارے کے انجن کو متحرک کیا تو اچانک ٹریننگ یونٹ کا ایک فرد مطیع الرحمان اس کے طیارے میں آن بیٹھا۔ پھر جب طیارہ فضا میں پہنچا تو مطیع الرحمان نے طیارہ کا کنٹرول خود سنبھال لیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اپنے رفیقوں کو پیغام دیا کہ ”میں جے پور بھارت جا رہا ہوں تم میرے بال بچوں کو لے کر بھارتی ہائی کمیشن پہنچ جاؤ۔“ جب یہ خوفناک حقیقت راشد منہاس پر آشکارا ہوئی تو اس نے کنٹرول ٹاور کو پیغام بھیجا کہ مجھے ہائی جیک کیا جا رہا ہے۔ مطیع الرحمان طیارے کو ریڈار سے بچنے کے لیے صرف 30یا40 فٹ کی بلندی پر اڑا رہا تھا۔ ان حالات میں راشد منہاس اور مطیع الرحمان میں شدید کشمکش شروع ہو گئی۔ بھارت کی سرحد اب صرف 35 میل دور رہ گئی، ان حالات میں راشد منہاس نے جوانمردانہ فیصلہ کرتے ہوئے طیارے کا رخ زمین کی طرف کر دیا اور مطیع الرحمان کے ناپاک عزم کو طیارے کے تباہ شدہ ملبے میں بھسم کر کے پاکستان کی آن کو بچا لیا۔ اس طرح اس بیس سالہ نوجوان نے وہ عظیم کارنامہ انجام دیا کہ پاکستان کے پاس جس کے لیے نشان حیدر سے بڑا کوئی اعزاز نہیں تھا جو اس سرفروش مجاہد کو دیا جا سکتا۔ ع، باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم   سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

میجر شبیر شریف شہید (شہادت 1971ء)

پاکستان کا وہ جری فوجی کمانڈر جس نے آخری سانس تک اپنے مشن کی تکمیل کی۔

نام ونسب: شبیر شریف، گجرات کے تاریخی قصبہ کنجاہ میں 28 اپریل 1948ء کو پیدا ہوئے اور 1964ء میں پاک فوج میں کمیشن حاصل کیا اور چھٹی فرنٹیئر فورس رجمنٹ سے منسلک ہوئے۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں ستارہ جرات کا اعزاز بھمب جوڑیاں کے محاذ پر خدمات انجام دینے پر حاصل کیا۔

1971ء کی پاک بھارت جنگ میں جرات، بہادری، بلند حوصلگی اور نظم وضبط کی قابل تقلید مثال قائم کی۔ وہ تین دن اور تین راتیں مسلسل دشمن کے خلاف سینہ سپر رہے اور انہوں نے دشمن کے ناپاک عزائم خاک میں ملا دیئے۔ 3 دسمبر 1971ء کو جب مکار دشمن نے مغربی پاکستان پر حملہ کیا تو انہیں سلیمانکی سیکٹر میں اس بند پر قبضہ کرنے کا حکم دیا گیا جو بھارت

کے سرحدی دیہات گورکھ گھیرااور بیری والا سے نظر آتا تھا۔ اس بند پر بھارت کی آسام رجمنٹ متعین تھی۔ میجر صاحب حکم ملتے ہی دشمن پر برق بن کر گرے اور آن واحد میں اس کے تمام مورچوں کو روند ڈالا۔ سب سے پہلے انہوں نے آگے بڑھ کر دشمن کی چوکی جھانگڑ پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد اپنے ساتھیوں سمیت بارودی سرنگوں کی پرواہ کیے بغیر 30 فٹ چوڑی نہر کو تیر کر عبور کی۔ نہر کے دوسرے کنارے پر دشمن کے ساتھ دست بدست جنگ شروع ہوگئی جس میں جلد ہی دشمن اپنے پختہ مورچے چھوڑنے پر مجبور ہوگیا۔ اس جنگ میں 43 بھارتی فوجی مارے گئے چار ٹینک تباہ ہوگئے۔ 6 دسمبر کو دشمن نے ایک بار پھر زبردست حملہ کیا۔ اسی حملے کے دوران میجر صاحب اپنے مورچے سے باہر آئے اور انہوں نے بھارتی فوج کے ایک کمانڈر میجر نرائن کو اسی کی مشین گن سے ہلاک کر دیا اور دشمن کی پوری بٹالین کا صفایا کر دیا۔ میجر صاحب توپ سے دشمن کے ٹینکوں کو نشانہ بنا رہے تھے کہ ایک گولہ انہیں آ کر لگا اور وہ اپنا مشن مکمل کرتے ہوئے شہید ہوگئے۔

کیپٹن کرنل شیر خان شہید (شہادت 1999ء)

پاکستانی فوج کے دسویں نشان حیدر کے حامل جنہوں نے اپنی بہادری کی وجہ سے نشان حیدر حاصل کیا

نام ونسب: کیپٹن کرنل شیر خاں، 27 ویں سندھ رجمنٹ آف پاکستان آرمی میں کیپٹن کے عہدے پر فائز تھے۔

پیدائش: یکم جنوری 1970ء کو سوابل، خیبر پختونخواہ میں پیدا ہوئے۔ 1994ء میں پاکستان آرمی کو جوائن کیا۔ ابتدائی فوجی ٹریننگ کی تکمیل کے بعد خان کو رسالپور میں ایرونائیکل الیکٹرک فنز مقرر کیا گیا۔ پھر اس نے پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں داخلہ لے لیا۔ گریجویشن کی تکمیل کے بعد اس کی پوسٹنگ اوکاڑہ میں 27 ویں سندھ رجمنٹ میں کی گئی۔ جنوری 1998ء میں اس نے رضاکارانہ طور پر 12NLI میں کشمیر میں اپنی پوسٹنگ کرالی۔ ان کی شہادت کے بعد ان کے بھائی نے ایک ٹیلیوژن انٹرویو میں بتایا تھا کہ وہ اپنے والدین کی خواہش کے احترام میں فوج میں بھرتی ہوئی تھے۔

کیپٹن شیر خان نے کارگل کی جنگ کے دوران گالٹری اور وادی مشکوش کے گرد حفاظتی چوکیاں قائم کیں اور ان کا کامیابی سے دفاع کیا۔ اگرچہ بھارتی فوج کی طرف سے الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے ٹائیگر ہل کی ایک چوکی پر قبضہ کر رکھا تھا، تاہم پاکستانی فوج اس الزام کو تسلیم نہیں کرتی۔ بہرحال کارگل محاذ پر کیپٹن شیر خان نے انتہائی بہادری سے اپنی پوزیشن کا دفاع کیا۔ اس کا اعتراف خود بھارتی فوج نے بھی کیا ہے۔ ان کے مقابل آنے والی بھارتی فوج تعداد اور اسلحے میں کہیں زیادہ برتری رکھتی تھی، تاہم انہوں نے بھارتی فوج کی آٹھویں سکھ رجمنٹ کو شکست دے کر پیچھے دھکیل دیا۔ آخر میں ان کے ساتھ صرف چند ساتھی رہ گئے مگر مورچہ چھوڑنے کی بجائے انہوں نے آگے بڑھ کر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا اور دشمن کے کیمپ تک جا پہنچے، مگر دشمن کے سپاہیوں نے ان کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ اسی گھیرے کو توڑنے کی کوشش میں انہوں نے جام شہادت نوش کیا اور پاکستانی فوج کے دسویں نشان حیدر کے حقدار قرار پائے۔

خواتینِ اسلام

حضرت سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا بنت وہب

ام المومنین حضرت سیدہ خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا (م 10 نبوت/619ء)

ام المومنین حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا (م58ھ/678ء)

حضرت سیدہ زینب رضی اللہ عنہا بنت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم (م8ھ/630ء)

حضرت سیدۃ النساء فاطمۃ الزاہرہ رضی اللہ عنہا (م 11ھ/632ء)

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بنت حیٰ بن اخطب (م تقریباً50ھ/670ء)

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا حضرت ام ایمن (م نواح73ھ/692ء)

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بنت عبدالمطلب (م20ھ/641ء)

حضرت خولہ بنت ازور (م34ھ/654ء)

حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا (م60ھ/680ء)

حضرت زینب بنت علی رضی اللہ عنہا (م62ھ/680ء)

حضرت سکینہ بنت الحسین رضی اللہ عنہا (م117ھ/735ء)

حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا (م185ھ/801ء)

خیزران بنت عطا (م183ھ/799ء)

ملکہ زبیدہ (م216ھ/801ء)

لبنیٰ قرطبی (م984ء)

ترکان خاتون (م487ھ/1094ء)

شجرۃ الدر (م655ھ/1257ء)

بغداد خاتون (م736ھ/1335ء)

محد شام ہانی (م870ھ/1460!)

ملکہ عائشہ الحرئی (حیات1492ء)

خرم روگزیلینا (م966ھ/1558ء) رہا محرک

چاند بی بی (م1008ھ/1600ء)

شہزادی عباسہ

فاطمہ الفہری (م266ھ/880ء)

ست الملک (م413ھ/1023ء)

اروی بنت اسماء

رضیہ سلطانہ (م637ھ/1240ء)

لِلّٰہ عارفہ (حیات781ھ/1379ء)

ملکہ خدیجہ آف مالدیپ (781ھ/1380ء)

ماہم انگہ (م982ھ/1562ء)

گلبدن بیگم (م1011ھ/1603ء)

ملکہ نور جہاں (م1056ھ/1645ء)

ملکہ ممتاز محل (م 1040ھ/1631ء)
زیب النسا بیگم (م 1114ھ/1702ء)
سکندر بیگم (م 1288ھ/1871ء)
بی اماں (م 1924ء)
عصمت چغتائی (1976ء)
عطیہ بیگم فیضی (1967ء)
بیگم ثریا خورشید (1958ء)
پروین شاکر (م 1994ء)
خالدہ ضیاء (حیات 1991ء)
شیخ حسینہ واجد (حیات 1996ء)
بیگم نسیم ولی خاں (حیات 1977ء)
اشرف پہلوی (م 2016ء)
رضیہ بھٹی (م 1996ء)
ملالہ یوسف زئی (حیات 2016ء)
زینب الغزالی (م 2005ء)

جہاں آرا بیگم صاحب جی (حیات 1109ھ/1694ء)
حضرت محل (حیات 1274ھ/1857ء)
شاہجہان بیگم (1319ھ/1901ء)
قرۃ العین حیدر (م 2007ء)
عدیلہ خانم
مادر ملت فاطمہ جناح (1967ء)
زبیدہ آغا (م 1997ء)
بے نظیر بھٹو (م 2007ء)
تانسو چلر (حیات 1993ء)
میگاوتی سوئیکارنو (1999ء)
ملکہ نور الحسین (حیات 1978ء)
توکل کرمان (حیات 2011ء)
عاصمہ جہانگیر (2016ء)
شیخہ منیرہ قبیسی
عزیزہ الہبری

ام رسول، حضرت سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا بنت وہب

کائنات کی سب سے افضل ماں، والدۂ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نسب عالی: سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا بنت وھب بن عبد المناف زھرۃ القرشی۔ آپ کی والدہ برہ بنت عبد العزیٰ بن عثمان بن عبد الدار تھیں۔ روایت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہا کے ولی آپ کے چچا، وہب بن عبد المناف زھرۃ القرشی تھے اور جس روز انھوں نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عبد المطلب کے ساتھ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کی منگنی کی تھی اسی روز اپنی بیٹی ہالہ بنت وہب کی نسبت حضرت عبد المطلب رضی اللہ عنہا کے ساتھ کردی تھی (طبقات ابن سعد)

معلوم ہوتا ہے کہ نکاح کے بعد بھی حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا اپنے میکے ہی میں رہیں، اور حضرت عبداللہ ان کے ہاں آتے جاتے رہے۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں عام روایت یہی ملتی ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیدا ہونے سے پہلے وفات پا گئے تھے۔ جب تک سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا زندہ رہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کی نگرانی میں پرورش پائی، گویا بظاہر انہیں کے گھر والوں کے ساتھ رہے۔ (سوائے اس زمانے کے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بدوی قبیلے کی انا، سیدہ حلیمہ رضی اللہ عنہا کے پاس صحرا میں بھیج دیا گیا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چھ سال کی عمر کو پہنچے تو سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا نے مدینہ سے واپس آتے ہوئے، جہاں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ننہالی عزیزوں سے ملنے کے لیے تشریف لے گئیں تھیں، مقام ابواء پر جو مکہ اور مدینہ منورہ کے درمیان واقع ہے، وفات پائی (577ء) حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کے سفر مدینہ کے مکمل کوائف نہیں ملتے تاہم محققین کے نزدیک مذکورہ بالا روایت کورد

کرنے کی کوئی معقول وجہ بھی نہیں ہے۔

ایک اور روایت کی رو سے، جو ابن ہشام سے مروی ہے جب آپ رضی اللہ عنہا حاملہ تھیں تو ایک رات آپ رضی اللہ عنہا نے دیکھا تھا کہ ایک نور آپ کے جسد انور سے نکلا اور اسے ملک شام کے شہر بصریٰ کے محلات آپ کو نظر آئے تھے۔ والدہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خواب کی تعبیر خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم تھے کہ جنہوں نے پوری دنیا کو منور کر دیا۔

ام المومنین حضرت سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا (م 10 نبوت/ 619ء)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی زوجہ محترمہ اور دنیا میں سب سے پہلے اسلام لانے والی خاتون

نسب عالی: حضرت سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی، حضرت سیدہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا نسب نامہ اکیس پشتوں کے بعد معد بن عدنان سے جا ملتا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہا کا نسب نامہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اتنی پشتوں تک آپ رضی اللہ عنہا کی دادیوں کے نام بھی معلوم ہیں۔ اسی طرح آپ رضی اللہ عنہا کی والدہ فاطمہ بنت زائدہ کا نسب نامہ چھ پشتوں تک نانیوں کے نام کے ساتھ کتب میں درج ہے۔ آپ رضی اللہ عنہا کا لقب طاہرہ، کنیت، ام ہند تھی اور آپ مکہ کی نہایت معزز اور متمول خاتون تھیں۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نیکی اور امانت داری دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا تجارتی نمائندہ منتخب کیا تھا اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اسباب تجارت باہر کے ملکوں کو بھیجتی تھیں پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق سے متاثر ہو کر انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت نکاح بھجوائی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا کے مشورے سے قبول کر لی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے 595ء میں نکاح فرمایا۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پچیس سال اور سیدہ کی عمر تقریباً 40 سال تھی۔ یہ شادی بڑی کامیاب اور بابرکت رہی۔ اس مقدس جوڑے کے ہاں دو بیٹے بھی پیدا ہوئے مگر وہ بچپن ہی میں داغ مفارقت دے گئے۔ چار بیٹیاں، حضرت زینب رضی اللہ عنہا، حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا، حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا اور حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا تھیں جو والدہ کی وفات کے بعد بھی حیات تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس مونس و ہمدرد رفیقہ حیات کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ انہوں نے تاریخ اسلام میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں دوسری شادی نہیں کی۔ وفات کے بعد بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ان کی تعریف کرتے تھے اور ان کی سہیلیوں سے بھی حسن سلوک فرماتے تھے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ہجرت سے تین سال پہلے 619ء میں بعمر 65 سال وفات پائی اور مکہ کے قبرستان جنت المعلیٰ میں دفن ہوئیں۔ نزول وحی کے موقع پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھبرا گئے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جن الفاظ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ڈھارس بندھائی تھی وہ الفاظ آج بھی کتب تاریخ میں آپ رضی اللہ عنہا کی ذہانت کا پتہ دیتے ہیں۔

ام المومنین حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا (م 58ھ/ 678ء)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دختر اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی چہیتی زوجہ، تقریباً دو ہزار حدیث کی راوی

نسب عالی: حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بنت ابی بکر بن ابی قحافہ، والدہ کا نام ام رومان، زینب رضی اللہ عنہا بنت عمیر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں صرف یہی باکرہ (کنواری) تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم کے وصال کے بعد تقریباً آدھی صدی تک زندہ رہ کر مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی کنیت ان کے بھانجے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے نام پر ام عبداللہ رکھی تھی۔ حضرت عبداللہ کو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنا متبنیٰ بنالیا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا نکاح نبوت کے دسویں سال ہوا۔ مہر کی رقم پانچ سو درہم مقرر ہوئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی ہجرت کے چند ماہ بعد یعنی شوال 1ھ/ اپریل 623ء مدینہ منورہ میں نہایت سادگی کے ساتھ ہوئی، مورخین کے مطابق اس وقت سیدہ کی عمر نو برس تھی بعض جدید سیرت نگاروں نے رخصتی کے وقت ان کی عمر پندرہ سال قرار دی ہے۔

حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا مورخین کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب ترین رفیقہ حیات تھیں۔ چونکہ ان کا رنگ سرخ وسپید تھا اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو "حمیرا" کے لقب سے پکارتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہا نہ صرف حسن ظاہری سے متصف تھیں بلکہ آپ کی ذہانت، عقل مندی اور باریک بینی آنکھیں دیگر ازواج مطہرات سے ممتاز کرتی تھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زندگی کا اہم ترین واقعہ ان پر جھوٹے بہتان کا ہے جسے قرآن مجید میں "الافک" کہا گیا۔ سیدہ کی برات میں سورۃ النور کی آیات نازل ہوئیں جن کے بعد سیدہ رضی اللہ عنہا سرخرو ہوگئیں کہ ان کی پاکدامنی کی گواہی خود اللہ نے دی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت سیدہ کی عمر مورخین نے اٹھارہ برس بتائی ہے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہا کی شہادت کے بعد لوگوں کی پیدا کردہ بدگمانی کی وجہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حامیوں کے درمیان جنگ جمل لڑی گئی جس کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو باقی زندگی بڑا افسوس رہا۔ سیدہ کا شمار کثیر الروایہ صحابہ میں ہوتا ہے آپ سے 2286 احادیث مروی ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہا نے 58ھ میں بعہد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ وفات پائی۔

حضرت سیدہ زینب رضی اللہ عنہا بنت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم (م 8ھ/630ء)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی صاحبزادی

نسب عالی: حضرت زینب بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم۔ ان کی والدہ حضرت سیدہ خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ عمر میں سب صاحبزادیوں سے بڑی تھیں۔ ان کی شادی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعث سے پہلے ہی اپنے عم زاد بھائی ابوالعاص بن الربیع کے ساتھ ہوگئی تھی۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی تو اس وقت وہ طائف میں تھیں اور مدینہ منورہ ہجرت نہ کرسکیں تھیں۔ ان کے شوہر جو ابھی تک مشرک تھے، جب غزوہ بدر کے موقع پر گرفتار ہوئے تو ان کی رہائی کے لیے فدیہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے اپنے اس ہار کی شکل میں بھیجا جو ان کی والدہ کا تھا۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوالعاص کو اس شرط پر رہا کردیا کہ وہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو مدینہ منورہ بھیج دیں گے، لیکن اثنائے راہ میں ان کو ایک حادثہ پیش آگیا جس کے نتیجے میں وہ فوت ہوگئیں۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ یہ حادثہ 8ھ میں پیش آیا تھا اور وہ ان کے انتقال کو 8ھ کا واقعہ بتاتے ہیں، جو زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

سریہ عیص 6ھ میں ان کے شوہر دوسری بار گرفتار ہوئے اور ان کی سفارش پر رہا کردیئے گئے۔ انہوں نے 7ھ میں اسلام قبول کیا اور ان کی شادی دوبارہ ان سے کردی گئی۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا انتقال 8ھ میں مدینہ منورہ میں

ہوا۔ ان کی دو اولادیں تھیں۔ ایک بچہ تو کم سنی میں فوت ہوگیا تھا۔ دوسری بچی امامہ تھیں جن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد نکاح کیا تھا۔

سیدۃ النسا العالمین، حضرت فاطمۃ الزاہرہ رضی اللہ عنہا (م 11ھ/632ء)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے چھوٹی اور چہیتی صاحبزادی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ اور حسنین کی والدہ ماجدہ

نسب عالی: حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم۔ ان کی والدہ معظمہ سیدہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ہیں جو مکہ کی سب سے معزز خاتون تھیں۔ بعثت نبوی سے پانچ برس پہلے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے پیدا ہوئیں۔ پندرہ سولہ برس کی تھیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نکاح ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سب بیٹیوں سے انتہائی شفقت سے پیش آتے تھے۔ مگر سیدۃ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی بڑی عزت کرتے اور ان سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صرف چھ ماہ بعد وفات پائی۔ وفات کے وقت عمر 28 سال تھی۔ نماز جنازہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔ جنت البقیع میں مدفون ہوئیں۔

آپ رضی اللہ عنہا کے بطن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پانچ اولادیں پیدا ہوئیں، حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ، حضرت زینب بنت علی رضی اللہ عنہا اور حضرت محسن رضی اللہ عنہ اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا۔ الزہرا آپ رضی اللہ عنہا کا لقب تھا۔ دیگر القاب میں البتول، معصوم السیدہ، الطاہرہ، مریم الکبریٰ شامل ہیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا رفتار و گفتار میں اپنے والد گرامی قدر صلی اللہ علیہ وسلم کی ہو بہو تصویر تھیں۔ وہ اپنی عظیم والدہ کی جانشین بھی تھیں۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غم گساری و خدمت سے ایک آن کے لیے بھی غافل نہ ہوتی تھیں۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر طائف سے لوٹے تھے اور دشمنوں کی دی ہوئی اذیتوں سے چور چور تھے تو سب سے زیادہ خدمت حضرت نے کی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد فدک کی زمینوں کے موروثی ہونے کے مطالبہ کرنے پر حضرت سیدہ نے کی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد فدک کی زمینوں کے موروثی ہونے کے مطالبہ کرنے پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سیدہ کو وہ حدیث یاد دلائی تھی جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ہم انبیاء نہ کسی کے وارث ہوئے اور نہ کوئی ہمارا وارث ہوتا۔ اس پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ترکہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالبہ کر دیا، اس سلسلے سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے درمیان جو ناراضگی پیدا ہوگئی تھی وہ بھی آپ رضی اللہ عنہ کی بیماری کے وقت دور ہوگئی تھی۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بنت حیی بن اخطب (م تقریباً 50ھ/670ء)

ام المومنین، اخلاق اور علم و فضل میں ممتاز خاتون، بنونضیر کے رئیس کی بیٹی

نام و نسب: مدینہ کے ممتاز یہودی قبیلے بنوالنضیر سے تھیں۔ آپ کے والد بنونضیر کے رئیس حیی بن اخطب اور والدہ برۃ بنت سموال تھیں۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا اصل نام زینب تھا۔ صفیہ نام کی توجیہ محققین نے یہ دی ہے کہ عرب میں مال غنیمت کا جو حصہ امام یا بادشاہ کے لیے مخصوص ہو جاتا تھا اسے صفیہ کہتے تھے۔ چونکہ آپ رضی اللہ عنہا جنگ خیبر میں عرب کے اسی دستور کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئی تھیں، اس لیے صفیہ کے نام سے مشہور ہوگئی تھیں (الزرقانی)

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی شادی پہلے سلام بن مشکم رئیس بنوقریظہ سے ہوئی تھی، لیکن جب اس نے طلاق دے دی تو کنانہ ابن الربیع بن ابی الحقیق کے نکاح میں آئیں جو بنونضیر کا سردار تھا۔ کنانہ جنگ خیبر میں کام آیا (محرم 7ھ)۔

خیبر کے چھ قلعے تھے جن میں قلعہ قموص سب سے مضبوط تھا۔ جب اس قلعے پر اسلام کا پرچم لہرایا تو حضرت صفیہ

اسیر ہو کر لشکر اسلام میں آئیں۔ ان کے والد، چچا اور شوہر سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خصومت رکھتے تھے سب اس جنگ میں مارے گئے۔ جب حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی گئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر اپنی چادر مبارک ڈال دی جو اس بات کی علامت تھی کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص ہیں۔ بعد ازاں مسلمان کرنے کے بعد انہیں آزاد کر دیا اور انتہائی عزت کے ساتھ ازواج مطہرات کے زمرے میں داخل فرمایا۔ بعد ازاں حضرت صفیہ دیگر ازواج مطہرات کی طرح علم وفضل کا مرکز تھیں اور لوگ ان سے مسائل دریافت کرنے کے لیے آتے تھے۔ محاسن اخلاق میں بھی ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ آپ رضی اللہ عنہا بڑی عاقلہ تھیں۔

مدینہ منورہ میں وفات پائی، آخری دور میں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بڑا ساتھ دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا نکاح 18 برس کی عمر میں ہوا تھا۔

حضرت حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا (24ھ/644ء)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ باندی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے والد کے ترکے میں ملی اور جسے آپ ''ماں'' کہتے تھے۔

نام ونسب: برکتہ بنت ثعلبہ بن عمرو بن حصن، کنیت ام ایمن تھی جوان کے بیٹے ایمن بن عبید کے نام پر تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش حضرت ام ایمن کے ہاتھوں میں ہوئی تھی۔ اسی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ ''ام ایمن میری ماں ہیں، میری ماں کے بعد''۔ ان کا پہلا نکاح حضرت عبید بن زید سے ہوا تھا جن سے ان کے صاحبزادے ایمن بن عبید تھے۔ جب حضرت عبید بن زید غزوہ حنین میں شہید ہوگئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح حضرت زید رضی اللہ عنہا بن حارثہ سے کرا دیا۔ حضرت ام ایمن نے پہلی ہجرت حبشہ کی طرف کی تھی اور پھر وہاں سے مدینہ ہجرت کی تھی۔

حضرت ام ایمن کے بطن سے دو لڑکے پیدا ہوئے، ایمن اور اسامہ۔ اسامہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب صحابہ میں سے تھے۔ حضرت ام ایمن نے غزوہ احد میں شرکت کی تھی اور زخمیوں کو پانی پلانے اور ان کی مرہم پٹی کرنے میں دوسری خواتین کے ساتھ شریک تھیں۔ معرکہ خیبر میں بھی شریک رہیں۔ حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے 20 دن بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں 24ھ/644ء میں وفات پائی۔

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا (م نواح 73ھ/692ء)

ذات النطاقین، مشہور صحابیہ، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی والدہ

نام ونسب: حضرت اسماء بنت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بن ابی قحافہ، لقب ذات النطاقین تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سب سے بڑی صاحبزادی جو ہجرت سے ستائیس برس پہلے قتیلہ بنت عبدالعزیٰ کے بطن سے مکہ میں پیدا ہوئیں۔ وہ سن شعور کو پہنچیں تو جبل فاران کی چوٹیاں اسلام کے اجالے سے روشن ہو چکی تھیں۔ انہوں نے بھی السابقون الاولون کی طرح اسلام قبول کرنے میں سبقت فرمائی اور وہ سب سختیاں برداشت کیں جو دور ابتلاء میں مسلمانوں کو پیش آئیں۔ حضرت اسماء کا شمار بڑی جلیل القدر صحابیات میں ہوتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کا ارادہ فرمایا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاں تشریف لائے تو حضرت

اسماء نے سفر کے لیے سامان خوردنوش تیار کیا لیکن اسے باندھنے کے لیے جب کوئی شے نہ ملی تو اپنے کمر بند، نطاق کو چاک کر کے اس کے دو حصے کیے اور ایک ٹکڑے سے ناشتہ دان اور دوسرے سے مشکیزے کا منہ بند کیا یوں آپ رضی اللہ عنہا کا لقب ذات النطاقین ہو گیا۔ آپ رضی اللہ عنہا کی شادی حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بن عوام، ''حواری رسول'' سے ہوئی۔ ہجرت کے فوراً مدینہ میں مسلمانوں میں جو پہلا بچہ پیدا ہوا وہ آپ رضی اللہ عنہا کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ تھے۔

کئی سال کی ازدواجی زندگی کے بعد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے انہیں طلاق دے دی تھی جس کی وجہ ان کی تیز مزاجی تھی۔

آپ رضی اللہ عنہا نے باقی زندگی اپنے صاحبزادے عبداللہ کے ساتھ گزار دی۔ حضرت اسماء کی زندگی کا سب سے الم ناک واقعہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت ہے جب مکہ میں حضرت اسماء نے اپنے بیٹے کی ہمت بڑھائی کہ راہ حق میں شہید کائے جانے یا مثلہ کیے جانے سے نہ ڈرو۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے ان کی لاش تین دن تک سولی تک لٹکتی رہی پھر حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے اصرار پر اسے ان کے حوالے کر دیا گیا۔ بیٹے کی شہادت کے چندروز بعد 73ھ میں آپ رضی اللہ عنہا نے بھی وفات پائی۔ وفات کے وقت آپ کی عمر سو برس تھی۔ آپ بالطبع بڑی فیاض، بڑی صابر اور قانع تھیں، افلاس اور تنگدستی کو بھی خوشی سے برداشت کیا تھا۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بنت عبدالمطلب (م 20ھ/641ء)

پھوپھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم، سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی سگی بہن اور وہ بہادر ہاشمی خاتون جو غزوہ خندق میں شریک جہاد تھیں

نسب عالی: حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بنت عبدالمطلب بن ہاشم۔ ان کی والدہ ہالہ بنت وہب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خالہ تھیں۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے والد حضرت عبداللہ کی علاتی اور سید الشہداء حضرت حمزہ کی سگی بہن تھیں۔

ان کی ولادت اسی سال ہوئی جس سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ہوئی تھی۔ جاہلیت کے زمانے میں ان کا نکاح حارث بن حرب کے ساتھ ہوا تھا جو ابوسفیان کا بھائی تھا۔ اس کے انتقال کے بعد ان کا نکاح عوام بن خویلد سے ہوا۔ ان سے دو بیٹے پیدا ہوئے، ایک حضرت زبیر رضی اللہ عنہ جو ''حواری رسول'' کے لقب سے سرفراز ہوئے اور دوسرے سائب جو عبدالکعبہ کے نام سے بھی جانے جاتے تھے۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا ہجرت سے پہلے اسلام لائی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چھ پھوپھیوں میں سے یہی ایک ایسی خاتون ہیں جن کے اسلام لانے پر مورخین اسلام متفق ہیں۔

جنگ احد 3ھ میں جب حضرت حمزہ رضی اللہ عنہا کی شہادت کا دردناک واقعہ پیش آیا جس میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا مثلہ کر دیا گیا یہاں تک کہ ہندہ نے سید الشہداء کا کلیجہ چبا ڈالا۔ اس موقع پر حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا اپنے شہید بھائی کی لاش دیکھنا چاہتی تھیں، انتہائی صبر سے کام لیتے ہوئے اپنے بھائی کی مثلہ کی گئی لاش کو دیکھا اور دعائے مغفرت کی۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی زندگی کا اہم ترین واقعہ غزوہ خندق کے دوران پیش آیا۔ جب حضرت حسان رضی اللہ عنہ بن ثابت کو مسلم خواتین اور بچوں کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ ایک یہودی شرپسند خواتین والے حصے کے دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ اس وقت اس حصے میں حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ موجود تھے۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے انھیں کہا کہ اس سرپسند کو قتل کر دو جو حضرت حسان رضی اللہ عنہ سے نہ ہو سکا۔ اس پر خود آگے بڑھیں اور اس یہودی پر حملہ کر دیا۔ اس کے سر پر ایسی ضرب ماری کہ وہ گر کر مر گیا۔ پھر خود اس یہودی کا سر کاٹ کر دیوار کے نیچے پھینک دیا جس سے اس یہودی

کے ساتھی ڈر گئے اور انہیں حملے کی جرات نہ ہوئی۔ آپ رضی اللہ عنہا نے 20ھ میں وفات پائی۔

حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا، نصیبہ

صحابیہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی وہ عظیم جری اور بہادر خاتون جس نے حفاظت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں تلوار اٹھائی

نام ونسب: تاریخ اسلام کے اوراق میں ان کے جرات آموز کارنامے کی بنا پر ام عمارہ رضی اللہ عنہا کے نام سے وہ زندہ جاوید ہوگئیں۔ جنگ احد کے موقع پر وہ میدان جنگ میں کب اور کیونکر پہنچیں، اس کا تو پتہ نہیں چلتا لیکن ہمیں وہ تاریخ کے اوراق میں اس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک تر نظر آتی ہیں جب ہنگامہ کارزار میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم دشمنوں کے نرغے میں پھنسے ہوئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تیر وتلوار سے دشمن پے در پے حملے کر رہے تھے۔ صورت حال اس قدر خطرناک ومہیب تھی کہ بڑے بڑے سورماؤں کا پتہ پانی ہوا جاتا تھا، لیکن ام عمارہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دفاع میں بے خوف خطر سینہ سپر ہوگئیں اور اس بے جگری سے لڑیں کہ اگر اس زمانے میں جرات اور بہادری دکھانے پر اعزاز دینے کا رواج ہوتا وہ یقیناً اعلیٰ ترین اعزاز کی مستحق قرار پائیں۔ ان کی غیر معمولی جرأت اور شجاعت اور جاں فروشانہ کردار کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ قریش کا ایک نامور سورما ابن قمیہ جب تیزی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ آور ہوا تو حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا لپک کر آگے بڑھیں اور اسے اپنی تلوار سے روکا۔ ابن قمیہ نے جھنجھلا کر ان پر وار کیا اور اس کی تلوار ان کے کندھے میں اتر گئی۔ حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا یہ زخم کھانے کے بعد کسی زخمی شیرنی کی طرح جوابی طور پر اس پر جھپٹیں اور اس کافر کو تلوار ماری مگر ابن قمیہ دہری زرہ پہنے ہوئے تھا اس لیے بچ گیا مگر یہ بہادر انصاری خاتون بے ہوش ہو کر گر گئیں۔ جب انہیں ہوش آیا تو میدان جنگ میں ان کا بھائی، باپ اور شوہر شہید ہوگئے تھے، لیکن وہ ہر شکیب وباخبر ملنے کے بعد خیریت رسول صلی اللہ علیہ وسلم دریافت کرتی رہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی افواہ پر وہ بے حد مضطرب وغمزدہ تھیں۔ جب اس مجاہد خاتون کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی تو بے اختیار پکار اٹھیں، ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہوئے ہر مصیبت ہیچ ہے۔“

حضرت خولہ بنت ازور

اسلام کے ابتدائی دور کی ایک شجاع ترین خاتون اور شاعرہ

نام ونسب: خولہ بنت ازور، ان کے بھائی ضرار بن ازور تھے۔ ان کے ساتھ وہ فتوحات شام کی جنگوں میں شریک ہوئیں اور غیر معمولی جرأت کا ثبوت دیا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ ایک موقع پر اتفاق سے ضرار کو رومیوں نے گرفتار کرلیا۔ خوا۔ نے فوج کا ایک جانباز دستہ بھائی کی مدد کے لیے روانہ کیا ابھی وہ لوگ دشمنوں سے لڑ رہے تھے کہ ایک اور نامعلوم سوار وہاں پہنچا جس نے بجلی کی تیزی سے حملہ کر کے دشمنوں کو حواس باختہ کردیا اور ضرار کو ان سے رہا کرالیا۔ مگر اس پراسرار سوار کا بھید کسی پر نہ کھل سکا کہ آخر وہ کون تھا اور کہاں سے آیا تھا؟ پھر جب یہ اسرار کھلا تو پتہ چلا کہ وہ سوار خود خولہ بنت ازور تھیں۔

خولہ بنت ازور ساتویں صدی عیسوی میں پیدا ہوئیں۔ وہ قبیلہ بنی اسد کے ایک سردار کی بیٹی تھیں۔ اس کا خاندان اولین اسلام لانے والوں میں شامل تھا۔ ان کے والد کا نام مالک یا طریق بن اوس تھا جو ازور کے نام سے بھی جانے جاتے تھے۔

خولہ کی جرات بہادری اور جنگی قابلیت کا پتہ پہلے پہل محاصرہ دمشق کے دوران چلا تھا۔ اس جنگ میں اس کا بھائی

راشدہ فوج کا ایک افسر تھا۔ اسی جنگ کا واقعہ مندرجہ بالا سطور میں پیش کیا گیا۔ خولہ نے رومیوں کے عقبی دستے پر حملہ کر کے اپنے بھائی کو چھڑوالیا تھا۔ جب راشدہ فوج کے کمانڈر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس پراسرار سوار کے متعلق پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ خولہ بنت ازور تھیں۔ دوسرے مجاہدین اس دوران خولہ کو خود حضرت خالد رضی اللہ عنہ سمجھ رہے تھے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ وہاں پہنچے۔ خولہ نے طاعون عمواس کے دوران وفات پائی تھی۔

حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا (م 60ھ/680ء)

حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی جڑواں بہن جنہوں نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا

نسب عالی: فاختہ رضی اللہ عنہا بنت ابی طالب بن عبدالمطلب بن ہاشم، الہاشمیہ القرشیہ المکیہ۔ یہ اپنی کنیت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے مشہور ہوئیں۔

ان کی والدہ سیدہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت اسد بن ہاشم تھیں جنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش اور نگہداشت اور پھر اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل ہے۔

ولادت: حضرت ام ہانی کی ولادت قریباً 10 قبل از نبوت میں ہوئی تھی وہ طلوع اسلام کے وقت تقریباً 10 برس کی تھیں۔ اگرچہ ان کی والدہ ابتدائی دور ہی میں اسلام قبول کر چکی تھیں البتہ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کے اسلام کے اظہار و اعلان کی نوبت 8ھ/630ء سے پہلے نہ آسکی۔ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کا نکاح ھبیرہ بن ابی وھب المخزومی کے ساتھ ہوا، اس وقت جناب حضرت ابوطالب حیات تھے۔ الکلبی سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب ابوطالب کے پاس حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کے لیے پیغام نکاح بھجوایا تھا لیکن حضرت ابوطالب نے ان کا نکاح ھبیرہ بن ابی وھب کے ساتھ کر دیا۔ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کا خاوند ھبیرہ بن ابی وھب اسلام کے شدید ترین مخالفین میں سے ایک تھا۔ اسی لیے فتح مکہ کے دن بھاگ کر نجران چلا گیا۔ اسی موقع پر حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا نے اسلام قبول کیا اور دونوں میں تفریق ہوگئی۔ فتح مکہ کے موقع پر ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اے ام ہانی رضی اللہ عنہا! جسے تو نے امان دی اسے میں نے بھی پناہ دی۔ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کا مدینہ منورہ جانا مورخین کے نزدیک ثابت نہیں۔

وفات: الترمذی کے مطابق وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت 40ھ/661ء کے بعد زندہ تھیں اور انہوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں 60ھ/680ء میں انتقال کیا۔ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہ سے 46 احادیث مروی ہیں جن میں سے چند ایک صحیحین میں شامل ہیں۔ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہ 8 رکعت نماز ضحی (چاشت) کے متعلق روایت کرنے میں منفرد ہیں۔ انہوں نے یہ بھی روایت کی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو تلاوت فرماتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کی آواز حضرت ام ہانی کے گھر میں سنائی دیتی تھی۔

حضرت زینب بنت علی رضی اللہ عنہا (م 62ھ/680ء)

تاریخ اسلام کی ایک نہایت محترم شخصیت جس نے سانحہ کربلا اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

نسب عالی: حضرت زینب رضی اللہ عنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا بنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی اور تاریخ اسلام کی ایک نہایت محترم شخصیت ہیں۔

ولادت: حضرت زینب کی ولادت 5 جمادی الاولی 5ھ کو مدینہ منورہ میں ہوئی۔ آپ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی

اللہ عنہ کی صاحبزادیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ ولادت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام ''زینب'' رکھا۔ ساتویں دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عقیقہ فرمایا۔ حضرت زینب ابھی چھ برس کی تھیں کہ اپنے نانا (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اپنی والدہ ماجدہ کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بعد جناب حضرت زینب سیدہ سلام اللہ علیہ کو ام البنین اور اسماء جیسی بلند مرتبہ خواتین کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ امام حسین رضی اللہ عنہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی تعظیم فرماتے اور جب خواہر محترمہ اتی تھیں تو آپ رضی اللہ عنہ کھڑے ہو جاتے اور اپنی جگہ بٹھاتے تھے۔ جناب زینب اپنی والدہ معظمہ کے بعد بڑی صاحبزادی ہونے کی بنا پر گھر کے تمام معاملات کی ذمہ دار قرار پائیں۔ جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا شادی کی عمر کو پہنچیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے فرزند عبداللہ کو شرف دامادی بخشا۔ حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے جو اولادیں ہوئیں ان میں سے دو فرزند عون اکبر اور محمد نے کربلا میں شہادت پائی۔ حضرت زینب سانحہ کربلا کے بعد دمشق میں اہل بیت کی سربراہ کی حیثیت سے ان کے ساتھ رہیں۔ پھر مدینہ تشریف لے گئیں۔ انہوں نے وفات کب پائی اس میں اختلاف ہے۔ شیخ جعفر نقدی نے ایک قول نقل کیا ہے جس کی رو سے انہوں نے 15 رجب 62ھ/681ء کو وفات پائی تھی۔

ام کلثوم و اُم الحسن ان کی کنیت تھی اور صدیقہ صغریٰ آپ رضی اللہ عنہا کا لقب تھا۔ ان کی عظمت یہ بھی ہے کہ محدثین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے انہیں ''ابی زینبؑ'' سے یاد کرتے ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہا وہ عظیم خاتون تھیں جس کا پورا خاندان کربلا میں شہید ہو چکا تھا اپنے شدید مصائب کے باوجود آپ رضی اللہ عنہا نے جابر حکمرانوں کے سامنے برملا اظہار حق کیا اور خواتین عالم کے لیے درخشاں مثال پیش کی۔

حضرت سکینہ بنت الحسین رضی اللہ عنہا (م 117ھ/735ء)

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی، ایک عالی نسب خاتون

نسب عالی: سکینہ بنت حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم، ان کی زندگی کے حالات کتب تاریخ میں بہت کم ملتے ہیں۔ ان کی والدہ رباب بنو کلب کی شاخ بنو عدی کے نامور سردار امراؤالقیس بن عدی بن اوس کی دختر تھیں، جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں امام حسین رضی اللہ عنہ کے عقد میں آئی تھیں۔ شہادت امام حسین رضی اللہ عنہ کے وقت وہ کربلا میں موجود تھیں اور حضرت سکینہ رضی اللہ عنہا بھی ان کے ساتھ تھیں۔ اس کے بعد اہل حرم قید ہو کر کوفہ و شام گئے اور رہائی کے بعد مدینہ واپس آئے۔ حضرت سکینہ رضی اللہ عنہا کے حالات اور سوانح پردہ اخفا میں ہیں لیکن تذکروں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جناب رباب رضی اللہ عنہا سوگ نشین ہو گئیں تھیں اور انہوں نے اسی غم فرقت سبط رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں وفات پائی۔

شیعی مورخین لکھتے ہیں کہ جناب حضرت سکینہ رضی اللہ عنہا کربلا میں بہت کم عمر تھیں، مقاتل میں متعدد واقعات ایسے رونما ہوئے جن میں آپ رضی اللہ عنہا کا نام آیا ہے۔ اسعاف الراغبین میں امام حسین رضی اللہ عنہ کا یہ جملہ بھی ہے کہ ''سکینہ پر استغراق مع اللہ غالب ہے۔'' مدینہ منورہ میں بنات امام حسین رضی اللہ عنہ کی زندگی کی تفصیلات نہیں ملتیں، لیکن حضرت سکینہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں کچھ واقعات کتاب الاغانی میں ملتے ہیں۔ تاہم واقعہ کربلا کے بعد ان کی زندگی کے جو حالات ملتے ہیں وہ معتبر اور مستند طریق پر ثابت نہیں ہیں۔ دمشق میں ایک مزار حضرت سکینہ رضی اللہ عنہا سے منسوب ہے اور لوگوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے قید شام میں وفات پائی تھی۔

اس کے برعکس شیعی مورخین نے لکھا ہے کہ جناب سکینہ رضی اللہ عنہا نے ایک طویل عمر پائی اور ان کا عقد کیے

دیگرے ابوبکر عبداللہ بن امام حسن رضی اللہ عنہ، مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن حزامی اور زید بن عمرو بن عثمان رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا۔ عبداللہ سے ان کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی تھی اور زید سے ایک بیٹا عثمان پیدا ہوا تھا۔ ان سب مورخین نے حضرت سکینہ رضی اللہ عنہا کی شرافت و نجابت اور حسن و صورت و سیرت کی تعریف کی ہے۔ ابن خلکان نے ان کی تاریخ وفات 117ھ دی ہے۔

حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا (م 185ھ/ 801ء)

بصرے کی ایک مشہور عارفہ اور ولیہ جن کا شمار اولیاء میں ہوتا ہے۔

نام و نسب: حضرت رابعہ العدویہ قبیلہ قیس بن عدی کی ایک شاخ العتیق کی آزاد شدہ کنیز، جو القیسیہ بھی کہلاتی تھی۔ وہ 95ھ/ 713ء میں پیدا ہوئی تھیں اور انہوں نے 185ھ/ 801ء میں بمقام بصرہ وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئیں۔

وہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ بچپن میں کسی شخص نے انہیں پکڑ کر فروخت کر دیا تھا، ان کی پاک طبیعت نے انہیں اس غلامی سے نجات دلائی۔ ان کے مالک نے جب دیکھا کہ وہ سارا دن کام کے بعد ساری رات محو عبادت رہتی ہیں تو اس نے انہیں آزاد کر دیا۔ بعد کی زندگی انہوں نے گوشہ نشینی اور تجرد میں بسر کرنے کے لیے صحرا میں عزلت اختیار کر لی۔ بعد ازاں وہ بصرے چلی آئیں، جہاں ان کے گرد بہت سے معتقدین اور رفقا جمع ہو گئے، جو ان سے مشورہ یا دعائے خیر حاصل کرنے، یا ان کی تعلیمات سے مستفید ہونے کے لیے ان کے پاس آتے تھے۔ ان لوگوں میں مشہور صوفی، مالک بن دینار، محدث سفیان ثوری اور شفیق بلخی جیسے زاہد شامل تھے۔ انہوں نے انتہائی زہد و تقویٰ کی زندگی بسر کی۔ ان کی کرامات کے سلسلے میں تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ جب وہ حج کرنے جا رہی تھیں تو ایک اونٹ جو راستے میں مر گیا تھا، ان کے لیے دوبارہ زندہ ہو گیا۔ گھر میں چراغ نہ ہونے کی کمی اس روشنی سے دور ہو جاتی تھی جو اس بزرگ خاتون کے اردگرد پھیلی رہتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جب ان کا وقت آخر آیا تو انہوں نے اپنے رفقا سے کہا وہ ان کے پاس سے ہٹ جائیں اور خدا تعالیٰ کے قاصدوں کے لیے راستہ چھوڑ دیں۔ دوسرے اہل تصوف کی طرح رابعہ رحمۃ اللہ علیہا بھی خدا سے جا ملنے (وصل) کی متمنی تھیں۔ رابعہ ان اولین اہل تصوف میں سے تھیں جنہوں نے محض اس کی ذات کے لیے بے غرض محبت کی تلقین کی اور اس تعلیم کو نظریہ کشف کے ساتھ پیش کیا۔

الخیزران بنت عطا (م 183ھ/ 799ء)

خلیفہ ہادی اور خلیفہ ہارون الرشید کی والدہ اور خلیفہ مہدی کی بیوی

نام نسب: خیزران کا تعلق سعودی عرب کے علاقے جوراش سے تھا۔ اسے اس کے گھر سے ایک بدو عرب نے اغوا کر کے مکہ میں حج پر آئے ہوئے خلیفہ مہدی عباسی کو فروخت کر دیا تھا۔ خلیفہ اسی کنیز کے عشق میں مبتلا ہو گیا اور اس نے اسے آزاد کر کے اس سے نکاح کر لیا۔ خیزران ایک طاقتور شخصیت کی مالک تھی۔ وہ پہلی خاتون تھی جو کاروبار خلافت پر اثر انداز ہوئی اور اُسے حکومت میں مداخلت کرنے کا موقع ملا۔ اس نے خلیفہ مہدی کو اپنے دونوں بیٹوں الہادی اور ہارون کو اپنا ولی عہد نامزد کرنے پر راغب کر لیا اور خلیفہ کی دوسری بیویوں سے ہونے والی اولاد نرینہ کو تخت خلافت سے محروم کر دیا۔ اس کا بیٹا الہادی اس کی حکومت میں مداخلت کو ناپسند کرتا تھا۔ مورخین کے مطابق اس نے خیزران کو زہر خورانی کے ذریعے اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی جس کا پتہ خیزران کو چل گیا اور اس نے بجائے خود الہادی کو اپنے راستے سے ہٹا کر ہارون الرشید کو

مسند نشین خلافت کردیا۔ بہت سے مورخین الف لیلیٰ میں ذکر کی گئی ملکہ شہرزاد کو خیزران سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگرچہ مورخین حکومت میں اس کی اثر اندازی کو کوئی تفصیل مہیا نہیں کرتے مگر اس کے نام پر عباسی سکے ضرور ڈھالے گئے تھے۔ اور اس کے نام پر کئی محلات کا نام بھی رکھا گیا تھا۔ جس قبرستان میں متعدد عباسی خلفا مدفون ہیں وہ بھی اس کے نام پر معنون تھا۔
اپنے بیٹے ہارون الرشید کے عہد میں وہ خاصی با اختیار رہی اور اس کی آمدنی سولہ کروڑ درہم بتائی جاتی ہے۔ اس کی وفات پر ہارون الرشید بہت رویا تھا اور جب دفن کے لیے اسے لے چلے تو ہارون نے اس کی میت کو کندھا دیا تھا۔

شہزادی عباسہ (آٹھویں صدی کے نصف آخر میں)

خلیفہ ہارون الرشید کی بہن اور ایک معروف عباسی خاتون

نام ونسب: عباسہ بنت المہدی، ہارون الرشید اور الہادی کی بہن۔ سویقہ العباسہ کا نام اسی کے نام پر ہے۔ یکے بعد دیگرے اس کی تین شادیاں ہوئیں، مگر تینوں شوہروں کا اس کی زندگی میں انتقال ہوگیا۔ اسی بنا پر عباسی درباری شاعر ابونواس نے کچھ طنز آمیز اشعار لکھے۔ برامکہ کے زوال اور جعفر بن یحییٰ البرمکی کے سلسلے میں بھی اس کا نام لیا جاتا ہے اور مورخ طبری نے کچھ واقعات نقل کیے ہیں، لیکن طبری سے پہلے کے مورخین اس واقعہ کا ذکر نہیں کرتے اور نہ اشارہ کرتے ہیں۔ یہ بات بھی خاص طور پر قابل غور ہے کہ ابونواس کے شارحین نے عباسہ کے جن شوہروں کا نام لیا ہے ان میں جعفر برمکی کا نام شامل نہیں۔ ابن خلدون نے اس واقعہ کی صحت کو مشتبہ قرار دیا ہے۔ جعفر اور عباسہ کے تعلقات کا افسانہ جو الطبری کی فارسی اشاعت میں درج ہے ان شواہد کی بنا پر یک سر غلط ثابت ہوتا ہے۔ عباسہ کے جعفر سے مزعومہ تعلقات شروع ہونے کے وقت عباسہ کی عمر چالیس سال کی ہو چکی تھی۔ یہ بالکل یقینی امر ہے کہ عباسہ کا دوسرا شوہر جعفر کی وفات سے دس گیارہ سال پہلے مر چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ انسانی عمر کے اس حصے میں جوانی کی رنگ آمیزیاں بعید از قیاس قرار پاتی ہیں۔ اس لیے اس کو محض ایک افسانوی داستان کہا جاسکتا ہے۔ عربی ادب میں دور جاہلیت کے قصوں میں بھی ایک بادشاہ کی بہن اور ایک وزیر کی کہانی ملتی ہے لہٰذا اس کہانی کو جعفر پر منطبق کرنا آسان تھا۔ یورپی مصنفین نے اس قصے کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ جو شاید مسلمان بادشاہوں یا شاہی خانوادوں کے کردار کو مشکوک بنانے کی ایک کوشش ہے جسے الف لیلوی رنگ دیا گیا ہے۔

ملکہ زبیدہ (م 216ھ/ 831ء)

خلیفہ ہارون الرشید کی ملکہ اور اس کے جانشین الامین کی والدہ

نام ونسب: زبیدہ بنت جعفر بن ابی جعفر منصور، کنیت ام جعفر تھی۔

ولادت: وہ 145ھ/ 764ء میں اپنے دادا خلیفہ المنصور کے حین حیات پیدا ہوئی۔ اس کا اصل نام امۃ العزیز تھا۔ یہ بچی اپنے دادا کو بہت پسند تھی وہ ہر وقت اسے اپنی آغوش میں رکھتا تھا، اسی نے اس کی تر و تازہ رنگت کی وجہ سے اس کا نام زبیدہ رکھ دیا تھا۔ 165ھ/ 781ء میں اس کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہارون الرشید سے ہوئی۔ ہارون کے مسند نشین ہونے کے بعد زبیدہ نے رفاہ عامہ کے کاموں میں بڑا نام پیدا کیا۔ شان و شوکت کی دلدادگی، شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی اور رفاہ عامہ کے کاموں میں وہ اپنے شوہر سے کچھ کم مشہور نہیں۔

مورخین نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے چھتوں کو مرصع کرنے کے لیے سونے چاندی کے قمقے اسی نے ایجاد کیے تھے اور اسی کے قصر کی چھتوں میں لٹکائے گئے تھے۔ چھت گیری بھی اسی کی ایجاد ہے۔ ریشمی کپڑوں پر گل بوٹے بناتی تھی۔ عنبر

کی شمع بھی اسی کی ایجاد ہے۔

اس کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ جس کے لیے وہ آج تک یاد کی جاتی ہے اس نے مکہ مکرمہ کو پانی کی فراہمی کے لیے ایک دس میل لمبی نہر کھدوائی تھی اور مکہ مکرمہ میں ان دنوں میں پانی پہنچایا تھا جب وہاں پانی کی سخت قلت محسوس ہو رہی تھی۔ یہ نہر اسی کے نام پر نہر زبیدہ کہلائی اور انیسویں صدی کے آخر تک مکہ کو پانی فراہم کرتی رہی۔ ملکہ زبیدہ حد سے زیادہ فیاض تھی۔ اس نے بغداد سے دمشق جانے والی شاہراہ پر جا بجا پل، کنوئیں اور سرائیں تعمیر کرائیں تا کہ مسافروں کو سفر میں آسانی ہو۔ ملکہ زبیدہ نے یکم جمادی الاولیٰ 216ھ/ جون جولائی 831ء کو بغداد میں وفات پائی۔

فاطمہ الفہر ی (م 266ھ/880ء)

نویں صدی عیسوی کی ایک متمول مسلمان خاتون جس نے مسجد و مدرسہ قائم کیا۔

نام ونسب: فاطمہ بنت محمد الفہر ی کنیت ام البنین۔ یہ مراکش کے شہر قیروان میں مدرسہ قائم کرنے کے لیے مشہور ہیں جو اب تک جاری وساری ہے اور آج کل قیروانی یونیورسٹی UNIVERSITY OF QARAVIYYIN کہلاتا ہے۔ یہ مدرسہ جس مسجد میں قائم کیا گیا تھا وہ آج کے شمالی افریقہ کی ایک بڑی مسجد ہے۔

فاطمہ الفہر ی ایک متمول تاجر کی بیٹی تھی۔ جس نے اسے اس زمانے کے مطابق باقاعدہ تعلیم دلوائی تھی۔ اس خاندان نے بعد ازاں تیونس کے شہر قیروان سے آج کے مراکش کے شہر فاس کی طرف ہجرت کی تھی اور اسی وجہ سے فاس میں قائم کردہ مسجد اور مدرسہ کا نام قیروان کے نام پر رکھا تھا۔

فاطمہ الفہر ی کی ایک بہن مریم نے بھی فاس میں ایک مسجد الاندلس کے نام سے تعمیر کروائی تھی۔ اس طرح دونوں بہنوں نے اس شہر میں مساجد تعمیر کروائی تھیں۔

فاطمہ الفہر ی نے مدرسہ قیروان میں اسلامی دنیا کی ایک قدیم لائبریری بھی قائم کی تھی۔ اس لائبریری کی تعمیر نو حال ہی میں کی گئی ہے اور اسے مئی 2016ء میں عوام کے لیے دوبارہ کھول دیا گیا ہے۔ اس لائبریری میں نویں صدی سے تعلق رکھنے والے قرآن مجید کے 4000 قلمی نسخے موجود ہیں۔

فاس میں فاطمہ الفہر ی کے خاوند اور بھائی کی وفات کے بعد اسے اور اس کی بہن کو آبائی دولت کا بڑا حصہ ملا تھا۔ یہ دونوں خواتین اپنے مال کو کسی نیک کام میں لگانا چاہتی تھیں۔ اس لیے دونوں بہنوں نے دو مساجد تعمیر کروائیں۔ القیر وانی مسجد بعد ازاں 10 ویں سے بارہویں صدی میں ایک جامعہ کا درجہ حاصل کر گئی۔

لبنیٰ قرطبی (م 373ھ/984ء)

خلیفہ الحکم ثانی کی سیکرٹری اور کاتب، دانشور خاتون

نام ونسب: کچھ مورخین کے مطابق لبنیٰ ایک ہسپانوی کنیز کے بطن سے خود خلیفہ کی بیٹی تھی۔ لبنیٰ نے امیر اندلس عبدالرحمان سوم کے محل میں پرورش پائی اور باوجود تعلیم میں معمولی شروعات سے تعلق رکھنے کے وہ بہت جلد امیر اندلس کے محل کی ایک اہم شخصیت قرار پائی۔ وہ خلیفہ عبدالرحمٰن سوم کے جانشین اور بیٹے الحکم ثانی کی ذاتی سیکرٹری اور کاتب کے عہدے پر فائز ہوگئی۔ لبنیٰ کے خلیفہ کی ذاتی لائبریری کی منتظم کی حیثیت میں اہم کردار ادا کیا۔ خلیفہ الحکم ثانی کی لائبریری میں 5 لاکھ سے زائد کتابیں محفوظ تھیں جن کی نگہداشت لبنیٰ کے سپرد کی گئی تھی جس کی وجہ سے دنیا کی اہم ترین لائبریری قرار پاتی ہے۔

کاتب کی حیثیت سے وہ نہ صرف ایک مترجم اور لکھنے والی تھی لیکن اس کے علاوہ وہ ہزاروں کتابوں کے مصنفین کے نام زبانی یاد رکھتی تھی اور ان کی کتابیں تلاش کرنا اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اسے ریاضی سے بڑا لگاؤ تھا۔ کہتے ہیں وہ قرطبہ کی گلیوں اور شاہراہوں پر چلتے چلتے بچوں کو ریاضی پڑھاتی اور ریاضی کے اہم کلیات سمجھا دیتی تھی۔

لبنیٰ صرف ایک ماہر ریاضی ہی نہیں تھی بلکہ اسے فلسفہ اور شاعری پر بھی عبور حاصل تھا اس کے علاوہ وہ ایک عظیم خطاط بھی تھی اس نے اپنی خطاطی کے خوبصورت نمونے اپنے ترکے کے طور پر چھوڑے ہیں۔ اندلسی مورخ ابن بشکوال لکھتا ہے کہ لبنیٰ شاعری اور سائنس میں بھی خود کفیل تھی اس کے علاوہ اسے ریاضی میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔ ان کے علاوہ وہ کئی دیگر علوم پر بھی دسترس رکھتی تھی۔ لبنیٰ نے 984ء میں وفات پائی۔

ست الملک (م 413ھ/1023ء)

فاطمی خلیفہ الحکم بامر اللہ کی بڑی بہن جو صرف دو سال کے لیے برسر اقتدار آئی تھی

نام و نسب: ست الملک بنت علی العزیز، مورخین اسے ست النصر کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔

اپنے والد علی العزیز کی وفات (996ء) کے بعد ست الملک نے اپنے ایک قریبی عزیز کی مدد سے اپنے بھائی کو تخت سے ہٹانے کی کوشش کی جو کامیاب نہ ہو سکی اور اسے ایک خواجہ سرا، برجوان نے گرفتار کر لیا۔ الحاکم کی گمشدگی کے بعد تاہم وہ جلد ہی اپنے بھتیجے کی نگران بن گئی (1021ء)۔ جب تک اس کا بھتیجا علی الظاہر جب تک بلوغت کو نہ پہنچا وہ بطور مشیر حکومت کے معاملات پر حاوی رہی۔ اقتدار میں آنے کے بعد اس نے اپنے دشمنوں کو چن چن کر ٹھکانے لگایا۔ اس نے دروزی فرقے کا مکمل طور پر استیصال کر لیا۔ اس نے حلب پر قبضے کے معاملے میں بازنطینی حکومت سے بات چیت کرنے کا فیصلہ کیا مگر یہ بات چیت شروع ہونے سے پہلے ہی 5 فروری 1023ء کو ست الملک نے بعمر 52 سال وفات پائی۔ وہ ایک مستعد فرمانروا تھی، جیسا کہ اس کے نیابت سلطنت کے مختصر دور سے پتا چلتا ہے کہ وہ انتظام و اہتمام میں مہارت تامہ رکھتی تھی۔ اس لیے قدرتی طور پر اس کے خلاف سازشیں بھی ہوئیں اور اتہامات بھی لگے، لیکن ان افسانوں میں حقیقت کچھ زیادہ نہیں پائی جاتی۔

ترکان خاتون (م 487ھ/1094ء)

ملک شاہ سلجوقی کی ملکہ اور شاہ سمرقند طفقاج خان کی بیٹی

نام و نسب: ترکان خاتون بنت طفقاج خان شاہ سمرقند ترکان خاتون نہ صرف ملک شاہ سلجوقی کی ملکہ تھی بلکہ اپنی لیاقت اور بیدار مغزی کی وجہ سے ملک شاہ کی مشیر خاص تھی اور امور سلطنت میں شریک غالب تھی۔ سلطان اس کے مشورے کے بغیر کوئی کام انجام نہیں دیتا تھا۔ اور امور سلطنت میں اس کی رضامندی کو مقدم رکھتا تھا۔ اس عورت کی عقل و دانشمندی پر اسے پورا بھروسہ تھا۔ ترکان خاتون سلطنت کے مختلف حصوں کے خود بھی دورے کرتی تھی۔ کئی بار وہ دربار خلافت یعنی بغداد بھی گئی اور دربار خلافت کے امراء اور وزراء کو اس نے بڑے بڑے عطیئے اور جاگیریں بھی عطا کیں تھیں، اس طرح وہ پوری سلطنت میں ایک ہر دلعزیز شخصیت بن گئی تھی۔

عباسی خلیفہ مقتدی بامر اللہ جب مسند نشین ہوا تو اس نے ملک شاہ کی بیٹی خازن سے نکاح کا پیام بھیجا۔ ملک شاہ نے سارا معاملہ ترکان خاتون پر چھوڑا جس نے چند شرائط پر یہ رشتہ منظور کیا۔ ان شرطوں میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ خازن کی

موجودگی میں خلیفہ کسی دوسری عورت سے شادی نہیں کرے گا جو عرب رواج و دستور کے خلاف تھی۔ اسی وجہ یہ شادی صرف ایک سال کامیابی سے چلی اور خلیفہ نے چونکہ چند شرطیں پوری نہیں کیں جس کی وجہ سے ناچاقی ہوگئی اور ترکان نے اپنی بیٹی اور نواسے کو واپس بلالیا۔ جہاں جلد ہی وہ (خازن) وفات پاگئی۔ ملک شاہ کی ولی عہدی کے سلسلے میں ترکان چاہتی تھی کہ ملک شاہ کے بڑے بیٹے برکیاروزق کی بجائے اس کا بیٹا محمود جانشین بنے۔ ملک شاہ کی وفات کے بعد یہ کشمکش شروع ہوگئی۔ ترکان نے خلیفہ سے محمود کی سلطانی کا پروانہ بھی حاصل کرلیا مگر آخر جنگ کے بعد برکیاروق کامیاب ہوا۔ ترکان نے اس ناکامی کے بعد 1094ء میں وفات پائی۔

اروی بنت اسماء

یمن کی ملکہ اور ایک بہادر خاتون جس نے بزور شمشیر ملک میں امن قائم کیا۔

نام ونسب: اروئی بنت اسماء۔ اروئی کا والد یمن کا بادشاہ اور ماں ملکہ تھی۔

اروئی ابھی کم سن ہی تھی کہ اس کے والدین کا انتقال ہوگیا۔ اس کی پرورش اس کے چچا نے کی جب وہ سن بلوغت کو پہنچی تو اس کی شادی اس کے ایک عم زاد سے ہوئی، اس کا نام المکرّم تھا۔

1066ء میں اس کے چچا اور چچی حج کے لیے مکہ جا رہے تھے کہ راستے میں انہیں ڈاکوؤں نے گھیر لیا۔ اس کے چچا کو موقع پر قتل کر دیا گیا جبکہ چچی کو قید کرلیا۔ قاتلوں نے المکرّم کو پیغام بھیجا کہ تمہاری ماں ہماری قید میں ہے تاوان ادا کر کے اسے رہا کروالو۔ اس پیغام کے ملنے کے بعد المکرّم نے بری تعداد میں فوج جمع کی تا کہ اپنی والدہ کو رہا کرا سکے، لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی والدہ محفوظ ہے تو اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اپنے شاہی اقتدار میں اپنی بیوی اروئی کو بھی شامل کرلیا۔

اروئی نے ایوان حکومت میں قدم رکھتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس آدمی کا سراغ لگالیا جس نے اس کے چچا کو قتل کیا تھا۔ اسے قتل کرنے کے بعد اس نے باغی قبائل پر چڑھائی کردی اور ان کی بغاوت کو فرو کر دیا۔ اس فوج کشی کے نتیجے میں اس کی سلطنت وسیع ہوگئی اور پورے ملک میں امن وامان قائم ہوگیا۔

المکرّم نے 1091ء میں وفات پائی جس کے بعد اروئی تنہا رہ گئی۔ ان حالات میں اس کے خلاف بغاوت کے شعلے بھڑکنے لگے۔ اروئی نے سباح نامی ایک شخص سے شادی کرلی اور وہ دونوں باغیوں کی سرکوبی میں اتنے مصروف ہوئے کہ باہم ملاقات نہ ہو سکی۔ تاہم اروئی ملک میں امن بحال کرنے میں کامیاب ہوگئی اور اس نے 1137ء میں وفات پائی۔

شجرۃ الدر (م 655ھ/1257ء)

اسلامی دور میں مصر کی واحد ملکہ جو ایک کنیز تھی۔

نام ونسب: شجرۃ الدر (شاخ مرجان) لقب عصمۃ الدین تھا۔ یہ ایک ترک یا ارمن کنیز تھی جو اپنے لام والدین کے ہاں دمشق میں 613ھ/1216ء میں پیدا ہوئی۔

اس کے آقا نے لاولد ہونے کی بنا پر اس کی تعلیم وتربیت اپنی بیٹی کی طرح کی تھی۔ جب وہ سن شعور کو پہنچی تو اس کی لیاقت علمی اور حسن ظاہری کا شہرہ حکومت کے ایوانوں تک پہنچا۔ ان دنوں شام پر الملک الصالح نجم الدین ایوب کی حکومت تھی۔ نجم الدین ایوب نے اس کے حسن کا شہرہ سن کر شجرۃ الدر کو اس کے پہلے آقا سے مانگ لیا۔ چونکہ اس کا نیک دل آقا اس

کی بھلائی کا متمنی تھا اس لیے اس نے شجرۃ الدر کو نجم الدین ایوبی کو دے دیا مگر قیمت لینے سے انکار کر دیا۔ یوں شجرۃ الدر شاہی محل تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی اور شہزادہ نجم الدین ایوبی نے اس سے شادی کر لی۔
جب نجم الدین تخت نشین ہوا تو اس نے شجرۃ الدر کو بھی کاروبار حکومت میں شامل کر لیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ شاہی فرامین پر دستخط بھی ملکہ کرنے لگی۔ پھر جب نجم الدین نے وفات پائی تو اس کی وفات کی خبر کو پوشیدہ رکھ کر وہ ملکہ بنی رہی۔ آخر نجم الدین کا بیٹا توران شاہ دمشق آیا تو وہ قاہرہ چلی گئی۔ توران شاہ کو اس کے امراء نے قتل کر دیا تو شجرۃ الدر ایک بار پھر ملکہ بن گئی۔ جب عورت کی حکومت پر اعتراض اٹھا تو اس نے اپنے ایک وزیر عز الدین ایبک سے شادی کر کے اسے حکومت میں شامل کر لیا۔ ادھر عز الدین نے اپنی پہلی بیوی سے علیحدگی کر لی اور خود شجرۃ الدر کی ایک کنیز سے بھی شادی کا خواہاں ہوا جس پر شجرۃ الدر نے اسے حمام میں اپنے غلاموں کے ذریعے قتل کروا دیا۔ اس پر عز الدین کو پہلی بیوی ام علی نے ایک محلاتی سازش کے ذریعے شجرۃ الدر کو سر پر کھڑاؤں مار مار کر ہلاک کر دیا اور اس کی لاش کو محل کے برج سے نیچے پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایوبی خاندان کی حکومت بھی مصر سے ختم ہوگئی۔

رضیہ سلطانہ (م 637ھ/1240ء)

ہندوستان میں خاندان غلاماں کی نامور خاتون فرمانروا

نام و نسب: رضیہ سلطان بنت شمس الدین التمش، سلطان دہلی سلطان شمس الدین التمش نے اپنے جانشین اور بڑے بیٹے کی وفات کے بعد اپنی بڑی بیٹی رضیہ کو اپنے امراء اور وزراء کے احتجاج کے باوجود اس بنا پر اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا کہ وہ حکومت کرنے کی خداداد صلاحیت رکھتی تھی، تاہم درباری امراء نے سلطان کی وصیت اور خواہشات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس کے ایک بیٹے رکن الدین فیروز کو تخت نشین کر دیا مگر وہ عیش و بدمستی کی زندگی کا دلدادہ تھا، دوسری طرف اصل اقتدار اس کی ماں ترکان خاتون کے ہاتھ میں تھا جس کی بے رحمی سے لوگ بغاوت پر آمادہ ہوگئے۔ بالآخر 634ھ/1236ء میں دہلی کی عوام اور فوج کے ایک حصے نے رضیہ سلطانہ کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ ہر چند کہ وزیر سلطنت نظام الملک محمد جنیدی نے رضیہ کو سلطان تسلیم نہ کیا مگر رضیہ نے عنان حکومت سنبھال کر بد نظمی کا خاتمہ۔ التمش کے عہد میں ترک امراء بہت زور پکڑ چکے تھے وہ کسی دوسرے قابل ترقی فرد کو اقتدار میں نہیں دیکھ سکتے تھے لہٰذا وہ رضیہ سے بگڑ بیٹھے۔ سرہند کے گورنر ملک اختیار الدین التونیہ نے مرکزی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ سلطانہ خود فوج لے کر اس کی سرکوبی کے لیے پہنچی تو عین قلعے کے سامنے ترک امراء نے غداری کی اور سلطانہ کو گرفتار کر لیا۔ سلطانہ نے ملک التونیہ سے شادی کر لی اور پھر دونوں مل کر بغاوت کے انسداد کے لیے بڑھے۔ اس اثنا میں ترک امراء نے سلطانہ کے بھائی کو بادشاہ بنا دیا۔ سلطانہ نے کیتھل کے قریب شکست کھائی اور میدان جنگ سے بچ کر نکلی مگر مال و زر کے لالچ میں دیہاتیوں کے ہاتھوں بے خبری میں ماری گئی۔ رضیہ سلطانہ کا ایک مقبرہ کیتھل میں انتہائی خستہ حالت میں موجود ہے جبکہ دوسرا دہلی میں ترکمانی دروازے کے قریب واقع ہے۔ احقر نے یہ خستہ حال مقبرہ 2005ء میں کیتھل میں دیکھا تھا۔

بغداد خاتون (م 736ھ/1335ء)

ایک نامور ایرانی خاتون، امیر الامراء امیر چوپان کی بیٹی

نام و نسب: بغداد خاتون امیر الامراء امیر چوپان کی بیٹی اور امیر حسن جلاتری کی بیوی، جس کے ساتھ اس نے

723ھ/ 1323ء میں نکاح کیا تھا۔ 1325ء میں ایران کے ایلخانی حکمران ابوسعید نے چنگیز خان کے مجموعہ قوانین، یاسا کو ثبوت کے طور پر پیش کر کے چاہا کہ امیر حسن اُسے طلاق دے دے تاکہ وہ اس سے خود نکاح کر سکے، لیکن ابوسعید کی یہ کوشش امیر چوپان نے کامیاب نہ ہونے دی۔ 1327ء میں امیر چوپان کو ابوسعید کی انگیخت پر قتل کر دیا گیا جس کے بعد ابوسعید بغداد خاتون سے نکاح کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

بغداد خاتون کو بڑا اعلیٰ مقام و مرتبہ دیا گیا اور ساتھ ہی اسے ''خداوندگار'' کا لقب دیا گیا۔ 1331ء میں شیخ حسین پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ اپنی سابقہ بیوی سے مل کر ابوسعید کو قتل کرنے کی سازش میں ملوث ہے۔ اس کے ساتھ ہی ابوسعید کے بغداد خاتون کے ساتھ تعلقات کشیدہ ہو گئے، لیکن اگلے سال جب یہ ثابت ہو گیا کہ سازش کا الزام جھوٹا تھا تو بغداد خاتون پھر مورد عنایت ہو گئی۔ 1333ء میں ابوسعید نے بغداد خاتون کی بھتیجی دلشاد خاتون سے شادی کر لی اور اسے اپنی دوسری بیویوں سے اونچا رتبہ دیا۔ اس بات نے بغداد خاتون کے دل میں حسد پیدا کر دیا اور ابوسعید نے 1335ء میں اچانک وفات پائی تو بغداد خاتون پر زہر خورانی کا شبہ کیا گیا اور امراء نے انتقاماً اسے قتل کروا دیا۔ اس کے قتل کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ بغداد خاتون نے مغلوں کے بڑے بادشاہ التون اردو کے خان کو خط و کتابت کے ذریعے ایران پر حملے کے لیے اکسایا تھا جس کی وجہ سے اسے قتل کر دیا گیا۔

لِلہ عارفہ (حیات 781ھ/ 1379ء)

وادی کشمیر کی مشہور صوفی منش عارفہ، زاہدہ اور شاعرہ

نام و نسب: ہندو نام لل ایشوری، مسلم نام لِلہ عارفہ

حالات: لِلہ عارفہ 735ھ/ 1335ء میں بعہد کشمیری راجہ ادیان دیو (1327ء-1343ء) سرینگر سے کچھ میل جنوب مشرق میں واقع گاؤں، پنڈرتھن میں ہندو والدین کے ہاں پیدا ہوئی والدین نے اس کا نام لل ایشوری رکھا اور ہندو دستور کے مطابق اس کی شادی نو عمری ہی میں ایک برہمن زادے سے کر دی۔ سسرال میں اسے ساس کے تشدد کا شکار ہونا پڑا جہاں بھوکوں مرنے اور سختیاں برداشت کرنے سے اسے نفس کشی کی عادت ہو گئی اور توکل و استغنا کی قوت بڑھی اور وجدان بیدار ہوتا چلا گیا، اسے اپنے اندر ایک نمایاں تبدیلی محسوس ہونے لگی اور کیفیتوں سے گزر کر آخر ایک دن اُسے عرفان نفس حاصل ہو گیا اور وہ پکار اٹھی: ''میں نے اپنے نفس کو مارا جس سے میرے اندر کا چراغ روشن ہو گیا، مجھے اپنی اصلیت معلوم ہو گئی۔'' اس کے بعد دنیا اس کی نظروں میں ہیچ تھی۔ اسی حالت میں اس سے چند خوارق عادت باتیں ظہور میں آئیں جن کی بدولت وہ پوری بستی میں مشہور ہو گئی۔ انہیں دنوں کشمیر پر ہندو راج ختم ہو کر اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ للہ نے یوں تو بعض مسلمان بادشاہوں کا زمانہ دیکھا، لیکن اس کی شہرت کا آغاز سلطان علاؤالدین کے زمانے میں ہوا۔ اسی زمانے میں مشہور روحانی بزرگ سید حسن سمنانی کشمیر وارد ہوئے تو للہ ان کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اسلام لے آئی۔ انہیں دنوں وادی کشمیر میں مخدوم جہانیاں جہاں گشت اور امیر کبیر سید علی ہمدانی کا ورود بھی ہوا۔ للہ ان بزرگوں کے فیوض سے بھی مستفید ہوئی۔ للہ 781ھ/ 1397ء میں ہیراپور کے مقام پر امیر کبیر سید علی ہمدانی سے ملی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اس نے بیج بہاڑہ میں وفات پائی جو سرینگر کے قریب واقع ہے اس کی تاریخ وفات معلوم نہیں ہو سکی۔

لِلہ عارفہ کے ایسے اقوال ملتے ہیں جو خالص اسلامی متصوفانہ خیالات کے حامل ہیں اسی طرح کشمیری پنڈتوں کے ہاں اس کے ایسے اقوال بھی ملے جن سے پتہ چلتا ہے کہ ہندومت کے یوگ فلسفے کا بھی اس پر اثر تھا۔

محدث ام ہانی (م 870ھ/1460ء)

مصر کی ایک محدث خاتون جو بہت سی حدیثوں کی راوی ہے۔

نام ونسب: ام ہانی مریم کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔

عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے راویان حدیث میں خواتین کے نام شامل چلے آتے ہیں۔علم حدیث کے شعبے خواتین کی خدمات کو بھی بھلایا نہیں جاسکتا۔

ام ہانی کا تعلق مصر سے تھا اور وہ حدیث کی ایک ممتاز راوی تھیں۔اس کی پرورش اس کے دادا نے کی تھی جو مصر کے ایک معزز قاضی تھے۔ان کا نام محمد ابن محمد القیاطی تھا۔ام ہانی نے سات سال کی عمر میں حدیث کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔جب اس کا دادا انہیں مکہ لے گیا تو انہوں نے وہاں علم حدیث کے بڑے بڑے اساتذہ سے اکتساب علم کیا۔مصر واپسی پر قاضی صاحب نے خود بھی اپنی ذہین پوتی کو پڑھایا اور اس نے علم حدیث میں کئی اسناد بھی حاصل کر لیں۔ام ہانی نے اپنی زندگی میں تیرہ حج کیے اور علم حدیث کی طلب میں بھی کئی بار سفر کیا۔

ام ہانی نے دو مرتبہ شادی کی۔جب اس کا دوسرا خاوند فوت ہوا تو اس نے اپنے شوہر کے چھوڑے ہوئے مال سے چرخہ کاتنے کی ایک ورکشاپ خرید لی اور یوں اپنی روزی کا بندوبست کر لیا۔اس کے بعد انہوں نے شادی نہیں کی۔اس دوران وہ مردوں اور خواتین دونوں کو باقاعدگی سے علم حدیث پڑھاتی رہیں۔لوگ ان کے علم اور ان کی پاکیزگی کی تعریف کرتے تھے۔ام ہانی نے کوئی کتاب نہیں لکھی البتہ فقہ شافعی پر بھی انہیں دسترس حاصل تھی۔

ملکہ خدیجہ آف مالدیپ (781ھ/1380ء)

اسلام کی ان ملکاؤں میں سے ایک جنہیں زمانہ بھول گیا ہے۔

نام ونسب: سلطانہ خدیجہ بنت سلطان جلال الدین بن سلطان سلاح الدین۔سلطانہ خدیجہ مالدیپ کے ان تین سلطانوں میں ایک تھی جنہوں نے ارمنہاز منہ وسطی میں اس جزیرے پر حکومت کی تھی۔مالدیپ کی اس ملکہ کا ذکر ہمیں مشہور مسلمان سیاح ابن بطوطہ کے سفرنامے میں ملتا ہے۔ابن بطوطہ اپنی مالدیپ کی سیاحت کے دراندوران اس سلطانہ سے بہت متاثر ہوا تھا۔اس کی روایت کے مطابق سلطانہ خدیجہ سلطان جلال الدین بن سلطان سلاح الدین کی بیٹی تھی۔اُس کے والد کی وفات کے بعد جب اقتدار کے لیے رسہ کشی شروع ہوئی تو اس نے وزیر جمال الدین سے شادی کر لی جو اس کے بھائی کو تخت سے اتار کر خود تخت نشین ہو گیا۔

مورخین نے لکھا ہے کہ سلطان جمال الدین نے اپنی بیوی خدیجہ کو اپنے اقتدار میں شامل کر لیا تھا جبکہ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ وہ اکیلا ہی اقتدار پر قابض تھا۔البتہ یہ بات واضح ہے کہ خدیجہ بھی اپنے نام سے حکم نامے جاری کرتی تھی اور اس کے علاوہ جمعہ کے خطبے میں بھی اس کا نام لیا جاتا تھا۔

خدیجہ کے اقتدار سے تنگ آ کر جمال الدین نے اسے اقتدار سے الگ کر دیا۔جس کے خلاف جوابی کاروائی کرتے ہوئے خدیجہ نے ایک سال کے اندر ہی اپنے اس شوہر کو قتل کروا دیا۔اس کے بعد خدیجہ نے ایک دوسرے وزیر سے شادی کر لی جس کا نام عبداللہ تھا۔اس نے خدیجہ کو تخت سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا اور اس کے بعد خود تخت نشین ہو گیا۔تاریخ نے اس مرتبہ بھی اپنے آپ کو دہرایا اور خدیجہ نے اپنے اس غاصب خاوند کو بھی قتل کروا دیا۔اس کے بعد خدیجہ خود تخت

نشین ہوگئی اور اس نے اگلے تیس سال تک مالدیپ پر حکومت کی۔اس کی وفات کے بعد اس کی بہن مریم مالدیپ کی سلطانہ بن گئی۔

ملکہ عائشہ الحرّہ (حیات 1492ء)

غرناطہ کی وہ مسلم ملکہ جس نے اپنے بیٹے ابوعبداللہ کو اس کی بزدلی پر عورتوں کی طرح رونے سے منع کیا

نام ونسب: عائشہ الحرّہ کو عام طور پر اس کے ہسپانوی نام AIXA سے جانا جاتا ہے۔کچھ مسلم مورخین اسے فاطمہ الحرّہ کا نام بھی دیتے ہیں۔وہ سیاسی طور پر ایک فعال غرناطی شخصیت تھی جو غرناطہ کی تاریخ کے آخری امام پر اثر انداز ہوئی۔اسی وجہ سے وہ غرناطہ کی تاریخ کی بہت معروف خاتون ہے۔وہ غرناطہ کے سلطان محمد چہارم کی بیٹی تھی۔اس کے اپنے ذاتی کئی محلات اور جاگیریں تھیں۔اس کی پہلی شادی غرناطہ کے حکمران محمد پنجم سے ہوئی تھی۔

اس کی موت کے بعد 1455ء میں عائشہ نے اس کے جانشین ابوالحسن علی یا مولائے حسن سے دوسری شادی کی۔ اس کی یہ شادی کچھ زیادہ کامیاب نہ ہوسکی کیونکہ اس کا شوہر اپنی ایک عیسائی کنیز ازابیلا ڈی سولس کی زلف کا اسیر ہوگیا اور اس نے عائشہ کو اس کے بیٹے کے ہمراہ الحمراء سے نکال کر ازابیلا سے شادی کرلی جس نے اسلام قبول کرنے کے بعد زورایہ نام رکھ لیا تھا۔مولائے حسن زورایہ کے زیر اثر اس کے بیٹے سعد کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا۔

زورایہ سے حسد کرتے ہوئے اور اس کے بیٹے کے جانشین نامزد ہوجانے کے خوف میں مبتلا ہوکر عائشہ نے ایک محلاتی سازش کے ذریعے ابوالحسن کے خلاف خانہ جنگی کی ایک تحریک کو ہوادی اور آخر کار ابوالحسن کے مخالفین ابن سراج سے مل کر ابوالحسن کو معزول کرکے اپنے بیٹے ابوعبداللہ کو محمد ہفتم کے نام سے تخت نشین کرنے میں 1483ء میں کامیاب ہوگئی مگر اس یا یہ نااہل بیٹا آخر 1492ء میں غرناطہ کے تاج وتخت کو کھو بیٹھا۔جب ابوعبداللہ الحمراء کو چھوڑ کر جارہا تھا تو اس کی ماں عائشہ الحرّہ اس کے ہمراہ تھی۔جب ایک پہاڑی پر سے ابوعبداللہ نے الحمراء پر آخری نگاہ ڈالی تو وہ عورتوں کی مانند پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا،اس پر عائشہ نے اسے تنبیہ کی کہ جس چیز کی حفاظت تم مردوں کی طرح نہیں کرسکے اب اس پر تمہیں عورتوں کی طرح آنسو بہانے کا بھی کوئی حق نہیں۔ملکہ عائشہ کا اپنے بیٹے کو یہ سمجھانا آج غرناطہ کی تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔

ماہم انگہ (م982ھ/1562ء)

شہنشاہ اکبر کی رضاعی والدہ اور دایہ جو کچھ عرصہ کے لیے کاروبار حکومت پر اثر انداز رہی

نام ونسب: ماہم انگہ شہنشاہ اکبر کی دایہ تھی اور اس نے بچپن میں اکبر کو دودھ بھی پلایا تھا۔وہ ادہم خان کوکہ کی والدہ تھی اور اپنے دور کی ایک ذہین اور فطین خاتون تھی۔شہنشاہ اکبر کے بچپن کے زمانے سے لے کر تخت نشینی تک دوام ملازمت، وفور اعتبار اور رازوں پر زیادہ اطلاع رکھنے اور اعتماد کی وجہ سے مشہور تھی۔اس نے اکبر کے اتالیق بیرم خان کے اثر واقتدار کے خاتمے میں بڑا اہم کردار ادا کیا،جب منعم خان وکیل سلطنت بھی ہوگیا تو وہ بڑے استقلال سے تمام امور سلطنت انجام دینے لگی۔

ہمایوں کی جلاوطنی کے ایام میں ماہم انگہ نے اکبر کا بے حد خیال رکھا تھا۔بیرم خان کے اقتدار سے نکالے جانے کے بعد وہ اقتدار پر چھا گئی تھی (1560ء اس کا یہ دور اکبر کے زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لینے تک (1562ء) اور اس کی موت سے ذرا پہلے تک قائم رہا۔اس عہد کو کچھ مورخین نے ''پیٹی کوٹ حکومت'' کا نام دیا ہے۔

انگہ ہی کی تحریک پر اکبر نے بیرم خان کو حج پر بھیجا تھا۔ماہم انگہ کا بیٹا ادھم خان بیرم خان کو سلطنت کی حدود سے

نکالنے کے لیے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ اسی دوران انگہ اکبر کو انگیخت دیتی رہی تھی کہ بیرم کو سزائے موت دی جائے مگر اس کو افغانوں نے انتقام لینے کے لیے قتل کر دیا۔

بعد ازاں ماہم انگہ کا بیٹا ادھم خان مال غنیمت میں خیانت کا مرتکب ہوا تو اس نے اکبر سے معافی مانگ کر خیانت کردہ مال واپس کر دیا۔ ماہم انگہ کو شمس الدین انگہ، وکیل مطلق کا عروج پسند نہ تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے سوا کوئی اور اکبر کی نظروں میں صاحب اعتماد ٹھہرے۔ ادھم خاں نے انگہ کو تلوار سے بحالت تلاوت قرآن شہید کر دیا اور پھر تلوار لے کر شاہی محل کے دروازے تک جا پہنچا اکبر نے اسے شاہی محل کی بلندی سے دو مرتبہ نیچے گرا کر مروا دیا۔ اپنے بیٹے کے مرنے کے چالیس دن بعد ماہم انگہ نے بھی وفات پائی اور اپنے بیٹے کے مقبرے میں دفن ہوئی۔

حُریم روگزیلینا (م966ھ/1558ء)

وہ عثمانی ملکہ جو کاروبار حکومت پر بھی اثر انداز تھی اور جس کے اثرات آج بھی جاری و ساری ہیں

نام و نسب: روگزیلینا آج کے یوکرین میں پیدا ہوئی جہاں سے اسے کریمیائی تاتاریوں نے استنبول پہنچا دیا۔ استنبول میں اسے سلیمان اعظم نے اپنے حرم کے لیے منتخب کر لیا۔ اس کا نام حُریم رکھا گیا اور جلد ہی وہ سلیمان اعظم کی محبوب ملکہ بن گئی، مگر ساتھ ہی سلیمان کے حرم کی دوسری خواتین اس سے حسد کرنے لگیں۔ حاسدین میں ولی عہد سلطنت کی ماں بھی شامل تھی۔ مگر یہ بازی بھی حُریم نے جیت لی کیونکہ ولی عہد کی ماں کو جلاوطن کر دیا گیا اور خود ولی عہد کا گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا گیا۔ کچھ مورخین نے لکھا ہے کہ یہ سب حُریم روگزیلینا کے اشارے پر ہوا تھا۔

سلیمان اعظم پر روگزیلینا کا اثر افسانوں کی حد تک بڑھ گیا اور ان دونوں کی محبت کو مغربی آرٹ کے شہپاروں میں جگہ دی گئی ہے۔ روگزیلینا کے بطن سے سلیمان کے پانچ بچے پیدا ہوئے۔ حُریم کی ترقی بھی بے مثال ہے کہ وہ ایک کنیز سے آزاد ملکہ کے مرتبہ تک پہنچی۔

سلیمان اعظم حکومتی معاملات میں اس سے مشاورت کرتا تھا۔ پولینڈ کے شاہ سجمنڈ آگسٹس سے بھی اس کی خط و کتابت تھی۔ روگزیلینا کی زندگی میں پولینڈ سے باب عالی کے تعلقات ہمیشہ دوستانہ رہے شاید یہ روگزیلینا کی خارجہ پالیسی پر اثرات کے نتیجہ میں تھے۔ اسی طرح وہ سلیمان اعظم اور کریمیا کے تاتاری خوانین کے معاملات میں بھی اثر انداز تھی، یہ خوانین یوکرین اور دوسرے علاقوں سے غلام اور کنیزیں لا کر استنبول میں فروخت کرتے تھے۔

روزگزیلینا کو تعمیرات کا بھی بڑا شوق تھا۔ اس کے حکم پر کئی مساجد اور دیگر عمارات تعمیر کی گئیں۔ جن میں خواتین کے لیے ایک ہسپتال اور آیا صوفیہ کے جوار میں عوام کے لیے حمام بھی شامل تھے۔ روگزیلینا کا بیٹا سلیم سلیمان اعظم کا جانشین بنا اور اس کے بعد اس کی بیٹی، بحرمہ حرم کے معاملات کو اس کے خطوط پر چلاتی رہی۔ 2007ء میں روگزیلینا کے اعزاز میں یوکرین میں ایک مسجد کا افتتاح کیا گیا ہے۔

گلبدن بیگم (م1011ھ/1603ء)

شہنشاہ بابر کی بیٹی اور ہمایوں نامہ کی مصنف مغل خاتون

نام و نسب: گلبدن بیگم بنت ظہیر الدین بابر، اس کی والدہ کا نام دلدار بیگم تھا۔ وہ 1523ء میں پیدا ہوئی۔ جب گلبدن بیگم اڑھائی برس کی ہوئی تو بابر نے ابراہیم لودھی کو شکست دے کر شمالی ہندوستان کو فتح کیا۔ 1527ء میں بابر نے شاہی

خاندان کو کابل سے ہندوستان آنے کا حکم دیا۔ آگرہ میں گلبدن اپنے والد سے ملی۔ اس ملاقات کا ذکر اس نے ہمایوں نامہ میں کیا ہے۔

ابھی ہندوستان آئے گلبدن بیگم کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اسے اپنے پیارے باپ کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ بابر کے بعد ہمایوں تخت نشین ہوا اسے اپنی اس ہمشیرہ سے محبت تھی۔ وہ ہر روز اس سے ملنے محل میں آیا کرتا تھا۔ 26 اپریل 1584ء کو گلبدن بیگم کی منہ بولی ماں ماہم بیگم کا انتقال ہوگیا۔ ادھر ہمایوں کا ستارہ اقبال بھی گردش میں آگیا اور اسے اپنے مخالف شیر شاہ سے شکست ہوئی۔ جب وہ اس شکست کے بعد آگرہ واپس آیا تو اس نے گلبدن بیگم کی جو 17 سال کی تھی شادی خضر خواجہ چغتائی مل سے کردی۔ جب ہمایوں کو دوبارہ شکست ہوئی تو کامران مرزا شاہی خاندان کی بیگمات کو لاہور لے آیا۔ لاہور سے وہ اپنی والدہ دلدار بیگم کے پاس چلی گئی جو اپنے بیٹے ہندال کے پاس ملتان میں تھی۔

1545ء میں ہمایوں نے دوبارہ کابل فتح کیا تو گلبدن بیگم بھی کابل میں تھی۔ 1555ء میں ہمایوں نے شمالی ہندوستان کو دوبارہ مسخر کیا، لیکن سلطنت مغلیہ کی بحالی کی یہ خوشی بہت جلد 27 جنوری 1556ء کو ہمایوں کی بے وقت موت سے غم میں بدل گئی۔ ہمایوں کے بعد اس کا نامور بیٹا اکبر تخت نشین ہوا جب ہندوستان میں امن وامان قائم ہوگیا تو اس نے شاہی خاندان کو کابل سے ہندوستان بلالیا۔ اکبر خود گلبدن بیگم کا بہت احترام کرتا تھا۔ 1557ء گلبدن بیگم حج پر روانہ ہوئی۔ گلبدن بیگم نے اپنے اس سفر کے واقعات درج نہیں کیے۔ حج سے واپسی پر اس نے اکبر کے ایماء پر "ہمایوں نامہ" لکھا جو اس کی اصل شہرت کا باعث ہوا۔ گلبدن بیگم نے 27 فروری 1603ء کو وفات پائی۔

سلطان، چاند بی بی (م 1008ھ/1600ء)

احمد نگر دکن کے بادشاہ حسین نظام شاہ کی دختر اور ایک رزم آزاد مسلم ملکہ

نام و نسب: چاند بی بی سلطان بنت حسین نظام شاہ، اس کی والدہ کا نام ملکہ خونزہ سلطان تھا۔

چودہ برس کی عمر تھی کہ 1564ء میں اس کا عقد سلطان بیجاپور، علی عادل شاہ سے ہوا۔ دوسری طرف اس کے متبادل کے طور پر علی عادل شاہ کی ہمشیرہ بی بی ہدیہ سلطان کا نکاح چاند بی بی سلطان کے بھائی مرتضیٰ نظام شاہ سے ہوا۔ اس طرح ان دونوں ہمسایہ سلطنتوں میں چپقلش ختم ہوگی۔ اور دکن کی پانچوں سلطنتوں میں اتحاد کی راہ نکل آئی۔ دکن میں یہ دور سخت آشوب و اضطرار کا تھا بہمنی ریاستیں بھی ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتی تھیں اور شمالی ہندوستان سے مغل بھی دکن کی طرف للچائی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جب چاند بی بی بیجاپور آئی تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے خاوند کا تخت کانٹوں کی سیج ہے، چنانچہ اس نے حتی المقدور طور پر اپنے خاوند کے معاملات میں اس کا ہاتھ بٹایا۔ جب علی عادل شاہ نے 1580ء میں وفات پائی تو اس کا بھتیجا ابراہیم وارث تخت ٹھہرا مگر اس کی خوردسالی کی وجہ سے اقتدار چاند بی بی کے ہاتھ میں آیا۔ چاند بی بی کی شجاعت کا پہلا تجربہ اس وقت ہوا جب برار، بیدر اور گولکنڈہ کی متحدہ فوجوں نے بیجاپور پر حملہ کردیا۔ چاند بی بی نے نہایت دلیری سے ایک سال تک محاصرین کا مقابلہ کیا تا آنکہ دشمن کو پسپاہ ہونا پڑا۔ انہیں دنوں چاند بی بی کے بھتیجے کی شادی ابراہیم کی بہن سے ہوئی تو چاند بی بی احمد نگر آئی۔ اکبر اعظم نے شہزادے مراد کو احمد نگر کی تسخیر کی مہم پر دکن بھیجا ہوا تھا۔ چاند بی بی نے احمد نگر کے قلعے کی حفاظت اس بہادری سے کی کہ فصیل میں شگاف پڑا تو خود نقاب پہن کر اس نے مرمت کرائی۔ آخر فریقین میں صلح ہوگئی۔ مغلوں نے 1599ء میں احمد نگر پر دوبارہ حملہ کیا تو تمام امراء شہر چھوڑ کر بھاگ گئے اور چاند بی بی نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ احمد نگر کو مغلوں کے حوالے کردیا اور خود چند مفسدین کے ہاتھوں ماری گئی۔

ملکہ نور جہاں (م1056ھ/1645ء)

مغل شہنشاہ جہانگیر کی چہیتی اور محبوب ملکہ جو عطر گلاب کی موجد ہے

نام ونسب: ملکہ نور جہاں کا اصل نام مہرالنساء تھا، اس کے والد کا نام مرزا غیاث تھا۔ اس کا دادا خواجہ محمد شاہ ایران کا وزیر اعظم تھا۔ اور دوسرے کچھ رشتہ دار بھی دربار شاہ ایران میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔

اس کے والد مرزا غیاث کا ستارہ کچھ ایسا گردش میں آیا کہ پیسے پیسے سے محتاج ہو گیا اور بالآخر تنگ آکر اس نے ہندوستان کی طرف ہجرت کی۔ اثنائے راہ جب اس کا قافلہ قندھار پہنچا تو اس کی بیوی کے ہاں مہرالنساء پیدا ہوئی مگر مصائب کا دور دورہ تھا اس لیے اسے بیٹی کی پیدائش بھی گراں گزری۔

ایک دن یہ قافلہ ایک راہ سے گزر رہا تھا تو ایک سوداگر کی نظر اس بچی پر پڑی اس کو اس پر رحم آیا اور اس نے اس کی کفالت کی ذمہ داری لے لی اور مہرالنساء کی ماں کو اسے دودھ پلانے پر اپنے ہاں ملازم رکھ لیا۔ جب سوداگر کو مرزا غیاث کے حالات معلوم ہوئے تو وہ اس کے ساتھ کمال لطف مہربانی سے پیش آیا۔ اسی سوداگر نے اس خاندان کو دربار اکبر تک پہنچا دیا۔ اکبر نے مہرالنساء کے باپ اور بھائیوں کو معمولی عہدوں پر مقرر کر دیا۔ اس خاندان نے شاہی محل میں آہستہ آہستہ اپنا اثر و رسوخ بڑھا لیا اور یہ لوگ دربار اکبری میں مناصب جلیلہ پر فائز ہو گئے۔ مہرالنساء کا بلا روک ٹوک شاہی محل میں آنا جانا ہو گیا۔ جوانی کی دہلیز پر پہنچی تو اس کے حسن ظاہری و باطنی کا چرچا ہونے لگا۔

اکبر نے 1594ء میں مہرالنساء کی شادی علی قلی استاجلو نامی ایک فارسی نوجوان سے کر دی۔ اس نوجوان کا فوجدار بنا کر بنگال بھیج دیا گیا۔ بعدازاں شیر افگن کے مارے جانے کے بعد مہرالنساء آگرہ پہنچی اور جہانگیر کی سوتیلی والدہ کی خواص بن گئی۔ 1611ء میں جہانگیر سے اس کی ملاقات ہوئی اور جہانگیر اس سے شادی کا خواہاں ہوا۔ جہانگیر نے اس سے شادی کر کے پہلے اُسے ''نور محل'' کا اور پھر ''نور جہاں'' کا خطاب دیا۔ نور جہاں ملکہ بننے کے بعد کاروبار سلطنت پر اثر انداز ہوئی، جہانگیر کے عہد حکومت کے آخر میں وہ اپنے داماد اور جہانگیر کے چھوٹے بیٹے شہریار کو تخت نشین کرنے کی خواہاں تھی مگر کامیاب نہ ہو سکی اور جہانگیر کی وفات کے بعد شاہجہاں تخت نشین ہوا تو نور جہاں نے باقی زندگی لاہور میں گزار دی اور جہانگیر کے مقبرے کے نزدیک ہی مرنے کے بعد دفن ہوئی۔ اس کی ایک ایجاد عطر گلاب ہے۔

ملکہ ممتاز محل (م1040ھ/1631ء)

تاج محل میں خوابیدہ شاہجہان کی وہ ملکہ جس کے لیے تاج محل وجود میں آیا

نام ونسب: ارجمند بانو ملقب ممتاز محل بنت آصف بن مرزا غیاث بیگ طہرانی۔

1003ھ/1594ء میں پیدا ہوئی اور نہایت حسین اور صاحب جمال تھی۔ ملکہ نور جہاں کی بھتیجی ہونے کے ناطے فہم و فراست میں بھی اس کے ہم پلہ تھی۔ شہنشاہ جہانگیر نے اس کی شادی اپنے بیٹے شہزادہ خرم سے جمعہ 9 ربیع الاول 1021ھ/1612ء کو کر دی تھی۔ بڑی شان و شوکت سے بیاہ کر شاہی محل میں آئی اور ممتاز محل کا لقب پایا۔ بزم شادی مرزا غیاث کے گھر منعقد ہوئی اور شہنشاہ جہانگیر نے اپنے ہاتھ سے نوشہ کے عمامہ پر موتیوں کا ہار باندھا اور پانچ لاکھ حق مہر مقرر کیا گیا تھا۔ اگرچہ شہزادہ خرم کی شادی ایران کے حکمران شاہ اسمٰعیل صفوی کی پوتی قندھاری بیگم سے ہو چکی تھی مگر ممتاز محل نے اس کو اپنی طرف مائل کر کے اس کے دل پر اپنی الفت و محبت کا سکہ جما دیا۔ محبت بھی ایسی کہ جس کا خمار ممتاز محل کی وفات کے بعد

بھی نہ اتر سکا اور اسی محبت نے تاج محل کی شکل اختیار کر لی۔

شاہجہاں کی محبت ممتاز محل سے لحہ بھر کی مفارقت بھی گوارہ نہیں کرتی تھی اس لیے وہ رزم و بزم سے ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی تھی اور ممتاز محل کو شاہجہاں کی تخت نشینی کے بعد سلطنت میں وہی دخل حاصل تھا جو بعہد جہانگیر ملکہ نور جہاں کو حاصل تھا اور وہ شاہی مہر کو تمام افرامین شاہی پر ثبت کرنے کی امین تھی۔ ممتاز محل کے والد آصف خاں کو منصب نو ہزاری عطا ہوا اور پچاس لاکھ سالانہ کی جاگیر منظور ہوئی۔ ممتاز محل حد درجہ رحم دل تھی اور غربا اور مساکین کی خبر گیری کرتی تھی۔

1631ء میں شاہجہاں خان جہاں لودی کی سرکوبی کے لیے برہان پور دکن میں معہ اپنی فوج کے مقیم تھا، ملکہ ممتاز محل بھی اس کے ساتھ تھی۔ ملکہ کے ہاں 17 ذی قعدہ کو ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کے بعد ملکہ علیل ہوگئی اور اُسے غش پڑنے لگے۔ جب زندگی کی امید نہ رہی تو شاہجہاں کو وصیت کی کہ میری اولاد سے غافل نہ ہونا پھر ملکہ نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ بادشاہ کے لیے یہ حادثہ جانکاہ قیامت سے کم نہیں تھا۔ اس کے الم وغم کا یہ حال تھا کہ مدتوں آئینہ میں اپنی شکل نہ دیکھی اور زندگی کی رنگینیوں سے بے زار ہو گیا۔ عارضی طور پر ملکہ کو برہان پور میں امانتاً دفن کیا گیا پھر آگرہ لا کر دفن کیا گیا اور ملکہ ممتاز محل کی قبر پر اس کی یاد میں روضہ تاج محل تعمیر کیا گیا۔

صاحب جی (حیات 1109ھ/1694ء)

ہندوستان کی شیر دل مسلم دختر جو سلطنت مغلیہ کی طرف سے کابل کی گورنر تھی

نام ونسب: عہد شاہجہانی کے امیر الامراء علی مردان خان کی دختر بلند اختر۔ اس کی تعلیم و تربیت بھی اس کے والد نے کی تھی۔

اسلامی تمدن نے جہاں ہندوستان پر اور بہت سے احسان کیے ہیں وہیں اس نے ہندوستان کی نسوانی زندگی میں انقلاب عظیم پیدا کر کے اسے قابل رشک بنا دیا اور رضیہ سلطانہ، چاند بی بی اور صاحب جی جیسی بہادر اور بلند حوصلہ خواتین ہندوستان میں پیدا ہوئیں۔

ماثر الامراء کے مطابق صاحب جی جب سن بلوغ کو پہنچیں تو اس کی شادی میر میراں امیر خان سے ہوگئی۔ امیر خان کو عہد عالمگیری میں پہلے تو جموں و کشمیر کی تسخیر اور تادیب کے لیے نامزد کیا گیا تھا بعد ازاں اسے شہنشاہ عالمگیر نے کابل کا گورنر بنا دیا۔ امیر خاں ایک اکھڑ مزاج سپاہی تھا مگر اس کی بیوی صاحب جی کی دانشمندی نے افغان سرداروں کو ایسا رام کر رکھا تھا کہ وہ امیر خان کے سامنے دم نہ مار سکتے تھے۔ صاحب جی معاملات حکومت میں اپنے شوہر کے ساتھ شریک کار تھی۔

1109ھ/1694ء میں امیر خاں کی وفات کے بعد جب افغان سردار فتنہ و فساد کی آگ مشتعل کرنے پر تلے اور انہوں نے مغلیہ حکومت کا جواء اپنے کندھوں سے اتار کر پھینکنا چاہا تو صاحب جی کا تدبر آڑے آیا اور اس نے تمام سرکشوں کے فسادی منصوبے خاک میں ملا دیئے۔ خان مذکور کی وفات عین اس وقت ہوئی جب وہ کابل کے پہاڑوں میں افغان سرکشوں کے خلاف برسرپیکار تھا اور صاحب جی مردانہ وار اس کی ہمرکاب تھی اس نے خان کی وفات کو پوشیدہ رکھنے کے لیے اس کے زخمی ہونے کا اعلان کیا اور کہا کہ وہ چند روز تک فوج کی کمان نہیں کر سکتا اور یوں فوج کی کمان خود سنبھال لی مگر کچھ دن بعد امیر خان کی موت کا اعلان کرنے کے بعد افغان سرداروں کو تنبیہ کی کہ وہ سرکشی سے باز رہیں۔ جب اورنگ زیب کو امیر خاں کی وفات کی خبر ملی تو وہ فکر مند ہوا مگر اس کے ایک درباری امیر نے اسے بتایا کہ افغانستان کا نظم ونسق صاحب جی نے سنبھال لیا ہے جب تک وہ وہاں موجود ہے افغان سردار شورش بپا نہیں کر سکتے۔ اپنے خاوند کی وفات کے دو سال بعد صاحب جی عازم

حج ہوئی اور اس نے اپنی بقیہ زندگی مکۃ المکرمہ میں بسر کی۔

جہاں آرا بیگم (1092ھ/1681ء)

شاہجہان کی پہلوٹھی کی بیٹی اور ''مونس الارواح'' کی مصنف مغل شہزادی

نام ونسب: جہاں آرا بیگم، شہنشاہ شہاب الدین شاہجہاں اور ملکہ ممتاز محل خاک نشین تاج محل کی سب سے بڑی اور چہیتی بیٹی۔ اعزازی لقب ''فاطمہ الزماں'' تھا۔

پیدائش: جہاں آرا بیگم 21 صفر 1023ھ/ 23 مارچ 1614ء کو آگرہ میں پیدا ہوئی۔ جہاں آرا جب سن شعور کو پہنچیں تو اس کی تعلیم وتربیت صدر النساء بیگم عرف ستی النساء خانم کے سپرد ہوئی جو مشہور شاعر طالب آملی کی بہن تھیں۔ قرآن مجید پڑھنے کے بعد شہزادی نے فارسی نظم ونثر کی طرف توجہ دی۔ ستی النسا کی توجہ اسے شہزادی کے دل میں کتب بینی کا شوق پیدا ہوا جو عمر بھر قائم رہا۔

جہاں آراء بیگم کی شادی عمر بھر نہ ہوئی، مگر ایک نہایت پاکباز زندگی بسر کی اور زہد وصلاح زندگی بھر اس کا شیوہ رہا، دارالشکوہ کے قتل کے بعد اس نے اس کی بیٹی جہاں زیب بانو بیگم کو اپنا متبنیٰ بنالیا تھا اور عمر بھر اس کو اپنی سگی اولاد کی طرح رکھا۔ 1631ء میں اپنی والدہ کی وفات کے بعد اسے مغلیہ سلطنت کی ''خاتون اول'' کا اعزاز حاصل ہوا اور وہ ''بادشاہ بیگم'' کے خطاب سے معروف ہوئیں۔ وہ ساری زندگی اپنے والد کی تہہ دل سے فرمانبردار اور خدمت گزار رہی اور اورنگ زیب کے ہاتھوں اس کی معزولی اور اس کے ایام اسیری کے دوران بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اورنگ زیب کے حریف اول یعنی دار شکوہ اپنے بھائی کی مونس اور ہمدرد ہونے کی بناپر اورنگ زیب کی مورد عتاب بھی رہی جبکہ اپنے والد کے عہد میں وہ بڑی بااثر خاتون تھی۔ جہاں آرا ایک باکمال مغلیہ خاتون تھیں اور تصوف کے موضوع پر دو کتابوں کی مصنف تھی۔

(1) ''مونس الارواح'' اور (2) ''صاحبیہ'' جو ان کے مرشد ملا شاہ قادی کی نامکمل سوانح عمری ہے۔ جبکہ کتاب ''مونس الارواح'' حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی سوانح حیات ہے۔ وہ خاندان تیموریہ کی پہلی خاتون تھی جس نے تصوف کو اپنا شیوہ بنایا۔ ابتداء میں سلسلہ قادریہ میں ملا شاہ قادری سے بیعت تھیں بعد ازاں اس نے سلسلہ چشتیہ میں بیعت کرلی تھی۔

جہاں آرا بیگم نے 1092ھ/ 1681ء میں وفات پائی اور حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے صحن میں دفن ہوئیں۔

زیب النسا بیگم (م1114ھ/1702ء)

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی سب سے بڑی اولاد اور ایک نامور مغل شہزادی

نام ونسب: زیب النسابنت اورنگ زیب، عالمگیر، ایک باشعور نامور مغل شہزادی۔

پیدائش: بروز پنج شنبہ 10 شوال 1047ھ/ 1637ء کو دولت آباد دکن میں پیدا ہوئی۔ اس کا نام اس کے دادا شاہجہان تجویز کیا۔ زیب النساء عمر بھر نا کتخدا رہی اور اس نے ماہ محرم 1114ھ/ 1702ء میں بعمر 67 سال دہلی میں وفات پائی۔

اورنگ زیب کو جب اس کی وفات کی اطلاع ملی تو اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے۔ شہنشاہ نے مرحومہ کے لیے روضہ کی تعمیر اور خیرات وصدقات کرنے کا شاہی فرمان جاری کیا۔ مقبرہ زیب النساء دہلی میں کابلی دروازہ کے باہر موجود تھا۔ 1885ء میں جب دہلی میں ''راجپوتانہ مالوہ'' ریلوے لائن تیار ہوئی تو یہ مقبرہ اس کی زد میں آگیا اور مسمار کردیا گیا۔

زیب النساء کی والدہ دلرس بانو بیگم رابعہ دُرانی بنت شاہ نواز خان صفوی تھی۔ زیب النسا کو اللہ تعالیٰ نے اپنے والد کی طرح علمی وادبی ذوق بخشا تھا۔ جو علم کی دولت اس مغل شہزادی کو نصیب ہوئی وہ اس کی بہنوں کو تو کیا شاہی خاندان کے کسی اور فرد کو حاصل نہ ہو سکا۔ ختم القرآن کے بعد شہزادی کو ملا جیون کی شاگردی میں دے دیا گیا جو عہدی عالمگیری کے ایک بڑے عالم ایک نامور مصنف تھے۔ زیب النسا بیگم اپنے ذوق علمی کی وجہ سے ہمہ وقت علمی اشغال میں مصروف رہتی اور دیگر شاہی بیگمات کی طرح آرام طلبی کی زندگی بسر نہیں کرتی تھی۔ اس کے ذاتی کتب خانے میں نادر اور بیش بہا کتابوں کا نایاب ذخیرہ موجود تھا۔ اس ذخیرہ میں زیادہ تر مذہبی اور ادبی ذوق کی کتابیں تھیں۔ اس کے علاوہ زیب النساء بیگم اہل علم وکمال کی بڑی قدر دان تھی ان میں سے بعض کے سپرد ترجمہ کا کام تھا۔ اس کے حکم پر جو کتابیں ترجمہ ہوئیں ان میں ایک ''زیب التفاسیر ہے جو اس کے نام سے معنون ہے۔ یہ قرآن مجید کی مشہور تفسیر ''تفسیر الکبیر'' کا ترجمہ ہے۔ زیب النسا کا تخلص ''مخفی'' تھا بعض لوگوں کے نزدیک 'دیوان مخفی' اسی کی تصنیف ہے۔ البتہ شالیمار باغ میں بیٹھے ہوئے اس نے فارسی قطعہ ضرور کہا تھا۔ بعض مورخین کے مطابق عالمگیر بھائیوں اور بھتیجوں کے بعد باپ کے خون سے بھی ہاتھ رنگنا چاہتا تھا۔ زیب النسا بیگم نے اپنے والد کو اس گناہ عظیم سے بچایا اور اسے سمجھایا کہ وہ شیخ فانی ہیں، آخر تھوڑے دنوں بعد شاہجہاں کا انتقال ہو گیا۔

زیب النساء کی شاعری کے بارے میں بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر کوئی قطعی رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ بعض شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ زیب النسا نے ایک مرقع تصاویر و خطاطی بھی مرتب کر رکھا تھا۔

حضرت محل (حیات 1274ھ/1857ء)

1857ء کی جنگ آزادی میں اہل لکھنو، کی راہنما اور سالار خاتون

نام ونسب: اصل نام امراؤ، خطاب حضرت محل، لکھنو کے نواب واجد علی شاہ کی بیگمات میں سے ایک۔

جنگ آزادی ہند کے شروع ہونے سے کچھ عرصہ پہلے انگریزوں نے لکھنؤ کے نواب واجد علی شاہ کو کلکتہ میں نظر بند کر دیا۔ ان کی غیر موجودگی میں جنگ آزادی ہند کے دوران اہل لکھنؤ کی سرداری اور راہنمائی حضرت محل کے حصے میں آئی بلکہ یہ انہوں نے اپنی جرات اور ہمت سے خود حاصل کی تھی۔

دسمبر 1848ء میں نواب واجد علی شاہ نے ایک نوخیز لڑکی جس کا نام امراؤ تھا، سے شادی کی اور اسے اپنی ملکہ بنا کر حضرت محل کا خطاب دیا۔ مئی 1857ء میں جب ہندوستان کے اکثر علاقوں میں جنگ آزادی کے شعلے بھڑکنے لگے تو امرائے لکھنو اور فوج کی کئی رجمنٹوں نے بھی انگریزوں کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کر دی۔ امرائے لکھنؤ پہلے نواب واجد شاہ کی دوسری ملکہ نواب محل کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ ولی عہد سلطنت کو بنا کر انگریزوں کا مقابلہ کیا جائے مگر نواب محل نے کہا کہ جب سلطنت اودھ کے بانی نواب شجاع الدولہ انگریزوں کا مقابلہ نہ کر سکے تو اب ان سے کیسے مقابلہ کیا جا سکے گا۔ اب امراء نے واجد علی شاہ کے سب سے چھوٹے شہزادے برجیس قدر کو بادشاہ بنانا چاہا اور حضرت محل کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ وہ برجیس قدر کی والدہ تھیں۔ حضرت محل میں غضب کی ہمت و جرأت تھی۔ وہ اپنے بیٹے کے مستقبل اور لکھنؤ کی آزادی کے لیے انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لیے تیار ہو گئیں۔

برجیس قدر کی تخت نشینی چونکہ کم سنی میں ہوئی اس لیے حضرت محل کو نائب السلطنت مقرر کیا گیا۔ جنہوں نے انگریزوں کے خلاف لڑنے کا فرمان جاری کر دیا اور حضرت محل بنفس نفیس گھوڑے پر سوار ہو کر جنگ کے لیے نکلیں۔ انہیں دنوں لکھنؤ میں ایک مرد درویش اور مجاہد، مولوی احمد اللہ شاہ آیا جو ایک جہاندیدہ انسان تھا اس کی تحریروں نے اہل لکھنؤ میں جہاد کی

روح پھونک دی۔ حضرت محل فوج کی باقاعدہ تنظیم کر چکی تھیں۔ انہوں نے مولوی احمد اللہ شاہ کو اپنا مشیر خاص مقرر کیا۔ جولائی 1857ء میں مولوی احمد اللہ شاہ نے بیلی گارد پر حملہ کیا اور فتح پائی۔ عالم باغ کے معرکے میں بھی اہل لکھنؤ نے فتح پائی۔ مگر ستمبر میں دہلی پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوگیا تو جنرل بخت خاں بھی لکھنؤ آ گئے مگر انگریزوں نے غداروں سے کام لیتے ہوئے حضرت محل اور اس کے ساتھیوں کو شکست دی۔ ان حالات میں ملکہ کو نیپال میں پناہ لینا پڑی اور باقی زندگی وہیں بسر کی۔

سکندر بیگم (م 1288ھ/ 1871ء)

ریاست بھوپال کی وہ رئیس جس کے ریاستی انتظام و انصرام کے خود انگریز معترف تھے۔

نام و نسب: سکندر بیگم بنت نواب نظر محمد خان، والدہ قدسیہ بیگم

پیدائش: 1231ھ/ 1819ء میں بھوپال میں پیدا ہوئیں۔ ابھی دو سال کی تھیں کہ ان کے والد عین جوانی کے عالم میں اتفاقیہ طور پر گولی لگنے سے ہلاک ہوگئے۔ مرتے وقت وصیت کر گئے کہ ان کے مرنے کے بعد قدسیہ بیگم ریاست کی مختار ہوں اور جب میری بیٹی سکندر بیگم سن بلوغت کو پہنچے تو اخوان ریاست میں سے جس کے ساتھ اس کا عقد ہو وہی رئیس ہو۔ 1250ھ/ 1838ء میں جب وہ سترہ سال کی ہوئیں تو ان کے چچازاد، نواب جہانگیر محمد خان سے ان کی شادی ہوئی تو جہانگیر محمد خان نے ریاست طلب کی جس کی مختار ریاست قدسیہ بیگم نے مخالفت کی۔ آخر اس معاملے نے طول کھینچا اور نوبت جدال و قتال کی پہنچی۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے ثالثی بن کر ریاست جہانگیر محمد خان کو دلوادی اور قدسیہ بیگم کو پانچ لاکھ سالانہ آمدنی جاگیر وقف کر دی۔

جہانگیر محمد خان کو ریاست مل گئی مگر ان کی سکندر بیگم سے نہ بن سکی اور سکندر بیگم اپنی والدہ قدسیہ بیگم کے ساتھ اسلام نگر کے قلعہ میں چلی گئیں۔ نواب جہانگیر محمد خان سے ریاستی انتظام نہ سنبھل سکا اور جلد ہی ریاست بیس لاکھ کی مقروض ہوگئی۔ جہانگیر محمد خان بھی جوانی میں مرض الموت میں گرفتار ہوئے تو سکندر بیگم ان کی عیادت کے لیے آئیں اور 1260ھ/ 1848ء میں جہانگیر محمد خان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے بعد قدسیہ بیگم کے بھائی میاں فوجدار خاں والئی ریاست بنایا گیا مگر ان سے ریاست کا انصرام نہ سنبھل سکا اور آخر ان کی جگہ سکندر بیگم رئیس بنیں۔ سکندر بیگم نے نئے سرے سے ریاست کی انتظامی امور کے مطابق تقسیم کی اور وصول و تحصیل کے نئے قوانین مرتب کیے۔ دیوانی اور فوجداری کے قوانین کے الگ الگ ضابطے تشکیل دیئے۔ ریاست میں اردو ہندی کے اسکولوں کا نظام قائم ہوگیا اور ریاست کی دفتری زبان اردو کر دی۔ 1274ھ/ 1857ء میں جب غدر ہوا سکندر بیگم نے نہایت دانشمندی سے اپنی فوج کو باغی نہ ہونے دیا اور انگریز فوج کو غلہ اور رسد پہنچائی۔ ان کی اس وفاداری کا صلہ لارڈ کیننگ نے ایک دربار منعقد کر کے دیا اور سکندر بیگم کو خلعت فاخرہ عطا کی۔ 1280ھ/ 1863ء میں 1500 آدمیوں کے قافلے کے ہمراہ سکندر بیگم حج کے لیے گئیں اور حجاز میں تقریباً 4 لاکھ روپیہ مصارف خیر پر خرچ کیا۔ 1288ھ میں وفات پائی۔

شاہجہان بیگم (1319ھ/ 1901ء)

صاحب سیف و قلم بھوپال کی رئیسہ جو حد درجہ فیاض تھیں۔ تاج الاقبال فی تاریخ بھوپال کی مصنف

نام و نسب: شاہجہاں بیگم بنت نواب جہانگیر محمد خاں، والدہ سکندر بیگم

پیدائش: جن دنوں ان کی والدہ سکندر بیگم اور والد نواب جہانگیر محمد خاں میں ناچاقی کی وجہ سے ان کی والدہ قلعہ

اسلام نگر چلی گئی تھیں، اسی زمانے میں قلعہ مذکور میں 6 جمادی الاول 1254ھ/ 1834ء میں ان کی ولادت ہوئی۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد جب وہ رئیسہ بھوپال بنیں تو ان کی عمر صرف سات آٹھ سال تھی، ان کی تمام تربیت ان کی والدہ سکندر بیگم کے زیر اہتمام ہوئی۔ انہوں نے علوم ظاہری کے علاوہ فنون ظاہری، سپہ گری، شہسواری اور نیزہ بازی وغیرہ میں مہارت حاصل کی۔ جب سن بلوغت کو پہنچیں تو ان کی شادی ریاست کے سپہ سالار اعلیٰ نواب امراؤالدولہ باقی محمد خاں سے ہوئی۔ سکندر بیگم نے گورنمنٹ آف انڈیا سے یہ پہلے ہی طے کرلیا کہ شوہر کی بجائے خود شاہجہاں بیگم ہی ان کے بعد ریاست کی رئیسہ رہیں گی۔ تاہم خود شاہجہاں بیگم نے والدہ کی موجودگی میں انتہائی سعادت مندی سے ولی عہد رہنا منظور کیا۔ 1284ھ/ 1867ء میں ان کے خاوند نواب امراؤالدولہ حج سے واپسی پر علیل ہو کر وفات پا گئے۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد والدہ سکندر بیگم نے انتقال کیا۔ 1285ھ/ 1867ء میں وہ ان صدموں کے بعد سربراہ ریاست بنیں۔ صدر نشینی سے پہلے ہی انہیں تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔

صدر نشینی کے بعد اپنی والدہ کی تقلید میں انہوں نے بھی ریاست کی انتظامی حالت بہتر بنانے کی کوشش کی۔ ریاست سات لاکھ روپے کی مقروض تھی۔ نواب شاہجہاں بیگم نے نہایت تن دہی اور جانفشانی کے ساتھ نظم و نسق پر توجہ دی اور کاروبار ریاست کو بہتر بنایا۔ ریاستی قرضہ بھی تین چار سال میں بے باق کر دیا۔ اپنی والدہ کی طرح ہی ریاست کے مختلف حصوں کے دورے کیے اور رعایا کی بہتری کے لیے مختلف حکم نامے جاری کیے اور ان کی ضروریات کا بندوبست کیا۔ سرکار انگلشیہ نے ان کی ان کوششوں کو سراہا۔

انہوں نے قانون ریاست میں بھی ترامیم و اضافے کیے اور فوج کی بھی اصلاح کی۔ ریاست میں کئی ہسپتال کھولے اور ڈاک خانے جاری کیے اور تار برقی کا نظام ریاست میں متعارف کرایا۔ بھوپال میں ریلوے کا نظام بھی شاہجہاں بیگم کے عہد میں جاری ہوا۔ 1319ھ میں بعمر 65 سال 34 برس کی حکمرانی کے بعد وفات پائی۔

بی اماں، والدہ مولانا محمد علی جوہر (م 1924ء)

عصر جدید کی برصغیر پاک و ہند سے تعلق رکھنے والی وہ پہلی خاتون جس نے سیاست میں سرگرم طور پر حصہ لیا

نام و نسب: عابدی بانو بیگم، "بی اماں" کے عرفی نام سے مشہور ہیں۔

پیدائش: وہ 1850ء یوپی کے ایک معروف گھرانہ میں پیدا ہوئیں۔ تحریک آزادی پاک و ہند میں انہیں ایک خصوصی مقام حاصل ہے۔ جدید زمانہ میں وہ ہندوستان کی پہلی خاتون ہیں جنہوں نے عملی سیاست میں فعال طور پر حصہ لیا۔

ان کی شادی عبدالعلی خان سے ہوئی تھی جو ریاست رام پور کے ایک سینئر آفیسر تھے۔ عبدالعلی خان صاحب کے عابدی بانو بیگم کے بطن سے کل پانچ بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ ان کے بیٹوں میں مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر شامل تھے۔ بی اماں صرف 30 سال کی عمر میں بیوہ ہوگئیں۔ اگرچہ بیٹوں نے خود تعلیمی میدان میں کوئی سند حاصل نہیں کی تھی مگر وہ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے جدید مغربی تعلیم کی اہمیت اور فوائد سے واقف تھیں۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنے بیٹوں کو علی گڑھ اور آکسفورڈ سے تعلیم دلوائی۔ اپنے بچوں کی تعلیم کے حصول کے لیے انہوں نے اپنے ذاتی زیورات تک کو گروی رکھ دیا تھا مگر تعلیم جاری رکھی تھی۔

1917ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے دوران بی اماں نے ایک موثر تقریر کی تھی اور اپنی اس تقریر سے غفلت میں پڑے ہوئے مسلمانان ہند کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا تھا۔ ان کی اس تقریر کے مسلم امہ پر بڑے اچھے اثرات مرتب

ہوئے تھے۔

1920ء کی دہائی میں جب ان کے صاحبزادے جیل میں تھے یہ ہی بی اماں تھیں جنہوں نے تحریک خلافت کو اپنی تقاریر اور کوششوں سے زندہ رکھا تھا۔ انہوں نے ملک کے بیشتر حصوں کے دورے کیے اور اپنی تقاریر کے جادو سے برصغیر کے مسلمانوں کو محمد علی جوہر اور شوکت علی جوہر کے راستے پر چلنے کی ترغیب دی۔ اسی زمانے میں مشہور شعر ''بولی اماں محمد علی کی جان بیٹے خلافت پر دے دو'' گھر گھر میں نوک زباں ہو گیا تھا۔

تحریک خلافت کے خاتمے تک بی اماں زندہ نہ رہ سکیں اور انہوں نے 13 نومبر 1924ء کو وفات پائی۔ ان کی وفات مسلم اُمہ کے لیے ایک بڑا نقصان تھا۔ مگر جن خواتین نے بی اماں کے ساتھ مل کر کام کیا تھا اور ان سے تربیت پائی تھی وہ تحریک جدوجہد آزادی پاک و ہند میں ایک سیاسی طاقت بن کر ابھریں اور انہوں نے مسلم لیگ کے جھنڈے تلے حصول پاکستان کی کوششوں میں عملی طور پر سرگرم حصہ لیا۔

قرۃ العین حیدر (م 2007ء)

ممتاز ادیبہ اور صاحب طرز ادیب سجاد حیدر یلدرم کی صاحبزادی

نام ونسب: قرۃ العین حیدر بنت سجاد حیدر یلدرم، ان کے والد خود ایک مشہور ادیب تھے۔

پیدائش: قرۃ العین حیدر 20 جنوری 1920ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئیں زندگی کا ابتدائی حصہ والد کی ملازمت کی وجہ سے پورٹ بلیئر (جزائر انڈیمان) میں گزرا۔ بعدازاں ڈیرہ دون اور لکھنؤ میں تعلیم پائی۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے انگریزی ادبیات میں ایم۔اے کیا۔ ہندوستانی کلاسیکی مصوری بھی سیکھی۔ لکھنے کا شوق زمانہ طالب علمی سے تھا۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان آ گئیں اور شعبہ اطلاعات وفلم سے وابستہ رہیں۔ مگر پاکستان میں زیادہ عرصہ قیام نہ رہا اور یہاں سے انگلستان چلی گئیں اور وہاں سے واپس بھارت جا کر محکمہ اطلاعات میں ملازم ہو گئیں۔

تصانیف: میرے بھی صنم خانے، سفینۂ غم دل، آگ کا دریا۔ ستاروں سے آگے۔ کار جہاں دراز ہے، فصل گل آئی یا اجل آئی، آخر شب کے ہم سفر، بادسنگ سوسائٹی، دلربا، سیتاہرن، چائے کے باغات۔ ان کی کہانیاں ناقدین کی نظر میں انتہائی بولڈ یعنی شہوت انگیز ہیں جن میں عریاں جذبات اور حیاسوزی پائی جاتی ہے۔ ان کے ناولوں میں لکھنؤ کی تہذیب کے نمونے بھی ملتے ہیں۔

ان کا ناول ''میرے بھی صنم خانے'' ڈاکٹر احسن فاروقی کے ناول ''شام اودھ'' کی یاد دلاتا ہے۔ لکھنوی تہذیب کے بارے میں ان کے ناول ''گردش رنگ چمن'' بے مثال ہے۔ اس میں دہلوی تہذیب کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ ان کا ناول ''آگ کا دریا'' اردو ادب میں ایک عظیم تجربہ ہے۔ اس میں چوتھی صدی عیسوی سے لے کر قیام پاکستان کے بعد تک کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے اور بڑی خوبی سے اتنی طویل کہانی کو ایک ناول میں سمو دیا گیا ہے۔ اس ناول پر ایک فلم بھی بن چکی ہے۔

قرۃ العین حیدر نے دہلی کے قریب ایک ہسپتال میں 2007ء میں وفات پائی اور دہلی جامع ملیہ قبرستان میں دفن ہوئیں۔ ان کی وفات پر بھارت کے وزیر اعظم اور صدر نے افسوس کا اظہار کیا۔

عصمت چغتائی (م1976ء)

اردو زبان کے افسانوی ادب میں ''عصمت چغتائی'' ایک ممتاز اور معتبر نام ہے۔
نام ونسب: عصمت چغتائی خانم، قلمی نام عصمت چغتائی۔ والد کا نام مرزا قسیم بیگ تھا۔ اپنے دس بہن بھائیوں میں عصمت سب سے چھوٹی تھیں۔ 21 جولائی 1915ء کو بھارت کے شہر بدایوں میں ایک متوسط مسلم گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ان کا آبائی وطن بھوپال ہے۔ انہوں نے پرورش آگرے میں پائی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی بعدازاں مسلم گرلز اسکول علی گڑھ سے میٹرک کیا۔ اس کے بعد لکھنؤ کے کالجز سے بی اے اور بی ٹی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ وہ برصغیر کی پہلی مسلم خاتون ہیں جنہوں نے تعلیم کے اعلیٰ مدارج طے کیے۔

عصمت چغتائی کے ایک بھائی مرزا عظیم بیگ ایک نامور ادیب اور مزاح نگار تھے۔ انہیں کی صحبت نے عصمت کے ادبی ذوق کو جلا دی۔ دوران تعلیم ہی عصمت نے سنجیدگی سے ادب کا مطالعہ شروع کیا تھا اور انہوں نے بہت سے غیر ملکی ادیبوں کو بھی پڑھا۔ بیس بائیس سال کی عمر میں انہوں نے اپنا پہلا افسانہ (ڈرامہ) ''فسادی'' کے عنوان سے لکھا جو 1939ء میں اس وقت کے مشہور ادبی رسالے ''ساقی'' میں شائع ہوئی۔ اسی شارٹ اسٹوری سے عصمت چغتائی کے ادب کا آغاز ہوا اور کچھ ہی عرصہ بعد وہ برصغیر پاک و ہند میں اپنے افسانوں کی وجہ سے مشہور ہوگئیں۔ ان کی تخلیقات میں افسانے، ناول، ڈرامے اور خاکے اور مضامین بھی شامل ہیں۔ عصمت چغتائی نے اپنی عملی زندگی کا آغاز درس وتدریس سے کیا وہ 1937ء میں اسلامیہ گرلز ہائی اسکول بریلی میں ہیڈ مسٹریس مقرر ہوئیں اور بعدازاں بمبئی میں انسپکٹرس آف اسکولز کی حیثیت سے ریٹائر ہوئیں۔

1942ء میں انہوں نے مشہور افسانہ نگار، مصنف وہدایت کار شاہد لطیف سے شادی کی جن سے ان کے ہاں دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ عصمت نے شاہد لطیف کی فلموں کے مکالمے اور کہانیاں بھی لکھیں اور کچھ فلمیں خود بھی بنائیں۔ عصمت چغتائی کا افسانہ جنسی آزادی کے حوالے سے مشہور ہے۔ انہوں نے 1976ء میں وفات پائی۔

عدیلہ خانم (1924ء)

کرد قبائلی راہنما خاتون، جس نے کامیابی سے اپنے قبیلے پر حکومت کی

نام ونسب: عدیلہ خانم 1847ء میں ایک ممتاز کرد خاندان میں پیدا ہوئی۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد اس نے عثمان پاشا سے شادی کی جو پڑوس کے کرد قبیلے کا سردار تھا۔ یہ قبیلہ زیادہ تر عراق علاقے کے حلابجہ میں آباد تھا۔ یہ شہر ان دنوں ترکی کی عثمانیہ سلطنت کے سرحدی علاقے میں واقع تھا۔

عثمانیہ اپنے سرحدی علاقوں کی بغاوتوں سے بچنے کے لیے مقامی سرداروں کو حکومتی عہدوں پر فائز کردیتی تھی۔ اسی حکمت عملی کے تحت عثمان پاشا کو شارازور SHARAZOR نامی علاقے میں ایک سرکاری منصب پر فائز کردیا گیا تھا۔ اپنے اسی سرکاری عہدے کی وجہ سے عثمان پاشا اکثر گھر سے غائب رہتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں عدیلہ اس قبیلے کے لوگوں پر حکومت کرتی تھی اسی وجہ سے اس کو خانم کا خصوصی لقب ملا تھا۔

1900ء میں ایک برطانوی سیاح ایلی ہینسٹر نے بھیس بدل کر مشرق وسطی کی سیاحت کی اور وہ حلابجہ بھی آیا۔ اس کی رائے میں اس علاقے کی خواتین سیاسی طور پر انگلستان کی خواتین کے ہم پلہ تھیں۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں جب

عدیلہ خانم 60 سال کی عمر کی ہو چکی تھی اس نے حلابچہ کو کردثقافت کا مرکز بنا دیا تھا۔ وہ آرٹ وفنون کی سرپرستی کرتی تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران عدیلہ نے برطانوی سپاہیوں کی جان بچائی تھی اس کی وجہ سے برطانیہ اس کا مشکور تھا۔ برطانیہ کی حکومت نے اسے ''خان بہادر'' کا خصوصی خطاب دیا تھا۔ عدیلہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا احمد جان پاشا اس کا جانشین بنا اس نے اپنی ماں کے ثقافتی کارناموں کو برقرار رکھا۔

عطیہ بیگم فیضی (م 1967ء)

ماہر فنون لطیفہ، ماہر موسیقی

نام ونسب: عطیہ بنت حاجی حسن علی آفندی، حاجی حسن علی آفندی بدرالدین طیب جی بمبئی والوں کے عزیزوں میں سے تھے۔ یہ ایک مدت سے ہندوستانی ایشیا کی تجارت ک ے سلسلے میں استنبول میں مقیم تھے۔ عطیہ بیگم انہیں کی صاحبزادی تھیں۔ جب ان کی تجارت کو فروغ نہ رہا تو واپس بمبئی آگئے۔ عطیہ نے انیسویں صدی کے نصف آخر میں مسلمان لڑکی ہونے کی حیثیت سے بڑی اچھی تعلیم پائی۔ فنون لطیفہ کا انہیں طبعی ذوق تھا۔ خصوصاً موسیقی میں بڑا کمال حاصل کیا۔

1906ء میں حکومت ہند نے انہیں وظیفہ مقرر کر کے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے ولایت بھیجا۔ وہاں یہ ہندوستانی دستکاریوں کی نمائش میں دلچسپی لیتی رہیں، اسی سلسلے میں انہیں انگلستان کے شاہی دربار بلائی گئیں۔

انگلستان کے علاوہ انہوں نے فرانس، جرمنی اور آسٹریا میں یورپی فنون لطیفہ کا مطالعہ کیا۔ یورپ تعلیم کے زمانے میں قیام ہائیڈل برگ کے دوران ان کی جان پہچان علامہ اقبال سے ہوئی جو خود بھی تعلیم کے سلسلے میں ہائیڈل برگ میں مقیم تھے۔ مشاہیر ہند میں ان کے علامہ شبلی نعمانی سے بھی روابط تھے۔ انہیں کی سفارش پر بیگم بھوپال علامہ شبلی کی سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اشاعت کے لیے مالی امداد کا انتظام کیا تھا۔

1912ء میں عطیہ بیگم نے فن موسیقی پر اپنی پہلی کتاب مکمل کی، اسی زمانے میں ان کی ملاقات مشہور مصور راحمین سے ہوئی جو شادی میں بدل گئی۔ راحمین یہودی النسل تھے، لیکن عطیہ بیگم سے شادی سے پہلے مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔ عطیہ بیگم نے ہندوستان میں مختلف مقامات کا دورہ کر کے موسیقی کے متعلق معلومات اور تاریخی اور تحقیقی مواد حاصل کیا تھا اس کے علاوہ اس زمانے کے باکمال موسیقاروں کو بھی ڈھونڈھ نکالا تھا۔ 1916ء میں انہوں نے بڑودہ میں موسیقی کی کانفرنس منعقد کی جس کے بعد بڑودہ موسیقی کا بڑا مرکز بن گیا تھا۔ 1947ء کے اواخر میں عطیہ بیگم کراچی آگئیں اور یہاں مستقل قیام کیا۔ کراچی میں انہوں نے ایک فنی عجائب خانہ بھی قائم کیا اور قومی اور رفاہی کاموں میں انہماک سے حصہ لیا۔ انہوں نے 1957ء میں وفات پائی۔

مادر ملت فاطمہ جناح (م 1967ء)

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی چھوٹی ہمشیرہ اور راہنما

نام ونسب: فاطمہ جناح بنت جناح پونجا، قائداعظم کے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹی تھیں۔ ابھی دو سال کی تھیں کہ آغوش مادر سے محروم ہو گئیں اسی وجہ سے قائداعظم ابتداء ہی سے اپنی اس بہن سے انسیت رکھتے تھے۔ انہوں نے بڑی شفقت سے ان کی تربیت کی اور عمدہ تعلیم دلوائی۔ محترمہ فاطمہ جناح نے اپنی زندگی جب طبقہ نسواں کی خدمت کے لیے وقف کر دینے کا فیصلہ کیا تو ان کے لیے دندان سازی میں ڈپلومہ حاصل کرنے کا انتظام کیا۔ ڈپلومہ کے حصول کے بعد وہ اس

میدان میں زیادہ عرصہ تک خدمات انجام نہ دیں اور قائداعظم کی اہلیہ کی وفات کے بعد انہوں نے خود کو بھائی کے گھر کے امور وانتظام کے لیے وقف کر دیا۔ بھائی نے بچپن میں ان کی پرورش کی تھی اور ان کی تعلیم وتربیت پر خصوصہ توجہ دی تھی اب انہوں نے اپنے عمر رسیدہ بھائی کی خدمت کو اپنا نصب العین بنایا اور اپنی زندگی بھائی کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔

قائداعظم کی سیاسی زندگی سے محترمہ فاطمہ جناح کو ہمیشہ دلچسپی رہی اور ان کی سیاسی سرگرمیوں میں بھی وہ برابر کی شریک رہیں۔

حصول پاکستان کے بعد مس فاطمہ کی ذمہ داریاں اور بڑھ گئیں۔ جب قائداعظم نے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے اپنے عہدے کا حلف اٹھایا تو سرکاری مہمان نوازی محترطہ فاطمہ جناح کے حصے میں آئی۔ مہاجرین کی امانت کے لیے بھی انہوں نے کئی ادارے قائم کیے۔ قیام پاکستان کے بعد محترمہ نے ایک بڑی سماجی خدمت یہ انجام دی کہ اپنی نگرانی میں گرل گائیڈ تحریک کا آغاز کیا۔ قائداعظم کی بہت سی صفات محترمہ کو ان کے انتقال کے بعد ورثے میں ملیں۔ ویسے بھی سیرت اور صورت میں دونوں بھائی، بہن یکساں تھے۔ محترمہ میں وہی وقار، وہی متانت، وہی خلوص اور وہی بے نیازی کی کیفیت تھی جو قائد کا خاصہ تھی۔ دونوں شخصیات نے کبھی باطل کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ اس بات کا ثبوت 1965ء میں صدر ایوب کے مقابلے میں حزب اختلاف کی سب جماعتوں کے متفقہ امیدوار کی حیثیت سے لڑے جانے والے الیکشن سے ملتا ہے۔ محترمہ فاطمہ جناح نے 9 جولائی 1967ء کو وفات پائی۔

جغرافیہ دان اور سیاح

البلخی	ابن رستہ	ابن حوقل
بشاری مقدسی	الاصطخری	البیرونی
الادریسی	ناصر خسرو	القزوینی
ابن جبیر	ابن بطوطہ	سیدی علی رئیس
اولیا چلبی	ابوعبید البکری	

البلخی (م 322ھ/934ء)

ایک مشہور و معروف عالم، جو آج کل زیادہ تر اپنی جغرافیائی تصانیف کی وجہ سے مشہور ہے۔ وہ تقریباً 236ھ/850ء) میں بلخ کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا اور اسی سال سے زائد عمر پا کر ذوالقعدہ 322ھ/ اکتوبر 934ء میں اس نے وفات پائی۔ البلخی امامیہ فرقے سے تعلق رکھتا تھا اور اس کا باپ بجستان میں ایک مدرس تھا۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد اس نے تحصیل علم کے لیے پیدل عراق کا سفر کیا اور وہاں آٹھ سال مقیم رہا۔ شہرہ آفاق مسلم فلسفی الکندی کی شاگردی کی اور اسے آس پاس کے ممالک کی سیاحت کا بھی موقع ملا۔ آخری عمر میں جب امیر بخارا نے اسے بلایا تو اس نے بلخ چھوڑ کر بخارا جانے کے لیے دریائے جیحوں کو عبور کرنے سے انکار کر دیا۔

عراق میں اپنے قیام کے دوران البلخی نے فلسفہ، نجوم، ہیئت، طب اور علوم طبیعیات کا مطالعہ کیا۔ کچھ مدت تک اپنے فرقہ امامیہ کے مذہبی اعتقاد اور نجوم کے اصول و قواعد کے درمیان جن کا فی زمانہ بڑا رواج تھا تذبذب میں مبتلا رہا، بعد ازاں وہ مذہبی عقائد کا حامی اور راسخ العقیدہ ہو گیا اور فلسفے کے ساتھ ساتھ اس نے مذہبی علوم کا مطالعہ بھی شروع کر دیا۔

شہرستانی اسے عظیم حکمائے اسلام میں شمار کرتا ہے۔ تاہم کتابیں تصنیف کرنے کی وجہ سے وہ اپنے مربیوں کی سرپرستی سے محروم ہو گیا تاہم ناقدین البلخی کی مذہبی تصانیف کی بڑی تعریف کی ہے۔ محققین نے یہ بھی لکھا ہے کہ البلخی اپنی ایک تصنیف کی وجہ سے مشہور و معروف ہے۔ وہ تصنیف ہے ''صور الاقالیم الاسلامیہ'' یا ''تقویم البلدان''۔ کہتے ہیں کہ البلخی کا رجحان جغرافیے کی طرف اپنے استاد الکندی کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس کی ایک اور اہم تصنیف ''صورۃ مامونیہ'' جو نقشوں کی کتاب ہے اس کی وجہ شہرت مانی جاتی ہے۔ المقدسی کی رائے کے مطابق البلخی زیادہ سفر نہیں کیے تھے بہر حال علم جغرافیہ پر وہ بڑی دسترس رکھتا تھا۔

ابن رستہ (م نواح 310ھ/922ء)

ابو علی احمد بن عمر، ایرانی الاصل عربی عالم، جغرافیہ دان اور مصنف ''الاعلاق النفیسہ''

تیسری صدی ہجری/نویں، دسویں صدی عیسوی کا ایک ایرانی الاصل عرب عالم، اس کی زندگی کے حالات بھی بہت کم معلوم ہوئے ہیں۔ وہ اصفہان کا رہنے والا تھا جہاں اور بھی کئی علماء ابن رستہ کے نام سے مشہور تھے۔ 290ھ/903ء میں وہ حج کے موقع پر مدینہ منورہ گیا اور تقریباً اسی زمانے میں اس نے اپنی کتاب الاعلاق النفیسہ لکھی۔ اس کتاب کا صرف ساتواں حصہ مستشرقین کی کوششوں سے ہم تک پہنچا ہے۔ اس میں سپہر فلک اور کرہ ارض پر ایک دیباچہ لکھنے کے بعد وہ مختلف ملکوں اور شہروں کا بیان شروع کرتا ہے۔ اس کتاب کا بیشتر مواد اس نے قدیم تصانیف اور اپنے ہم عصر علما کی تصانیف سے لیا تھا۔ مستشرق دخویہ سے پہلے ایک اور مستشرق CHWOLSON اس کی کتاب کے کچھ حصے روسی زبان میں ترجمہ کر کے شائع کر چکا تھا۔

ابن رستہ کی وفات قریباً 310ھ/922 عیسوی میں ہوئی تھی۔

ابن حوقل (م 350ھ/961ء)

ابو القاسم محمد النصبی البغدادی، عرب سیاح، جغرافیہ نگار اور کتاب ''المسالک والممالک کا مصنف

ایک اہم عرب سیاح اور جغرافیہ نگار۔ اس کے حالات زندگی کے متعلق بہت کم معلومات موجود ہیں۔ وہ اپنے متعلق خود بتاتا ہے کہ رمضان 331ھ/مئی 943ء میں بغداد سے اس مقصد سے نکلا کہ دوسرے ملکوں اور ان کے باشندوں کے متعلق معلومات حاصل کرے اور تجارت کے ذریعے دولت کمائے اس نے مشرق سے مغرب تک اس وقت کی دنیائے اسلام کی سیاحت کی اور اپنے پیشرو سیاحوں، الجیہانی، ابن خرداذبہ اور قدامہ کی تصانیف کا مطالعہ کیا۔ مستشرق ڈوزی کی رائے میں وہ فاطمی خلفائے مصر کے لیے جاسوسی کا فرائض انجام دیتا تھا۔ سفر کے دوران میں وہ غالباً 340ھ میں اصطخری سے ملا اور اس کی درخواست پر اس نے اس جغرافیہ نویس کے نقشوں کی اصلاح کی اور اس کی کتاب میں ترمیم و تبدیلی کی لیکن اس کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اس کتاب کو خود از سر نو لکھے۔ چنانچہ اس کتاب کو نئے سرے سے لکھ کر اس نے اپنے نام کے ساتھ بعنوان ''المسالک والممالک'' کے ساتھ شائع کیا۔ تاہم یہ کتاب 367ھ/977ء سے پہلے مکمل نہ ہو سکی لیکن یہاں یہ اختلاف ہے کہ حاجی خلیفہ، صاحب کشف ظنون نے اس کا سال وفات 350ھ/961ء دیا ہے۔ مستشرقین میں سے ڈخویہ DEGOEJE نے اس کی کتاب المسالک والممالک لائیڈن سے 1873ء میں شائع کی جبکہ ایک اور مستشرق کرامرز نے اس کی کتاب ''صورۃ الارض'' کے نام سے دو حصوں میں شائع کی ہے۔

اردو زبان میں صوفی تبسم نے اس کا جزوی ترجمہ بعنوان ''مسلمانوں کا علم جغرافیہ اور شوق سیاحت'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔

بشاری مقدسی (م 391ھ/1000ء)

شمس الدین ابو عبداللہ محمد، ایک مشہور عرب عالم اور ماہر جغرافیہ دان، سیاح اور صاحب ''احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم''

المقدسی جیسے کے نام سے ظاہر ہے بیت المقدس کا باشندہ تھا۔ وہ تقریباً 945ء عیسوی میں القدس ہی میں پیدا ہوا۔ اس کی وجہ شہرت اس کی مشہور زمانہ تصنیف ''احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم'' ہے۔ المقدسی نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو وہ القدس ہی میں تھا۔ اس کے بعد وہ اندلس، سندھ اور بحستان کے علاوہ مملکت اسلامیہ کے بیشتر علاقوں کا سفر کیا۔ وہ صقلیہ بھی گیا اور ملتان بھی آیا۔ اپنے ان تمام سیاحتی سفروں کے مشاہدات اور تجربات کو اس نے ''احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم'' میں قلمبند کیا۔ یہ تصنیف اس نے شیراز میں 985ء میں مکمل کی۔ جبکہ اس کے پندرہ سال بعد 1000ء میں SISLEY وفات پائی۔

ازمنہ وسطی کے دیگر جغرافیہ نگاروں نے اپنی کتابوں جغرافیائی جزئیات کو بیان کیا ہے مگر بشاری مقدسی نے ان سے مختلف طبقات کی ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا کر کے انہیں مفید معلومات فراہم کرے۔ اس نے اپنی تصنیف ''احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم'' میں سمندروں، دریاؤں اور جگہوں کے نام اور ان کے متبادلات، مختلف خطوں کی امتیازی خصوصیات اسلام میں پائے جانے والے مختلف فرقے اور دنیائے اسلام میں آباد ذمی رعایا یعنی غیر مسلم باشندے اور اختلافی امور و مقامات پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں پہلی مرتبہ انہوں نے عربی زبان کی جغرافیائی اصطلاحوں کے معانی اور مطالب بھی درج کیے ہیں۔ اس نے دنیائے اسلام کو چودہ اقالیم (خطوں) میں تقسیم کیا ہے ان میں سے چھ اقالیم عرب دنیا کی ہیں جبکہ باقی اقالیم عجمی ہیں یعنی المشرق (ساسانیوں کی مملکت)، گیلان اور بحیرہ خزر کے مشرق میں واقع پہاڑی خطے، الرحاب، الجبال، خوزستان اور بین النہرین کے مشرق میں واقع علاقہ۔ فارس، کرمان اور سندھ المقدسی ان تمام اقالیم کا الگ الگ نقشہ مرتب کیا اور ان میں آباد لوگوں کے بارے میں بھی معلومات درج کیں ہیں۔

الاصطخری (م حیات 340ھ/ 951ء)

ابواسحاق ابراہیم بن محمد الفارسی، ایک عرب جغرافیہ نگار، مصنف ''المسالک والممالک''

اس مشہور عرب جغرافیہ نگار کے سوانحی حالات کہیں نہیں ملتے۔ کیونکہ کتاب جغرافیہ المسالک الممالک میں جو اس کی طرف منسوب کی جاتی ہے اور مستشرق دخویہ نے اس کی پہلی جلد شائع کی تھی۔ اس کی سیرت کے بارے میں خاموش ہے۔ دخویہ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کی یہ کتاب دراصل ابوزید بلخی کی ایک قدیم تر کتاب کا نیا روپ ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ابن حوقل نے الاصطخری کی کتاب کو اپنی کتاب کی بنیاد قرار دیا اور اپنے پہلے ارادے کو ترک کر دیا کہ الاصطخری کی کتاب میں چند اصلاحات کر دی جائیں۔ اگرچہ خود اصطخری نے جس سے ابن حوقل 340ھ/ 952ء میں ملا تھا اس سے صرف اصلاحی کام ہی کیا جائے کہا تھا۔ اس سے صرف یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ وہ ابن حوقل کے زمانے میں یعنی چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں زندہ تھا۔

البیرونی (م440ھ/ 1048ء)

مشہور عالم محقق، سیاح، جغرافیہ نگار، مورخ، فلسفی اور ریاضی دان

البیرونی کا نام ابوریحان محمد بن احمد تھا۔ وہ 6 ستمبر 973ء کو خوارزم میں پیدا ہوا اور غزنی میں 1048ء میں وفات پائی۔ البیرونی کی شہرت کئی حوالوں سے ہے لیکن اسے علم الہیئت، ریاضیات، جغرافیہ اور تاریخ میں ایک مستند امام کی حیثیت حاصل ہے۔ البیرونی نے بچپن ہی سے مختلف سائنسی علوم میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ وہ خوارزم کے معروف ہیئت دان

اور ریاضی دان ابونصر منصر کے تلامذہ شامل تھا۔ سترہ برس کی عمر میں اس نے ایک ایسا حلقہ ایجاد کیا جس پر نصف درجہ تک نشانات لگے ہوئے تھے اور یہ نصف النہار کے وقت کاث میں ارتفاع شمس کے مشاہدہ کے لیے استعمال کیا گیا اور اس کی مدد سے البیرونی نے زمین عرض بلد معلوم کیا۔

البیرونی تحصیل علم اور تحقیقات میں مصروف تھا کہ خوارزم میں خانہ جنگی شروع ہوگئی اور اسے اپنے آبائی وطن سے ہجرت کرنا پڑی۔ وہ آل بویہ کی قلمرو میں آ گیا اور اس نے بویہ شہزادے فخر الدولہ کے حکم پر تعمیر کیے گئے آلہ سدس کی مدد سے البیرونی 944ء میں انقلاب شمسی کا مطالعہ کیا اور ایک رسالہ لکھا۔ البیرونی 997ء میں واپس کاث، خوارزم پہنچا اور اس نے وہاں اسی سال (997ء) 24 مئی کو وہاں چاند گرہن کا مشاہدہ کیا۔ البیرونی اور ابوالفنا نے چاند گرہن کے مشاہدے سے بغداد اور کاث کے طول البلد کا فرق معلوم کیا تھا۔ کاث کے محمود غزنوی کے قبضے میں آ جانے کے بعد البیرونی غزنی آ گیا اور یہاں سے اس کی علمی زندگی کا زریں دور شروع ہوا۔ غزنوی سلاطین کے عہد میں ہی البیرونی شاہی نگرانی میں بارہ تیرہ برس ہندوستان میں رہا اور یہاں اس نے قلعہ نندنہ میں بہت سے تحقیقی تجربات اور زمین کا طول البلد معلوم کیا۔ یہیں اس نے 1030ء میں اپنی مشہور زمانہ تصنیف ''تحقیق ماللہند'' مکمل کی۔ البیرونی کی فضیلت اور اس کا علمی مرتبہ اسلام کے عظیم عالموں اور محققین میں سے ہے۔ اس کی ہمہ گیری، اس کے مذاق کا تنوع اور پھر اس پر اس کے علم کی گہرائی بے نظیر ہے۔ البیرونی بیک وقت سیاح، ریاضی دان، ماہر فلکیات، جغرافیہ دان، ماہر فلکیات اور مورخ اور آثار قدیمہ کا عالم تھا۔ مشہور فلسفی ابن سینا سے اس کے کئی بار مناظرے ہوئے۔ ابن سینا جیسا بڑا فلسفی بھی اس کے سوالات کے خاطر خواہ جوابات نہ دے سکا تھا۔

الادریسی (م 560ھ/ 1165ء)

ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ بن ادریس الحمودی الحسنی اسلامی مغرب کا سب سے بڑا جغرافیہ نگار المعروف بالشریف الادریسی (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے ہونے کی بنا پر) 493ھ/ 1100ء میں سبتہ CUETA میں پیدا ہوا اور 560ھ/ 1165ء میں وفات پائی۔ اس نے اسلامی اندلس کے علمی دار الحکومت قرطبہ میں تعلیم پائی اور اس وجہ سے القرطبی بھی کہلاتا ہے۔ حصول تعلیم کے بعد متعدد ملکوں کا سفر کرنے کے بعد ایک طویل مدت تک اس نے صقلیہ کے دار الحکومت پلرمو PALERMO میں قیام کیا اور صقلیہ کے نارمن بادشاہ روجر ثانی ROGER THE SECOND کے دربار میں رہا اور اسی نسبت سے الصقلی بھی کہلایا۔ راجر ثانی کی موت کے تھوڑے ہی عرصہ پہلے (548ھ/ 1154ء) اس نے چاندی کے ایک بڑے قرص پر دنیا کے اس بڑے نقشے کا بیان مکمل کیا تھا جو اس نے اپنی کتاب ''نزھۃ المشتاق فی اختراق الافاق'' یا ''روجر کی کتاب'' کے لیے تیار کیا تھا۔ صقلیہ کے دوسرے نارمن بادشاہ ولیم اول WILLIAM I (1154ء تا 1166ء) کے لیے الادریسی نے جغرافیہ کی اس سے بھی بڑی کتاب ''روض الانس و نزھۃ النفس'' یا کتاب الممالک والمسالک لکھی لیکن اس کتاب کا صرف ایک اقتباس ہی محفوظ رہ سکا ہے جو استنبول کے ایک کتب خانہ میں موجود ہے۔ جبکہ ''نزھۃ مشتاق'' کو یورپ میں نصابی کتاب کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

الادریسی نے اپنی سیاحت کا آغاز ایشیائے کوچک کے سفر سے کیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر بمشکل 16 سال تھی۔ پھر اس نے فرانس کے جنوبی ساحل کے ساتھ ساتھ سفر شروع کیا اور اس طرح وہ انگلستان سے ہوتا ہوا اسپین اور مراکش واپس پہنچ گیا اور براعظم یورپ کے متعلق اس کی معلومات کا باعث بنا۔ اسپین اور مراکش میں وہ خوب گھوما پھرا۔ تقریباً 1138ء میں اسے صقلیہ کے نارمن بادشاہ روجر ثانی نے اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی اور جب الادریسی صقلیہ پہنچ گیا تو روجر نے

اسے وہاں مستقل قیام کرنے کی دعوت دی اور اسے علوی سادات میں سے ہونے کی وجہ سے عباسی کلفاء سے اسے درپیش خطرات سے آگاہ کیا۔ بادشاہ کی اسی درخواست کی وجہ سے الادریسی صقلیہ SISLEY میں ایک طویل عرصہ تک مقیم رہا اور بادشاہ کی فرمائش پر ''نزھۃ المشتاق'' لکھی جو قرون وسطیٰ کا ایک گراں بہا ک انسائیکلوپیڈیا ہے اور اس مین یورپ ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ممالک کے جغرافیائی حالات پیش کیے۔

ناصر خسرو (م 453ھ/1061ء)

ابو معین ناصر بن خسرو، ایک سیاح فارسی کا ایک صاحب دیوان شاعر اور مصنف سفرنامہ

ناصر خسرو بن حارث 394ھ/1003ء میں بلخ کے علاقے قبادیان میں پیدا ہوا۔ ایرانی مورخین اسے علوی لکھتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں کہ وہ مذہباً شیعہ تھا اور شاید اولاد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تھا۔ ناصر نے اچھی تعلیم پائی اور جواں سالی ہی میں مروجہ علوم وفنون سے بخوبی واقف ہوگیا۔ وہ تعلیم کے بعد گیارہویں صدی کے سنہ 40 اور 50 کے درمیانی سالوں م یں مرو میں کسی سرکاری عہدے پر فائز تھا۔

1045ء میں اس کی طبیعت میں اچانک ایک انقلاب پیدا ہوا جس کے باعث خود ناصر خسرو نے ایک الہامی خواب بتایا ہے۔ جس کے بعد اس نے اپنی ملازمت اور تمام عیش وآرام تج دیے اور حج کے سفر پر روانہ ہوگیا۔ ایران جو اس کا وطن تھا متواتر مقامی حکمرانوں کے درمیان جنگوں کا شکار تھا۔ دوران سیاحت وہ جن دیگر اسلامی ممالک کی سیاحت پر گیا ان میں سے کئی بھی اسی قسم کے حالات سے دوچار تھے۔ اس نے فقط مصر کو ایسے حالات سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ اس نے مصر میں مکمل امن وسکون پایا اگر چہ وہاں ان دنوں فاطمیوں کا اسماعیلی خاندان برسراقتدار تھا۔ وہ ان کے فرقے میں شامل ہوگیا اور اس نے فاطمی خلیفہ سے خراسان میں اسماعیلی کی تبلیغ کے لیے اجازت حاصل کی۔

ناصر خسرو نے اپنے سفرنامے میں بیت المقدس کا بھی مفصل ذکر کیا ہے۔ اس کی اور بھی بہت سے تصانیف تھیں مگر اس کی نثریات میں سب سے بہترین اس کا سفرنامہ بھی ہے۔ اس کی دیگر کتابوں میں ''زاد المسافرین'' اول درجے کی کتاب ہے جسے معلومات کا خزانہ کہا جاسکتا ہے۔ یہ الٰہیات اور نظام کائنات سے متعلق مختلف مسائل پر مشتمل ہے۔ اس کا فلسفیانہ دیوان بھی مشہور کتاب ہے۔ اس کتاب میں اس نے اپنی مصیبت کے ایام یعنی جلاوطنی کے دنوں میں مرتب کیا تھا۔ یہ تاریخ ادب فارسی میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ تاہم اس کی تمام تصنیفات زیادہ تر اسمٰعیلی مذہب کی درسی کتب ہیں اور صرف اس کا سفرنامہ اس سے مستثنیٰ ہے۔

القزوینی (م 682ھ/1283ء)

ہیروڈوٹس اور بلینوس کا ہم پایہ عرب کا مستند ترین جغرافیہ نگار مصنف عجائب المخلوقات

عرب جغرافیہ نگاروں میں القزوینی کو قرون وسطیٰ کا ہیروڈوٹس یا عربوں کا بلینوس (یونانی فلسفی) کہا جاتا ہے۔ مشرق میں بالخصوص کائنات سے متعلق اس کی ایک تصنیف کو بے حد قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے یہ احوال کائنات پر ہے۔

زکریا بن محمد بن محمود ابو یحییٰ القزوینی تقریباً 1203ء میں ایران کے شہر قزوین میں پیدا ہوا۔ اس کے سوانحی حالات کے مطابق وہ عرب کے ایک خاندان فقہا سے تعلق رکھتا تھا۔ قزوین کو اس نے کب چھوڑا یہ ٹھیک طرح سے معلوم نہیں۔ البتہ وہ

ابتدائی عمر ہی میں دمشق چلا گیا تھا۔ یہ بات یقینی ہے کہ وہ 1233ء میں دمشق میں تھا اور اسی سال وہاں اس کی ملاقات ایک اور نابغہ روزگار شخصیت، شیخ الاکبر ابن العربی سے ہوئی تھی وہ ان کی صوفیانہ تعلیمات سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ القزوینی کی تربیت ایک فقیہ کے طور پر ہوئی تھی اس لیے وہ آخری عباسی خلیفہ المستعصم کے عہد میں عراق کے شہر الواسط اور حلہ کا قاضی مقرر ہوا تھا۔ اس کی وفات 1283ء میں ہوئی تھی۔

القزوینی نے دو کتابیں لکھیں جو اس کی شہرت کا باعث بنی تھیں۔ ان میں سے ایک احوال کائنات پر اور دوسری جغرافیہ سے متعلق تھی۔ پہلی کتاب کا نام ''عجائب المخلوقات وغرائب الموجودات'' ہے۔ یہ کتاب عطا الملک القزوینی کے نام معنون کی گئی تھی۔ جغرافیے کی کتاب کے دو نام ملتے ہیں۔ ایک ''عجائب البلدان'' اور بعد کے نسخے کا ''آثار البلاد واخبار العباد'' ہے۔

ابن جبیر (م 614ھ/1217ء)

ابوالحسن محمد بن احمد بن سعید بن جبیر الکنانی، اندلس کا مشہور عرب سیاح اور مصنف ''الرحلۃ''

10 ربیع الاول 540ھ/ یکم ستمبر 1145ء کو بلنسیہ، اندلس میں پیدا ہوا اور شعبان 614ھ مطابق نومبر 1217ء میں اسکندریہ مصر میں وفات پائی۔ اس نے فقہ اور حدیث کی تعلیم شاطبہ میں حاصل کی جو اس کے خاندان کا آبائی شہر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ والئی غرناطہ ابوسعید بن مومن کے ہاں بطور کاتب ملازم تھا تو اسے مجبوراً شراب پینا پڑی اور اس گناہ کے کفارے کے لیے اس نے قصد حج کیا۔ وہ 578ھ/ 1183ء میں غرناطہ سے روانہ ہو کر طریفہ اور سبتہ CEUTA کے راستے بذریعہ بحری جہاز اسکندریہ پہنچا چونکہ عیسائیوں نے مکہ کا راستہ مسدود کر رکھا تھا اس لیے اسے قاہرہ قوص، عیذاب اور جدے کے راستے سے مکہ پہنچنا پڑا۔ بعد ازاں وہ کوفے، بغداد، موصل حلب اور دمشق گیا اور پھر مکہ سے جہاز میں سوار ہو کر صقلیہ روانہ ہوا اور قرطاجنہ کے راستے 1185ء میں واپس غرناطہ پہنچا۔ اس کے بعد دو مرتبہ پھر اس نے دنیائے مشرق کی طرف سفر کیا۔ یعنی 585ھ تا 587ھ/ 1189 تا 1191ء اور 614ھ/ 1217ء میں، لیکن اس مرتبہ وہ صرف اسکندریہ تک پہنچ سکا جہاں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے ''الرحلۃ'' کے نام سے اپنے سفروں کا جو حال لکھا ہے وہ عربی ادب کی اہم ترین تصنیف ہے اور ولیم (WILLIAM THE 6001) کے عہد کی صقلیہ کی تاریخ کا ایک بہترین حوالہ جاتی کتاب ہے۔ اس سفرنامہ کا اردو زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ ابن جبیر شاعر بھی تھا۔ ابن عبدالملک لکھتا ہے کہ اس کے دیوان کا حجم ابوتمام کے دیوان اتنا تھا۔ اسی طرح اس نے اپنی بیوی کا مرثیہ بھی لکھا تھا۔ ایک محقق نے لکھا ہے کہ ابن جبیر کے سفرنامے کی تحریر اس کی اپنی نہیں بلکہ کسی دوسرے شخص کی ہے۔

ابن بطوطہ (م 779ھ/1377ء)

پرنس آف دی ٹریولرز، شاہ سیاحت، شرف الدین محمد بن عبداللہ، مشہور عرب سیاح، مصنف ''تحفۃ النظار''

مغربی محققین نے ابن بطوطہ PRINCE OF TRAVELLERS کا خطاب دیا ہے۔ وہ طنجہ میں 14 رجب 703ھ/ 24 فروری 1304ء کو پیدا ہوا۔ ایک علم دوست خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے خود علوم دینیہ سے بخوبی واقف تھا۔ 22 سال کی عمر میں 2 رجب 725ھ/ 14 جون 1325ء کو ارادہ حج سے مکہ کے لیے روانہ ہوا۔ اہل قافلہ نے تونس سے روانگی کے وقت اس کے علم وفضل کی وجہ سے اسے اپنا قاضی منتخب کر لیا، سفر پر روانہ ہوتے ہی وہ بیمار پڑ گیا مگر اس نے سفر

جاری رکھا۔ وہ شمالی افریقہ کے راستے بالائی مصر سے ہوتا ہوا بحیرہ احمر پہنچا۔ اسکندریہ میں اس کی ملاقات ایک عالم دین برہان الدین سے ہوئی جس نے اسے ہندوستان اور چین کے بعض علما کے پتے دیئے اور ان سے ملنے کی سفارش کی۔ چونکہ وہ یہاں سے سمندر کے راستے سفر نہ کرسکا اس لیے اس نے شام و فلسطین کے راستے سے مکہ پہنچ گیا پھر وہاں سے ایران، موصل اور دیار بکر کی سیاحت کی اور دوبارہ مکہ پہنچ گیا۔ جہاں اس نے 729ھ اور 730ھ کے سال بسر کیے۔ اس کے بعد ایک تیسرے سفر پر وہ جنوبی عرب سے ہوتا ہوا مشرقی افریقہ گیا اور پھر سمندری راستے سے واپس خلیج فارس پہنچا اور ہرمز سے ایک بار پھر مکہ پہنچا اور تیسری بار حج کیا۔ اس مرتبہ اس نے براستہ مصر و شام ایشیائے کوچک کا سفر اختیار کیا اور کریمیا تک پہنچا۔ ایک یونانی شہزادی جو سلطان محمد ازبک کی بیوی تھی کے جلو میں وہ قسطنطنیہ پہنچا اور وہاں سے اس زمانے کے قیصر روم، انڈونیکس ANDONIKES سے ملاقات کی۔ پھر خوارزم، بخارا اور افغانستان کی سیاحت کی یہاں سے سلطان محمد تغلق کی دعوت پر ہندوستان کے دارالحکومت دہلی پہنچا جہاں دو سال تک مالکیہ مسلک کے مطابق قاضی رہا۔ دو سال کے بعد ایک سفارت کے ساتھ جو چین جارہی تھی کے ساتھ جزائر مالدیپ تک پہنچ سکا جہاں ڈیڑھ سال تک قاضی کے فرائض انجام دینے کے بعد براستہ لنکا، مالابار، بنگال اور کمبوڈیا اور چین تک گیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پیکنگ تک پہنچا۔ پھر سماٹرا انڈونیشیا سے وہ عرب پہنچا اور محرم 748ھ میں ظفار میں جہاز سے اترا اور حج سے فارغ ہوکر پورے چوبیس سال بر اعظم افریقہ پہنچا۔ یہاں سے غرناطہ کا رخ کیا اور پھر اپنے آخری طویل سفر پر ٹمبکٹو سے ہوتا ہوا مراکش پہنچا اس نے اٹھائیس سال تک مسلسل سفر کیے۔

سیدی علی رئیس (م بعد از 1557ء)

تخلص کیاتب رومی، ایک ترک امیر البحر، سمندروں کا سیاح اور محقق و مصنف

سیدی علی رئیس استنبول میں غلطہ کے علاقے میں پیدا ہوا۔ اس کا دادا سلطان محمد فاتح کے عہد میں شپ یارڈ کا ناظم اعلیٰ تھا۔ سیدی علی نے خود بھی شپ ہارڈ میں بطور رئیس کام کیا اور خیر الدین باربروسہ کی کفالت میں پرورش پائی۔

1522ء میں جزیرہ روڈس کی فتح اور بحر ابیض میں لڑی جانے والی تمام بحری جنگوں میں خیر الدین باربروسہ کے شانہ بشانہ شرکت کی اور ان عسکری مہمات کے دوران بحر ابیض کے مغربی ساحلوں کے متعلق بہت سی معلومات حاصل کیں۔ 1538ء میں جنگ پروزہ BATTLE OF PREVEZA میں عثمانی بحری بیڑے کے میسرہ کی قیادت کی اور شہرت پائی۔ 1551ء میں فتح طرابلس میں کپتان سنان پاشا اور ترگت رئیس کے زیر قیادت کام کیا۔

وہ سمندری جنگ جس میں پرتگالیوں کا بحری بیڑا ان کے مدمقابل آیا اور مراد رئیس کو قیادت سے ہاتھ دھونا پڑے اور سیدی علی کو رئیس یا کپتان ہند مقرر کیا گیا آپ کی زندگی میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ 1554ء میں بصرہ روانہ ہوئے۔ اس دوران جغرافیہ اور نقشہ نگاری کے میدان میں بے مثال ماہرانہ صلاحیتیں بروئے کار لائے۔ 1554ء میں بصرہ سے سویش کے سفر میں مسقط کے قریب ان کے بیڑے پر پرتگالیوں نے حملہ کردیا۔ اس اچانک حملے میں پرتگالیوں کے 6 بحری جہاز اور عثمانی قافلے کے 5 بحری جہاز ڈوب گئے۔ اسی سفر کے دوران عمان کے ساحل کے قریب ایک شدید سمندری طوفان کا سامنا بھی کرنا پڑا جس کے دوران سیدی علی کا نو بحری جہازوں پر مشتمل قافلہ بچھڑ کر جنوب کی جانب چلا گیا اور ہندوستان میں گجرات کے ساحل سے جا لگا۔

باقی چھ جہازوں کے ساتھ سیدی علی صراط کی بندرگاہ پر اترے اور پھر خود گجرات کی بندرگاہ احمد آباد چلے گئے۔ گجرات کے سلطان احمد خان نے ان کا استقبال کیا۔ پھر ترکی کی طرف واپسی میں ملتان، لاہور اور دہلی پہنچے اور شہنشاہ ہمایوں

سے ملے اور ایک عرصہ اس کے وزیر رہے۔ ہمایوں کی وفات کے بعد افغانستان، ایران اور ترکستان کے راستہ اناطولیہ کا سفر کیا۔ سیدی علی نے اپنے ان تمام سفروں کو ایک کتاب کی شکل دی ہے۔ سیدی علی اپنی اس طویل سیاحت کے بعد 1557ء میں استنبول پہنچے تھے۔

اولیاء چلپی (م 1095ھ/1684ء)

ابن درویش محمد ظلی، مشہور ترکی سیاح اور مصنف ''سیاحت نامہ''

اس کی تاریخ ولادت 10 محرم 1020ھ/ 25 مارچ 1611ء ہے، وفات 1095ھ/ 1684ء سے پہلے نہیں ہوئی۔

1631ء میں اس نے استنبول میں گھومنا پھرنا شروع کیا۔ وہ اپنی ان طویل سیاحتوں کے حالات قلمبند کرتا رہا جو اس نے کیں۔ یہ سیاحتیں اس نے کبھی نجی حیثیت میں اور کبھی سرکاری حیثیت میں یا امرائے سلطنت عثمانیہ کی ہمرکابی میں کی تھیں۔ بعد ازاں اولیا چلپی نے اپنے ان سفروں کے حالات اپنی اس تصنیف میں جمع کر دیئے جو دس جلدوں پر مشتمل ہے۔ عام طور پر یہ سیاحت نامہ یا ''تاریخ سیاح'' کے نام سے مشہور ہے اور تذکرہ سیاح بھی کہلاتی ہے۔

اولیا چلپی کے علاوہ اس کا اصل نام معلوم نہیں۔ اولیا اس کا قلمی نام ہے جو اس نے اپنے استاد اولیا محمد آفندی امام بارگاہ کی تکریم میں اختیار کیا تھا۔ اس کے والد کا نام درویش محمد ظلی تھا اور وہ دربار کا مخصوص زرگر تھا اس کی عمر اولیا چلپی کی تصریح کے مطابق ایک سو سترہ سال ہوئی تھی۔ اولیاء کی والدہ قفقاز کی رہنے والی تھی اور سلطان احمد اول کے عہد میں داخل سرائے ہوئی اور وہاں اس کی شادی سرکاری زرگر یعنی اولیا کے باپ سے کر دی گئی۔

اپنے سیاحت نامے کی جلد اول میں اولیا نے استنبول شہر اور اس کے مضافات کا ذکر کیا ہے۔ جلد دوم میں برصہ، ازمید، ماطوم، طرابزون، ابخازیہ، اقریطش ارزروم، آذربائیجان، جارجیا وغیرہ کی سیاحت کا ذکر ہے۔ جلد سوم میں دمشق، شام، فلسطین، سیواس، کردستان، آرمینیا، رومیلیا (بلغاریہ) وغیرہ کا۔ جلد چہارم، وان، تبریز، بغداد، بصرہ کے احوال پر مشتمل ہے۔ جلد پنجم میں وان، بصرہ، اوکرکوف، ہنگری، روس، اناطولیہ، بروصہ، دردانیال، ادرنہ، مولوبیا، ٹرانسلونیا، بوسینیا، صوفیا اور دلماتیا کا، جلد ششم میں ٹرانسلونیا، البانیہ، ہنگری، اجوار، بلغریہ، مانٹی نیگرو، کروشیا اور وی آنا کریمیا، مالدیویا، قازق، جنوبی روس، قفقاز اور داغستان کا۔ جلد ہفتم اور جلد ہشتم میں ازق، کافا، باغچہ سرائے (کریمیا) استنبول، اقریطش، مقدونیا، یونان، ایتھنز، ڈوڈی، پیلوپونیس، البانیا، ویلونا، البصان۔ جلد نہم میں سفر حج بسوئے مکہ، اناطولیا، سمرنا، افی سوس، مدینہ منورہ مکہ اور سویز کا۔ جلد دہم میں مصر، قاہرہ، بالائی مصر، سوڈان اور ایسیا کا۔ بہر حال سیاحت نامہ اس کی عظیم تر تصنیف ہے۔

ابو عبید البکری (پانچویں صدی ہجری)

ابو عبید البکری اور شریف الادریسی اسلامی مغرب کے سب سے بڑے جغرافیہ نگار ہیں۔ ابو عبید البکری، عبداللہ بن عبدالعزیز بن محمد بن ایوب کا شمار پانچویں صدی ہجری/گیارہویں عیسوی میں اندلس کے عربی علم و فضل کے مخصوص ترین نمائندوں میں ہوتا ہے۔ ان کی زندگی کے حالات اگرچہ بہت کم معلوم ہیں مگر ان کے کارنامے اتنے ہیں کہ وہ اندلس کے بڑی صاحب علم شخصیات میں سے ایک ہیں۔ بلاد مشرق اور شمالی افریقہ کے حالات اس نے بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں مگر وہ کبھی ان خطوں کی سیاحت کے لیے نہیں نکلا تھا۔ اس کا والد عز الدولہ، عبدالعزیز البکری، والبہ HUELLVA اور شلطیش

کی ایک چھوٹی ریاست کا رئیس الختار تھا۔ 1051ء میں اس نے اپنی ریاست تاجدار اشبیلیہ المعتضد بن عباد کے دباؤ کی وجہ سے اس کے حوالے کر دی تھی۔ اس کے بعد ابوعبید اپنے باپ کے ساتھ قرطبہ چلا گیا اور وہیں اس نے مستقل سکونت اختیار کر لی اور وہیں اس کا انتقال 487ھ/1094ء کو ہوا تھا۔

ابوعبید البکری کو اگر اس کی تصنیفات کے حوالے سے جانچا جائے تو وہ ایک مکمل قسم کا مشارک یا ہمہ دان نظر آتا ہے جسے علم و حکمت کی مختلف شاخوں میں بڑی وسیع معلومات حاصل تھیں۔ اس کی زیادہ تر حیثیت ایک جغرافیہ نگار کی ہے، تاہم وہ ایک عالم الٰہیات، ماہر لسانیات اور عالم نباتیات کا بھی ماہر بلکہ اسے فن شاعری پر بھی دسترس حاصل تھی۔ اس کی تصانیف لسانیات اور نباتیات پر بھی ہیں مگر اس کی جغرافیائی تصنیف ہی دراصل عرب دنیا میں اس کی شہرت کا باعث بنی تھی۔ یہ دو کتابوں پر مشتمل ہے، "معجم ما استعجم" اور "المسالک والممالک"۔ معجم جسے مستشرق وسٹنفلٹ نے اپنے دستخطوں کے ساتھ شائع کیا تھا، دراصل ایک فہرست ہے اور اس میں جزیرۃ العرب کے مقامات کے ناموں کا جن کا ذکر زمانہ جاہلیت کی شاعری میں کیا گیا تذکرہ کیا گیا ہے۔ المسالک البکری کی سب سے بڑی تصنیف ہے مگر ابھی تک اس کا صرف ایک حصہ دستیاب ہوا ہے۔ یہ بڑے طویل اجزاء پر مشتمل ہے جو ابھی سب کے سب شائع نہیں ہو سکے۔ مقدمے میں عام جغرافیہ اور مسلم اور غیر مسلم اقوام سے بحث کی گئی ہے۔

○

وطن پرست راہنما

شہید تیتو میر	نواب سراج الدولہ	سلطان ٹیپو شہید
احمد خان کھرل	مصطفیٰ کمال پاشا	محمد علی جناح
عصمت انونو	احمد سوئیکارنو	شیخ مجیب الرحمان
عالیجاہ عزت بیگووچ	محمود احمد نژاد	

شہید تیتو میر (1831ء)

بنگال کا وہ وطن پرست راہنما جو انگریزوں کے خلاف جہاد میں پیش پیش تھا۔ تیتو میر نثار علی، عظیم بنگالی وطن پرست اور مجاہد۔ وہ عوام میں تیتو میر کے نام سے مشہور تھا۔ موضع چاند پور میں 1782ء میں پیدا ہوا۔ قرآن پاک حفظ کیا اور پہلوانی کا فن بھی سیکھا۔ اوائل عمری سے اسے دین سے لگاؤ تھا۔

1822ء میں سید احمد بریلوی کے ہاتھ پر بیعت کی اور تبلیغ شروع کر دی۔ اس کا نعرہ تھا کہ اگر کسی مسلمان پر ظلم ہو تو اس کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔ چاند پور کا ایک مقامی زمیندار، کرشن دیورائے اسلامی شعائر کے خلاف تھا اور اس نے داڑھیوں، مسلمان ناموں اور مسجدوں پر بھاری ٹیکس عائد کر رکھا تھا۔ ان حالات میں تیتو میر اس کے خلاف میدان میں اترا اور کرشن رائے کے خلاف اس نے جہاد کیا۔ زمیندار نے انگریزوں سے مدد طلب کی۔ تیتو میر نے اس کے باوجود ایک مضبوط قلعے کو اپنا عسکری مرکز بنا کر اسے شکست دی اور 24 پرگند اور نادیا، فرید پور وغیرہ پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ اس نے ایک گاؤں میں بانسوں کا قلعہ تعمیر کر کے انگریزی حکومت کے خاتمے اور نئی مسلم سلطنت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ اس نے کئی بار انگریزی فوج کو شکست دی اور کلکتے پر حملہ آور ہوا۔ آخر کار لارڈ ولیم بینٹنگ نے اس کے خلاف باقاعدہ فوج بھیجی جس نے تیتو میر کے قلعے کو تباہ کر دیا اور وہ اپنے متعدد ہمراہیوں کے ساتھ انگریزوں کے خلاف لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔

نواب سراج الدولہ (م 1758ء)

بنگال کا وہ بیدار مغز حکمران جس نے انگریزوں کو مزید قلعے اور مورچہ بندیاں بنانے سے منع کر دیا تھا بنگال کے نواب علی وردی خان کا نواسہ اور متبنیٰ اور جانشین تھا۔ چونکہ اس کی پیدائش (1728ء) کے چند ہی روز

بعد اس کے نانا علی وردی خاں کے غیر معمولی عروج کا دور شروع ہوا، لہٰذا نومولود سراج الدولہ کو جس کا اصل نام میرزا محمد تھا، نہایت بابرکت سمجھا گیا، بعدازاں اس کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دی گئی۔ اپنے نانا علی وردی خاں کی وفات پر تقریباً 28 سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ بڑا بیدار مغز حکمران تھا۔ انگریزوں کے ارادوں کو بھانپ کر اس نے انگریزوں کو بنگال سے مزید قلعے اور مورچہ بندیاں تعمیر کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا اور جب انگریزوں نے حیلے بہانے کر کے اس کے احکام کی تعمیل سے بچنا چاہا تو اس نے جوابی کاروائی کے طور پر پہلے قاسم بازار کے برطانوی کارخانے اور پھر کلکتہ پر قبضہ کر لیا۔ کلکتے پر قبضے کے سلسلے ہی میں انگریز مورخین نے اس پر "بلیک ہول" نامی سانحے کا الزام لگایا ہے مگر جدید تحقیقات نے یہ الزام بے بنیاد ثابت کر دیا ہے۔ کلکتے پر قبضے کے بعد انگریزوں نے مدراس سے کمک لے کر لارڈ کلائیو کی سرکردگی میں بنگال پر حملہ کیا۔ درباریوں کے اصرار پر نواب سراج الدولہ نے انگریزوں سے صلح کر لی اور انگریزوں کے نقصانات کی تلافی کر دی۔ انگریزوں نے نواب کے وزیر میر جعفر سے ساز باز کر لی جو سراج الدولہ کو انگریزوں کی مدد سے معزول کر کے خود تخت نشین ہونا چاہتا تھا۔ انگریز سپہ سالار لارڈ کلائیو بھی سازشی ذہن کا انسان تھا اس لیے میر جعفر کے اس مقصد کے لیے وہ سرگرم کار ہو گیا۔ میر جعفر نے لارڈ کلائیو اور کمپنی کے دیگر عہدہ داروں کو رشوت کے طور پر بڑی بڑی رقمیں دینے کا وعدہ کیا۔ 23 جون 1758ء کو نواب سراج الدولہ اور انگریزوں کے درمیان جنگ پلاسی لڑی گئی عن میدان جنگ میں میر جعفر اور اس کے ساتھی نواب سراج الدولہ سے غداری کرتے ہوئے انگریزوں سے جا ملے اور میر جعفر نے حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے نواب صاحب کو میدان جنگ سے فرار کر دیا بعدازاں اس کے بیٹے نے اسے بے دردی سے قتل کر دیا۔ میر جعفر نے ناظم بنگال بننے کے بعد انگریزوں کو خطیر رقمیں اپنے وعدے کے مطابق پیش کیں اور یوں ایک غدار وطن کو نواب آف بنگال بنا دیا گیا۔

سلطان ٹیپو شہید (1799ء)

شیر میسور، جو تمام خطروں کا مقابلہ تنہا کرنے کا عزم وحوصلہ رکھتا تھا

سلطان حیدر علی خان بانی سلطنت میسور کا عظیم سپوت، 10 نومبر 1750ء کو جمعے کے دن دیون ہلی، بنگلور میں پیدا ہوا۔ والدہ کا نام فاطمہ المعروف بہ فخر النساء تھا۔ ان کا نام ٹیپو سلطان حیدر علی نے آرکاٹ کے ایک مشہور بزرگ ٹیپو مستان ولی کے نام پر رکھا تھا۔ پانچویں سال میں تعلیم وتربیت شروع ہوئی، عربی فارسی میں مہارت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ انگریزی اور فرانسیسی زبانیں بھی بولنا سیکھیں۔ فنون سپہ گری میں مہارت تامہ حاصل کی۔ 1765ء میں حیدر علی نے ملیبار پر حملہ کیا تو ٹیپو سلطان اس حملے میں ساتھ تھا۔ پہلی جنگ میسور میں بھی ٹیپو سلطان کو مدراس کے محاذ پر بھیجا گیا، یوں عالم شہزادگی میں ہی سلطان ٹیپو نے بہادری اور جرأت کے بہت سے کارنامے انجام دیئے۔

سلطان حیدر علی کے انتقال (7 دسمبر 1782ء) کے بعد 26 دسمبر 1782ء کو مسند نشینی سلطان کی رسم ادا ہوئی اور ٹیپو سلطان تخت نشین ہوئے۔ تخت نشینی کے فوراً بعد ایک فرانسیسی افسر کو فوج کو نئے نمونے پر مرتب کرنے کا حکم دیا۔ توپ خانے کی بھی تنظیم نو کی گئی۔ پھر اس کے بعد تمام دشمنوں کے خلاف سینہ سپر ہو گئے۔ انگریز، مرہٹے اور نظام دکن بھی سلطنت خداداد میسور کو ہڑپ کر جانے کے لیے کوشاں تھے۔ انگریزوں سے کچھ عرصہ کے لیے جنگ ختم ہوئی تو مرہٹوں نے نظام کے ساتھ ساز باز کر کے سلطان کے علاقے پر حملہ کر دیا۔ سلطان مقامی طاقتوں سے لڑنے کی بجائے انہیں انگریزوں کے خلاف صف آراء دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے ان سے صلح کر لی۔ سلطان نے انگریزوں کے خلاف جو بڑے معرکے لڑے وہ میسور کی پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی جنگیں کہلاتی ہیں۔ انگریزوں نے سلطان کے افسروں کو بھاری رشوتیں دے کر ورغلایا ان غداروں

میں میر صادق، میر غلام علی، میر قاسم علی اور دیوان پورنیا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں کی غداریوں سے انگریزوں کو کامیابی ہونے لگی۔ یہاں تک انہوں نے میسور کے پایہ تخت سرنگا پٹم کا محاصرہ کرلیا۔ دیوان پورنیا اور میر صادق نے عین میدان جنگ میں غداری کی اور انگریزوں سے جاملے۔ بالآخر یہ مرد مجاہد 4 مئی 1799ء کو میدان جنگ میں بہادرانہ طور پر لڑتے ہوئے شہید ہوگیا۔ جس جنرل ہیرس نے نعرہ لگایا کہ ''آج سے ہندوستان ہمارا ہے۔''

صاحب سیف ہونے کے ساتھ ساتھ ٹیپو سلطان صاحب قلم بھی تھے انہوں نے ''فرامین احکام'' اور ''فتح المجاہدین'' دو تصانیف اپنی یادگار کے طور پر چھوڑی ہیں۔

احمد خان کھرل (م 1857ء)

1857ء کی جنگ آزادی کا ایک مجاہد اور وطن پرست راہنما احمد خان کھرل کا تعلق منٹگمری یا ساہیوال سے تھا۔ اس نے مختلف گروہوں کو ساتھ ملایا اور جنگ آزادی ہند کے دوران پنجاب میں انگریزوں کے خلاف جنگ شروع کردی اور گوگیرہ جیل کو توڑ کر تمام قیدی رہا کروالیے۔ پھر بعض مقامی رئیسوں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر احمد خان کھرل کے خلاف اقدامات شروع کردیئے۔

ملتان کے ایک سجادہ نشین کی طرف سے پیغام ملا کہ انہوں نے مراقبے میں دیکھا ہے کہ تقدیر سے حکومت کا قرعہ انگریزی گورنمنٹ کے نام پڑ چکا ہے اور آئندہ برصغیرہ میں انگریزوں کا راج ہوگا لہٰذا تمام مقامی سرداروں کو چاہیے کہ انگریزوں کے خلاف جنگ ختم کرکے انگریزی حکومت کے ساتھ مل کر اپنا اقتدار بڑھائیں۔ 19 دسمبر 1857ء کو گوگیرہ، ضلع اوکاڑہ کے مقام پر مجاہدین آزادی، جن کی راہنمائی احمد خان کھرل کررہا تھا اور انگریزی فوجوں کے درمیان گھمسان کی جنگ لڑی گئی جس میں احمد خان کھرل شہید ہوگیا۔

مصطفیٰ کمال پاشا،

اتاترک، جمہوریہ ترکیہ کا بانی اور ترک قوم کو ایک نئی جہت دینے والا

جمہوریہ ترکی کے بانی اور پہلے صدر، 1881ء میں سلونیکا میں پیدا ہوئے۔ اصل نام مصطفیٰ تھا، والد کا نام علی رضا آفندی اور والدہ زبیدہ خانم تھیں۔ ابھی مصطفیٰ کمال پاشا کم سن ہی تھے کہ یتیم ہوگئے اور ان کی پرورش ان کی والدہ نے کی۔ ابتدائی تعلیم سلونیکا میں ''شمسی آفندی مکتب'' میں حاصل کی اس کے بعد عسکری رشدیہ میں اپنی والدہ کی مرضی کے خلاف داخلہ لیا۔ اسی اسکول کے ایک استاد مصطفیٰ نے اس کا نام ''مصطفیٰ کمال'' رکھ دیا تھا۔

مدرسہ عسکریہ سے فراغت کے بعد مصطفیٰ کو پانچویں فوج میں مامور کرکے شام بھیج دیا گیا جہاں مصطفیٰ پر حکومت کی بے ترتیبی، اور بے پروائی اور لوگوں میں سیاسی بے چینی اور اضطراب عیاں ہوگیا۔ ان حالات سے متاثر ہوکر مصطفیٰ نے اپنے دوستوں کی مدد سے ''وطن حریت'' کے نام سے ایک خفیہ انجمن قائم کی جو بعد ازاں ''انجمن اتحاد وترقی'' میں بدل گئی۔

ادھر 1907ء میں مصطفیٰ کو مقدونیہ میں متعین کردیا گیا پھر وہ سلونیکا آگئے۔ 1908ء میں اصلاحات کا اعلان ہوا جس سے مصطفیٰ مطمئن نہیں ہوئے۔ سلونیکا سے مصطفیٰ کو استنبول بھیجا گیا۔ اسی اثنا میں جنگ طرابلس چھڑ گئی اور مصطفیٰ مصر و لیبیا کے محاذوں پر بھیجے گئے۔ بلقان کی جنگ کے اختتام پر مصطفیٰ کو صوفیا میں ملٹری اتاشی مقرر کیا گیا۔ پہلی جنگ عظیم میں مصطفیٰ کمال نے بحیثیت ایک کرنل اور فوجی مشیر کے ترکی کی اس جنگ میں شرکت کی مخالفت کی مگر گیلی پولی کے محاذ پر بے مثال فوجی

کارنامے بھی انجام دیئے۔ مصطفیٰ کمال ایک قوم پرست ہونے کی وجہ سے ترکی میں ایک عظیم انقلاب بپا کرنا چاہتا تھا جنگ عظیم اول کے بعد جب اتحادیوں نے ترکی کے بہت سارے علاقے ہڑپ کیےاور یونان کی فوج سمرنا میں اتری تو مصطفیٰ نے انتہائی بہادری سے ترکی کی سرزمین کا دفاع کیا۔ اگرچہ حکومت نے اسے اس کے عہدے سے برطرف کر دیا مگر فوجی افسروں نے حکومت کے اس فیصلے کوتسلیم نہ کیا اور مصطفیٰ کو اپنا راہنما تسلیم کرلیا۔ جو بالآخر قدیم سلطنت عثمانیہ کے خاتمے اور جدید ترکیہ کا باعث بنا۔ ملک کو جمہوریہ قرار دینے کے بعد مصطفیٰ کمال نے ہمیشہ ایک منتخب پارلیمنٹ کے ذریعے حکومت چلائی اور ملکی نظام میں انقلابی تبدیلیاں عمل میں لائی گئیں۔ خلافت کے خاتمے کے بعد ترکی ٹوپی کی ممانعت کردی گئی اور قومی لباس میں بھی تبدیلی کی گئی اور یوں اپنے صرف پندرہ سالہ دورحکومت میں انہوں نے ترکیہ میں بہت سی اصلاحات کا نفاذ کر کے اُسے جدید اقوام عالم کی صف میں کھڑا کر دیا۔ مصطفیٰ کمال نے 10 نومبر 1938ء کو وفات پائی۔

محمد علی جناح، قائداعظم (م ستمبر 1948ء)

برصغیر کے ممتاز سیاست دان اور قوم پرست راہنما، جنگ آزادی کے قومی لیڈر اور بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح پاکستانی قوم کی وہ عظیم شخصیت ہیں جن کو بلاشبہ ہر کوئی قائداعظم تسلیم کرتا ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح بروز اتوار 25 دسمبر 1876ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ کراچی میں آپ نے سندھ مدرسۃ الاسلام میں داخلہ لیا۔ لندن میں تین سالہ اپرنٹس شپ کے لیے بھیجنے کا فیصلہ آپ کے والد نے کیا مگر ان کی والدہ نے یہ شرط رکھ دی کہ لندن جانے سے پہلے ان کی شادی کردی جائے۔ 1895ء کے اوائل میں آپ تعلیم کے لیے انگلستان پہنچے اور آپ نے لنکنز ان میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخلہ لیا جو اس بنا پر تھا کہ لنکنز کے دروازے پر دنیا کو قانون عطا کرنے والی عظیم شخصیات میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا نام شامل تھا۔ پھر بیرسٹر کا امتحان پاس کر کے آپ چار سال بعد کراچی واپس پہنچے اور پھر آپ نے کراچی کی بجائے بمبئی میں وکالت کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ آپ اپنے خاندان کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ مگر جب کچھ عرصہ تک آپ کی وکالت نے زور نہ پکڑا تو آپ نے سرکاری ملازمت کرنے کا فیصلہ کیا اور مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز ہو گئے تاہم جلد ہی دوبارہ وکالت کرنے لگے اور اس مرتبہ کامیابی نے آپ کے قدم چومے۔ 1904ء تک آپ نہ صرف وکالت میں نام پیدا کر چکے تھے بلکہ سیاسی حلقوں میں بھی روشناس ہو چکے تھے۔ 1906ء میں آپ نے انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس میں دادا بھائی نوروجی کے پرائیویٹ سیکرٹری کے طور پر شرکت کی اور آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوگیا۔ شروع میں آپ ہندو مسلم اتحاد کے پیامبر تھے۔ 1913ء میں آپ نے مسلم لیگ میں شرکت کی اور دسمبر 1916ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کا مشترکہ اجلاس منعقد ہوا اور محمد علی جناح ہی کی کوششوں سے میثاق لکھنؤ طے پایا مگر جلد ہی مسلم لیگ اور کانگریس کی راہیں مختلف ہوگئیں اور ہندو ہٹ دھرمی کی وجہ سے جناح نے بھی کانگریس کو چھوڑ دیا۔ اب آپ برصغیر کے مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت کے راہنما بن کر ابھرے اور نہرو رپورٹ کے مقابلے میں آپ نے اپنے چودہ نکات پیش کیے۔ 1930ء میں علامہ اقبال نے برصغیر میں مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کا تصور پیش کیا جو تصور پاکستان تھا۔ بہت سے نشیب وفراز سے گزرنے کے بعد مسلمانوں نے 14 اگست 1947ء کو آپ کی قیادت میں بالآخر پاکستان حاصل کرلیا اور آپ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بنے مگر آزادی کے حصول کے صرف ایک سال بعد آپ نے وفات پائی۔

عصمت انونو (م 1974ء)

جدید ترکی کا نامور قائد، مدبر، قوم پرست راہنما اور سپہ سالار

یہ مشہور و معروف ترک راہنما سمرنا میں پیدا ہوا۔ اس کے والد مجسٹریٹ تھے مگر عصمت نے فوجی ملازمت کو ترجیح دی۔ 1908ء میں تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کی وجہ سے عصمت انونو بھی انجمن اتحاد و ترقی کے سرگرم رکن بن گئے۔ جب اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا (1911ء) تو جو نوجوان ترک فوجی افسر بھیس بدل کر عربوں کی تنظیم کے لیے طرابلس گئے ان میں غازی عصمت انونو بھی شامل تھے۔ پھر جنگ عظیم اول میں بھی مختلف محاذوں پر اتحادیوں کے خلاف لڑے۔ جنگ عظیم کے اختتام پر ایک بھکارنی کے بھیس میں اناطولیہ پہنچے اور مصطفیٰ کمال کے دست راست کے طور پر یونانیوں کے خلاف جنگ سکاریہ میں لڑے اور انہیں شکست فاش دی۔ اس طرح جہاد آزادی میں حصہ لے کر اپنے وطن کو اغیار کی دستبرد سے بچالیا۔ جنگ عظیم کے بعد ہونے والی کانفرنس میں ترکی کے وفد کی قیادت کی۔

ترکی میں جمہوریت کے قیام کے بعد مصطفیٰ کمال کے عہدہ صدارت میں جمہوریہ ترکی کے وزیراعظم رہے۔ مصطفیٰ کمال کی وفات پر ان کی جگہ ملک کے صدر بن گئے۔ ان کا یہ عہد صدارت 1938ء سے 1950ء تک۔ اسی دوران جنگ عظیم دوم میں ترکی کو غیر جانب داری کی حکمت عملی پر گامزن رکھا۔ 1945ء کے آغاز میں جمہوریہ ترکی نے اپنے سابق اتحادی جرمنی کے خلاف اتحادیوں کی حمایت میں اعلان جنگ کر دیا۔ بعد ازاں ترکی کو اقوام متحدہ کا رکن بھی ان کے ہی عہد میں بنایا گیا۔ 1960ء کے فوجی انقلاب کے بعد 1961ء میں دوبارہ وزیراعظم بنے۔ 1965ء میں مستعفی ہونے پر مجبور ہوگئے مگر ان کی خدمات کے صلے میں ان کو ترکی بہت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا۔

25 دسمبر 1974ء کو وفات پائی۔

احمد سوئیکارنو (م 1970ء)

انڈونیشیا کا وطن پرست بانی صدر اور 22 سال تک اقتدار میں رہنے والی بااثر شخصیت

احمد سوئیکارنو کی شخصیت جدید قوم پرستی کی تاریخ میں خود ایک تاریخ کی حیثیت رکھتی ہے۔ دنیا نے بارہا ان میں ہٹلر، سولینی، واشنگٹن روز اور والٹ کی جھلک دیکھی، گو سوئیکارنو ملک کے آمر مطلق تھے، لیکن اپنی تمام خوبیوں کی وجہ سے ملک میں جمہوری راہنماؤں سے زیادہ مقبولیت رکھتے تھے اور بڑی ہی باوقار اور پراثر شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے مختصر ترین مدت میں پوری قوم کو اتحاد و یگانگت کے انمٹ رشتوں میں جکڑ دیا تھا۔ انڈونیشیائی قوم کے یہ عظیم قائد جون 1901ء میں پیدا ہوئے۔ جب ان کا سیاسی شعور بلوغت کی دہلیز پر پہنچا تو انہوں نے اپنے ملک کو ساڑھے تین سو سالہ ولندیز کی نو آبادیاتی نظام میں جکڑا ہوا پایا۔ سوئیکارنو نے 1926ء میں جدوجہد آزادی کے ہراول دستے میں شرکت کی۔ 1927ء میں انہوں نے نیشنلسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی۔ اس پارٹی نے بعد ازاں انڈونیشیا کی جدوجہد آزادی میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

سوئیکارنو کی یہ سرگرمیاں ولندیزی سامراجی حکومت کے لیے ناقابل برداشت تھیں۔ چنانچہ 1930ء میں صرف انتیس سال کی عمر میں پہلی بار جیل یاترا پر بھیجے گئے۔ انڈونیشیا کی آزادی کے حصول کے لیے انہوں نے اپنی زندگی کے تیرہ سال مختلف وقفوں سے پس زندان گزارے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران انڈونیشیا پر جاپان نے قبضہ کر لیا اس وقت بھی سوئیکارنو یاترا کی جیل میں تھے۔ جنگ عظیم کے بعد چار سالہ جدوجہد کے بعد ہالینڈ نے انڈونیشیا کی آزادی کو تسلیم کر لیا اور

سوئیکارنو انڈونیشیا کے پہلے صدر بنے مگر ملک سیاسی انتشار کا شکار ہو گیا۔ ملک کے حالات بہتر ہونے کی جب کوئی صورت نہ بچی تو انہوں نے 1959ء میں تمام اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیے اور ملک کی پارلیمنٹ کو توڑ دیا اور سیاسی مخالفوں کو بڑی تعداد میں گرفتار کر لیا۔

ملکی استحکام کو بحال کرنے کے ساتھ ساتھ وہ عالمی امور پر بھی طوفان بن کر چھائے رہے۔ 1955ء کی بنڈونگ کانفرنس نے ایشیا کے ملکوں خصوصاً چین کو اس قدر ابھارا کہ عالمی سیاست کا محور بنا دیا۔ یکم اکتوبر 1965ء کو کمیونسٹوں نے سوئیکارنو کی حکومت کا تختہ الٹنے کی ناکام کوشش کی جس کے بعد انڈونیشیا میں امن و امان کی صورتحال بگڑتی چلی گئی۔ ملک میں بڑھتی ہوئی بے چینی کے پیش نظر صدر سوئیکارنو نے 1967ء میں اقتدار وزیر فوج جنرل سوہارتو کے حوالے کر دیا اور خود اقتدار سے الگ ہو گئے۔ سوئیکارنو نے 1970ء میں وفات پائی۔

شیخ مجیب الرحمان

بنگلہ دیش کے بانی اور پاکستان کے ایک منحرف سیاستدان

1920ء میں پیدا ہوئے، اسلامیہ کالج کلکتہ اور ڈھاکا یونیورسٹی سے تعلیم حاسل کی۔ شروع میں مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔ سیاسی کیریئر کے آغاز میں حسین شہید سہروردی کی عوامی لیگ کے قیام میں مدد کی۔ تاہم ان کی شورش پسندانہ سیاست اور مزاج کی وجہ سے حسین سہروردی نے انہیں پس منظر میں رکھا۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد 1948ء میں بنگالی زبان کی حمایت میں ہونے والے ہنگاموں میں حصہ لینے پر انہیں ڈھاکہ یونیورسٹی سے خارج کر دیا گیا اور گرفتار کر لیا گیا۔ 1954ء میں متحدہ محاذ میں عوامی لیگ اور دوسری حزب اختلاف کی جماعتیں شامل تھیں۔ 1954ء ہی میں وہ متحدہ محاذ کے جو بعد میں جگتو فرنٹ کہلایا کی طرف سے وزیر محنت اور تجارت مقرر ہوئے لیکن پاکستان کی حکومت میں شمولیت کے باوجود انہوں نے اس حیثیت میں بھی سابق مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کی لسانی آزادی کی تحریک چلائی۔ اور اس سلسلے میں کبھی جیل میں اور کبھی جیل کے باہر رہے۔ 1963ء میں جب صدر ایوب خان کے ایبڈو کی پابندیاں ختم کیں تو عوامی لیگ کے لیڈر بن گئے اور 1966ء میں اس پارٹی کے 6 نکات کے مسئلے پر دو حصوں میں منقسم ہو جانے تک اس کے لیڈر رہے۔ صدر ایوب خان نے علیحدگی 6 نکات پیش کرنے پر انہیں گرفتار کر لیا۔ 1968ء میں ان پر اگرتلا سازش کیس میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی تحریک کی اعانت کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا۔

اس کیس سے وہ اس وقت رہا ہوئے جب ایوب خاں کی حکومت کے خلاف تحریک مزاحمت زوروں پر تھی۔ تاہم ان کے خلاف لگائے گئے الزامات واپس نہیں لیے گئے۔ انہوں نے اس گول میز کانفرنس میں بھی شرکت کی جو صدر ایوب خان نے مارچ 1969ء میں راولپنڈی میں طلب کی تھی۔ وہ اپنے مزاج اور فطرت کے لحاظ سے ایک ضدی اور ہٹ دھرم انسان تھے۔ 1970ء کے انتخابات میں زبردست کامیابی کے بعد انہوں نے مغربی پاکستان کی اکثریتی پارٹی پیپلز پارٹی سے کوئی سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے بعد علیحدگی کی تحریک چلائی جس کے نتیجے میں بنگلہ دیش وجود میں آ گیا اور وہ 1972ء میں وہ بنگلہ دیش کے وزیر اعظم بنے۔ فروری 1974ء میں اسلامی سربراہان کانفرنس میں شمولیت اختیار کی۔ اگست 1975ء میں قتل کر دیئے گئے۔

اسلام کریموف (م 2016ء)

ازبکستان کا وطن پرست راہنما اور یکم ستمبر 1991ء سے اپنی وفات 2 اکتوبر 2016ء تک صدر رہنے والا 30 جنوری 1938ء کو پیدا ہوا اس کا مکمل نام اسلام عبدالغنی یویچ کریموف تھا۔ کریموف کو اس کی پیدائش کے وقت یتیم خانے میں رکھا گیا تھا۔ بعد اس نے معاشیات اور انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی اور کیمونسٹ پارٹی روس کا ایک اعلیٰ عہدہ دار بن گیا۔ 1989ء میں اس جماعت کے پہلے صدر منتخب ہوئے جبکہ مارچ 1990ء میں ازبک سوویت اشتراکی جمہوریہ کا پہلا صدر بن گیا۔

اسلام کریموف نے 31 اگست 1991ء کو ازبکستان کو ایک آزاد ملک قرار دے دیا اور وہاں منعقد ہونے والے پہلے عام انتخابات میں 86 فی صد ووٹ لے کر پہلے صدر جمہوریہ منتخب ہو گیا۔ تاہم بعدازاں ان انتخابات کو غیر منصفانہ قرار دے دیا گیا۔ ازبکستان کے آئین کے مطابق کوئی شخص دو مرتبہ زائد صدر منتخب نہیں ہوسکتا۔ مگر اسلام کریموف مسلسل آئین میں ترامیم کر کے اپنی وفات 2 ستمبر 2016ء تک صدر کے عہدے پر تقریباً 26 سال براجمان رہے۔ آخری مرتبہ انہوں نے مارچ 2015ء کے اختتام پر ازبکستان کا صدارتی انتخاب جیتا تھا۔

اسلام کریموف نے 2 ستمبر 2016ء کو وفات پائی۔ وہ اپنی وفات سے چند روز پہلے دماغ کی شریان پھٹنے کی وجہ سے ہسپتال میں منتقل کر دیئے گئے۔ ازبکستان کے بانی صدر کی حیثیت سے تاریخ اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

عالیجاہ عزت بیگوچ (م 2003ء)

بوسینیا کے سابق صدر تھے انہوں نے انیس سو نوے کے عشرے کی خانہ جنگی میں کلیدی کردار ادا کیا اور وہ ملک میں کثیر النسلی حکومت کے زبردست حامی تھے۔ یوگوسلاویہ میں صدر ٹیٹو کی سربراہی میں کیمونسٹ حکومت کے دوران عزت بیگوچ کو مسلم قوم پرست گروہ سے وابستہ ہونے کے الزام میں قید کی سزا کاٹنا پڑی تھی۔ تاہم 1985ء میں وہ بوسینیا کے صدر منتخب ہوئے۔ صدر بننے کے بعد جو مسئلہ انہیں درپیش آیا وہ سربیا کی فوج کے محاصرے کا تھا۔ بعدازاں وہ امریکہ کی ثالثی میں طے پانے والے معاہدے پر رضامند ہو گئے جس کے تحت بوسینیا ہرزیگونیا کو ایک سربیائی جمہوریہ اور مسلم اور کروشیائی وفاق میں تبدیل کر دیا گیا۔

جنگ کے خاتمے کے بعد عزت بیگوچ مسلم نشست پر بوسینیا کے صدر منتخب ہوئے۔ خرابی صحت کی بنا پر انہیں اس عہدے سے دستبردار ہونا پڑا۔ 2003ء میں وفات پائی۔

محمود احمد نژاد

جدید دور میں ایران کا ایک سادہ طرز زندگی رکھنے والا حکمران

محمود احمدی نژاد 28 اکتوبر 1956ء کو پیدا ہوئے۔ وہ ایک لوہار کے بیٹے تھے۔ ابھی ان کی عمر صرف ایک سال تھی کہ ان کے خاندان نے تہران کی طرف نقل مکانی کی۔ تعلیم کے بعد وہ انقلاب ایران کے پاسداران کے ساتھ وابستہ ہو گئے ان پر امریکی سفارت خانے پر حملہ کرنے کا الزام بھی لگایا جاتا ہے۔

2003ء میں وہ تہران کے میئر بنے۔ میئر کی نامزدگی سے پہلے بہت کم لوگ ان کے نام سے واقف تھے۔ جب

وہ تہران کے میئر نامزد ہوئے تو انہوں نے اپنے پیشرو میئر کی طرف سے کی جانے والی تبدیلیوں کو ختم کر دیا۔ شہر سے تمام فاسٹ فوڈ ریستوران ختم کر دیئے۔ بلدیہ کے ملازمین کے لیے لمبے بازو والی قمیض پہننا اور داڑھیاں رکھنا لازم قرار دی گئیں۔ اسی وجہ سے ایران کے اصلاح پسند صدر محمد خاتمی نے احمد نژاد کے کابینہ کے اجلاسوں میں شرکت کرنے پر پابندی لگا دی۔ جبکہ عام حالات میں تہران کا میئر کابینہ کے اجلاسوں میں شرکت کرتا تھا۔ محمود احمد کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ وہ تہران کا میئر ہونے کے باوجود ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہائش پذیر ہے اور انہوں نے کبھی سرکاری گاڑی اور سرکاری رہائش گاہ استعمال نہیں کی۔

جب انہوں نے 2005ء میں صدارتی انتخاب لڑنے کا اعلان کیا تب بھی وہ ایرانی سیاسیات میں کوئی مشہور شخصیت نہیں تھے مگر انتخاب کے پہلے مرحلے میں انہوں نے سابقہ صدر ہاشمی رفسنجانی کے بعد سب سے زیادہ ووٹ لیے اور دوسرے مرحلے میں 62% ووٹ لے کر صدر منتخب ہوگئے۔ ایران کے غریب صوبوں میں احمدی نژاد کے حق میں سب سے زیادہ ووٹ ڈالے گئے تھے۔ احمدی نژاد نے ایران کے معاشرتی طور پر پسماندہ طبقات کی ترقی کے لیے اقدامات کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ صدر بننے کے بعد انہیں شدید امریکی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسری طرف ان کے عہد میں ایران کے ایٹمی پروگرام پر بھی عالمی اعتراضات کی وجہ مسلسل دباؤ رہا۔ 12 جون 2009ء کو وہ دوبارہ صدر منتخب ہوئے اور ان کی کامیابی میں ایران کے نچلے طبقات کا بڑا ہاتھ تھا۔ ان پر دھاندلی کے الزامات بھی لگائے گئے۔

وزرائے اعظم وصدور

قائد ملت خان لیاقت علی خان		عدنان میندریس
تنکو عبدالرحمٰن		صدر ایوب خان
صدر جمال عبدالناصر	دیکھیے انقلابی اور مصلح	ذوالفقار علی بھٹو
کرنل معمر قذافی	دیکھیے انقلابی اور مصلح	صدر انوار السادات
صدر صدام حسین		جنرل محمد ضیاء الحق
بے نظیر بھٹو		ڈاکٹر مہاتیر محمد
نواز شریف		

قائد ملت خان لیاقت علی خان (1951ء)

پاکستان کے پہلے وزیر اعظم اور قائد اعظم کے دست راست، محب وطن راہنما

قائد ملت نوابزادہ لیاقت علی خان کرنال کے نواب رستم علی خان کے ہاں یم اکتوبر 1895ء کو پیدا ہوئے۔ نواب صاحب کے روحانی پیشوا حضرت سید عبدالعلی شاہ نے اس بچے کے متعلق پیشین گوئی فرمائی تھی کہ یہ بچہ کسی ملک کا سربراہ مملکت بنے گا۔ نوابزادہ لیاقت علی کو بچپن ہی سے سیاسیات میں بے حد دلچسپی تھی۔ آپ دوران تعلیم اسکول وکالج کے انتخابات میں مسلسل حصہ لیتے رہے اور علی گڑھ اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد آخر آل انڈیا مسلم لیگ سے وابستہ ہوگئے۔ قائد اعظم نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ نوابزادہ لیاقت علی خان میرے دست راست ہیں۔ انہوں نے دن رات کام کیا ہے اور یہ خدمت انجام دینا کسی اور فرد کے لیے ممکن نہیں، نوابزادہ صاحب نے کس قدر بھارتی بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے اس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔ میری دعا ہے کہ ان کی عمر دراز ہو۔

انگریز اور ہندو سے سیاسی جنگیں لڑنے کے بعد جب قائد اعظم کی قیادت میں پاکستان معرض وجود میں آیا نوابزادہ لیاقت علی خاں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم بنے، آپ پاکستان کے پہلے وزیر دفاع اور وزیر خارجہ بھی تھے۔

ان کے عہد میں پاکستان کو بہت سے مسائل کا سامنا تھا جن میں سے ایک بھارت سے آنے والے مہاجروں کی آبادکاری کا مسئلہ بھی تھا۔ جسے لیاقت خاں صاحب نے بڑی خوش اسلوبی سے حل کیا۔

انہیں کے عہد میں 9 اکتوبر 1950ء کو پاکستان کا پہلا ضمنی بجٹ پیش کیا گیا جس میں مہاجروں کی آبادکاری کے

لیے حکومت پاکستان نے کچھ نئے ٹیکس عائد کرنے کا فیصلہ کیا۔ قائد ملت لیاقت علی خاں پہلے وزیراعظم پاکستان تھے جنہوں نے دورہ امریکہ کیا۔ ان کے وزیراعظم بننے پر روس اور امریکہ دونوں بڑی طاقتوں کی طرف سے دورہ کے دعوت نامے موصول ہوئے تھے، نواب صاحب نے روس پر امریکہ کو ترجیح دیا۔ سرکاری حیثیت کے علاوہ آپ نے ذاتی حیثیت میں بھی وہاں کچھ عرصہ قیام کیا۔ قیام پاکستان کے بعد سے وزیراعظم کے علاوہ وزیر دفاع کا عہدہ بھی ان کے پاس رکھا گیا تھا۔ بطور وزیر دفاع ان کی وہ تقریر بری مقبول ہوئی جس میں انہوں نے دشمن کو ''آہنی مکا'' دکھاتے ہوئے کہا تھا کہ یہ ''مکا'' دشمن کا منہ توڑ سکتا ہے۔ 16 اکتوبر 1951ء کو راولپنڈی کے کمپنی باغ میں جب آپ نے اپنی تقریر کے آغاز میں ابھی ''برادران ملت'' ہی کہا تھا تو شقی القلب سید اکبر کی دو گولیوں نے آپ کو شہید کر دیا جو افغانی تھا۔ 17 اکتوبر 1951ء کو انہیں کراچی میں قائداعظم کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔

عدنان میندریس (م 1961ء)

ترکی کے ڈیموکریٹک وزیراعظم جنہیں اسلام پسندی اور آئین کی خلاف ورزی کے الزامات میں پھانسی دی گئی

ترکی کا نواں وزیراعظم عدنان میندریس 1899ء میں پیدا ہوا۔ اس کا تعلق ترکی ایک متمول گھرانے سے تھا۔ اس نے امریکن کالج ازمیر میں تعلیم پائی۔ اس نے اپنی جاگیر کو اپنے حصہ داروں میں تقسیم کر دیا تھا اور اپنے لیے صرف ایک فارم رکھا تھا۔ 1930ء کی دہائی میں وہ ترکی کی پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہوا اور کمال اتاترک کی ری پبلکن پیپلز پارٹی کا نمائندہ تھا۔ اس پارٹی سے عدنان کو 1945ء میں نکال دیا گیا اور اس نے 1946ء میں ڈیموکریٹک پارٹی کی بنیاد رکھی جو ترکی کی پہلی حزب اختلاف پارٹی کی حیثیت رکھتی تھی۔

1950ء کے عام انتخابات میں عدنان میندریس کی ڈیموکریٹک پارٹی کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔ میندریس ری پبلکن پارٹی کے راہنماؤں کے مقابلے میں زیادہ اسلامی خیالات کے مالک اور اسلام پسند تھے اگرچہ خارجہ حکمت عملی میں وہ بھی مغرب نواز ہی تھے۔ ان کی پارٹی نے ترکی میں نجی جائیداد اور کاروبار کی حمایت کی۔

ترکی کے اقتصادی مسائل کے حل نہ ہونے کے باوجود ڈیموکریٹک پارٹی 1954ء میں ہونے والے انتخابات جیت گئی اور عدنان میندریس نے اپنی مقبولیت بحال رکھی۔ میندریز حزب اختلاف کی طرف سے کی گئی تنقید کو برداشت نہیں کرتے تھے اس لیے انہوں نے دوبارہ اقتدار میں آنے کے بعد حزب اختلاف کو خاموش کرنے کے لیے پریس پر سنسر عائد کر دیا اور کئی صحافیوں کو جیلوں میں ٹھونس دیا۔ اس کی حکمت عملی سے نہ صرف ملک کے دانشور اس سے نالاں ہو گئے بلکہ فوج بھی اس کی مخالف ہو گئی اور اتاترک کی پالیسیوں کی محافظ ہونے کے ناطے فوج نے کمال اتاترک کی اصلاحات کو غیر محفوظ قرار دے دیا لیکن 1957ء کے انتخابات بھی ڈیموکریٹک پارٹی جیت گئی اور عدنان میندریس وزیراعظم کے عہدے پر بحال رہے۔ اندرونی سطح پر اس کے خلاف لاوا پکتا رہا جو 27 مئی 1960ء کو ایک فوجی انقلاب کی صورت میں پھٹ پڑا۔ فوجی حکومت نے عدنان میندریس اور اس کی پارٹی کے ہزاروں کارکنان کو گرفتار کر لیا۔ اس کے خلاف بدعنوانی اور آئین کی خلاف ورزی کے مقدمات قائم کر دیئے گئے۔ اور انہیں الزامات میں اسے موت کی سزا دی گئی۔

تنکو عبدالرحمان (م 1990ء)

ایک ملائیشیائی سیاستدان تھے جو وفاق ملایا کے 1955ء تک وزیراعلیٰ رہے۔ 1957ء میں ملائیشیا کی آزادی کے

بعد وہ ملایئشیا کے پہلے وزیر اعظم بن گئے۔ وہ ملایا کے مرحوم سلطان عبدالحمید کے بیٹے تھے۔ وہ 8 فروری 1903ء کو پیدا ہوئے اور انہوں نے 6 دسمبر 1990ء کو کوالالمپور میں وفات پائی۔

16 سال کی عمر میں انہوں نے کیمبرج یونیورسٹی کی اسکالرشپ پائی اور تعلیم کے حصول کے لیے کیمبرج انگلستان چلے گئے۔ انہوں نے سینٹ کیتھرائن کالج کیمبرج سے تعلیم پائی۔ (37-1920ء) 1951ء میں انہوں ملائن انڈین کانگریس میں شرکت کی اور 1955ء کے الیکشن میں کامیابی کے بعد وہ وفاق ملایا کے پہلے وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے۔ اگست 1957ء میں ملایئشیا کی آزادی کے بعد وہ پہلے وزیر اعظم بنا دیئے گئے۔

صدر ایوب خان

پاکستان کے وہ عظیم راہنما جن کا عہد تاریخ پاکستان کا سنہرا دور تھا۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان 14 مئی 1907ء کو ضلع ہزارہ کے ایک گاؤں ریحانہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد انڈین آرمی ایک ریٹائرڈ نان کیشنڈ آفیسر تھے۔ ایوب خان نے ابتدائی تعلیم ہری پور میں حاصل کی اور پھر علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ دوران تعلیم ہی وہ انڈین آرمی کے لیے چن لیے گئے۔ جنرل سکین، ایک انگریز فوجی افسر کو جو انڈین آرمی کے لیے نوجوانوں کو منتخب کرنے کے لیے علی گڑھ آئے تھے ایوب خان کی جاذب نظر شخصیت نے بہت متاثر کیا۔ اس نے انہیں کیشنڈ آفیسر منتخب کر کے فوجی تربیت کے لیے سینڈ ہرسٹ کالج برطانیہ بھجوا دیا وہاں رجمنٹ میں متعین کر دیے گئے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران انہوں نے برما کے محاذ پر خدمات انجام دیں۔ 1945ء میں انہیں صوبہ سرحد بھیج دیا گیا اور پنجاب رجمنٹ کی کمان انہیں سونپی گئی۔

آزادی کے بعد وہ جنوری 1948ء میں مشرقی پاکستان میں جنرل کمانڈنگ آفیسر مقرر کیے گئے۔ 1950ء کی دہائی میں ایوب خان کا تعارف اسکندر مرزا سے ہوا اور اسی کی وجہ جنوری 1951ء میں ایوب خان پاکستان کے پہلے کمانڈر انچیف مقرر ہوئے۔ 1956ء میں آئین کے نفاذ کے بعد جب سیاستدانوں کو جنرل محمد ایوب کی قیادت میں ملک میں پہلا مارشل لاء لگا بعد ازاں جب اسکندر مرزا نے جنرل محمد ایوب کو بھی راستے سے ہٹانا چاہا تو انہوں نے اسکندر مرزا کو گورنر جنرل کے عہدے سے معزول کر کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ سنبھال لیا۔ آپ کے اقتدار سنبھالتے ہی ملک میں سیاسی سرگرمیوں اور سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی اور 1962ء میں ایک نیا آئین تشکیل دے کر خود صدر پاکستان کا عہدہ سنبھال لیا۔ پھر 1964ء میں ہونے والے انتخابات میں حزب اختلاف نے محترمہ فاطمہ جناح کو ان کا مخالف صدارتی امیدوار بنا دیا۔ مگر وہ جنرل انتخابات ہار گئیں۔ 1965ء کی جنگ قوم نے ان کی قیادت میں لڑی مگر جلد ہی قوم غلط فہمیوں کی وجہ سے ان کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی اور مارچ 1969ء میں انہیں مستعفی ہونا پڑا مگر 1974ء میں ان کے انتقال پر پوری قوم ان کے غم میں سوگوار ہوئی اور ان کی خوبیاں کھل کر قوم کے سامنے آئیں۔

ذوالفقار علی بھٹو (م 1979ء)

پاکستان کی وہ عظیم انقلابی شخصیت جس نے پاکستان کو 1973ء کا مستقل آئین دیا۔

22 جون 1966ء کو تیز گام جب ملتان کے ریلوے اسٹیشن پر ٹھہری تو اخبار نویسوں نے ذوالفقار علی بھٹو سے سوال کیا کہ کیا آپ ملک وملت کی خدمات جاری رکھیں گے تو انہوں نے جواب دیا کہ "میں یہی کرتا رہا ہوں" پھر 23 نومبر

پاکستان کو ایک صحیح اسلامی سوشلسٹ اسٹیٹ بنا کر رہیں گے۔

1966ء کو ایک بیان میں انہوں نے کہا کہ وہ

ذوالفقار علی بھٹو 1958ء میں صدر ایوب کی مارشل لاء حکومت سے وابستہ ہو گئے تھے۔ جنوری 1966ء میں اعلان تاشقند کے بعد جو ستمبر 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد صلح کا معاہدہ ہوا اس کے خلاف ذوالفقار علی ان کی حکومت سے مستعفی ہو گئے اور انہوں نے اکتوبر 1967ء میں لاہور میں پیپلز پارٹی نامی سیاسی جماعت کی بنیاد رکھی۔ فروری 1968ء میں انہوں نے تحریک جمہوریت پاکستان میں شامل سیاسی جماعتوں کے سربراہوں کے ساتھ مل کر ایوب خاں کی حکومت کے خلاف ایک مہم کا آغاز کیا جس کے نتیجے میں یحیٰی خان کی مارشل لاء حکومت نے 1970ء میں پاکستان کے پہلے عام الیکشن کرائے جن میں مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی نے 81 نشستیں حاصل کر کے اکثریت حاصل کی جبکہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نے بھاری اکثریت حاصل کی۔

20 دسمبر 1971ء کو جب پاکستان پیپلز پارٹی کو اقتدار سونپا گیا تو اس وقت پاکستان دولخت ہو چکا تھا اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے بحیثیت صدر مملکت اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر عہدہ سنبھالا۔ 12 اپریل 1973ء کو پاکستان کا موجودہ آئین بالغ رائے دہی کی بنیاد پر متفقہ طور پر منظور کیا گیا جس کے تحت 14 اگست 1973ء کو ذوالفقار علی نے وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھالا۔ ان کی وزارت عظمیٰ کے دوران ہی فروری 1974ء میں لاہور میں اسلامی سربراہ کانفرنس منعقد ہوئی جس میں انہوں نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے عہد میں مختلف قسم کی اصلاحات کا نفاذ بھی کیا گیا جن میں زرعی اصلاحات، مزدوروں کے لیے اصلاحات اور اقتصادی اصلاحات شامل تھیں۔ صحت عامہ اور رسل و رسائل کی بہتری کے لیے بھی پروگرام شروع کیے گئے تعلیمی بجٹ کو چار گنا کر دیا گیا اور پرائمری تک تعلیم لازمی قرار دی گئی۔ 1974ء میں ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کو ان کے ایک خط کے جواب میں پاکستان بلا کر بھارت کے 1974ء میں کیے جانے والے ایٹمی دھماکے کے جواب میں پاکستان کا ایٹمی پروگرام شروع کیا گیا مگر ان تمام کارناموں کے باوجود بھٹو صاحب کی مقبولیت بتدریج کم ہوتی گئی اور 1977ء کے انتخابات کے بعد حزب اختلاف کی جماعتوں نے ان کے خلاف تحریک چلائی جس کے نتیجے میں پاکستان میں ایک بار پھر فوجی حکومت قائم ہو گئی اور جس نے بھٹو صاحب کو 1979ء میں تختہ دار پر لٹکا دیا۔

صدر انوار السادات (م 1981ء)

مصر کے بہت بڑے قوم پرست راہنما اور صدر جس نے اسرائیل سے سفارتی تعلقات قائم کیے۔

صدر انوار السادات 25 دسمبر 1918ء کو مصر کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ 1952ء کے فوجی انقلاب مصر میں انہوں نے فوجی افسروں کے ایک گروپ لیڈر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور صدر ناصر کے مددگار کی حیثیت سے سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ ستمبر 1970ء میں صدر ناصر کی وفات کے بعد قائمقام صدر بن گئے اور 15 اکتوبر 1970ء کو ایک ریفرنڈم کے ذریعے مصر کے صدر منتخب ہوئے۔ سادات کے برسر اقتدار آنے کے وقت مصر کی اقتصادی حالت دگرگوں تھی اور مصر کو ایک ایسے باتدبیر اور باہمت راہنما کی ضرورت تھی جو اسے اس حالت سے نکال سکے اور طوفانی حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکے، صدر انوار السادات ایسے ہی راہنما ثابت ہوئے۔ انہوں نے اسرائیل کے ساتھ روایتی دشمنی ختم کر کے دوستانہ تعلقات استوار کیے چونکہ حکومت مصر روس کے حامیوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی اس لیے 1971ء میں روس نواز علی صابری نے صدر سادات کی حکومت کا تختہ الٹنا چاہا تو صدر سادات نے مصر کے روس نواز ناصر کو گرفتار کر لیا۔ روسی راہنما پوڈگرنی نے قاہرہ

پہنچ کر صدر سادات کو مجبور کیا کہ وہ روس سے دوستی اور تعاون کا ایک طویل المدت معاہدہ کریں جس کے بدلے میں مصر کو جدید ہتھیار فراہم کرنے کا وعدہ کیا مگر وعدہ پورا نہ ہونے پر صدر سادات نے روسی مشیروں کو واپس بھیج دیا۔اس نازک دور میں شاہ فیصل نے مصر کی مالی اعانت کی۔1973ء کی عرب اسرائیل جنگ میں مصری افواج اسرائیلی افواج پر غلبہ پانے کو تھیں کہ امریکہ نے مداخلت کر کے جنگ بند کرادی۔1974ء میں سادات نے سینائی کا پہلا معاہدہ کیا تو روسی راہنما ناراض ہو گئے اور مصر کا گھیراؤ کرنا چاہا تو سادات نے دوسرا سینائی معاہدہ کر کے نہر سویز کو کھول دیا اور پھر 1977ء میں اسرائیل کا دورہ کر کے دنیا کو ششدر کر کے رکھ دیا۔یہ صدر انوار السادات ہی تھے جنہوں نے اسرائیل کے مسلمان شہریوں کو حج کا فریضہ ادا کرنے کی سہولت اسرائیلی حکومت سے دلائی اور مشرق وسطیٰ میں امن قائم کرنے کے لیے کیمپ ڈیوڈ سمجھوتہ کیا۔قیام امن کی کوششوں پر انہیں نوبل انعام بھی ملا مگر 6 اکتوبر 1981ء کو وہ اپنے ہی فوجیوں کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے۔

صدر صدام حسین (م2006ء)

عراق کا وہ صدر جس نے دنیا کی دو عظیم طاقتوں سے ٹکرانے کا تجربہ کیا

صدام حسین 28 اپریل 1937ء کو تکریت عراق کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔وہ پیدائشی یتیم تھے اس لیے شروع میں انہوانہیں غربت اور تنگدستی کا سامنا کرنا پڑا۔شاید اسی وجہ سے ان کا مزاج برہم تھا اور ان میں غصہ اور ضد حد درجہ تک پائی جاتی تھی۔دوران تعلیم ہی انہوں نے اس زمانے کی زیر زمین پارٹی "بعث" میں شمولیت اختیار کر لی تھی اور عراق کے کمیونسٹ نواز حکمران جنرل عبدالکریم قاسم کی حکومت کے خلاف سرگرمیوں میں لیتے تھے۔مارچ 1959ء میں باغیوں نے جنرل قاسم کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی جو ناکام ہو گئی۔بغاوت کی اس کوشش میں سرکاری فوجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے صدام حسین اور ان کے ساتھی بھی زخمی ہوئے اور پھر شام کی طرف فرار ہو گئے اور پھر مصر چلے گئے۔مصر کے صدر ناصر نے انہیں مصر میں پناہ دی بلکہ قاہرہ یونیورسٹی میں داخلہ بھی دلایا تا کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کریں۔

1963ء میں جب جنرل قاسم کی حکومت کا تختہ ان کے ایک دست راست عبدالسلام عارف نے الٹ دیا تو صدام حسین بھی وطن واپس آ گئے۔وطن واپس آ کر انہوں نے اپنی چچازاد ساجدہ سے شادی کر لی۔عبدالسلام عارف نے بعث پارٹی سے دھوکہ کیا اور صدام حسین سمیت بہت سے بعث راہنماؤں کو گرفتار کر لیا مگر صدام جیل توڑ کر فرار ہو گئے۔1968ء میں بعث پارٹی ایک مرتبہ پھر حکومت کا تختہ الٹنے میں کامیاب ہو گئی اور جسالبکر کی صدارت میں جو بعث حکومت قائم ہوئی اس میں صدام حسین کو نائب صدر کا عہدہ ملا اور وہ 16 جولائی 1979ء سے 9 مارچ اپریل 2003ء تک حکومت عراق سے وابستہ رہے۔باوجود بہت سے الزامات کے ان کے عہد حکومت میں عراق کی ترقی اور معیشت کی بہتری کے لیے کام کیا گیا۔

امریکہ نے جب 1981ء میں عراق کے ری ایکٹر پر اسرائیل سے حملہ کرایا تو صدام حسین نے روس سے تعلقات بہتر بنا لیے مگر وہ روس اور امریکہ دونوں سپر طاقتوں کے مال پر ہاتھ صاف کرنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے امریکہ سے بھی تعلقات قائم رکھے جو بالآخر ان کی مختلف حکمت عملیوں کی وجہ سے ان کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوئے اور 1990ء میں کویت پر عراق کے قبضے کے بعد سے امریکہ ان کے خلاف ہو گیا۔2003ء میں عراق پر قبضے کے بعد 30 دسمبر 2006ء کو صدر صدام حسین کو مختلف الزامات میں سزائے موت دی گئی۔

جنرل محمد ضیاء الحق (اگست 1988ء)

کرکٹ ڈپلومیسی کے ذریعے برصغیر میں امن قائم رکھنے اور افغانستان کی جنگ جیتنے والا پاکستانی صدر

جنرل محمد ضیاء الحق 12 اگست 1924ء کو جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی محمد اکبر علی ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ انہوں نے بیٹے کی تربیت اسلامی خطوط پر کی۔ ابتدائی تعلیم شملہ میں حاصل کرنے کے بعد سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں تعلیم حاصل کی۔ مئی 1945ء میں ضیاء الحق نے کیولری رجمنٹ میں کمیشن حاصل کرلیا اور یوں فوج سے وابستہ ہوگئے۔ جنگ عظیم دوم کے دوران جنرل ضیاء الحق برما، ملایا اور جاوا کے محاذوں پر انگریزی فوج کی طرف سے لڑے۔ اس کے بعد 1950ء کی دہائی میں انہوں نے کوئٹہ میں اسٹاف کالج سے گریجویشن کی۔ 1963ء میں وہ امریکی کمانڈ اینڈ جنرل اسٹاف کالج فورٹ لیون ورتھ میں داخل ہوگئے۔ بعد ازاں انہیں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدہ پر ترقی دی گئی اور اسٹاف کالج کوئٹہ میں انسٹرکٹر بھی رہے۔ اپریل 1975ء میں انہیں لیفٹیننٹ جنرل کے عہدہ پر ترقی دی گئی اور کور کمانڈر بنا دیے گئے۔ یکم 1976ء کو انہیں جنرل بنا کر چیف آف آرمی اسٹاف بنا دیا گیا۔ اسی دوران 1977ء میں بھٹو کے خلاف تحریک چلنے کے بعد جب ملک میں سیاسی ابتری پھیلی تو وہ 5 جولائی کو اقتدار پر قابض ہوگئے۔

جنرل ضیاء الحق اقتدار میں آنے کے بعد پاکستان کے سرکاری اور سیاسی منظر پر طویل عرصہ تک موجود رہے۔ وہ بارہ سال تک پاک فوج کے سربراہ، آٹھ سال تک چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور نو سال تک صدر پاکستان کے عہدے پر فائز رہے۔ ان کا مجموعی اقتدار گیارہ سال تک قائم رہا۔ تاہم اقتدار میں آنے کے بعد انہوں نے اپنی پہلی تقریر میں وعدہ کیا تھا کہ وہ صرف 90 دن کے بعد الیکشن منعقد کروا کر واپس چلے جائیں گے۔ مگر لیلیٰ اقتدار کی جدائی بعد ازاں انہیں پسند نہ آسکی۔ جنرل ضیاء الحق سیاسی راہنماؤں کو قومی حکومت بنانے کی تجویز پیش کی تھی مگر سیاسی جماعتوں کے باہمی اختلاف کی وجہ سے یہ تجویز ترک کر دی گئی۔ 1979ء میں افغانستان میں روسی فوجوں کے داخلے کے بعد سے ضیاء الحق نے روسی فوجوں کے خلاف جو پالیسی اختیار کی اسے ساری دنیا میں سراہا گیا۔ 1985ء میں غیر جماعتی بنیادوں پر انہوں نے الیکشن کروایا اور جونیجو وزیراعظم بنے مگر دونوں میں اختلاف پیدا ہو گئے جن کی بنا پر ضیاء الحق نے انہیں مئی 1888ء میں برطرف کر دیا خود جنرل صاحب اگست 1988ء میں ایک ہوائی حادثے میں مارے گئے۔

بے نظیر بھٹو (م 2007ء)

جدید زمانے میں عالم اسلام کی پہلی وزیراعظم خاتون

نام ونسب: بے نظیر، بنت ذوالفقار علی بھٹو، ان کی والدہ نصرت بھٹو ذوالفقار علی بھٹو کی دوسری بیوی تھی۔

پیدائش و تعلیم: بے نظیر بھٹو 21 جون 1953ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں۔ ان کے گھرانے کا تعلق پاکستان کے بائیس بڑے خاندانوں سے تھا۔ بے نظیر بھٹو نے ابتدائی تعلیم کانونٹ کی کیتھولک راہباؤں سے حاصل کی۔ اس کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر بھیج دی گئیں۔ اس نے 1973ء میں ہارورڈ یونیورسٹی سے گریجویشن کی۔ اس کے والد چاہتے تھے کہ وہ مزید تعلیم آکسفورڈ یونیورسٹی سے حاصل کرے چنانچہ اس نے آکسفورڈ میں داخلہ لے لیا۔ 1977ء میں وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے پاکستان لوٹی۔ اسی سال ان کے والد کو وزارت عظمیٰ سے اتار کر گرفتار کر لیا گیا۔

جیل میں بھٹو نے اپنی بیٹی کو وصیت کی کہ وہ اس کے کام کو آگے بڑھائے۔ اپنے والد کی وصیت پر جب بے نظیر

بھٹو سیاست کے میدان میں اتریں تو پہلے چار سالوں میں ان کا زیادہ وقت نظر بندی یا جیل میں گزرا۔ اسی دوران 1979ء میں ان کے والد کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ جس کے بعد انہیں سیاست میں بہت سے نشیب وفراز سے گزرنا پڑا۔ کان کی تکلیف کی وجہ سے وہ 1984ء تک انگلستان میں مقیم رہیں۔ 1986ء میں بے نظیر وطن واپس لوٹیں۔ جنرل ضیاء الحق نے اس وقت سیاسی پارٹیوں پر عائد پابندی ہٹائی تو لاہور میں مینار پاکستان پر ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔

اگلے دو سال تک انہوں نے پیپلز پارٹی کو مزید مستحکم اور مربوط کیا۔ 1987ء میں بے نظیر بھٹو نے آصف علی زرداری سے شادی کر لی جو شاید بے نظیر کے سیاسی مستقبل کے لیے ضروری تھی۔ 1988ء میں ضیاء الحق کی موت کے بعد وہ پہلی مرتبہ پاکستان کی خاتون وزیر اعظم بنیں۔ وہ دنیا کی پہلی خاتون تھیں جو مسلم امہ کے کسی ملک کی وزیر اعظم بنی تھیں۔ 6 اگست 1990ء کو پاکستان کے صدر نے ان کو وزارت عظمیٰ سے اتار دیا اور اس کے بعد میں اسمبلی میں قائد حزب اختلاف بنیں۔ 1993ء میں دوسری مرتبہ وزیر اعظم منتخب ہوئیں اس دوران انہیں بہت سے سیاسی مسائل کا سامنا کرنا پڑا اور دوسری مرتبہ بھی ان کی حکومت توڑ دی گئی۔ 2007ء میں وہ پاکستان واپس آئیں مگر دسمبر میں قتل کر دی گئیں۔

ڈاکٹر مہاتیر محمد (پیدائش 20 دسمبر 1925ء)

ملائیشیا کو اقتصادی مشکلات سے نکالنے والی عظیم مسلم شخصیت

تن ڈاکٹر مہاتیر بن محمد کو کیدا میں پیدا ہوئے۔ وہ 1981ء سے 2003ء تک ملائیشیا کے وزیر اعظم رہے۔ اس نے تن حسین اون کی جگہ وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھالا تھا، اور 2003ء میں یہ عہدہ داتو سری عبداللہ احمد بدوی نے سنبھالا۔ یاد رہے کہ تن ملائیشیا کا سب سے بڑا قومی اعزاز ہے اور ایک وقت میں یہ اعزاز صرف 22 زندہ افراد کو دیا جا سکتا ہے۔

مہاتیر محمد پیشہ کے لحاظ سے ایک ڈاکٹر ہیں اور یونائیٹڈ مالیز آرگنائزیشن کے رکن کی حیثیت سے وہ پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ 1970ء کی دہائی میں وہ نائب وزیر اعظم سمیت کئی وزارتوں کے سربراہ رہ چکے تھے۔

مہاتیر محمد کی کامیابیوں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ تاہم ان کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ انہوں نے ملائیشیا میں ایک نئے متوسط طبقے کو وجود میں لا کر ملائیشیا میں بسنے والی مختلف نسلوں کے درمیانی اختلاف کو دور کیا۔ ملائیشیا کے اسی نئے متوسط طبقے نے چینی نسلوں کے اقلیتی مالی غلبے کو کم کیا۔ جدید ملائیشیا کی تاریخ میں 1960ء اور 1970ء کی دہائیاں نسل پرستانہ آویزشوں سے رقم ہیں۔ اس دور میں ڈاکٹر صاحب کو مالے انتہا پسند کا لقب بھی دیا گیا تھا۔ مہاتیر محمد کو تنقید کا نشانہ بنانے والوں میں سنگاپور کے وزیر اعظم لیکوان یو سرفہرست رہے ہیں۔ 1970ء میں جب انہوں نے اپنی تحریر THE MALAY DILEMMA شائع کی تو پارٹی نے ان کی رکنیت معطل کر دی تھی۔ انتہا پسندی کے حوالے سے دیا گیا لقب بھی ساری عمر ان کے ساتھ چسپاں رہا ہے۔ ملائیشیا پر نسل پرستانہ حکمت عملی اختیار کرنے کا الزام لگتا رہا ہے اور بہت سے ماہرین کا خیال ہے کہ اس الزام میں کسی حد تک سچائی بھی موجود ہے۔

1997ء میں ملائیشیا اور جنوبی ایشیا کی مالی مارکیٹ کو شدید دھچکا لگا۔ بظاہر یوں نظر آنے لگا تھا کہ سرمایہ کاروں کا متعدد ایشیائی کرنسیوں سے اعتماد اٹھ گیا تھا۔ اس اقتصادی بحران کے دوران مہاتیر محمد اور وزیر مالیات انور ابراہیم میں سیاسی کشمکش کا آغاز ہوا اور دونوں میں شدید اختلاف پیدا ہو گئے۔ 1998ء میں مہاتیر نے انور کو حکومتی عہدوں سے سبکدوش کر دیا تو انور اور اس کے ساتھیوں نے حکومتی بدعنوانی کے خلاف مہم چلائی اور حکومت کے خلاف مظاہرے زور پکڑ گئے مگر اس کے باوجود مہاتیر نے 1999ء کا الیکشن جیت لیا تھا۔

فلسفی، طبیب، موجد اور سائنسداں

جابر بن حیان 120ھ/737ء تا 198ھ/813ء

الفرغانی (حیات 237ھ/851ء)

الکندی (حیات 257ھ/870ء)

ابوحنیفہ الدینوری (م 282ھ/895ء)

الفارابی (870ء-950ء)

ابوالقاسم الزہراوی (دسویں صدی عیسوی)

الخجندی (م 1000ء)

السجزی (م 1020ء)

ابن الہیثم (م 1040ء)

عمر خیام (1132ء)

ابن رشد (م 1198ء)

جابر بن افلح (بارھویں صدی)

السمرقندی (م 1222ء)

نصیر الدین الطوسی (م 1274ء)

ابن الشاطر (م 1375ء)

الغ بیگ (م 1449ء)

پری ریس (م 1554ء)

آک شمس الدین (م 1460ء)

الحسن ابن محمد (م بعد از 1554ء)

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی (م 1994ء)

حکیم محمد سعید دہلوی (

ڈاکٹر عبدالقدیر خان (حیات 2011ء)

اشفاق احمد (حیات 1998ء)

الخوارزمی (م 230ھ/844ء)

حبش الحاسب (م حدود 250ھ/864ء)

ابومعشر البلخی (م 272ھ/886ء)

الرازی (م 313ھ/925ء)

اخوان الصفا (چوتھی صدی ہجری)

المجریطی (م تقریباً 1007ء)

ابن یونس (م 1009ء)

ابن سینا (م 1037ء)

ابن باجہ (م 1138ء)

ابن طفیل (م 1181ء)

الاقلیدسی (بارھویں صدی کا نصف)

شرف الدین طوسی (م 1213ء)

ابن البیطار (1248ء)

ابن النفیس (م 1288ء)

قاضی زادہ رومی (1436ء)

ابن الماجد (م 1554ء)

علی کشچو (م 1474ء)

سلیمان المہری (م قبل 1554ء)

سیدی علی رئیس (م 1562ء)

حکیم اجمل دہلوی (م 1729ء)

ڈاکٹر عبدالسلام (م 1996

احمد زویل (م 2016ء)

ڈاکٹر ثمر مبارک مند (حیات)

جابر بن حیان (120ھ/737ء تا198ھ/813ء)

مشہور معروف عرب کیمیادان جو ماء الملوک جیسے تیزاب کا موجد ہے

نام ونسب: جابر بن حیات بن عبداللہ کوفی المعروف بہ الصوفی جو خراسان میں پیدا ہوا، اولین دور کے عربی علم الکیمیا کے ممتاز نمائندوں میں سے تھا۔ محققین کے مطابق وہ ابتدائی عباسی خلفا کا ہم عصر تھا۔ انگریز محقق ہوم یارڈ HOLM YARD نے لکھا ہے کہ اس کا باپ حیان نامی ازدی تھا جو کوفہ کا ایک عطار تھا۔ حیان کا ذکر آٹھویں صدی کی ان سیاسی تحریکوں کے سلسلے میں آتا ہے جن سے بالآخر خلافت بنوامیہ کا خاتمہ ہوا تھا۔

علم الکیمیا کے بارے میں خود جابر کا قول یہ ہے کہ اسے یہ علم اپنے استاد امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے ملا ہے اور اس کے سارے علوم اسی ''معدن حکمت'' کے رہین ہیں اور اس کی اپنی حیثیت محض ایک مرتب ومؤلف کی ہے مگر دوسری طرف شیعی محققین یہ کہتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں کسی جابر بن حیان کا نام نہیں ملتا ہے۔

جابر کی اہم ترین تصنیفات یہ ہیں۔

(1) کتب الماتہ والاثناعشر، فن کیمیا گری میں جابر کے غیر مربوط مضامین پر مشتمل کتاب۔

(2) کتاب السبعین، یعنی علم کیمیا میں جابر کی تعلیمات کا مرتب مجموعہ۔

(3) کتب المائتہ والاربعۃ والاربعون علم کیمیا اور جملہ علوم باطنی پر مشتمل ہے۔

(4) کتب الخمسائتہ والاربعہ جو متفرق رسائل پر مشتمل ہے۔

اس کے علاوہ بعض چھوٹے مجموعے بھی ہیں جن میں ارسطو اور افلاطون کی کتابوں پر شرحوں کے حوالے سے کیمیا گری سے بحث کی گئی ہے۔ بقول لیبان LEBON جابر وہ پہلا کیمیا گر تھا جس نے عمل تقطیر وتذویب وتحویل بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ فلسفہ، فلکیات ونجوم، ریاضیات اور موسیقی پر، اور طب وسحر پر بھی اس کے رسائل ملتے ہیں۔ اقلیدس کے ہندسے اور بطلیوس کی مجسطی کی شرحیں لکھ کر جابر نے سائنسدانوں پر احسان عظیم کیا ہے۔ وہ کچھ عرصہ خلیفہ ہارون الرشید کے دربار سے منسلک بھی رہا۔ شورے کا تیزاب اس کی اہم ترین دریافتوں میں سے ایک ہے جسے اس نے ماء الملوک کا نام دیا تھا۔ یورپ میں وہ GEBER کے نام سے جانا جاتا ہے۔

الخوارزمی (م230ھ/844ء)

ماہر فلکیات وریاضی اور مورخ، مصنف کتاب الجبر والمقابلہ

نام ونسب: ابو جعفر ابن موسیٰ الخوارزمی کا شمار خلیفہ مامون الرشید کے دربار سے منسلک نامور مسلم سائنسدانوں میں ہوتا ہے۔ اسے فلکیات، ریاضی اور جغرافیے سے خاص شغف تھا۔

الخوارزمی کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مایہ ناز اسلامی سائنسداں کا تعلق وسط ایشیا کے ملک خوارزم سے تھا۔ ایک روایت کے مطابق وہ آٹھویں صدی عیسوی کے آخری عشرے میں پیدا ہوا اور اس نے 844ء کے قریب وفات پائی۔ اس کی کتاب ''الجبرا'' سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا اور بغداد کے افق پر چمکنے والے علمی ستاروں میں روشن ترین تھا۔ وہ بغداد میں قائم علمی ادارے ''دارالحکمۃ'' کا ایک اہم رکن تھا۔ یہ اکادمی ہارون رشید کے عہد میں بغداد میں قائم کی گئی تھی اور مامون الرشید کے عہد میں اس اکادمی کی ترقی پر خصوصی توجہ دی گئی تھی۔ مامون الرشید عباسی خلیفاؤں میں

سب سے زیادہ علم پرور اور علما کا قدر دان تھا۔ الخوارزمی نے فلکیات اپنی مشہور کتاب اسی کے ایما پر لکھی تھی۔ اس کی دوسری اور اہم ترین تصنیف ''الجبرا'' بھی مامون الرشید کے نام پر معنون ہے۔ الخوارزمی نے یہودی کیلنڈر کے متعلق ''استخراج تاریخ الیہود'' لکھی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ خلیفہ الواثق باللہ نے الخوارزمی کو ایک سفارتی مشن پر قفقاز بھیجا تھا مگر تاریخی شواہد بتاتے ہیں کہ وہ شاید محمد بن موسیٰ ابن شاکر نامی دوسرا مسلم سائنسداں تھا۔ الطبری نے الخوارزمی کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے خلیفہ الواثق کی علالت کے دوران اس کا زائچہ تیار کر کے پیشین گوئی کی تھی کہ خلیفہ ابھی مزید پچاس برس زندہ رہے گا مگر اس کی یہ پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی اور خلیفہ صرف دس دن بعد ہی وفات پا گیا جس کی وجہ الخوارزمی اور اس کے ساتھی دوسرے ماہر فلکیات کو خجالت اٹھانا پڑی۔ یاد رہے کہ الخوارزمی کی فلکیات پر تصنیف کا نام ''زیج السند ہند'' ہے۔ خوارزمی ہندوؤں کے علم حساب اور جبر و مقابلہ پر اپنے وسائل کی وجہ سے مشہور ہے۔ جبر و مقابلہ کا نام بھی اسی کا تجویز کردہ ہے۔

الفرغانی (حیات 237ھ/ 851ء)

قرون وسطیٰ کا ایک مسلم ہیئت دان اور اصطرلاب پر دو کتابوں کا مصنف

نام ونسب: ابوالعباس احمد بن محمد بن کثیر الفرغانی، ماوراالنہر میں فرغانہ کے مقام پر پیدا ہوا تھا۔ اس کے نام کے بارے میں مورخین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بعض مورخین اس نام کی دو شخصیتیں تسلیم کرتے ہیں۔ گمان اغلب یہ ہے کہ ان دونوں سے مراد ایک ہی شخص تھا۔ جو خلیفہ المامون الرشید کے عہد کا ہیئت دان تھا اور 861ء میں المتوکل کی وفات کے وقت بھی زندہ تھا۔ ابن عزی بردی اور مورخ ابن ابی صیبعہ دونوں ہی ایک شخص احمد بن کثیر الغرفانی کا ذکر کرتے ہیں جسے خلیفہ المتوکل باللہ نے 861ء میں مقیاس النیل کی تعمیر کی نگرانی کے لیے الفسطاط (قاہرہ) بھیجا تھا۔

الفرغانی کو زیادہ دلچسپی انجینئرنگ کے شعبے سے تھی، اسی وجہ سے سوانح نگاروں نے اس کی زندگی کے حالات دیئے ہیں۔ ابن تعزی بردی کے مطابق اس نے خلیفہ المتوکل کے حکم پر الفسطاط کے مقام پر ''مقیاس الکبیر'' کی تعمیر کی نگرانی کی تھی۔ یہ تعمیر 861ء میں پایہ تکمیل کو پہنچی تھی اور اسی سال خلیفہ المتوکل وفات پا گیا تھا۔ روایت ہے کہ المتوکل نے موسیٰ بن شاکر کے دو بیٹوں محمد اور احمد کو الجعفری نامی ایک نہر کی کھدائی کی نگرانی کا کام سونپا تھا انہوں نے یہ کام احمد بن کثیر الفرغانی کے سپرد کر دیا تھا جس نے جدید مقیاس النیل تعمیر کی تھی۔ اس طرح سے ایک اور ماہر انجینئر سند بن علی کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اس نہر کی تعمیر میں الفرغانی سے ایک سنگین غلطی کا ارتکاب ہوا۔ وہ یہ کہ نہر کا ابتدائی حصہ بقیہ نہر سے گہرا ہو گیا جس سے پانی کا بہاؤ سست ہو گیا۔ جس سے خلیفہ بہت ناراض ہوا۔ سند بن علی نے اپنی رپورٹ میں یہ لکھ کر کہ الفرغانی کا منصوبہ تو بالکل درست تھا کہیں تکنیکی غلطی ہو جانے کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ اس طرح اس نے الفرغانی کو خلیفہ کے عتاب سے بچا لیا۔

الفرغانی نے ہیئت میں اپنے مشاہدات کو ایک کتاب ''جوامع علم النجوم والحرکات السماویہ'' میں قلمبند کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنی کتاب ''عمل الرخامات'' میں آفتابی گھڑی کی بناوٹ پر بحث کی ہے۔ اس کی کتاب جوامع کو لاطینی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔

حبش الحاسب المروزی (م تقریباً250ھ/864ء)

ابتدائی اسلامی فلکیات میں ایک اہم شخصیت، مصنف کتاب الزیج الدمشقی

نام ونسب: احمد بن عبداللہ، الحبش الحاسب المروزی جو ابتدائی اسلامی فلکیات میں نہایت اہم اور دلچسپ شخصیت کا مالک ہے۔ صرف خراسان میں پیدا ہوا، بعدازاں اس نے بغداد میں سکونت اختیار کی۔ اس کے عرفی نام حبش کی کہیں وضاحت نہیں ملتی۔ ممکن اس کی جلد کی رنگت سیاہ ہونے کی وجہ سے اس کا یہ نام پڑ گیا ہو۔ ابن الندیم نے اپنی ''الفہرست'' میں صرف اس کے متعلق یہ لکھا ہے کہ اس نے سو برس سے زیادہ عمر پائی تھی۔

ابن القفطی کے مطابق اس کا زمانہ حیات المامون اور المعتصم کا عہد حکومت تھا۔ وہ المامون سے المعتصم تک عباسی خلفاء کے دربار سے بطور ہیئت دان منسلک رہا لیکن شاید اس حلقے کا رکن نہیں تھا جس نے مشاہدات ممتحن فراہم کرنے میں مدد دی تھی۔ بغداد میں اس کے کام کا زمانہ محققین کے مطابق 825ء سے 835ء تک بنتا ہے۔

ابن الندیم، القفطی اور حاجی خلیفہ نے اس کی تصانیف یہ بتاتی ہیں۔ (1) سند ہند: اس کتاب کی اس نے ترتیب نو کی تھی۔

(2) ممتحن زیج: یہ اس کی کتابوں میں معروف ہے۔

(3) شاہ زیج: یہ تمام زیجوں سے مختصر ہے۔

(4) دمشقی زیج۔

(5) مامونی زیج: یہ زیج اور دمشقی زیج کے دونوں یزدگرداور سلوکس کی تقویم کے بجائے ہجری تقویم پر مشتمل ہے۔

(6) رخامات اور پیمائشوں کے بارے میں رسالہ

(7) فلکی کروں پر رسالہ

(8) اصطرلاب پر رسالہ

(9) عمودی اور ترچھے مستوی پر رسالہ

(10) ستاروں کے فاصلے پر رسالہ

الکندی (حیات 257ھ/870ء)

المعروف بہ فیلسوف عرب، نامور عرب فلسفی اور عالم، کئی کتابوں کا شارح

نام ونسب: ابو یوسف یعقوب ابن اسحاق الصباح، اس کی وجہ شہرت فلسفہ ہے۔

ولادت: 801ء میں کے لگ بھگ ولادت ہوئی اور 866ء میں بغداد میں وفات پائی۔ پہلے نامور عرب فلسفی ہیں۔

الجاحظ جیسے مصنفین نے الکندی کی زندگی کے بارے میں بہت سے افسانوی قصے بیان کیے ہیں لیکن مستند اور معتبر روایات بہت کم ملتی ہیں۔ الکندی کا تعلق یمن کے ایک عرب قبیلے الکندہ سے تھا۔ اس نے کوفہ میں تعلیم پائی اور مزید تعلیم کے حصول کے لیے بغداد آیا۔ یہ دونوں شہران دنوں مرکز علوم وفنون وثقافت تھے۔ بغداد میں الکندی کی نابغہ روزگار شخصیت پر خلیفہ المامون کی نگاہ التفات پڑی۔ خلیفہ نے اسے اپنے دارالترجمہ، دارالحکمۃ میں متعین کردیا اور اسے یونانی کتب کے ترجمہ کا کام سونپا۔ المامون کے جانشین المعتصم نے الکندی کو اپنے بیٹے احمد کا اتالیق مقرر کیا، الکندی نے اپنے کئی فلسفیانہ مضامین

اس کے نام پر مضمون لکھے ہیں۔

المعتصم کی وفات کے بعد دربار خلافت کے ساتھ الکندی کے تعلقات میں سرد مہری آگئی اور خلیفہ الواثق کے برسر اقتدار آنے کے بعد قائم رہی جب المتوکل سند آرائے خلافت ہوا تو الکندی کو ذلت کا سامنا کرنا پڑا، وہ درباری منجمین کی سازشوں کا شکار ہو گیا اور اسے اپنی زندگی کے آخری ایام میں گوشہ نشینی کی زندگی گزارنا پڑی۔

بعض محققین نے الکندی کو ''اولین عرب فلسفی'' کے خطاب سے یاد کیا ہے۔ اس نے اسلامی علوم ترویج واشاعت میں بھرپور کردار ادا کیا، اس نے عرب کی فلسفیانہ اور سائنسی اصطلاحات کی حتمی تشکیل اور توضیح کرنے میں حصہ لیا تھا۔

الکندی نے اپنی تمام تر سائنسی تحریروں میں کم وبیش کامیابی کے ساتھ قدیم سائنسی علوم پر غور کرنے کے ساتھ ساتھ ذخیرہ سائنس میں اضافہ کیا اور ریاضیاتی رجحان کے ساتھ تحقیق وتفتیش کو آگے بڑھایا۔ الکندی کی تقریباً پندرہ فلسفیانہ تصانیف موجود ہیں۔

ابو معشر البلخی (م 272ھ/886ء)

ماہر ہیئت وعلم نجوم اور مصنف المدخل الکبیر

نام ونسب: جعفر بن محمد ابو معشر البلخی کو انگریزی اور لاطینی زبان میں ALBUMASAR کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ وسطی ایشیا کے مشہور شہر بلخ میں 10 اگست 787ء کو پیدا ہوا تھا۔ اس کا انتقال 9 مارچ 886ء کو بعمر 99 سال عراق کے شہر الواسط میں ہوا۔ بلخ ایک قدیم شہر تھا جسے حضرت عثمان کے عہد خلافت میں فتح کیا گیا تھا۔ اس شہر کے ارباب دانش وعلم سیاسی طور پر ایرانی اور مذہبی طور پر شیعیت کا رجحان رکھتے تھے۔ لیکن ان کے مذہبی رجحانات کے باوجود خلفائے بنوعباس نے انہیں بغداد کے دارالحکمۃ میں جگہ دی تھی۔

ابو معشر بلخی بھی اہل خراسان کے دانشوروں میں سے ایک تھا۔ ابو معشر ایک ماہر نجوم تھا۔ فلسفے میں وہ اس نظریہ کا داعی تھا کہ تمام مختلف قومی نظام ہائے فکر کی اصل ایک ہے۔ یہ نظریہ نو افلاطونی نظریہ تجلی EMANATION سے مشابہ تھا۔

ابو معشر نے اپنی عملی زندگی بغداد میں خلیفہ المامون کے عہد میں بطور محدث کیا تھا۔ 825ء میں اس کا الکندی سے علمی تنازعہ شروع ہوا۔ الکندی کے علم سے متاثر ہو کر اس نے فلسفیانہ استدلال کی تفہیم کے لیے علم ریاضی کا مطالعہ شروع کیا اور اس زمانے کی تمام عقلی روایات سے استفادہ کیا۔ ابو معشر کی شہرت بطور ماہر نجوم اپنے معاصرین میں اور بعد کے دور میں بھی بہت زیادہ تھی۔ بقول مورخ ابن قفطی اسلامی دنیا کے ماہرین نجوم کی طرح ''اثرات کواکب'' کے ضمن میں مسلمانوں کا استاد تھا۔ علم نجوم سے گہری وابستگی کی وجہ سے خلیفہ المستعین کے عہد میں اسے کوڑے بھی لگائے گئے تھے۔ ابو معشر کے ایک شاگرد شاذان کی ایک کتاب کے مطابق البتہ ابو مشعر بطور منجم زیادہ محنتی اور دیانت دار نہیں تھا۔

ابو حنیفہ الدینوری (م 282ھ/895ء)

شہرہ آفاق مورخ، عالم دین، ماہر نباتیات اور مصنف الاخبار الطوال وغیرہ

نام ونسب: ابو حنیفہ احمد بن داؤد بن ونند، شہرہ آفاق مسلم ماہر نباتیات، اُس کی ولادت تیسری صدی ہجری کے شروع میں ہوئی تھی۔ ابن الندیم نے اسے دینور کا باشندہ بتایا ہے۔ شاید وہ پیدا بھی دینور ہی میں ہوا تھا۔ اس کی وفات 26 جمادی الاولی 282ء کو ہوئی۔

ابوحنیفہ دینوری زیادہ تر ماہر نباتیات کے طور پر زیادہ شہرت رکھتا ہے، لیکن وہ نحو، لغت، ہندسہ، نجوم، ریاضی اور تاریخ جیسے علوم میں بھی قابل وثوق سمجھا جاتا تھا۔ فقہ اور تفسیر جیسے اسلامی علوم میں بھی اس نے دسترس حاصل کی تھی۔

ادبیات اور عربی زبان کی تعلیم اس نے بصرے اور کوفے میں حاصل کی تھی، بطور ادیب وہ جاحظ کا ہم پلہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ علم جغرافیہ میں ابوزید بلخی کا ہم پلہ تھا، اور ریاضی اور فلکیات جیسے علوم پر دسترس رکھنے کی وجہ سے الجاحظ سے بہت آگے تھا۔

یونانی علم نباتیات کی یونانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہونے سے پہلے ہی الدینوری نے خالص اسلامی نباتیاتی معلومات کی مدد سے 6 جلدوں پر مشتمل علم نباتیات کا انسائیکلوپیڈیا ''مرکتاب النبات'' کے نام سے مرتب کیا تھا۔ ایک جرمن محقق زلبر برگ نے لکھا ہے کہ ابوحنیفہ دینوری نے اپنی اس تصنیف میں یونانی ماہر نباتیات کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ ابوحنیفہ دینوری کی 20 تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی ان تصانیف میں سے صرف الاخبار الطوال اور جزء ''کتاب النبات'' دستیاب ہوئی ہیں۔ اس نے 13 جلدوں میں قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھی تھی اور فقہ میں کتاب الوصایا اور کتاب فی حساب الدور اس کی اہم تصانیف تھیں۔ جن میں تقسیم ترکہ کے پیچیدہ مسائل پر روشنی ڈالی گئی تھی۔

لغت اور ادبیات میں مایلحن فیہ العامۃ، کتاب اصلاح المنطق، کتاب الفصاحۃ، کتاب الجمع والتفریق، کتاب الشعر والشعراء اس کی اہم تصانیف ہیں۔ ریاضی اور فلکیات پر البحث فی حساب الھند، کتاب الجبر والمقابلہ، کتاب نوادر الجبراء، کتاب الکسوف اور کتاب الانواء اہم ہیں۔

الفارابی (870ء-950ء)

ایک نامور مسلم فلسفی، سائنسدان، ماہر موسیقی، حکیم حاذق اور شارح ارسطو

نام ونسب: ابونصر محمد بن محمد بن طرخان بن اوزلغ لاطینی میں اسے کئی ناموں سے یاد کیا جاتا ہے، مگر ان میں اہم ALPHARABIUS ہے۔ وہ ایک ترکی النسل مسلمان تھا۔ وسطی ایشیا کے علاقے الفاراب کے ایک شہر وسیج میں 870ء کے لگ بھگ پیدا ہوا تھا۔ اس نے 950ء میں شام کے شہر دمشق میں وفات پائی۔

الفارابی کے دادا نے اسلام قبول کیا تھا اور اس کا دادا ایک فوجی افسر اور ایرانی امراء میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس کے آباء واجداء ساسانی بادشاہوں کی اولاد ہونے کے دعویدار تھے۔ الفارابی جس خطے میں پیدا ہوا وہاں شافعی فقہ مروج تھا۔ الفارابی کو شافعی فقہ پر کامل دسترس حاصل تھی۔ الفارابی کو علم موسیقی سے دلچسپی تھی اس نے بخارا میں علم موسیقی کا باقاعدہ مطالعہ کیا اور فن میں مہارت تامہ حاصل کی۔ خراسان کے شہر مرو میں اس نے ایک عیسائی راہب یوحنا بن حیلان سے منطق کی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ اپنے اس غیر مسلم استاد کا بے حد احترام کرتا تھا۔

خلیفہ معتضد کے عہد میں الفارابی اور اس کا یہ استاد دونوں بغداد آ گئے۔ یوحنا نے اپنے فرائض منصبی سنبھالے اور نسطوری خانقاہوں کا نظام سنبھال لیا اور فارابی فلسفیوں کے حلقے میں حصہ لینے لگا۔

خلیفہ المکتفی کے عہد میں فارابی بغداد چھوڑ کر قسطنطنیہ چلا گیا جہاں اس نے مزید علم حاصل کیا۔ مورخ الخطابی کے مطابق الفارابی یونان میں بھی آٹھ سال قیام پذیر رہا تھا، 910ء اور 920ء کے درمیان کسی وقت الفارابی قسطنطنیہ سے واپس لوٹ آیا اور اگلے بیس برس نے اس تصنیف وتالیف میں گزارے۔ اسی زمانے میں اس کی شہرت بطور فلسفی پھیل گئی اور کہا جانے لگا کہ ارسطو کے بعد اگر کوئی فلسفی اس کے پائے کا دنیا میں آیا ہے تو صرف الفارابی ہے۔ بغداد میں قیام کے دوران الفارابی نے کبھی مذہبی اور سیاسی مناقشوں میں حصہ نہ لیا اور فلسفے کی گتھیوں کو سلجھاتا رہا، مگر شاید سیاسی حالات کی وجہ سے ہی

اسے ستر برس کی عمر میں بغداد کو چھوڑنا پڑا۔ الفارابی دو برس دمشق میں رہا اور وہیں اس نے وفات پائی۔

الرازی (م313ھ/925ء)

قدیم دنیائے اسلام کا سب سے بڑا طبیب اور ایٹم کا اہل کیمیادان اور فلسفی

نام ونسب: ابوبکر محمد بن زکریا رازی۔ اس کو اہل یورپ RHAZES کے نام سے جانتے ہیں۔ وہ ایران کے مشہور شہر رے کا باشندہ تھا۔ رے ہی میں وہ 854ء کے قریب پیدا ہوا۔ اس کا انتقال بھی اپنے اسی آبائی شہر میں 925ء کے لگ بھگ ہوا تھا۔ اسے اس شہرت طب، الکیمیا، فلسفہ اور مذہبی تنقید جیسے علوم میں نام پیدا کرنے کے سبب ہے۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ رازی ریاضیات، فلسفہ، ہیئت اور ادب کا گہرا مطالعہ کیا اور جوانی میں وہ علم کیمیا پر اپنے تجربات میں بھی مشغول رہا اور خامی عمر کو پہنچنے کے بعد اس نے طب میں نام پیدا کیا۔ حاکم رے نے اس کی طب میں شہرت کے سبب رے کے نئے ہسپتال کا نگران اعلیٰ مقرر کیا، مگر تھوڑے دنوں بعد ہی وہ ہمیں بغداد کے ایک ہسپتال میں اسی منصب پر نظر آتا ہے۔ اپنے عہد کا سب سے بڑا طبیب ہونے کی شہرت اسے ایک سے دوسرے دربار میں پہنچاتی رہی مگر بادشاہوں کے مستقل مزاج نہ ہونے کے سبب وہ کسی شاہی دربار میں بھی مستقل طور پر نہ ٹھہر سکا۔

الرازی کا اہم ترین کمال اس کی طبابت ہے۔ اسے بجا طور پر اسلام کا سب سے بڑا طبیب لکھا اور مانا جاتا ہے۔ اس نے مختلف امراض پر متعدد رسائل لکھے ہیں۔ ان میں چیچک اور خسرہ پر اس کا رسالہ کتاب الجدری والحصبہ ہے جو اس کی تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس نے طب پر اور بھی کئی مشہور کتابیں لکھیں۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے دور میں اس کی ان طبی تصانیف کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ "کتاب الحاوی" عربی زبان میں سب سے بڑا طبی انسائیکلوپیڈیا ہے، الرازی نے اسے پندرہ سال میں مرتب کیا تھا۔ الرازی طب میں اپنے آپ کو جالینوس سے برتر اور فلسفہ میں ارسطو اور افلاطون سے فائق سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ رازی کے خلاف مذہبی نقطہ نظر اور الکیمیا میں اس کی دلچسپی کے باعث اس پر سخت تنقید ہوئی۔ البیرونی نے اس پر لگائے گئے الزامات کا جواب دینے کی کوشش میں رازی کی تحریروں کی ایک فہرست مرتب کی تھی تاہم وہ صحیح طور پر الرازی کا دفاع نہ کر سکا تھا۔

اخوان الصفا (چوتھی صدی ہجری/ دسویں صدی عیسوی)

چوتھی صدی ہجری، دسویں صدی عیسوی کے نصف آخر کی ایک سیاسی، مذہبی اور فلسفی جماعت

اخوان الصفا ایک ایسی مذہبی اور سیاسی جماعت تھی جس کے خیالات پر معتزلیت اور قرمطیت کا رنگ غالب تھا۔ بصرہ اس جماعت کا مرکز تھا اور اس کے ارکان اپنے آپ کو "اہل الصفاء والایمان" کہتے تھے۔ ان کی سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں کوئی خاص معلومات نہیں ملتی۔ البتہ رسائل کا ایک مجموعہ جسے انہوں نے ایک جامع شکل میں ترتیب دیا تھا ان کی علمی باقیات میں سے باقی رہ گیا ہے۔ اس مجموعے میں کل 52 مقالات میں اور اسے محققین ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت دیتے ہیں۔ اخوان الصفا نے اپنے خیالات کا اظہار ان مقالات میں بڑی پیچیدہ زبان میں کیا ہے۔ فلسفیانہ اعتبار سے اخوان الصفا کی حیثیت وہی ہے جو یونانی، ایرانی اور ہندی حکمت و دانش کے قدیم مترجمین اور جامعین کی تھی۔ اخوان الصفا کے مقالات میں ہرمیس، فیثاغورث اور سقراط اور افلاطون کا حوالہ بار بار ملتا ہے۔ ارسطو کا درجہ ان کے نزدیک بہت بلند تھا اور اسے انہوں نے منطق اور افلاطونی الٰہیات کا مصنف ٹھہرایا ہے۔

اخوان الصفا کے رسائل کے مشمولات نمایاں طور پر انتقادی نوعیت کے ہیں اور ان کا مرکزی خیال روح کے آسمانی مبداء اور خدا کی طرف اس کے رجوع کا عقیدہ ہے۔ ان کے نزدیک جسم مرجاتا ہے تو روح پاک وصاف ہوکر لوٹ جاتی ہے۔ اخوان الصفا موت کو قیامت صغریٰ اور نفس عالم کے اپنے خالق کی طرف رجوع کو قیامت کبریٰ سے تعبیر کرتے ہیں۔

ان کے انسائیکلو پیڈیا یا مقالات کا لب ولہجہ موعظانہ ہے۔ ان رسائل کا پہلا چودہ رسائل پر مشتمل ہے جن میں ریاضیات اور منطق کا ذکر طبور تمہید کیا گیا ہے۔ دوسرا حصہ سترہ رسائل پر مشتمل ہے اور اس میں علوم طبیعیہ کا ذکر کیا گیا۔ اور آخری حصہ میں جو گیارہ رسائل پر مشتمل اور تصوف، نجوم اور سحر کو بیان کیا گیا ہے۔

ابوالقاسم الزہراوی (دسویں صدی عیسوی)

قرون وسطیٰ کے اسلامی عہد کا ممتاز جراح جس نے ہڈی کو عمل جراحت سے نکالنے کی سفارش کی

نام ونسب: ابوالقاسم خلف ابن عباس الزہراوی، جس کے نام کو اہل مغرب توڑ مروڑ کر ابوالکاسس یا الزہراویس ALZAHARAWIUS کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ اسپین میں قرطبہ کے نزدیک واقع ایک شہر الزہرا میں تقریباً 936ء میں پیدا ہوا۔ الزہرا نامی شہر اندلس کے مشہور اموی حکمران عبدالرحمٰن ناصر نے اپنی ملکہ الزہرا کے نام پر تعمیر کیا تھا۔

الزہراوی نہ صرف اپنے عہد کا بلکہ پورے قرون وسطیٰ کا ایسا مسلم طبیب تھا جس کی عظمت کا لوہا اہل یورپ صدیوں تک مانتے رہے ہیں۔ طب اور جراحت کے علاوہ علم الٰہیات اور دیگر طبعی علوم پر بھی الزہراوی کو مکمل دسترس حاصل تھی۔

الزہراوی کے ابتدائی حالات کے بارے میں تاریخ خاموش ہے۔ بس صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا دور اسلامی اندلس کی تاریخ کا سنہرا دور تھا۔ یہ دور آٹھویں اندلسی خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر کا عہد حکومت تھا۔ اس دور میں اندلسی مسلمانوں کی علمی و فنی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں طبعی اور ریاضیاتی علوم اپنے اوج کمال پر تھے۔ قرطبہ کی شاہی لائبریری میں تقریباً دولاکھ کے قریب علمی اور فنی کتب موجود تھیں۔ قرطبہ اور الزہرا کے پائے کے علمی شہر پورے یورپ میں کہیں اور نہ تھے۔

فن جراحت کی تاریخ میں الزہراوی وہ پہلا شخص تسلیم کیا جاتا ہے جس نے سفارش کی تھی کہ ٹوٹی ہوئی ہڈی، گھٹنے کی چپنی کی عمل جراحت سے نکالی جاسکتی ہے۔ یہی وہ پہلا مسلمان طبیب تھا جس نے خواتین کے مثانے میں پتھری کے اخراج کی وضاحت کی تھی۔ عمل جراحت میں استعمال ہونے والے اوزار اور الزہراوی کے دماغ کی اختراع تھے۔ الزہراوی نے مشہور فرانسیسی جراح AMBROISEPARE سے صدیوں پہلے شریانوں کا خون بند کرنے کا اور زخموں کو ٹانکے لگانے کا طریقہ دریافت کیا تھا۔

الزہراوی نے ایک طبعی سائنسدان اور اطلاقی کیمیادان کی حیثیت اسپین کے تمام پودوں اور جانوروں کے بارے میں معلومات جمع کی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک ماہر نفسیات کی حیثیت سے ایک نفسیاتی طریقہ علاج بھی وضع کیا تھا۔

المجریطی (م تقریباً 1007ء)

اندلس کے ماہر فلکیات کو رسائل اخوان الصفا سے متعارف کرانے والا مسلم سائنسدان

نام ونسب: ابوالقاسم مسلمہ بن احمد الفرضی المجریطی، دسویں صدی عیسوی کے نصف دوم میں اسپین کے شہر میڈرڈ میں پیدا ہوا۔ اس نے فلکیات کے میدان میں نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ اس کی وفات قرطبہ میں 1007ء میں ہوئی تھی۔

بہت سے دیگر عظیم مسلم سائنسدانوں کی طرح ہی المجریطی کے حالات زندگی پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔اس کے متعلق ہماری معلومات ابن حزم اندلسی کی کتاب ''طوق الحمامہ'' میں کیے گئے اس کے ذکر پر مشتمل ہیں۔مورخین نے لکھا ہے کہ وہ بچپن سے ہی قرطبہ میں قیام پذیر تھا۔جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی وہ علماء کے اس گروہ میں شامل ہوگیا جسے خلیفہ عبدالرحمٰن سوئم کی سرپرستی حاصل تھی۔مورخین کے مطابق 979ء تک المجریطی نے مشاہدات فلکیات شروع کردیئے تھے اور الخوارزمی کی فلکیاتی جدولوں کی ترتیب نو بھی کی تھی۔اس کے کچھ عرصہ بعد ہی اس نے اندلس کے ماہرین فلکیات کو ''رسائل اخوان الصفا'' سے متعارف کرایا۔المجریطی کے شاگردوں میں سے الکرمانی نے اخوان الصفا کے رسائل کو اپنے استاد ہی کے خطوط پر چلتے ہوئے ملک کے شمالی گوشوں تک پہنچایا۔

المجریطی کی کتابوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں۔عام طور پر جادوگری اور کیمیا گری پر مشتمل کچھ کتابیں غلط طور پر اس سے منسوب کی جاتی ہیں۔المجریطی کی مستند تصانیف میں ایک کتاب ''معاملات'' ہے جو ابن خلدون کے تجزیے کے مطابق جائیداد کے موضوع پر ہے۔اصطرلاب پر تحریر کردہ ایک رسالہ بھی المجریطی سے منسوب ہے۔المجریطی کے کارناموں میں ایک اہم کارنامہ یہ مانا جاتا ہے کہ اس نے الخوارزمی کے فلکیاتی جدول کا استعمال کرتے ہوئے المجریطی نے قرطبہ کا طول بلد معلوم کیا اور ہجری تقویم بھی تیار کی تھی۔اس کے علاوہ کتاب ''رتبۃ الحکیم'' جو اس کے نام منسوب کی جاتی ہے۔یہ کتاب الکیمیا کے موضوع پر ایک اہم کتاب ہے۔

الخجندی (م 1000 عیسوی)

معروف ترین ماہر فلکیات جس نے سورج اور سیاروں کا مشاہدہ کرکے طریق الشمس کی پیائش کی۔

ابومحمود حامد بن الخضر الخجندی کے خوانین میں سے تھا۔

نصیرالدین محقق الطوسی کے مطابق اسے ''خان'' کا لقب ملا ہوا تھا۔اس کے حالات زندگی بہت کم ملتے ہیں۔ کچھ مدت تک اسے بویہ حکمران فخرالدولہ (976ء تا 997ء) کی سرپرستی حاصل رہی۔الخجندی نے 1000 عیسوی میں وفات پائی۔

حاجی خلیفہ نے ''کشف الظنون'' میں اور مغربی مستشرق براکلمان نے کچھ سائنسی تصنیفات اس کے نام سے منسوب کی ہیں۔جن کے نام یہ ہیں۔(1) رسالہ فی المیل وعرض البلد (طریق شمس کے جھکاؤ کے بارے میں) (2) رسالۃ جیومیٹری۔(3) فی عمل الالۃ العامۃ۔

ان کے علاوہ نصیرالدین طوسی کے مطابق الخجندی نے قانون الہیت یعنی کروی مثلثوں سے متعلق مسئلہ جیب زاویہ دریافت کیا تھا جس نے مینی لاؤس MENELAUS کے قانون کی جگہ لی تھی۔

طوسی نے اپنی کتاب ''شکل القطاع'' میں مسئلہ جیب زاویہ کے لیے الخجندی کا حل بیان کیا ہے۔

اپنے مشاہدات کو استعمال کرتے ہوئے الخجندی نے ایک اور کتاب ''الزیج الفخری'' مرتب کی تھی جو آج کل تہران کی ایرانی مجلس کی لائبریری میں محفوظ ہے۔یہ اس کی مرتب کردہ زیج کی نقل ہے جو اس کی وفات کے دوسو سال بعد فارسی میں لکھی گئی تھی۔

ابن یونس (م 1009ء)

ابن یونس نے اپنے مشاہدات میں سورج گرہن، اعتدالین اور طریق الشمس کے جھکاؤ کو بیان کیا ہے۔

نام ونسب: ابوالحسن علی بن عبدالرحمٰن بن احمد بن یونس الصوفی، ابن یونس کی تاریخ ولادت معلوم نہیں ہے البتہ اس نے فسطاط، مصر میں 1009ء میں وفات پائی تھی۔ ابن یونس کی وجہ شہرت علم ہیئت اور علم ریاضی ہیں۔

ابن یونس قرون وسطیٰ کے مسلم ہیئت دانوں میں ایک اہم نام ہے۔ وہ ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے جد اعلیٰ یونس امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھیوں میں سے تھے۔ جبکہ اس کے والد عبدالرحمٰن ایک ممتاز مورخ اور محدث تھے۔ ابن یونس علوم سائنس کے ساتھ ادبی ذوق بھی رکھتا تھا اور شعر وشاعری اس کے شغف میں شامل تھی۔ اس کی کچھ نظمیں بھی اب تک محفوظ ہیں۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ ابن یونس نے اپنی جوانی کے دنوں میں فاطمیوں کے ہاتھوں مصر کو فتح ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ 977ء سے 996ء تک کے دور میں اس نے فاطمی خلیفہ العزیز کے عہد میں فلکیاتی مشاہدات کیے تھے۔ خلیفہ الحاکم کے حکم پر اس نے اپنے فلکیاتی مشاہدات کا اندراج 1003ء تک جاری رکھا تھا۔

ابن یونس کی سب سے بڑی تصنیف ''الزیج الحاکمی الکبیر'' ہے۔ زیج وہ کتاب ہوتی ہے جس میں فلکیاتی جدولیں دی گئیں ہوں۔ قرون وسطیٰ کے دور میں تقریباً 250 اسلامی زیج ترتیب دی گئیں تھیں۔ ان سب میں ابن یونس کی زیج سب سے زیادہ مفید ہے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ ابن یونس نے الحاکم کے قاہرہ کے قریب پہاڑیوں میں واقع ایک مکان میں اپنے فلکیاتی مشاہدات کیے تھے۔ اس خلیفہ ابن یونس کی وفات کے بعد قاہرہ میں ایک رصدگاہ تعمیر کرنے کی کوشش کی تھی جو ناتمام رہی تھی۔ ابن یونس کا دوسرا بڑا تالیفی کام کروی فلکیات جدولوں کا ایک مجموعہ ہے۔

السجزی (م 1020ء)

قرون وسطیٰ کا وہ مسلم ماہر فلکیات جو سائنسی تحقیقات میں علم نجوم پر توجہ دیتا تھا۔

نام ونسب: ابوسعید احمد ابن محمد ابن عبدالجلیل، وہ ایران کے شہر سجستان میں 945ء کے قریب پیدا ہوا تھا۔ علم جیومیٹری، فلکیات اور علم نجوم اس کے خاص موضوعات تھے۔ بعض اسے السجزی کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ البیرونی کا ہم عصر تھا۔ البیرونی نے اپنی کتاب ''آثار الباقیہ'' میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ علاوہ ازیں البیرونی نے قبلہ کی صحیح سمت کے تعین کے لیے السجزی سے رابطہ بھی قائم کیا تھا۔ اسی طرح السجزی نے بھی اپنی ایک تصنیف میں البیرونی کی تین جیومیٹریکل اشکال کو بیان کیا ہے اور البیرونی کو پیش پانچ مسائل کو اپنی کتاب کے اختتام پر پیش کرتا ہے۔

969ء میں السجزی نے شیراز میں ریاضی پر کچھ کتابیں لکھیں اور ان کی نقول بھی تیار کیں تھیں۔ ان نقول میں سے ایک کا قلمی نسخہ جو بعد میں تیار ہوا تھا پیرس کے قومی کتب خانے میں محفوظ ہے۔ انہیں دنوں اس نے ایک کتاب بعنوان ''کتاب القرانات'' بھی لکھی تھی۔ اس کتاب میں اس کی خودنوشت ''منتخب الالوف'' کے حوالے بھی موجود ہیں۔ 970ء میں شیراز میں قیام کے دوران اس نے عبدالرحمٰن الصوفی کے مشاہدات میں اس کی مدد کی تھی۔

السجزی سائنسی تحقیقات میں علم نجوم پر زیادہ وقت صرف کرتا تھا اور فلکیات کے سلسلے میں اسے قدیم معلومات پر بھی مکمل عبور حاصل تھا۔ السجزی نے ابومعشر بلخی کی تین کتابوں کا خلاصہ بھی لکھا تھا اور فلکیات پر ایک کتاب ''کتاب زرداشت صور درجات فلک'' بھی تالیف کی تھی۔ اسی طرح اس نے علم ریاضی پر بھی کتب تالیف کی تھیں۔ السجزی کی وفات کا

سال صحیح طور پر معلوم نہیں ہے، لیکن یہی بتایا جاتا ہے کہ وہ 1020ء کے قریب فوت ہوا تھا۔

ابن سینا (980ء-1037ء)

الشیخ الرئیس، نامور عرب فلسفی، طبیب، ریاضی دان اور دنیائے اسلام کا شہرآفاق سائنسدان

نام ونسب: ابوعلی الحسین ابن عبداللہ ہے۔ لاطینی اور دیگر مغربی زبانوں میں اسے AVICENNA کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی ولادت وسط ایشیا میں افشانہ نامی مقام 980ء میں ہوئی تھی۔ جبکہ اس نے وفات 1037ء میں ہمدان میں پائی۔ ابن سینا کی شہرت فلسفہ، سائنس اور طب کے شعبے میں ہے۔

ابن سینا ایک غیر معمولی ذہین انسان تھا اس نے بہت کم عمری میں مختلف سائنسی علوم میں معاصر معلومات کا احاطہ کرلیا تھا۔ اور صرف پندرہ برس کی عمر میں طبابت شروع کردی تھی۔ اپنے دور کی سیاسیات میں بھی اس نے بھرپور حصہ لیا۔ قونج کے قاضی اور معلم سائنس اور رے اور ہمدان کے ناظم کے طور پر بھی اس نے خدمات سرانجام دیں، بعدازاں مشمس الدولہ کا وزیر نامزد ہوگیا تھا۔ ان سرکاری ملازمتوں کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی سائنسی دلچسپیوں کو بھی پورا وقت دیا۔ ابن سینا کی موت بھی مورخین کے نزدیک ایک معمہ ہے۔ بظاہر اسے درد قولنج کی کی تکلیف ہوئی جس کا علاج صحیح طور پر نہ ہوسکا، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی امکان ہے کہ اس کی موت زہرخورانی کی وجہ سے واقع ہوئی تھی۔

علم فلسفہ پر اس کی عظیم تصنیف ''شفا'' جو چار حصوں پر مشتمل ایک ضخیم انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس کے علاوہ طب م یں اس کی معروف کتاب القانون فی طب، الھدایہ، حکمت علائی اور اس کی آخری تصانیف میں سے ایک ''کتاب الارشارات والتنبیہات اہم ترین ہیں۔

کہتے ہیں کہ علم طب جب معدوم تھا تو اسے بقراط نے پیدا کیا، جب وہ مرچکا تھا تو جالینوس نے اسے زندہ کیا، جب وہ متفرق اور پراگندہ تھا تو الرازی نے اسے سہارا دیا اور جب وہ ناقص تھا تو ابن سینا نے سے پایہ تکمیل کو پہنچایا۔

ابن سینا کی زندگی کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ 17 برس کی عمر میں اس نے تاجدار بخارا، نوح بن منصور کا علاج کامیابی سے کیا تھا جس کے سلے میں اسے شاہی کتب خانے کا مہتمم مقرر کیا۔

ابن الہیثم (965ء-1040ء)

علم المناظر کا امام اور اسلامی دنیا اور ازمنہ متوسطہ کا سب سے بڑا طبیعیات دان

نام ونسب: ابوعلی الحسین، یورپ میں ازمنہ متوسطہ سے اسے ال ھیزن ALHAZEN کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسلامی دنیا اور ازمنہ متوسطہ کا سب سے بڑا سائنسدان جو طبیعیات کے شعبے بصریات میں شہرت رکھتا ہے۔ بصریات کے علاوہ، ریاضی، فلسفہ اور طبابت پر بھی اسے مکمل دسترس حاصل تھی۔ مزید براں اس نے ارسطو اور جالینوس کی شرح بھی کی۔ 354ھ/965ء میں بصرہ میں پیدا ہوا اس لیے اسے ابوعلی بصری بھی کہا جاتا ہے۔ فاطمی خلیفہ الحاکم نے اس کی شہرت سن کر اسے مصر آنے کی دعوت دی تھی۔ مصر آکر اس نے خلیفہ سے اس امر کی پیشکش کی کہ وہ دریائے نیل کے بہاؤ کو قابو میں لاسکتا ہے، لیکن اسوان کے قریب دریا کا معائنہ کرنے کے بعد جلد ہی اسے یہ منصوبہ ترک کرنا پڑا اور خجالت اٹھانا پڑی۔ بعدازاں خلیفہ نے بعض محکمے اس کے سپرد کردیئے جن میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا، مجبوراً خلیفہ کے ڈر سے وہ ان محکموں میں کام کرتا رہا، ساتھ ہی اس نے یہ ظاہر کیا کہ اس کے دماغ میں فتور ہے، یہاں تک کہ خلیفہ الحاکم کا انتقال ہوگیا جس کے بعد وہ ریاضی اور

بعض دوسرے علوم میں اپنی تصنیفات کی بدولت گذر اوقات کرتا رہا۔ اس نے 430ھ/1039ء میں وفات پائی۔

جیسا کہ اس کے تراجم میں مذکور ہے، علم ہیئت میں مہارت کی وجہ سے اسے بطلیموس ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ مورخ ابن ابی اصیبعہ نے ابن الہیثم کی دو سو سے زائد تصانیف کا ذکر کیا ہے جو اس نے ریاضیات، ہیئت اور طبیعیات اور بصریات و طب کے علوم پر کیں تھیں۔ اس کی اہم ترین تصنیف OPTICS یا ''کتاب المناظر'' ہے جس کا لاطینی ترجمہ 1572ء میں کیا گیا تھا۔ علم بصریات ہی میں وہ پہلا شخص تھا جس نے روشنی کو شیشوں، آئینوں اور پانی سے گذار کر انعطاف نور پر تجربات کیے۔ ابن الہیثم نے اس یونانی نظریہ کی تردید کی کہ آنکھ سے نکلنے والی روشنی کی کرنیں ان چیزوں سے ٹکرا کر ہماری آنکھوں میں واپس آتی ہیں جنھیں ہم دیکھتے ہیں۔ ابن الہیثم نے بینائی کے عمل کی صحیح سائنسی تشریح کی تھی۔

ابن باجہ (م 1138ء)

اندلس کا مشہور عرب فلسفی، سائنسدان، عالم ادب ونحو، یورپ میں AVEMPACE کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے بعض مغربی فلسفیوں، خصوصاً ڈیکارٹ اور برگساں کو اس حد تک متاثر کیا کہ وہ ساری عمر اس کے فعال ذہن کے گن گاتے رہے۔ مشہور یونانی فلسفی افلاطون کے بعد یہ پہلا مسلمان مفکر تھا جس نے 20 برس کی عمر ''تدبیر التوحد'' جیسی کتاب لکھ کر فلسفیانہ افکار پر ایسا گہرا اثر چھوڑا کہ آج تک باقی ہے۔ ابن باجہ کا تعلق بارہویں صدی عیسوی سے ہے جو اسلامی فلسفیانہ افکار کی تاریخ میں ''عظیم ترین صدی'' کہلاتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دنیائے اسلام کے مشرق میں امام غزالی کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا جو فلسفیوں پر تنقید کرنے کے لیے مشہور ہیں، لیکن اندلس کے اس حکیم نے فلسفیانہ افکار کو امام غزالی کی تنقید سے بچانے کا فرض ادا کیا۔

ابن باجہ اندلس کے شہر سرقسطہ SARAGOSSA میں پیدا ہوا۔ اور ابتدائی تعلیم بھی وہیں پائی۔ ابھی وہ مشکل سے گیارہ برس کا ہوا تھا کہ اس شہر پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا اور اسے اشبیلیہ جانا پڑا۔ اشبیلیہ میں قیام کے دوران ہی ابن باجہ نے اپنی پہلی کتاب تصنیف کی مگر اس کتاب کی تالیف کے بعد بہت سے لوگ اس کے دشمن ہو گئے اور اسے مجبوراً مراکش کے شاہی دربار میں پناہ لینا پڑی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ابن باجہ نے اپنی تصنیفات میں اگرچہ قرآن مجید اور احادیث نبوی صلی علیہ وسلم کی طرف برابر رجوع کیا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ یونانی طرز فکر کی بنیادوں پر اسلامی طرز فکر کی عمارت کھڑی کی ہے۔ اس کے نظریات نے ابن طفیل اور ابن بطروح کو آگے بڑھنے کا راستہ فراہم کیا اور ان کا راستہ زیادہ صاف کر دیا۔ قرون وسطی کے لاطینی مصنفوں پر بھی اس کے اثرات گہرے ہیں۔ اس کی تصانیف ''تدبیر التوحد، الاتصال اور الوداع یورپ میں بھی خاصی مقبول تھیں۔ ابن باجہ کا انتقال جوانی میں ہوا جو شاید زہر خورانی کی وجہ سے ہوا تھا۔

عمر خیام (1132ء)

سلجوقی عہد کا مشہور ایرانی سائنسداں، عالم ہیئت داں وریاضیات، شاعر اور عظیم رباعی گو

نام ونسب: غیاث الدین ابوالفتح عمر ابن ابراہیم الخیامی المعروف بہ عمر الخیام

ولادت: 15 مئی 1048ء کو ایران کے شہر نیشاپور میں پیدا ہوا اور اسی شہر میں اس نے 4 دسمبر 1132ء کو وفات پائی۔ وہ ایک باکمال رباعی گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہر ریاضی داں بھی تھا اور اسے فلکیات اور فلسفے میں بھی کمال حاصل تھا۔ خیمہ سازی اس کے آباؤ اجداد کا پیشہ تھا اس لیے خیام کہلاتا ہے۔ فی زمانہ عمر خیام کی شہرت ایک رباعی گو شاعر کی

حیثیت سے اس کی سائنسی تحقیقات سے زیادہ ہے۔ اگرچہ عمر خیام کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ حسن بن صباح اور نظام الملک کا ہم مکتب تھا مگر اس کے باوجود مورخین نے لکھا ہے کہ یہ بات وثوق سے نہیں کی جا سکتی کہ خیام نے تعلیم کہاں حاصل کی تھی، البتہ یہ کہا جاتا ہے کہ تعلیم کی تکمیل کے بعد اس نے غالباً معلمی کا پیشہ اختیار کیا تھا چونکہ تدریسی مصروفیات کی وجہ سے وہ اپنی سائنسی تحقیقات پر توجہ نہیں دے سکتا تھا اس مقصد کے لیے یکسوئی کی خاطر خیام نے شاہی دربار سے وابستگی اختیار کی۔ اسی زمانے میں عمر خیام نے اپنے ''رسالۃ فی البراہین علیٰ مسائل الجبر والمقابلہ'' کو تصنیف کیا اور اس کے بعد ''مشکلات الحساب'' جیسی اہم اور مفید کتاب قلمبند کی۔ علم موسیقی پر ایک رسالہ ''القول علیٰ اجناس التی بالاربع'' بھی لکھا۔

1070ء میں عمر خیام سمرقند پہنچا اور وہاں اس نے قاضی القضاۃ ابوطاہر کی مصاحبت اختیار کی اور اس کی سرپرستی میں مکعب مساواتوں کے متعلق الجبرے کی ایک عظیم کتاب تصنیف کی۔ خیام نے اصفہان میں تقریباً اٹھارہ برس قیام کیا۔ یہ دور غالباً اس کی زندگی کا سب سے زیادہ پرسکون دور تھا۔ اصفہان کی رصدگاہ میں اسے سلجوقی سلطان ملک شاہ اور اس کے وزیر نظام الملک کی سرپرستی حاصل تھا اور اس عہد کے بہترین ماہرین فلکیات اس کے ساتھ کام کرتے تھے۔ خیام کی راہنمائی اس کے رفقا کار نے فلکیاتی جداول ''زیج ملک شاہی'' کے نام سے مرتب کیں۔ اس کے علاوہ ایران میں مروج شمسی کیلنڈر کی اصلاح کا اہم کام بھی اسی رصدگاہ میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ خیام سلطان ملک شاہ کے درباری منجم کے طور پر بھی کام کرتا رہا۔ 1920ء میں نظام الملک کے قتل کے بعد اور ملک شاہ کی وفات کے بعد ترکان خاتون تخت نشین ہوئی تو عمر خیام اس کے عتاب کا شکار ہوا اور بعد ازاں اسے اصفہان چھوڑنا پڑا کچھ عرصہ وہ مرو میں رہا اور اس نے ''میزان الحکم'' تصنیف کی۔

ابن طفیل (حیات 1181ء)

اسلامی اندلس کا نامور عرب فلسفی، شاہی طبیب، کاتب اور رسالہ حیّ بن یقظان کا مصنف

نام ونسب: ابوبکر محمد بن عبدالملک بن محمد بن محمد بن طفیل القیسی، اسلامی اندلس کا مشہور اور نامور فلسفی، جو ابوجعفر الاندلسی القرطبی کے نام سے بھی مشہور تھا۔ اہل یورپ نے اسے ABABACER کا نام دیا ہے جو عربی نام ابوبکر کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ قبیلہ قیس سے تعلق رکھتا تھا اور وادی آش میں 1100ء کے لگ بھگ پیدا ہوا۔ یہ وادی غرناطہ سے چالیس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ وہ ابن باجہ کا شاگرد تھا مگر شاید یہ صحیح نہیں۔ اس لیے کہ ابن طفیل نے اپنی تصنیف حیّ بن یقظان میں اپنی ابن باجہ سے عدم واقفیت کا اظہار کیا ہے۔ پیشہ کے اعتبار سے وہ ایک طبیب بھی تھا اور غرناطہ میں طبابت کرتا رہا۔ پھر والئ غرناطہ کا کاتب بنا اور 1154ء میں یہی خدمت اس نے طنجہ اور بستہ کے والیوں کے ہاں انجام دیں۔ آخر الامر الموحد حکمران ابویعقوب یوسف اول کا طبیب مقرر ہوا۔ یہی منصب تھا جو اس کے بعد اس کے دوست اور مشہور مسلم فلسفی ابن رشد کو ملا۔ امیر المومنین ابویعقوب یوسف کو مسائل فلسفہ سے دلچسپی تھی اسی کی تحریک پر ابن رشد کو ابن طفیل نے مشورہ دیا تھا کہ وہ ارسطو کی تصانیف پر حواشی لکھے۔ ابن طفیل کے ایک شاگرد نے لکھا ہے کہ امیر المومنین کو اپنے طبیب خاص ابن طفیل سے بڑا لگاؤ تھا اسی وجہ سے ابن طفیل کئی کئی دن شاہی محل میں بسر کرتا تھا۔

1182ء میں جب ابن طفیل پیرانہ سالی میں قدم رکھ چکا تھا تو ابن رشد کو اس کی جگہ شاہی طبیب مقرر کیا گیا۔ مگر امیر المومنین اور اس کے بعد اس کے بیٹے نے ابن طفیل کی سرپرستی جاری رکھی۔ یہاں تک کہ امیر المومنین نے ابن طفیل کی نماز جنازہ میں بھی شرکت کی۔ ابن طفیل کی ایک ہی تصنیف دستیاب ہوئی ہے وہ ہے حیّ بن یقظان جس میں گویا اس نے اپنے فلسفیانہ نظریات کی وضاحت ایک داستان کی شکل میں کی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ارسطو کی METEOROLOGY کا

ترجمہ بھی ابن طفیل نے کیا تھا مگر اس کے علم طب پر دو رسالوں کی طرح یہ بھی ناپید ہے۔

ابن رشد (م 1198ء)

اسلامی اندلس کا سب سے بڑا فلسفی، تہافت التہافت کا مصنف اور ارسطو کا شارح

نام ونسب: ابو ولید محمد بن احمد بن محمد بن رشد جسے اہل یورپ ایویرروس AVERROES کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ اندلس کا سب سے بڑا عرب فلسفی تھا۔ 520ھ/1126ء میں قرطبہ میں پیدا ہوا۔ اس کا دادا اور والد قرطبہ میں قاضی کے عہدے پر فائز رہے تھے۔ ابن رشد نے قانون اور طب کی تعلیم حاصل کی۔ 1153ء میں مراکش میں بھی تعلیم کے حصول کے لیے مقیم تھا۔ ابن طفیل سے اس کے بے حد دوستانہ تعلقات تھی اس کی ترغیب پر وہ مراکش گیا تھا اور اسی کی سفارش پر وہ الموحد حکمران ابو یعقوب یوسف کے دربار میں متعارف ہوا اور بعدازاں شاہی طبیب مقرر ہوا۔ ابو یعقوب نے اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔

ابو یعقوب کو مسائل فلسفہ سے دلچسپی تھی اس نے ابن رشد سے دریافت کیا تھا ''کیا وہ جوہر ازلی ہے یا اس کی کوئی ابتدا تھی؟ ابن رشد کہتا ہے کہ مجھ پر اس قدر ہیبت طاری ہوئی کہ میں اس کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ تاہم خلیفہ نے خود اس کے حجاب وتکلف کو دور کیا اور خود مختلف علما کے نظریات بیان کر کے اس موضوع کو آگے بڑھایا، یہ علمی قابلیت بادشاہوں کے ہاں شاذ ونادر ہی نظر آتی تھی۔ ابو یعقوب ہی کی اس شکایت پر کہ ارسطو کی کتابیں گنجلک ہیں ابن رشد نے ابن طفیل کی فرمائش پر ارسطو کی کتب کی شرحیں لکھنا شروع کیا جس کے لیے اسے اپنے فلکیاتی مشاہدات اور سائنسی تحقیق کو چھوڑنا پڑا۔ اسی حکمران کے عہد میں ابن رشد کو اشبیلیہ کا قاضی مقرر کیا گیا۔ تاہم اس نے شرحیں لکھنے کا کام جاری رکھا۔

ابو یعقوب کی وفات کے بعد جب اس کے بیٹے نے حکومت سنبھالی تو دس برس تک ابن رشد کا احترام قائم رکھا، لیکن 1195ء میں اسے یہ عزت وتوقیر حاصل نہ رہی جس کی وجہ فقہا مالکی کے اثر ورسوخ کا بڑھ جانا تھا جو فلاسفہ کے سخت خلاف تھے۔ ابن رشد کو اندلس سے جلاوطن کر دیا گیا بعدازاں قرطبہ کے اشراف کی عدالت میں اسے پیش کیا گیا اور مالکی فقہا نے اس کے نظریات کو ملعون قرار دیا اور عدالت نے احکام جاری کیے کہ فلسفہ کی کتابوں کو جلا دیا جائے پھر جب المنصو ر واپس مراکش پہنچا تو اس نے ان احکام کو منسوخ کر دیا اور ابن رشد کو اپنے پاس بلا لیا مگر اس سے ابن رشد کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا کیونکہ 1198ء کے آخر میں اس کا انتقال ہو گیا۔ ابن رشد کو اور اس کے فلسفے کو بعدازاں اہل مغرب نے بے حد سراہا۔

الاقلیدسی (بارہویں صدی کا نصف دوم)

الاقلیدسی نے واضح طور پر بتایا کہ ہندوستان کے حسابی نظام کا انحصار DUST ABACUS پر ہے۔

نام ونسب: ابوالحسن احمد ابن ابراہیم کی زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہے۔ اس عظیم مسلم ریاضی دان کو اس کی کتاب ''کتاب الفصول فی الحساب الہندی'' کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ استنبول کی ایک لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس کتاب کے پہلے صفحہ پر مصنف کے نام کے ساتھ ہی لکھا ہوا ہے کہ یہ کتاب 952ء سے 953ء عیسوی میں لکھی گی ء اور 1157ء میں اس مخطوطے کی یہ نقل تیار کی گئی تھی۔ الاقلیدسی کا لفظ اس زمانے میں ایسے لوگوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا جو مشہور یونانی ریاضی دان اقلیدس کی کتاب ''عناصر'' کی نقول تیار کر کے فروخت کرتے تھے۔ یوں مورخین کے مطابق شاید الاقلیدسی نے بھی کچھ عرصہ ذریعہ معاش کے طور پر یہ کام کیا ہوگا۔ اس کی کتاب کے مطالعہ سے

پتہ چلتا ہے کہ اسے ہندوستانی حساب کو پڑھانے میں مہارت تامہ حاصل تھی اور وہ ریاضی کی مشکلات کو حل کرنے میں بھی مہارت رکھتا تھا۔

الاقلیدسی کی کتاب ''کتاب الفصول فی الحساب الہندی'' کے چار حصے ہیں۔ پہلے حصے میں اس نے قدیم ہندی اعداد کا تعارف کرایا ہے اور اعداد کی مقامی قیمت کے نظریے کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس حصے میں حسابیاتی عملوں کا طریقہ بھی سمجھایا گیا ہے۔ ان عملوں میں جذرالربع بھی شامل ہے۔ ان تمام عملوں کی اساس ساٹھ کا نظام ہے۔ دوسرے حصے کا موضوعاتی مواد اعلیٰ درجے کا ہے۔ اس میں SINES کو نکالنے کا طریقہ بھی بتایا گیا ہے۔ اسی کتاب کے تعارف میں اقلیدسی نے ہندوستانی نظام کا اس دور کے انگلیوں پر شمار کرنے کے رائج نظام سے موازنہ کیا ہے اور ہر دو کے فوائد ونقصانات کے بارے میں ایک صحیح اور جامع رپورٹ مرتب کی ہے۔ دوسرے کئی مسلم مصنفین کے مقابلے میں اقلیدسی مفصل طور پر ہندوستانی حساب کی وضاحت کی ہے۔

جابر بن افلح (بارھویں صدی کا نصف دوم)

وہ مسلم سائنسداں جس کی تحقیقات کو اہل یورپ نے سولہویں اور سترھویں صدی تک پیش نظر رکھا

نام ونسب: ابو محمد بن جابر بن افلح، مشہور مسلم ہیئت دان، جو قرون وسطیٰ جبر GEBER کے نام سے یورپ میں مشہور تھا۔ اسے ملتے جلتے نام کی وجہ سے اکثر ابوعبداللہ جابر بن حیان کے ساتھ خلط ملط کر دیا جاتا تھا۔ جابر بن افلح کا تعلق اشبیلیہ، اندلس سے تھا۔ اس نے جس زمانے میں فروغ پایا، اس کا صحیح تعین تو نہیں ہو سکا، لیکن چونکہ اس کا بیٹا یہودی فلسفی ابن میمون (م 1204ء) کو ذاتی طور پر جانتا تھا لہٰذا نتیجتاً یہ سوچا جا سکتا ہے کہ جابر بن افلح نے بارھویں صدی کے نصف دوم سے قرطبہ کے قریب وفات پائی۔

جابر بن افلح، ریاضی اور علم فلکیات پر دسترس رکھتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا کام بطلیموس کی المجسط کو نو ابواب میں ''اصلاح المجسطی'' کے نام سے دوبارہ ترتیب دینا ہے۔ اسکوریال لائبریری میں اس کتاب کا جو نسخہ موجود ہے اس میں اسے ''کتاب الہیئت'' کا نام دیا گیا ہے۔ ''اصلاح المجسطی'' کے دیباچہ میں بطلیموس کی ''اغلاط'' کی ایک فہرست دی گئی ہے۔ جابر بن افلح کا ''المجسط'' سے اہم ترین اور مشہور انحراف یا اختلاف سیارگان اسکل یعنی عطارد اور زہرہ سے متعلق ہے۔ بطلیموس نے ان دونوں سیاروں کی جگہ سورج سے نیچے متعین کی تھی، جابر نے اس کے اس نظریئے کو غلط ثابت کرتے ہوئے عطارد اور زہری کا مقام سورج کے اوپر کیا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ سیارے سورج کی نسبت زمین سے زیادہ قریب تر ہیں۔ ''اصلاح المجسطی'' اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس کے فلکی حصے سے پہلے مثلثیات TRIGNMETRY پر بھی ایک باب موجود ہے۔ جس سے اہل یورپ کے علم مثلثیات پر بڑا اہم اثر مرتب ہوا تھا۔ کئی مغربی ماہر ریاضی اپنی تصنیفات میں جابر کا حوالہ دیتے ہیں۔ ''اصلاح المجسطی'' کا عربی متن برلن شمارہ 5653 اسکوریال شمارہ 1930,9106 اور پیرس کے کتب خانے میں موجود ہے۔ پیرس میں اس کتاب کا عبرانی رسم الخط میں بھی نسخہ موجود ہے۔

یورپ میں دور احیاء العلوم کے بعد سولہویں اور سترھویں صدی میں بھی مغربی سائنسدانوں نے جابر کی تحقیقات کو پیش نظر رکھا تھا۔

شرف الدین طوسی (م 1213ء)

طولی اصطرلاب کا موجد، جو ستاروں کی بلندی، وقت طوالع اور قبلے کی سمت بتاتا تھا

نام ونسب: شرف الدین الظفر ابن محمد ابن المظفر الطوسی کا وطن مالوف الطوس، ایران ہے۔ یہ وہی الطوس ہے جہاں الغزالی اور نصیرالدین طوسی جیسے عظیم علما پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے علم وفضل کی بنیاد پر شہرت دوام حاصل کی۔ شرف الدین الطوسی کی زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہے۔ قرون وسطیٰ کے علماء کی طرح الطوسی نے بھی اس زمانے کی دنیائے اسلام کی سیاحت کی۔ وہ غالباً 1165ء میں دمشق میں اکتساب علم کر رہا تھا۔ اس کا مشہور شاگرد ابوالفضل بھی اسی شہر سے تعلق رکھتا تھا۔ ابوالفضل نے نورالدین زنگی کے عہد میں تعمیر کیے جانے والے ایک شفا خانے ''بیمارستان النوری'' کی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ دمشق کے بعد الطوسی نے حلب میں سکونت اختیار کی جہاں اس کے شاگردوں میں ابوالفضل بن یامین نامی ایک یہودی بھی شامل تھا۔ اس یہودی شاگرد نے الطوسی سے علم الاعداد، علم نجوم اور فلکیات میں استفادہ کیا تھا۔

الطوسی کے جس شاگرد نے فضل وکمال میں استاد سے زیادہ نام کمایا، وہ کمال الدین ابن یونس تھا جو موصل کا رہنے والا تھا۔ اس نے الطوسی کی تعلیمات کو نصیرالدین اور اثیر الدین الاسری تک پہنچایا۔ الطوسی کچھ عرصہ موصل میں مقیم رہا جس کے بعد وہ اربل چلا گیا اور وہاں وہ ابن الدھان کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہو گیا۔ اسی دوران ابن الدھان اربل چھوڑ کر صلاح الدین ایوبی کی دعوت پر دمشق چلا گیا۔ ادھر الطوسی ایران واپس آ گیا اور اس نے تقریباً 1213ء میں وفات پائی۔ الطوسی اپنی ایک ایجاد ''عصائے طوسی'' طولی اصطرلاب کی وجہ سے مشہور ہے۔ اصطرلاب لکڑی کی ایک سادہ چھڑی سے بنایا گیا تھا۔ الطوسی کا عظیم ترین علمی کارنامہ اس کی ایک تصنیف ہے جس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے۔ اگرچہ یہ قلمی نسخہ اپنی اصلی حالت پر میں محفوظ نہیں مگر اس کے باوجود ایک عظیم علمی کارنامہ ہے۔

السمرقندی (م 1222ء)

نام ونسب: نجیب الدین ابوحامد محمد بن علی بن عمر، تیرھویں صدی عیسوی کا ایک ماہر طبیب تھا جس نے طب کے موضوع پر کئی اہم کتابیں تصنیف کی تھیں۔ اس نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ افغانستان کے شہر ہرات میں گزارا تھا اور اسی شہر پر 1222ء میں ہونے والے منگول حملے کے دوران وفات پائی تھی۔ السمرقندی کو مشہور فلسفی فخر الدین الرازی کا ہم عصر بتایا گیا ہے۔ السمرقندی کے حالات زندگی کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہے۔ ابن ابی اصیبعہ کے مطابق وہ ایک مشہور طبیب تھا۔

السمرقندی کی تصانیف میں سب سے اہم تصنیف ''الاسباب والعلامات'' تسلیم کی جاتی ہے جو بیماریوں کے اسباب اور ان کی علامات کے بارے میں ہے۔ نفیس بن عوض الکرمانی کی کتاب میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ نفیس نے السمرقندی کی اس کتاب کی شرح بعنوان ''شرح الاسباب والعلامات'' کے نام سے کی تھی۔ السمرقندی کی جو کتاب اب تک دستیاب ہیں وہ یہ ہیں۔ الادویہ ولمفردات، اغذیۃ والاشربۃ وما یتصل بہا فی مداوات وجمع المفاصل فی کیفیت ترکیب طبقات العین، اقرباذین، فی علاج من سقیہ السموم اونہشہ الہوام وغیرہا۔

اپنی تصانیف میں السمرقندی قدیم نظریہ امراض خلطی HUMORAL PATHOLOGY پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ یہ نظریہ قدیم یونانی اطبا نے پیش کیا تھا کہ ہر بیماری جسم انسانی کی چار خلطوں، بلغم، خون، صفاء اور سودا کی کمی بیشی سے

پیدا ہوتی اور پھیلتی ہیں۔ السمر قندی نے ادویات کے بہت سے نقصانات پر بھی قلم اٹھایا تھا وہ ادویات کے دائرہ عمل کے حوالے سے جسم کی کیفیت وساخت کے بارے میں بھی وضاحت کرتا ہے اور مختلف بیماریوں کے لیے بھی مختلف الادویہ تجویز کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ اسلامی طب کی تاریخ السمر قندی کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی اور اس کی خدمات کا تذکرہ طب کے طلبا کو تحقیق کے میدان میں پیش قدمی پر اکساتا ہے۔

ابن البیطار (م646ھ/1248ء)

قرون وسطی کا مشہور مسلمان ماہر نباتیات اور مصنف کتاب الجامع فی الادویۃ المفردۃ

نام ونسب: ابو محمد عبداللہ بن احمد ضیاء الدین ابن البیطار المالقی، نہ صرف جانوروں کا معالج بلکہ ایک عظیم ماہر نباتیات تھا۔ اس کا تعلق غالباً مالقہ کے ابن البیطار خاندان سے تھا۔ وہ چھٹی صدی ہجری کے ربع آخر میں پیدا ہوا۔ اندلس کے مشہور شہر اشبیلیہ کی فصیل کے باہر اس کے والد احمد ضیاء الدین کا شفاخانہ حیوانات تھا، جہاں ابن بیطار اپنے والد کو بیمار حیوانات کا علاج کرتے ہوئے دیکھتا تھا۔

علم نباتیات میں اس کے استاد کی حیثیت سے ابوالعباس نباتی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، جس کے ساتھ وہ اشبیلیہ کے گردونواح میں پودے جمع کیا کرتا تھا۔ باپ کی کوشش تھی کہ اس کا بیٹا اس کا فن سیکھے مگر اس کی دلچسپی علم نباتیات میں زیادہ تھی۔ تقریباً بیس برس کی عمر میں وہ علم نباتیات کے مزید مطالعے کے لیے شمالی افریقہ کی سیاحت پر نکلا۔ جب وہ مصر پہنچا تو وہاں اس وقت ایوبی خاندان کی حکومت تھی اور الملک الکامل وہاں کا بادشاہ تھا۔ ابن البیطار نے اس کی ملازمت اختیار کر لی اور تمام ماہرین علم نباتیات کا افسر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ الملک الکامل کی وفات کے بعد بھی وہ اپنے اس عہدے پر فائز رہا اور اس نے دمشق میں بھی کچھ عرصہ قیام کیا۔ اس نے شام اور ایشیائے کوچک میں پائی جانے والی جڑی بوٹیوں کو جمع کرنا اور ان کا مطالعہ کرنا جاری رکھا اور اس موضوع پر دو کتابیں بھی تصنیف کیں۔ اس نے 300 کے قریب ایسی جڑی بوٹیاں دریافت کیں جن کا ذکر اس سے پہلے نہیں ملتا تھا۔ اس کی شہرت کا دارومدار اس کی اہم ترین تصنیف ''کتاب المفردات الادویہ والاغذیہ'' پر ہے۔ یہ کتاب حیوانات، نباتات، معدنیات کے ذریعے علاج کے سہل نسخوں پر مشتمل ہے۔ مشہور مورخ ابن ابی اصیبعہ ابن البیطار کا شاگرد تھا اور دمشق میں اس کے ساتھ جڑی بوٹیوں کی تلاش میں شریک کار تھا۔ ابن البیطار نے 646ھ/1248ء میں دمشق میں وفات پائی تھی۔

نصیر الدین الطوسی (م672ھ/1274ء)

ایک منجم، مورخ، شیعہ سیاستدان، ہلاکو کا معتمد خاص اور چند کتب کا مصنف

نام ونسب: نصیر الدین ابو جعفر محمد بن محمد بن الحسن، 18 فروری 1201ء کو خراسان کے مشہور شہر طوس میں پیدا ہوئے اور 1274ء میں بغداد کے نواحی علاقے کاظمین میں 26 جون کو انتقال کیا۔ الطوسی نے ہیئت، ریاضی، معدنیات، منطق، فلسفہ، اخلاقیات اور دینیات کے ماہر کی حیثیت سے شہرت پائی۔ اس کے معاصرین اسے محقق طوسی، خواجہ طوسی اور خواجہ نصیر کے ناموں سے یاد کرتے تھے۔ محقق طوسی اسلام کی فکریاتی تاریخ میں ایک اہم شخصیت کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں۔

محقق طوسی کے والد فقہائے اثناعشریہ میں سے تھے، محقق طوسی نے علوم عقلیہ اور علوم نقلیہ کی تعلیم انہیں سے پائی۔ اس کے علاوہ منطق، فلسفہ اور مابعد الطبیعیات جیسے علوم کی تعلیم اپنے ایک ماموں سے پائی اور الجبرا اور جیومیٹری جیسے علوم

پر بھی دسترس حاصل کی۔ کچھ دن نیشاپور میں قیام کر کے علوم متداولہ پر دسترس حاصل کی اور جلد ہی ان کا شمار اس شہر کے ممتاز علما میں ہونے لگا۔ الطوسی کے مشہور اساتذہ میں فرید الدین الداماد شامل ہیں جن کا سلسلہ نسب چار واسطوں میں ابن سینا تک جا پہنچتا ہے۔

طوسی کا زمانہ اسلامی تاریخ کا ہنگامہ خیز دور تھا۔ تاتاریوں نے صحرائے گوبی سے نکل کر دنیائے اسلام پر یلغار کر دی تھی اور وہ خراسان کی طرف پیشقدمی کر رہے تھے۔ طوسی کے لیے بھی اس زمانے میں اپنی علمی سرگرمیوں کو جاری رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ ان حالات میں ایک اسماعیلی حکمران ناصر الدین محتشم نے اسے اپنے پہاڑی قلعے میں آ کر کام کرنے کی پیشکش کی جو اس نے قبول کر لی۔ 1256ء میں شمالی ایران سے اسماعیلیوں کا اقتدار ہلاکو خان نے ختم کر دیا مگر الطوسی کی قدر افزائی کرتے ہوئے اسے اپنا علمی مشیر مقرر کیا۔ ہلاکو خان کو علم نجوم سے دلچسپی تھی اس نے مراغہ میں الطوسی کے لیے ایک رصدگاہ قائم کی جس کی تعمیر ہلاکو خان کے جانشین اباقاخان کے عہد میں مکمل ہوئی۔ الطوسی نے 1274ء میں وفات پائی اور امام موسیٰ کاظم کے مقبرے کے نزدیک دفن کیا گیا۔ الطوسی کی تصانیف میں 150 رسالے اور مکتوبات بھی شامل ہیں اور کئی علوم کا احاطہ کرتے ہیں۔

ابن النفیس (م 687ھ/1288ء)

ولیم ہاروے سے تقریباً 300 سال پہلے انسانی جسم میں دوران خون کی نشاندہی کرنے والا

نام و نسب: علاء الدین ابو العلاء علی بن الحزم القرشی الدمشقی۔ ساتویں صدی ہجری اور تیرھویں صدی عیسوی کا ایک عرب طبیب جس نے مشہور انگریز طبیب ولیم ہاروے سے تقریباً 300 سال پہلے انسانی جسم میں دوران خون کی نشاندہی کی تھی۔ اس کی تاریخ وفات کے سوا اس کی زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ اس ایک وجہ یہ ہے ابی اصیبعہ، ابن نفیس کا ہم عصر ہونے کے باوجود اپنی تصنیف ''تاریخ الاطبا'' میں اس کا ذکر نہیں کرتا۔ ابن نفیس 607ھ/1210ء کے لگ بھگ دمشق میں پیدا ہوا اور وہیں اس نے اس شفاخانے میں جس کی بنیاد نور الدین زنگی نے چھٹی صدی ہجری میں رکھی تھی جس کا نام اس کے نام پر ''البیمارستان'' مہذب الدین عبدالرحیم بن علی المعروف بہ ''دخوار'' تھا جو ابن التلمیذ کے مدرسہ کا فارغ التحصیل تھا۔ یہ مدرسہ بغداد سے شام منتقل کیا گیا تھا۔ طب کے علاوہ ابن نفیس نے صرف و نحو، منطق اور اصول فقہ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ چنانچہ فقہ شافعی میں اُسے ایک مستند عالم کا مرتبہ حاصل تھا۔ تعلیم کے حصول کے بعد وہ قاہرہ چلا گیا جہاں اُسے رئیس الاطبا مصر کا عہدہ دیا گیا۔ غالباً وہاں اس نے ناصری شفاخانے میں کام کیا تھا۔ قاہرہ میں وہ مدرسہ مسروریہ میں فقہ شافعی بھی پڑھاتا تھا۔ قاہرہ ہی میں بعمر اسی سال اس کا انتقال 16 دسمبر 1288ء کو ہوا تھا۔

ابن نفیس نے اپنی ''شرح تشریح ابن سینا'' میں جو قلمی نسخہ کے طور پر محفوظ ہے۔ ابن سینا اور جالینوس کے برعکس انسانی پھیپھڑوں میں دوران خون کی کیفیت اس کے مغربی دریافت کنندگان MIGUEL SERVETO اور ولیم ہاروے سے تقریباً 300 سال پیشتر صحیح طور پر بیان کر دی تھی مگر ابن نفیس کی اس انکشاف کا علم اہل یورپ کو نہ ہو سکا تھا کیونکہ اس کی ایک کتاب کا ترجمہ لاطینی میں نہیں ہوا تھا۔

ابن الشاطر (م 1375ء)

اسلامی فلکیات پر ابن شاطر کا دائرہ اثر بہت وسیع رہا ہے اس کے علفلکیاتی آلات پر بہت اہم مقالے بھی ہیں۔

نام ونسب: علاؤالدین ابوالحسن علی بن ابراہیم ہے۔ بمقام دمشق 1305ء کے لگ بھگ پیدا ہوا اور اسی شہر میں انتقال 1375ء میں ہوا تھا۔ ابن الشاطر چودھویں صدی عیسوی کا ممتاز ترین مسلم ہیئت دان تھا۔ وہ دمشق کی مشہور مسجد جامعہ اموی میں نماز کے اوقات مرتب کرتا تھا، مگر اس کی دلچسپیاں اپنے ابتدائی دور کے معاصرین یعنی ابن السراج، ابن الغزولی کے ساتھ مشترک تھیں اور یہ سب اصطرلابوں اور ربعوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ ابن شاطر نے ایک شمسی گھڑی بھی بنائی تھی تاہم فلکیات میں اس کا ایک نظریہ سیارگان بہت اہم ہے۔ سیاراتی ماڈلوں میں اس نے بطلیموس کے نظریہ میں متعدد مفید تبدیلیاں بھی کی تھیں۔ یاد رہے کہ بطلیموس کے نظریہ میں زمین کو ہی مرکز قرار دیا گیا تھا۔ یہی وہ خامی ہے جو ابن شاطر کے نظریہ میں بھی پائی جاتی ہے جبکہ اس کے قطع نظر اس کے ماڈل وہی تھے جو کوپرنیکس کے تھے۔ ابن الشاطر کے نظریے پر پہلی مرتبہ جدید زمانے میں 1950ء میں تحقیق کا آغاز ہوا۔ اس دریافت نے اس کے ماڈل کو پرنیکس کے ماڈلوں کے مشابہ تھے، نہایت دلچسپ سوالات پیدا کردیتے ہیں۔ اس سے یہ امکان بڑھ گیا ہے کہ شاید اس کا نظریہ ب ھی یورپ منتقل ہوا ہو۔ اس نے الآلۃ الجامعۃ'' نامی آفاقی اصطرلاب بھی ڈیزائن کیا تھا۔

بہت سے عظیم مسلمان سائنسدانوں کی طرح ہی ابن شاطر کے سوانح حیات بھی تفصیلاً دستیاب نہیں ہوسکے۔ اس کے بچپن میں اس کے دادا نے اسے ہاتھی دانت پر نقش ونگار بنانے کا فن سکھایا تھا۔ دس برس کی عمر میں ابن شاطر نے علم ہیئت کی تحصیل کے لیے قاہرہ اور اسکندریہ کا سفر کیا تھا۔ سیاراتی فلکیات پر ابن شاطر نے اپنے کام کا آغاز فلکیاتی جدولوں کو ترتیب دیتے ہوئے کیا تھا۔ اس کے علاوہ 1372ء میں ابن الشاطر نے ایک عظیم الشان شمسی گھڑی تیار کرکے جامع بنوامیہ دمشق کے شمالی مینار پر نصب کی تھی۔ اس گھڑی میں قوسوں کے نظام سے دن رات کے مساوی گھنٹوں میں طلوع آفتاب کے اوقات اور زوال کا وقت، بتایا گیا تھا۔

قاضی زادہ رومی (1436ء)

قاضی زادہ رومی مشہور مسلمان سائنسدان حکمران الغ بیگ کی دانش گاہ کا ناظم اعلیٰ تھا۔

نام ونسب: قاضی زادہ رومی المعروف بہ صلاح الدین موسیٰ پاشا 1364ء میں ترکی کے شہر برصہ میں پیدا ہوا۔ وہ ریاضی اور فلکیات پر مکمل دسترس رکھتا تھا۔ وسطی ایشیا کے مشہور تیموری حکمران الغ بیگ نے جو ایک سائنسداں بھی تھا، جب سمرقند میں یونیورسٹی قائم کی تو قاضی زادہ کو اس کا چانسلر مقرر کیا تھا۔ الغ بیگ اور قاضی زادہ میں بڑے قریبی دوستانہ تعلقات تھے۔

برصہ میں ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد قاضی زادہ نے ملا شمس الدین الفناری کی شاگردی اختیار کرلی جو ایک ماہر قاموس نگار اور علم الٰہیات کا ایک جید عالم تھا۔ الفناری نے اسے فلکیات اور جیومیٹری کی تعلیم دی اور مزید تعلیم کے حصول کے لیے اسے ماوراالنہر جانے کا مشورہ دیا اور ماوراالنہر کے علما کے نام تعارفی خط اور اپنی ایک تصنیف ''انموذج العلوم'' بھی دی۔

تقریباً 1410ء میں اس کی ملاقات الغ بیگ سے ہوئی اور اس نے سمرقند میں سکونت اختیار کی۔ 1421ء میں الغ بیگ نے سمرقند میں ایک دانش گاہ کی تعمیر کا حکم دیا اور قاضی زادہ کو اس دانش گاہ کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا۔ اس دانش گاہ میں قاضی زادہ نے ریاضی اور فلکیات کے علوم کے استاد کے فرائض بھی انجام دیئے۔ قاضی زادہ جب اس یونیورسٹی میں ان علوم پر لیکچر دیتا تو خود الغ بیگ بھی اس کے لیکچروں میں شرکت کرتا تھا۔

1431ء میں ایک ایرانی نوجوان ماہر فلکیات والریاضی، الکاشی کی زیر نگرانی سمرقند کی رصدگاہ بھی پایہ تکمیل کو پہنچی اور اس میں فلکیاتی جدول کی تیاری کا کام شروع ہوگیا۔ یہ کام نصیر الدین الطوسی کے فلکیاتی جدولوں کو سامنے رکھ کر کیا گیا۔

میں الکاشی کی وفات کے بعد اس رصدگاہ کا نگران اعلیٰ فائز نہ رہ سکے اور ان کی جگہ علی توشچی نے لی۔ قاضی زادہ نے 1439ء میں سمرقند میں کی تھی اس شادی سے ان کے ہاں ایک بیٹا شمس الدین محمود پیدا ہوا تھا۔ قاضی زادہ کی اہم تصانیف کے نام شادی بھی یہ ہیں۔ رسالتہ فی الحساب، شرح الملخص فی الہیۃ اور رسالتہ فی الہیۃ والہندسہ وغیرہ۔

الغ بیگ (م853ھ/1449ء)

ترکستان اور ماوراالنہر کا تیموری حاکم، ادیب، فن کار، عالم دینیات اور سائنسداں

نام ونسب: الغ بیگ محمد تورغائی بن شاہ رخ میرزا ابن تیمور لنگ۔ خاندان چنگیز کے مشہور مغول فاتح امیر تیمور کا پوتا تھا۔ الغ بیگ اس کا لقب تھا جس کا مطلب ترکی زبان میں "شہزادہ اعظم" بنتا ہے۔

الغ بیگ نے اپنے عظیم دادا تیمور لنگ کے دربار میں پرورش پائی۔ 1407ء میں اسے خراسان اور ماژندوان کا گورنر مقرر کیا گیا۔ 1409ء میں شاہ رخ نے ترکستان اور ماوراالنہر کے علاقے بھی اسے سونپ دیئے۔ تیموری خاندان کا فرد ہونے کی حیثیت سے وہ اپنے دادا کی طرح عظیم فاتح تو نہ بن سکا، لیکن علوم وفنون سے دلچسپی کی بنا پر اس نے سمرقند کو اسلامی تہذیب وتمدن کا مرکز بنا کر اپنے دادا کا خواب پورا کر دکھایا۔ وہ خود ایک جید عالم اور ماہر سائنسدان تھا اسے علم ریاضی اور فلکیات سے خاص شغف تھا۔ اس نے سمرقند میں بہت سی عظیم الشان عمارات اور ایک رصدگاہ تعمیر کروائی تھی۔ مورخین کے مطابق اس کے بیٹے عبداللطیف نے اس کے خلاف بغاوت کر کے اسے گرفتار کر لیا اور بعد ازاں اپنے ایک ایرانی ملازم امیر عباس کے حوالے کر دیا جس نے ایک مقدمے کا ڈھونگ رچا کر اسے 27 اکتوبر 1449ء کو قتل کر دیا۔

الغ بیگ نے سمرقند میں ایک یونیورسٹی، دانش گاہ کی بنیاد رکھی تھی جس میں درس تدریس کے لیے بھی اس کے نامور سائنسداں منتخب کیے اور ان کی قابلیت کا امتحان خود لیا۔ یونیورسٹی کے اساتذہ میں قاضی زادہ رومی اور غیاث الدین کاشی جیسے بلند پایہ سائنسداں شامل تھے۔

سمرقند یونیورسٹی کے قیام کے تقریباً 4 سال بعد الغ بیگ نے ایک رصدگاہ کی بنیاد رکھی جہاں الکاشی اور اس کے بعد قاضی زادہ کو مہتمم مقرر کیا گیا۔ یہ رصدگاہ فقہا کی ستم ظریفیوں کا شکار ہو کر آہستہ آہستہ تباہ ہوتی چلی گئی اور سولھویں صدی میں کھنڈرات کی شکل اختیار کر گئی۔ بیسویں صدی کے آغاز تک اس رصدگاہ کے صحیح مقام کا کسی کو پتہ نہ تھا۔ اس کا سراغ 1908ء میں ایک ماہر آثار قدیمہ نے لگایا اور اس کی باقیات دریافت کیں۔ اس رصدگاہ میں الغ بیگ اور اس کے رفقا نے فلکیاتی جدول تیار کیے تھے جن کو زیج جرجانی کا نام دیا گیا تھا۔ اس زیج کے دوسرے حصے میں تقویمی حسابات، تکونیات اور سیاروں کی جداول اور ستاروں کی ایک فہرست شامل ہے۔

ابن الماجد (پندرھویں صدی کا نصف دوم)

پندرھویں صدی کا نامور عرب جہازراں اور کتاب "الفوائد فی اصول علم بحر" کا مصنف

نام ونسب: شہاب الدین احمد ابن ماجد پندرھویں صدی عیسوی کے نصف دوم میں مشہور جہازراں ہو گزرا ہے جس کا تعلق سعودی عرب کے علاقے نجد سے تھا، کچھ روایات کے مطابق وہ موجود عمان کے علاقے جلفار میں پیدا ہوا تھا۔

ابن ماجد کا خاندان کئی پشتوں سے جہازرانی کا پیشہ اپنائے ہوئے تھا۔ اس کا والد اور دادا دونوں ہی فن جہازرانی کے استاد تھے۔ ان کی فنی مہارت اس بات سے عیاں ہے کہ لوگ ان کو "معلم" کے نام سے پکارتے تھے۔ معلم عرب میں

ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کی پوری زندگی جہاز رانی کے پیشہ سے وابستگی میں گزری ہو۔ ابن ماجد کا باپ اور دادا دونوں ہی بحر احمر میں جہاز رانی کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ ابن ماجد بھی اپنے آباؤ اجداد کی طرح بحر ہند اور بحر احمر کے بارے میں اس قدر معلومات اور اتنا زیادہ تجربہ رکھتا تھا کہ کوئی دوسرا جہاز راں اس سلسلے میں ابن ماجد سے سبقت نہ لے جاسکا۔ وہ بحر احمر کے راستے مشرقی افریقہ اور وہاں سے بحر ہند کے راستے ہندوستان اور چین تک کے تمام بحری راستوں سے واقف تھا۔

1498ء میں جب مشہور پرتگیز جہاراں واسکوڈی گاما ہندوستان کے لیے نئے بحری راستے کی تلاش میں مشرقی افریقہ میں ملندی پہنچا تو اس کے ملاحوں میں سے ایک نے اپنے روزنامچہ میں لکھا کہ وہاں انہیں ایک ایسا بحری ناخدا مل گیا جس نے انہیں براہ راست کالی کٹ، جنوبی ہندوستان کے ساحل پر پہنچا دیا۔ اس نے اس ناخدا کو ''معلم کنکا'' لکھا ہے۔ اس واقعہ کا ذکر عربی کتاب ''البرق الیمانی'' میں قطب الدین النہر والی نے کیا ہے اور لکھا ہے کہ پرتگالی جہازوں کے اس عرب راہنما کا نام ابن ماجد تھا۔

ابن ماجد مسلمان اور یونانی جغرافیہ دانوں، ماہرین فلکیات کی تصنیفات کا متبحر عالم تھا۔ مورخین نے ابن ماجد کی کل 38 تصنیفات کا ذکر کیا ہے۔ علوم بحر پر اس کی تصنیفات دوسرے جہاز رانوں کے لیے راہنما تھیں اور اس کے بعد کے زمانے کے جہاز راں انہیں راہنمائی کے لیے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

پری رئیس (م 1554ء)

یونانی الاصل عثمانی جہاز راں اور ماہر نقشہ کشی اور کتاب ''بحریہ'' کا مصنف

نام ونسب: پری یا پیری رئیس کا اصل نام محی الدین تھا۔ وہ ترکی کے شہر گیلی پولی میں 1470ء میں پیدا ہوا اور 1554ء میں مصر میں اس کی وفات ہوئی۔ پری رئیس حاجی محمد رئیس کا بیٹا اور مشہور ترک امیر البحر کمال رئیس کا بھتیجا تھا۔ اس نے 1487ء سے 1493ء تک ترکی کی شاہی عثمانی بحریہ میں خدمات انجام دیں اور اپنے چچا کے زیر کمان بعض بحری جنگوں میں حصہ لیا۔ 1511ء میں اپنے چچا کمال کے انتقال کے بعد اس نے بحریہ کو چھوڑ دیا اور نقشہ سازی شروع کردی۔ اس کے بعد اس نے الجزائر کے خیر الدین باربروسہ کے ہاں ملازمت کرلی۔

1516ء اور 1517ء میں پری رئیس کو چند ایسے بحری جہازوں کی کمان سونپی گئی جو مصر کے خلاف فوج کشی کی مہم میں حصہ لے رہے تھے۔ اس بحری مہم میں اس نے مصر کا شہر اسکندریہ فتح کرلیا۔ یہ ایک ایسا کارنامہ تھا جس کی بدولت سلطان سلیم اول سے اس کی ملاقات ممکن ہوگئی۔ اس نے سلطان کی خدمت اپنا تیار کردہ ایک بحری نقشہ پیش کیا۔

فتح مصر کی مہم سے فارغ ہو کر پری رئیس پھر واپس گیلی پولی لوٹ آیا اور یہاں اس نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''بحریہ'' لکھنی شروع کردی۔ مصر میں بغاوت ہوئی تو پری رئیس کو پرگا کے ابراہیم پاشا کا گائیڈ مقرر کیا گیا۔ مصر جاتے ہوئے اسے سمندر میں ایک بڑے طوفان کا سامنا کرنا پڑا جس کے باعث اس کے جہازوں کو ایک ماہ تک جزیرہ روڈس میں پڑاؤ کرنا پڑا۔ اس دوران میں پری اپنی تحریروں کی طرف بار بار رجوع کرتا۔ اس سے ابراہیم پاشا کی توجہ اس کی طرف ہوئی اور اس نے پری کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ اپنی کتاب مکمل کرے تاکہ اسے سلطان کی خدمت میں پیش کیا جاسکے۔ 1523ء میں سلطان نے پری کو جنوبی سمندروں کا امیر البحر بنا دیا۔ بعد ازاں وہ بحیرہ قلزم اور بحیرہ عرب کے امیر البحر کے طور پر بھی کام کرتا رہا۔

1929ء میں ترکی کے طوپ قپو عجائب گھر میں پری رئیس کا بنایا ہوا ایک بحری نقشہ دریافت ہوا تھا جس میں اس براعظم امریکہ کے سواحل اور مقامات دکھائے تھے۔ یہ شاید 1513ء کا بنا ہوا تھا اور اسے پری رئیس نے سلطان سلیم کی خدمت

میں پیش کیا تھا۔

علی کشچو ترک (م 1474ء)

پندرھویں صدی میں مشرق و مغرب کے سب سے بڑے عالم اور فلکیات دان

نام و نسب: علاؤ الدین علی بن محمد، 1403ء میں سمرقند میں پیدا ہوئے۔ علی کشچو کے والد مشہور تیموری بادشاہ الغ بیگ کے پرندوں کی رکھوالی کیا کرتے تھے۔ چونکہ پرندے رکھنے والوں کو ترکی زبان میں کشچو کہا جاتا ہے۔ اس لیے ان کا لقب کشچو مشہور ہو گیا۔

علی کشچو بچپن ہی سے ریاضی اور فلکیات میں دلچسپی رکھتے تھے۔ آپ نے فلکیات اور ریاضی کی بنیادی تعلیم سمرقند میں الغ بیگ قاضی زادہ رومی اور غیاث الدین جمشید سے حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے کرمان کا رخ کیا۔ یہاں انہیں بہت سی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔ ان کتابوں میں خواجہ نصیر الدین طوسی کی کتاب ''تجرید الکلام'' شامل تھی۔ آپ نے اس کتاب کی ایک شرح لکھی اور ابو سعید کی خدمت میں پیش کی۔ اس کے بعد دوبارہ الغ بیگ کے دربار میں آ گئے۔ الغ بیگ نے ایک رسالہ ''حل اشکال قمر'' جو علی کشچو نے کرمان میں مرتب کیا تھا بہت پسند کیا اور علی کشچو کو ''زریج الغ بیگ'' کی تیاری میں شامل کرایا۔ قاضی زادہ رومی کی وفات کے بعد انہیں سمرقند کی رصدگاہ کا نگران اعلیٰ بنا دیا گیا۔ الغ بیگ نے آپ کو مزید تعلیم کے لیے چین بھی بھیجا۔ چین سے واپسی پر آپ نے کرہ ارض کی پیمائش کے لیے ایک کلیہ مرتب کیا اور میریڈین کا حساب بھی لگایا۔

الغ بیگ کی وفات کے بعد سمرقند چھوڑ کر تبریز آ گئے جہاں کے حکمران اوزون حسن نے آپ کا احترام کیا اور اپنا سفیر بنا کر سلطان محمد فاتح کے دربار میں استنبول بھیج دیا۔ بعد ازاں سلطان محمد فاتح نے ان کو آیا صوفیہ کے مدرسہ میں تدریس کی ذمہ داریاں سونپ دیں۔ آپ نے استنبول کا طول بلد 59 درجے اور عرض بلد 41 درجے 14 منٹ نکالا۔ مسجد سلطان محمد فاتح میں آپ کی ایجاد کردہ شمسی گھڑی نصب ہے۔ آپ کی تصانیف میں رسالۃ الفتحیہ'' رسالہ اور شرح زیج الغ بیگ'' مشہور کتابیں ہیں۔

آک شمس الدین (م 1460ء)

جراثیم کے اولین دریافت کنندہ، ولی کامل اور استنبول کے معنوی فاتح

نام و نسب: آک شمس الدین کا اصل نام محمد بن حمزہ تھا۔ انہوں نے سلطنت عثمانیہ میں علمی پرورش پائی۔ چونکہ آپ سفید پوک تھے اور آپ کے داڑھی و سر کے بال بھی سفید تھے اس لیے آپ کا لقب آک یعنی سفید مشہور ہو گیا اور یوں آپ کو آک شیخ اور آک شمس الدین کہا جانے لگا۔ آپ کا تعلق مشہور ولی کامل حضرت شہاب الدین سہروردی کے گھرانے سے تھا اور آپ کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔

آک شمس الدین اپنے والد شرف الدین حمزہ شامی کے ہمراہ اناطولیہ آئے اور مضافات اماسیا میں قیام کیا۔ بچپن سے ہی تحصیل علم میں لگ گئے۔ قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد عقلی و نقلی علوم پر دسترس حاصل کی، اور تحصیل علم کے بعد شہر چورم کے ایک قصبہ عثمانجک میں آپ کا تقرر بطور مدرس ہو گیا۔ تصوف کی طرف میلان کی وجہ سے انقرہ میں مقیم اپنے زمانے کے مشہور ولی، حاجی بیرام ولی کے ارادت مندوں میں شامل ہو گئے اور ان کی صحبت میں تصوف کی باریکیوں سے آشنا ہوئے اور ان سے خرقہ خلافت پایا۔ اس کے ساتھ ساتھ علم طب میں مہارت تامہ حاصل کی اور نئی متعدی امراض پر محققانہ کام کیا۔ جراثیم

کے متعلق مشہور مغربی سائنسداں لوئی پاسچر سے تقریباً 4 سو برس پیشتر اپنی ایک کتاب ''مادۃ الحیاۃ'' میں لکھا کہ متعدی امراض جراثیم کے ذریعے پیدا ہوتے ہیں جو انتہائی درجہ کے چھوٹے جاندار ہیں انہیں دیکھنے سے انسانی آنکھ قاصر رہتی ہے۔

سلطان محمد فاتح جب قسطنطنیہ فتح کرنے کے لیے نکلا تو آک شمس الدین اس کی فوج کے ساتھ تھے۔ دوران جنگ آک شمس الدین نے انہیں فتح کی خوش خبری دی اور مشہور اصحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مزار کا محل وقوع بتایا جو قسطنطنیہ کی فصیل کے قریب واقع تھا۔ مشہور روایت ہے کہ آک شمس الدین نے صدر اعظم جاندارلی خلیل پاشا کے کینسر میں مبتلا ایک صاحبزادے کا علاج بڑی کامیابی سے کیا تھا۔ آک شمس الدین نے 864ھ/ 1460ء میں وفات پائی۔

سلیمان المہری (م قبل 1554ء)

فن جہاز رانی کا ماہر اور سولہویں صدی عیسوی میں اس موضوع پر متعدد کتب کا مصنف

نام ونسب: سلیمان المہری، معلم البحر اور ہدایات جہاز رانی پر اک کتاب ''اصول بحری'' کا مؤلف جو سولہویں صدی کے نصف اول سے تعلق رکھتا ہے۔

پیرس کے قومی کتاب خانہ میں عربی مخطوطہ نمبر 2559 میں متعدد ایسے رسائل جمع ہیں جو بحر ہند، مغربی چین کے سمندر اور ایشیا کے بڑے مجمع الجزائر کے سمندروں میں جہاز رانی کے متعلق ہیں۔ ان میں سے جو منظوم رسائل ہیں ان کا مصنف ابن ماجد ہے جبکہ پانچ رسائل جو نثر میں ہیں ان کا مصنف ایک اور معلم البحر سلیمان بن احمد المہری المحمدی ہے۔ اس معلم البحر کے باپ دادا دونسبتوں سے مہری کہلاتے تھے۔ یعنی ایک تو وہ جنوبی عرب کے قبیلہ المہرہ سے تعلق رکھتے تھے اس لیے وہ بھی ''المہری'' کہلاتا تھا۔ اصول بحری پر اس کی اپنی تالیف میں اس کے سوانح حیات کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے ترکی ترجمے میں 1554ء میں ترکی کے امیر البحر سیدی علی نے کیا تھا اور اس کا نام ''المحیط'' رکھا تھا۔ مترجم مذکور نے لکھا ہے کہ وہ اس سنہ میں وفات پا گیا تھا۔ اس سے زیادہ اس مسلم جہاں جہاز راں کی زندگی کے حالات کہیں نہیں ملتے۔ ان بحری رسائل میں سے ایک پر سنہ 1511ء درج ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہ رسائل سولہویں صدی کے نصف اول میں تالیف ہوئے تھے۔ ان میں ابن ماجد کا حوالہ بھی موجود ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ابن ماجد کے بعد کے ہو سکتے ہیں پہلے کے نہیں۔ پیرس کے مخطوطے میں سلیمان المہری کے پانچ رسائل موجود ہیں۔

(1) ''رسالۃ قلادۃ الشموس واستخراج قواعد الاسوس'' اس رسالہ میں دنیا کے مشہور سمندروں کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

(2) ''تحفۃ الفحول فی تمہید الاصول'' یعنی مردوں کا تحفہ جہاز رانی کے اصول کی معرفت کے لیے۔

(3) ''العمدۃ المہریہ فی ضبط العلوم البحریہ'' یہ رسالہ بحری فلکیات پر ہے۔

(4) ''کتاب المنہاج الفاخر فی علم البحر'' یہ سوال عرب، مکران سندھ، گجرات اور مالا بار کے بارے میں ہے اور اس میں مختلف بحری راستوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

(5) ''کتاب شرح تحفۃ الفحول فی تمہید الاصول'' اس میں افلاک وکواکب کے بارے میں معلومات درج ہیں۔

الحسن ابن محمد (م بعد از 1554ء)

نام ونسب: الحسن ابن محمد الوزان الریاتی الغرناطی، اسے لیووی افریقن LEO THE AFRICAN بھی کہتے تھے۔ 1485ء کے قریب اسلامی اندلس کی آخری مسلم ریاست غرناطہ میں پیدا ہوا اور 1554ء کے بعد تیونس میں انتقال کر گیا۔ اس نے علم جغرافیہ اور سیاحت عالم کی وجہ سے شہرت پائی۔ سقوط غرناطہ 1492ء کے بعد اس کے خاندان نے غرناطہ سے مراکش کے شہر فیض کی طرف ہجرت کی۔ الحسن نے فیض ہی تعلیم پائی۔

الحسن کے جغرافیائی علم کی بنیاد قرون وسطیٰ کے مسلم جغرافیہ دانوں کی تحریروں اور اس کی اپنی سیاحتوں میں کیے گئے مشاہدات پر تھی۔ مورخین کے مطابق اس نے اپنا پہلا سفر 1508ء میں ٹمبکٹو کا کیا۔ 1512-1514ء میں وہ ایک بار پھر ٹمبکٹو جانے کے لیے نکلا اور وہاں سے جھیل چاڈ کے راستے مصر پہنچا۔ 1518ء میں مراکش کے سفیر کی حیثیت سے قسطنطنیہ بھیجا گیا۔ اس سفر میں اس نے مصر اور طرابلس کی بھی سیاحت کی۔ طرابلس میں اسے اطالوی بحری قزاقوں نے پکڑ لیا اور اسے اٹلی لے گئے اور وہاں ایک غلام کے طور پر اسے پوپ لیو دہم کی خدمت میں پیش کیا۔ پوپ کے دربار میں اُسے عیسائیت قبول کرنا پڑی اس کا نام تبدیل کر کے پوپ کے نام پر لیو رکھ دیا گیا۔ 1529ء میں جب وہ اطالیہ سے واپس تیونس ایا تو اس نے دوبارہ اسلام قبول کیا۔

اٹلی میں قیام کے دوران الحسن نے اطالوی زبان میں ایک جغرافیائی تصنیف DELL AFRICA DELLA DERCITION لکھی۔ اس میں براعظم افریقہ کے بارے میں جغرافیائی معلومات درج کی گئی ہیں۔ یہ کتاب نو ابواب میں ہے۔ پہلی فصل یا باب میں افریقہ اور افریقیوں کے بارے میں معلومات دی گئیں۔ اگلے پانچ ابواب میں شمالی افریقہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ساتویں فصل میں بالائی نائیجیریا اور صحارہ کی جنوبی حدوں کے متعلق معلومات دی گئی ہیں۔ دیگر ابواب مصر اور براعظم افریقہ میں پائی جانے والی معدنیات اور جنگلی حیات کے بارے میں ہیں۔

سیدی علی رئیس (م 1562ء)

بحری کپتان، جغرافیہ دان اور ریاضی کے بڑے عالم

نام ونسب: سیدی علی رئیس استنبول کے علاقے گلاتا GALATA میں پیدا ہوئے۔ آپ کے خاندان کا تعلق سینوپ SINOP سے تھا۔ آپ کے دادا سلطان محمد فاتح کے عہد میں شپ یارڈ کے ناظم اعلیٰ تھے۔ خود سیدی علی نے بھی شپ یارڈ میں بطور رئیس کام کیا۔ خیر الدین بار بروسہ کی کفالت میں پرورش پائی۔ 1522ء میں روڈس کی فتح اور بحر ابیض میں لڑی جانے والی بحری جنگوں میں خیر الدین بار بروسہ کے شانہ بشانہ رہے۔ انہیں جنگوں کے دوران سیدی علی نے بحر ابیض کے مغربی ساحلوں کے متعلق بہت سی مفید جغرافیائی معلومات اکٹھی کیں۔ 1538ء میں پریوزہ PEREVEZA کی بحری جنگ میں عثمانی بحریہ کے میسرہ کی قیادت کی اور شہرت پائی۔ ایک سمندری جنگ میں جبکہ وہ ترکت مراد رئیس کے زیر قیادت پرتگالیوں کے خلاف لڑ رہے تھے مراد رئیس کو قیادت سے ہاتھ دھونا پڑا تو سیدی علی کو بحر ہند کا کپتان مقرر کر دیا گیا اور بصرہ کے بحری قافلے کا ذمہ دار بنا کر سویش بھیجا گیا۔

1554ء میں بصرہ سے سویش سفر کے دوران خرفقان اور مسقط کے قریب پرتگالیوں نے حملہ کر دیا مگر جوابی کارروائی میں پرتگالیوں کے چھ جہاز غرق کر دیئے گئے جبکہ 5 عثمانی جہاز بھی ڈوب گئے۔

اسی سفر کے دوران عمان کے ساحل پر شدید طوفان آیا اور سیدی علی کا نو جہازوں پر مشتمل بیڑا بچھڑ کر جنوب کی جانب چلا گیا اور ہندوستان کے ساحل پر گجرات کے قلعے کے سامنے جا ٹھہرا۔ تین جہاز برف میں پھنس گئے۔ گجرات کے سلطان احمد خان نے ان کا خیر مقدم کیا۔ جنگی جہازوں کے سویش تک پہنچنے کی کوئی صورت نہ تھی اس لیے سیدی علی نے براستہ خشکی واپس استنبول جانے کا فیصلہ کیا اور ملتان لاہور اور پھر دہلی پہنچ کر ہمایوں بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے پھر ایران کے راستے واپسی کا سفر کیا اپنے اس دلچسپ سفر کو کتابی شکل دی۔ 1562ء میں وفات پائی آپ کی تصانیف میں مراۃ کائنات اور مراۃ ممالک بڑی اہم کتب ہیں مراۃ ممالک ہندوستان سے بغداد تک کا سفر نامہ ہے۔

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی (م 1994ء)

چاند بوٹی سے اجملین جیسی موثر الکلائیڈ دوا تیار کرنے والا مسلمان

نام ونسب: ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی۔ 19 اکتوبر 1897ء کو لکھنو میں پیدا ہوئے۔ وہ قدرتی اشیا کی پیداواری علم کیمیا سے جدید زمانے کے جابر بن حیان تھے انہوں نے نیم کے درخت سے بہت سے مفید کیمیائی مرکبات تیار کیے تھے۔ بانی ڈائرکٹر H.E.J لیبارٹریز آف ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری کے طور پر انہوں نے جنوبی ایشیا میں پائے جانے والے ادویائی خصوصیات کے حامل پودوں پر تحقیق کر کے ادویا سازی میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ 1922ء میں برصغیر کے مشہور زمانہ حکیم اجمل دہلوی کے ایما پر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے جرمنی گئے اور وہاں ایک جڑی بوٹی اسرول جسے چاند بوٹی بھی کہا جاتا ہے تحقیق کا کام کیا۔ اس بوٹی کو حکیم اجمل دہلوی بلند فشار خون، ہسٹریا اور دیوانگی کے موثر علاج کے لیے استعمال کرتے تھے۔

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی لکھنو کی تحصیل بارہ بنکوی سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں پائی۔ انہیں ادب وشاعری کا ذوق اپنے والد شیخ محمد زماں سے ورثے میں ملا تھا۔ انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے فلسفہ اور فارسی زبان میں گریجویشن کی ڈگری حاصل کی۔ 1920ء میں یونیورسٹی لندن کالج سے طب کی تعلیم حاصل کرنے لندن چلے گئے تاہم حکیم اجمل دہلوی کے اصرار پر کچھ عرصہ جرمنی میں بھی تعلیم حاصل کی۔ 1924ء میں انہوں نے اپنی ایک ہم جماعت جرمن لڑکی اےتھل سے شادی کی اور 1927ء میں جرمنی سے فلسفہ میں بھی ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ہندوستان واپسی پر طبیہ کالج دہلی میں آیورویدک اور طب یونانی پر ریسرچ کے لیے ایک انسٹی ٹیوٹ قائم کیا۔ اس کام میں انہیں حکیم اجمل دہلوی کی سرپرستی حاصل تھی۔ اسی ادارے میں انہوں نے چاند بوٹی کے جوہر سے اجملین تیار کی جسے اہل یورپ نے بھی ایک موثر دوا کے طور پر تسلیم کیا۔ 1951ء میں ڈاکٹر سلیم الزماں ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور یونیورسٹی آف کراچی میں کیمسٹری کے ایک انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ 1967ء میں انہیں پاکستان اکیڈمی آف سائنس کا صدر بنا دیا گیا۔ ڈاکٹر سلیم الزماں ایک سائنسداں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے مصور بھی تھے انہوں نے 14 اپریل 1994ء میں بعمر 97 سال وفات پائی۔

حکیم اجمل دہلوی (م 1729ء)

بیسویں صدی کے وہ حکیم جن کے ہاتھوں میں ہر مرض کا علاج موجود تھا

نام ونسب: مسیح الملک حافظ حکیم محمد اجمل خان فرزند حکیم محمود خاں شریف خانی، دلی کے محسن اعظم، اپنے عہد میں دہلی کے بے تاج بادشاہ مانے گئے۔ ان کی طبی خدمات کے سلسلے میں طبیہ کالج دہلی اور ہندوستانی دواخانہ شاہد عدل ہیں۔ جامعہ ملیہ بھی ان کی خاص توجہ کا ممنون رہا۔ حکومت برطانوی ہند نے انہیں حکیم حاذق الملک کا خاندانی خطاب دیا تھا جو انہوں

نے ترکِ موالات میں ترک کر دیا تو قوم نے انہیں مسیح الملک کا خطاب پیش کیا۔ اپنے عہدِ حیات میں تمام قومی، ملکی اور ملی تحریکات یعنی تحریک خلافت، کانگریس، جمعیۃ العلما کی تنظیم و توسیع میں مرکزی کردار ادا کرتے رہے۔ ہندو، مسلم اور انگریز و عیسائی سب انہیں احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد شام و فلسطین کے عرب خوفناک مسائل کا شکار ہوئے تو حکیم صاحب نے ان کی مالی امداد و اعانت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ بڑے مدبر، متوازن اور دور اندیش بزرگ تھے۔ 1987ء میں نواب آف رامپور کے علاج کے لیے رامپور گئے ہوئے تھے۔ وہیں عارضہ قلب سے وفات پائی۔ ان کی میت کو رامپور سے لاکر طبیہ کالج دہلی کے احاطے میں دفن کیا گیا۔

حکیم محمد سعید دہلوی (1920ء-1998ء)

ممتاز طبیب، ادیب، سفرنامہ نگار اور سابق گورنر سندھ۔

1920ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ پہلے قرآن مجید حفظ کیا پھر عربی اور فارسی کی تعلیم مولانا قاضی سجاد حسین سے حاصل کی۔ بعد ازاں انگریزی کی تعلیم بھی پائی۔ یونانی طبیہ کالج سے فارغ التحصیل اور 1939ء میں طب کا اعلیٰ امتحان پاس کیا۔ اسی زمانے میں انہوں نے اپنا پہلا افسانہ "تسبیح" کے نام سے لکھا تھا۔ یہ افسانہ اخبار وطن دہلی میں 1933ء میں چھپا تھا۔

1939ء میں طب سے فراغت کے بعد اپنے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید کے ساتھ ہمدرد دواخانے میں کام کرنے لگے۔ قیام پاکستان کے بعد جنوری 1948ء کراچی آ کر یہاں ہمدرد دواخانہ کھولا۔ قائداعظم سے آپ کو عقیدت و لگاؤ تھا اسی بنا پر تحریک پاکستان میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ کراچی میں ہمدرد یونیورسٹی کا قیام انہیں کی کوششوں کا ثمر ہے۔

آپ ایک کثیر التصانیف مصنف تھے آپ نے بہت سی کتابیں لکھی تھیں۔ جن میں میڈیسن ان چائنا (انگریزی) ابن الہیثم، ہیلتھ آف دی نیشن۔ دی ہسپلائز اینڈ ایمپلائی، تذکرہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، ہمدرد فارما کوپیا آف میڈیسن، مقالات شام ہمدرد، یورپ نامہ، جرمنی نامہ، عجائبات جسم انسانی، ایک مسافر چار ملک، کوریا کہانی، اخلاقیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، روس کا سفرنامہ، یونیسکو لینڈ میں میرے روز و شب شامل ہیں۔

یونیسکو کے رسالے پیامی کے ایڈیٹر تھے۔ ان کے زیر نگرانی، ہمدرد صحت ہمدرد نونہال اور اخبار الطب وغیرہ شائع ہوتے تھے۔ 1966ء میں ستارہ امتیاز اور کویت پرائز برائے اسلامی طب 1983ء میں ملا تھا۔ صدر پاکستان کی مشیر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں اور 1991ء تا 1994ء سندھ کے گورنر بھی رہے۔ انہیں اکتوبر 1998ء میں دہشت گردوں نے ان کے مطب کے عین سامنے ہلاک کر دیا تھا۔

ڈاکٹر عبدالسلام (م 1996ء)

پہلا نوبل انعام یافتہ پاکستانی سائنسدان اور عالم اسلام کی نوبل پرائز حاصل کرنے والی دوسری شخصیت

نام و نسب: ڈاکٹر عبدالسلام ولد چودھری محمد حسین، والدہ ہاجرہ حسین، ایک مسلم راجپوت فیملی سے تعلق رکھتے تھے

1926ء میں جھنگ میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایس سی کیا پھر کیمبرج یونیورسٹی چلے گئے۔ کیمبرج یونیورسٹی میں انہوں نے نظریاتی طبعیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ 1951ء میں وطن واپسی پر گورنمنٹ کالج لاہور میں ریاضی کے پروفیسر اور 1952ء میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ ریاضی کے صدر مقرر ہوئے۔ جلد ہی واپس انگلستان چلے گئے اور امپیریل کالج لندن میں شعبہ ریاضی کے صدر مقرر ہو گئے۔ وہیں آپ نے ایٹمی سائنس میں ابتدائی ذرات پر مقالہ لکھ کر

شہرت حاصل کی۔ 1957ء میں پنجاب یونیورسٹی نے ذراتی طبعیات پر تحقیق کرنے پر ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ 1959ء میں صرف 33 سال کی عمر میں رائل سوسائٹی لندن کے فیلو منتخب ہوئے۔

1959ء ہی میں ان کی ملاقات مشہور ایٹمی سائنسدان اوپن ہیمر سے ہوئی اور انہوں نے اوپن ہیمر کو اپنا نیوٹران پر کیا کام پیش کیا۔ اپنے سائنسی کیریر کی ابتدا میں ہی انہوں نے کوانٹم الیکٹروہائیڈروڈائنامیکس پر بھی کام کیا تھا۔ 1960ء میں پاکستان واپس آگئے اور صدر پاکستان نے انہیں سائنسی امور کے مشیر خاص کا عہدہ پیش کیا جس پر وہ 1974ء تک فائز رہے۔ پاکستان کی سائنسی ترقی میں انہوں نے انتہائی اہم کردار ادا کیا اور وہ پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کے بانی تھے۔ ستمبر 1974ء میں جب قومی اسمبلی میں احمدیوں کو اقلیت قرار دیا گیا تو وہ احتجاجی طور پر مستعفی ہوگئے اور برطانیہ واپس چلے گئے جہاں انہیں مختلف اعزازات سے نوازا گیا۔ 1968ء میں انہیں اقوام متحدہ کا انعام برائے ایٹم برائے امن دیا گیا اور پھر دسمبر 1979ء میں انہیں دیگر دو سائنسدانوں کے ساتھ مشترکہ طور پر نوبل انعام برائے طبعیات دیا گیا۔ 30 دسمبر 1979ء کو صدر پاکستان نے انہیں نشان امتیاز عطا کیا۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے 21 نومبر 1996ء کو بعمر 70 سال آکسفورڈ میں وفات پائی ان کی تدفین ربوا کے بہشتی مقبرے میں پاکستان میں ہوئی۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان

پاکستان کو دنیا کی پہلی اسلامی ایٹمی طاقت بنانے والی عظیم مسلم شخصیت

نام ونسب: پاکستان کے ایٹم بم کے خالق، ڈاکٹر عبدالقدیر خان۔ یکم اپریل 1936ء کو بھوپال، بھارت میں پیدا ہوئے۔ آزادی کے بعد کراچی آکر ڈی جے سائنس کالج سے بی ایس سی کیا، بعدازاں میٹالرجی کی اعلیٰ تعلیم کے لیے برلن کی ٹیکنیکل یونیورسٹی میں داخلہ لیا مگر ہالینڈ چلے گئے۔ ہالینڈ کی ڈیلفٹ یونیورسٹی سے وابستہ ہوگئے اور ماسٹر ڈگری حاصل کی۔ پھر بیلجیئم سے ڈاکٹریٹ آف انجینئرنگ کی سند حاصل کی۔ 1976ء میں پاکستان واپس آئے اور وزیراعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو سے ملے اور انجینئرنگ ریسرچ لیبارٹریز میں شمولیت اختیار کی۔ بعدازاں اس ادارے کا نام صدر ضیاء الحق نے ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کے نام پر ڈاکٹر اے کیو خان لیبارٹریز رکھ دیا تھا۔ یہ ادارہ پاکستان میں یورینیم کی افزودگی میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔

1983ء میں ہالینڈ کی ایک عدالت نے ان پر اہم ایٹمی راز چرانے کا الزام لگایا اور انہیں چار سال قید کی سزا سنائی۔ پاکستان کے ایک وکیل ایس ایم ظفر نے ہالینڈ کی اس عدالت میں ڈاکٹر صاحب کے اس مقدمے کی پیروی کی اور جرمنی، انگلینڈ، ہالینڈ اور بیلجیئم کے پروفیسر صاحبان نے بھی اس الزام کو غلط قرار دیا اور ڈاکٹر صاحب کو بری کرنے کی سفارش کی جس پر ہالینڈ کی عدالت نے ڈاکٹر صاحب کو باعزت طور پر بری کردیا۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے وطن کی حفاظت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایٹم کو برائے امن استعمال کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور ایٹم بم کے علاوہ بھی بہت سے دفاعی آلات تیار کیے۔ جس کی وجہ سے 22 مارچ 1989ء کو انہیں پاکستان اکیڈمی آف سائنس کا فیلو منتخب کیا گیا۔

مئی 1998ء میں بھارت کے ایٹمی دھماکے کے جواب میں پاکستان نے بھی جوابی طور پر ایٹمی دھماکے کیے۔ ان کی نگرانی ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے کی تھی، ان دھماکوں کے نتیجے میں پاکستان دنیائے اسلام کی پہلی ایٹمی طاقت بن گیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم ڈاکٹر پر شمالی کوریا اور ایران کو ایٹمی ٹیکنالوجی فراہم

کرنے کا الزام لگا جس کا انہوں نے اعتراف بھی کیا اور بتایا کہ اس معاملے میں افواج پاکستان یا حکومت پاکستان کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ کیا ان کا یہ ایثار کم ہے؟

احمد ذویل (م 2 اگست 2016ء)

نام ونسب: احمد ذویل کا تعلق مصر سے تھا۔ وہ 26 فروری 1946ء کو پیدا ہوئے۔ پورا نام احمد حسن ذویل۔ وہ ایک مصری امریکی سائنسدان تھے۔ انہیں 1999ء میں نوبل پرائز برائے کیمیا ایکی Femtochemi Stry کی خدمات کے صلے میں دیا گیا تھا۔ وہ پہلی مصری سائنسداں تھے جنہیں نوبل انعام دیا گیا تھا۔ کیمیا کے شعبے میں انعام پانے والے یہ مصری سائنسدان فزکس کے پروفیسر تھے۔ انہیں بابائے فیمٹو کیمسٹری بھی کہا جاتا ہے۔

وہ دامن حور نامی مصری قصبے میں پیدا ہوئے اور انہوں نے اسکندریہ میں پرورش پائی۔ یونیورسٹی آف کیلی فورنیا سے ڈاکٹریٹ PHD کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہ 1976ء میں کیلی فورنیا انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے لیکچرار بن گئے۔ 1982ء میں انہیں امریکی شہریت عطا کی گئی۔ احمد ذویل نے اپنی پوری زندگی امریکہ میں صرف کی اور آخری عمر میں وہ امریکی صدر بارک اوبامہ کے مشیروں کی کونسل کے رکن بھی مقرر کر دیئے گئے تھے۔

احمد ذویل نے اپنی بی ایس سی کی ڈگری اسکندریہ یونیورسٹی سے حاصل کی تھی اور ایم ایس سی کے بعد وہ امریکہ چلے گئے تھے۔ جہاں انہوں نے فیمٹو کیمسٹری کی بنیاد رکھی تھی۔

اشفاق احمد (حیات 1998ء)

پاکستان کی وہ عظیم شخصیت جسے پاکستان کے پہلے ایٹمی دھماکوں کے بعد نشان امتیاز دیا گیا

نام ونسب: اشفاق احمد، 3 نومبر 1930ء کو برطانوی ہندوستان کی تحصیل گورداسپور میں پیدا ہوئے۔ 1951ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ 1954ء میں کولمبو پلان کے تحت اسکالرشپ جیتنے کے بعد کینیڈا چلے گئے اور مانٹریال یونیورسٹی سے ایٹمی فزکس میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ پاکستان واپس آنے پر پاکستان اٹامک انرجی کمیشن میں ایک سینئر سائنسداں کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی۔

1962ء سے 1964ء تک وہ مانٹریال یونیورسٹی میں پروفیسر کے عہدے پر فائز رہے اور انہوں نے اوٹاوہ یونیورسٹی کینیڈا میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں۔ 1971ء کے بعد سے اشفاق احمد نے پاکستان کے ایٹم بم پروجیکٹ میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

1991ء میں پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کے چیئرمین منتخب کیے گئے۔ اسی کے دوران انہوں نے حکومت پاکستان کے خصوصی مشیر برائے سائنسی امور کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔

مئی 1998ء میں اشفاق احمد کینیڈا میں مانٹریال لیبارٹریز میں کوانٹم فزکس پر لیکچر دے رہے تھے کہ انہیں بھارت کے ایٹمی دھماکوں کی اطلاع ملی جس کے بعد وہ اپنا کینیڈا کا دورہ ملتوی کر کے پاکستان واپس آ گئے اور انہوں نے ذاتی طور پر پاکستان کی طرف سے کیے جانے والے ایٹمی دھماکوں کی تیاری کی نگرانی کے فرائض ادا کیے۔

28 مئی 1998ء کو چاغی اول کے کوڈ نام سے پہلا دھماکہ کیے جانے کے بعد اشفاق احمد کو وزیراعظم پاکستان نے نشان امتیاز عطا کیا جبکہ ستارہ امتیاز کا قومی نشان انہیں 1989ء میں وزیراعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو پہلے ہی عطا کر چکی تھیں۔

ڈاکٹر ثمر مبارک مند (حیات 1998ء)

پاکستان کے مایہ ناز ایٹمی سائنسداں جو پاکستان کے پہلے ایٹمی دھماکے کرنے والے عملے کے سربراہ تھے۔
نام ونسب: ڈاکٹر ثمر مبارک مند کا تعلق راولپنڈی سے ہے جہاں وہ 17 ستمبر 1942ء کو پیدا ہوئے۔ انہوں نے سینٹ انتھونی ہائی اسکول لاہور سے 1956ء میں میٹرک کیا۔ 1958ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے طبعیات میں گریجویشن کیا۔ 1962ء میں نیوکلیائی طبعیات میں ایم ایس سی کیا۔ 1962ء ہی میں انہیں آکسفورڈ یونیورسٹی انگلینڈ سے ڈاکٹریٹ کرنے کی اسکالرشپ ملی اور 1966ء میں انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ پاکستان واپس آنے پر حکومت پاکستان نے انہیں اٹامک انرجی کمیشن میں خصوصی عہدہ دے دیا۔ 1974ء میں ڈاکٹر عبدالسلام نے انہیں پاکستان کے ایٹمی پروگرام میں شامل کرلیا بعدازاں وہ ایٹمی توانائی کمیشن کے ڈائریکٹر اور ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر فائز رہے۔ 28 مئی اور 30 مئی 1998ء کو ان کی زیرنگرانی پاکستان نے راس کوہ میں چھ ایٹمی دھماکے کیے۔ شاہین اور غوری میزائل کی تیاری میں ان کا کردار فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ حکومت پاکستان نے ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں ستارہ امتیاز اور ہلال امتیاز کے اعزاز سے نوازا ہے۔

ڈاکٹر ثمر مبارک مند پاکستان میں معدنیات کی تلاش کے کئی اہم منصوبوں پر بھی کام کرتے رہیں اور پاکستان کو بجلی کی فراہمی کے میدان میں خصوصی منصوبے بنا کر خودکفیل کرنے کے خواہاں ہیں۔ بلوچستان میں بھی معدنیات کی تلاش کے کئی منصوبوں سے منسلک بھی رہے ہیں۔

خلفائے اسلام

خلفائے بنوامیہ و بنوعباس حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ

مروان بن الحکم
عبدالملک بن مروان
ولید بن عبدالملک
ہشام بن عبدالملک
مروان ثانی
خلفائے بنوعباس رضی اللہ عنہم
ابوالعباس السفاح
المنصور
المہدی
ہارون الرشید
مامون الرشید
المتوکل علی اللہ
المعتضد باللہ
المستعصم باللہ
خلفائے فاطمین مصر
المہدی عبیداللہ
القائم بامراللہ
الحاکم بامراللہ
المستنصر باللہ
الآمر باحکام اللہ
امرائے خلفائے اندلس
عبدالرحمٰن الداخل
ہشام اول
الحکم الاول
عبدالرحمٰن الثانی
عبدالرحمٰن الثالث
الحکم الثانی
المنصور بن ابی عامر

خلفائے بنو امیہ

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ (م 60ھ/680ء)

بانی خلافت اموی دمشق وخلافت اموی اندلس، کاتب وحی، قائد عسکر، نامور صحابی

ان کے والد کا نام ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور والدہ کا نام ہند بنت عتبہ تھا۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا شجرہ نسب پانچویں پشت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرہ نسب سے مل جاتا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں ان کا خاندان بنوامیہ قریش میں معزز ومحترم مانا جاتا تھا اور قریش کا عہدہ سپہ سالاری ان کے پاس پاس تھا۔ ان کے والد ابوسفیان آغاز اسلام سے فتح مکہ تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے سخت دشمن بنے رہے اور معرکہ احد وخندق میں سپہ سالار قریش کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ فتح مکہ کے دن ابوسفیان اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہم دونوں نے اسلام قبول کیا۔ قبول اسلام کے بعد وہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں غزوہ حنین وطائف میں شریک ہوئے، اسی زمانے میں انہوں نے کاتب وحی کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جب شام پر فوج کشی کی گئی تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہم کے بھائی یزید رضی اللہ عنہ بن سفیان ایک فوجی دستے کے افسر تھے۔ رومیوں کے خلاف جب دربار خلافت سے کمک طلب کی گئی تو امدادی دستے کے ہراول کی قیادت امیر معاویہ کے سپرد کی گئی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں جب یزید رضی اللہ عنہ بن سفیان نے وفات پائی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی جگہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو سالار بنادیا۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی تجربہ کاری کے پیش نظر انہیں پورے شام کا والئی بنادیا اور انہوں نے طرابلس، عموریہ اور ملطیہ کے مقامات فتح کیے۔ اس کے بعد وہ قبرص کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کو فتح کرنے کے لیے تاریخ اسلام میں پہلی مرتبہ بحری فوج بنا کر قبرص کو فتح کرلیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کیا گیا تو انہوں نے قصاص عثمان کا دعوئ کر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے انکار کردیا اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جیسے صاحبان تدبیر وسیاست کی تائید انہیں حاصل ہوگئی اور نوبت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صفین کے مقام پر جنگ لڑنے تک پہنچی۔ پھر واقعہ تحکیم کے بعد جب خوارج کا فرقہ پیدا ہوا تو انہوں نے حضرت رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن العاص کو قتل کرنے کی سازش کی۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن العاص بچ گئے جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس سازش کا شکار ہوگئے۔ پھر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت سے دستبرداری کے بعد حضرت امیر معاویہ مسند نشین خلافت ہوئے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے تقریباً بیس سال تک حکومت کی اور

ان کا عہد ایک پر امن عہد ثابت ہوا۔ ان کے عہد میں رومیوں سے بحری جنگیں لڑی گئیں اور خصوصی طور پر قسطنطنیہ پر حملہ کیا گیا جو اگر چہ کامیاب نہ ہو سکا۔

مروان بن الحکم (م 65ھ/ 685ء)

اموی خلیفہ اور مروانی خلفائے بنو اُمیہ کا مورث اعلیٰ

مروان بن الحکم ابن ابی العاص بن امیہ۔ مروانی خلفائے بنو امیہ کا مورث اعلیٰ۔ مکہ یا طائف میں ہجرت سے چند سال پہلے پیدا ہوا۔ اس کے باپ الحکم کو طائف جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ اسی بنا پر اسے کبار تابعین میں شامل کیا گیا ہے۔ تاہم مورخین نے لکھا ہے کہ اس نے بچپن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی تھی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جو اس کے دادا کے بھائی تھے انہوں نے خلیفہ منتخب ہو جانے کے بعد اسے اپنا کاتب مقرر کیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکان پر حملہ ہونے کے دن ''جسے یوم الدار'' کہا جاتا ہے، مروان بھی شدید زخمی ہوا تھا۔ اس کے بعد اس نے جنگ جمل میں بھی حصہ لیا جس میں اسے کئی زخم آئے تھے اس لیے اس نے ایک عورت کے گھر میں پناہ لی تھی بعد ازاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پتا چل گیا تو انہوں نے اسے امان دی اور مدینہ واپس بھیج دیا تھا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں اسے مدینہ منورہ اور حجاز مقدس کا گورنر مقرر کیا تھا۔ اس کام میں اس نے غیر معمولی قابلیت اور مستعدی دکھائی تھی۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد کے آخری چند سالوں میں اسے اس کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا جس کی وجہ سے اس نے یہ سال کسمپرسی میں گزارے۔ جب حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہم نے یزید کی بیعت سے انکار کیا تو مروان نے گورنر مدینہ کو ان کے خلاف طاقت استعمال کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ یزید اول کی وفات کے بعد اس نے شام میں سکونت اختیار کر لی اور معاویہ ثانی کے دربار میں حاضر رہا پھر جب یہ حکمران بھی چل بسا تو وہ بنو امیہ کی قسمت سے مایوس ہو کر ابن الزبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو تسلیم کرنے ہی والا تھا کہ عبید اللہ بن زیاد نے اسے خود خلافت کا امیدوار بنا دیا اور مجلس جابیہ میں اس کی خلافت کا اعلان کر دیا گیا اور اس نے قیسیوں کو شکست دی۔ اس کے عہد میں سیاسی استحکام مفقود رہا اور اس کے زمانہ حکومت میں مسلسل لڑائیاں ہوتی رہیں۔ اس نے ایک تیز معرکہ آرائی کے بعد مصر کو فتح کیا اور پہلے خالد بن یزید کو اپنا جانشین مقرر کیا پھر اپنے بیٹے عبدالملک کو ولی عہد بنایا۔ ستر سال کی عمر میں اس نے 65ھ/ 685ء کو دمشق میں وفات پائی۔ کہتے ہیں کہ اسے یزید اول کی بیوی نے قتل کیا تھا جس سے اس نے خلیفہ بننے کے بعد نکاح کر لیا تھا۔

عبدالملک بن مروان (م 86ھ/ 705ء)

بنو مروان کا دوسرا اور بنو اُمیہ کا پانچواں خلیفہ

ابو ولید، عبدالملک بن مروان نے 65ھ/ 685ء سے 86ھ/ 705ئی تک حکومت کی۔ عام روایت کے مطابق وہ 26ھ/ 646ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی والدہ عائشہ بنت معاویہ بن المغیرہ تھی۔ وہ دس سال کا تھا کہ اس نے مدینہ منورہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر پر باغیوں کا حملہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ سولہ سال کی عمر میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے بوزنطینیوں کے مقابلے پر افواج کا سالار بنا کر بھیجا۔ یزید اول کے عہد میں اہل مدینہ نے اس کے خلاف بغاوت کی تو باغیوں نے مروان اور اس کے بیٹوں کو مدینہ سے نکال دیا۔ پھر اپنے باپ کی موت پر اسے بنی امیہ کے طرفداروں نے خلیفہ

مقرر کیا۔ شروع میں اسے شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر اس نے ان تمام مشکلات پر قابو پالیا اور بالآخر اس نے عراق سے حضرت مصعب بن الزبیر کی حکومت ختم کردی اور حجاز سے حضرت عبداللہ بن زبیر کی حکومت ختم کرنے کے لیے حجاج بن یوسف ثقفی کو زیر قیادت ایک لشکر مکہ بھیجا۔ حجاج نے یکم ذوالقعدہ 72ھ/ 25 مارچ 692ء کو مکہ کا محاصرہ کرلیا۔ چھ ماہ اور کچھ دن کے محاصرے کے بعد حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ نے میدان جنگ میں شہادت پائی اور حجاج حجاز کے سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔

بعدازاں عبدالملک نے حجاج کو کوفہ کا والی بنادیا۔ اس نے سخت گیری سے کام لیتے ہوئے ازارقہ کی بیخ کنی میں کامیابی حاصل کی۔ حجاج نے شامی افواج کے لیے عراق میں ابواسط کی فوجی چھاؤنی تعمیر کی۔ یہ ضمنی واقعہ بنوامیہ کی تاریخ میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ 692ء میں عبدالملک بوزنطینیوں کے خلاف صف آرا ہوگیا کیونکہ قیصر روم نے مسلمانوں کے طلائی سکے دینار کو جائز تسلیم کرنے سے انکار کردیا تھا۔ اپنے پورے عہد میں عبدالملک اندرونی خلفشار اور بیرونی جنگوں میں مصروف رہا مگر اس نے مملکت کے نظم ونسق کو بھی بہتر بنایا اس کے عہد کے آخری سال خوشحالی اور امن واستحکام کے سال تھے۔ اس نے بیت المقدس میں قبۃ الصخرہ جیسی اور دیگر عمارات بھی تعمیر کرائیں۔ آخر میں وہ چاہتا تھا کہ اپنے بھائی عبدالعزیز کو ولی عہدی سے برطرف کر کے اپنے بیٹوں ولید اور سلیمان کو ولی عہد بنائے۔ اس کی یہ تمنا اس طرح پوری ہوئی کہ عبدالعزیز کا انتقال اس سے پانچ ماہ پہلے ہوگیا۔

ولید بن عبدالملک (98ھ/715ء)

مشہور اموی خلیفہ جس کے عہد میں فتوحات اسلام ہند، اندلس اور چین تک پہنچیں۔

ولید اپنے والد عبدالملک کی وفات پر 705ء میں مسند نشین خلافت ہوا اس وقت اس کی عمر 30 سال تھی۔ اس خلیفہ کا عہد تاریخ اسلام میں فتوحات کا دور کہلاتا ہے۔ اس کے عہد خلافت میں برصغیر پاک ہند میں سندھ ملتان، یورپ میں اسپین و پرتگال اور ترکستان میں بلخ و بخارا، سمرقند، فرغانہ، کاشغر اور خوارزم تک فتح ہوئے۔

ولید نے مسند نشین ہوتے ہی ایک طرف شاہانہ طمطراق اور دوسری طرف مذہبی جوش اور ولولہ کی نمائش شروع کردی تھی جو اس کے پیشرو اموی خلفاء میں بالکل مفقود تھی۔ اموی تاریخ میں اس کا مقام اس حکمران خاندان کے معمار کا ہے۔ اس کا پہلا تعمیراتی کارنامہ دارالخلافہ، دمشق میں ایک عظیم الشان مسجد جامع اموی کی تعمیر تھا۔ مسیحی روایات کے مطابق یہ مسجد حضرت یحییٰ علیہ السلام کے گرجا کی جگہ پر تعمیر کی گئی...... بہر حال اس گرجا کی ملکیت کا جھگڑا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور سے چل رہا تھا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور عبدالملک نے عیسائیوں سے اس معاملے میں بہت گفت وشنید کی تھی کہ وہ پورا گرجا دے دیں مگر یہ بے سود رہی تھی۔ ولید نے اس جھگڑے کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں کردیا اور اس گرجا کی ملکیت مسلمانوں کے سپرد کردی۔ تاہم اس نے گرجا کو گرایا نہیں بلکہ صرف مشرقی محراب دار حصے کو منہدم کرایا اور اسے مسجد کی شکل دے دی۔ خلیفہ ولید کے عہد حکومت کی ایک اور خصوصیت تمام نظام حکومت کو عربیت کے سانچے میں ڈھالنا ہے۔ اس نے عربی رنگ کو حکومت کے ہر شعبے میں نمایاں کردیا تھا۔ اس نے مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کی مساجد کی تعمیر نو بھی کرائی تھی اور شامی ماہرین تعمیرات کو اس کام کی نگرانی کا حکم دیا تھا۔ ولید کے بعد اس کے باپ عبدالملک کی وصیت کے مطابق سلیمان کو مسند نشین ہونا تھا مگر ولید اپنے بیٹے عبدالعزیز کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ 22 فروری 715ء کو اس نے وفات پائی۔ مورخین کے مطابق وہ شریعت کا پابند تھا اور علماء سے بھی اچھی طرح پیش آتا تھا۔

ہشام بن عبدالملک (م 125ھ/743ء)

اموی خلافت کا دسواں خلیفہ جس نے 105ھ/724ء سے 125ھ/743ء تک حکومت کی۔ اس کے بھائی یزید ثانی نے اسے اپنا ولی عہد نامزد کیا تھا۔ اس کی وفات کے بعد ہشام مسند نشین ہوا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور اس کے والد عبدالملک کی طرح اس کا دور حکومت بھی طویل رہا اور اموی خلافت کی خوشحالی اور شان و شوکت کا آخری مظہر بھی تھا۔ ہشام نے مسند نشین ہوتے ہی خالد القسری کو عراق کا گورنر مقرر کیا اس نے عراق کو اقتصادی اور زرعی اعتبار سے بڑی ترقی دی۔ اس کے حریف اور جانشین گورنر عراق یوسف بن عمر ثقفی کے دور میں حضرت زید بن علی نے خروج کیا اور ایک مختصر سی جھڑپ کے بعد شہادت پائی مگر ان کے خروج سے ہاشمی دعوت کو تقویت پہنچی۔ اس کے عہد حکومت میں مغربی اطراف میں بوزنطینیوں سے جھڑپیں بھی ہوتی رہیں لیکن کسی بڑی جنگ کی نوبت نہ آئی۔

مسلمہ کے 98ھ/717ء کے قسطنطنیہ کے محاصرے کے بعد سے عربوں کا اس محاذ پر زور کم ہو گیا تھا۔ افریقہ اور اندلس میں بہت سے واقعات رونما ہو رہے تھے جن کی وجہ سے وہاں مرکزی حکومت کا اقتدار خطرے میں پڑ گیا تھا۔ افریقہ کے والئی عبیداللہ بن الحجاب کی متشددانہ کارروائیوں سے برانگیختہ ہو کر بربروں نے وہاں بڑے پیمانے پر بغاوت کر دی اور عرب فوج کو پہلی بار شکست فاش دی، یہ جنگ جنگ اشراف کہلاتی ہے کیونکہ اس میں بڑے بڑے عرب اشراف کام آئے تھے۔ اندلس کے عرب مجاہدین فرانس میں جبل ابرانس سے آگے نکل چکے تھے کہ 732ء میں عبدالرحمٰن غافقی کی شہادت کے بعد عربوں نے آپس میں لڑ کر طاقت ضائع کر دی اور یورپ میں ان کی پیش قدمی رک گئی۔ اتنے پرآشوب عہد کے باوجود کہتے ہیں کہ ہشام نے قصر الحیر کے دو محلات شام میں ندم کے مغرب میں تعمیر کرائے تھے۔ قصر الحیر الغربی کے کھنڈرات سے خود ہشام کی تصویر بھی برآمد ہوئی ہے۔ ہشام کے عہد حکومت کے آخری سال جانشینی کے خرخشوں کی نذر رہے۔ جب وہ اپنے بیٹوں کو اپنا ولی عہد بنانے میں ناکام رہا تو اس نے اپنے بھتیجے ولید ثانی کو اپنا ولی عہد نامزد کر دیا۔ ہشام نے حرکت قلب بند ہو جانے سے 743ء میں انتقال کیا۔

مروان ثانی (132ھ/749ء)

دمشق کا آخری اموی حکمران، مروان بن الحکم کا پوتا

مروان بن محمد بن مروان بن الحکم۔ بنوامیہ کا آخری حکمران جو مروان بن الحکم کا پوتا تھا اور مروان ثانی کہلاتا تھا۔ اس کا باپ محمد بن مروان آرمینیا کا حاکم ہونے کی حیثیت سے کئی سال تک بوزنطینیوں کے خلاف معرکہ آرا رہا۔ اس کی ماں ایک کرد کنیز تھی۔

734ء میں مروان آرمینیا اور آذربائیجان کے حاکم کی حیثیت سے نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ اس عہدے پر وہ بارہ برس تک فائز رہا۔ اسے کوہ قاف کے علاقے میں جنگوں کا تجربہ تھا۔ 126ھ/743ء میں یزید ثالث کی وفات پر اس کا بھائی ابراہیم بن ولید تخت نشین ہوا تو اسے صرف ملک شام کے جنوبی حصے کا حکمران تسلیم کیا گیا۔ مروان مقتول ولید ثانی کے بیٹوں کے حقوق کی حفاظت کے بہانے ملک شام میں داخل ہوا جہاں قیسی فوراً اس سے آملے۔ عین البحر کے مقام پر اس کا کلبیوں سے مقابلہ ہوا جو خلیفہ ہشام کے ایک بیٹے سلمان کے زیر قیادت تھے۔ اس جنگ میں مروان کو فتح ہوئی اور ابراہیم بن ولید دمشق چھوڑ کر چلا گیا جس پر مروان نے دمشق میں داخل ہو کر لوگوں سے اپنی بیعت لی (دسمبر 744ء)۔

دمشق میں انتظامات مکمل کر کے اس نے حران کو اپنا مستقر بنایا۔ اگلے سال جب وہ عراق پر فوج کشی کے لیے روانہ ہوا تو شامیوں نے اس کا ساتھ چھوڑ کر سلیمان بن ہشام کی خلافت کا اعلان کیا۔ مروان کو دوبارہ سلیمان سے جنگ لڑنا پڑی جس میں سلیمان کو پھر شکست ہوئی۔ اس کے عہد میں مشرقی صوبوں میں ابتری پھیلی رہی۔ علوی، عباسی، خارجی بغاوتوں کا اسے سامنا کرنا پڑا۔ ابھی خارجیوں کا سردار ضحاک بن قیس اس کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا تھا کہ خراسان میں عباسیوں کے خروج کی اطلاع ملی چونکہ مروان پہلے ہی مسائل میں گھرا ہوا تھا اس لیے وہ مشرق بعید کی طرف توجہ نہ دے سکا اور عباسیوں نے کوفہ فتح کرنے کے بعد ابوالعباس اسفاح کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ اسی سال جنوری 750ء میں مروان کو جنگ زاب میں شکست ہوئی اور ایک مقام سے دوسرے کی طرف بھاگتا پھرا۔ بالائی مصر میں بوصیر کے مقام پر دشمنوں نے اسے گھیر لیا اور اموی خاندان کا آخری خلیفہ بری بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ آخری خلیفہ بنوامیہ ایک نہایت عقلمند، مدبر اور شجاع انسان تھا اور مروان الحمار کہلاتا تھا۔

خلفائے بنوعباس

ابوالعباس السفاح (136ھ/754ء)

پہلا عباسی خلیفہ جو اپنی خون آشامی کی وجہ سے السفاح کہلاتا ہے۔ عربی لفظ ''سفاح'' کے معنی ''خونخوار'' کے ہیں۔ پہلا عباسی خلیفہ اپنی خون آشامی کی وجہ سے السفاح کہلاتا ہے۔ الحسن بن قحطبہ نے جب کوفے پر قبضہ کر لیا تو اس کے کچھ دن بعد صفر 132ھ/ستمبر 749ء میں السفاح نے آل عباس کے دوسرے افراد کے ساتھ یہاں پناہ لی اور کوفہ ہی میں 12 ربیع الثانی 132ھ/28 نومبر 749ء کو شہر کی جامع مسجد میں اس کی خلافت کا اعلان کیا گیا۔ اس موقع پر اس نے ایک مشہور خطبہ دیا جو کتب تاریخ میں محفوظ ہے۔

ابوالعباس کا پہلا کام یہ تھا کہ امویوں کو کلی طور پر شکست دے دی۔ چنانچہ اس کے چچا عبداللہ بن علی نے دریائے زاب کے کنارے مروان ثانی کو شکست فاش دے کر اس کا تعاقب کیا اور وہ مصر میں مارا گیا اور یوں مروانیوں سے جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد عراق اور شام میں جو بغاوتیں رونما ہوئیں وہ بھی خونریزی سے دبا دی گئیں مگر اس کے باوجود فاتحین شدید انتقامی کارروائیوں پر اتر آئے جن میں سب سے بڑا واقعہ نہر ابی فطرس کا تھا جہاں عبداللہ بن علی نے بنوامیہ کے کوئی 80 کے قریب امراء اور شیوخ کو السفاح کے حکم پر قتل کر دیا اور ان کی لاشوں پر دستر خوان بچھایا، بعدازاں ان لاشوں کو کتوں کے آگے پھاڑنے کے لیے پھنکوا دیا گیا۔ البصرہ اور حجاز میں بھی ایسی ہی انتقامی کارروائیاں کی گئیں۔ خلفائے بنوامیہ کے مقابر تک کی بے حرمتی کی گئی۔ اسی طرح علویوں سے بھی سختی سے پیش آ گیا جو بنوامیہ کے خلاف دعوت خروج کے اصل بانی تھے مگر اس خروج کے ثمرات سے محروم رہ گئے تھے۔ چنانچہ 133ھ/750ء میں اس بغاوت کو بھی فرو کر دیا گیا جو ابومسلم خراسانی حاکم خراسان نے علویوں کی تائید میں کی تھی۔ یوں سررشتہ خلافت مکمل طور پر عباسیوں کے ہاتھ آ گیا اور ان کے دونوں حریفوں یعنی امویوں اور علویوں کا خاتمہ ہو گیا۔ ماوراء النہر میں زیاد بن صالح کی بغاوت کو بھی دبا دیا گیا۔ ابوالعباس نے 136ھ/754ء میں وفات پائی اور اس کے عہد میں عباسی تحریک انقلابی دور سے گزر کر آئینی منزل تک پہنچ گئی۔

المنصور (158ھ/775ء)

دوسرا عباسی خلیفہ جس نے بغداد تعمیر کیا تھا

المنصور، ابو جعفر عبداللہ بن محمد، دوسرا عباسی خلیفہ۔ اس کا ماں سلامہ ایک بربر کنیز تھی اور اس کا بھائی ابوالعباس السفاح تھا جو پہلا عباسی خلیفہ تھا۔ خلافت کے حصول کے لیے بنوامیہ سے جنگیں لڑی گئیں ان میں المنصور نے بھی دادشجاعت دی اور واسط کے محاصرے میں حصہ لیا۔ جسے مروان ثانی کے آخری حمایتی ابن ھبیرہ نے خوب مستحکم کر رکھا تھا۔ ابن ھبیرہ کو اگرچہ دونوں عباسی خلفاء نے معافی دی تھی مگر بعدازاں المنصور نے اسے دھوکے سے قتل کرا دیا۔ السفاح نے المنصور کو آرمینیا، آذربائیجان اور عراق کا والی مقرر کیا تھا۔ 754ء میں ابوالعباس کے انتقال کے بعد المنصور کو خلیفہ بنا دیا گیا۔ اس کے چچا عبداللہ بن علی نے جانشینی کے لیے جھگڑا کرنا چاہا تو اس کو مشہور عباسی جرنیل ابومسلم خراسانی نے شکست دی مگر بعدازاں خود ابومسلم جب علم بغاوت بلند کرنا چاہتا تھا تو اسے المنصور نے راستے سے ہٹا دیا۔ المنصور کے عہد خلافت میں خراسان الہاشمیہ اور مدینہ منورہ میں بغاوتیں رونما ہوئیں جنہیں المنصور نے بڑی سختی سے کچل دیا۔ اُسے خلیفہ کے بھتیجے عیسیٰ بن موسیٰ نے شکست دے کر شہید کر دیا اور پھر ان کے بھائی ابراہیم پر بصرے میں حملہ کیا اور شکست فاش دی۔ حضرت نفس زکیہ اور المنصور میں جو خط و کتابت ہوئی تھی وہ آج بھی تاریخ اسلام کے صفحات کا حصہ ہے۔

رومی سرحدوں پر بھی طبل جنگ بجتا رہا اور المنصور کے عہد میں ان سے بھی مسلسل جنگیں ہوتی رہیں۔ المنصور پہلے پہل اپنے پیشرو کی طرح کوفہ کے قریب الہاشمیہ میں رہائش پذیر تھا۔ بعدازاں اس نے ایک نیا دارالحکومت بغداد تعمیر کرایا اور وہاں منتقل ہو گیا۔ اس نے حکومت کے مالی معاملات کی بھی اصلاح کی اور وہ سلطنت کے تمام صوبوں کے حالات سے باخبر رہتا تھا۔ اس نے ادب کی ترقی میں بھی دلچسپی لی اور وہ خود ایک شاندار خطیب تھا اور دربار میں نغمہ و سرود کو گوارا نہ کرتا تھا۔

المنصور نے حج کے موقع پر 158ھ/775ء میں مکہ کے قریب وفات پائی اور مکہ میں دفن ہوا۔

المہدی (م169ھ/785ء)

تیسرا عباسی خلیفہ، والد خلیفہ ہارون الرشید

ابوعبداللہ محمد، المہدی، تیسرا عباسی خلیفہ۔ جس کا والد المنصور اور والدہ ام موسیٰ جو قدیم حمیری بادشاہوں کے خاندان سے تھی۔ اکتوبر 775ء میں وہ المنصور کی وفات کے بعد تخت خلافت پر بیٹھا اور اپنی شرافت اور فیاضی کی وجہ سے بہت مقبول ہو گیا۔ تاہم اپنے عہد خلافت میں بعض اوقات اُسے انتہائی سخت گیری سے بھی کام لینا پڑا۔ 777ء میں خراسان میں جہاں ہر وقت بدامنی رہتی تھی بغاوت ہوئی اس بغاوت کا سرغنہ یوسف بن ابراہیم تھا اسے شکست دینے کے بعد موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ المہدی کے عہد میں رومیوں کے خلاف بھی جنگ جاری رہی اور اس میں کبھی کبھی بازنطینیوں کا پلہ بھی بھاری رہا مگر مجموعی طور پر مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی اور وہ ابتدائی مہمات میں انقرہ تک پہنچ گئے۔ اس کے بیٹے ہارون نے اس کے عہد میں بازنطینیوں سے معرکہ آرائی کی اور رومی ملکہ آئرین تین سال کے لیے عارضی صلح کرنے اور خراج دینے پر رضامند ہو گئی۔ 168ھ/785ء میں بازنطینیوں نے اس معاہدہ صلح کو توڑ ڈالا۔ المہدی کی وفات تک ان سے جنگ جاری رہی مگر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ المہدی کے عہد ہی میں ایک جھوٹے مدعی الوہیت المقنع نے خروج کیا وہ اپنے جادو کے زور پر ایک چاند ایک کنویں سے طلوع کرتا تھا اور خود ہمیشہ نقاب لیے رہتا تھا۔ بعدازاں اس ڈر سے کہ کہیں شکست کے بعد دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار نہ

ہو جائے اس نے بعہد مہدی زہر کھا کر خودکشی کر لی۔
المہدی نے اپنی سلطنت میں امن وامان قائم کیا اور ترقیاتی کام بھی کروائے۔ نئی سڑکیں بنوائیں، محکمہ ڈاک میں اصلاح کی گئی۔ صنعت وحرفت میں اتنی ترقی ہوئی کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ علماء کو بیش قرار انعامات سے نوازا گیا۔ المہدی ہی کے عہد میں ملک کی آمدنی بے سود مصارف تعیش میں برباد ہونے لگی، جو اس کے جانشینوں کے عہد میں بڑھتی گئی اور عباسی خاندان کے زوال کا سبب بنی۔ المہدی اپنی ملکہ الخیز ران اور اپنے حاجب الربیع بن یونس کے ہاتھوں میں کھیلنے اور ان کے اشاروں پر چلنے لگا تھا۔ الخیز ران نے اس کی وفات کے بعد اپنے بیٹے الہادی کو تخت نشین کیا۔

ہارون الرشید (م193ھ/808ء)

نامور اور ممتاز ترین عباسی خلیفہ اور الف لیلیٰ کا ایک رنگین مزاج کردار

عباسی خلفاء میں ہارون الرشید کا عہد بہت شاندار تھا۔ یہ خلیفہ مہدی کا بیٹا تھا اور اس کی ماں کا نام ملکہ خیزران تھا۔ ہارون کی تعلیم وتربیت بھی خلیفہ مہدی ہی کی نگرانی میں ہوئی۔ خلیفہ مہدی کی وفات کے بعد ہارون اپنے بھائی ہادی کے بعد مسند نشین ہوا۔ (170ھ/786ء) اس وقت اس کی عمر 23 سال تھی۔ ہارون کے عہد میں بغداد دنیا کا بہترین شہر تھا اور اس شہر کی عظمت اس کے شاندار محلات سے قائم تھی۔ یہ شہر اس زمانے میں دینی اور دنیاوی علوم کا مرکز بنا ہوا تھا اور دور دور سے لوگ یہاں علم حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ خلیفہ خود ایک علم دوست اور علما پرور حکمران تھا اس لیے اس کی قدردانی سے پوری دنیائے اسلام سے مختلف علوم وفنون کے ماہرین بغداد آ گئے تھے۔ ہارون کے عہد کے سیاسی حالات کے مطابق اس کے عہد میں بھی شورشیں اور بغاوتیں رونما ہوئیں جو دبا دی گئیں۔ محمد نفس الزکیہ کے چھوٹے بھائی یحییٰ بن عبداللہ نے ایران کی پہاڑی علاقے دیلم میں خروج کیا۔ ہارون نے ان کے مقابلے کے لیے اپنے وزیر فضل برمکی کو بھیجا چونکہ وہ اہل بیت کی طرف مذہبی رجحان رکھتا تھا اس لیے اس نے یحییٰ کو صلح پر آمادہ کر کے اس کو امان دلائی اور بغداد میں آباد کیا۔ بیرونی فتوحات کے لحاظ سے بھی ہارون الرشید کا عہد بہت شاندار تھا۔ قسطنطنیہ کی ملکہ آئرین نے ہارون سے خراج کی ادائیگی پر صلح کی تھی مگر نقفور نامی رومی شہنشاہ نے برسر اقتدار آنے کے بعد خراج کی رقم واپس کرنے کا مطالبہ کیا اور اسلامی قلمرو پر حملہ کر دیا۔ خلیفہ نے بذات خود میدان جنگ میں نقفور کو شکست دی اور اس نے مجبور ہو کر خراج کی ادائیگی پر ملکہ کی طرح صلح کر لی۔ ہارون الرشید کے غیر ملکی شاہان کے ساتھ سفارتی تعلقات بھی اچھے تھے۔ شارلمین نے بغداد میں اپنا سفیر بھیجا تو خلیفہ نے اسے تحفہ میں ایک ہاتھی اور ایک نادر روزگار گھڑی بھیجی تھی۔ اہل رفانس نے سمجھا یہ گھڑی جادو کی بنی ہوئی ہے مگر وہ چابی سے چلتی تھی۔ ہارون الرشید شریعت کا بڑا پابند تھا اور مورخین نے لکھا ہے کہ اس نے نو حج کیے اور وہ ہر روز فرض نماز کے علاوہ ایک سو رکعات نفل بھی ادا کرتا تھا۔ ہارون الرشید نے 193ھ/809ء میں وفات پائی۔

مامون الرشید (م833ء)

سائنسی علوم وفنون کا سرپرست خلیفہ جس نے شاہ روم سے خراج میں قدیم یونانی حکماء کی کتابیں طلب کی تھیں

مامون کی ابتدائی تعلیم وتربیت مشہور وزیر جعفر بن یحییٰ برمکی کی نگرانی میں ہوئی۔ خداداد ذہانت اور اساتذہ کی محنت جلد رنگ لائی اور مامون نے کم عمری ہی میں علوم متداولہ پر دسترس حاصل کر لی۔ چونکہ اس کی والدہ ایرانی النسل تھی اس لیے وہ شروع ہی سے ایرانی تہذیب وتمدن سے متاثر تھا۔ 813ء میں وہ مسند خلافت پر متمکن ہوا مگر بغداد کی بجائے خراسان کے

پایۂ تخت مرو ہی میں ٹھہرا رہا۔ دراصل ان دنوں اقتدار اس کے ایرانی وزیر فضل بن سہل کے ہاتھ میں تھا جو بغداد میں رہائش پذیر تھا۔ اسی وزیر کی غلط حکمت عملیوں کی وجہ سے سرزمین حجاز میں عباسی حکومت کے خلاف کئی شورشیں برپا ہوئیں۔ امام موسیٰ علی رضا نے مامون کو سلطنت کے حالات سے باخبر کیا تو وہ بغداد آ گیا۔ اسی دوران اس کے اشارے پر چند لوگوں نے وزیر فضل بن سہیل کو قتل کر ڈالا۔ یہی رویہ کہتے ہیں مامون نے امام علی رضا کے ساتھ اختیار کیا کہ انہیں اپنا ولی عہد قرار دینے کے باوجود انگور کے دانے میں انہیں زہر دے کر شہید کر دیا۔ 816ء میں ایک ایرانی النسل بابک خرمی نے جھوٹا دعویٰ کیا اور ایک ایسے مذہب کی بنیاد رکھی جس میں اخلاقی اصولوں کی پابندی لازمی نہیں تھی۔ مامون کے عہد میں اس کی سرکوبی کے لیے کئی مرتبہ افواج بھیجی گئیں مگر کامیابی نہ ہوئی کہیں جا کر معتصم باللہ کے عہد میں اس کے فتنے کو دبایا جا سکا۔ مامون کے عہد حکومت میں بازنطینیوں سے بھی جنگوں کا سلسلہ رہا اس کے علاوہ اموی حکمرانوں نے سلطنت کے نظم و نسق کو جو عربی رنگ دیا تھا اب وہ مکمل طور پر ایرانی رنگ میں ڈھل گیا اور سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر اب ایرانی فائز کر دیے گئے۔ مامون الرشید علم و حکمت کا سرپرست اور ایک علم دوست حکمران تھا اس کے عہد میں بے حد علمی ترقی ہوئی۔ یونانی علوم کو فروغ ملا۔ یونانی قدماء کی کتابوں کو ترجمہ کرنے کے لیے دارالحکمت قائم کیا گیا۔ کرۂ ارض کی پیمائش کی گئی۔ فلسفہ، ریاضی اور جیومیٹری جیسے سائنسی علوم پر کتب لکھی گئیں اور علم و ادب کا چرچا عام ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ مامون کو یونانی فلسفی ارسطو خواب میں نظر آیا تھا اور اس نے اسے نصیحت کی تھی۔ بیس سال پانچ ماہ تک حکومت کرنے کے بعد مامون نے 9 اگست 833ء کو وفات پائی۔ اس کا عہد ہر لحاظ سے ایک سنہری عہد تھا۔

المعتصم باللہ (م 227ھ/842ء)

نامور آٹھواں عباسی خلیفہ جس کے عہد میں بے شمار بغاوتیں ہوئیں۔

المعتصم باللہ، ابو اسحٰق محمد عباسی خلیفہ جو 795ء سے 795ء یا 797ء میں پیدا ہوا اور خلیفہ ہارون الرشید اور ایک کنیز ماردہ نامی کا بیٹا تھا۔ اپنے بھائی المامون کے عہد میں اس نے بازنطینیوں کے خلاف جنگوں میں حصہ لیا اور مصر کی ولایت پر بھی متمکن رہا۔

المامون کی وفات پر وہ رجب 218ھ/ اگست 833ء میں تخت خلافت پر متمکن ہوا اس کے تھوڑے عرصے بعد اس کے بھتیجے عباس بن المامون نے جس کی خلافت کا دعویٰ فوج نے کیا تھا اس کی خلافت کو تسلیم کر لیا۔ اسی زمانے میں ایک علوی مدعی خلافت محمد بن القاسم کی بغاوت کو خراسان کے والی عبداللہ بن طاہر نے فرو کر دیا۔

بازنطینی شہنشاہ تھیوفیلوس THEO PHILOS سے عارضی صلح کر لینے کے بعد معتصم نے اپنے سپہ سالار عجیف بن عنبسہ کو بصرے اور واسط کے درمیان آباد زط (جاٹ) قوم کی بغاوت کو فرو کرنے کے لیے بھیجا۔ بابک خرمی جیسے جھوٹے مدعی نبوت کے خلاف مہم المعتصم نے اپنے سالار الافشین حیدر بن کاؤس کی سرکردگی میں بھیجی جسے کہیں دو سال کے بعد 222ھ/ 837ء میں کامیابی نصیب ہوئی۔ خلیفہ معتصم معتزلہ عقائد کا حامی تھا اس وجہ سے لوگ عام طور پر اس سے ناراض ہو گئے تھے۔ اس کے خلاف ناراضگی کی ایک اور وجہ المعتصم کا شوریدہ سر اور پیشہ ور ترک اور بربر سپاہیوں کو اپنی ملازمت میں لینا تھا۔ اسی وجہ سے اس نے سامرا میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد بازنطینیوں سے دوبارہ جنگ چھڑ گئی۔ بازنطینی شہنشاہ اسلامی قلمرو پر حملہ آور ہوا تھا جس کے جواب میں 223ھ/ 838ء میں المعتصم بذات خود جنگ میں کود پڑا اور بہت جلد بازنطینی شہنشاہ کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ طبرستان میں اسپہبد مازیار بن قارن نے بغاوت بھی اسی عہد

میں کی تھی اور حرب المیر قع نے فلسطین میں سرکشی اختیار کی تھی دونوں کو دبا دیا گیا۔ المعتصم نے 18 ربیع الاول 227ھ/842ء کو وفات پائی۔ المعتصم کی ترکوں سے رعایت اور عربوں سے سختی کی پالیسی ہی بعد ازاں خلافت عباسیہ کے زوال کا سبب بنی تھی۔

المتوکل علی اللہ (م 247ھ/861ء)

نواں عباسی خلیفہ جس کے عہد میں ترک سرداروں نے بڑا زور پکڑا اور اسے قتل تک کر دیا

خلیفہ واثق باللہ کی وفات کے بعد 847ء میں اس کا بھائی ایک ترک سردار واصف کی اعانت سے مسند نشین ہوا۔ اس نے المتوکل علی اللہ کا لقب اختیار کیا۔ وہ ایک سخت گیر حکمران ثابت ہوا۔ مامون الرشید اور اس کے دو جانشینوں کے بعد یہ پہلا عباسی خلیفہ تھا جو مذہب معتزلہ کا سخت مخالف تھا۔ اس نے شاہی احکام کے ذریعے نظریہ خلق قرآن اور صفات باری تعالیٰ کے متعلق مباحثے حکماً بند کرا دیے اور ان تمام قیدیوں کو بشمول امام احمد بن حنبل رہا کر دیا جو معتزلہ مذہب کی مخالفت کے سلسلے میں قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے تھے۔ متوکل علی اللہ کے ان اقدامات کی وجہ سے جمہور اسلام نے اسے محافظ سنت کا خطاب دیا کہ اس نے علمائے اہل سنت کو دوبارہ ان کے عہدوں پر بحال کر دیا تھا۔ مگر متوکل ہی کے عہد سے سلطنت عباسیہ کو زوال آنا شروع ہو گیا تھا۔

متوکل کے زمانے میں قیصر روم تھیوڈورا کی فوجوں نے مصر اور سلیشیا پر حملے کر کے ہزاروں مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا مگر متوکل اس قیصر کے خلاف کوئی مؤثر اقدام نہ اٹھا سکا۔ اس کے عہد میں ترک سردار بہت زور پکڑ گئے تھے اور بادشاہ گر بن بیٹھے تھے۔ خود متوکل بھی انہیں کی مدد سے تخت نشین ہوا تھا۔ اس نے ترکوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو کم کرنے کے لیے کئی تدابیر اختیار کیں اور اس سلسلے میں ایک ترک سردار ایتاخ کو قتل بھی کروایا مگر وہ مجموعی طور پر ترک سرداروں کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ آخری ایام میں متوکل نے ہارون الرشید کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے تینوں بیٹوں، منتصر، معتز اور مؤید کو یکے بعد دیگرے اپنا ولی عہد نامزد کیا اور اپنی سلطنت کو ان تینوں میں تقسیم کر دیا مگر بعد ازاں معتز کی ماں کے زیر اثر اس نے معتز کو منتصر پر فوقیت دینا چاہی۔ اس پر منتصر نے ترک سرداروں سے ساز باز کر کے ترک سرداروں کے ذریعے اسے قتل کروا دیا۔

المعتضد باللہ (289ھ/902ء)

ابوالعباس احمد، ایک نامور عباسی خلیفہ،

یہ عباسی خلیفہ ضرار نامی کنیز اور خلیفہ المعتمد کے نائب سلطنت الموفق کا بیٹا تھا۔ الموفق کی زندگی کے آخری دو سالوں میں المعتضد حقیقی معنوں میں خود ہی بادشاہ تھا اور جب رجب 279ھ اکتوبر 892ء میں المعتمد کا انتقال ہوا تو وہ اس کی جگہ تخت نشین ہو گیا۔ یہ نیا خلیفہ جس نے اپنے والد کی تمام صفات حکمرانی ورثے میں پائی تھیں اور جو عسکری قابلیت اور کفایت شعاری میں بھی ممتاز تھا۔ اپنی سختی اور بے رحمی کے باوجود عباسیوں کے سب سے بڑے خلفاء میں شمار ہوتا ہے۔ المعتضد کی تخت نشینی کے بعد طولونی خمارویہ نے طویل جنگ سے تنگ آ کر صلح کر لی اور اپنی بیٹی کی شادی خلیفہ سے کر دی۔ خوارج عراق اپنے باہمی نفاق کی وجہ سے کمزور ہو چکے تھے۔ اس لیے المعتضد نے باغی بنو شیبان کے خلاف ایک عسکری مہم بھیج کر مطیع کر لیا۔

اگلے دو سالوں میں ایک اور خارجی سردار ہارون بن عبداللہ کو شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ اسی زمانے میں سامانیوں نے صفاریوں اور علویوں کو دبا کر اپنی طاقت بڑھا لی۔ صفاری عمرو بن اللیث کو گرفتار کر کے بغداد لایا گیا۔ قرامطہ

اسی زمانے میں میدان میں نمودار ہوئے انہوں نے اپنے سردار الجناجی کی سرکردگی میں خلیفہ کی افواج کو شکست دی۔ المعتضد 22 ربیع الثانی 289ھ 5 اپریل 902ء کو بعمر 40 یا 47 سال فوت ہو گیا۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ اسے زہر دے کر ہلاک کیا گیا تھا۔

المعتضد عباسی خلفاء میں ایک نہایت شجاع، عقل مند اور مدبر شخص تھا۔ اس نے اپنے حسن تدبیر سے رو بہ تنزل عباسی خلافت کی شان وشوکت کو بحال کر دیا تھا۔ اس کا بڑا کارنامہ ترک فوجی افسروں کا زور توڑنا تھا۔ اس کے حسن انتظام سے ملک میں امن وامان قائم ہو گیا تھا اور رعایا فارغ البال اور خوشحال ہو گئی تھی۔ وہ دیندار، بدعات کا دشمن اور رعایا کے اعمال اور اخلاق کی اصلاح کرنے والا حکمران تھا۔

المستعصم باللہ (م656ھ/1258ء)

بغداد کا آخری خلیفہ بنو عباس جسے ہلاکو خان نے نمدے میں لپٹوا کر ہلاک کر دیا۔

ابو احمد عبداللہ بن المستنصر، 609ھ/1212ء میں پیدا ہوا اور اپنے والد کی وفات کے بعد جمادی الاول 640ھ/ نومبر 1242ء میں مسند نشین ہوا۔ اس میں اتنی عسکری قابلیت نہیں تھی کہ وہ تاتاریوں کے خطرے کو ٹال سکتا۔ اس کے مشیر بھی انتہائی نالائق اور ناعاقبت اندیش تھے۔ وہ ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں مصروف کار تھے اور ان میں کبھی اتفاق رائے نہیں ہوتا تھا۔ ابن علقمی جیسے لوگ عباسیوں سے اقتدار کو چھنوا دینے کے حق میں تھے۔ 653ھ/1255ء میں ہولا گو خان مغول نے خلیفہ سے مطالبہ کیا کہ وہ اسماعیلیوں کے ساتھ جنگ میں تاتاریوں کے ہاتھ مضبوط کرے تاہم خلیفہ نے اس مطالبے کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ ربیع الاول 655ھ/ مارچ اپریل 1257ء میں ایک تاتاری سفیر بغداد آیا اور اس نے مطالبہ کیا کہ المستعصم شہر کی فصیلوں کو مسمار کرا دے اور بذات خود ہلاگو خان کے دربار میں حاضری دے یا اپنے معتمد کو بھیجے تا کہ مزید گفت وشنید ہو سکے۔ جب خلیفہ نے ان مطالبات کی تعمیل سے انکار کیا تو ہلاگو خان نے جنگ کی دھمکی دے دی۔ جس کے جواب میں خلیفہ المستعصم نے بھی ایک پیغام میں ہولاگو کو خوفزدہ کرنے کی کوشش کی مگر اس کے فوراً بعد ہلاگو خان بغداد پر حملہ کرنے کے لیے روانہ ہو گیا، راستے میں اسے خلیفہ کا ایک سفیر ملا جس نے اسے خراج کی ادائیگی کی پیشکش کی مگر بے رحم تاتاری کسی طور پر راضی نہیں ہوا اور محرم 656ھ میں تاتاری فوجیں بغداد کے دروازوں کے سامنے آموجود ہوئیں اور محاصرہ کر لی گیا۔ جب نئی گفت وشنید کی کوششیں بھی بے کار ثابت ہوئی تو 4 صفر/10 فروری کو خلیفہ المستعصم ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو گیا جس کے بعد بغداد کو لوٹ کر تباہ کر دیا گیا۔ ہلاگو خان نے خلیفہ المستعصم کو مع اس کے چند رشتہ داروں کے قتل کرا دیا اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ دریائے دجلہ کا پانی قتل عام کی وجہ سے پہلے سرخ اور شہر کی لائبریریوں اور دیگر عمارات کو جلوا دینے کی وجہ سے سیاہ ہو گیا۔

خلفائے فاطمین مصر

المہدی عبیداللہ (322ھ/934ء)

پہلا فاطمی خلیفہ

مورخین کے مطابق اس کی اصل نسل غیر معلوم ہے۔ اسے سعید بھی کہتے ہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ایران کے مشہور و معروف اسماعیلی مقتداء عبداللہ بن میمون القداح کا پوتا تھا، لیکن اس کا اپنا دعویٰ یہ تھا کہ وہ صحیح النسب سید، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہے۔ بعض لوگ اسے بارہویں امام کا بھائی سمجھتے ہیں۔ اس کی حیرت انگیز اقبال مندی عین اس وقت عروج پر پہنچی جب جواز خلافت کے پیچیدہ مسئلے پر، جس میں امامت اور ظہور مہدی منتظر کے باطنی عقائد کو بھی بڑا عمل دخل تھا، اہل تشیع سرگرم عمل ہو گئے۔ اسی دور میں اسماعیلی دعوت نقطہ عروج پر پہنچی اور اس میں قرامطہ عرب کا الحاد بھی اس کے شامل حال تھا۔

شمالی افریقہ میں فاطمی بغاوت اپنے نازک مراحل سے گزر رہی تھی ایک داعی ابوعبداللہ اس کا سب سے بڑا محرک تھا۔ اس نے نقیب مہدی ہونے کا دعویٰ کیا ہوا تھا۔ بہرکیف عبیداللہ کو تاج و تخت اسی کے ذریعے سے حاصل ہوا تھا۔ عبیداللہ شامی شام میں سلمیہ کے مقام سے قیروان کی طرف نقل و حرکت کرنے میں مصروف تھا۔ مصر میں وہ ایک تاجر کے بھیس میں وارد ہوا تو وہاں کے شکی مزاج گورنر کے ہاتھوں قید و بند کی مصیبت میں پڑنے سے بال بال بچا۔ مگر وہ آخر میں عباسیوں کے ایک حلیف قبیلے سجلماسہ کے لوگوں نے اسے اور اس کے بیٹے کو ایک کال کوٹھڑی میں ڈال دیا۔ اسی دوران اس کے سپہ سالار نے بنی کتامہ نامی قبیلے کی مدد سے سجلماسہ فتح کر لیا اور عبیداللہ کو رہا کرا کے اس کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ اقتدار اعلیٰ تک پہنچنے کے بعد عبیداللہ نے اپنی مملکت کی حدود کو وسیع کرنے کی حکمت عملی اختیار کی۔ ابوعبداللہ اب اس کا ماتحت تھا۔ وہ دل برداشتہ ہو کر بربروں کو بغاوت پر اکسانے لگا تو مہدی نے اسے اور اس کے بھائی کو گرفتار کر کے قتل کروا دیا۔ جلد ہی اس کی مملکت کی سرحدات مصر سے مراکش تک وسیع ہو گئیں۔ اس نے مہدیہ کو قیروان کی بجائے دارالخلافہ قرار دیا اور اُسے اس زمانے کا ترقی یافتہ شہر بنا کر چھوڑا۔ پچیس سال حکومت کرنے کے بعد عبیداللہ نے 322ھ/934ء میں وفات پائی۔

القائم بامراللہ (م334ھ/946ء)

بنو فاطمہ کا دوسرا خلیفہ اور فاطمی سلطنت کی بنیادیں مستحکم کرنے والا فرمانروا

ابوالقاسم عبدالرحمٰن، 280ھ/893ء میں پیدا ہوا اور 322ھ/934ء میں اپنے والد عبیداللہ المہدی کی جگہ تخت

نشین ہوا اس نے اپنا ذاتی نام محمد رکھا اور تخت نشینی کے وقت القائم بامر اللہ کا لقب اختیار کیا۔ اس کے والد نے اسے 298ھ/911ء میں اپنا ولی عہد نامزد کیا تھا اور خطبہ جمعہ میں بھی اس کا نام لینے کا حکم جاری کیا تھا۔

اپنے والد کے عہد میں وہ فوج کا سالار رہا اور اس نے اکثر عسکری مہمات کی قیادت کی تھی یہاں تک کہ قسطنطنیہ اور طرابلس کی تسخیر اور فتح مصر کی اس کوششیں قابل قدر ہیں۔ مصر کے خلاف دوسرے معرکے میں اس نے اسکندریہ اور گیزہ کو فتح کیا اور فیوم پر قابض ہو گیا تھا اور اس نے فاطمی حکومت کو برقہ تک مستحکم کر دیا تھا۔

تخت نشینی کے بعد اس نے ایک مذہبی حکمت عملی کے تحت خود کو المہدی کا بیٹا مشہور کر دیا۔ 928ء میں شہر مسیلہ کو ترقی دے کر اپنا دارالخلافہ بنایا اور اس کا نام المحمدیہ رکھا۔ بعدازاں اپنے عہد میں اس نے ساحل فرانس تک اپنا بحری بیڑا بھیجا جہاں اس کے جہازیوں نے خوب لوٹ مار کی اور اطالوی بندرگاہ جینوا پر بھی قبضہ کر لیا۔

935ء میں اس نے 10 ہزار کی ایک فوج مصر کے خلاف روانہ کی اور اسکندریہ فتح کر لیا، لیکن چند روز بعد عباسی عامل کے بھائی محمد بن طغج الاخشید کے ہاتھوں شکست کھائی۔ خود اپنے ملک میں بھی وہ باغی قبائل کے خلاف ایک طویل عرصہ تک نبرد آزما رہا۔ القائم فاطمی عقاید کا ایک پر جوش اور سرگرم علم بردار تھا۔ اس کا عہد لگاتار لڑائیوں کا دور ثابت ہوا۔ اس لیے اس کی دلیری اور مستقل مزاجی سے مورخین انکار نہیں کرتے۔ اس نے اپنے اخلاف کی عظمت وشان کے لیے محکم بنیادیں رکھ دیں۔ اس کے عہد میں چونکہ جنگوں پر زور تھا اس لیے اس کے لیے زمانہ امن کے کاموں پر توجہ دینا ممکن نہ ہو سکا۔

الحاکم بامر اللہ (411ھ/1021ء)

چھٹا فاطمی خلیفہ جو اپنی انتہا پسندیوں، ظلم وتشدد، دعویٰ الوہیت اور پر اسرار خاتمے کی وجہ سے مشہور ہے ابو علی منصور بن العزیز باللہ نزار۔ اس کی شخصیت کا صحیح تصور قائم کرنا مشکل ہے اس نے اپنے عہد میں کئی ایسے اقدامات کیے جو بہت ہی عجیب بلکہ ناقابل توجیہ ہیں اور اس کا کردار تضادات کا مجموعہ نظر آتا ہے۔

الحاکم قاہرہ میں 23 ربیع الاول 375ھ/ 985ء میں پیدا ہوا۔ اپنے والد کی وفات پر وہ صرف ساڑھے گیارہ سال کی عمر میں مسند نشین ہوا۔ اس کی شخصیت صحیح طور پر 390ھ/ 1000ء کے بعد ظاہر ہونے لگی۔ اس کا اتالیق جو اس کے ابتدائی دور حکومت میں اقتدار پر قابض تھا اسے محل کے اندر بند رکھتا تھا اور اُسے توہین آمیز ناموں سے پکارنے لگا تھا۔ اس لیے اس نے اسے اپنے ایک غلام کے ہاتھوں اسے قتل کروا دیا۔ اس قتل اور سرد مہری ہی سے اس کے خون آشام میلانات کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے بعد الحاکم ایک مطلق العنان حکمران کی حیثیت سے حکومت کرنے لگا۔

الحاکم کے عہد کی اہم خصوصیات یہ تھیں کہ مذہبی اقدامات اور اخلاقی ومعاشی نوعیت کے فرامین کو ایک سے زائد بار منسوخ کیا گیا۔ پھانسی کے بہت سے واقعات دوسری طرف ایسے مواقع بھی نظر آتے ہیں جن میں الحاکم نے نہایت سادگی، انکسار اور زہد ورواداری اور انصاف کا مظاہرہ کیا۔

393ھ/ 1003ء میں اس نے شراب کی ممانعت اور شراب کے مٹکے توڑنے کا حکم جاری کر دیا۔ شراب کی ممانعت اس کے عہد میں کئی بار کی گئی۔ اسی طرح عیدالاضحیٰ کی نماز ادا کرنے پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ 399ھ/ 1009ء میں اس نماز کی ادائیگی کی اجازت دے دی گئی۔ رمضان میں تراویح پڑھنے اور اذان میں ''حیّ علیٰ خیر العمل'' کی بجائے سنی مسلک کے مطابق ''الصلوٰۃ خیر من النوم'' کہنے کی اجازت دے دی گئی تاہم 403ھ/ 1012ء میں دوبارہ حیّ علیٰ کی طرف دوبارہ رجوع کرنے کا حکم دیا گیا۔ اسی متلون مزاجی کی وجہ سے شیعہ سنی کشیدگی نے بڑھ کر فسادات کی شکل اختیار کر لی اور اسے

اپنا بعد کا فرمان منسوخ کرنا پڑا۔ اس کا عجز و انکسار اور زہد بھی قابل ذکر۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تصوف کی طرف ہمیشہ سے اس کا میلان پایا جاتا تھا۔ اس نے دو بڑے اسلامی تہواروں کو جلوس اور زیورات کے بغیر منانے پر بڑا زور دیا، کھانے پینے اور جسمانی لذتوں میں بھی اس نے زہد و ورع اختیار کیا۔ الحاکم کی زندگی کی طرح اس کا انجام بھی غیر معمولی ہوا۔

27 شوال 411ھ/ فروری 1021ء کو وہ رات کے وقت سیر کے لیے نکلا اور اپنے درباریوں سے بچھڑ گیا پھر اسے دوبارہ کبھی نہیں دیکھا گیا۔ پانچ دن بعد اس کا لباس خنجر کی نوک سے تار تار کیا ہوا ملا۔ اس کی گم شدگی کا معمہ کبھی حل نہ ہو سکا۔

المستنصر باللہ (م 487ھ/ 1094ء)

آٹھواں فاطمی خلیفہ جس نے 60 سال کے طویل عرصہ تک حکومت کی۔

اپنے والد خلیفہ الظاہر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا 1035ھ میں مسند نشین ہوا۔ اس کا مکمل نام ابو تمیم معد بن علی الظاہر تھا اس نے المستنصر باللہ کا لقب اختیار کیا۔ اس کی عمر تخت نشینی کے وقت صرف سات سال تھی۔ اس لیے تمام سیاسی اختیارات شروع میں اس کی والدہ کے ہاتھوں اور وزراء کے پاس رہے۔ اس کے ساٹھ سالہ عہد حکومت ملک خانہ جنگی، باہمی رقابتوں اور شورشوں کا شکار رہا۔ اسی عہد میں بربروں اور ترکوں کے درمیان باہمی چپقلش کا بازار گرم ہوا۔ اس کے نتیجے میں حجاز اور یمن کے صوبے فاطمیوں کے قلمرو سے نکل گئے۔ شمالی افریقہ میں بھی فاطمی مقبوضات میں بے حد کمی ہوئی۔ علاوہ ازیں اس خلیفہ کے عہد میں دریائے نیل میں سیلاب نہ آنے کی وجہ سے ایک زبردست قحط پڑا جو سات سال تک جاری رہا جس سے بے شمار افراد موت کا شکار ہو گئے۔ ان مصائب کی وجہ سے مصر تباہ ہو کر رہ گیا۔ تاہم اس کلیفہ کے عہد میں علمی اور تہذیبی سرگرمیوں کو فروغ ملا۔ فاطمین مصر اپنے ہم عصر عباسی حکمرانوں کی طرح ہی علوم و فنون کے دلدادہ تھے۔ ان کے عہد میں مصر میں پبلک لائبریریاں اور مختلف تعلیمی و سائنسی ادارے قائم کیے گئے۔ ان کی تہذیب میں ایرانی لطافت نمایاں تھی۔ ناصر خسرو، مشہور اسلامی سیاح فاطمی خلفاء کے سنہری عہد میں مصر و فلسطین کی سیاحت کے لیے وہاں پہنچا تھا۔ اس 1046ء میں وہاں کی سیاحت کی تھی۔ اس نے مصر کی شان و شوکت کے متعلق لکھا تھا۔ اس ملک کی دولت و ثروت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا اور یہاں کے باشندے دوسرے اسلامی ممالک کے باشندوں کے مقابلے میں زیادہ فارغ البال ہیں۔

الآمر باحکام اللہ (م 524ھ/ 1130ء)

دسواں فاطمی خلیفہ، ابو علی منصور۔

وہ 12 محرم 490ھ/ 31 دسمبر 1096ء ہے۔ وہ ابھی پانچ سال کا بچہ تھا کہ وزیر الافضل نے اس کے والد کلیفہ المستعلی کی وفات 14 صفر 495ھ/ 1101ء کو اسے مسند نشین خلافت کر دیا۔ تاہم اس کے بچپن میں تقریباً 20 سال تک زمام حکومت وزیر افضل کے پاس رہی۔ 515ھ/ 1121ء میں خلیفہ المستعلی کے بھائی نزار کے آدمیوں نے الافضل کو قتل کر دیا، لیکن اس قتل کی سازش میں خلیفہ کو شریک ٹھہرایا۔ الافضل کی جگہ المامون بن البطائحی وزیر مقرر ہوا مگر وہ بھی اپنی باری پر 4 رمضان 519ھ/ 1125ء کو قید کر دیا گیا۔ اس کے بعد کوئی نیا وزیر مقرر نہ ہو سکا۔ ایک عیسائی صدر محصل نجاح بن قناء کا بہت اثر رسوخ رہا مگر آخر وہ بھی 523ھ/ 1129ء میں گرفتار ہو کر مارا گیا۔

الافضل کے عہد وزارت میں صلیبیوں کے مقابلے میں کچھ سرگرمیاں بھی دکھائی گئیں تھیں اور الافضل کے بیٹے سناء الملک الحسین کے زیر قیادت متعدد مہمات صلیبیوں کے خلاف بھیجی گئیں مگر اس کے باوجود فلسطین اور شام کے ساحلی علاقے کا

بیشتر حصہ صلیبیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ 1117ء میں بالڈون BALDWIN شاہ یروشلم نے خود مصر پر چڑھائی کی اور فرما پر قبضہ کرکے آگے بڑھا مگر بیمار ہو جانے کی وجہ سے راستے ہی میں مر گیا۔ مصر پر اس عہد میں بربروں کے لواتہ قبائل نے بھی یلغار کی تھی اور وہ اسکندریہ تک پہنچ گئے تھے لیکن وزیر المامون نے انہیں پسپا کر دیا تھا۔ الآمر کے عہد میں نزاری فرقے کے اختلاف کی وجہ سے فاطمی خاندان اسماعیلی اعتزالیوں کے حصہ غالب کی حمایت سے محروم ہو گیا۔ اسی وجہ سے وزیر المامون نے ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی تاکہ نزاری فرقے کے گماشتے مصر میں داخل نہ ہو سکیں۔ 524ھ/1130ء میں الآمر کے ہاں ولی عہد خلافت پیدا ہوا جس کا نام طیب رکھا گیا مگر یہ معلوم نہیں کہ اس کا انجام کیا ہوا۔ 2 ذوالقعدہ 524ھ/18 اکتوبر 1130ء کو خلیفہ الآمر نزاریوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا اور ناگہانی تغیر کا دور شروع ہو گیا۔

امراء وخلفائے اندلس

عبدالرحمٰن الداخل (م 172ھ/788ء)

عباسی انقلاب سے بچ کر اندلس پہنچنے اور وہاں خودمختار اموی سلطنت قائم کرنے والا شہزادہ

مسلمان 711ء میں ہسپانیہ میں اس زمانے میں داخل ہوئے تھے جب اسلامی فتوحات کا دائرہ دنیا کے تین براعظموں میں بڑھتا جا رہا تھا۔ ایشیا، افریقہ اور یورپ میں ان کی فاتحیت کے پھریرے اڑ رہے تھے۔ پھر جب عباسیوں کو غلبہ حاصل ہوا تو امویوں کی قبائے خلافت پارہ پارہ ہوگئی اور اس خاندان کا ایک فرد شام سے ایسی حالت میں نکلا کہ قدم قدم پر موت اس کی گھات میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک مقام پر اس نے دریائے فرات میں چھلانگ لگا کر اپنی جان بچائی۔ اس کے پاس کوئی فوج تھی نہ خزانہ وہ صرف نصرت الٰہی کی امید پر بھروسہ کر کے طوفانوں کو چیرتا ہوا ہسپانیہ پہنچا اور اس نے وہاں ایک ایسی سلطنت کی بنیاد رکھ دی جس کے کارناموں کی گونج اقصائے عالم تک پھیلی اور جو یورپ میں پھیلے ہوئے جہالت کے اندھیروں میں علم وتہذیب کا مینارہ نور بنی رہی۔ یہ تھا عبدالرحمٰن الداخل جو ہسپانیہ میں بنوامیہ کا پہلا سلطان تھا۔

عبدالرحمٰن الداخل 731ء میں پیدا ہوا اور پانچ برس کی عمر میں یتیم ہوگیا۔ اس کے دادا خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے بڑے اہتمام سے اس کی پرورش کی۔ بیس برس کا ہوا تو عباسی انقلاب نے بنوامیہ کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا اور عبدالرحمٰن الداخل کو دمشق چھوڑ کر بھاگنا پڑا اس کے ساتھ اس کا چھوٹا بھائی اور بیٹا بھی تھا وہ دریائے فرات کے کنارے پناہ گزین تھے کہ عباسی فوج ان کی تلاش میں وہاں پہنچ گئی اور عبدالرحمٰن دریائے فرات عبور کر گیا جبکہ اس کا بھائی عباسیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ افریقہ پہنچنے پر عباسی گورنر نے اسے گرفتار کرنے کی کوشش کی مگر ایک سردار کی بیوی نے اسے اپنے کپڑوں میں چھپا کر بچا لیا۔ افریقہ سے بحرظلمات کو عبور کر کے جب عبدالرحمٰن اندلس پہنچا تو اس کی قسمت جاگ اٹھی اور اس نے صرف سات سو افراد کے لشکر کے ساتھ قرطبہ فتح کر لیا۔ عبدالرحمٰن الداخل فاتح کی حیثیت سے قرطبہ میں داخل ہوا اور اس نے ہسپانیہ میں پھیلی بدنظمی کو اپنی سیاسی سوجھ بوجھ سے دور کر دیا اور ہسپانیہ میں اموی سلطنت قائم کر دی ابھی عبدالرحمٰن نے سکھ کا سانس نہ لیا تھا کہ فرانس کے عیسائی بادشاہ شارلیمین نے مسلم ہسپانیہ پر حملہ کر دیا مگر عبدالرحمٰن نے پامردی سے اسے بھگا دیا۔ تعمیرات میں امیر کا سب سے بڑا کارنامہ جامع قرطبہ کی تعمیر ہے جو آج بھی قرطبہ میں موجود ہے۔

ہشام اول (م 180ھ/796ء)

قرطبہ کا دوسرا اموی امیر اور خلیفہ عمر بن عبدالعزیز جیسا پرہیزگار اموی

ابوعلید الرضی، العادل بن عبدالرحمان اول، قرطبہ کا دوسرا اموی امیر جس نے 788ء سے 796ء تک حکومت کی۔ وہ اپنے مستعد اور ہوشیار باپ کے مقابلے میں متقی، رحم دل اور منصف مزاج تھا تاہم وہ اپنے باغی بھائیوں کے مقابلے میں اپنی امارت قائم رکھنے میں کامیاب رہا۔ اس نے کئی عشروں کے بعد ایک بار پھر اسلامی لشکر کے ساتھ شمال میں مسیحی ممالک کی جانب پیش قدمی کی بلکہ جنوبی فرانس میں بڑھتے ہوئے ناربون تک پہنچ گیا۔ اندرون ملک اس نے سب سے پہلے اپنے مدنی ہم عصر امام مالک بن انس کے مذہب فقہ کو اندلس میں تقویت پہنچائی اور اس مسلک کو اندلس کا سب سے مقبول مسلک بنا دیا۔ اس نے قرطبہ کی جامع کبیر کو جس کی بنیاد اس کے والد عبدالرحمٰن نے رکھی تھی پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ وادی الکبیر پر عامل السمح کے تعمیر کردہ پل، القنطرہ کو جو خستہ ہو گیا تھا نئے سرے سے تعمیر و مرمت کرایا۔ اس قابل حکمران کا انتقال صرف 47 برس کی عمر میں صرف 8 سال تک حکومت کرنے کے بعد ہو گیا اور اس کے بعد اس کا بیٹا الحکم اول اس کا جانشین ہوا۔

اس نیک دل حکمران کا آٹھ سالہ عہد حکومت کئی ایک شورشوں کے باوجود پر امن دور کہلاتا ہے کیونکہ ان شورشوں سے اندلس کی عوام زیادہ متاثر نہ ہوئی اور لوگ بحیثیت مجموعی خوشحال زندگی بسر کرتے تھے۔ علاوہ ازیں خلیفہ نے سرکاری اہل کاروں کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ تمام ٹیکس اسلامی قوانین کے مطابق وصول کریں۔ وہ خود اتنا انصاف پسند تھا کہ اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بالکل سادہ لباس پہنتا، غریبوں کی شکایات سنتا اور عوام کے مسائل دور کرنے کے لیے راتوں کو سادہ لباس میں قرطبہ کے گلی کوچوں میں گشت کرتا تھا۔

اس کی امام مالک سے عقیدت کی وجہ سے اس کے عہد حکومت میں علما و فقہا کی قدر و منزلت بڑھ گئی تھی۔

الحکم الاول (206ھ/822ء)

قرطبہ کا تیسرا اموی امیر اور ایک اہم حکمران

الحکم بن ہشام بن عبدالرحمٰن، ابوالعاصی، قرطبہ کا تیسرا اموی امیر۔ اس کے والد امیر ہشام نے اپنے سب سے بڑے بیٹے عبدالملک کی بجائے الحکم کو ولی عہد نامزد کیا تھا۔ چنانچہ اپنے والد کی وفات کے بعد 3 صفر 180ھ کو الحکم کی قرطبہ میں بیعت کی گئی۔ اس کی الحکم کی عمر چھبیس سال تھی۔ اس کے دونوں چچا سلیمان اور عبداللہ اس کے خلاف ہو گئے اور خود امیر بننے کے خواب دیکھنے لگے اور یہاں تک کہ عیسائی بادشاہ شارلیمن سے ساز باز کرنے لگے۔ سلیمان 182ھ میں قرطبہ پر حملہ بھی کیا مگر اسے شکست ہوئی۔ عبداللہ کو اس شرط پر معافی دی گئی کہ وہ بلنسیہ نہیں چھوڑے گا۔ چنانچہ عبداللہ نے اپنی باقی ماندہ عمر وہیں گزار دی۔

الحکم کا پورا عہد ان بغاوتوں کو فرو کرنے میں گزرا جو طلیطلہ، سرقسطہ اور ماردہ کی سرحدوں پر متواتر ہوتیں رہیں۔ اس کے ایک امیر طلیطلہ نے "یوم خندق" کے مشہور واقعے میں بہت سے باغی مولد امراء کو قتل کروا کر اہل طلیطہ کی مزاحمت ختم کر دی۔ ان سرحدی بغاوتوں کے علاوہ خود دارالحکومت قرطبہ میں بھی الحکم کے خلاف دو بڑی بغاوتیں ہوئیں۔ جمادی الاول 189ھ/مئی 805ء میں حکم اول کو معزول کر کے اس کی جگہ محمد بن قاسم کو تخت نشین کرنے کی سازش بھی پکڑی گئی جس کے نتیجے میں قرطبہ کے 72 امراء کو پھانسی دی گئی۔ اندرونی بغاوتوں کے نتیجے میں عیسائیوں نے بیرونی حملے بھی شروع کر دیئے جنہیں

الحکم نے بڑی بہادری سے پرے دھکیل دیا اور پرشلونہ پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ الحکم کا عہد حکومت مسلسل بغاوتوں اور لڑائیوں کے باوجود اندلس کی ترقی کا دور تھا۔ الحکم اندلس کا بڑا صاحب عزیمت وبصیرت، پرشکوہ اور مدبر فرمانروا تھا۔ وہ پہلا امیر یا خلیفہ تھا جس نے اندلس میں باقاعدہ تنخواہ دار فوج رکھی اور اسے اسلحہ سے خوب لیس کیا۔ اس کے محل کے دروازے پر ہر وقت ایک ہزار گھڑ سوار فوجی تیار کھڑے رہتے تھے۔ دشمنوں کے ساتھ سخت گیری سے پیش آنے کے باوجود وہ ایک عدل پرور حکمران تھا۔

عبدالرحمٰن الثانی (م 238ھ/852ء)

الحکم الاول کا جانشین اور اندلس کا ایک قابل وزیرک حکمران

عبدالرحمٰن ثانی، عبدالرحمٰن الداخل کا پڑپوتا اور الحکم اول کا بیٹا تھا۔ وہ 21 مئی 822ء کو اپنے والد الحکم کی وفات کے بعد اس کا جانشین بنا۔ وہ 176ھ/792ء میں اندلس کے مشہور شہر طلیطلہ میں پیدا ہوا تھا۔ عبدالرحمٰن ثانی کے عہد کے آغاز میں اس کے والد کے آہنی طرز حکومت کے خلاف کچھ بغاوتیں رونما ہوئیں جنہیں آسانی سے دبا دیا گیا۔ طلیطلہ میں اسی دوران بڑے پیمانے پر بغاوت رونما ہوئی جسے 837ء میں سرکاری فوجوں نے دبا دیا۔

انہیں ایام میں عبدالرحمٰن ثانی نے اندلس کی سرحدوں پر عیسائیوں کے خلاف بھی عسکری مہمات بھیجیں اور امیر نے بذات خود عیسائی ریاست لیون کے خلاف کئی مہمات کی قیادت کی۔ اس کے عہد میں دو اہم سیاسی واقعات رونما ہوئے۔ ایک یہ کہ طلیطلہ اور قرطبہ کے عیسائی مضاربہ نے قوم پرستی کے نام پر بغاوت کردی۔ یہ آگ مذہبی انتہا پسند عیسائیوں نے بھڑکائی تھی۔ قرطبہ اور طلیطلہ کے یہ انتہا پسند عیسائی اسلام اور بانی اسلام کے خلاف بدزبانی کرتے تھے اس لیے ان کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کی گئی۔ آخر عیسائیوں کی اس بدنام زمانہ تحریک اشبیلیہ کے اسقف اعظم کی مشاورت سے ختم کردیا گیا۔ دوسرا اہم واقعہ یہ ہے کہ 844ء میں اسلامی اندلس پر وائی کنگوں یا نارمنوں نے حملہ کیا۔ انہوں نے اپنے بحری بیڑے کی مدد سے اشبیلیہ اور اس کے گردونواح میں بڑی تباہی مچائی۔ نومبر 844ء میں ایک خونریز جنگ کے بعد ان بحری قزاقوں کو شکست دے کر اشبیلیہ کا شہر ان سے آزاد کرالیا گیا۔

امیر عبدالرحمٰن ثانی ایک اعلیٰ منتظم، بانی تعمیرات اور سرپرست علوم وفنون تھا۔ اس نے اپنی مملکت کا نظم ونسق از سرنو عباسیوں کے طریق پر قائم کیا اور قرطبہ اور مملکت کے دوسرے حصوں میں رفاہ عامہ کے متعدد ادارے قائم کیے۔ قرطبہ کی جامع مسجد کی از سرنو توسیع وتزئین کی۔ اس کے عہد میں قرطبہ میں مالکی مذہب نے بہت ترقی کی۔ اس کے دربار کے کئی شعراء مثلاً العباس بن فرناس اور الغزال بہت مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے عہد میں بغداد سے مشہور موسیقار زریاب بھی اندلس آیا تھا۔ عبدالرحمٰن ثانی نے 22 ستمبر 852ء کو وفات پائی۔ اس کا عہد ایک شاندار عہد تھا۔

عبدالرحمٰن الثالث (م 350ھ/961ء)

ہسپانیہ کا سب سے بڑا اموی حکمران اور الاندلس کا اموی خلیفہ الاول۔

عبدالرحمٰن الثالث بن محمد بن عبداللہ کی عمر تخت نشینی کے وقت صرف 23 سال تھی۔ اس کے دادا نے اس کی اعلیٰ صفات کی وجہ سے اسے جواں سال ہونے کے باوجود اپنا ولی عہد منتخب کیا تھا۔ یہ انتخاب مورخین کے مطابق بہت موزوں ثابت ہوا، اندلس کی اسلامی تاریخ میں کسی اور حکمران کا عہد عبدالرحمٰن الثالث کے عہد سے زیادہ درخشاں اور شاندار نہیں ہو

گزرا۔ اس نے تقریباً نصف صدی تک حکومت کی۔ اپنے عہد کے طویل ہونے کی وجہ سے عبدالرحمٰن اپنی حکمت عملی کو مسلسل جاری رکھ سکا تھا اور اس نے الاندلس کے تمام شورش پسند عناصر کو تابع فرمان بنالیا تھا۔

مورخین نے اس کے عہد کو دو ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور داخلی امن و امان کے استحکام کا دور تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب سلطنت قرطبہ میں سیاسی وحدت پیدا ہوئی۔ امیر عبداللہ کے ہاں یہ وحدت خطرے میں پڑ گئی تھی۔ الثالث کا دوسرا طویل دور زیادہ تر خارجہ حکمت عملی کی سرگرمیوں کا زمانہ ہے جس میں مسیحی اندلس کے خلاف جارحانہ اقدامات کیے گئے اور شمالی افریقہ میں اثر و رسوخ بڑھانے کی خاطر اس عہد کی دوسری بڑی حکومت فاطمین مصر کے ساتھ بھی کشمکش جاری رہی۔ اسی کشمکش کی وجہ سے عبدالرحمٰن الثالث نے خلیفہ ہونے کا اعلان کیا۔ عبدالرحمٰن الثالث کی تخت نشینی کے زمانے میں جنوبی اندلس میں ایک مشہور باغی عمر بن حفصون کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ جن کو عبدالرحمٰن الثالث نے بالآخر ختم کردیا اور طلیطلہ جیسے باغیوں کے شہر نے بھی پانچ سال مسلسل مزاحمت کرنے کے بعد اطاعت اختیار کی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہمسایہ مسیحی ریاستوں کی طرف سے قرطبہ کے پہلو میں چھرا گھونپ دینے کے خطرے کو بھی ختم کردیا۔ عبدالرحمٰن الثالث نے 22 رمضان المبارک 350ھ/ 15 اکتوبر 961ء کو عین اس وقت وفات پائی جب اس کے اقتدار کا اور اس کی شہرت کا ستارہ نصف النہار پر تھا۔ آخری ایام میں جب وہ ایک مطلق العنان حکمران کی زندگی بسر کرتا تھا اس نے سکونت اپنے تعمیر کردہ شہر مدینۃ الزہراہ میں اختیار کرلی تھی تاہم قرطبہ میں اسی زمانے میں دنیائے مغرب کا چمکتا ہوا ہیرا کہلاتا تھا۔

الحکم الثانی (م 366ھ/976ء)

عبدالرحمٰن الثالث کا بیٹا اور اندلس کا ایک قابل اموی خلیفہ

المستنصر باللہ الحکم ثانی، عبدالرحمٰن ثالث کا بیٹا۔ اس کا عہد حکومت قرطبہ کی اموی امارت اور خلافت میں سب سے زیادہ پر امن اور خوشحال تھا۔ اس کے زمانے میں قرطبہ ایک علمی مرکز کی حیثیت سے نمایاں ہوا۔ اگرچہ وہ عالم جوانی میں ولی عہد نامزد ہوا تھا مگر اس نے 46 برس کی عمر میں حکومت سنبھالی۔ اس طرح اُسے کاروبار سلطنت چلانے کا وسیع تجربہ حاصل تھا۔ اس کا پندرہ سالہ دور حکومت اسلامی اندلس کی تاریخ میں بے مثال ہے۔

اندلس کی آزاد عیسائی ریاستوں نے جن کے عبدالرحمٰن ثالث کے ساتھ معاہدات تھے کچھ بدعہدیاں کیں مگر بری طرح شکست کھائی۔

بعد ازاں تمام عیسائی حکمرانوں نے اس سے صلح کرلی۔ اس نے قرطبہ کی عظیم الشان جامع مسجد کی توسیع اور تزئین میں بڑے انہماک اور خوش ذوقی کا ثبوت دیا جس نے اس کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ اس کے ادبی اور فنی رجحانات کو دیکھتے ہوئے یہ توقع تھی کہ اب ایک طویل اور پر منفعت عہد حکومت کا آغاز ہو جائے گا لیکن جلد ہی اس کی صحت نے جواب دے دیا اور ریاستی امور عملی طور پر اس کے حاجب ابوالحسن جعفر بن عثمان المصحفی کے ہاتھ میں چلے گئے۔ ابھی وہ اپنے بیٹے ہشام الثانی کی بیعت لینے کی تجویز کر رہا تھا کہ 3 صفر 366ھ یکم اکتوبر 976ء کو اس نے وفات پائی۔

وہ بڑا علم پرور اور علما کا قدردان تھا۔ وہ علما کو کتابیں لکھنے کی ترغیب دیتا تھا اور کتابیں لکھنے پر بڑے بڑے انعامات بھی دیتا تھا۔ مشہور ہے کہ اس کا کتب خانہ اتنا وسیع تھا کہ اس کی الماریوں کی چابیاں کئی اونٹوں پر لادی جاتی تھیں۔ اس نے

دوسرے اسلامی ممالک سے کثیر تعداد میں کتابیں خرید کر اپنے ملک کے کتاب خانوں میں جمع کروائی تھیں۔ اس نے کئی ادباء اور شعراء کو وزارت کے منصب پر فائز کیا تھا جیسے اس کا حاجب ابوالحسن جعفر بن عثمان المصحفی وغیرہ۔

المنصور بن ابی عامر (م 392ھ/1002ء)

دسویں صدی عیسوی میں اندلس کا مشہور حاجب، سپہ سالار، فاتح اور ماہر سیاست

سلاطین وشاہان اسلام

احمد بن طولون
سلطان صلاح الدین ایوبی
سلطان الپ ارسلان
سلطان شہاب الدین غوری
سلطان شمس الدین التمش
سلطان الجائتو خدابندہ
امیر تیمور صاحبقران
سلطان غیاث الدین تغلق
سلطان محمد فاتح
شہنشاہ بابر
سلطان سلیمان قانونی
عباس اعظم
شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر
سلطان حیدر علی
شاہ
مولائے حسن
شاہ فیصل بن عبدالعزیز
شاہ حسین آف اردن
سلطان نورالدین زنگی
سلطان محمود غزنوی
سلطان ملک شاہ
سلطان قطب الدین ایبک
سلطان بلبن
سلطان عثمان اول
سلطان بایزید اول
سلطان قائتبائی
سلطان ابوالحسن علی
سلطان شیر شاہ سوری
شہنشاہ جلال الدین اکبر
شہنشاہ شہاب الدین شاہجہاں
بہادر شاہ ظفر
نظام ملک آصف جاہ
محمد علی پاشاہ
سلطان عبدالعزیز بن ابن سعود
محمد رضا شاہ پہلوی

احمد بن طولون

مصر میں طولونی خاندان کا بانی اور مصر کا شام سے الحاق کرنے والا پہلا مسلم سلطان

احمد بن طولون عباسی خلفا کا برائے نام باج گزار تھا۔ وہ ان جاہ طلب لوگوں میں سے ایک تھا جو آزادی کی آرزو

کی بدولت بالآخر مسلمانوں پر حکومت کرنے والے تھے۔ کہتے ہیں احمد کا باپ طولون بخارا کے والئی کی طرف سے عباسی خلفاء کو بھیجے جانے والے خراج میں بطور غلام شامل تھا اور خلیفہ المامون کے عہد میں بغداد بھیجا گیا تھا جہاں وہ خلیفہ کے ذاتی محافظوں کا سردار بنا دیا گیا تھا۔ اپنی شجاعت اور بہادری کی بدولت احمد بھی خلیفہ المستعین کی نظروں میں مقبول ہو گیا۔ خلیفہ المعتز کے عہد میں جب مصر میں عباسی فوج کا سپہ سالار باکباک نامی ترک سردار کو مقرر کیا گیا تو احمد اس کے سوتیلے بیٹے کے طور پر اس کا نائب مقرر کیا گیا کیونکہ باکباک نے احمد کی والدہ اور طولون کی بیوہ سے نکاح کیا ہوا تھا۔ احمد 23 رمضان 254ھ/15 ستمبر 868 عیسوی کو فسطاط، مصر پہنچا۔

اگلے چار سال تک وہ ابن المدبر کی جگہ مالیات کا منتظم بننے کی کوششوں میں مصروف رہا۔ اُس کے سوتیلے والد باکباک کے قتل کے بعد مصر کا صوبہ یرجوخ نامی سردار کو بطور جاگیر عطا ہوا۔ یرجوخ نے اپنی ایک بیٹی کا نکاح ابن طولون سے کر دیا اور اسے نائب والی کے عہدے پر ترقی دے دی۔ اس کے اقتدار کی بنیاد بن گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی والئی کے پاس ایک ایسی فوج تھی جو براہ راست خلیفہ کے ماتحت نہ تھی۔ بعدازاں وہ اپنا اثر و رسوخ دربار خلافت تک بڑھا کر یرجوخ کی جگہ والئی مصر مقرر ہوا۔ بعدازاں اس نے بازنطینیوں کے خلاف ملک شام کی سرحدوں کی حفاظت کے نام پر اس نے ملک شام پر بھی قبضہ کر کے اس کا الحاق مصر سے کر لیا۔ اس کے بعد خود مختاری کی طرف ایک اور قدم کے طور پر اس نے سونے کے سکوں پر خلیفہ کے ساتھ ساتھ اپنا نام بھی کندہ کرانا شروع کر دیا۔ ایک بغاوت کے دوران جب عباسی خلیفہ کو بغداد چھوڑنا پڑا تو ابن طولون نے اسے دعوت دی کہ وہ مصر میں آ کر پناہ گزین ہو جائے۔ یوں اس نے مصر میں آل طولون کی حکومت کی بنیاد رکھی اور اس طرح وہ دنیائے اسلام کا پہلا خود مختار حکمران بن گیا۔

سلطان نور الدین زنگی (1118ء سے 1174ء تک)

الملک العادل، شام وحلب کا نامور سلطان، صلیبیوں کے خلاف جہاد کرنے والا

ابوالقاسم محمود بن عماد الدین، نور الدین زنگی، معروف بہ الملک العادل۔ اتابک حلب و دمشق، شوال 511ھ/ فروری 1118ء میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنے والد کے ساتھ قلعہ جعبر کے محاصرے میں حصہ لیا جہاں اس کا والد ربیع الثانی 541ھ/ستمبر 1146ء میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس کی سلطنت اس کے دونوں بیٹوں میں تقسیم ہو گئی۔ سیف الدین غازی موصل کا حکمران بنا اور نور الدین نے حلب پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ جونہی صلیبی جنگجو جوسلین دوم JOSCELIN II کو عماد الدین کی موت کی خبر ملی اس نے الرہا کے باشندوں سے گفت و شنید شروع کر دی۔ یہ صلیبیوں کا ایک مستحکم مورچہ تھا جو عماد الدین زنگی نے ان سے چھین لیا تھا۔ وہاں کے باشندوں نے اسے تعاون کا یقین دلایا چنانچہ وہ کسی دقت کے بغیر الرہا پر قابض ہو گیا۔ وہاں کے مسلمان حفاظتی دستے نے قلعے میں محصور ہو کر پناہ لی۔ جب نور الدین کو اس کی خبر ملی تو اس نے تیزی سے الرہا کو جوسلین سے آزاد کرا لیا۔ اور وہاں کے مسیحیوں سے اس غداری کا انتقام لیا۔ 1144ء میں الرہا کے اس سقوط کی خبر نے اہل یورپ پر بڑا گہرا اثر ڈالا اور وہاں پوپ یوجینیئس نے ایک نئی صلیبی جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ پاپائے روم کی صلیبی جنگ کے اعلان کے بعد فرانس کے لوئی ہفتم نے فلسطین اور دمشق پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ 1148ء میں مسیحی سورماؤں نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ ادھر نور الدین زنگی اور اس کا بھائی اس شہر کی اعانت کے لیے اپنی افواج لے کر آئے تو صلیبیوں کے لیے محاصرہ اٹھانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ مگر انہوں نے حلب پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ سلطان نور الدین نے ان کے ناپاک ارادوں کو خاک میں ملا دیا۔ ادھر اپنے ایک مشیر شیرکوہ کو مصر بھیج کر مصر پر بھی عباسی خلیفہ کی حکومت قائم کر دی۔

سلطان نورالدین زنگی کے عہد حکومت میں ہی صلیبیوں نے مدینہ منورہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جسد پاک چرانے کی جسارت کرنے کی کوشش کی تھی، جسے سلطان نے ناکام بنا دیا تھا۔ ابھی سلطان صلیبیوں کے خلاف اقدامات میں مصروف تھا کہ اچانک اس نے مرض خناق سے وفات پائی۔ سلطان نورالدین بڑا حق شناس، رعایا پرور اور متقی سلطان تھا۔ اس نے سرکاری خزانے سے اپنی ذات کے لیے کچھ بھی نہیں لیا تھا اور اپنی ذاتی جائیداد کی آمد پر گزارا کرتا تھا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی (م1193ء)

سلطان الملک الناصر صلاح الدین یوسف اول، فاتح بیت المقدس آج دنیائے اسلام کو ایک اور صلاح الدین ایوبی کی ضرورت ہے کہ جو قبلہ اول بیت المقدس کو یہودیوں کے پنجے سے آزاد کرا دے کہ جیسے ماضی میں صلاح الدین ایوبی نے تقریباً ایک سو سال کے بعد بیت المقدس کو عیسائیوں (صلیبیوں) سے آزاد کرایا تھا۔

صلاح الدین یوسف بن نجم الدین ایوب نسلاً ایک کرد تھا۔ وہ 1138ء میں عراق کے شہر تکریت میں پیدا ہوا۔ اس کے والد نجم الدین ایوب نے سلطان نورالدین زنگی کی فوج میں ایک اعلیٰ افسر کی خدمات انجام دی تھیں۔ سلطان نے اسے بعلبک کا والی مقرر کیا تھا۔

صلاح الدین ایوبی کے بچپن کے حالات پر پردہ اخفا پڑا ہے اس لیے اس کی تعلیم و تربیت کے دور کے متعلق کچھ علم نہیں ہے۔ اس کی شہرت کا آغاز اس وقت ہوا جب شیرکوہ اسے پہلی بار 1164ء میں مصر کے خلاف اپنی ایک عسکری مہم اپنے ساتھ لے گیا اور اس کامیاب عسکری مہم کے بعد شام واپس پہنچ گیا۔

شیرکوہ مصر کو فتح کرنا چاہتا تھا مگر صلیبی جنگوں کی وجہ سے سلطان نورالدین اپنی فوجی طاقت کو تقسیم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تاہم اکتوبر 1168ء میں شیرکوہ ایک بار پھر صلاح الدین کے ہمراہ مصر پر حملہ آور ہوا اور جنوری میں خلیفہ نے شیرکوہ کو اپنا وزیر مقرر کیا مگر اس کے اچانک وفات پانے پر اس نے صلاح الدین کو "ملک الناصر" کا خطاب دے کر وزیر مقرر کر دیا۔ ادھر سلطان نورالدین نے اسے شامی فوجوں کا سالار تسلیم کر لیا اور اس واقعہ کے بعد ہی صلاح الدین کی عظمت کے جوہر کھلنے شروع ہوئے۔ اسی زمانے میں تیسری صلیبی جنگ کے لیے صلیبی جنگجو یورپ سے مشرق وسطیٰ پہنچنے لگے، سلاح الدین نے کئی جنگوں میں صلیبی فوجوں کو شکست دی اور 20 ستمبر 1187ء کو بالآخر بیت المقدس کو صلیبیوں سے آزاد کرا لیا۔ صلیبیوں پر اپنی فتوحات کے باوجود سلطان نے عیسائیوں سے اس قدر عدل و احسان، رحم و کرم اور دریا دلی اور فیاضی کا برتاؤ کیا کہ آج تک یورپی مورخین اپنی کتابوں میں اس کی تعریف کرتے ہیں اور انگلستان کے بادشاہ رچرڈ شیر دل سے اس کے محاربات آج بھی یورپ میں مشہور ہیں۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے 4 مارچ 1193ء کو بعارضہ زرد بخار 65 برس کی عمر میں وفات پائی اسے دمشق کی جامع مسجد کے قریب ایک مقبرے میں دفن کیا گیا۔ سلطان صلاح الدین اپنے دور کا ایک عظیم ترین مسلم راہنما تھا اس نے مسلم دنیا کی طرف بڑھتے ہوئے یورپی یا صلیبی جنگجوؤں کو شکست دے کر ان کے ناپاک مقاصد میں ناکام بنا دیا تھا۔

سلطان محمود غزنوی (م1030ء)

معروف فاتح ہند، الیمین الدولۃ امین الملۃ ابوالقاسم محمود بن ابومنصور سبکتگین

سلطان محمود کا والد سبکتگین نسلاً ترک غلام تھا بعد ازاں امیر غزنی الپتگین نے اسے اپنا داماد بنایا اور اس کے بعد سبکتگین امیر غزنی بنا۔ اس کی وفات پر درباریوں نے اس کے چھوٹے بیٹے اسماعیل کو تخت نشین کرنے کا اعلان کر دیا کیونکہ

الپتگین کی بیٹی کے بطن سے تھا مگر اس میں سلطنت سنبھالنے کی صلاحیت نہ ہونے کی وجہ محمود اسے شکست دے کر خود غزنی کے تخت پر بیٹھ گیا۔ اسے خلیفہ بغداد نے ''یمین الدولہ'' اور ''امین ملت'' کے خطابات سے نوازا۔ محمود ابھی اپنی سلطنت کے انتظامات میں الجھا ہوا تھا کہ ہند کے راجہ جے پال نے جو سبکتگین سے دو مرتبہ شکست کھا چکا تھا دسمبر 1000ء میں پشاور پر حملہ کر دیا۔ محمود نے اسے شکست دے کر گرفتار کر لیا اور اپنے ساتھ غزنی لے گیا اور اس پر بھاری تاوان جنگ عائد کیا۔ اپنی رہائی کے بعد راجہ جے پال نے اپنے بیٹے آنند پال کو اپنا جانشین بنایا اور خود چتا میں بیٹھ کر زندہ جل مرا۔ ان دنوں ملتان پر قرامطہ کی حکومت تھی جو اپنے باطنی عقائد کی وجہ سے اہل اسلام کے لیے ایک خطرہ تھے۔ محمود نے اگلا حملہ ملتان پر کیا اور اسے قرامطہ سے پاک کر دیا۔ ملتان پر حملے کے لیے سلطان محمود کو راجہ آنند پال کی قلمرو میں سے گزرنا پڑا تھا۔ جس کے دوران راجہ آنند پال نے اس کا راستہ روکا تھا جس کی وجہ سے محمود کو پہلے آنند پال کو شکست دینا پڑی تھی۔ اپنی اس شکست کا بدلہ آنند پال نے ہندو راجاؤں کا ایک ایک متحدہ لشکر محمود کے خلاف تیار کر کے لیا اور ہندوستان کی عوام اور راجاؤں سب کو محمود سے لڑنے کے لیے تیار کیا مگر اس متحدہ ہندو فوج کو بھی محمود نے شکست دی اور اس کے بعد محمود نے ہندوستان ان راجاؤں کے علاقوں پر تادیبی حملوں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ محمود کا سترہواں اور آخری حملہ سومنات پر تھا جو کاٹھیاواڑ میں سمندر کے کنارے ایک مندر تھا۔ ہندوؤں کا خیال تھا کہ سومنات کے بت اس کی حفاظت کریں گے مگر محمود نے راجستھان کے صحراؤں کو عبور کر کے سومنات کے مندر میں نصب بتوں کو توڑ کر ہندوؤں کے اس خیال خام کو غلط ثابت کر دیا بھلا پتھر کے بت اپنی حفاظت کیسے کر سکتے تھے۔ انہیں حملوں کے دوران محمود نے پنجاب پر قبضہ کر کے لاہور کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ سلطان کے عہد میں غزنی ایک بڑا شہر بن گیا تھا۔ سلطان نے غزنی میں ''عروس فلک'' کے نام سے ایک عالیشان مسجد تعمیر کرائی تھی۔ ک سلطان محمود نے جہاں بے شمار دشمنوں کو میدان جنگ میں شکست دی وہیں وہ خود سندھ میں موسمی بخار کے ہاتھوں معذور ہو کر 30 اپریل 1030ء کو وفات پا گیا۔

سلطان الپ ارسلان (م 465ھ/ 1073ء)

عضد الدولہ محمد بن داؤد چغری بیگ، سلجوقی خاندان کا دوسرا بڑا سلطان

یہ شاہان سلجوق میں دوسرا بڑا حکمران تھا۔ غالباً 421ھ/ 1030ء کو پیدا ہوا اور کم سنی ہی سے اپنے والد چغری بیگ کی افواج کی قیادت، بالخصوص آل غزنویہ کے خلاف بڑی کامیابی سے کی۔ 450ھ/ 1098ء میں اس نے ایران میں ابراہیم اینال کی بغاوت کے دوران میں اپنے چچا طغرل بیگ کی جان بچائی۔ اس کے دو تین سال بعد اس نے چغری بیگ کی جگہ سنبھال لی۔ جو ایک عرصہ سے بیمار تھا۔ پھر 455ھ/ 1063ء میں سلجوق خاندان کے پہلے سلطان طغرل بیگ کا جانشین ہوا جو لاولد فوت ہو گیا تھا۔ اس طرح وہ تمام سلجوقی سلطنت کو اپنے زیر نگین لے آیا۔ اس کا سوتیلا بھائی سلیمان جسے طغرل بیگ نے متبنٰی بنایا ہوا تھا اسے راستے سے ہٹا دیا۔ اور الکندری وزیر کو اس کی ناعاقبت اندیشی کی پاداش میں قتل کروا دیا گیا۔ عباسی خلیفہ القائم نے الپ ارسلان کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ تتلمش جو اس کے والد اور چچا کا چچا زاد بھائی تھا اسے بحیرہ خزر کے جنوب میں واقع پہاڑوں میں شکست دی اور دوسرے باغیوں کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔ آل غزنویہ نے اس صلح نامے کی پابندی کی جو چغری بیگ کے عہد میں طے پا گیا تھا۔ الپ ارسلان کی شہرت مغربی محاذ پر اس کی سرگرمیوں کی وجہ سے بھی ہے۔ اپنے پیشرو طغرل بیگ کی طرح اس کی بھی خواہش تھی کہ مصر پر حملہ کر کے وہاں سے فاطمی رافضیت کو ختم کر دے اس کے علاوہ آذربائیجان سے پرے کی مسیحی سلطنتوں پر بھی حملے کرنا چاہتا تھا۔ اپنی تخت نشینی کے کچھ عرصہ بعد اس نے بازنطینیوں، ارمنی اور گرجستانی مسیحی

ممالک کے خلاف مہمات کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس کے بعد الپ ارسلان کا ارادہ تھا کہ وہ فاطمیوں کے خلاف لشکر کشی کرے مگر بازنطینی شہنشاہ دیوجانس رومانوس نے آرمینیا میں لشکر کشی کی جس کی وجہ سے ذوالقعدہ 463ھ/ اگست 1071ء میں ملازگرد کے مقام پر وہ بوزنطی لشکر کے خلاف معرکہ آرا ہو گیا۔ پورے کے سخت مقابلے کے بعد بوزنطی لشکر کو شکست فاش ہوئی اور شہنشاہ رومانوس خود گرفتار ہو گیا۔ اسلامی دنیا میں یہ پہلا موقع تھا جب کسی مسلمان فرمانروا نے بوزنطینی شہنشاہ کو گرفتار کیا تھا۔ اس عظیم فتح کے بعد سلطان ایک قیدی کے ہاتھوں شدید زخمی ہو گیا اور اس نے عالم جوانی میں وفات پائی۔

سلطان ملک شاہ (م 1092ء)

سلطان ملک شاہ بن الپ ارسلان، ابوالفتح، ایک سلجوقی سلطان اور مشہور فاتح

سلطان الپ ارسلان کے بعد اس کا بیٹا ملک شاہ سلطان بنا۔ عباسی خلیفہ نے اسے جلال الدولہ کا خطاب عطا کیا۔ ملک شاہ کے عہد میں سلجوقیوں کو غیر معمولی اقتدار نصیب ہوا۔ بغداد میں جہاں عباسی خلیفہ نام نہاد حکمران تھے ملک شاہ کا نائب اپنے مکان پر نوبت نقارہ بجوایا کرتا تھا۔ حالانکہ یہ علامت صرف خلیفہ کے لیے مخصوص تھی۔ سلطان ملک شاہ نے ماوراالنہر کے تمام علاقے فتح کیے اور اس طرح اسلامی مملکت کی سرحدیں چین کی سرحدوں سے مل گئیں۔ رومی حکمرانوں نے اپنی سابقہ شکست جو انہوں نے سلطان الپ ارسلان کے ہاتھوں من ذی گرد میں اٹھائی تھی کا بدلہ لینا چاہا اور حملہ آور ہوئے مگر مجبور ہو کر ملک شاہ کو ایک گرانقدر خراج کی ادائیگی پر صلح کی۔ ملک شاہ کے ان زریں کارناموں سے خوش ہو کر خلیفہ مقتدی نے 1082ء میں اپنی ایک بیٹی ملک شاہ کے نکاح میں دی۔

ملک شاہ کے عہد کی شاندار کامیابیاں بڑی حد تک اس کے وزیر با تدبیر نظام الملک طوسی کی مرہون منت تھیں۔ اس نامور وزیر نے 80 سال کی عمر تک ملک شاہ کی اور مملکت اسلام کی بے لوث خدمت کی۔ اسی نے بغداد میں نظامیہ کالج کی لافانی درس گاہ قائم کی۔ نظام الملک کے اقتدار کی وجہ سے شاہی خاندان کے افراد اس سے حسد کرنے لگے تھے۔ انہوں نے سازش کر کے اس قابل وزیر کو برطرف کرا دیا۔ اسی دوران 1092ء میں نہاوند کے قریب حسن بن صباح کے ایک فدائی نے اسے خنجر مار کر شہید کر دیا۔

سلطان ملک شاہ خود ایک منصف مزاج، نیک، بہادر اور عدل پرور حکمران تھا اور ایک بلند پایہ منتظم بھی تھا۔ اس نے اپنے عہد میں ہمیشہ اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال رکھا۔ ٹیکسوں کے بوجھ کو کم کیا۔ ایک جامع مسجد تعمیر کرائی اور ایک شاندار مدرسہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کی یادگار کے طور پر کھولا۔ خود عالم تھا اور علما و فضلاء کی قدر دانی کرتا تھا۔ علم فلکیات کی ایک رصد گاہ تعمیر کرائی جو اس کی زندگی کے ایام میں قائم رہی۔ لوگوں کی بہبود کی خاطر کئی پل تعمیر کیے اور نہریں کھدوائیں۔ ان زریں کارناموں کی وجہ سے ملک شاہ کا شمار دنیا کے عظیم حکمرانوں میں ہوتا ہے۔

سلطان شہاب الدین غوری (م 1206ء)

شاہزادگان غور میں سے سلطنت غزنی کا چوتھا بادشاہ اور فاتح

اصل نام شہاب الدین تھا، لیکن اس نے معزالدین کا لقب اختیار کر لیا تھا اس لیے عموماً محمد معزالدین کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس کا بڑا بھائی غیاث الدین جب 1163ء میں تخت نشین ہوا تو اس نے محمد معزالدین کو ہرات کا حاکم بنا کر اس کے سپرد یہ کام بھی کیا کہ وہ اس خاندان کی سلطنت کو ہندوستان تک وسیع کرے۔ محمد معزالادین نے پہلی مرتبہ 1175ء

میں اس ارشاد کی تعمیل کی۔ اور ہندوستان پر حملہ کیا اور قرامطہ کو جو ملتان پر حکومت کر رہے تھے انہیں وہاں سے نکال دیا اور اُچ کو بھی فتح کر لیا۔ 1178ء میں دوسری مرتبہ یورش کر کے گجرات میں داخل ہو گیا لیکن وہاں کے راجہ بھیم واگھیلہ نے اسے شکست دی اور وہ غزنی واپس اپنی بچی کچی فوج کے ساتھ پہنچ سکا۔

اگلے سال اس نے پشاور فتح کر لیا اور 1181ء میں لاہور پر بھی قابض ہو گیا۔ یہاں اس نے غزنوی خاندان کے آخری تاجدار ملک خسرو کو اسیر کیا۔ اور پنجاب کا صوبہ اپنے بھائی کی سلطنت میں شامل کر دیا۔ 1190ء-1191ء میں اس نے دہلی کی چوہان سلطنت پر حملہ کر کے بھٹنڈا پر قبضہ کر لیا۔ لیکن راجہ پرتھوی راج نے اس کے خلاف لشکر کشی کر کے تراوڑی کے مقام پر اسے شکست دی اور وہ میدان جنگ میں زخمی بھی ہو گیا۔ 1192ء میں وہ دوبارہ ہندوستان آیا اس مرتبہ اس نے پرتھوی راج کو تراوڑی ہی کے میدان میں شکست فاش دی اور وہ جنگ میں مارا گیا۔ اس مرتبہ ہانسی، سامانہ، کہرام اور اجمیر کو فتح کر لیا گیا۔ غزنی واپس آنے سے پہلے وہ ہندوستان میں قطب الدین ایبک کو اپنا نائب السلطنت مقرر کر گیا۔ اس نے دہلی کو فتح کر کے اسے اپنا پایہ تخت بنالیا۔ 1197ء میں ایبک اجمیر میں محصور ہو گیا تو سلطان شہاب الدین نے بطور کمک افواج بھیجیں جن کی مدد سے اس نے گجرات کے راجا بھیم واگھیلہ کو شکست دی۔ اسی دوران محمد معزالدین اپنے بھائی کے ساتھ مل کر خراسان کو واپس لینے کی کوششیں کرنے لگا اور اس کی قیادت میں ایک عسکری مہم رے کی طرف بھیجی گئی مگر اس کی فوج کی بدعنوانیوں کی وجہ سے دونوں بھائیوں میں کشیدگی ہو گئی۔ 1202ء میں اپنے بھائی کی موت پر معزالدین تخت نشین ہوا۔ 1205ء میں ایک مرتبہ پر وہ ہندوستان آیا اور اس نے کوکھروں کو شکست دی لیکن غزنی واپسی کے سفر میں اسے دریائے سندھ کے کنارے 5 مارچ 1206ء کو قتل کر دیا گیا۔

سلطان قطب الدین ایبک (م 1210ء)

ہندوستان کا پہلا مسلمان بادشاہ اور بانی خاندان غلاماں

خاندان غلاماں کے بانی سلطان قطب الدین ایبک دراصل ایک ترک نژاد غلام تھا جسے نیشاپور میں قاضی الدین صاحب نے ترکستان کے سوداگروں سے خریدا تھا۔ ایک شفیق سرپرست کی حیثیت سے قاضی صاحب نے اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ قاضی صاحب کی وفات پر وہ ایک اور غلاموں کے سوداگر کے ہاتھ پڑ گیا جس نے اسے سلطان معزالدین کو بطور تحفہ پیش کر دیا۔ دربار شاہی میں آتے ہی قطب الدین کے ذاتی جوہر نمایاں ہونے لگے۔ شہسواری، تیغ زنی، نیزہ بازی اور دیگر فنون جنگ میں اس نے وہ کمال حاصل کیا کہ جلد ہی سلطان محمد غوری کی فوج میں ایک قابل جرنیل کا عہدہ پا گیا۔ کہتے ہیں کہ راجہ قنوج، جے چند اسی کے تیر کا نشانہ بن کر جاں بحق ہوا تھا۔ اس کی خدمات کے صلے میں سلطان محمد غوری نے اسے ہندوستان میں اپنا نائب السلطنت مقرر کر دیا۔ چودہ سال تک نائب السلطنت کے فرائض انجام دیتے ہوئے اس نے دہلی، میرٹھ، رتھمبور اور گوالیار کو فتح کر کے سلطان کی قلمرو میں شامل کر لیا۔ پھر اس نے گجرات کے راجہ بھیم دیو کو شکست فاش دی اور کالنجر کا قلعہ فتح کر لیا۔

قطب الدین ایبک کے ایک فوجی سالار محمد بختیار خلجی نے صرف دو سو سواروں کی جمعیت کے ساتھ بہار فتح کر لیا اور پھر بنگال پر بھی اس کا تصرف قائم ہو گیا۔ سلطان محمد گوری کی وفات کے بعد قطب الدین ایبک نے اپنی خود مختار سلطنت قائم کرنے کا اعلان کیا اور خاندان غلاماں کی بنیاد رکھی۔ خود مختار فرمانروا بننے کے بعد سلطان قطب الدین ایبک نے سندھ اور پنجاب کے صوبے فتح کیے اور اس کی سلطنت کی حدود لاہور سے بنگال اور دہلی سے گجرات تک پھیل گئیں۔ چار سال تک

کامیاب حکمرانی کرنے کے بعد وہ لاہور میں چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر جاں بحق ہو گیا۔ اس کا مزار انارکلی لاہور میں مرجع خلائق ہے۔ سلطان قطب الدین ایبک ایک کامیاب جرنیل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نہایت منصف مزاج بادشاہ تھا۔ اتنا سخی تھا کہ مورخ فرشتہ کے مطابق اس کی سخاوت اگلے چار سو برس تک ضرب المثل بنی رہی۔

ابوالمظفر سلطان شمس الدین التمش (م 1236ء)

ہندوستان میں خاندان غلامان کا دوسرا اور نامور حکمران

قطب کے بعد اس کا متبنیٰ آرام شاہ تخت دہلی پر بیٹھا مگر اپنی نا اہلی کی وجہ سے بہت جلد اسے سبکدوش ہونا پڑا۔ اس کے مختصر عہد حکومت میں قطب الدین کی وسیع سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے، سندھ پر ناصر الدین قباچہ حکمران بن بیٹھا، بنگال میں خلجیوں نے آزاد سلطنت قائم کر لی۔ آخر امراء دہلی نے تنگ آ کر شمس الدین التمش کو جو قطب الدین کا غلام اور داماد تھا اور بدایوں کا حاکم تھا۔ دہلی پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ اس نے آرام شاہ کو شکست دے کر دہلی کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ التمش بھی ایک ترک غلام تھا جسے اس کے چچا زاد بھائیوں نے فروخت کر دیا۔ سلطان دہلی ایبک نے اسے خریدا اور قطب الدین کے زیر سایہ التمش کی بہادری کے جوہر خوب چمکے۔ اس کی خداداد صلاحیتوں سے متاثر ہو کر سلطان نے اسے اپنی دامادی کا شرف بخشا اور سلطان قطب الدین کے بعد وہ بالآخر خاندان غلاماں کا دوسرا بادشاہ بنا۔ التمش کے تخت نشین ہوتے ہی کئی مسلمان سرداروں نے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ چنانچہ یلدوز کے غزنی اور قباچہ نے سندھ میں اپنی خودمختاری کا اعلان کیا ادھر خلجی بنگال میں بگڑ بیٹھے۔ سلطان التمش نے یلدوز کو شکست دی۔ قباچہ نے اطاعت قبول کر لی مگر پھر بغاوت کر کے اوچ پر قبضہ کر لیا۔ التمش نے اوچ کو فتح کر کے قباچہ کا بھکر کے قلعہ میں محاصرہ کر لیا اور آخر اس نے راہ فرار اختیار کی۔ اسی طرح التمش نے بنگال میں خلجیوں کی سرکوبی کی اور اپنے بیٹے ناصر الدین محمود کو بنگال کا گورنر مقرر کیا۔ سلطان کے ہندو راجپوت راجاؤں سے بھی معرکے رہے اور اس نے گوالیار کے ہندو راجہ منگل دیو کو شکست دے کر قتل کر ڈالا۔ سلطان التمش کا ایک اور بڑا کارنامہ تاتاریوں کے ہندوستان پر حملوں کو ناکام بنانا تھا۔ خلیفہ بغداد نے اسے ہندوستان کا حکمران تسلیم کیا تھا۔ التمش کا لائق بیٹا ناصر الدین محمود اس کی زندگی میں وفات پا گیا تھا جس کے بعد اس نے اپنی بیٹی رضیہ کو اپنا جانشین قرار دیا۔ التمش ایک آزمودہ کار سپاہی اور باکمال بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ سلطنت کے انتظام کا بڑا ماہر تھا اور عالموں کی قدر کرتا تھا۔

سلطان غیاث الدین بلبن (م 1287ء)

خاندان غلاماں کا مشہور بادشاہ اور فاتح جنوبی ہند

سلطان غیاث الدین بلبن بھی ابتدا میں سلطان التمش کا ایک غلام تھا جو بہشتی کی حیثیت سے بادشاہ کے خدمت گاروں میں داخل کیا گیا تھا۔ رضیہ سلطان کے عہد میں وہ میر شکار مقرر ہوا۔ پھر 1246ء میں سلطان ناصر الدین محمود نے اسے اپنا وزیر اعظم مقرر کیا۔ بلبن نے اپنی وزارت کے زمانہ میں نہ صرف تاتاریوں کے حملوں کو روکا بلکہ مالوہ، دوآبہ اور کالنجر کے ہندو راجاؤں کی بھی سرکوبی کی اور سلطنت کا خاطر خواہ انتظام بھی کیا۔ 1266ء میں سلطان ناصر الدین کی وفات پر امراء نے بلبن کو ملک کا حکمران منتخب کر لیا۔

تخت نشین ہوتے ہی بلبن نے سب سے پہلے میواتیوں کی بغاوت کو فرو کیا۔ افغان امراء اور فوجی سرداروں کے اقتدار کو کم کرنے کے لیے بلبن نے نظام جاگیرداری کو اڑا دیا اور فوج کو نقد تنخواہ دینے کا بندوبست کیا۔ جن امراء نے اس کے

اس نئے نظام کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ان کو بلبن نے نیست و نابود کر دیا۔ ملک میں امن قائم کیا اور چوروں اور ڈاکوؤں سے پاک کر دیا۔ جا بجا جنگلات کو صاف کر کے شاہراہیں تعمیر کی گئیں۔ بلبن عدل و انصاف کا پتلا تھا اس نے حاکم اودھ کو ایک ملازم کو کوڑے لگوانے کی پاداش میں سر دربار کوڑے لگوائے یہاں تک کہ وہ مر گیا۔ مورخ فرشتہ کے مطابق تحت علالت کی وجہ سے اس کی موت کی افواہ پھیل گئی اور بنگال میں طغرل خان اور دیگر گورنروں نے خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ بلبن نے طغرل خان کی سرکوبی کی۔ اپنے لائق بیٹے شہزادہ محمد کو اس نے ملتان کا حاکم مقرر کیا تھا وہ تاتاریوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گیا جس سے بلبن تخت مایوس ہو گیا اور اس نے اپنے دوسرے بیٹے بغرا خان کو اپنا جانشین مقرر کرنا چاہا مگر وہ بنگال کی حکمرانی چھوڑنے پر رضامند نہ ہوا جس کے بعد بلبن نے اپنے بیٹے کیخسرو کو اپنا جانشین نامزد کیا۔ مگر امراء نے بلبن کے بعد بغرا خاں کے بیٹے کیقباد کو دہلی کے تخت پر بٹھا دیا۔ کیقباد بلبن کا اچھا جانشین ثابت نہ ہوا اور عیش و عشرت میں پڑ گیا۔

سلطان الجائتو خدابندہ (م 1316ء)

ایران کا آٹھواں ایل خانی حکمران جس نے 1303ء سے 1316ء تک حکومت کی

وہ اپنے پیشرو ایل خانی حکمرانی غازان خان کی طرح ارغون خان اور ہلاگو خان کا پوتا تھا۔ تخت نشینی بعمر 24 سال ہوئی۔ آغاز شباب میں اسے خربندہ کا اسم عرفی دیا گیا تھا مورخین نے اسے مغل زبان میں ایک لفظ بمعنی سوم قرار دیا ہے۔ شروع میں اس کی والدہ ارک خاتون نے اسے بطور عیسائی بپتسمہ دلوایا تھا، لیکن بعد ازاں وہ مسلمان ہو گیا اور اس نے محمد نام رکھا۔ اس کا اسم عرفی بھی ''خدابندہ'' بدل گیا۔ اس کے علاوہ اس نے غیاث الدین والدنیا کا لقب اختیار کیا۔ غازان کی وفات کے وقت وہ اپنی فوج کے ہمراہ ہندوستانی سرحد پر تھا مگر اس کی عدم موجودگی سے جانشینی میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی کیونکہ اس وقت کوئی دوسرا مدعی تخت اس کے خاندان میں موجود نہیں تھا۔

الجائتو نے تخت نشین ہونے کے بعد اپنے پیشروؤں کی روایات کے مطابق مصر کی مملوک سلطنت سے جنگ جاری رکھی اور یورپ کی عیسائی طاقتوں سے دوستانہ تعلقات بھی قائم رکھے۔ پوپ کلیمنٹ خامس اور انگلستان کے بادشاہ ایڈورڈ ثانی کے نام اس کے بعض خطوط اب تک محفوظ ہیں تو عیسائی سفیر توماس الدوچی نے پہنچائے تھے۔ الجائتو نے بازنطینی شہنشاہ قسطنطنیہ کی مدد کے لیے ایک فوج مہم بھی ایشیائے کوچک بھیجی تھی۔ مملوکوں کے خلاف ایک عسکری مہم کی قیادت اس نے خود کی تھی جس کے دوران دریائے فرات کے کنارے رحبہ کا ناکام محاصرہ کیا گیا تھا۔ 1307ء میں جیلان کی فتح اور کرت کے باج گزار خاندان سے ہرات چھین لینے کے بعد اس کا اقتدار مضبوط ہو گیا تھا۔ الجائتو نے 1306ء میں اپنے جانشین ابوسعید کی پیدائش پر نو آباد شہر سلطانیہ کو دارالحکومت قرار دیا تھا۔ ملک میں غازان کے قوانین دوبارہ نافذ کرنے اور وزیر رشید الدین طبیب کے حسن انتظام سے خوشحالی بڑھ گئی تھی۔ اس کا میلان شیعوں کی جانب تھا مگر پھر اس نے سُنی مسلک اختیار کر لیا اور شافعی مسلک کو فروغ دینا چاہا مگر پھر شیعہ ہو گیا۔ 1316ء میں وفات پائی۔

سلطان عثمان اول (م 726ھ/1326ء)

عثمان غازی، ترکیہ کی سلطنت عثمانیہ کا بانی جو 1924ء تک قائم رہی

سلطان عثمان خان اول امیر ارطغرل کا بیٹا تھا۔ اسی نے دولت عثمانیہ کی بنیاد رکھی جو 1288ء سے 1924ء تک قائم رہی۔ عثمان خان کی تخت نشینی کے بعد سے بازنطینی سلطنت قسطنطنیہ اندرونی خلفشار میں مبتلا تھی مگر اس کے باوجود بازنطینی

قلعہ دار مسلم سلجوقوں کے علاقے پر جارحانہ حملے کرتے رہتے تھے۔ ان قلعہ داروں کو سزا دینے کی خاطر سلطان عثمان خان اول نے اپنے عہد حکومت کے پہلے ہی سال میں قرلجہ حصار نامی قلعہ فتح کیا۔ اس پر سلجوقی سلطان علاؤالدین نے اس سے خوش ہو کر نہ صرف قرلجہ حصار اور اس کے مضافات عثمان کو دے دیئے بلکہ اسے اپنے نام کا سکہ جاری کرنے اور جمعہ کے خطبہ میں اپنا نام شامل کرنے کی اجازت دی جو اس کی خود مختاری کی علامت تھی۔

699ھ/ 1300ء میں سلطان علاؤالدین سلجوقی مارا گیا اور اس کا بیٹا غیاث الدین بھی تاتاریوں کے ہاتھوں مقتول ہوا۔ اس کی وفات کے ساتھ ہی سلجوق سلطنت کا خاتمہ ہوگیا اور عثمان خان اول ایک خود مختار حکمران کی حیثیت سے حکومت کرنے لگا۔ 701ھ/ 1301ء سے اس نامور حکمران نے اپنی فتوحات کا سلسلہ شروع کیا اور بازنطینی (رومی) قلعے یکے بعد دیگرے فتح کرتا چلا گیا اور یوں ایشیائے کوچک کا بڑا حصہ اس کے زیر انتداب آگیا۔ اس کے بیٹے اورخاں نے تاتاریوں کو شکست فاش دی اور یوں عثمانی فتوحات کا دائرہ بحر اسود تک پہنچ گیا۔

1317ء میں سلطان عثمان نے اپنے بہادر بیٹے اورخاں کو بروصہ کی تسخیر کے لیے بھیجا۔ یہ شہر تقریباً دس سال کے طویل محاصرے کے بعد فتح ہوا۔ جب اورخاں اپنی اس عظیم فتح کی خوشخبری لے کر سغوت واپس آیا تو عثمان اول بستر مرگ پر تھا۔ تاہم وفات سے پہلے اس نے اس عظیم فتح پر اورخان کی شجاعت کی داد دی اور اسے اپنا جانشین مقرر کیا۔ عثمان خان اول نے کل اڑتیس سال حکومت کی اور عثمانی مملکت کو جنوب میں کوتاہیہ اور شمال میں بحر مامورا کے ساحلوں تک وسیع کردیا۔ وہ محض ایک فاتح ہی نہیں بلکہ ایک قابل منتظم حکمران بھی تھا۔

امیر تیمور صاحبقران (م 807ھ/ 1405ء)

مشہور معروف مغل حکمران اور فاتح ایشیا جس نے دمشق سے ہندوستان تک کو فتح کر ڈالا۔

فاتحین عالم میں ایک نام امیر تیمور صاحبقران کا۔ چنگیز خاں کی سلطنت کو بحال کرنے اور وسطی ایشیا کے مغرب میں بحیرہ روم، جنوب میں ہندوستان اور شمال میں روس تک اپنی سلطنت کو وسیع کرنے والا امیر تیمور چنگیز خاں ہی کی طرح مفتوحہ علاقوں میں لوٹ مار کرنے وہاں کے خزانوں کو سمرقند اپنے محل میں منتقل کرنے تباہی و بربادی پھیلانے اور دشمن کی کھوپڑیوں سے اپنی فتوحات کے مینار تعمیر کرانے کے لیے بھی مشہور ہے۔ تاہم اس نے ادب وفنون کی سرپرستی بھی کی اور سمرقند کو اس وقت کی دنیا کا ثقافتی دارالحکومت بنایا۔ میدان جنگ میں بربریت اور زیادتیوں کو فروغ دینے والا تیمور جنگی داؤپیچ کا ماہر اور ایک قابل عسکری سالار تھا اور اس نے طویل عسکری مہمات میں شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔ امیر تیمور نے ہندوستان پر حملہ محض یہ کہہ کر کیا تھا کہ یہاں کے مسلم حکمران اپنی ہندو رعایا سے بہت زیادہ نرم سلوک کرتے ہیں۔ مگر اس کا اصل مقصد کشور کشائی تھا۔ اس کی فوج نے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور اس شہر کو اپنی حالت بحال کرنے میں اگلے ایک سو سال کا عرصہ لگا۔ 17 دسمبر 1398ء کو پانی پت کے میدان میں تیمور نے ایک لاکھ قیدی ہندوستانی سپاہیوں کو تہہ تیغ کیا اور بہت سے ماہر فنون ہندوستانیوں کو واپس جاتے ہوئے اپنے ساتھ لے گیا۔

1401ء میں تیمور نے دمشق کا محاصرہ کیا اور اس شہر کے 20 ہزار باشندے ذبح کردیئے۔ 1402ء میں عثمانی سلطان بایزید کو انگورہ کی جنگ میں شکست دے کر قید کرلیا اور یوں عثمانی سلطنت کو شدید نقصان پہنچایا اور مشرقی یورپ میں بڑھتے ہوئے عثمانیوں کے قدم رک گئے۔ اپنی عمر کے آخری دنوں میں امیر تیمور نے چین کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا مگر اس منصوبے پر عمل پیرا ہونے سے پہلے 19 جنوری 1405ء کو وفات پائی اور سمرقند میں دفن ہوا۔ تیمور کے بعد دنیائے مشرق نے

کوئی اور فاتح عالم پیدا نہیں کیا اس طرح وہ مشرق کا آخری فاتح عالم تھا۔

سلطان بایزید اول (م 1403ء)

اگر تیمور عثمانی سلطنت پر حملہ آور نہ ہوتا تو بایزید قسطنطنیہ کو پچاس سال پہلے فتح کر لیتا

بایزید اول یلدرم، عثمانی سلطان، سلطان مراد اول اور گل چچک خاتون کا بیٹا تھا۔ وہ 1354ء/ 755ھ میں پیدا ہوا۔ وہ سلطان مراد کے کوسوو کے میدان میں زخمی ہو جانے کے بعد سلطان مراد کی وصیت کے مطابق تخت نشین ہوا۔ اس کا باپ سربیا کے خلاف لڑتا ہوا شہید ہوا تھا۔ اس نے وقتی طور پر سربیا سے صلح کر لی اور سلطنت میں رونما ہونے والی دیگر بغاوتوں پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر بایزید نے جب مغرب کے حالات کو فوری توجہ کے قابل پایا تو کوسوو کو فتح کرنے کے بعد اس نے بازنطیم پر اپنا اقتدار بڑھانے کی کوشش کی۔ بعد ازاں تسالونیکا دوبارہ فتح کر کے سلطان نے تھسلی کو بھی مسخر کر لیا اور قسطنطنیہ کی ناکہ بندی شروع کر دی جو اگلے سات سال تک جاری رہی۔ سلطان کے یورپ میں ان بہادرانہ اقدامات نے ہنگری اور وینس کو 796ھ/ 1394ء میں معاہدہ اتحاد کرنے اور یورپ میں ترکوں کے خلاف ایک صلیبی جنگ کرنے پر آمادہ کر دیا۔ چنانچہ 1396ء میں جب بایزید قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا تو صلیبیوں نے سگمنڈ کے ماتحت نکوپولس کا محاصرہ کر لیا۔ بایزید تیزی سے وہاں پہنچا اور ستمبر 1396ء میں صلیبی جنگجوؤں کو ایک تباہ کن شکست دی۔ اب قسطنطنیہ فتح کرنا چنداں مشکل نہیں تھا مگر قیصر مینوئیل نے انتہائی سخت شرائط پر صلح کر لی۔ کہتے ہیں کہ سلطان بالضرور قسطنطنیہ کو فتح کر لیتا اور یورپ میں بہت آگے تک فتوحات کرتا چلا جاتا اگر تیمور اس کے خلاف میدان جنگ میں نہ اترتا۔ 1399ء میں تیمور نے چنگیز خانیوں کے نمائندے کی حیثیت سے اناطولیہ کے تمام فرمانرواؤں پر اپنے اقتدار کا دعویٰ کیا اور 1400ء میں سیواس کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ سلطان بایزید نے تیمور کے باغیوں کو اپنے ہاں پناہ دی جو بالآخر 1402ء میں انقرہ کے قریب سلطان بایزید اور تیمور میں جنگ انگورہ کا باعث بن گئی۔ تیمور نے بایزید کو شکست دے کر گرفتار کر لیا اور اس نے آق شہر کے مقام پر بحالت قید وفات پائی۔ یوں تیمور نے عثمانیوں کو یورپ فتح سے روک دیا۔

سلطان غیاث الدین تغلق (م 1325ء)

غازی ملک، تغلق خاندان کا بانی اور ہندوستان کا مشہور مسلم حکمراں

وہ اصلاً قرونہ ترک تھا اور خراسان سے ترک وطن کر کے ہندوستان آ کر خلجیوں کے ہاں ملازم ہوا تھا۔ 1305ء میں سے پنجاب میں دیبال پور کا صوبیدار مقرر کیا گیا۔ اس نے پندرہ برس تک ہندوستان کے ان علاقوں پر تاتاریوں کے حملوں کو روکے رکھا۔ جب تخت دہلی پر غاصب خسرو خان قابض ہوا۔ اس نے آخری خلجی حکمران قطب الدین مبارک کو قتل کر دیا تھا تو غازی ملک نے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ تین فیصلہ کن جنگوں کے بعد خسرو خان کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ اب سلطنت دہلی کا غیر متنازع حکمران غازی الملک تھا۔ اسے عمائدین سلطنت نے اجماع سے تخت نشین کیا اور اس نے غیاث الدین کا لقب اختیار کیا۔ چونکہ اس وقت سلطنت دہلی کو نہ صرف مغلوں کے حملوں بلکہ ہندوؤں کی سازشوں سے بھی خطرہ تھا اس لیے اسلامی حکومت کے تحفظ اور بحالی کے اس کارنامہ کی وجہ سے معاصر مورخین اسے محافظ اسلام قرار دیتے ہیں اور اُسے ایک مثالی بادشاہ قرار دیا گیا ہے۔ وہ زہد و تقویٰ کا پابند حکمران تھا۔ 1325ء میں بنگال میں ہونے والی خانہ جنگی میں غیاث الدین تغلق نے لشکر کے ساتھ مداخلت کی۔ واپسی پر غیاث الدین نے ایک چوبی خیمہ کے ملبے تلے دب کر وفات پائی

جواس کے استقبال کے لیے اس کے بیٹے جوناخاں کے حکم پر فوری تعمیر کیا گیا تھا۔ ان دنوں ابن بطوطہ بھی ہندوستان آیا ہوا تھا اس نے جوناخاں کو اپنے باپ کی موت کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ غیاث الدین تغلق کے عہد کا اہم واقعہ مورخین ملک کی معیشت بحالی قرار دیا ہے جو خسرو خان کے زمانے میں اقتصادی طور پر تباہ ہو چکی تھی۔ تغلق نے محصول اراضی کے متعلق بھی اصلاحات کیں جن سے اگرچہ ہندو کاشتکار متاثر ہوئے مگر اس سے اس بغاوت کا خطرہ ٹل گیا جو دولت کے چند ہاتھوں میں سمٹنے سے برپا ہو سکتی تھی۔

سلطان قائتبائی (1495ء)

مشہورترین سلطان مصروشام الملک الاشرف ابوالنصر سیف الدین المحمودی الظاہری

قائتبائی کو سلطان برسبائی نے خریدا اور سلطان جمقق نے آزاد کیا۔ اس کے بعد وہ محافظ شاہی اور دوادار اعلیٰ کے دفتر میں محرر ہو گیا۔ بعدازاں اینال کے عہد میں 10 مملوکوں کا امیر، سلطان خوش قدم کے دور حکومت میں امیر طبل خانہ اور پھر تھوڑی ہی مدت میں مقدم الف یعنی ہزاری افسر فوج بنا دیا گیا۔ 872ھ/ 1468ء میں وہ مملوکوں کا سپہ سالار اعلیٰ بن گیا۔ یوں تمام منازل طے کرنے کے بعد جب یکم جمادی الثانی 872ھ/ 1467ء کو تمر بوغا تخت نشین ہوا تو اس نے اپنے دوست قائیتبائی کو اتابک مقرر کر دیا، لیکن سلطان کے ہاتھ میں اصل اقتدار نہیں تھا کیونکہ مولوکوں میں اس کے حامی بڑے کم تھے۔ اتنا خزانہ نہ تھا کہ نئے حمایتی بنا لیے جائیں کیونکہ خزانہ خالی پڑا ہوا تھا۔ اس لیے اسی سال ایک بغاوت رونما ہونے کے بعد تاج و تخت قائیتبائی کو پیش کر دیا گیا اور اس نے کچھ پس و پیش کے بعد قبول کر لیا۔

تخت نشین ہونے کے بعد سب سے بڑا مسئلہ دولت عثمانیہ کے ساتھ تعلقات کا تھا۔ آل عثمان اور مصریوں کے درمیان رقابت باج گزاروں کے درمیان لڑائی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ سلطان محمد فاتح کی جب کرمان شاہ احمد سے جنگ چھڑی تو قائتبائی نے شاہ احمد کی مدد کی اور آگے چل کر اس نے سلطان بایزید ثانی کے بھائی اور تخت کے دعویدار شہزادہ جم کا دوستانہ خیر مقدم کیا مگر دولت عثمانیہ سے صلح جوئی پر بھی قائم رہا۔ اسی سلطان کے عہد میں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمانی بجلی سے شدید نقصان پہنچا تو اس نے مسجد شریف کی تعمیر نو کروائی، حلب میں قصر نو اور قاہرہ کے دروازوں کے سامنے اس کے مقبرے سے متصل مسجد کی تعمیر اس کے تعمیراتی کارنامے ہیں۔ اس نے فریضہ حج بھی ادا کیا اور دریائے فرات کے کنارے تک، وہ اپنی سلطنت کے دورے بھی کیا کرتا تھا۔ اس نے 1495ء میں وفات پائی۔

سلطان محمد فاتح (م 1481ء)

سلطان محمد دوم عثمانیہ سلطنت کا ساتواں فرمانروا اور فاتح قسطنطنیہ

کنیت ابوالفتح تھی مگر مشہور فاتح ہوئی۔ اس نے 1451ء سے اپنی وفات 1481ء تک حکومت کی۔ وہ 83ھ/ 1429ء کو پیدا ہوا اور 9 فروری 1451ء کو بحیثیت سلطان ادرنہ میں داخل ہوا۔ شروع میں ایسا لگتا تھا کہ وہ امن و صلح کی طرف مائل ہے مگر حقیقتاً وہ خاندان عثمانیہ کا سب سے بڑا فاتح بن کر ابھرا۔ اور فتوحات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کے عہد حکومت کا سب سے بڑا اور پہلا کارنامہ قسطنطنیہ کی تسخیر تھا جس کو اسلام کی آمد کے بعد سے گزشتہ 800 سال میں کوئی دوسرا مسلم فاتح فتح نہیں کر سکا۔ اس شہر کی فتح اس لیے بھی یادگار تھی کہ اس کی پیشین گوئی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی۔ اس شہر کے محاصرے کی تیاریاں سلطان محمد فاتح نے 1452ء میں شروع کر دی تھیں اور رومیلی کے حصار کے علاوہ ایک بڑی

توپ خاص اس مقصد کے لیے ڈھالی گئی تھی۔ 29 مئی 1453ء کو بالآخر قسطنطنیہ فتح ہو گیا اور اس کے بعد غلطہ نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔ اگلے سال سلطان کو سربیا کے خلاف کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ 1456ء میں بلغراد کے محاصرے میں ناکامی ہوئی۔ 1458ء اور 1459ء میں سربیا کا ملک براہ راست سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا۔ 1462ء میں سلطان محمد فاتح کی ایشیائی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسرہ، سینوب اور طرابزون بہت جلد فتح کر لیے گئے۔ یورپ میں ولاچیا کے نواب کاؤنٹ کو اس کی ریاست سے نکال دیا گیا اور اس کی ریاست اس کے بھائی رادل RADUL کو دے دی گئی۔ 1463ء اور 1464ء کے دو سال بوسینیا کی سلطنت کا الحاق کرنے میں صرف ہوئے۔ 1463ء میں وینس کی سلطنت سے جنگ چھڑ گئی جو اگلے 17 سال تک جاری رہی۔ 1464ء میں قرہ مان اوغلو ابراہیم کی موت پر اس کی سلطنت کے تمام شہر یکے بعد دیگرے فتح کر لیے گئے۔ اسی سال سلطان یورپ میں البانیا میں بھی کامیابی حاصل ہوئی۔ یونان کا مشہور شہر ایتھنز بھی سلطان محمد فاتح نے ہی فتح کیا۔ ایک عسکری مہم کے دوران ہی 1481ء میں سلطان محمد فاتح نے وفات پائی اور اس کو قسطنطنیہ میں دفن کیا گیا۔ سلطان محمد فاتح ایک عظیم فاتح ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی شاندار عمارتوں کا بھی بانی تھا۔ اسی نے قسطنطنیہ میں جامع فاتح اور مسجد ایوبی تعمیر کرائیں۔ اس کے علاوہ سلطان نے سائنس و ادبیات کے فروغ کی بھی حوصلہ افزائی کی اور اطالیہ میں نشاۃ ثانیہ کو بھی فروغ دیا۔

سلطان مراد اول (م 1389ء)

عثمانی سلطان مراد اول سرزمین یورپ کا پہلا ترک مسلمان فاتح تھا

سلطنت عثمانیہ کا تیسرا فرماں روا۔ وہ آرخان اور ایک بوزنطی خاتون نیلوفر کا بیٹا تھا۔ اس کے ولی عہد بننے سے پہلے اس کے بھائی سلیمان پاشا کو آرخان نے اپنا ولی عہد نامزد کر رکھا تھا مگر سلیمان کی اچانک موت کی وجہ سے جو آرخان کی موت سے کچھ عرصہ پہلے واقع ہوئی مراد غیر متوقع طور پر مملکت عثمانیہ کا حکمران بن گیا۔ یہ تخت نشینی 1360ء کا واقعہ ہے۔ سلطان مراد اول کے عسکری کارناموں کی وجہ سے عثمانی ترکوں کو جزیرہ نما بلقان میں قدم جمانے کا موقع ملا۔ عثمانی ترکوں کی جزیرہ نما بلقان میں کامیابی کی وجہ مورخین کے مطابق بوزنطہ، بلغاریہ اور سربیا کی سلطنتوں میں باہمی عداوت تھی۔ اس کے علاوہ پاپائے روم یہ چاہتے تھے کہ روسی کلیساء کو پھر سے شامل کر لیا جائے۔ ان حالات کی وجہ سے ترکوں کو خود عیسائیوں ہی میں سے مفید حلیف ملتے رہے۔

سلطان مراد اول کی فتوحات کے زمانے کو مورخین نے تین زمانوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے زمانے میں سلطان نے تھریس THRACE کا علاقہ فتح کیا۔ اسی زمانے میں بوزنطی قیصر جان پلیوتوگس نے پہلی بار شاہ مراد کا باجگزار بننا قبول کیا۔ مراد کی فتوحات کا دوسرا دور اس وقت شروع ہوتا ہے جب چرمن کے قریب غالباً 1371ء میں سربیا کی پیش قدمی کو روک دیا گیا اور سربیا کو شکست ہوئی۔ 1385ء میں اس کی فتوحات کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے جب ترکی فوجوں نے البانیہ میں مداخلت کی اور 1386ء میں صوفیا پر ترکوں کا قبضہ ہو گیا۔ 1389ء میں سلطان مراد نے سربیا اور اس کے حلیفوں کو کوسوو KOSOVE کی جنگ میں شکست دی مگر کچھ اپنے لوگوں کی غداری کی وجہ سے ایک عیسائی فراری کے خنجر کا شکار ہو گیا جس نے سلطان سے ملاقات کی اجازت حاصل کی اور جب اسے سلطان کی خدمت میں حاضر کیا گیا تو اس نے سلطان پر خنجر سے حملہ کر دیا اور اس کا کام تمام کر دیا۔

شہنشاہ ظہیر الدین بابر (1483ء تا 1530ء)

ہندوستان کا پہلا مغل فرمانروا، شاعر اور تزک نگار

بابر، ظہیر الدین محمد ہندوستان کا فاتح اور پہلا مغل فرمانروا، والد کی طرف سے اس کا سلسلہ نسب پانچویں پشت میں امیر تیمور سے جا ملتا ہے۔ اس کی والدہ قتلوق نگار خانم تھی جس کا شجرہ نسب پندرھویں پشت میں چنگیز خان سے جا ملتا ہے۔ بابر 6 محرم الحرام 888ھ/ 14 فروری 1483ء کو فرغانہ میں پیدا ہوا۔ جون 1494ء میں وہ اپنے والد کے انتقال پر میرزائے فرغانہ بنا۔

بابر کو اپنے عزیز و اقربا کے ساتھ وسط ایشیا میں جنگ ورثے میں ملی تھی۔ 1497ء تک اس نے اپنے چچا سلطان احمد سمرقندی اور اپنے ماموں سلطان محمود تاشقندی کی وہ تمام کوششیں ناکارہ بنا دیں جو انہوں نے بابر کو اس کے والد کی جانشینی سے محروم کرنے کے لیے کی تھیں۔ پھر اپنے چچازاد بھائیوں کے باہمی جھگڑوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے سمرقند پر بھی قبضہ کر دیا تھا مگر اپنے صدر مقام آذربائیجان میں بغاوت کے خطرے کے پیش نظر اس نے جلد ہی سمرقند چھوڑ دیا۔ بابر کا ایک چچا فرمانروائے کابل تھا۔ اس کی وفات کے بعد 1504ء میں وہ کابل کا حاکم بن گیا۔ فتح سمرقند کے بعد اس نے قندھار پر بھی حملہ کیا مگر ناکام رہا مگر ایسی نادر روزگار شخصیتیں کبھی آرام سے نہیں بیٹھتیں۔

1524ء میں دولت خان لودھی کی دعوت پر وہ لاہور آیا اور اس نے دیپال پور کو بھی فتح کر لیا۔ 1526ء میں پانی پت کے میدان میں بابر نے سلطان دہلی ابراہیم لودھی کو شکست دی اور دہلی و آگرہ پر قبضہ کر لیا۔ پھر ایک طرف راجپوتوں کے سردار رانا سانگا کو کنواہہ کی جنگ میں شکست فاش دے کر اس نے بنگال تک ہندوستان کو فتح کر لیا اور پہلا مغل فرمانروائے ہند بن گیا۔ اپنے بیٹے ہمایوں کی بیماری کے دوران بابر نے 1530ء میں اپنی جان اس پر صدقہ کر کے آگرہ میں وفات پائی۔ اسے کابل میں دفن کیا گیا۔ جنوب ایشیا کے حکمرانوں میں بابر غیر معمولی اوصاف کا مالک انسان تھا۔ وہ انتہائی حوصلہ تھا کہ بڑی سے بڑی مشکل میں اس نے حوصلہ نہ ہارا اور اس کے عزم و استقلال میں کبھی فرق نہیں آیا۔ بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک انتہائی رحم دل اور فیاض انسان بھی تھا۔ صاحب سیف ہونے کے ساتھ ساتھ وہ صاحب قلم بھی تھا۔ اس نے ترکی زبان میں اپنی سوانح عمری ''تزک بابری'' لکھی ہے جو اس زمانے کی ایک بہت اہم تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

سلطان شیر شاہ سوری (م 1545ء)

سوری خاندان کا بانی اور روپیہ کا خالق ہندوستان کا حکمران

شیر شاہ کا اصل نام فرید خان تھا۔ اس کے دادا ابراہیم خان سوری نے افغانستان سے ہندوستان آ کر سکونت اختیار کی تھی۔ اس کا باپ حسن خان صوبہ بہار میں سہسرام کا جاگیردار تھا اور نصیر خان لوہانی کا ملازم تھا۔ بہلول لودھی کے عہد حکومت میں اس کے ہاں فرید خاں 1486ء میں پیدا ہوا۔ فرید خان سے اس کے باپ کا سلوک کچھ اچھا نہ تھا اس لیے گھریلو حالات سے تنگ آ کر فرید حاکم جون پور کے پاس چلا گیا۔ اور اس نے تحصیل علوم حاصل کی۔ اپنی خداداد ذہانت کی بدولت جلد ہی اس نے عربی اور فارسی پر عبور حاصل کر لیا۔ بعدازاں فرید خاں نے سلطان محمد والئی بہار کی ملازمت اختیار کر لی۔ یہ زمانہ بابر کے ہندوستان پر حملے کا تھا۔ کچھ مدت کے لیے فرید خاں جو اب شیر خاں بن گیا بابر کی فوج میں ملازم بھی رہا۔ چند میری کے محاصرے میں اس نے اپنی ذاتی بہادری کے جوہر بھی دکھائے، تاہم وہ بابر کے ساتھ نباہ نہ کر سکا اور بابر کی ملازمت ترک

کر کے ایک افغان سردار جلال خان کے ہاں ملازم ہوگیا۔ جب محمود لودھی نے جلال خاں کو شکست دی تو شیر خاں نے محمود لودھی کی اطاعت قبول کر لی پھر کچھ بعد وہ بہار کے افغانوں کا سردار بن گیا اور اس نے غاصب مغلوں کو ہندوستان سے نکالنے کا عزم صمیم کر لیا۔ کئی سالوں تک فریقین میں ہندوستان کی بادشاہت کے لیے سرکشی ہوتی رہی۔ آخر کار شیر شاہ نے 1540ء میں قنوج کے مقام پر شکست دی اور وہ ایران کی طرف بھاگ گیا۔

اس فتح کے بعد شیر شاہ پورے ہندوستان کے سیاہ و سفید کا مالک بن گیا اور اس نے قلعہ رہتاس تعمیر کر کے سندھ اور ملتان کے علاقوں کو فتح کر لیا۔ انتظام سلطنت کے سلسلے میں شیر شاہ کا شمار دنیا کے بڑے فرمانرواؤں میں ہوتا ہے۔ اس نے صرف پانچ سال ہندوستان پر حکومت کی مگر اس مختصر عرصہ میں نظام حکومت میں اتنی اصلاحات کیں کہ ان کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ انہیں اصلاحات کو بعد کے زمانے میں مغلوں کے بلکہ انگریزوں تک نے اختیار کیا۔ شیر شاہ کا ذکر اس کی تعمیر کردہ جرنیلی سڑک کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اور اسی طرح آج بھی برصغیر میں چلنے والی کرنسی روپیہ بھی اسی نے رائج کی تھی۔ شیر شاہ نے ایک جنگ کے دوران 1545ئ میں میدان جنگ میں وفات پائی۔

سلطان سلیمان قانونی (م1566ء)

سلطان سلیمان ذی شان، سلطنت عثمانیہ کا دسواں اور سب سے عظیم فرمانروا

سلطان سلیمان اعظم چھبیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ تخت نشینی سے پہلے وہ مختلف سنجاقوں (صوبوں) کا والئی رہ چکا تھا اور اسے امور سلطنت کا کافی تجربہ تھا۔ وہ ایک رعایا پرور اور رحم دل حکمران تھا اس لیے وہ رعایا میں ہردلعزیز تھا۔

تخت نشین ہوتے ہی اس نے یورپی طاقتوں کی طرف توجہ دی جو ان دنوں عثمانی سلطنت کے خلاف ساز باز کرنے میں مصروف تھیں۔ اس نے ہنگری سے لڑ کر بلغراد فتح کر لیا پھر جزیرہ روڈس کی تسخیر کر کے جمہوریہ وینس کو از سر نو عثمانی سلطنت کا باج گزار بنا دیا۔ 1526ء میں ہنگری پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ 1529ء میں عثمانی فوجیں یورپ میں آسٹریا کے دارالحکومت وی آنا تک پہنچ گئیں اور انہوں نے ویانا کا محاصرہ کر لیا اگر موسم ناساز گار نہ ہوتا تو یقیناً ویانا کو ترک فتح کر لیتے مگر موسم کی ناسازگاری کی وجہ سے ویانا کا محاصرہ ناکام رہا۔ اس کے تین سال بعد سلطان نے یورپ میں اسٹائریا اور ٹرانسلوانیا کے علاقے فتح کیے۔ 1534ء میں ایشیا میں سلطنت عثمانیہ کی ایرانی سلطنت سے جنگ چھڑ گئی۔ طہماسپ، شاہ ایران ترکوں کا مقابلہ نہ کر سکا اور ترک فوج نے آسانی سے تبریز، موصل، بغداد اور آرمینیا کے علاقے فتح کر لیے۔ سلطان سلیمان اعظم قانونی کے عہد میں بڑے بڑے بحری معرکے بھی لڑے گئے۔ سولہویں صدی میں ہسپانیہ، پرتگال اور وینس کے بحری بیڑے بڑے مضبوط تھے۔ مگر ترکی کے بحری بیڑوں نے ان یورپی بحری طاقتوں کو متعدد بحری معرکوں میں شکست دی اور بحیرہ روم پر ترکی کا اقتدار مکمل طور پر قائم ہوگیا۔ سلیمان کے عہد میں طرابلس اور الجزائر کو فتح کر کے عثمانی قلمرو میں شامل کیا گیا۔ خیرالدین باربروسہ سلیمان اعظم کا مشہور امیر البحر تھا۔ اس نے پرتگال سے بھی کئی جنگیں لڑی تھیں۔ ہنگری میں بغاوت کو دبانے کے لیے سلیمان اعظم عمر رسیدگی کے باوجود خود فوج لے کر 1566ء میں قسطنطنیہ سے بوڈاپسٹ کی طرف روانہ ہوا اس نے اثنائے راہ میں 5 ستمبر 1566ء کو وفات پائی۔

شہنشاہ جلال الدین اکبر (م 1605ء)

ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر، ہندوستان کا تیسرا مغل فرمانروا، مغل اعظم

شہنشاہ ہمایوں شیر شاہ سوری کے ہاتھوں جنگ قنوج میں شکست کھانے کے بعد وادی سندھ میں سرگرداں تھا کہ قلعہ عمر کوٹ میں اکبر کی ولادت ہوئی۔ (بروز یکشنبہ 5 رجب 949ھ/ 15 اکتوبر 1542ء)۔

اکبر کی شیر خوارگی اور کم سنی کا ماحول بڑا پر آشوب تھا۔ وہ نو ماہ کا تھا جب ہمایوں کو ہندوستان چھوڑنا پڑا اور ایران کا رخ کرنا پڑا۔ بچے کو چونکہ اس طویل اور کٹھن سفر پر لے جانا مناسب نہیں تھا اس لیے اسے ماہم انگہ کے سپرد کر کے بھائیوں کے پاس بھیج دیا۔ عسکری میرزا کی لاولد بیوی سلطان بیگم نے اس کی پرورش قندھار میں کی۔ 1545ء میں جب ہمایوں کی واپسی کی خبریں آنے لگیں تو اکبر کو قندھار سے کابل میرزا کامران کے پاس بھجوا دیا گیا۔

ستمبر 1545ء میں ہمایوں نے پہلے قندھار اور پھر کابل کو فتح کیا تو کم و بیش دو سال کے بعد وہ اپنے بیٹے سے ملا۔ اس پر آشوب دور میں اکبر کی تعلیم کا کوئی مستقل انتظام نہ ہو سکا۔ چار سال کی عمر میں مکتب نشینی کی رسم ادا ہوئی مگر اکبر کو تعلیم سے چنداں رغبت نہیں تھی تاہم فنون سپاہ گری میں اس نے مہارت تامہ حاصل کی اور حکومت کے اسرار و رموز سے بھی وہ ابتدائے عمر ہی میں آشنا ہو گیا۔ ہمایوں کی اچانک 24 جنوری 1556ء کو دہلی میں وفات کے بعد بیرم خاں نے لانور ضلع گورداس پور میں اکبر کی بادشاہت کا اعلان کر دیا مگر ہمایوں کی وفات کے بعد بہت سے فتنوں نے سر اٹھایا اور ہیمو بقال نے آگرے میں سکندر خاں ازبک اور پھر دہلی میں تردی بیگ کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا اور وہ خود راجہ بکرماجیت کا لقب اختیار کر کے اس نیت سے پنجاب کی طرف بڑھا کہ مغلوں کو ہندوستان سے نکال دے۔ پھر 10 محرم 964ھ/ 5 نومبر 1556ء کو پانی پت کے میدان میں دوسری بڑی جنگ لڑی گئی اور بازی ایک بار پھر مغل جیت گئے اور اس فتح کے بعد دہلی اور آگرہ پر مغلوں کا قبضہ بحال ہو گیا۔ پھر اکبر نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ کر حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی اور تفوق اور برتری فی نفسہ کے لیے بلا تامل ایک علاقہ کے بعد دوسرا علاقہ فتح کرتا چلا گیا مگر اکبر کی عظمت کا انحصار صرف عسکری کارناموں پر نہیں تھا۔ قدرت نے اسے تنظیم کی غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا اسی وجہ سے وہ اکبر اعظم کہلایا اور اس نے حکومت کے ہر شعبے میں اصلاح و تبدیلی کی اور اپنی سلطنت کے استحکام کے لیے ایک نیا دین، دین الٰہی اکبر شاہی تک ایجاد کیا۔ اکبر نے کل انچاس سال آٹھ ماہ حکومت کی۔

عباس اعظم صفوی (م 1629ء)

عباس مرزا الملقب بہ اعظم، ایران کے صفوی خاندان کا عظیم فرمانروا

تخت نشینی کے وقت شاہ عباس اعظم کی عمر صرف سولہ برس تھی۔ اس لیے شروع میں علی قلی خاں اور مرشد قلی یکے بعد دیگرے اس کے سرپرست بنے لیکن بہت جلد یہ نامور بادشاہ مرشد قلی کا خاتمہ کر کے ایران کا بلا شرکت غیرے حکمران بن گیا۔

جن دنوں ایران میں سیاسی ابتری پھیلی ہوئی تھی ترکوں کے ایک جرنیل فرہاد پاشا عثمانی نے ایران پر حملہ کر کے تبریز، موصل اور بغداد وغیرہ کے علاقے فتح کر لیے تھے۔ ترکوں سے مسلسل جنگ جاری تھی کہ وسطی ایشیا کے ازبکوں نے ایران پر لگاتار حملے کر کے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ دو بیرونی طاقتوں سے لڑنا شاہ ایران کی وجی طاقت سے باہر تھا اس لیے شاہ عباس اعظم نے ترکوں کے ساتھ معاہدہ صلح کر لیا جس کی رو سے تبریز، شیروان اور بحیرہ خزر کے علاقے ایرانیوں کو واپس مل گئے اور دوسری

طرف انہیں ازبکوں سے لڑنے کے مواقع میسر آ گئے۔ ازبکوں نے حملہ کر کے حضرت امام علی رضا کے مقبرے کا سامان تک لوٹ لیا تھا اور مشہد کو فتح کر لیا تھا۔ عباس اعظم عارضی دست برداری کی وجہ سے ازبکوں کے خلاف کوئی موثر کروائی نہ کر سکا۔ پھر صحت یابی کے بعد عباس اعظم نے ہرات کے قریب ازبکوں کو شکست فاش دی اور ایرانی فوجوں کی تنظیم نو کی۔ قزلباش فوجی سرداروں کا زور توڑنے کے بعد اس نے ایرانی فوج میں توپ خانے کا اضافہ کیا اور ایرانی سپاہیوں کو انگریزی طریقے سے لڑنے کی فوجی تربیت دلوائی۔ 1602ء میں ترکوں نے سلماس پر حملہ کیا تو شاہ عباس جنگ کے لیے تیار تھا۔ اس نے ترکوں سے جھیل ارومیہ کے کنارے ایک خونریز جنگ لڑی جس میں ایرانیوں کا پلڑا بھاری رہا اور ان کردستان، آذربائیجان، موصل و بغداد اور دیگر علاقے واپس مل گئے اور ترکی سے ایک جدید صلح نامہ طے پا گیا۔ مگر اس کے بعد بھی ترکوں نے تین مرتبہ ایران سے جنگ چھیڑی مگر ناکام رہے۔ شاہ عباس نے 1627ء میں بعمر ستر سال وفات پائی۔

شہنشاہ شہاب الدین شاہجہاں (م 1658ء)

تاج محل کا خالق، شہاب الدین صاحبقران ثانی، ہندوستان کا مشہور معمار بادشاہ

شہنشاہ جہانگیر کی وفات کے وقت شاہ جہاں دکن میں تھا اور شہزادہ شہریار آگرہ میں۔ شہریار نے جب باپ کی وفات کی خبر سنی تو فوراً اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ مگر شاہجہاں کے خسر آصف جاہ نے ایک تیز رفتار ایلچی کے ذریعے شاہجہاں کو جہانگیر کی وفات کی خبر بھجوائی اور ابھی شاہجہاں آگرہ نہیں پہنچا تھا کہ آصف جاہ نے لاہور کے قریب شہریار کو شکست دے کر قید کرا لیا۔

شاہجہاں اپنے والد کے انتقال کی خبر ملتے ہی دکن سے آگرہ پہنچا اور فروری 1628ء میں نہایت شان و شوکت کے ساتھ تخت نشین ہوا۔ تخت نشینی کے بعد اس نے آصف جاہ کو جاگیروں سے نوازا جبکہ آصف جاہ نے شہریار، دانیال اور خسرو کے تمام بیٹوں کو قتل کروا دیا تا کہ تخت کا کوئی دوسرا دعویدار باقی نہ رہے۔ شاہ جہاں کو تخت نشین ہوئے ابھی صرف دو برس ہوئے تھے کہ دکن کے صوبیدار خان جہاں لودھی نے بغاوت کر دی اور دیگر شاہان دکن سے ساز باز کر لی۔ مگر مغلیہ افواج نے اسے دھول پور کے مقام پر شکست دی، وہ 1633ء میں کالنجر کے قریب مغل افواج سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ بندیل کھنڈ میں راجہ جھجار سنگھ نے بھی علم بغاوت بلند کیا مگر اسے بھی شکست دی گئی اور وہ بھی مارا گیا۔ اکبر اور جہانگیر کے عہد سے پرتگیزوں نے دریائے ہگلی کے کنارے تجارتی کوٹھیاں بنانا شروع کر دی تھیں اور ہندو اور مسلمان یتیم بچوں کو عیسائی بنانا شروع کر دیا۔ ایک مرتبہ انہوں نے ملکہ ممتاز محل کی دو باندیوں کو پکڑ لیا۔ بنگال کے حاکم نے ان کے خلاف کارروائی کی اور ہگلی کو فتح کر لیا۔ شاہجہان کے عہد میں ایران سے قندھار کے لیے جنگ ہوئی مگر قندھار دوبارہ مغلوں کے قبضے میں نہ آ سکا۔ شہزادے اورنگ زیب کو وسطی ایشیا کے شہروں بلخ و بدخشاں کی تسخیر کے لیے بھیجا گیا مگر حالات کی ناموافقت کی وجہ سے کامیابی نہ ہوئی۔ دکن میں بھی اورنگ زیب کی سرکردگی میں کئی مہمات بھیجی گئیں۔ شاہجہاں برصغیر کا معمار بادشاہ کہلاتا ہے۔ اس کی تعمیر کردہ عمارتیں آج بھی موجود ہیں۔ ان میں تاج محل آگرہ، لال قلعہ دہلی، شالامار باغ لاہور، شاہجہانی مسجد ٹھٹھہ بڑی اہم ہیں۔ بہر حال تاج محل کا شمار جدید عجائبات عالم میں ہوتا ہے۔ یہ مقبرہ شاہجہان نے اپنی ملکہ ممتاز محل کی یاد میں تعمیر کرایا تھا۔ شاہجہان نے 1666ء میں وفات پائی۔

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر (م 1707ء)

محی الدین اورنگ زیب عالمگیر، ہندوستان کا آخری عظیم مغل فرمانروا

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی کنیت ابوظفر محی الدین تھی وہ 1027ھ/ اکتوبر 1628ء میں پیدا ہوا اور شاہجہاں اور ممتاز محل کا بیٹا تھا۔ اس کے دادا شہنشاہ جہانگیر نے اس کا نام "سلطان اورنگ زیب" رکھا تھا۔ اورنگ زیب بچپن ہی سے ذہین شجاع اور بہادر تھا۔ اس نے چودہ سال کی عمر میں ایک غضبناک ہاتھی پر حملہ کر کے انتہائی بہادری کا مظاہرہ کیا تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اسے پہلے عسکری مہم جو ایک باغی راجہ جھجار سنگھ کے خلاف تھی سپرد ہوئی۔ بندھیل کھنڈ کی اس عسکری مہم کے بعد اورنگ زیب کو دکن کا صوبیدار بنا دیا گیا اور اورنگ زیب دکن کے بگڑے ہوئے حالات کو سدھارنے میں آٹھ سال تک مصروف رہا۔ اورنگ زیب کی شادی نواز خان کی بیٹی دلرس بیگم سے ہوئی۔ یہ اورنگ زیب کی پہلی شادی تھی اس سے اورنگ زیب کے ہاں پانچ اولادیں پیدا ہوئیں۔ اس کے علاوہ اورنگ زیب نے اور شادیاں بھی کیں۔

ستمبر 1646ء میں اورنگ زیب کو بلخ و بخارا کی عسکری مہم سونپی گئی اور اس نے ازبکوں کو شکست دی تاہم دشوار گزار راستوں، دروں اور پہاڑوں سے برفانی موسم میں گزرتے ہوئے اس کی فوج کا بڑا حصہ جاں بحق ہو گیا۔ اس مہم سے واپسی پر اورنگ زیب کو گورنر ملتان مقرر کیا گیا اور اسے قندھار کی مہم تفویض ہوئی۔

باپ کے شدید بیمار ہو جانے پر اورنگ زیب اور اس کے بھائیوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی اور اس کے تینوں بھائی اس سے شکست کھا گئے۔ باپ کو بھی نظر بندی قبول کرنا پڑی۔ اورنگ زیب نے تخت نشینی کے بعد تقریباً پچاس سال حکومت کی۔ ان پچاس سالوں میں سے پہلے پچیس سال شمالی ہند اور آخری پچیس سال جنوبی ہند کی مہمات میں صرف ہوئے اور دکن میں مغلیہ سلطنت اس حد پر پہنچ گئی جو اسے پہلے نصیب نہ ہوئی تھی۔ اورنگ زیب نے مرہٹوں، سکھوں اور ست نامیوں کی شورشوں کو بڑی بہادری سے دبا دیا اور پوری سلطنت کو ایک نظام کا پابند بنا دیا۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کا مدبر، منتظم، بیدار مغز حکمران، بہادر، باتدبیر اور صاحب عزم سپہ سالار، وقت کا ممتاز عالم، یگانہ صاحب قلم، پابند شریعت اور زاہد بادشاہ تھا۔ اورنگ زیب نے فقہ حنفی کی مشہور کتاب "فتاویٰ عالمگیری" خود اپنی نگرانی میں مرتب کرائی خود قرآن مجید لکھ کر اور ٹوپیاں سی کر اپنی روزی کا سامان کرتا تھا۔ ایشیا بھر کے سلاطین میں ایک مثالی حیثیت کا حکمران تھا۔ اس نے 1707ء میں وفات پائی۔ اس کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت زوال و انحطاط کا شکار ہو گئی۔

بہادر شاہ ظفر (م 1862ء)

ہندوستان کا آخری مغل تاجدار، ابوالمظفر سراج الدین بہادر شاہ غازی

ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ غازی، آخری مغلیہ تاجدار ہندوستان۔ 27 شعبان 1189ھ/ 24 اکتوبر 1775ء کو دہلی میں پیدا ہوا اور اس نے 13 جمادی الاول 1279ھ/ 7 نومبر 1862ء میں بحالت نظر بندی رنگون، برما میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہے۔ وہ مغل شہنشاہ اکبر شاہ ثانی اور لال بائی کا دوسرا بیٹا تھا۔ اس کا سلسلہ نسب گیارہویں پشت میں ظہیر الدین بابر سے جا ملتا ہے۔

1253ھ/ 1837ء میں لال قلعہ دہلی میں تخت نشین ہوا اور 1857ء تک برائے نام بادشاہ رہا۔ اس زمانے میں مورخین کے مطابق اس کی حیثیت محض ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک وظیفہ خوار کی تھی اور اس کا اقتدار، قلعہ معلیٰ، لال قلعہ کی چار

دیواری تک محدود تھا۔ اسے ایسٹ انڈیا کمپنی سے ایک لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کے عہد حکومت کے دوران ایسے سکے جاری کر دیئے تھے جس پر بادشاہ کا نام موجود نہیں تھا۔ گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف کی طرف سے اس کے دربار میں پیش کی جانے والی نذروں کا سلسلہ بھی موقوف ہو چکا تھا۔ بادشاہ نے اپنے وظیفہ میں اضافہ کے لیے راجہ موہن داس کو اپنا نمائندہ بنا کر لندن بھیجا مگر وہاں شنوائی نہ ہوئی۔

بہادر شاہ اپنے چھوٹے بیٹے مرزا جواں بخت کو اپنا ولی عہد بنانا چاہتا تھا مگر انگریزوں نے پہلے فخر الدین کو اور پھر اس کی موت کے بعد محمد قریش شکوہ کو ولی عہد بنانا چاہا۔

11 مئی 1857ء کو میرٹھ چھاؤنی میں ہندوستانی فوج نے بغاوت کر دی اور بعد ازاں حریت پسندوں نے دہلی میں بہادر شاہ کو اپنا سربراہ بنا کر انگریزوں سے معرکہ آرا ہونے کی تیاریاں شروع کر دیں مگر ستمبر 1857ء میں انگریزوں نے دہلی پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور 22 ستمبر کو میجر ہڈسن نے بہادر شاہ کو گرفتار کر کے اس کے شہزادوں کو قتل کر دیا۔ سر جان لارنس نے بادشاہ پر مقدمہ بغاوت چلایا اور اسے بالآخر جلاوطنی کی سزا دی۔ اسے انچاس انگریزوں کے قتل کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ 17 اکتوبر 1858ء کو بہادر شاہ کو رنگون بھجوا دیا گیا جہاں اس نے وفات پائی۔

مورخین کا اتفاق ہے کہ بہادر شاہ مغل بادشاہوں میں انتہائی مہذب، شائستہ اور نیک انسان تھا۔ 1837ء میں چارلس مٹکاف نے اس کے متعلق رائے ظاہر کی تھی کہ وہ مغل شہزادوں میں سب سے زیادہ قابل احترام ہے۔ وہ خطاط، شاعر اور ماہر موسیقی بھی تھا۔

سلطان حیدر علی (م 1782ء)

سلطنت خداداد میسور (جنوبی ہندوستان) کا بانی حکمران

سلطان حیدر علی قریشی النسب تھا اور اس کا خاندان دسویں صدی ہجری میں مکہ سے ہجرت کر کے ہندوستان آیا تھا۔ وہ خود 1134ھ/1722ء میں ضلع کولار میں پیدا ہوا۔ اس کا والد شیخ فتح محمد جنوبی ہند کے مغل سوبیدار کا منصب دار تھا۔ اس کی والدہ ایک مقامی زمیندار کی دختر تھی۔ حیدر علی ابھی پانچ سال کا تھا کہ اس کا والد ایک لڑائی میں مارا گیا۔ یتیم حیدر علی کی پرورش اس کے چچازاد بھائی حیدر صاحب نے کی وہ میسور کی فوج میں ایک عہدہ دار تھا۔ حیدر علی نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد کرناٹک کے نواب محمد علی والا جاہ کی ملازمت اختیار کی۔ اس زمانے میں میسور پر ایک کٹھ پتلی راجا کی حکومت تھی۔ اور اصل اقتدار اس کے وزیر اور خسر نندراج کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے حیدر صاحب کی سفارش پر حیدر علی کو سرنگاپٹم میں ریاستی فوج میں ایک دستے کی کمان سونپ دی۔ حیدر علی نے اندرون ریاست کی شورشوں کو کچلنے اور کارناٹک کی جنگوں میں ایسی جانبازی دکھائی کہ نندراج نے اس کی فوجی صلاحیتوں کے اعتراف میں اسے ڈنڈیگل کا گورنر مقرر کیا۔ اسی زمانے میں مرہٹہ پیشو (بالاجی باجی راؤ) نے میسور پر حملہ کیا۔ راجا نے ایک کروڑ روپیہ ادا کرنے کا وعدہ کیا اور ریاست کا بڑا حصہ بطور یرغمال اسے دے دیا۔ جب راجا یہ رقم ادا نہ کر سکا تو حیدر علی نے اطراف و جوانب سے رقم اکٹھی کر کے راجا کو دی تو وہ خوش ہوا۔ بعد ازاں حیدر علی نے نندراج کو گرفتار کر کے خود حاکم خود مختار بن گیا مگر راجا کو اقتدار پر قائم رکھا۔ پانی پت کی جنگ میں مرہٹوں کی شکست کے بعد حیدر علی نے مرہٹوں سے چھینا ہوا علاقہ واپس لے لیا اور کئی چھوٹی ریاستیں بھی فتح کر لیں۔ بدنور کی فتح کے بعد کثیر دولت ہاتھ آئی اور حیدر علی نے اپنے نام کا سکہ ضرب کرایا۔ ہمسایوں سے لڑائیاں جاری رہیں اور انگریز جو نئے حریف تھے انہوں نے بھی حیدر علی سے دب کر صلح کی۔ پھر انگریزوں سے دوسری جنگ چھڑ گئی جس میں بکسر کے فاتح انگریز

جنرل سر ہیکڑ منرو تک سے ہتھیار رکھوا لیے گئے۔ اسی دوران حیدر علی کا بعارضہ کینسر دسمبر 1782ء میں انتقال ہو گیا۔ اس کی بہادری، سپہ سالاری، ذہانت کی دوست و دشمن بھی داد دیتے ہیں۔ بحیثیت منتظم بھی حیدر علی اعلیٰ ترین صلاحیتوں کا مالک تھا۔

نظام ملک آصف جاہ (م 1748ء)

دکن کی سلطنت آصف جاہی کے بانی اور شاہ جہاں کے وزیر سعد اللہ خاں کے نواسے

میر قمر الدین، چین قلیچ خاں، نظام الملک 1671ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب خواجہ شہاب الدین سہروردی کے واسطے سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ ان کے آباواجداد بخارا سے ہندوستان آئے تھے۔ میر قمر الدین شاہجہاں کے مشہور وزیر سعد اللہ خان کے نواسے تھے۔ والد شہاب الدین، غازی الدین کی زندگی میں مرہٹوں کے ساتھ جنگوں میں بہادرانہ کارنامے انجام دینے کی بنا پر انہیں مغلیہ دربار سے منصب پنج ہزاری عطا ہوا تھا اور ساتھ ہی چین قلیچ خاں کا خطاب بھی دیا گیا تھا۔ بہادر شاہ اول کے عہد میں دربار کے حالات سے بددل ہو کر خانہ نشین ہو گئے تھے۔ فرخ سیر نے منصب ہفت ہزاری عطا کر کے دکن کی صوبیداری پر فائز کیا مگر سادات بارہہ نے جو بادشاہ گر کے نام سے مشہور تھے دکن سے واپس بلا کر مالوہ کی صوبیداری پر فائز کیا۔ محمد شاہ رنگیلا کے عہد میں نظام الملک نے سادات بارہہ کو شکست دے کر دکن کی صوبیداری دوبارہ حاصل کر لی اور مالوہ پر بھی قبضہ کر لیا (1720ء) سادات بارہہ کے خاتمے پر نظام الملک کو وزیر اعظم بنایا گیا۔ مگر دربار کے ناسازگار حالات کی وجہ سے انہوں نے دکن کا رخ کیا اور وہاں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا مگر مغلیہ دربار کی خیر خواہی بھی کرتے رہے۔ نادر شاہ درانی کے حملے کی خبر سن کر محمد شاہ نے نظام الملک کو حیدر آباد سے واپس بلا لیا۔ نظام الملک نے ایک خطیر رقم کے عوض نادر شاہ کو کرنال کے مقام سے واپس چلے جانے پر راضی کر لیا لیکن برہان الملک نے اسے دہلی جانے کی رائے دی۔ اس طرح مغلیہ شاہان کی جمع کردہ دولت پر نادر شاہ کو قبضہ کرنے کا موقع مل گیا اور اس نے دہلی میں قتل عام بھی کرایا۔ نادر کے واپس چلے جانے کے بعد نظام الملک دکن واپس چلا گیا جہاں اس کا بیٹا ناصر جنگ خود مختار بن بیٹھا تھا۔ نظام الملک نے اسے شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ 1748ء میں برہان پور میں انتقال کیا۔ نظام الملک حرب وسیاست دونوں کا ماہر تھا، فاضل اور علم دوست ہونے کے ساتھ عفو اور فیاضی اس کی پسندیدہ عادات تھیں۔ خود شعر بھی عمدہ کہتا تھا۔

محمد علی پاشاہ (م 1848ء)

مصر کا مشہور حکمران اور نائب السلطنت عثمانیہ

مصر کا خدیو، پیدائشی طور پر ایک یونانی تھا۔ 1805ء میں سلطنت عثمانیہ کی طرف سے مصر کا حکمران بنا۔ ابتداء میں اس نے عثمانی سلطنت کے والی کے طور پر خدمات انجام دیں۔ 1818ء میں جب نجد میں فتنہ وہابیت ابھرا تو اس نے نجد پر قبضہ کر کے اس فتنہ کو دبا دیا۔

1826ء میں یونان کی بغاوت کو فرو کیا بعد ازاں سلطان محمود ثانی سے اختلاف کی بنا پر اس نے خود 1831ء میں سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ تاہم اگلے سال مغربی طاقتوں کے دباؤ کی وجہ سے باب عالی سے صلح کر لی اور سلطان محمود ثانی نے اسے صوبہ شام کا بھی والئی بنا دیا۔ 1841ء میں اسے مصر کا موروثی والی یا خدیو مصر بنا دیا گیا۔ اسی دوران اس نے 1820ء میں نوبہ کو اور 1821ء میں سوڈان کو شہر سنار تک فتح کر لیا تھا۔ مصر کا حکمران بننے کے بعد اس نے مصر کے نظام حکومت میں متعدد فوجی، سیاسی اور سماجی تبدیلیاں کیں اور مصر کو خوشحال بنایا اور فرانسیسی مشیروں کے تعاون سے ملک میں

جدید فوجی نظام کی بنیاد ڈالی اور مصر کے باشندوں کو پہلی مرتبہ فوج میں بھرتی کیا۔ اس کے علاوہ فوجی تربیت کے لیے جا بجا فوجی مدرسے، انجینئرنگ کے کالج اور طبی مدارس قائم کیے۔ اسکندریہ کی بندرگاہ کو ترقی دینے کے ساتھ ساتھ جہاز سازی کا کارخانہ بھی قائم کیا۔ 1822ء میں مضافات قاہرہ میں مصر کا سب سے پہلا چھاپہ خانہ یا پرنٹنگ پریس قائم کیا۔ اس نے اسکندریہ میں 1848ء میں انتقال کیا اس کے بعد اس کا بیٹا بھی اپنے باپ کی طرح بہادر اور اعلیٰ پائے کا منتظم ثابت ہوا۔ اس نے قاہرہ میں محمد علی پاشا مسجد کے نام سے ایک شاندار مسجد قائم کی تھی۔

مولائی حسن (م جون 1894ء)

ابو علی، سجلماسہ کے حسنی اشراف کا چودھواں فرمانروا، سلطان مراکش

الحسن مولائی، ابو علی، 12 ستمبر 1873ء سے لے کر 9 جون 1894ء تک کے لیے مراکش کا سلطان۔ وہ سیدی محمد بن عبدالرحمٰن کا بیٹا تھا۔ انہیں کا وہ سینتیس برس کی عمر میں جانشین بنا۔ تاہم اس کی تخت نشینی کے جلد بعد متعدد مقامات پر بغاوتیں پھوٹ پڑیں۔ سلطان نے بڑی تیزی سے اور بغیر کوئی ظلم کیے یہ بغاوتیں انتہائی کامیابی سے دبا دیں۔ اس نے اپنے عہد کا بڑا حصہ ایسی عسکری مہمات میں گزارا جن کا مقصد بربر قبائل کی اطاعت کو برقرار رکھنا تھا۔ ایسی ہی ایک طویل مہم سے واپسی پر تافیلات سے واپس آتے ہوئے وہ فوت ہو گیا۔ فوج کے دارالحکومت پہنچنے تک اس کی موت کو صیغہ راز میں رکھا گیا۔ دارالحکومت پہنچنے کے بعد اس کے نوجوان بیٹے عبدالعزیز کو اس کے جانشین کے طور پر تخت نشین کیا گیا۔

اپنے والد اور دادا کی طرح خود سلطان مولائی حسن نے مراکش کو جدید بنانے کی ضرورت کو سمجھ لیا تھا اور سب سے پہلے جس حصے کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا وہ فوج تھی۔ اس نے مستقل اور باقاعدہ فوجی دستے قائم کیے تھے اور 1877ء کے بعد سے فرانسیسی اور انگریز اپنی فوج کی تربیت کے لیے بلوائے تھے۔ مزید براں اپنی فوج کے کچھ دستے جبرالٹر بھیجے تاکہ انگریزی فوجی دستوں کے ساتھ عملی تربیت حاصل کر سکیں۔ سلطان نے یورپ سے جدید اسلحہ خریدا اور مراکش میں کارتوس بنانے کا کارخانہ اور فاس میں ایک جدید اسلحہ خانہ بھی قائم کیا۔ اس نے مراکش میں جدید بحری بیڑے کی بھی بنیاد رکھی۔ اس نے مراکش میں دلچسپی رکھنے والی یورپی طاقتوں سے بھی روابط قائم کرنے میں سرگرمی کا اظہار کیا جس کے بعد متعدد ملکوں کے سفیر رباط پہنچے۔ برطانیہ کے اصرار پر مراکش کے متعلق اس نے پہلی بین الاقوامی کانفرنس 19 مئی سے 3 جولائی 1880ء تک میڈرڈ میں منعقد کرائی۔ یہ کانفرنس شریفی سلطنت میں یورپی طاقتوں کے حقوق کے متعلق تھی۔ اس طرح سلطان مولائی حسن اپنے اس اقدام میں مضر خطرات کو نہ جانتے ہوئے مراکش بین الاقوامی الجھنوں میں ڈالنے کا موجب بنا جن سے 1912ء میں چھٹکارا ملا۔

سلطان عبدالعزیز بن عبدالرحمان ابن سعود (م 1953ء)

دولت سعودی عربیہ کا بانی اور صیہونیت کے خلاف عربی تحریک کا قائد

کویت کے شیخ مبارک کی مدد سے، جس کے پاس اس کے باپ نے اپنی جلاوطنی کے دوران پناہ لی تھی، اس نے 1902ء میں محمد بن رشید کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور صرف دس آدمیوں کے ساتھ ریاض پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ابن رشید نے بالآخر ترکوں کو مدد کے لیے بلایا۔ تاہم اس بدنظمی کی وجہ سے جو ان دنوں نجد میں پھیلی ہوئی تھی اور نجد کے عوام کی چاہت کی وجہ سے عبدالعزیز سلطنت ریاض و نجد کے اقتدار کو دوبارہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بعد ازاں اسی عبدالعزیز

بن عبدالرحمٰن نے موجودہ مملکۃ السعودیہ العربیہ قائم کی جس میں نجد وحجاز دونوں شامل تھے۔ 8 جنوری 1926ء کو مکہ، مدینہ اور جدہ کی فتح کے بعد اس نے شاہ حجاز ہونے کا اعلان کیا اور سلطان نجد کا لقب ترک کر دیا۔ 20 مئی 1927ء کو اس کے اور برطانیہ کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جس کی رو سے برطانیہ نے مملکت سعودیہ کی آزادی کو تسلیم کر لیا۔ 1932ء میں اس مملکت کا نام المملکۃ السعودیہ العربیہ رکھا گیا۔ 1937ء میں شاہ عبدالعزیز نے ایک معاہدہ یمن کے ساتھ کیا جس کی رو سے دونوں مملکتوں کی سرحدوں کا تعین کیا گیا۔

1942ء میں شاہ عبدالعزیز نے ایک معاہدہ برطانیہ کی وساطت سے شیخ کویت سے کیا اور نجد اور کویت کے درمیان دوستانہ تعلقات اور تجارتی مراسم قائم کر دیئے۔ شاہ عبدالعزیز نے 1953ء میں طائف میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سعود تخت نشین ہوا۔ نجد کے صحراؤں میں تیل جیسی مائع دولت کے خزانے دریافت ہو جانے کے بعد دولت سعودیہ کی کایا پلٹ گئی اور سعودی عرب ایک متمول اور امیر ملک تسلیم کیا جانے لگا۔

محمد رضا شاہ پہلوی (م 1980ء)

ایران کا دور جدید کا آخری بادشاہ اور پہلوی خاندان کا آخری حکمران

تہران میں 26 اکتوبر 1919ء کو پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم بھی تہران میں پائی۔ بعد ازاں اعلیٰ تعلیم سوئٹزرلینڈ سے حاصل کی۔ 1938ء میں تہران کی ملٹری اکادمی کے اسٹاف کالج سے فوجی تربیت حاصل کی اور 16 ستمبر 1941ء کو اپنے والد کے تخت سے دستبردار ہونے کے بعد ایران کا تاج وتخت سنبھالا۔ محمد رضا شاہ پہلوی کی پہلی شادی مصر کے بادشاہ فاروق کی بہن ثریا سے ہوئی لیکن جب اس کے بطن سے کوئی اولاد نرینہ نہ ہو سکی تو دوسری شادی فرح دیبا سے کی جس کے بطن سے اس کا ولی عہد پیدا ہوا۔

1948ء تا 1971ء شاہ نے متعدد ایشیائی، یورپی اور امریکی ممالک کا دورہ کیا۔ شہنشاہ محمد رضا شاہ پہلوی نے دو کتابیں بھی لکھی تھیں جن میں اس نے اپنے عہد حکومت کی حکمت عملیوں اور سفید انقلاب ایران کا ذکر کیا تھا۔ ان کے عہد کا زریں کارنامہ اکتوبر 1971ء میں ایران میں بادشاہت کے 2500 سالہ جشن کی وہ تقریب تھی جس میں دنیا بھر کے سربراہان مملکت نے شرکت کی تھی۔ محمد رضا شاہ پہلوی نے اپنے عہد حکومت کے دوران ایران کو دفاعی اعتبار سے ایک مضبوط ملک بنا دیا تھا اور تہران ایشیا کا پیرس کہلانے لگا تھا۔

1978ء اور اس سے پہلے سے پہلوی حکومت کی حکمت عملیاں عوام ان کے مذہبی راہنماؤں کے نظریات سے ٹکرا گئیں جس سے ملک میں سیاسی بے چینی پیدا ہو گئی جو 1979ء میں آنے والے اسلامی انقلاب ایران کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اسی انقلاب کے نتیجے میں شاہ کو بالآخر ایران کو چھوڑنا پڑا۔ شاہ نے امریکا، پانامہ اور میکسیکو میں رہائش اختیار کرنے کی درخواست کی مگر ناکامی ہوئی اور کسی ملک نے شاہ کو اپنے ہاں رہنے کی دعوت نہیں دی سوائے مصر کے جہاں بالآخر شاہ کو سکونت اختیار کرنے کی اجازت مل گئی۔ شاہ کینسر کے موذی میں مبتلا تھے باوجود علاج کے اس نے قاہرہ کے فوجی ہسپتال میں وفات پائی (24 جولائی 1980ء)

شاہ حسین آف اردن (م1999ء)

اردن کی ہاشمی مملکت کے تیسرے حکمران ایک زیرک عرب سیاستدان

حسن بن طلال بن عبداللہ۔ اردن کے شاہ عبداللہ اول کے پوتے اور شاہ طلال کے فرزند۔ 1935ء میں عمان میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ کا نام ملکہ زین تھا۔ ابتدائی فوجی تربیت، وکٹوریہ کالج سکندریہ میں حاصل کی بعد ازاں انگلستان کی مشہور فوجی درسگاہ سینڈہرسٹ کالج سے اعلیٰ فوجی تربیت مکمل کی۔ انگلستان کے مشہور اسکول ہیرو میں بھی زیر تعلیم رہے۔ والد کی ذہنی بیماری کی وجہ سے حکومت سے دست برداری کے بعد 1952ء میں انہیں صرف سترہ برس کی عمر میں تاج وتخت سنبھالنا پڑا۔ ان کے عہد کے اہم واقعات میں جان گلب (گلب پاشا) کی بحیثیت اردن کے درمیان فوجی میثاق (1956ء) اردن سے انگریزی فوجوں کا اخراج (1958ء) اردن اور عراق کا اتحاد جو اتحاد العربی کہلاتا تھا اس کا قیام اور اس کی تنسیخ۔ مملکت سعودی عربیہ کے ساتھ اقتصادی، فوجی اور ثقافتی عہد و پیمان (1962ء) شاہ حسین نے اپنی مملکت کے حالات پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔

1948ء میں اسرائیل کے قیام کے بعد اردن کی فوجوں نے یروشلم کے پرانے شہر کو فتح کر لیا تھا وہ 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ تک اردن میں شامل رہا۔ شاہ حسین پر کئی مرتبہ قاتلانہ حملہ بھی کیا گیا۔ تاہم وہ ان حملوں میں محفوظ رہا اور کئی بار معجزانہ طور پر بچ گیا۔ ان کے خلاف کئی بار بغاوتیں بھی ہوئیں جو ناکام ہوگئیں۔ 2 مئی 1952ء کو انہوں نے اردن کی بادشاہت کو آئینی قرار دیا تھا۔ یکم نومبر 1953ء کو انہوں نے اردن کی پارلیمنٹ کے پہلے اجلاس کا افتتاح کیا تھا۔ شاہ حسین اردن کی افواج کے کمانڈر ان چیف بھی تھے۔ 1962ء میں انہوں نے اپنی خودنوشت UNEASY LIES THE HEAD شائع کی تھی۔ 1972ء میں انہوں نے اردن کی ملکہ نور سے شادی کی تھی جو ایک انگریز خاتون ہیں۔ وہ پائلٹ بھی تھے۔ 1988ء میں اس نے دریائے اردن کا مغربی کنارہ فلسطین کے حوالے کرنے کا اعلان کیا تھا۔ جون 1991ء میں انہوں نے اردن میں سیاسی سرگرمیاں بحال کر دی تھیں۔ 1999ء میں بعارضہ کینسر وفات پائی۔

اولیائے کرام ومشائخ عظام

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ
حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ
حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ
حضرت حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ
حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ
حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ
حضرت فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ
حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ
حضرت لعل شہباز قلندر رحمۃ اللہ علیہ
حضرت شاہ کمال قادری کیتھلی رحمۃ اللہ علیہ
حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ
حضرت طاہر بندگی رحمۃ اللہ علیہ
حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ
حضرت بلھے شاہ
حضرت خواجہ سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ
حضرت شاہ علی احمد قادری کیتھلی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ
حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ
حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ
حضرت داتا گنج بخش ہجویری رحمۃ اللہ علیہ
حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ
حضرت شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ
حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ
حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت رحمۃ اللہ علیہ
حضرت موسیٰ پاک شہید
حضرت شاہ سکندر ررؤس الاولیا
حضرت شاہ موسیٰ ابوالمکارم رحمۃ اللہ علیہ
حضرت صابر علاؤالدین کلیری رحمۃ اللہ علیہ
حضرت شاہ عنایت قادری
حضرت عبدالعلی شاہ رحمۃ اللہ علیہ
حضرت مہر علی شاہ گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ
حضرت مقبول محی الدین گیلانی دامت برکاتہم العالیہ

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ (م 728ء)

ابوسعید بن ابی الحسن یسار البصری، اموی عہد میں بصرے کے مشہور واعظ صوفی سرخیل تابعی عالم اسلام کے مشہور صوفی عالم، ماہر الٰہیات اور دانشور جنہوں نے اسلام میں تصوف کو مستحکم کیا اور اسے ایک مستحکم فکری اساس فراہم کی۔ آپ 21ھ/642ء میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے اور بصرہ میں پرورش پائی۔ روایت ہے کہ جب یہ پیدا ہوئے تو ان کے والد انہیں خیر و برکت کے لیے خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لے گئے۔ حضرت عمر رضی

خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی خادمہ تھیں۔ اس لیے حضرت حسن بصری سے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بہت پیار کرتی تھیں۔ اس طرح آپ رحمۃ اللہ علیہ کو عالم اسلام کی اولین دو بڑی شخصیتوں کے منظور نظر ہونے کا شرف حاصل تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں دیکھا تو فرمایا کہ ''ماشاء اللہ بڑا ہی خوبرو بچہ ہے۔''

دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صحبتوں سے فیض پانے کے بعد علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل آپ نے بالخصوص حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہی سے کی۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ آپ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے مرید و شاگرد تھے۔ بصرہ میں ایک مقام آج بھی حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی یاد دلاتا ہے، یہ ہے ''باب الطشت''۔ روایت ہے کہ اس مقام پر آپ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ مجھے تبرکاً طہارت سکھا دیں اور شاہ ولایت، امام الاولیا نے ایک طشت منگوا کر آپ کو وضو کرنا سکھایا تھا۔

تمام تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ آپ نسلاً حبشی ہونے کے باوجود بہت فصیح اللسان تھے اور حجاج بن یوسف آپ کی فصاحت کے سامنے عرب ہونے کے باوجود خود کو ہیچ سمجھتا تھا۔

سانحہ واقعہ کربلا آپ کے سامنے ظہور پذیر ہوا مگر آپ چونکہ اس واقعہ اور اس کے اثرات کے پیدا ہونے والے قتل و غارت کے واقعات کو ہاتھ سے روکنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے اس لیے گوشہ نشین رہے مگر آپ رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کو دنیا اور صرف دنیا ہی کے بن کر رہ جانے کو بڑی سختی سے روکا اور خلاف سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم چلنے سے منع کیا۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اسلام کے اولین صوفی بزرگ ہیں اور تمام سلاسل تصوف کے امام ہیں مگر آپ ایک ممتاز حیثیت کے مالک اس لیے بھی ہیں کہ ایک طرف تو آپ شیخ الحدیث تھے دوسرے بصرہ کے سب سے بڑے فقیہ ہونے کا شرف بھی آپ کو حاصل تھا۔ خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے 778 عیسوی میں انتقال کیا اور بصرہ میں دفن ہوئے۔

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ (م 816ء/200ھ)

ابومحفوظ بن فیروز، دبستان بغداد کے مشہور و معروف صوفی و زاہد

دبستان بغداد کے مشہور و معروف صوفی زاہد حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ مشرقی عراق کے ایک قصبے کرخ میں پیدا ہوئے اور اسی نسبت سے کرخی کہلائے۔ بعض محققین نے انہیں بغداد کے محلہ کرخ سے منسوب کیا ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ان کے والدین عیسائی تھے۔ بقول ابن تغری بردی وہ واسط کے علاقے کے باشندے اور صابئین میں سے تھے۔ بکر بن خنیس الکوفی اور ایک اور کوفی فرقہ السنجی تصوف میں ان کے مرشد مانے جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ کشف المحجوب میں حضرت داتا گنج بخش ہجویری نے ان کے مرشد کا نام داؤد طائی لکھا ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے جن لوگوں کو تعلیم دی یا فیض یاب کیا ان میں سب سے زیادہ مشہور حضرت سری سقطی تھے جو آپ رحمۃ اللہ علیہ کے قریبی عزیز بھی تھے۔ حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ بعد ازاں حضرت جنید بغدادی کے مرشد بنے۔ یہ حکایت کہ حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ شیعی امام حضرت علی بن موسیٰ الرضا کے متوسلین میں سے تھے جن کے ہاتھ پر انہوں نے اسلام قبول کیا تھا اور اپنے والدین کو بھی اسلام قبول کرنے کی ترغیب دی تھی بعض محققین کے نزدیک قابل اعتبار نہیں ہے۔ جو اقوال ان سے منسوب کیے جاتے ہیں انہیں میں سے یہ بھی ہیں۔ ''عشق کی تعلیم انسانوں سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک خدائی عطیہ ہے اور اس کی رحمت ہی سے کسی کو حاصل ہوتا ہے۔'' ''ولیوں کو پہچاننے کی تین علامتیں ہیں: ''ان کا فکر خدا کے لیے ہوتا ہے، ان کا شغل فی اللہ اور سعی الی اللہ۔ دقیقہ حقائق کا ادراک اور جو چیز مخلوق کے قبضے میں ہے اسے ترک کر دینا تصوف ہے۔''

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کو ولی کامل تسلیم کیا جاتا ہے۔ بغداد میں دریائے دجلہ کے بائیں کنارے پر ان کا مقبرہ اب بھی مرجع خلائق ہے۔ القشیری نے لکھا ہے کہ لوگ ان کے مزار پر جا کر بارش کے لیے دعا مانگا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ''معروف کا مقبرہ اس کام کے لیے تریاق مجرب ہے۔'' وہاں جا کر مانگی ہوئی بارش کی دعا کبھی رد نہیں کی جاتی اور بارگاہ الٰہی میں مقبول ہوتی ہے۔''

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ (م 861ء/248ھ)

رئیس الصوفیہ ابوالفیض ثوبان بن ابراھیم المصری، ابتدائی دور کے ایک صوفی بزرگ

حضرت ذوالنون مصری اپنے مریدین کو اکثر فرماتے تھے کہ صرف وہی ذات پاکیزہ ہے جو عارفین کو دنیاوی مسائل سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ حضرت ذوالنون مصری نے فرمایا کہ ایک پہاڑ پر میں نے بیماروں کا اجتماع دیکھا جب دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ ایک زاہد و عابد اپنے حجرے سے سال میں ایک مرتبہ نکل کر بیماروں پر کچھ دم کرتا ہے جس کے بعد بیمار صحت مند ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ میں بھی ان کے انتظار کرنے والوں میں شامل ہو گیا پھر جب وہ عابد اپنے حجرے سے نکلے اور انہوں نے بیماروں کو دم کیا تو تمام بیمار صحت یاب ہو گئے اور وہ عابد واپس اپنے حجرے میں جانے لگے تو میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر عرض کیا کہ ظاہری مرض والوں کو تو شفا ہو گئی، لیکن میرے باطنی مرض کو بھی رفع کر دیجئے۔ میری بات سن کر وہ بزرگ گویا ہوئے کہ اے ذوالنون میرا ہاتھ چھوڑ دے کیونکہ اللہ تعالیٰ نگرانی فرما رہے ہیں اور تو نے اللہ کا دست کرم چھوڑ کر ایک غیر کا ہاتھ تھاما ہے، تب مجھے احساس ہوا کہ مشکل اور مصیبت میں صرف اسی ذات باری کی طرف دیکھنا چاہیے جو کل کائنات کا پالنے والا ہے۔

حضرت ذوالنون مصری، بالائی مصر میں مقام اخمیم 180ھ/796ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ ان کے والد نوبیہ (سوڈان) کے رہنے والے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ذوالنون ایک آزاد شدہ غلام تھے۔ انہوں نے طب، علم الکیمیا اور دیگر علوم کا بہت مطالعہ کیا تھا۔ یونانی فلاسفہ تعلیمات کا اثر بھی ان پر ضرور ہوا ہوگا۔ ان کے استاذ اور مرشد حضرت سعدون مصری بتائے جاتے ہیں۔ ذوالنون نے مکہ المکرمہ اور دمشق کی سیاحت کی اور انطاکیہ کے جنوب میں کچھ راہبوں سے بھی ملاقات کی۔ انہیں سفروں میں انہوں نے زہد اور ضبط نفس کی ریاضتیں کیں۔ علمائے معتزلہ نے ان سے معاندانہ سلوک کیا کیونکہ انہوں نے معتزلہ کے برعکس راسخ الاعتقاد اہل سنت کی اس رائے کی تائید کی تھی کہ قرآن کریم غیر مخلوق ہے۔ عبداللہ بن عبدالحکم المصری جو مالکی مسلک سے تھا، انہیں اس بات پر ملامت کی کہ وہ علم اسرار روحانیہ کی برملا تعلیم دیتے ہیں۔ آخر عمر میں انہیں گرفتار کر کے بغداد میں قید کر دیا گیا، لیکن بالآخر خلیفہ المتوکل کے حکم پر رہا ہوئے اور مصر واپس آ گئے جہاں انہوں نے 246ھ/861ء میں وفات پائی۔

ذوالنون ''رئیس الصوفیہ'' کہلاتے تھے اور ایک شیخ طریقت تھے۔ ان کے بہت سے مرید ہوئے اور یہ سلسلہ ان کی وفات کے بعد بھی جاری رہا۔ سحر اور کیمیا کی چند کتابیں ان سے منسوب کی جاتی ہیں لیکن ان کی صوفیانہ تعلیمات ہمیں صرف دوسرے مصنفین کی تحریروں سے ملتی ہیں۔ محققین نے لکھا ہے کہ ذوالنون پہلے بزرگ تھے جنہوں نے بتایا کہ معرفت توحید حقیقی کو پہچاننے کا نام ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ (م 298ھ/910ء)

رئیس الطائفہ، ابوالقاسم بن محمد الجنید الخزار القواری، ایک شہرہ آفاق صوفی

مورخین طریقت نے لکھا ہے کہ دنیا میں صرف تین اہل اللہ ہوئے ہیں، شام عبداللہ جلاء، نیشاپور میں ابوعثمان اور بغداد میں...... حضرت جنید بغدادی۔

ایرانی صوبہ جبال کے ایک سرد مگر خوبصورت شہر مہناوند سے ہجرت کر کے ایک خاندان بغرض تجارت بغداد میں آباد ہوگیا تھا۔ اسی گھرانے میں حضرت جنید بغدادی پیدا ہوئے۔ ان کے والد قواریری یا شیشہ گر کہلاتے تھے۔ جبکہ ان کے ماموں شیخ سری سقطی تھے جو پیشے کے اعتبار سے مسالہ فروش تھے۔ مگر کاروبار کی بجائے زیادہ تر زہد وعبادت میں مصروف رہنے کی وجہ سے معاشی طور پر کمزور تھے۔ پہلے خویش کے محاورے پر عمل کرتے ہوئے جب قواریری نے اپنے برادر نسبتی کو مال زکوۃ دینا چاہا تو اس نے انکار کر دیا اس پر وہ بڑے غمگین ہوئے تو حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ جو ابھی چھ سال کے بچے تھے اپنے والد کے نام پر قبول فرمائیں جس نے آپ پر فضل اور میرے والد سے عدل کر رکھا ہے۔ شیخ سقطی نے اپنے بھانجے سے پوچھا بیٹے ذرا بتاؤ کہ خدا نے مجھ پر فضل اور تیرے والد سے عدل کس طرح کر رکھا ہے۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کچھ یوں گویا ہوئے کہ ماموں اللہ نے آپ کو پرہیزگار اور متقی بنا کر آپ پر فضل کیا جبکہ اسی خدا نے میرے والد کو دنیاوی کاروبار میں اتنا عروج دیا کہ وہ مال زکوۃ ادا کرنے کے قابل ہوئے۔ یہ اللہ کا عدل ہے کہ میرا باپ زکوۃ کا یہ مال اس کے حقداروں تک خدا کے نام پر پہنچاتا ہے۔ اب آگے حقداروں کی مرضی ہے چاہے وہ قبول کریں یا نہ کریں۔ اس واقعے کے بعد حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ اپنے ماموں کے زیر تربیت آگئے اور اپنے والد کے انتقال کے بعد انہیں کے پاس منتقل ہوگئے۔

حضرت جنید بغدادی کے شب و روز خالق حقیقی کی عبادت میں بسر ہوئے۔ آپ تزکیہ نفس کے بعد سخت ترین مجاہدے کرتے تھے۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ نے تیس سال تک ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر عشا کے بعد پوری رات اللہ اللہ کا ورد کیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو خواب میں رشد و ہدایت کرنے کی ہدایت کی تو آپ نے پہلا واعظ کیا۔ اس واعظ میں لوگ آپ کی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے جاں بحق ہوگئے اور کچھ بے ہوشی کے عالم میں گھروں کو لے جائے گئے۔ آپ کی نگاہوں میں ایک عجب تاثیر تھی اس لیے آپ ہر ممکن احتیاط برتتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ اپنے مریدین کے ہمراہ بغداد کے ایک چوراہے سے گزر رہے تھے جہاں ایک چور کو مسلسل چوری کرنے کے جرم میں پھانسی دی گئی تھی آپ نے پھانسی پر لٹکے ہوئے اس چور کے قدموں کو چوما مریدین بڑے حیران ہوئے، ایک مرید نے جرات کرتے ہوئے پوچھا کہ حضرت یہ کیا ہے آپ ایک مجرم کے پاؤں چوم رہے ہیں حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس چور نے اپنے پیشے کے ساتھ وفاداری کی اور اس کا انعام پا گیا انسان اپنے مالک سے اتنی وفاداری بھی نہیں کرتا۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ (م مابین 160ھ/ تا 166ھ/783ء)

مشہور صوفی بزرگ اور عابد و زاہد جنہوں نے تعیش اور آرام کو تج دیا تھا۔

اپنے عہد کا ایک حکمران اپنے محل کی خواب گاہ میں محو استراحت تھا کہ اچانک خواب گاہ کی چھت پر کسی کے چلنے کی آہٹ محسوس ہوئی جو حکمران کے آرام میں خلل کا سبب بنی۔ حکمران نے با آواز بلند پوچھا کہ چھت پر کون ہے؟ چھت سے آواز آئی کہ بادشاہ سلامت آپ کا ایک جاننے والا ہے۔ جس کا اونٹ کھو گیا ہے وہ چھت پر اپنا اونٹ تلاش کر رہا ہے۔ بادشاہ

نے جب یہ انوکھا جواب سنا تو وہ سخت برہم ہوا اور اجنبی سے پوچھا کہ اس کا اونٹ بھلا شاہی محل کی چھت پر کیسے گم ہوسکتا ہے۔ چھت پر موجود شخص نے برملا جواب دیا کہ جس طرح آپ کو تخت و تاج میں خدا مل سکتا ہے۔ یہ فکر انگیز جواب سن کر بادشاہ پر کپکپی طاری ہوگئی۔ پھر ایک دوسرا واقعہ یوں رونما ہوا کہ عین اس وقت جب بادشاہ دربار سجائے بیٹھا تھا ایک شخص آیا اور ارد گرد کا جائزہ لینے لگا۔ بادشاہ کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ اس جگہ سکونت اختیار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے مگر اب کہیں اور جگہ جا کر رہے گا کیونکہ یہ جگہ تو محض ایک سرائے کی مانند ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ اے شخص یہ شاہی محل ہے سرائے نہیں۔ اجنبی نے پوچھا آپ سے پہلے یہاں کون رہتا تھا۔ بادشاہ نے کہا میرے آباؤ اجداد اور آئندہ بھی میری اولاد رہے گی اجنبی نے کہا پھر تو یہ جگہ کسی سرائے کی طرح ہی ہے جہاں آج کوئی اور کل کوئی رہے گا۔ یہ سنتے ہی بادشاہ پر ایک ہیبت طاری ہوگئی اور وہ شاہی محل چھوڑ کر اس اجنبی کے پیچھے چل دیا۔

اس بادشاہ کا نام حضرت ابراہیم بن ادھم تھا جو تاج و تخت چھوڑ کر ویرانوں میں ریاضت اور مجاہدے میں مصروف ہوگیا اور اس نے شاہی محل کے آرام کو عبادت پر تج دیا۔ حضرت ابراہیم بن ادھم نے ایک طویل عرصہ حضرت امام ابوحنیفہ کی صحبت میں گزارا۔ ایک مرتبہ جب آپ حضرت امام ابوحنیفہ کی مجلس میں حاضر تھے تو لوگوں نے انہیں تمسخرانہ نگاہوں سے دیکھا مگر امام صاحب نے حضرت ابراہیم بن ادھم کو "سیدنا" کہہ کر مخاطب کیا تو حاضرین بہت حیران ہوئے اور انہوں نے حضرت امام سے استفسار کیا کہ اس شخص کو آپ نے اتنا بڑا اعزاز کیوں دیا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ یہ روز و شب عبادت میں مصروف رہتے ہیں جبکہ ہم دنیا داری میں مصروف ہیں۔

حضرت ابراہیم بن ادھم بلخ کے رہنے والے تھے۔ روایت ہے کہ ان کی وفات اس وقت ہوئی تھی جب وہ بازنطینیوں کے خلاف ایک بحری مہم میں شریک تھے۔ ایک بیان کے مطابق انہیں بلاد روم کے ایک قلعے سوقین میں دفن کیا گیا تھا۔ جب عبداللہ بن مبارک نے ان سے سوال کیا کہ انہوں نے اپنے وطن کو کیوں چھوڑا تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھے شام کے سوا کہیں لطف نہیں آتا کہ یہاں مجھے سرگردان دیکھ کر یہاں کے لوگ مجھے دیوانہ سمجھتے ہیں۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ (م 261ھ/ 847ء)

طیفور بن عیسیٰ بن سروشان، معروف ترین مسلم صوفیائے کرام میں سے ایک شخصیت

ایران کے صوبہ قوس کے شہر بسطام میں ایک بزرگ عیسیٰ رہتے تھے۔ ان کی زوجہ امید سے تھی ابھی ولادت میں چند ماہ باقی تھے کہ شیخ عیسیٰ دار فانی سے رحلت کر گئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے ہاں پیدا ہونے والے بچے نے روحانیت کی انتہائی بلندیوں کو چھوا اور وہ سلطان العارفین کہلایا۔ یہ پیدائشی یتیم حضرت بایزید بسطامی تھے۔ محققین نے لکھا ہے کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کو اولیائے کرام میں وہ مقام حاصل ہے جو فرشتوں میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کو۔ توحید کے معاملات و مسائل میں تمام بزرگوں کی انتہا آپ رحمۃ اللہ علیہ کی ابتدا ہے۔ آپ نے مکتب میں داخل ہوتے ہی قرآن مجید کی آیات سے استدلال حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔ آپ کی والدہ نے آپ کو سپرد خدا کر دیا اور فرمایا کہ خدا کا شکر کرو اور علم کی تلاش کرو۔ تلاش علم میں آپ نے قریہ قریہ کی خاک چھانی اور شہر بہ شہر بہت سے علما اور مشائخ سے ظاہری اور باطنی علوم کا اکتساب کیا۔ مسلسل تیس سال تک شام کے صحراؤں میں بھٹکتے رہے۔ اس دوران آپ نے 170 علما اور مشائخ سے فیوض و برکات حاصل کیں۔

اتنی مدت تک تحصیل علوم کرنے کے بعد آپ بسطام کو واپس لوٹے اور مجاہدات اور نفس کشی کا سلسلہ شروع کیا۔ حضرت نظام الدین اولیاء اپنے مریدوں کو حضرت بایزید بسطامی کے مجاہدات اور ریاضات کے متعلق بتایا کرتے تھے کہ اسلام

نام کے طور پر تو بہت آسان ہے لیکن اس کے کام اور پابندیاں بہت مشکل ہوتی ہیں۔ آپ کے مجاہدات بہت سخت تھے۔ آپ نے ایک مرتبہ آدھی رات کو ارادہ کیا کہ میں بقیہ رات عبادت میں گزاروں گا آپ کے نفس نے اس کی مخالفت کی تو اس پر آپ نے قسم کھائی کہ میں اپنے نفس کو ایک سال تک پانی سے محروم رکھوں گا چنانچہ اگلا ایک سال آپ نے پانی کے بغیر گزارا۔

حضرت بایزید ایک سچے عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی تھے۔ مکہ جاتے تو پھر مدینہ نہیں جاتے کہ یہ خلاف ادب ہے کہ مدینہ منورہ کی زیارت مکہ کے ماتحت رکھی جائے۔ بلکہ آپ مدینہ منورہ بڑے اہتمام سے جاتے اور اس سال مکہ کا رخ تک نہ کرتے تھے۔ آپ کے ایثار کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ حج پر جانے لگے تو ایک ضرورت مند آگیا اور آپ سے کہنے لگا کہ زادِ راہ کی رقم مجھے عطا کر دیں کہ میں ضرورت مند ہوں اور میرے گرد طواف کر لیں آپ کا حج ہو جائے گا اور میری ضرورت پوری ہو جائے گی۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے ایسا ہی کیا۔ آپ کو اکثر معراج روحانی نصیب ہوتا تھا اور آسمانوں پر فرشتے آپ کا والہانہ استقبال کرتے تھے۔ ایک مرتبہ فرشتوں کو خضوع سے عبادت میں مصروف دیکھ کر دعا کی کہ یا اللہ مجھے بھی اپنے عبادت کے لیے ان جیسا کر دے۔ پھر جب اگلی مرتبہ معراج روحانی پر گئے تو فرشتوں نے آپ کا استقبال نہیں کیا تو اللہ سے التجا کی ''یہ معاملہ کیا ہے؟''۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''پہلے آپ انسان تھے اور مقام اشرف پر فائز تھے اب فرشتوں جیسے ہیں۔

حضرت حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ (م 309ھ/ 922ء)

ابو المغیث الحسین بن المنصور بن محمی البیضاوی ایک متنازعہ صوفی اور عالم

ایک رات بغداد کے گلی کوچے ایک پر سوز آواز سے گونج اٹھے کوئی ''انا الحق'' کے نعرہ ہائے مستانہ بلند کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا اے اللہ تیری روح اور میری روح یوں ایک ہو گئی ہے جیسے آبِ زلال میں شراب۔ جب کسی شے کا لمس تجھے محسوس ہوتا ہے تو اس لمس کا احساس مجھے بھی ہوتا ہے کیونکہ تو اور میں ایک ہی تو ہیں اور ہر حال میں ایک رہنے والے ہیں۔ اس نعرہ مستانہ کو سننے والے بالکل نہ جان سکے کہنے والا کیا کہہ رہا ہے۔ وہ طیش سے بول اٹھے کہ یہ شخص کلمات کفر بول رہا ہے۔ اس کے ذہن پر یقیناً شیطانی اثرات کا اثر ہے اور یہ کافر بن گیا ہے۔ پھر یہ نعرہ ہائے مستانہ جب حکومت کے ایوانوں تک پہنچے تو اس شخص کو پابجولاں کر دیا گیا۔ یہ نعرہ ہائے مستانہ بلند کرنے والا یہ شخص حسین بن منصور حلاج تھا۔ 22ھ/ 857ء میں پیدا ہونے والا یہ نڈر و بے باک صوفی درویش اپنے افکار اور کردار میں کس قدر کھرا، سچا اور صاف گو تھا کہ اس کی تندی اور تیزی کو دیکھ کر اس کے بڑے بڑے ہم عصر لرزاں ہو گئے تھے۔

حسین بن منصور ایرانی شہر بیضا میں پیدا ہوئے اور نو عمری میں عراق کے شہر واسط آ گئے۔ واسط والوں کے لیے وہ ایک عجیب و غریب نوجوان تھا جو جوانی کے تقاضوں سے دامن بچائے خاموش خاموش نظر آتا تھا، ایک دن ایک کپاس فروش اسے اپنی دوکان کی رکھوالی کے لیے چھوڑ گیا جب وہ واپس آیا تو اس نے ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ روئی سے بنولے محض اس نوجوان کے اشارے پر خود بخود الگ ہو کر ڈھیر ہو رہے تھے۔ جب وہ اس منظر کی تاب نہ لا سکا تو اس نے پوچھا حسین یہ سب کیسے ہو رہا ہے؟ حسین نے کہا کہ آپ مجھے جاتے جاتے کہہ گئے تھے کہ آپ کو روئی دھنکنے کا موقع نہیں ملا تو میں نے سوچا کہ آپ کی یہ پریشانی دور کر دوں مگر اس دوکاندار نے اسے حسین کا جادو قرار دیا مگر حسین نے کہا ''نہیں جناب یہ جادو نہیں ہے بلکہ میں خود اسی کوشش میں مصروف ہوں کہ اپنی ذات سے دوئی کو یک مشت نکال دوں۔''

مگر حسین کی اپنی ذات سے دوئی کو الگ کرنے کی یہ کوشش اسے بغداد کے چوراہے تک لے گئی جہاں وہ حضرت جنید بغدادی کی خدمت میں رہنا چاہتا تھا مگر جنید بغدادی نے کہا ''حسین ہمیں افسوس ہے کہ ہم تجھے اپنی صحبت میں نہیں رکھ

لگے کہ تم رازہائے قدرت عیاں کرنے کے عادی ہو۔"

اوران رازوں کوعیاں کرنے کی وجہ سے ایک دن حسین پابجولاں ہوکر ٹکٹکی پر لے جائے گئے مگر تین سو کوڑے لگنے پر بھی حسین کے منہ سے آہ تک نہ نکلی پھر جلاد آگے بڑھا اوراس نے تلوار کے ایک ہی وار میں حسین کے دونوں ہاتھ قلم کر دیئے پھر دونوں پاؤں اور آنکھیں تک نکال دی گئیں اور زبان بھی کاٹ دی گئی مگر اس کے روئیں روئیں سے اناالحق کی صدا جاری تھی۔ اگلے دن لاش کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا مگر یہ صدا اب بھی جاری تھی۔

حضرت داتا گنج بخش ہجویری رحمۃ اللہ علیہ (م 481ھ/1088ء)

ابوالحسن علی ہجویری بن عثمان، ہندوستان کے مشہور بزرگ ولی اور صاحب کشف المحجوب

حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے اپنے قیام لاہور کے دوران اس سرزمین کے ولی کامل حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا تھا

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا

ناقصا راں پیر کامل کاملا راں راہنما

حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کو خلق خدا ان کی زندگی ہی میں گنج بخش کہتی تھی اور وہ خود اپنے آپ کو کہتے تھے۔

"اے علی! اس بات کو دل میں نہ لا کہ لوگ تجھے گنج بخش کہتے ہیں۔ گنج بخش تو وہ ذات مقدس ہے جو وحدہ لاشریک ہے۔"

حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری کو محققین نے ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ کا پہلا علمدار قرار دیا ہے۔ جن عظیم مسلم شخصیات نے اپنی زندگیاں ہندوستان میں تبلیغ اسلام کے لیے وقف کر دی تھیں ان میں پہلے اور بڑے بزرگ حضرت علی ہجویری ہیں جو عام طور پر داتا گنج بخش کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ افغانستان کے شہر غزنی میں پیدا ہوئے (400ھ/1010ء) میں یہ سلطان محمود غزنوی کا عہد تھا۔ اس زمانے میں غزنی جوابر مشرق تھا اور نیویارک اور پیرس ولندن کا کہیں نام تک نہیں تھا۔ دنیائے مغرب میں قرطبہ کو یہی حیثیت حاصل تھی۔ آپ کی والدہ غزنی کے محلہ ہجویر سے تھیں اس لیے آپ بھی ہجویری کہلائے۔

کتابی علم کی تحصیل کے بعد آپ نے باطنی علوم کا اکتساب کیا اور شیخ ابوالفضل محمد بن حسن ختلی کی صحبت میں رہے اور وہاں سے قطب دوراں بن کر نکلے۔ 431ھ/1040ء میں آپ اپنے مرشد کے حکم پر ہندوستان کے ظلمت کدہ میں شمع اسلام کی روشنی بکھیرنے کے لیے بعہد مسعود غزنوی لاہور پہنچے۔ آپ جب لاہور میں داخل ہوئے تو کسی بزرگ کا جنازہ اٹھایا جارہا تھا۔ وہ خواجہ حسین زنجانی کا جنازہ تھا۔ آپ کے لاہور بھیجے جانے میں شاید یہ مصلحت کارفرما تھی کہ لاہور کو خواجہ حسین زنجانی کے بعد آپ کی ضرورت تھی۔ حضرت داتا گنج بخش نے اگلے پورے چونتیس برس لاہور میں گزارے اور لاکھوں لوگوں کو صراط مستقیم دکھائی اور لاکھوں سینوں میں اسلام کے چراغ روشن کیے۔ شیخ نے 465ھ/1072ء یا 481ھ/1088ء میں لاہور ہی میں وفات پائی اور اسی جگہ دفن ہوئے جہاں چونتیس سال تبلیغ اسلام کا فریضہ ادا کیا تھا۔ آپ کا مزار اقدس 1861ء تک گنبد کے بغیر تھا۔ آپ کے مزار پر گنبد تعمیر کرنے کی سعادت حاجی نور محمد فقیر کو حاصل ہوئی۔

آپ کے مزار پر ماضی میں بڑے بڑے سلاطین و بادشاہ حاضر ہوتے رہے۔ سلطان ابراہیم غزنوی اور سلطان التمش نے اپنے ہاتھ سے قرآن لکھ کر ہدیہ عقیدت کے طور پر آپ کے مزار پر بھیجا۔ سلطان ہند خواجہ معین الدین چشتی جب آپ کے مزار پر حاضر ہوئے تو یہاں چلہ کش ہوئے اور آپ کو خراج عقیدت پیش کیا۔ ان کے بیس برس بعد حضرت بابا فرید گنج شکر

بھی یہاں چلہ کش رہے۔ یہاں تک کہ رنجیت سنگھ جیسا غیر مسلم بھی آپ کا احترام کرتا تھا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی پیران پیر رحمۃ اللہ علیہ (م 561ھ/1166ء)

غوث الاعظم، بغداد کے مشہور عالم اور بزرگ سلسلہ قادریہ کے بانی اور متعدد کتب کے مصنف حضرت شیخ عبدالقادر کے القاب میں ایک ''محی الدین'' ہے۔ روایت ہے کہ ایک رات آپ رحمۃ اللہ علیہ نے خواب میں دیکھا کہ ایک نحیف ونزار شخص بیماری کے عالم میں دراز ہے اور اٹھ کر بیٹھنے سے بھی معذور ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے سہارا دیا اور اٹھایا تو وہ تندرست ہو کر اٹھ بیٹھا۔ جب آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اس تومند ہو جانے والے نحیف سے اس کا نام پوچھا تو اس نے کہا کہ میں تمہارے نانا کا ''دین اسلام'' ہوں۔ اگلی صبح جب آپ رحمۃ اللہ علیہ گھر سے نکلے تو لوگ آپ رحمۃ اللہ علیہ کو ''محی الدین'' کے لقب سے پکارنے لگے۔ گویا یہ خواب ایک اشارہ ربانی تھا۔ عالم رؤیا میں شفقت ایزدی نے آپ رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد احیائے دین کا فریضہ کر دیا تھا۔

اولیائے کرام نے آپ رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت سے مدتوں پہلے آپ رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت خبر دی تھی۔ قطب دوراں شیخ ابوبکر بن ہوار نے ایک دن اپنی مجلس میں فرمایا تھا کہ عراق میں ایسا ایسا مرد خدا پیدا ہوگا جو اللہ کے بندوں کے نزدیک بے حد رتبے کا حامل ہوگا اور اس کی سکونت بغداد میں ہوگی اور وہ کہے گا کہ میرا قدم ہر ولی کی گردن پر ہے اور ہر زمانے کے اولیائے کرام آپ کا یہ قول تسلیم کریں گے۔

470ھ/1077ء میں آپ ایران کے قصبے جیلان میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش پر آپ رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ ماجدہ کا ارشاد ہے کہ ''میرے فرزند عبدالقادر نے رمضان شریف میں بوقت دن کبھی دودھ نہیں پیا تھا۔'' ایک مرتبہ 29 رمضان کو مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہیں آیا تو لوگ میرے پاس پوچھنے کے لیے آئے کہ آج آپ کے بچے نے دودھ پیا کہ نہیں اور میں نے کہلا بھیجا کہ نہیں۔''

پھر طلب علم کے لیے آپ نے اپنی والدہ کے حکم پر سفر بغداد اختیار کیا۔ آپ کی والدہ نے زادراہ کے طور پر چالیس اشرفیاں آپ کی عبا میں سی دی تھیں۔ اثنائے راہ میں لٹیروں نے حملہ کیا اور تمام قافلے کو لوٹ لیا جب شیخ نے ان کے پوچھنے پر از خود انہیں بتایا کہ ان کی عبا میں چالیس اشرفیاں سلی ہوئی ہیں تو وہ آپ کے اس سچ کی بنا پر وہ لٹیروں سے ابدال بن گئے اور ان کی دنیا ہی بدل گئی۔ بغداد میں تحصیل علم کے بعد آپ نے تعلیم وتدریس کا سلسلہ شروع کیا اور وعظ کرنے لگے۔ وعظ میں مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ایک دن دوران وعظ آپ کو چھینک آئی اور آپ نے تمہید فرمائی۔ اس کے جواب میں ''یرحمک اللہ'' کا غلغلہ پورے مجمع میں اس طرح بلند ہوا کہ خلیفہ المستنجد باللہ یہ غلغلہ اپنے محل میں سن کر گھبرا گیا کہ کہیں دشمن نے بغداد پر حملہ تو نہیں کر دیا ہے؟

سیدنا غوث اعظم کی کرامات کے تواتر کا اعتراف امام ابن تیمیہ جیسے محقق نے بھی کیا ہے ان کا ایک قول ہے کہ شیخ کی کرامات کی حد تواتر کو پہنچ گئی۔ ان میں سب سے بڑی کرامت مردہ دلوں کی سچائی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے جہاں آپ کے ہاتھ پر مردہ لوگوں کو زندہ کر دیا تھا وہیں آپ کے قلب کی توجہ اور زبان کی تاثیر سے لاکھوں انسانوں کو نئی ایمانی زندگی عطا فرمائی۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک پر لاکھوں جرائم پیشہ نے توبہ کی اور نیکی کی راہ اختیار کی وہیں ہزاروں عیسائی اور یہودی بھی آپ کے ہاتھ پر ایمان لائے۔ آپ نے 561ھ میں وفات پائی۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ (م 633ھ/1236ء)

سلطان الہند، اسلامی تاریخ تصوف کے ایک برگزیدہ بزرگ اور ہندوستان میں سلسلہ چشتیہ کے بانی

اپنے مرشد حضرت خواجہ عثمان ہارونی کی اجازت سے جب حضرت خواجہ معین الدین چشتی ہندوستان پہنچے ان دنوں مشہور راجہ پرتھوی راج ترائن کے محاذ پر سلطان شہاب الدین غوری کو اپنی عسکری طاقت کے بل پر عارضی شکست دینے میں کامیاب رہا تھا۔ اور اس فتح کے نشے میں بدمست تھا۔ خواجہ نے سرزمین ہند پر قدم رکھتے ہی جس دربار میں سب سے پہلے حاضری دی وہ داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کا مزار اقدس تھا۔ یہاں کچھ دن چلہ کش رہنے کے بعد آپ ملتان تشریف لے گئے جہاں آپ رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان میں بولی جانے والی معروف زبانیں سیکھیں تاکہ اہل ہند کو تبلیغ خود ان کی زبانوں میں کی جا سکے۔ پھر دلی میں کچھ دن قیام کے بعد آپ اجمیر پہنچے جو آئندہ ابد تک آپ کا مستقر بننے والا تھا۔ اجمیر راجہ پرتھوی راج کی راجدھانی تھا۔ اجمیر میں آپ نے اناساگر نامی جگہ پر قیام فرمایا۔ اتفاق سے یہ وہ مقام تھا جہاں پرتھوی راج کے اونٹ بیٹھتے تھے۔ راجہ کے ساربانوں نے جب ایک مسلم درویش کو اس جگہ فروکش پایا تو انہوں نے آپ کو یہ جگہ چھوڑنے کے لیے کہا اور بتایا کہ یہاں راجہ کے اونٹ بیٹھتے ہیں۔ آپ نے ان کے اصرار پر وہ جگہ چھوڑ دی اور جاتے ہوئے فرمایا لو بھئی ہم تو اٹھ کر جا رہے ہیں تم بٹھالو اپنے اونٹوں کو خدا جانے وہ یہاں سے بھی اسی طرح اٹھ سکیں گے یا نہیں اور راجہ کے اونٹ ایسے بیٹھے کہ خود راجہ بھی انہیں نہ اٹھا پایا۔ جب ساربانوں نے اسے مسلم درویش کی بات کا ذکر کیا تو راجہ نے انہیں حکم دیا کہ وہ ان سے معافی کے طلب گار ہوں اور اونٹوں کے اٹھنے کی درخواست کریں۔ ساربانوں کے معافی طلب کرنے پر آپ نے فرمایا کہ تمہارے راجہ کے اونٹ تو اٹھ کھڑے ہیں جاؤ اپنا کام کرو۔ اناساگر وہ علاقہ ہے جہاں آج آپ کا مزار اقدس واقع ہے۔ یہیں بیٹھ کر حضرت خواجہ نے ہندوستان کے ظلمت کدہ میں اسلام کی روشنی پھیلائی مگر آپ کا یہاں قیام پرتھوی راج کیسے برداشت کر سکتا تھا اس نے اجمیر کے سب سے بڑے ہندو پروہت کو ان کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیجا مگر آپ کی نگاہ کامل نے اس کے دل کی دنیا بدل دی اور وہ حلقہ بگوش اسلام ہوا۔ پھر اس علاقے کے لوگ تواتر سے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنے لگے اور تقریباً ایک لاکھ لوگوں نے اسلام قبول کر لیا اور مندروں کی سرزمین پر جہاں گھنٹیاں بجتی تھیں اب اذان گونجنے لگی جس سے نالاں ہو کر پرتھوی راج نے خواجہ صاحب کو اجمیر چھوڑنے کا حکم بھجوایا مگر اجمیر خود پرتھوی راج کو چھوڑنا پڑا۔ ترائن کی دوسری جنگ میں سلطان شہاب الدین نے اسے شکست دے کر گرفتار کیا اور قتل کر دیا۔ اور یوں خواجہ صاحب نے اپنی سعی جمیلہ سے سرزمین کفر کو نور اسلام سے منور کر دیا۔ حضرت خواجہ معین الدین نے بعمر ترانوے سال 1236ء میں انتقال فرمایا۔ آپ کا مزار صدیوں سے مرجع خلائق ہے۔

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کاکی رحمۃ اللہ علیہ (م 633ھ/1235ء)

برصغیر میں سلسلہ چشتیہ کے ایک بزرگ ولی اور بابا فرید الدین گنج شکر کے مرشد ارشد

مہرولی، دہلی ایک ایسی مسلم شخصیت کی آخری آرام گاہ کی حیثیت رکھی ہے جسے دنیا خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے جانتی ہے۔ حضرت خواجہ بختیار کاکی ماوراالنہر سے ہندوستان تشریف لائے تھے اور انہوں نے اپنے مختصر عرصہ حیات میں عرفان کی وہ بلندی حاصل کر لی جو ان کے ہم عصر طویل عمروں اور سخت ریاضتوں کے باوجود نہ پا سکے۔ جب خواجہ بختیار کاکی گھر بار چھوڑ کر عرفان الٰہی کی تلاش میں سرگرداں تھے تو ان کی ملاقات شیخ شہاب الدین

سہروردی، شیخ برہان الدین چشتی اور پھر حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ سے ہوئی۔ آپ نے خواجہ قطب الدین کو شرف مریدی اور خرقۂ خلافت عطا فرمایا اور انہیں بغداد میں چھوڑ کر خود اجمیر کی راہ لی۔ جب حضرت بختیار کاکی کو ان کے ہندوستان میں قیام کی اطلاع ملی تو وہ خود بھی عازم ہند ہوئے اور ملتان میں حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی کے مہماں ہوئے۔ ان دنوں تاتاریوں نے ملتان کا محاصرہ کرلیا قریب تھا کہ وہ اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں کہ ناظم ملتان حضرت بہاؤالدین زکریا کی خدمت میں حاضر ہوکر فریاد کناں ہوا۔ حضرت بہاؤالدین کے ساتھ حضرت خواجہ بختیار کاکی بھی تشریف فرما تھے انہوں نے ایک تیر ناظم ملتان کو دیا اور حکم دیا کہ اسے تاتاریوں پر چلاؤ جیسے ہی اس نے یہ تیر چلایا ایک طوفان بادوگرد نے تاتاریوں کو آلیا اور پھر جب مطلع صاف ہوا تو میدان بھی تاتاریوں سے صاف ہو چکا تھا۔ کچھ دن ملتان میں قیام کے بعد خواجہ صاحب نے دہلی کا رخ کیا اور وہاں قاضی حمید الدین ناگوری کے ہاں قیام کیا۔ اپنے مرشد حضرت خواجہ معین رحمۃ اللہ علیہ کو پیغام بھجوایا کہ بندہ آپ سے ملاقات کے لیے دہلی تک آ پہنچا ہے مگر ہنوز زیارت سے محروم ہے۔ حضرت خواجہ نے اپنے مرید باصفا کو دہلی میں ٹھہرنے کا حکم دیا اور خوشخبری دی کہ انہیں دہلی کی ولایت بخشی جاتی ہے۔ دہلی میں آپ کی عظمت و بزرگی اور علم و فضل کا چرچا پھیل گیا اور سلطان دہلی التمش تک آپ کے دربار میں حاضری دینے لگا اور اس نے کوشش کی کہ آپ کوئی حکومتی عہدہ سنبھال لیں مگر آپ نے ایسا نہ کیا۔ ادھر آپ نے دہلی میں دوسری شادی کی۔ مگر تنگ دستی اور عسرت کی زندگی بسر کرتے رہے۔

آپ کے ہمسائے میں ایک ہندو بنیا رہتا تھا جس کی دوکان سے آپ کے ہاں اشیاء خورد و نوش ادھار پر آتی تھیں۔ بنیے کی بیوی نے جب ادھار اشیا دینے کا احسان خواجہ صاحب کی بیوی پر جتایا تو آپ نے اپنی بیوی کو اس مہاجن کی دوکان سے ادھار اشیا منگوانے سے منع کر دیا اور فرمایا کہ جب بھوک محسوس ہو تو طاق سے ایک کاک یا تندوری نان اٹھا کر کھا لیا کرو۔ اسی کاک کی وجہ سے آپ کاکی کے لقب سے مشہور ہوگئے۔ خواجہ معین الدین چشتی ان سے ملنے کے لیے دہلی آئے اور آپ کو اپنے ساتھ اجمیر لے جانے کا ارادہ فرمایا جس پر دہلی کے لوگ اور سلطان زار و قطار رونے لگے تو خواجہ نے قطب صاحب کو لے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

حضرت شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ (م 578ھ/1191ء)

ابوالفتح شہاب الدین یحییٰ بن حبش المعروف بہ مقتول، ایک فلسفی، صوفی، حکمت الاشراق کے مصنف بارہویں صدی کے وسط میں پیدا ہوئے۔ قانون کی تعلیم مراغہ میں حاصل کی اور پھر ایک فلسفی اور صوفی حیثیت میں پہلے اصفہان اور بعد ازاں بغداد اور حلب میں اقامت اختیار کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ حلب کے والئی الملک الظاہر نے ان کی سرپرستی کی لیکن جب ان کے صوفیانہ عقائد نے مسلمانوں کے دلوں میں ان کی طرف سے شکوک و شبہات پیدا کر دیے اور راسخ العقیدہ علما نے ان پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ کیا تو الملک الظاہر نے 587ھ/1191ء میں انہیں قتل کروا دیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف 36 یا 38 سال کی تھی۔

سہروردی خود کو شائی اور صوفی کہتے ہیں۔ ارسطو کی تعبیر و شرح میں وہ ابن سینا سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے فلسفے کی ذاتی و امتیازی خصوصیت نور اور اشراق کے مابعد الطبعی نظریات ہیں۔ دراصل یہ نو افلاطونی نظریہ نور ہے یعنی وہ روحانی نور جو کنایہ ہے صدور سے، لیکن اس کے ساتھ اسے اشیا کی بنیادی حقیقت تصور کیا جاتا ہے۔ یہ نظریہ جس نے مسیحی اور اسلامی فلسفے اور تصوف میں بہت بڑا حصہ لیا عرب فلسفیوں کے ہاں بھی ملتا ہے۔ بالخصوص فارابی، ابن سینا اور الغزالی کے

ہاں، تاہم الغزالی کے نور کا تصرف قرآن مجید کی اس آیت پر مبنی ہے "اللہ نور السموات والارض، مثل نورہ..... من شجرۃ مبارکہ لا یۃ۔ (24 النور35) لیکن مورخین کے نزدیک اس کنایہ سے سہروردی سے زیادہ کسی نے کام نہیں لیا۔

شہاب الدین سہروردی اپنی تصنیف "حکمت الاشراق" کی وجہ سے "شیخ الاشراق" بھی کہلائے۔ اشراق کے معنی تابانی کے ہیں، اصطلاحاً اس سے مراد کشف روشن ضمیری ہے۔ یعنی یہ لوگ تمام حقائق کشف سے معلوم کر لینے کے مدعی تھے۔ شہاب الدین نے خداداد ذہانت سے معقولات میں وہ کمال حاصل کر لیا تھا کہ دنیائے اسلام میں ان کا کوئی ہم سر نہیں رہا۔ حلب میں ان کے سامنے دیگر تمام علما کی شہرت ماند پڑ گئی اسی وجہ سے ان پر الزامات لگائے گئے، بعض معاملات میں سہروردی کے نظریات قدماء کے عقائد سے مختلف تھے اسی وجہ سے انہیں سزائے موت کا سامنا کرنا پڑا۔

حضرت فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ (586ھ/1190ء)

مشہور صوفی بزرگ اور فارسی شاعر، مصنف منطق الطیر وغیرہ

خواجہ فرید الدین عطار نے اسلامی تاریخ میں تصوف کا جو رنگ پیدا کیا وہ ان کے اپنے الفاظ میں کوئی سیکھنے سکھانے کی چیز نہیں بلکہ انعام ازلی ہے۔ حضرت خواجہ فرید الدین عطار شعبان 513ھ میں نیشاپور کے نزدیک ایک گاؤں کدگن میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم کا نام ابراہیم بن اسحاق تھا۔ آپ کا اصل نام محمد تھا اور لقب فرید الدین تھا۔ آپ کے والد صاحب عطر کا کاروبار کرتے تھے۔ اسی وجہ سے آپ عطاری کہلاتے ہیں۔ والد کی وفات کے بعد یہ کاروبار آپ نے سنبھالا اور اس کو ترقی دی۔ آپ کارزار فقر و تصوف میں قدم رکھنے کے بعد بھی عطاری کاروبار میں مشغول رہے مگر ساتھ ہی عبادات وریاضیات میں بھی مصروف رہتے اور اسرار و عرفان کے حقائق پر کتابیں بھی تحریر کرتے تھے۔ خواجہ صاحب اس حکم پر کاربند تھے کہ اسلام رہبانیت کو گوارہ نہیں کرتا اس لیے صوفیائے کرام کو ان کے مجاہدات اور ریاضتوں میں شامل دنیاوی مانع نہیں آتے۔ آپ کے متعلق مورخین نے لکھا ہے کہ اعلیٰ درجہ کے طبیب بھی تھے اور آپ کا مطب بھی بڑے زور شور کا تھا۔ آپ روزانہ تقریباً 500 مریضوں کو دیکھتے تھے اور انہیں شفا کا جام پلاتے تھے۔

پروفیسر براؤن، مرزا محمد قزوینی کے حوالے سے خواجہ فرید الدین عطار کی کتاب "مظہر العجائب" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس کتاب سے آپ کے انتہائی رجحانات کا پتا چلتا ہے۔ انہی رجحانات کی وجہ سے سمرقند کے ایک عالم دین نے خواجہ صاحب پر فتویٰ کفر لگا دیا تھا اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے برقان ترکمان جو خوارزم شاہی کے امراء میں سے تھا کو خواجہ صاحب کو جلاوطن کرنے کا مشورہ بھی دیا تھا۔ خواجہ صاحب نے یہاں سے مکہ معظمہ کا قصد کیا اور کافی عرصہ تک وہیں رہے۔ اپنی کتاب "لسان الغیب" انہوں نے مکہ معظمہ ہی میں تصنیف کی تھی۔ خواجہ صاحب کی ملاقات مورخین کے مطابق مولانا روم سے اس زمانے میں ہوئی تھی جب مولانا ابھی طفل مکتب تھے۔ خواجہ نے انہیں دعا دی تھی۔ بعض مشائخ نے اپنے اشعار میں خواجہ صاحب کی فضیلت کا اعتراف کیا ہے۔ 627ھ میں نیشاپور میں تاتاریوں نے جو قتل عام کیا اس میں آپ بھی شہید ہوئے تھے۔ آپ کی مشہور تصنیف "تذکرۃ الاولیا" ہے۔

حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ (670ھ/1271ء)

برعظیم پاک وہند کے مشہور و معروف ولی اللہ، سلسلہ چشتیہ کے عظیم بزرگ، مرشد نظام الدین اولیاء

حضرت فرید الدین گنج شکر وہ بزرگ ہیں جنہیں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت خواجہ معین

الدین چشتی جیسی عظیم ہستیوں کی جانشینی کا شرف حاصل ہوا۔

آپ کا سلسلہ نسب 33 واسطوں سے حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے آپ کے والدین ملتان کے قریب ایک مقام کھوتوال میں قیام پذیر تھے۔ اسی مقام پر 584ھ/ میں بابا فرید نے جنم لیا۔ آپ کی والدہ ایک خدا رسیدہ اور نیک پارسا خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنے بیٹے کا نام فرید الدین مسعود رکھا۔ حضرت بابا فرید گنج شکر نے ملتان میں تعلیم حاصل کی اور یہیں ان کی ملاقات حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کا کی سے ہوئی جو ان دنوں ملتان آئے ہوئے تھے۔ جب مرشد ارشد نے حضرت فرید الدین مسعود کے قلب پر خصوصی نظر کی اور توجہ فرمائی تو آپ ان کے بندہ بے دام بن گئے اور مرشد کی ہدایت پر قندھار کے سفر پر نکلے اور پانچ سال تک دنیائے روحانیت و تصوف کی نادر روزگار ہستیوں، حضرت شہاب الدین سہروردی، شیخ فرید الدین عطار اور شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی جیسے بزرگوں سے اکتساب فیض کیا، لیکن اصل فیض انہیں اپنے مرشد حضرت خواجہ بختیار کا کی رحمۃ اللہ علیہ سے ہی ملا۔ ایک مرتبہ آپ حضرت بختیار کا کی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں چلہ کش تھے کہ ان سے ملنے کے لیے حضرت خواجہ معین الدین چشتی تشریف لائے اور خصوصاً اس حجرے میں تشریف لے گئے جہاں حضرت فرید الدین گنج شکر چلہ کش تھے۔ خواجہ صاحب ان پر اتنے مہربان ہوئے کہ قبلہ رو ہو کر ان کے لیے صاحب علم و عرفان آگاہی بنانے کی خداتعالیٰ سے دعا کی۔ یہ خواجہ صاحب کی دعا کا نتیجہ تھا کہ آپ کو قطب ابدال یا قطب اکبر کا مقام حاصل ہوا۔

حضرت بختیار کا کی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد حضرت خواجہ فرید اجودھن یا پاک پتن تشریف لے آئے اور رشد و ہدایت کے لیے یہیں مستقل قیام فرما ہوئے۔ اس علاقے میں زہریلے حشرات الارض بہت پائے جاتے تھے جو انسانوں کو نقصان پہنچاتے تھے مگر آپ کے قیام کی برکت سے وہ یہ علاقہ چھوڑ گئے۔ کہتے ہیں آپ کو شیرینی بہت پسند تھی اور شکر کو پسند فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ شکر کے کچھ بیوپاری اجودھن سے گزرے تو آپ نے ان سے کچھ شکر طلب کی مگر انہوں نے آپ کو ٹالنے کے لیے کہا کہ ان کی بوریوں میں شکر نہیں بلکہ نمک ہے پھر جب انھوں نے بوریوں کو کھولا تو انہیں نمک سے بھرا پایا کہتے ہیں کہ آپ کی والدہ بھی آپ کے لیے شکر آپ کے جائے نماز کے نیچے رکھ دیتی تھیں اور جب بھول جاتیں تو بھی آپ کو جائے نماز کے نیچے سے شکر دستیاب ہو جاتی تھی اسی وجہ سے آپ گنج شکر کہلائے۔ آپ نے 670ھ/ 1271ء میں وفات پائی اور پاک پتن ہی میں مدفون ہوئے۔

حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ (م 661ھ/ 1262ء)

بہاؤالحق ملتانی شیخ شہاب الدین سہروردی کے ممتاز خلیفہ اور برصغیر میں سلسلہ سہروردیہ کے بانی بڑے صاحب الکمال بزرگ تھے۔ سہروردی سلسلہ برصغیر پاک و ہند میں زیادہ تر آپ ہی سے جاری ہوا۔ آپ کے جداعلیٰ شاہ کمال الدین علی مکہ مکرمہ سے خوارزم ہوتے ہوئے برصغیر میں ملتان میں مقیم ہوئے۔ شیخ بہاؤالدین چھوٹی عمر ہی میں یتیم ہو گئے۔ بارہ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا پھر بخارا میں تحصیل علم کی۔ بعدازاں حرمین شریفین پہنچے۔ حج اور زیارت سے فارغ ہو کر بیت المقدس جا کر بھی تحصیل علم کی اور طلب حدیث میں یمن کا سفر بھی اختیار کیا۔

بغداد پہنچ کر شیخ شہاب الدین عمر سہروردی سے خلافت پائی اور واپس ملتان آ کر غیر معمولی ہر دلعزیزی حاصل کی۔ یہ زمانہ 614ھ/ 1217ء ملتان میں قباچہ کی حکومت کا تھا۔ حضرت بہاؤالدین زکریا نے ملتان میں دعوت و ارشاد کی مسند سنبھال لی اور ملتان میں ایک دینی مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ یہ محض ایک مدرسہ ہی نہیں تھا بلکہ ایک جامع روحانی و اخلاقی درس گاہ تھی۔ آپ اپنی ثروت کی وجہ سے اس درسگاہ کے اخراجات اپنی جیب سے ادا کرتے تھے۔ یہ مدرسہ آپ کے نام پر مدرسہ

بہائیہ کہلایا۔ اس سے فارغ التحصیل ہونے والے ہزاروں طالم علموں نے پورے برصغیر میں فریضہ تبلیغ دین انجام دیا اور اسلام کی روشنی کو پھیلایا۔ آپ نے اپنے خلفاء کو برصغیر سے باہر بھی تبلیغ کے لیے بھیجا۔ علم تصوف پر آپ نے ایک کتاب ''بہائیہ'' تصنیف کی۔ آپ کی ایک اور تصنیف ''الاوراد'' ہے جس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ آپ نے 21 دسمبر 1262ء میں ملتان میں وفات پائی۔ آپ کا مزار ملتان میں مرجع خلائق ہے۔ حضرت بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی رکھا گیا ہے جوان کے مدرسہ بہائیہ کی یاد دلاتی ہے۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت رحمۃ اللہ علیہ (م 785ھ/1384ء)

جلال الدین حسین بخاری، برعظیم پاک ہند کے ایک معروف صوفی بزرگ اپنے شعائر کی وجہ سے مشہور مخدوم جہانیاں جہاں گشت ہندوستان کے قدیم پیروں میں سے ہیں۔ آپ سید احمد کبیر کے فرزند تھے جن کے والد سید جلال الدین سرخ بخارا سے ہجرت کر کے پہلے ملتان اور پھر بھکر آ گئے تھے۔ آپ کا خاندان امام علی النقی کی نسل سے تھا۔ آپ کے والد حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتح المعروف رکن عالم ملتانی سے بیعت تھے جو حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ جناب مخدوم کی ولادت 707ھ/1308ء میں اچ شریف میں ہوئی اور ان کا روضہ بھی وہیں ہے۔ حضرت مخدوم صاحب نے تعلیم اچ شریف اور ملتان میں حاصل کی۔ اوائل عمر ہی میں وہ مزید تعلیم کے حصول کے لیے حجاز چلے گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اپنی دور دراز کی سیاحت کے دوران میں، جس کی وجہ سے آپ حضرت جہانیاں جہاں گشت کہلاتے ہیں۔ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، کازرون، مسر، عراق، شام بشمول فلسطین، بلخ، بخارا اور خراسان بھی گئے۔ سفرنامہ مخدوم جہانیاں جوان کی سیاحت کا احوال بیان کرنے کی غرض سے لکھا گیا ہے، مافوق الفطرت قصوں سے بھرا ہوا ہے لہٰذا اس سفرنامے کو محققین نے وضعی قرار دیا ہے۔ وہ عبداللہ الیافعی جن کے ساتھ انہوں نے مکہ المکرّمہ میں صحاح الستہ پڑھی تھی اور حضرت اشرف جہانگیر سمنانی کے ہم عصر تھے اور خرقہ خلافت انہیں حضرت نصیر الدین چراغ دہلی سے ملا تھا۔ سلطان محمد بن تغلق نے انہیں شیخ الاسلام مقرر کیا تھا۔ اور سیوستان میں چالیس خانقاہیں انہیں تفویض کی تھیں۔ فیروز شاہ تغلق بھی ان کا بہت گرویدہ تھا۔ شیخ ہر دوسرے سال اس سے ملنے دہلی جاتے تھے۔ 1363ء میں ٹھٹھہ کی مہم میں بھی اس کے ساتھ سندھ تشریف لے گئے تھے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے 10 ذوالحجہ 785ھ/3 فروری 1384ء کو وفات پائی۔ دائرۃ المعارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی کے مطابق آپ رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال کے تین مجموعے موجود ہیں۔

(1) خلاصۃ الفاظ جامع العلوم

(2) ملفوظات مخدوم

(3) خزانہ جلالی۔

یہ تمام مجموعے خصوصاً جامع العلوم ضخیم ہیں اور کشف وجذب کی حالت میں لکھے گئے ہیں۔

حضرت لعل شہباز قلندر رحمۃ اللہ علیہ (م 650ھ/1252ء)

مجذوبیت وقلندری دراصل شکر کا مظہر ہے، اہل سکر وجذب معلوم وعادات کی نفی کرتے ہیں اور آپ مقام قلندری پر فائز ہیں۔

حضرت لعل شہباز قلندر آذر بائیجان (روس) کے ایک گاؤں مروند میں 537ھ/ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام سید

عثمان تھا۔ آپ نے لعل شہباز قلندر کے نام سے شہرت پائی۔ آپ کے والد گرامی کا نام سید کبیر الدین تھا۔ ان کا سلسلہ نسب مختلف واسطوں سے حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا تھا۔

حضرت لعل شہباز نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی جو معرفت وولایت کے اسرار ورموز سے بھی آگہی رکھتے تھے۔ پھر آپ سیاحت دوراں کے لیے گھر سے نکلے۔ دوران سیاحت آپ کی ملاقات اس زمانے کے بادشاہ سلطان غیاث الدین بلبن سے ہوئی جو عارفوں اور عالموں کا بڑا قدر دان تھا۔ یہ ملاقات ملتان میں ہوئی تھی۔ اگرچہ سلطان نے انہیں ملتان میں مستقل قیام کی دعوت دی مگر حضرت لعل شہباز ابھی مرشد کامل کی تلاش میں تھے اس لیے سلطان سے آپ نے معذرت کرلی۔ برصغیر کی سیاحت کے بعد آپ ایران میں مشہد مقدس پہنچے وہاں آپ کی ملاقات شیخ جمال مجرد کے مرید ابراہیم سے ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں خواب میں لعل شہباز قلندر کو سرخ لباس میں ملبوس دکھایا اور بیعت کرنے کا حکم دیا تھا۔ بابا ابراہیم نے سید عثمان کو مرید کرلیا اور خرقہ خلافت کے ساتھ ایک عصا جو بادام کی لکڑی کا تھا عطا فرمایا۔ یہ عصا آج بھی سیہون شریف میں آپ کے مزار اقدس میں محفوظ ہے۔ اس عصا کے متعلق روایت یہ ہے کہ حضرت زین العابدین کے دست مبارک میں رہتا تھا۔ یوں آپ شجرہ طریقت بابا ابراہیم اور سید جمال مجرد سے حضرت زین العابدین تک پہنچتا ہے۔

سفر سیاحت ہی میں حضرت لعل شہباز قلندر کی ملاقات حضرت بوعلی قلندر پانی پتی سے بھی ہوئی۔ برصغیر میں آپ کا تعلق حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ سے خصوصی طور پر رہا۔ آپ نے ان کے صاحبزادے حضرت شیخ صدرالدین ملتانی کی صحبت اختیار کیے رکھی۔ حضرت جلال الدین بخاری اور شیخ فرید جیسے اکابر اولیاء آپ کا احترام کرتے تھے۔ پھر جب حضرت لعل شہباز سیہون شریف تشریف لائے تو یہ آپ کی شخصیت کا اعجاز تھا ہر مکتبہ فکر کے لوگ آپ سے متاثر ہوئے اور آپ نے سیہون شریف میں سکونت اختیار کر کے اس علاقے میں نور اسلام پھیلایا۔ محققین نے سیہون کو سندھ کا اجمیر کہا ہے مگر آج افسوس کے اجمیر وسندھ بھی دہشت گردوں کے ناپاک عزائم سے محفوظ نہیں اور ان ظالموں نے حضرت لعل شہباز قلندر رحمۃ اللہ علیہ کے دربار میں دھماکہ کر کے لوگوں کو لہولہو کر دیا ہے۔

حضرت موسیٰ پاک شہید رحمۃ اللہ علیہ (م 1010ھ/)

اولیائے ملتان میں سے ایک عظیم شخصیت جو صاحب تسبیح ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب شمشیر بھی تھے

حضرت موسیٰ پاک شہید آبائی طور پر اوچ شریف کے رہنے والے تھے۔ ان کا شجرہ نسب گیارہویں پشت میں حضرت سیدنا غوث الاعظم سے ملتا ہے۔

آپ کے مورث اعلیٰ حضرت مخدوم سید محمد غوث جیلانی خراسان سے آکر برصغیر کے شہر اوچ میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔ انہیں حضرت سید محمد غوث کی تیسری پشت میں حضرت مخدوم سید حامد جہاں بخش پیدا ہوئے جو حضرت موسیٰ پاک شہید کے والد گرامی تھے۔ تعلیم وتربیت کے بعد والد گرامی نے حضرت موسیٰ پاک کو اپنی زندگی میں خرقہ ولایت اور سجادگی عطا فرمائی مگر والد کی وفات کے بعد سجادگی اور جانشینی کا معاملہ خاندانی جھگڑے کی صورت اختیار کر گیا اور درباری اکبر میں سماعت کے لیے جا پہنچا۔ دربار اکبری سے فیصلہ حضرت موسیٰ پاک کے حق میں ہوا۔ چنانچہ رفع تنازع کے بعد آپ کچھ عرصہ کے لیے مغلیہ لشکر سے وابستہ ہوگئے۔ آپ کو پنج صدی کا منصب ملا۔ دہلی میں قیام کے دوران آپ کے دست حق پرست پر حضرت عبدالحق محدث دہلوی نے بیعت کی۔ حضرت موسیٰ پاک کچھ عرصہ دہلی میں قیام کرنے کے بعد واپس اوچ تشریف لے گئے۔ واپسی کے سفر میں آپ موضع منگے ہٹی سے گزر رہے تھے کہ رات کو اچانک اس موضع پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا۔ جب آپ

ڈاکوؤں سے مردانہ وار مقابلے کے لیے نکلے تو ایک شقی القلب ڈاکو سلطانلنگاہ نے آپ کو تیر مارا جس کی تاب نہ لا کر آپ شہید ہو گئے۔ آپ کے صاحبزادے مخدوم سید حامد بخش ثانی نے آپ کا جسد خاکی اوچ شریف میں اپنی جدی خانقاہ میں دفن کیا مگر خاندانی تنازع نے پھر سر اٹھایا اور برادرزادے آپ رحمۃ اللہ علیہ کی تدفین پر معترض ہوئے۔ تدفین کے تقریباً پندرہ برس بعد آپ کے صاحبزادے حضرت حامد آپ کا جسد خاکی ملتان لے آئے اور اس جگہ دفن کیا جہاں آج کل ملتان میں آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔ اسی نسبت سے بعد ازاں ملتان کا یہ دروازہ پاک دروازہ کہلانے لگا۔ آپ کی تدفین کے بعد آپ کے صاحبزادے نے ملتان میں سکونت اختیار کی۔ آج مشاہیر ملتان میں سے سابقہ وزیراعظم پاکستان جناب یوسف رضا گیلانی اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

حضرت شاہ کمال قادری کیتھلی رحمۃ اللہ علیہ (م 981ھ)

برصغیر کے دیگر شہروں اور بھارت کے صوبہ ہریانہ کی سرزمین کو نور اسلام سے منور کرنے والی عظیم شخصیت حضرت شاہ کمال 895ھ/ میں بغداد میں پیدا ہوئے۔ خاندان سید غوث الاعظم نے حضرت شاہ فضیل قادری کو ایک بشارت دی تھی کہ سید عمر (والد گرامی حضرت شاہ کمال رحمۃ اللہ علیہ) کے ہاں ایک صاحب فضیلت بچہ پیدا ہوگا جو حضرت سیدنا غوث اعظم کی جیتی جاگتی تصویر ہوگا۔ آپ کی پیدائش پر حضرت فضیل قادری تشریف لائے اور سید عمر کو اس بچہ کی خصوصی تعلیم و تربیت کی ہدایت دیں۔ حضرت شاہ کمال رحمۃ اللہ علیہ جب مکتب میں پہنچے اور قرآن مجید پڑھا تو آپ رحمۃ اللہ علیہ ''سیروفی الارض'' والی آیت شریفہ سے بہت متاثر ہوئے اور آپ نے اسی آیت میں دیئے گئے حکم ربانی یعنی ''زمین کی سیر کرو اور قدرت الٰہیہ کے نشان دیکھو'' پر عمل پیرا ہو کر صحرا نوردی شروع کر دی۔ اسی دوران ایک دن حضرت شاہ فضیل قادری ان کے ہاں تشریف لائے اور سید عمر کی درخواست پر حضرت شاہ کمال رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی مریدی اور شاگردی میں لے لیا۔ جس کے بعد حضرت شاہ کمال رحمۃ اللہ علیہ کو سیدنا غوث اعظم سے براہ راست فیض حاصل ہوا اور خرقہ خلافت بھی ملا جو بعد ازاں آپ نے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے جانشین کے ذریعے عطا فرمایا تھا۔

حضرت شاہ کمال اپنے مرشد حضرت شاہ فضیل قادری کے ساتھ طویل سیاحت پر روانہ ہو گئے اور آپ رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی تربیت کر کے ایک دن حضرت شاہ فضیل قادری نے آپ کو مسند خلافت سے سرفراز فرما کر ہندوستان روانگی کا حکم دیا کہ اسی اقلیم کے آپ آئندہ حکمران روحانی بننے والے تھے۔ آپ مشہد مقدس، نجف اشرف، تبریز واصفہان ہوتے ہوئے درہ گومل کے راستے برصغیر میں داخل ہوئے اور پہلے پہل ٹھٹھہ میں وارد ہوئے جو اس زمانے میں برصغیر کا ایک علمی شہر تھا۔ ان دنوں حضرت شاہ کمال رحمۃ اللہ علیہ پر مجذوبی کیفیت طاری تھی۔ آپ عموماً ٹھٹھہ کے ایک مدرس شاہ محمد کے درس میں اپنی جذبی کیفیت میں تشریف لے جاتے جو اس کو ناگوار گزرتی مگر جلد ہی وہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے مقام و مرتبہ سے واقف ہو کر آپ کی تعظیم کرنے لگا۔

ٹھٹھہ سے آپ کی اگلی منزل ملتان تھی جہاں سے آپ نے مشرقی پنجاب کا رخ کیا اور کیتھل شریف میں مستقل سکونت اختیار کی۔ اسی شہر میں آپ نے بے شمار غیر مسلموں کو حلقہ بگوش اسلام کیا اور بہت سے لوگوں کی راہنمائی کا فریضہ ادا کیا۔ حضرت شاہ کمال اپنی جذبی کیفیت کی وجہ سے سرخ لباس میں ملبوس رہتے تھے جس پر بعض لوگوں نے اعتراض بھی کیا مگر آپ کو پیش کیے گئے سفید لباس نے بھی آپ کے جسم پر زیب تن ہونے کے بعد سرخ رنگ اختیار کر لیا جس سے لوگوں کو پتا چلا کہ یہ مشیت ایزدی کے مطابق عمل تھا۔ آپ نے 29 جمادی الآخر 981ھ کو وفات پائی اور کیتھل شریف ہی میں مدفون

ہوئے۔ وہیں آپ کا مزار اقدس آج بھی مرجع خلائق ہے۔

حضرت شاہ سکندر روُس الاولیاء (م 1023ھ)

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے قادری مرشد اور سلسلہ قادریہ کے ایک عظیم بزرگ

10 ویں صدی کے آخری عشرے تاریخ اسلامی ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے دور ابتلا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اکبر اعظم جیسے مغلیہ بادشاہ نے دین الٰہی ایجاد کر کے اسلامی تعلیمات کو مسخ کرنے کی کوشش کی تھی۔ کوشامدی درباری علماء اس کے ہمنوا بن گئے تھے۔ یہ مسلمانان ہند کے لیے لمحات فکریہ تھے۔ ایسے میں سلسلہ قادریہ کے ایک بزرگ حضرت شاہ سکندر روُس الاولیاء کی تعلیمات پر چلتے ہوئے حضرت مجدد الف ثانی نے آوازہ حق بلند کیا اور سلطنت مغلیہ کے ایوانوں کو لرزاں کر دیا۔ حضرت مجدد الف ثانی سلسلہ قادریہ میں حضرت شاہ سکندر روُس الاولیاء کے ہاتھ پر بیعت تھے۔ حضرت شاہ سکندر کی ذات وہ مینارہ نور تھی جس کی روشنی میں حضرت مجدد الف ثانی کے علاوہ بھی بے شمار طالبان حق نے راہنمائی حاصل کی تھی۔ آپ حضرت شاہ کمال قادری کیتھلی کے نبیرہ تھے۔ 29 شعبان 863ھ/ 962ء کو حضرت شاہ سکندر کی ولادت ہوئی۔ آپ کی تعلیم و تربیت آپ کے دادا حضرت شاہ کمال کیتھلی رحمۃ اللہ علیہ نے کی۔ عظیم دادا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آپ ساری ساری رات عبادی الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ آپ کی نظر میں برق کی تاثیر تھی آپ جس کی جانب دیکھ لیتے وہ بے خود ہو کر رہ جاتا تھا۔ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو آپ سے نسبت قوی اور رابطہ خاص رہا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مجدد الف ثانی کو اپنے ہاتھ سے خرقہ حضرت غوث اعظم عطا فرمایا تھا۔ ''کرامت الاولیاء'' میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت شاہ سکندر قادری رحمۃ اللہ علیہ سرہند تشریف لائے۔ سخت گرمی کا موسم تھا، آپ شیخ احمد (حضرت مجدد الف ثانی) ے گھر پہنچے تو انہوں نے پذیرائی کی یہاں تک کہ خود اپنے ہاتھوں سے حضرت شاہ سکندر روُس کے ہاتھ پاؤں دھوئے۔ اس میں سپاس گزاری یہ تھی کہ مرشد نے دھوپ اور گرمی میں قدم رنجہ فرمایا تھا۔ حضرت شاہ سکندر بھی امام ربانی سے بے حد محبت کرتے تھے اور ان کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے ایک روز فرمایا کہ اگر چاہتے ہو العلما وراثت الانبیا کے معنی معلوم ہوں تو شیخ احمد کو دیکھ لو۔ آپ کا وصال مبارک 9 جمادی الاول 1023ھ کو تازہ غسل کرنے کے بعد ہوا۔ آپ کا مزار اقدس کیتھل شریف ہریانہ بھارت میں مرجع خلائق ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ (م 1034ھ/ 1624ء)

امام ربانی، ابوالبرکات بدرالدین شیخ احمد سرہندی عہد اکبر و جہانگیر کے بہت بڑے عالم اور مصلح

رات کے آخری پہر میں شیخ عبدالاحد سرہندی نے خواب دیکھا کہ خنزیر، بندر اور ریچھ مخلوق خدا کو ہلاک کر رہے ہیں پھر ایک نورانی صورت انسان ایک نورانی تخت پر سوار آپ کے سینے سے نمودار ہونے والے نور سے ظاہر ہوا اور اس نے ظالموں، ملحدوں اور زندیقوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر دیا۔ پھر خواب ہی میں آپ کو آیت قرآنی ''وقل جآء الحق وزھق الباطل ان الباطل ان کان زھوقا'' سنائی دی اور آپ کی آنکھ کھل گئی۔ اگلی صبح آپ حضرت شاہ کمال کیتھلی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تعبیر خواب پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ تمہارے ہاں ایک بچہ پیدا ہوگا جو الحاد و بدعت کی سیاہیوں کو دنیا سے مٹا دے گا۔ پھر جمعہ 16 شوال 971ء کی شب شیخ عبدالاحد کے ہاں وہ بچہ تولد ہوا تو شیخ صاحب نے اس کا نام احمد رکھا۔ یہی بچہ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی تھا جس نے مغلیہ دربار میں دین اکبری کی پھیلی ہوئی تاریکیوں کو دور کیا تھا۔ ابتدائی

تعلیم سرہند میں حاصل کرنے کے بعد شیخ احمد سیالکوٹ تشریف لے گئے اور حضرت مولانا کمال کشمیری سے اکتساب علم کیا۔ تحصیل علم کے بعد آپ واپس سرہند تشریف لے گئے اور درس وتدریس کا آغاز کیا۔ شیخ احمد سرہندی نے تعلیم باطنی کی تکمیل کے لیے چاروں روحانی سلاسل کے بزرگوں سے انتساب باطنی کیا، سلسلہ نقشبندیہ میں آپ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مرید وخلیفہ تھے، سلسلہ چشتیہ اور سہروردیہ میں آپ اپنے والد شیخ عبدالاحد کے مرید تھے جبکہ سلسلہ قادریہ میں آپ کو خرقہ حضرت غوث الاعظم حضرت شاہ سکندر روس الاولیاء کیتھلی نے عطا فرمایا تھا۔ اسی دور میں مغل شہنشاہ اکبر کے گرد ملا مبارک کے صاحبزادگان ابوالفضل وفیضی، کچھ ہندو پنڈت اور دیگر مذاہب کے عالم اس طرح پھیل گئے کہ انہوں نے بادشاہ کو دین الٰہی ایجاد کرنے پر مجبور کر دیا۔ جو بہت سے الہامی وغیر الہامی مذاہب کا ملغوبہ تھا اور بہت سے عقائد باطلہ کا حامل تھا۔ حضرت مجدد الفثانی کی رگوں میں خون فاروقی دوڑتا تھا کیونکہ آپ کا شجرہ نسب ستائیسویں پشت میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے جاملتا تھا اور آپ فاروقی تھے۔ آپ نے عہد اکبری کے ان عقائد باطلہ کی تردید ایک رسالہ لکھ کر فرمائی اور جب اکبر کے بعد جہانگیر سریر آرائے سلطنت ہوا اور اپنے باپ کے نقش قدم پر چلا تو آپ نے اپنے خلفا کے ذریعے ارکان سلطنت مغلیہ کو سیدھی راہ دکھائی اسی دوران جہانگیر نے آپ کو اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی مگر آپ نے سجدہ تعظیمی نہ کیا جس پر بادشاہ نے آپ کو گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا جہاں آپ نے قید خانے ہی میں رشد وہدایت کا کام جاری رکھا اور بے شمار لوگوں کو ہدایت دی۔ تقریباً دو سال بعد جہانگیر اپنے کیے پر نادم ہوا اور اس نے آپ کو رہا کرنے کا فرمان جاری کیا مگر حضرت مجدد الف ثانی نے فرمایا کہ جب تک ملحدانہ قوانین منسوخ نہ کیے جائیں آپ رہا نہ ہوں گے۔

حضرت شاہ موسیٰ ابوالمکارم رحمۃ اللہ علیہ (م 985ھ/ 1577ء)

سلسلہ عالیہ قادریہ کے ایک جلیل القدر اور صاحب کرامت بزرگ

آپ کو حضرت شاہ محسن کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ آپ حضرت شاہ کمال کیتھلی رحمۃ اللہ علیہ کے منجھلے صاحبزادے تھے، مادرزاد ولی ہونے کی وجہ سے بچپن ہی سے آثار بزرگی آپ رحمۃ اللہ علیہ کی پیشانی پر ہویدا تھے۔ ریاضت و عبادت کی منزلیں بچپن ہی میں طے کر لی تھیں۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ ہر شب دوگانہ نماز میں ایک قرآن پاک ختم کیا کرتے تھے۔ اوائل عمر میں قرآن شریف کو ناظرہ کے طور پر پڑھا اور پھر حفظ کر لیا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں تمام علوم متداولہ میں دسترس حاصل کر لی۔ آپ کی فضیلت وتبحر علمی کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا۔ قرب وجوار کے شیوخ اور اساتذہ نے بھی آپ سے استفادہ کیا۔ آپ اپنے والد گرامی قدر کی جلالی طبیعت کے خوف سے کہ احوال تھے کیتھل شریف سے قبولہ شریف (ضلع پاکپتن) تشریف لے ائے تھے۔ اور وہاں خوب نام پیدا کیا تھا۔ بعدزاں جب حضرت شاہ کمال رحمۃ اللہ علیہ کی جلالی کیفیت وطبیعت وقت کے ساتھ ساتھ کچھ ٹھہری تو آپ نے حضرت موسیٰ ابوالمکارم کو بہت سے خطوط لکھے جو آج بھی کتابوں کے صفحات میں موجود ہیں۔

حضرت شاہ موسیٰ ابوالمکارم جب پہلے پہل پاکپتن پہنچے تو آپ نے حضرت فرید الدین گنج شکر کے مزار پر حاضری دی، اس دوران آپ ذکر وفکر میں کچھ ایسے محو ہوئے کہ رات ہوگئی اور خدام نے دربار شریف کو بند کر دیا تو آپ حجرہ شریف کے اندر رہ گئے اور آدھی رات گزرنے کے بعد حضرت فرید الدین گنج کی اپنے سجادہ نشین کو ہدایت کے بعد دربار شریف کھلوایا گیا۔ قبولہ شریف میں آپ نے تعلیمات اسلام کو فروغ دیا اور بہت سے غیر مسلموں نے آپ کے دست حق پرست پر اسلام قبول کیا جبکہ بہت سے بھٹکے ہوؤں کو آپ کی تعلیمات سے منزل نصیب ہوئی۔ قبلوہ شریف میں آپ نے 25 رمضان المبارک

985ھ/6 دسمبر 1577ء کو بروز جمعہ انتقال فرمایا اور یہیں آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے سجادہ نشینوں میں حضرت دیوان غلام دستگیر صاحب ایک بڑا نام ہیں۔ آپ نے حالیہ برسوں میں انتقال فرمایا ہے۔

حضرت طاہر بندگی رحمۃ اللہ علیہ

ایک صاحب کرامت باعمل، روشن ضمیر، بلند کردار اور فخر روزگار ہستی جن کا مزار لاہور میں مرجع خلائق ہے

حضرت شیخ احمد سرہندی، مجدد الف ثانی کی مجلس وعظ کے حلقہ ذکر سے حضرت شیخ ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ ہم نے اس حلقہ میں شامل ایک دوست کی پیشانی پر لفظ شقی لکھا ہوا دیکھا ہے۔ یہ سن کر حلقہ میں شامل تمام حضرات پر ہیبت طاری ہوگئی اور ہر ایک لرز کر رہ گیا اور آپ کی دعا سے یہ مصیبت اور آفت اس دوست سے دور ہوگئی یہ دوست کوئی اور نہیں بلکہ ان کے مرید حضرت شیخ طاہر بندگی لاہوری تھے۔ اس واقعہ کے تھوڑے عرصہ بعد حضرت شیخ طاہر بندگی سے عجیب عجیب لغزشیں سرزد ہوئیں۔ ایک مرتبہ آپ کی زبان سے نکلا کہ حضرت مجدد الف ثانی بھی چاہیں تو میری نسبت سلب نہیں کر سکتے اس بات پر حضرت مجدد کو جلال آ گیا اور شیخ طاہر ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے مگر حضرت مجدد نے انہیں تڑپتا دیکھ کر رحم فرمایا اور ان کا قصور بشری معاف کر دیا۔

حضرت شیخ محمد طاہر بندگی 984ھ میں بمقام لاہور پیدا ہوئے اور یہیں پرورش پائی۔ سلسلہ قادریہ کے عظیم بزرگ حضرت شاہ کمال قادری رحمۃ اللہ علیہ نے عالم رؤیا میں آپ کو بندگی کا لقب عطا فرمایا تھا۔ حضرت شاہ سکندر رؤس الاولیاء نے آپ رحمۃ اللہ علیہ کو ابوطاہر کا خطاب دیا تھا۔ علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد آپ نے دہلی اور آگرہ جا کر وہاں کے ارباب فضل وکمال سے استفادہ کیا پھر فیض باطنی کے حصول کے لیے کسی مرد کامل کی تلاش میں نکلے۔ دہلی میں حضرت باقی باللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا کہ تمہارا معاملہ شیخ احمد سرہندی کے ساتھ ہے اس لیے سرہند جاؤ۔ سرہند جا کر حضرت مجدد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ کے جوہر چمک اٹھے کئی دن حضرت شاہ سکندر رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں کیتھل شریف بھی حاضر رہے۔ پھر اپنے مرشد کے حکم پر لاہور آ گئے اور لاہور کی قطبیت سے نوازے گئے۔ اپنے مرشد عظیم کے ساتھ ساتھ آپ کے روح وقلب پر حضرت شاہ سکندر کیتھلی قادری رحمۃ اللہ علیہ کی توجیہات کا اتنا اثر غالب تھا کہ ایک مرتبہ حضرت شاہ سکندر لاہور تشریف لائے اور حضرت طاہر رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر پہنچے۔ اس وقت آپ بالائی منزل میں تشریف رکھتے تھے۔ حضرت شاہ سکندر رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھتے ہی بے اختیار ہو کر بالائی منزل سے چھلانگ لگائی اور قدم بوس ہوئے۔

حضرت شیخ آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی شہرت سنی تو ترک شیخیت کر کے پاپیادہ بنور سے لاہور آئے اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور مسند ارشاد پر فائز ہوئے۔ حضرت طاہر بندگی نے 10 محرم 1040ھ میں انتقال فرمایا اور لاہور کے مشہور قبرستان میانی صاحب میں مدفون ہوئے۔

حضرت صابر علاؤ الدین کلیروی رحمۃ اللہ علیہ

برصغیر کے جلیل القدر بزرگ حضرت بابا فرید گنج شکر کے بھانجے حضرت علاؤ الدین علی احمد پیا جلالی طبیعت کے مالک تھے اور اولیائے ہند میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ سات سال کی عمر میں یتیم ہو گئے اور ان کی بیوہ ماں نے اپنے بھائی حضرت فرید گنج شکر کے دامن میں پناہ لی۔ حضرت بابا فرید نے ہی اپنے یتیم بھانجے کی پرورش کی اور ساتھ ہی روحانی تربیت بھی فرمائی۔ حضرت بابا فرید نے لنگر خانے کا انتظام اس کے سپرد کر دیا مگر حضرت علی احمد اتنے صابر تھے کہ بارہ برس تک لنگر

خانے کا انتظام کرتے رہے مگر خود اس میں سے کچھ نہ کھایا نہ پیا۔ جب ان کی والدہ نے اُنھیں ضعف ونقاہت سے لرزا دیکھا تو اس کا شکوہ حضرت فرید سے کیا جنہوں نے جب یہ ماجرا سنا تو بھانجے کو گلے سے لگا کر کہا کہ علی احمد تم نے تو صبر کی انتہا کردی تم واقعی صابر ہو! بخدا تم صابر ہو۔ اس دن سے حضرت علی احمد کو صابر کے لقب سے پکارا جانے لگا۔ ادھر بابا فرید نے انہیں دلی کی ولایت عنایت کی مگر شرط یہ رکھی کہ حضرت شیخ جمال ہانسوی اس فرمان ولایت پر اپنی مہر تصدیق ثبت کردیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت علی احمد صابر کی جلالی طبیعت اور گرم مزاجی کی وجہ سے انہوں نے فرمایا تھا کہ دہلی والے ان کی گرم مزاجی کے بھلا کیسے متحمل ہوسکیں گے۔ جس کے بعد حضرت بابا فرید نے انہیں سہارنپور میں رڑکی کے قریب ایک قصبہ کلیر شریف کی ولایت کا فرمان عطا کیا۔ جب آپ کلیر پہنچے تو وہاں کے ایک امیر قیام الدین نے انہیں کہا کہ آپ اپنے عمل سے دکھائیں کہ آپ واقعی ولی ہیں اور شعبدہ باز نہیں ہیں۔ حضرت علی احمد نے انتہائی تحمل سے کام لیتے ہوئے ان سے پوچھا کہ تم کون سی کرامت دیکھنا چاہتے ہو۔ امیر نے انتہائی تحمل سے کہا کہ حضرت چند ماہ پہلے میری ایک بکری گم ہوگئی ہے آپ اس کو ڈھونڈ نکالیں تو مانیں۔ حضرت علی احمد نے اس سے پوچھا کہ تمہاری بکری کا نام کیا تھا۔ اس نے حرمنہ بتایا تو آپ نے بلند آواز میں اعلان کیا کہ اے حرمنہ کے کھانے والو جامع مسجد میں حاضر ہوجاؤ۔ یہ الفاظ ابھی آپ کی زبان سے ادا ہوئے تھے کہ ایک جماعت مسجد میں حاضر ہوگئی۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے پوچھا کہ کیا تمہی نے امیر شہر کی بکری چُرائی اور اسے کھالیا تھا۔ ان لوگوں نے تسلیم کیا کہ انہوں نے یہ بکری کھائی تھی۔ مگر اس کرامت کو قاضی شہر نے آپ کی ساحری قرار دیا اور آپ کی شان میں گستاخی کی۔ کلیر والوں کو اس گستاخی کی یہ سزا ملی کہ اس قصبے میں طاعون کی وباء پھیل گئی اور ہر طرف تباہی پھیل گئی اس پر آپ مغموم و بے چین ہوگئے اور ایک گولر کے درخت کے نیچے اپنا مسکن بنا کر محو عبادت ہوگئے مگر آپ کی جلالی طبیعت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔

حضرت علاؤ الدین علی احمد صابر پیا نے 13 ربیع الاول 690ھ کو وفات پائی اور کلیر شریف میں آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔

کہتے ہیں کہ وفات کے بعد حضرت عبدالقدوس گنگوہی آپ کے مزار پر حاضر ہوئے تھے اور آپ سے جلال میں کمی کی درخواست کی تھی۔

حضرت میاں میر لاہوری رحمۃ اللہ علیہ (م 1045ھ/ 1653ء)

المعروف بہ پیر لاہوری میر محمد فاروقی برصغیر کے عظیم ولی اور شاہان مغلیہ کے مرجع عقیدت بزرگ تھے

آپ رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ نسب اٹھائیس واسطوں سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے بزرگ عربوں کے حملہ سندھ کے دوران برصغیر پہنچے تھے۔ خزینۃ الاصفیاء کے مطابق آپ سندھ کے شہر سیوستان میں 957ھ/ 1550ء میں پیدا ہوئے تھے۔ سندھ میں پیدا ہونے کی وجہ سے شاید جہانگیر نے توزک جہانگیری میں ان کو سندھی نژاد لکھا ہے۔ ابھی سات سال کے تھے کہ والد گرامی قاضی سائیں دتہ فاروقی وفات پاگئے۔ شہزادہ دارا شکوہ نے لکھا ہے کہ ان کی والدہ ماجدہ، بی بی فاطمہ بنت قاضی قادن رابعہ وقت تھیں اور ان کا خاندان علم و فضل اور پابندی شریعت میں شہرت رکھتا تھا۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنی والدہ سے ہی سلسلہ قادریہ میں تلقین حاصل کی تھی اور ان کی اجازت سے کوہ سیوستان میں شیخ خضر سیوستانی سے بیعت کر کے تکمیل فقر اور خرقہ خلافت حاصل کیا تھا۔ 25 سال کی عمر میں آپ لاہور تشریف لائے (1574ء) یہ مغلوں کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا اور دنیوی جاہ و حشم نے ان کی آنکھوں کو خیرہ کردیا تھا۔ حضرت میاں میر نے عظیم مغل بادشاہوں کے دوسرے دارالسلطنت لاہور میں رہ کر فقر اسلامی کے مطابق ترک کا صالح نمونہ پیش کیا اور اپنی بلند و

بالاشخصیت سے خود مغل شہنشاہوں کو متاثر کر دیا۔ حصول علم کی آرزو میں پہلے تو عہد اکبری کے مشہور فاضل مولانا سعد اللہ کے درس میں شامل ہوئے اور علوم منقول پڑھے۔ تحصیل علم کے بعد حضرت میاں میر نے اپنے آپ کو عبادت و ریاضت کے لیے وقف کر دیا اور رات کو حجرہ بند کر کے شب بیداری کیا کرتے تھے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کو نسبت اویسی حاصل تھی۔ بے وضو کبھی حضرت غوث الثقلین کا نام نامی زبان پر نہیں لاتے تھے۔ کچھ عرصہ سرہند شریف میں حاجی نعمت اللہ سرہندی کی خدمت میں رہے اور پھر واپس لاہور آ کر محلہ باغبان پورہ میں قیام کیا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ عمر بھر مجرد رہے۔ حق تعالیٰ کی ذات کے سوا نظر میں کوئی نہ سماتا تھا۔ ان کے فقر کی شہرت ہوئی تو عوام، امراء اور مغل شہنشاہ تک خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ جہانگیر نے آپ سے ملاقات خصوصی کی تھی۔ شاہجہاں دو مرتبہ خدمت میں حاضر ہوا۔ شہزادی جہاں آرا بیگم ان کی عقیدت مند تھی۔

حضرت شاہ عنایت قادری رحمۃ اللہ علیہ (حیات 1150ھ/ 1737ء)

شطاری سلسلے کے صوفی بزرگ، بلھے شاہ کے مرشد اور غایۃ الحواشی کے مصنف

حضرت ابوالمعارف شاہ عنایت قادری قدس سرہ کی شہرت و عظمت اٹھارہویں صدی عیسوی میں پورے ہندوستان پھیلی ہوئی تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر کے جانشینوں میں محمد شاہ آپ رحمۃ اللہ علیہ سے بغض رکھتا تھا۔ ایک دن وہ اپنے درباریوں کی ایک جماعت کے ساتھ امتحان کی نیت سے آپ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کوئی کرامت دکھانے کی فرمائش کی، آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مسکرا کر جواب دیا کہ ”اے دنیا کے بادشاہ تو شاید بھول گیا کہ تم سے بڑا بھی ایک بادشاہ ہے جو اس کائنات کا خالق و مالک ہے، میں تو اسی مالک کا ایک ادنیٰ سا بندہ ہوں۔ مجھے یقین کامل ہے کہ میرا خدا مجھے تمہارے ہر امتحان میں کامیاب فرمائے گا۔ بتا تو کیا چاہتا ہے؟“ بادشاہ نے سردیوں کا موسم ہونے کے باوجود حضرت کے صحن میں کھڑے آم کے پیڑ سے تازہ پکے ہوئے آم اتار کر کھلانے کی فرمائش کی اور سوچا کہ سردیوں میں بھلا آم کہاں سے آئیں گے۔ حضرت شاہ عنایت قادری نے خدا سے سرخروئی کی دعا کی خدا نے کرم کیا اور وہ پیڑ پکے ہوئے آموں سے بھر گیا۔ شہنشاہ ہند محمد شاہ دم بخود رہ گیا اور اس کی آنکھیں اشکوں سے لبریز ہو گئیں اور بے اختیار ہو کر حضرت شاہ عنایت کے قدموں میں گر گیا اور آپ رحمۃ اللہ علیہ سے معافی کا خواستگار ہوا۔

بادشاہ نے اس کے بعد حضرت شاہ عنایت رحمۃ اللہ علیہ سے لاہور کے بھاٹی دروازے کی اونچی مسجد میں امامت قبول کرنے کی التجا کی جو شاہ عنایت رحمۃ اللہ علیہ نے قبول فرمالی۔

حضرت شاہ عنایت دنیائے تصوف کی ایک عظیم المرتبت اور صاحب بصیرت شخصیت تھے۔ اولیائے وقت اور صوفیا کرام میں آپ کا مرتبہ نہایت بلند تھا۔ آپ مشہور صوفی شاعر حضرت بلھے شاہ کے مرشد کامل تھے۔ آپ کے ایک نہایت صالح بزرگ مولوی پیر محمد صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے ہم عصر تھے۔ آپ نے پانچ سال سے کم عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ پھر تحصیل علم کے لیے نکلے اور لاہور میں قیام کیا۔ لاہور ان دنوں علم و دانش کا سرچشمہ تھا۔ یہاں آپ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت محمد رضا شاہ قادری شطاری سے روحانی فیض حاصل کیا اور سات دیگر بزرگان سلسلہ قادریہ سے بھی خلافت حاصل کی پھر مرشد کے حکم پر قصور کا رخ کیا، وہاں جلد ہی آپ کی ولایت اور کرامات کا چرچا ہونے لگا۔ تاہم آپ لاہور واپس آگئے اور یہاں پہنچ کر اپنے آبائی گاؤں مزنگ میں قیام کیا۔ جن دنوں آپ محمد شاہ کی فرمائش پر بھاٹی دروازے کی اونچی مسجد میں امام تھے تو حضرت بلھے شاہ بیعت ہونے کے لیے آپ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر

ہوئے۔ آپ نے پہلے تو ٹال دیا مگر پھر بیعت کر کے انہیں تزکیہ نفس کی راہ دکھائی۔ حضرت شاہ عنایت نے 1738ء میں وفات پائی اور اپ کا مزار کوئنز روڈ لاہور پر مرجع خلائق ہے۔

حضرت بلھے شاہ (م 1168ھ/ 1757ء)

سید محمد عبداللہ شاہ، پنجابی زبان کے شہر صوفی شاعر   کی جاناں میں کون؟

حضرت بلھے شاہ قادری اُچ گیلانیاں میں 1061ھ/ 1675ء میں پیدا ہوئے۔ اُچ گیلانیاں آج کل بہاولپور ڈویژن میں شامل ہے۔ حضرت بلھے شاہ کا اصل نام عبداللہ شاہ تھا اور آپ رحمۃ اللہ علیہ کے والد کا نام سید درویش محمد شاہ تھا۔ وہ درس وتدریس کے سلسلہ میں اپنا وطن مالوف چھوڑ کر موضع ملکوال نزد کاہنہ نو ضلع لاہور میں آبسے تھے۔

حضرت بلھے شاہ نے ابتدائی تعلیم حافظ محمد لام مرتضٰی سے حاصل کی جو قصور میں قیام پذیر تھے۔ مروجہ علوم کی تحصیل کے بعد حضرت بلھے شاہ کسی مرشد کامل کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔ ایک دن اسی جستجو میں ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے کہ اونگھ آ گئی، خواب میں دیکھا کہ آپ کی پانچویں پشت کے جد امجد سید عبدالحکیم ایک تخت پر تشریف فرما ہیں، انہوں نے بلھے شاہ سے پوچھا تم کون ہو؟ آپ نے جواب دیا میں سید عبداللہ بن سید درویش محمد ہوں۔ انہوں نے کہا بیٹا ہمیں پیاس لگی ہے۔ آپ نے دودھ کا پیالہ ان کی خدمت میں پیش کیا انہوں نے نوش کرنے کے بعد کچھ بچا کر بلھے شاہ کو عنایت فرمایا اور حکم دیا کہ اسے پی لو۔ حضرت بلھے شاہ نے جیسے ہی ان کا پس انداز دودھ پیا۔ نور معرفت سے آپ کا قلب منور ہو گیا۔ سید عبدالحکیم نے بھی انہیں تلاش مرشد کی تلقین کی۔ جس کے بعد حضرت بلھے شاہ نے اپنے والد کو خواب سنا کر پوچھا کہ مرشد کامل انہیں کہاں مل سکیں گے۔ آپ کے والد نے مراقبہ کر کے بتایا کہ وہ اس وقت موضع سانده میں مقیم ہیں۔ بلھے شاہ اسی وقت گھر سے نکلے اور سانده کی مسجد میں جا کر لیٹ گئے۔ ایک بار پھر خواب میں سید عبدالحکیم سے ملاقات ہوئی تو اس بار انہوں نے حضرت شاہ عنایت قادری سے رجوع کرنے کا کہا جو ان دنوں بھاٹی دروازہ کی اونچی مسجد میں امام تھے اور درس وتدریس بھی فرماتے تھے۔ جب ان کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کرنے کی درخواست کی تو انہوں نے کہا کہ پہلے ایک کام یہ کرو کہ پانچ سو نقد ایک گھوڑا اور پوشاک وکنگن طلائی لے کر آؤ پھر بیعت کر لیں گے۔ مگر ان کے مالی حالات ان شرائط کو پورا کرنے کے لیے ناکافی تھے اس لیے مغموم ہو کر دریا میں ڈوب مرنے کا فیصلہ کیا مگر ابھی چھلانگ نہیں لگائی تھی کہ کسی نے آواز دی کہ لڑکے میرا یہ سامان سنبھالو کہ میں دریا میں غسل کرنا چاہتا ہوں۔ وہ سامان آپ کے مرشد کی مطلوبہ اشیا پر مشتمل تھا۔ اس بزرگ نے دریا میں ایسا غوطہ لگایا کہ پھر دوبارہ دریا سے باہر نہ آیا اور حضرت بلھے شاہ اس کا سامان لے کر اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ راستے میں لوگوں نے پوشاک اور گھوڑا پہچان کر انہیں بتایا کہ یہ تو حضرت شاہ عنایت کے ہیں، پھر حضرت شاہ عنایت نے انہیں بیعت سے مشرف فرمایا اور حضرت بلھے شاہ اپنی منزل پا گئے۔

حضرت عبدالعلی شاہ رحمۃ اللہ علیہ (انیسویں صدی عیسوی) (م دسمبر 1900ء)

قائد ملت، لیاقت علی خاں کے والد نواب رستم علی خاں کے قادری مرشد اور عظیم روحانی پیشوا

مشرقی پنجاب (ہریانہ) کا شہر کیتھل از منۂ وسطیٰ میں ہندوستان میں بت پرستی کا گڑھ تھا، اور اس کا اصل نام کپس تھل تھا جس کے معنی ''بندروں کا استھان'' ہیں۔ اسی شہر میں بیسویں صدی کے نصف اول تک بندر بڑی کثرت سے پائے جاتے تھے اور دیوتا ہنومان (بڑا بندر جس کا ذکر رام چندری کی اسطوری کہانی میں ملتا ہے)۔ اس بت کدے میں سلسلہ عالیہ

قادریہ کے ایک شہباز لامکانی حضرت شاہ کمال کیتھلی رحمۃ اللہ علیہ مختلف ممالک کی سیر وسیاحت فرماتے ہوئے تشریف لائے اور دسویں صدی ہجری کے وسط میں یہاں مستقل قیام فرمایا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اس بت کدے کو اسلام کی روشنی سے منور کر دیا اور کپس تھل کو کیتھل بنا کر یہاں سے رشد وہدایت کا چشمہ جاری فرمایا جس سے بے شمار بندگان خدا فیضیاب ہوئے اور روحانیت کے بے شمار چراغ روشن ہوگئے۔ انہیں چراغوں میں سے ایک حضرت مجدد الف ثانی تھے جنہوں نے مغلیہ دربار میں کلمۃ الحق بلند کیا اور ''دین الٰہی اکبر شاہی'' کی سیاہیوں کو انڈیا کے افق سے دور کر دیا۔

حضرت مجدد الف ثانی سلسلہ قادریہ میں حضرت شاہ کمال کیتھلی کے نبیرہ حضرت شاہ سکندر روئس الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے تھے۔ حضرت شاہ سکندر کی اولاد امجاد اور ان کے سجادگان عظام میں حضرت محمد شاہ علی رحمۃ اللہ علیہ، قبلہ عالم حضرت سید علی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت سید عبدالعلی رحمۃ اللہ علیہ نے ہزاروں تشنگان راہ سلوک کو صراط مستقیم پر گامزن کیا۔ حضرت سید عبدالعلی رحمۃ اللہ علیہ اپنے جد امجد حضرت شاہ سکندر روئس الاولیاء کے سلسلہ خاندانی میں آٹھویں پشت کے بزرگ تھے۔ آپ نے انیسویں صدی عیسوی کا زمانہ پایا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد سلطان العارفین حضرت سید شاہ محمد علی رحمۃ اللہ علیہ قادری ایک بلند پایہ صاحب نسبت بزرگ ہونے کے ساتھ ایک بڑے عالم دین بھی تھے۔ انہیں سے حضرت شاہ عبدالعلی رحمۃ اللہ علیہ فیضیاب ہوئے اور شرف ارادت حاصل کیا، پھر منازل سلوک طے کرتے ہوئے اس قدر زبردست مجاہدے کیے کہ موجودہ دور میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ آپ ہمیشہ روزے سے رہتے تھے اور آپ کی زندگی کا کوئی لمحہ یاد الٰہی سے خالی نہیں گزرا۔ قائد ملت لیاقت علی خان کے والد نواب رستم علی خان کو آپ رحمۃ اللہ علیہ سے شرف بیعت حاصل تھا۔

قائد ملت کی پیدائش پر حضرت سید عبدالعلی رحمۃ اللہ علیہ نے نواب رستم علی خان کو بشارت دی تھی کہ تمہارا یہ بیٹا کسی ملک کا بادشاہ بنے گا۔ قائد ملت کے وزیراعظم پاکستان بننے پر آپ کی یہ بشارت حرف بحرف پوری ہوئی۔ حضرت سید عبدالعلی قادری رحمۃ اللہ علیہ نے شعبان 1318ھ/ دسمبر 1900ء میں وفات پائی اور کیتھل ہی میں مدفون ہوئے۔

حضرت خواجہ سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ

کوہستان سلیمان کی بلند چوٹیوں سے پرواز کر کے تونسہ آنے والے بزرگ

خواجہ خواجگان حضرت محمد سلیمان تونسوی کوہستان گڑگوجی میں 1764ء بمطابق 1182ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام جناب زکریا تھا جو افغانوں کے قبیلے جعفر کے سردار تھے۔ حضرت سلیمان تونسوی کے سر سے والد کا سایہ عہد طفولیت ہی میں اٹھ گیا۔ آپ کی والدہ نے آپ کی تعلیم وتربیت کا بندوبست بڑے تدبر سے کیا۔ تعلیم قرآن کے بعد مزید تعلیم آپ نے تونسہ آ کر حاصل کی۔ ان دنوں کوٹ مٹھن میں قاضی احمد علی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے والد محترم قاضی محمد عاقل نے ایک دارالعلوم قائم کیا ہوا تھا، حضرت سلیمان تونسوی نے اس دارالعلوم سے بھی استفادہ کیا۔ پھر وہاں سے آپ اُچ شریف گئے جہاں حضرت خواجہ نور محمد مہاروی بھی تشریف لائے اور آپ کو بیعت سے سرفراز کیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ نے منازل تصوف طے کر لیں اور بائیس سال کی عمر میں آپ کو اجازت وخلافت عطا ہوئیں اور مسند ارشاد پر بیٹھنے کا حکم ملا۔ حضرت خواجہ سلیمان تونسوی نے بحکم مرشد تونسہ شریف میں قیام کیا۔ سب سے پہلے آپ سے شیخ جمال الدین چشتی اور خلیفہ اعظم مولانا محمد باراں صاحب نے بیعت کی۔

تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ حضرت خواجہ سلیمان تونسوی کی شکل وصورت حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ

سے ملتی تھی اور آپ کے مزاج میں نفاست اور طبیعت میں لطافت تھی۔ خواجہ صاحب کی عوام میں مقبولیت اس درجہ تھی کہ آپ کے ہم عصر سر سید احمد خاں اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ خواجہ سلیمان تونسوی کی شہرت قاف سے قاف تک ہے۔ اسی طرح حضرت مولانا حسین احمد مدنی چشتی فرمایا کرتے تھے کہ خواجہ صاحب اپنے زمانے کے آفتاب تھے۔ 1267ھ میں ماہ صفر کا چاند نظر آیا تو خواجہ صاحب نے اپنے مریدوں کو فرمایا کہ ہمارے سفر کا مہینہ آ گیا ہے۔ یکم صفر کو آپ کو شدید زکام و بخار ہوا اور ایک ہفتہ کی علالت کے بعد آپ نے 7 صفر 1267ھ کو بوقت تہجد وصال فرمایا۔ آپ کا مزار تونسہ شریف میں مرجع خلائق ہے۔ آپ کے مریدین میں خواجہ اللہ بخش تونسوی حضرت مولانا فخر الدین دہلوی اور حضرت مولانا محمد علی مکھڈی اور خواجہ شمس الدین سیالوی قابل ذکر ہیں۔

حضرت مہر علی شاہ گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ (م 356ھ/ 1937ء)

برعظیم کے مشہور صوفی بزرگ، عالم دین، واعظ اور مصنف

حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی کے آباؤ اجداد جو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے تھے، بغداد سے بغرض تبلیغ ہندوستان آئے اور پہلے ساڈھورہ ضلع انبالہ مشرقی پنجاب میں اور بعد ازاں گولڑہ شریف نزد راولپنڈی میں سکونت پذیر ہوئے۔

حضرت مہر علی شاہ یہیں یکم رمضان 1275ھ/ 4 اپریل 1859ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سید نذر الدین اور ماموں سید فضل الدین کے زیر سایہ مختلف اساتذہ سے پائی۔ پھر انگہ ضلع سرگودھا میں دو سال تک مولانا سلطان محمود کے درس میں شریک رہے اور علوم متداولہ پر عبور حاصل کیا۔

مولانا سلطان محمود کو سلسلہ چشتیہ کے بزرگ حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی سے عقیدت تھی۔ حضرت مہر علی شاہ بھی ایک باران کے ہمراہ سیال شریف گئے اور خواجہ صاحب کے جذب و عشق سے متاثر ہو کر ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس کے بعد کچھ عرصہ علی گڑھ میں مولانا لطف اللہ سے اکتساب علم کیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ سہارن پور میں شیخ الحدیث مولانا احمد علی کی خدمت میں رہ کر سند فراغت حاصل کی اور وطن واپس آ کر پہاڑوں اور جنگلوں میں مجاہدات اور ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ بہت جلد انہوں نے ایقان و عرفان کے مدارج طے کر لیے اور خواجہ شمس الدین سیالوی سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے ماموں سید فضل الدین شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے سلسلہ قادریہ کا خرقہ خلافت بھی انہیں عطا کیا۔ حصول خلافت کے بعد آپ حج کے لیے تشریف لے گئے۔ واپس آ کر آپ اس زمانے میں پھیلے ہوئے فساد قادیانیت کے خلاف سر بکف ہو گئے اور ساتھ ہی مسند ارشاد و ہدایات بھی سنبھال لی۔

اٹھارہویں صدی میں خواجہ نور محمد مہاروی نے احیا و اصلاح دین کی جو تحریک پنجاب میں شروع کی تھی اسے حضرت شاہ صاحب بڑی مستعدی سے لے کر آگے بڑھے اور درس و تدریس کا فریضہ بھی بطریق احسن ادا کیا۔ آپ شیخ اکبر کی فصوص الحکم کا درس بھی دیتے تھے۔ آپ فارسی اور پنجابی میں شعر بھی کہتے تھے۔

پیر صاحب کا شمار اکابر صوفیہ میں کیا جاتا ہے۔ آپ کا شرب افراط و تفریط سے پاک تھا۔ آپ نے دہلی میں شاہ جارج پنجم کی تاج پوشی کے دربار میں شرکت کی دعوت کو محض اس بنا پر مسترد کر دیا تھا تخت دہلی کبھی مسلمانوں کا تھا۔

قبلہ عالم، حضرت علی احمد شاہ قادری رحمۃ اللہ علیہ (م 1383ھ/1962ء)

کمالی فہر کے نقش و نگین اور حضرت شاہ سکندر روٗس الاولیا کے امین، قطب دوراں

عصر جدید کے قطب دوران حضرت سید علی احمد بن سید عبدالعلی عبداللہ شاہ کی ولادت 12 شعبان 1315ھ/8 جنوری 1898ء بروز جمعۃ المبارک کیتھل شریف (ہریانہ انڈیا) میں آپ کا سلسلہ نسب 12 واسطوں سے حضرت شاہ کمال کیتھلی اور پھر 25 واسطوں سے حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی، غوث الاعظم سے جاملتا ہے۔

دیگر مشاہیر عالم کی طرح آپ بھی صرف تین سال کی عمر میں یتیم ہوگئے اور آپ کی پرورش آپ کے چچا میاں غلام رسول شاہ اور آپ کی والدہ ماجدہ نے کی۔ قرآن شریف حفظ کرنے کے بعد آپ نے عربی و فارسی کے علوم متداولہ میں عبور و کمال حاصل کیا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کو زمانے کے دستور کے مطابق اسکول بھی بھیجا گیا۔ آپ کے اساتذہ میں ملا غلام حیدر اور مولانا مرتضیٰ احمد قابل ذکر ہیں۔ حصول تعلیم کے بعد آپ نے منازل سلوک طے کرنے کے لیے کئی سال تک سخت ریاضت کی اور چلہ کش رہے، ان دنوں آپ سوائے نماز جمعہ کے باہر نہیں نکلتے تھے۔ آپ کا اصل مقام مجاہدہ نفس تھا۔ اس سے گزرنے کے بعد آپ نے کچھ دن محکمہ ریلوے اور اسلامیہ ہائی اسکول میں بھی ملازمت کی اور پھر اسے ترک کر دیا۔

آپ خانقاہ قادریہ کیتھل شریف کے سجادہ نشین تھے۔ تحریک پاکستان میں آپ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور مسلم لیگ کی بھرپور حمایت کی۔ آپ نے نومبر 1945ء میں مسلم لیگ کی حمایت میں ایک بیان جاری فرمایا تھا جو روزنامہ نوائے وقت لاہور میں شائع ہوا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ ہجرت فرما کر پہلے قبولہ شریف، ملتان اور پھر ڈیرہ غازی خاں میں قیام فرما ہوئے۔

ڈیرہ غازی خاں میں آپ کی فیض رسانیوں اور آپ کے جذبہ کامل کا شہرہ بہت جلد ہر طرف پھیل گیا۔ آپ نے ڈیرہ غازی خاں ہی میں 23 رجب 1383ھ/ 21 دسمبر 1962ء کو وصال فرمایا اور آپ کا مزار اقدس دربار عالیہ قادریہ کے نام سے یہیں مرجع خلائق ہے۔

آپ اپنے دور کے درویش کامل اور روحانی بزرگ تھے۔ آپ نے ہزاروں افراد تک دین کی روشنی پہنچائی۔ آپ تصوف کے پیکر تھے۔ آپ نے اپنے علم و فضل سے تصوف کو فروغ دیا۔ آپ کی زیارت سے لوگوں کے دل منور ہو جاتے تھے۔

حضرت مقبول محی الدین گیلانی دامۃ برکاتہم العالیہ (حیات)

برصغیر پاک و ہند میں سلسلہ عالیہ قادریہ کے نامور بزرگ، شیخ الآفاق حضرت شاہ کمال کیتھلی رحمۃ اللہ علیہ کے تیرھویں سجادہ نشین

سید مقبول محی الدین گیلانی، لقب میاں سرکار، آپ 23 محرم 1353ھ/ 13 مئی 1934ء کو کیتھل شریف ضلع کرنال (ہریانہ) میں پیدا ہوئے۔ آپ برصغیر پاک و ہند کے سلسلہ قادریہ کے ایک عظیم روحانی پیشوا اور نامور بزرگ شیخ الآفاق حضرت شاہ کمال کیتھلی کے خانوادہ کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کے والد مخدوم حضرت سید علی احمد شاہ قادری عصر حاضر کے مشائخ عظام میں انتہائی برگزیدہ بزرگ اور فقر و تصوف کے مرد میدان تھے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مشہور تھا کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ پیدائشی ولی تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت سیدنا غوث الاعظم سے جاملتا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد آپ پاکستان تشریف لائے اور ڈیرہ غازی خاں میں سکونت اختیار کی۔ وہیں آپ کا انتقال 23 رجب 382ھ ☆ 21 دسمبر

1952ء کو ہوا۔ آپ کا مزار اقدس دربار قادریہ کے نام سے مرجع خلائق ہے۔

حضرت سید مقبول محی الدین گیلانی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد گرامی قدر کی آغوش میں حاصل کی پھر آپ نے اسلامیہ کالج لاہور سے ایف اے تک تعلیم حاصل کی اور ادیب فاضل کے امتحانات بھی پاس کیے۔ سیارہ ڈائجسٹ کا اولیائے کرام نمبر آپ کے زیر ادارت نکلا۔ آپ اپنی ادبی، دینی اور ملی خدمات کی بنا پر اہل بینش و دانش کے حلقوں میں نہایت قدر و حترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ کشادہ دل اور علم دوست ہیں اور انسانیت کے لیے ایک دردمند دل رکھتے ہیں۔ ملت اسلامیہ کی سربلندی و بہبود کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ آپ کی تعلیمات کے مطابق معاشرے کی موجودہ خرابیاں خدا اور آخرت سے بے نیازی کی وجہ سے ہے۔ آپ ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور اُن کی سنتوں پر عمل پیرا ہونے کی تلقین فرماتے ہیں۔ آپ حضرت شیخ الآفاق حضرت کمال کیتھلی رحمۃ اللہ علیہ کے تیرھویں سجادہ نشین ہیں اور آپ کا سلسلہ نسب 26ویں پشت میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے جاملتا ہے۔

میاں سرکار کی محفل میں اہل قلم، دانشور، صحافی، اساتذہ اور شعرا موجود رہتے ہیں اس کی وجہ آپ کی علم دوستی ہے۔ آپ کے تین صاحبزادے، سید فریدوں کمال، سید جنید کمال اور سید احمد کمال ہیں جو اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔ بڑے صاحبزادے سلسلہ ملازمت بیرون ملک مقیم ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر جنید کمال ڈیرہ غازی خان میں پریکٹس فرماتے ہیں اور سید احمد کمال اسلام آباد میں رہائش پذیر ہیں۔ آپ بھی سخن فہم اور کثیر المطالعہ ہیں اور شعری ذوق رکھتے ہیں۔

فاتحین، سپہ سالاران اور امیران عسکر

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ
حضرت شرجیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ
حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ
موسیٰ بن نصیر
محمد بن قاسم
عبدالرحمٰن غافقی
افشین حیدر
جوہر صقلی
سلطان بیبرس
خیرالدین باربروسہ
احمد شاہ ابدالی
جنرل ایوب خان
حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ
حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ
حضرت عقبہ بن نافع
طارق بن زیاد
قتیبہ بن مسلم
مسلمہ بن عبدالملک
قاضی اسد بن فرات
بدر الجمالی
بیبرس المنصوری
نادر شاہ افشار
جنرل بخت خان
جنرل راحیل شریف

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ (م 21ھ/642ء)

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بن مغیرہ، سیف اللہ، مشہور صحابی رضی اللہ عنہ، فاتح اور سپہ سالار اسلام۔ رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی، ایک عظیم سپہ سالار اور تاریخ ساز فاتح، ان کی کنیت ابوسلمان اور ابو ولید اور لقب سیف اللہ تھا۔ سلسلہ نسب ساتوں پشت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور رسول اللہ صلی علیہ وسلم سے جا ملتا ہے۔ قریش کی عسکری قیادت ان کے قبیلے بنومخزوم کے ہاتھ میں رہی تھی۔ حضرت خالد کے والد کا شمار مکہ کے دولتمندوں اور شرفاء میں ہوتا تھا۔

جب اسلام کا ظہور ہوا تو خالد قبیلہ قریش کے ان لوگوں میں شامل تھے جنہیں اسلام سے عداوت تھی۔ صلح حدیبیہ تک کفار مکہ نے اسلام کے خلاف جتنی جنگیں لڑیں ان میں وہ شریک تھے۔ جنگ احد میں اسلام کے خلاف ان کا سپاہیانہ کردار تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ صلح حدیبیہ کے بعد حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ مورخین کے مطابق آپ رضی اللہ

عنہ ماہ صفر 8ھ میں غزوہ موتہ سے دو ماہ اور فتح مکہ سے چھ ماہ پہلے اسلام لائے۔ قبول اسلام کے بعد حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے عہد نبوت صلی اللہ علیہ وسلم، عہد صدیقی اور عہد فاروقی میں مختلف معرکوں میں لشکر اسلام کی قیادت کی اور انتہائی شاندار جنگی کارنامے انجام دیئے۔ غزوہ موتہ میں یکے بعد دیگرے تین اسلامی سالاروں کی شہادت کے بعد لشکر اسلام کی قیادت سنبھالی اور اس موقع پر پہلی بار حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی جنگی مہارت وصلاحیت اسلام کے کام آئی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے نرغے میں آئے ہوئے مجاہدوں کو بڑی مہارت کے ساتھ نکال لیا اور رومیوں پر اہل اسلام کا رعب بھی قائم رہا۔ صدیقی عہد میں مسیلمہ کذاب کا خاتمہ آپ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں ہوا۔ ایرانی لشکر کو شکست دے کر ایران کا کچھ حصہ بھی آپ نے فتح کیا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورے پر آپ کو شام کے محاذ پر بھیجا گیا جہاں جنگ یرموک میں آپ کی عسکری قابلیت کی بنا پر مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ فلسطین اور شام کے بعض علاقے آپ رضی اللہ عنہ کی کوششوں سے فتح ہوئے۔ بعد ازاں چند مصلحتوں کی بنیاد پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو سپہ سالاری سے معزول کر دیا اور کچھ عرصہ بعد آپ رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ (م 54ھ/673ء)

- متبنیٰ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے صحابی وسالار

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پا پیادہ جیش اسامہ کو مقام جرف تک چھوڑنے کے لیے ساتھ ساتھ تھے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے ان کے احترام میں گھوڑے سے نیچے اترنا چاہا مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے منع کر دیا پھر انہوں نے آپ کو گھوڑے پر سوار ہونے کا کہا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر تھوڑی دیر تک راہ خدا میں اپنا پاؤں میں بھی غبار آلود کر لوں تو کیا مضائقہ ہے۔ پھر جب حضرت اسامہ اپنا عسکری ہدف پورا کر کے واپس آئے تو جانشین رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر صحابہ کرام کے ساتھ مدینہ سے نکل کر ان کا استقبال کیا اور نہایت خوشی کا اظہار کیا۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب صحابی تھے۔ وہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ، متبنیٰ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اور حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہ کے بیٹے تھے۔ ان کے والد بھی محبوب رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے اس لیے انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت کا شرف اپنے والدین سے ورثے میں ملا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے عہد اسلام ہی میں آنکھ کھولی اور کفر وشرک کی آلودگی میں کبھی بھی ملوث نہیں ہوئے۔

غزوہ احد پیش آیا تو آپ رضی اللہ عنہ دس سال کے تھے اور جہاد میں شرکت کے آرزومند تھے اس لیے اجازت نہ ملی۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ بیت اللہ میں داخل ہوئے۔ 11ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو اس جیش کا سردار مقرر فرمایا جو موتہ کی جنگ میں ان کے والد حضرت زید رضی اللہ عنہ اور حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد رومی علاقے پر یلغار کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ جس سے مقصود یہ تھا کہ اسلامی سرحد رومی فتنہ وفساد سے محفوظ ہو جائے۔ چونکہ اس لشکر میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے صحابہ کبار بھی شامل تھے اس لیے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ رضی اللہ عنہ کی نوعمری پر اعتراض کیا۔ جب اس کی خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود علالت کے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے حق میں خطبہ دیا اور اپنے دست مبارک سے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو علم عطا فرمایا۔ ابھی اپنے جیش کے ساتھ آپ رضی اللہ عنہ مقام جرف

تک نہ پہنچے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی جس کی وجہ سے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ لوٹ آئے مگر جب واپس پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت کچھ بہتر تھی لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر آپ رضی اللہ عنہ پھر اپنی مہم پر روانہ ہوئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ اور متعدد صحابہ کبار شریک لشکر تھے۔ ابھی روانہ ہو ہی رہے تھے کہ حضرت ام ایمن نے اطلاع بھجوائی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کا وقت قریب ہے لہٰذا آپ بمعہ لشکر واپس آ گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں شریک ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسد اطہر بھی قبر میں اتارنے کی سعادت اُنہیں حاصل ہوئی۔ پھر جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو انہوں نے فتنہ ارتداد کے باوجود ان کے جیش کو روانہ فرمایا۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے 54 میں بعہد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ وفات پائی اور مدینہ منورہ ہی میں دفن ہوئے۔

حضرت شرجیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ (م 18ھ/ 639ء)

ایک مشہور صحابی، نامور سپہ سالار، امیر عسکر اور فاتح اردن

حضرت شرجیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کی والدہ کا نام حسنہ تھا۔ ان کے والد عبداللہ بن عمرو بن المطاع الکندی تھے۔ حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ بنو زہرہ کے حلیف تھے۔ وہ مشہور صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم، بہادر عرب مجاہد اور نامور مسلم سپہ سالار تھے۔ اپنی والدہ سمیت مکہ میں اسلام لائے اور دونوں ہجرت کر کے حبشہ میں آباد ہو گئے۔ اُن دنوں ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا بھی حبشہ میں مقیم تھیں کہ وہاں کے بادشاہ نجاشی نے ان کا نکاح حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا اور حق مہر کے چار ہزار درہم بھی اپنے پاس سے ادا کیے تھے۔ روایت ہے کہ نجاشی نے ام المومنین کو حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ اور ان کی والدہ کی رفاقت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ بھیج دیا تھا۔

حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ مدینہ آنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شانہ بشانہ غزوات میں شریک ہوتے رہے۔ کاتبانِ وحی میں بھی ان کا شمار ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سفیر بنا کر مصر بھیجا۔ آپ رضی اللہ عنہ ابھی مصر میں ہی تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا سے رحلت فرمائی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں مرتدین اور مسیلمہ بن کذاب کے فتنے سے نمٹنے کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فتح شام کے لیے جو چار سپہ سالار مقرر فرمائے تھے ان میں حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کو بھی شامل رکھا تھا۔ انہوں نے اردن کا علاقہ بزور شمشیر فتح کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں والئی اردن مقرر کیے گئے۔ انہوں نے اپنی زندگی بھر اسلام کی بڑی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ بالآخر 18ھ/ 639ء میں شام و اردن کے علاقے طاعون عمواس پھیلنے کی وجہ سے وفات پائی۔ اسی وباء میں امین الامۃ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ اور سید العلما حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے بھی وفات پائی تھی۔ حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ کی عمر بوقت انتقال 67 یا 69 برس تھی۔ سنن ابن ماجہ میں ابن ماجہ نے حضرت شرجیل بن حسنہ سے دو احادیث نقل کی ہیں۔ اس طرح آپ رضی اللہ عنہ راویان حدیث میں بھی شمار کیے جاتے ہیں۔

حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ (م 18ھ/ 639ء)

حضرت عامر بن عبداللہ بن الجراح، امین الامۃ، عشرہ مبشرہ میں شامل امیر عسکر اسلام

ان کے والد عبداللہ بحالت کفر غزوہ بدر میں خود انہیں کے ہاتھوں مقتول ہوئے تھے۔ (بحوالہ التہذیب)

والدہ کا نام امیمہ بنت غنم تھا وہ مسلمان ہو گئی تھیں اور ان کا شمار صحابیات میں ہوتا ہے۔

حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہم عمر تھے۔ اسلام کے دور ابتلاء میں انہوں نے مکہ معظمہ میں سب سے زیادہ اذیتیں برداشت کی تھیں۔ پھر بوقت ہجرت مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی اور حضرت کلثوم بن ھدم کے ہاں قیام کیا۔ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کی شرکت و بدر و حدیبیہ میں کسی کو اختلاف نہیں۔ فدویت اسلام کا یہی جذبہ انہیں میدان احد میں لے گیا تھا۔ غزوہ احد میں جب مسلمانوں کے پاؤں اکھڑے تو ان کے پایہ استقلال مطلق جنبش نہ ہوئی۔ حدیبیہ کے صلح نامہ میں ان کے دستخط بطور گواہ موجود تھے۔ انہوں نے غزوہ ذات السلاسل (7ھ) سیف البحر (8ھ) میں بھی حصہ لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعدازاں انہیں صدقات کی وصولی اور تبلیغ کے لیے یمن بھیجا تھا اور امین الامۃ کا لقب عطا فرمایا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کی بہادری اور شجاعت مزید کھل کر عہد فاروقی میں اس وقت آئی جب فتح دمشق میں آپ اپنی فوج لے کر شہر کے ایک دروازے کے باہر کھڑے تھے اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کمند کے ذریعے فصیل شہر پر چڑھ کر دروازہ کھول دیا اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ شہر میں داخل ہو گئے۔ مسند خلافت پر بیٹھتے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے ان کی جگہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو شام کا سپہ سالار اعلیٰ مقرر کیا تھا۔ حضرت ابوعبیدہ نے اس منصب کے فرائض بڑی خوبی سے انجام دیئے۔ بحیثیت سپہ سالار انہوں نے شام کے محاذ پر سب سے پہلے اس رومی لشکر کو شکست دی جو فحل میں جمع ہو رہا تھا پھر آگے بڑھ کر آپ مرج الروم پر قبضہ کر لیا اور اس کے بعد حمص کا رخ کیا اور باوجود شدید سردی کے اس شہر کا محاصرہ کر لیا۔ جنگ یرموک میں بھی آپ رضی اللہ عنہ کی کارکردگی انتہائی عمدہ تھی۔ امیر لشکر ہونے کی حیثیت سے جہاں آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی عسکری ذمہ داریوں کو پورا کیا وہیں اشاعت اسلام کا بھی خصوصی خیال رکھا۔ 18ھ میں طاعون عمواس کی وبا شام کے علاقوں میں پھیلی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو واپس بلا بھیجا مگر انہوں نے جواب دیا کہ کیا آپ تقدیر الٰہی سے بھاگ رہے ہیں؟ حضرت عمر نے سمجھایا مگر وہ اپنی رائے پر قائم رہے اور اسی وباء میں انتقال فرمایا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے مقام دفن کے متعلق معلوم نہیں ہے۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ (42ھ/ 663ء)

نامور صحابی، سپہ سالار، فاتح مصر اور زیرک عرب سیاستدان

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، السہمی، قریشی النسب اور صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ تاریخ اسلام کے افق پر وہ 8ھ/ 629ء میں مشرف بااسلام ہونے کے بعد ابھرتے ہیں۔ مورخین نے لکھا ہے کہ اس وقت وہ ضرور ادھیڑ عمر کے تھے کیونکہ ان کی وفات کے وقت 42ھ/ 663ء میں ان کی عمر 90 سال سے تجاوز کر گئی تھی۔ وہ اپنے زمانے کے مدبر سیاستدانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ دیگر اہل مکہ سے زیادہ صاحب نظر تھے کہ انہوں نے غزوہ احزاب میں مدینہ منورہ کا محاصرہ ناکام ہونے کے بعد سے ہی اسلام کی حقانیت کے بارے میں غور کرنا شروع کر دیا تھا اور اسلام کی صداقت پر انہیں یقین ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ جیسے لوگوں کے ساتھ فتح مکہ سے پہلے ہی اسلام لے آئے اور بحیثیت سپہ سالار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیر ہدایت اپنی خدمات کا آغاز کر دیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں عمان کی مہم پر بھیجا تھا۔ مگر اس مہم پر جانے کے بعد انہیں دوبارہ زیارت رسول صلی اللہ علیہ وسلم نصیب نہ ہوئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنے عہد میں 12ھ/ 633ء میں شام و فلسطین کے محاذ پر بھیجا۔ اس محاذ پر انہوں نے جنگ اجنادین اور جنگ یرموک اور فتح دمشق جیسے بڑے عسکری کارناموں میں شرکت کی۔ پھر بھی

ان کی اصل شہرت فتح مصر کی وجہ سے ہے جو انہوں نے حضرت عمر کے عہد خلافت میں اپنی ذمہ داری پر کی تھی۔
خلیفہ سوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے آغاز میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو معزول کر دیا مگر اس کے باوجود بھی حضرت عمرو بن العاص خلیفہ سوم کے دشمنوں سے الگ رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں انہوں نے کھلم کھلا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا۔ معرکہ صفین میں شامی لشکر ان کی حکمت عملی کی وجہ سے شکست فاش سے بچ گیا تھا اور انہیں کی حکمت عملی کی وجہ سے تحکیم کے دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خود ان کے حکم حضرت ابو موسیٰ اشعری نے معزول کر دیا جس کے بعد حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلافت کا صحیح حقدار ثابت کیا۔ اسی سیاست کی بنا پر انہیں خارجیوں نے قتل کرنا چاہا مگر وہ بچ گئے اور انہوں نے 42ھ/663ء میں وفات پائی۔

عقبہ بن نافع (م 63ھ/683ء)

دشت تو دشت دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

عقبہ بن نافع بن عبد قیس القرشی الفہری، پہلی صدی ہجری کے نامور سپہ سالار، جنہوں نے شمالی افریقہ میں ابتدائی عرب فتوحات کو مستحکم اور محکم بنا کر بربری مخالفت کو ختم کرنے کی سعی کی، لیکن ایک پر آشوب زندگی کے بعد بالآخر افریقی بغاوت پسندوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا۔ عقبہ کے سوانح حیات کے متعلق بہت کم یا بہت زیادہ معلومات ملتی ہے۔ عقبہ کی ولادت عہد نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری سالوں میں ہوئی۔ وہ اپنی والدہ کی طرف سے نامور مسلم سپہ سالار حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بھانجے تھے۔ جنہوں نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے عقبہ کو عساکر افریقیہ کا سردار اعلیٰ مقرر کیا تھا۔

عقبہ اس وقت سوڈان کی طرف متوجہ تھے اور غدامس میں اسلام کی تبلیغ کے لیے مصروف پیکار تھے۔ اس کے بعد ان کو ایک مہم 50ھ/670ء میں پیش آئی اور اسی دوران میں عقبہ نے صوبہ بیزاسین BYZACENE کے وسط میں القیروان کے مستحکم قلعہ کی بنیاد رکھی۔ اس مہم میں عقبہ کی فوج میں دس ہزار سوار تھے جن میں نومسلم بربر بھی شامل تھے۔ اس فوج کے ساتھ وہ نہ صرف بوزنطینیوں بلکہ بربر باغیوں پر حملہ کرنے کے قابل ہو گئے۔ قیروان کی تاسیس کے بعد عرب فوج کو ایک مضبوط مستقر ہاتھ آ گیا جس سے افریقہ میں اشاعت اسلام کا راستہ صاف ہو گیا تھا۔ افریقیہ کا صوبہ مصر کے تابع تھا اور نئے حاکم مسلمہ ابن مخلد انصاری نے 675ء میں عقبہ کو اس کے عہدے سے معزول کر دیا۔ تاہم 62ھ/682ء میں عقبہ کو بحال کر دیا گیا۔ بحالی کے بعد عقبہ نے اپنی پہلی عسکری مہم سے زیادہ بہتر عسکری مہم کا اہتمام کیا اور کوہ اطلس اور سوس کے کافر بربروں کی طرف متوجہ ہوئے ان کی فتوحات اگرچہ شاندار تھیں مگر نتیجہ خیز نہ ثابت ہو سکیں کیونکہ عقبہ ان فتوحات کے بعد قبضہ بحال نہ رکھ سکے اپنی خوش بختی کے زعم میں طنجہ کے مقام پر اپنی فوج کو متعدد دستوں میں تقسیم کر دیا۔ اب ان کے ساتھ ایک مختصر سی فوج تھی جس کے ساتھ وہ جب صحرا کے کنارے مقام تہودہ پہنچے تو انہیں کسیلہ کے باغی گروہوں نے آ گھیرا اور 63ھ/683ء میں وہ اپنے تین سو ساتھیوں کے ساتھ بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ ان کی قبور ایک گاؤں سیدی عقبہ میں مرجع خلائق ہے۔

موسیٰ بن نصیر (م 97ھ/ 715ء)

فاتح اندلس، والئی افریقیہ والمغرب، ایک عظیم مسلم سپہ سالار

موسیٰ بن نصیر بن عبدالرحمٰن بن زید، ابوالرحمٰن، گورنر افریقیہ والمغرب۔ اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے تین نامور سپہ سالاروں میں ایک۔ 19ھ/ 640ء میں پیدا ہوا۔ اکثر مورخین اسے لخمی کہتے ہیں۔ اس کا باپ نصیر بن عبدالرحمٰن حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی فوج میں افسر اور ان کے مقربین میں سے تھا، موسیٰ بن نصیر شروع ہی سے باعزم نوجوان تھا۔ اس نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے قبرص پر حملہ کیا تھا اور وہاں ماغوصہ اور بانس نامی قلعے تعمیر کرائے تھے اور قبرص میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے نائب کے طور پر کام کیا تھا۔ عبدالملک بن مروان نے جب عراق پر قبضہ کیا تو موسیٰ بن نصیر کو اپنے بھائی اور گورنر عراق بشر بن مروان کا وزیر اور مشیر مقرر کیا۔

ولید بن عبدالملک جب خلیفہ بنا تو اس نے موسیٰ بن نصیر کو افریقیہ اور المغرب و مراکش کا مستقل گورنر بنا دیا۔ موسیٰ بن نصیر نے پورے افریقیہ اور المغرب و المراکش کو زیر نگیں کر کے وہاں مسلمانوں کے اقتدار کو مستحکم بنایا۔ 91ھ میں اندلس کا قوطی بادشاہ فوت ہوا تو اس کے ایک فوجی افسر راڈرک نے حکومت پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ سبتہ کا کاؤنٹ جولین راڈرک سے ناراض تھا اس نے موسیٰ سے ملاقات کی اور اسے اندلس پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ موسیٰ نے طارق بن زیاد کو اندلس بھیجا پھر جب طارق کی لرزہ خیز فتوحات کا حال موسیٰ نے سنا تو اس نے بھی اسپین پر فوج کشی کی اور اس ملک کے کچھ حصے کو فتح کر لیا۔ 714ء میں خلیفہ ولید نے موسیٰ کو دمشق حاضر ہونے کا حکم دیا۔ چنانچہ فروری 715ء میں موسیٰ نے جامع اموی دمشق میں ولید کی خدمت میں اندلس کا مال غنیمت پیش کیا۔ خلیفہ ولید نے جانشین سلیمان نے موسیٰ کو اپنی نافرمانی کے الزام میں گرفتار کر لیا اور اس کے بیٹے عبدالعزیز کو مروا دیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد موسیٰ کو قید سے رہائی ملی اور وہ حجاز کے ایک گاؤں وادی القریٰ میں تنگ دستی کی حالت میں فوت ہوا یوں اتنے بڑے سپہ سالار کا انجام کچھ اچھا نہ ہوا۔

طارق بن زیاد (م 102ھ/720ء)

مشہور اسلامی سپہ سالار، فاتح ہسپانیہ اور اپنی کشتیاں جلا دینے والا امیر عسکر

فاتح اندلس اور اس کا پہلا اموی گورنر۔ شوال 92ھ/ 711ء تا جمادی الآخر 93ھ/ 712ء۔ دنیا کے بہترین سپہ سالاروں میں سے ایک ہے جس نے مختصر سی فوج کے ساتھ یورپ کی عظیم سلطنت اسپین کو فتح کیا اور اس ملک میں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ وہ والئی افریقہ موسیٰ بن نصیر کا ایک آزاد کردہ غلام اور نائب تھا۔ طارق بن زیاد کی عسکری تربیت بھی موسیٰ بن نصیر جیسے ماہر حرب اور عظیم سپہ سالار کی زیر نگرانی ہوئی تھی۔ طارق کا والد زیاد مصری فوج میں ایک سپاہی تھا۔ کاؤنٹ جولین کی دعوت پر جب موسیٰ بن نصیر نے اسپین پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا تو اس نے طارق بن زیاد کو اس عسکری مہم کا سربراہ مقرر کیا اور اس کی سرکردگی میں تقریباً سات ہزار سپاہ کو بھیجا۔ طارق اپنے اس لشکر کے ساتھ دوشنبہ 5 رجب 92ھ/ 711ء کو ہسپانیہ کے ساحل پر اترا اور اس نے ایک پہاڑ کے قریب اپنا فوجی مستقر قائم کیا بعدازاں یہ پہاڑ اسی کے نام پر جبل الطارق کہلایا۔ افریقیہ سے مزید کمک آجانے کے بعد طارق نے 12 ہزار فوج کے ساتھ راڈرک شاہ اسپین کی ایک لاکھ فوج کو شکست فاش دی۔ اس موقع پر طارق نے اپنی فوج کو جو ولولہ انگیز خطبہ دیا تھا اسے تاریخ اسلام میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ راڈرک کے میدان جنگ سے بھاگ جانے کے بعد فاتح طارق کے لیے میدان صاف ہو گیا اور اس نے اندلس کے جنوب مغربی علاقے

کو فتح کر کے اسپین کے مشہور شہروں پر قبضہ کرلیا۔ باقی دو اموی سپہ سالاروں کی طرح طارق بن زیاد کا انجام بھی اچھا نہ ہوا۔ طارق اور موسیٰ کی فتوحات کا سلسلہ ابھی اسپین میں جاری تھا کہ دربار خلافت سے بلاوا آ پہنچا۔ انہیں حکم دیا گیا کہ جلد سے جلد دمشق پہنچیں مگر چند فتوحات کے سلسلے ان سے خلیفہ کے حکم کی تعمیل میں تاخیر ہوگئی۔ دمشق پہنچنے کے ساتھ ہی موسیٰ اور طارق جیسے عظیم سپہ سالاروں کی عسکری زندگی کا خاتمہ ہوگیا اور انجام کار وہ گمنامی کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اگر طارق اور موسیٰ دربار دمشق کی مداخلت سے آزاد رہتے تو شاید آج براعظم یورپ کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا۔

محمد بن قاسم الثقفی (م 96ھ/715ء)

مشہور عرب سپہ سالار اور فاتح سندھ، حجاج بن یوسف کا بھتیجا

عرب کے مشہور قبیلہ بنوثقیف کے سربرآوردہ خاندان آل ابی عقیل سے تعلق رکھنے والا ایک نامور فاتح، محمد بن قاسم الثقفی، طائف میں 75ھ میں پیدا ہوئے۔ اس کے والد قاسم مشہور گورنر عراق حجاج بن یوسف کے سگے بھائی تھے۔ حجاج بن یوسف نے ہی اپنے بھتیجے کو سندھ کی مہم پر بھیجا تھا۔

محمد بن قاسم بچپن ہی سے ہونہار تھا اور ایک ذوق لطیف کا مالک تھا چونکہ اسے موسم بہار کے ایک خوشبودار پودے البہار سے خصوصی شغف تھا اسی لیے اس کی کنیت ابوالبہار ہوگئی، الحجاج کو محمد بن قاسم سے خاص انسیت تھی اسی وجہ سے وہ اسے اپنے قریب رکھتا تھا۔ 92ھ کے نصف آخر میں محمد بن قاسم کو حجاج نے فتح سندھ کے لیے نامزد کیا اور وہ شیراز سے فتح سندھ کے لیے روانہ ہوا اور مکران فتح کرتے ہوئے دیبل کی بندرگاہ کو فتح کیا۔ اس کے بعد دریائے سندھ کے دائیں کنارے میرون، کوٹ سیہون اور بدھیہ کے علاقہ کو فتح کر کے اس نے اپنی فنی مہارت اور حکمت عملی سے کشتیوں کا پل بنا کر دریا کو عبور کیا اور 10 رمضان 93ھ/ جون 712ء میں راوڑ کے قلعے کے قریب راجہ داہر کے لشکر کو شکست دی اور یہاں سے آگے بڑھتا ہوا ملتان تک پہنچ گیا اور اوچ اور ملتان کے علاقے فتح کیے۔ ملتان سے محمد بن قاسم نے راجپوتانے اور کاٹھیاواڑ میں سرست پر فوجیں بھیجیں اور گجرات کے شہر گیرج پر لشکرکشی کی۔ محمد بن قاسم نے یہاں سے شمالی ہندوستان کی طرف توجہ کی اور قنوج پر حملے کے لیے مشہور شہر اودھاپور پہنچا تھا کہ دمشق سے اس کی معزولی کا حکم نامہ آ پہنچا۔ سندھ کے نئے حاکم یزید بن ابی کبشہ نے محمد کو گرفتار کر کے عراق بھیج دیا تاہم خلیفہ کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی صالح عبدالرحمٰن ایک خارجی نے اسے واسط کے قید خانے میں اذیت و عذاب دے کر قتل کر دیا۔ یہ اس نے اپنے بھائی کے انتقام میں کیا جسے حجاج نے قتل کروایا تھا۔ محمد بن قاسم کی گرفتاری اور معزولی کا سبب یہ تھا کہ حجاج نے خلیفہ سلیمان کی ولی عہدی سے معزولی کی سازش میں خلیفہ ولید کا ساتھ دیا تھا جس کی وجہ سے سلیمان حجاج اور اس کے خاندان کا دشمن ہوگیا تھا۔

قتیبہ بن مسلم (م 96ھ/715ء)

ابوحفص الباہلی، اموی دور کا مشہور عرب سپہ سالار اور فاتح ترکستان

ایک عرب سپہ سالار، اس کی پیدائش کا سنہ مورخین نے 49ھ/669ء دیا ہے۔ اس کا پورا نام قتیبہ بن مسلم ابوحفص الباہلی تھا۔ عبدالرحمٰن بن محمد بن الاشعث کے خلاف لڑائی میں الحجاج ثقفی نے اس کی صلاحیت کا اندازہ کرتے ہوئے اسے خراسان کا والی بنانے کی سفارش خلیفہ عبدالملک کو کی۔ جب قتیبہ مرو پہنچا تو اسے اپنی سپاہ گری کی صلاحیت کو اجاگر کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ اس نے آس پاس کے ترک علاقوں پر حملے کر کے قلمرو خلافت کو اتنا وسیع کیا کہ اس کا شمار بنوامیہ کے عہد

کے عظیم فاتحین میں ہونے لگا۔ 705ء میں اس نے طخارستان پر حملہ کیا جہاں کے حاکم اخرون وشومان کو خراج ادا کر کے صلح کرنا پڑی پھر سغانیان پر حملہ کر کے وہاں وہاں کے بادشاہ کو اطاعت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ اگلے سال اس نے وسطی ایشیا کے مشہور شہر بخارا پر چڑھائی کی اور وہاں کے حکمران نیزک سے معاہدہ صلح کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد قتیبہ نے دریائے جیحوں کو عبور کر کے بیکند کا رخ کیا۔ یہاں کے لوگوں نے اس کی پیش قدمی کی خبر پا کر آس پاس کی ریاستوں سے اتحاد کر کے اس کا راستہ روک لیا اور قتیبہ پورے طور پر ان کے نرغے میں پھنسا رہا لیکن انجام کار اسے کامیابی نصیب ہوئی اور اس نے بیکند کو فتح کر لیا۔ 707ء میں اس نے ایک بار پھر بخارا پر حملہ کیا اور اسی حملے سے دو اور شہر، نوشکث اور رامینہ فتح کر لیے۔ بخارا آخر 710ء میں فتح ہو گیا اور اس نے اپنے ایک وفادار کو وہاں تخت نشین کر دیا۔ اس کے بعد قتیبہ نے سجستان پر چڑھائی کی وہاں کے حاکم نے صلح کر لی۔ اس سے اگلے سال اس نے شاہ خوارزم کو اس کے باغی بھائی کے مقابلے میں مدد دی اور اس کے بعد سمرقند پر چڑھائی کر دی اور قبضہ کر لیا۔ 713ء میں اس نے الشاش کے خلاف فوج کشی کی اور فرغانہ، خجند اور کاشان تک پہنچ گیا۔ اسی دوران حجاج کی وفات کی خبر ملی تو واپس مرلوٹ ایا۔ ادھر خلیفہ ولید کے انتقال کے بعد سلیمان خلیفہ بنا تو اس نے سلیمان کی بیعت سے انکار کر دیا جس کے نتیجے میں اس کی فوج باغی ہو گئی اور 715ء میں اسے اس کے باغی سپاہیوں نے قتل کر دیا۔

عبدالرحمٰن غافقی (م 114ھ/732ء)

مشہور ہسپانوی سپہ سالار اور والئی اندلس جو فرانس کی سرحدیں عبور کر گیا تھا

اسے والئی ہسپانیہ کے منصب پر 111ھ/730ء کے آغاز میں محمد بن عبداللہ اشجعی کی جگہ مقرر کیا گیا تھا۔ وہ اپنی وفات 732ء تک اس پر فائز رہے۔ وہ پہلے عارضی طور پر دو ماہ کے لیے 721ء میں بھی والئی ہسپانیہ رہ چکے تھے۔ وہ تابعین میں سے تھے اور نیکی و تقویٰ میں شہرت رکھتے تھے۔ انہیں سب سے زیادہ شہرت یورپ کے ملک فرانس پر لشکر کشی کی وجہ سے حاصل ہوئی اور اسی مہم میں اس نے اپنی جان بھی نذر کر دی تھی۔

فرانس پر اس حملے کے دوران اس کی منزل مقصود طلوشہ TOURS، فرانس میں کلیسائے سینٹ مارٹن تھا۔ عبدالرحمٰن نے خاصی فوج جمع کی، اور پمپلونہ PAMPEONA سے نکل کر درہ RONCÈSVALLES سے ہوتے ہوئے بوردو BORDEAUX پر حملہ کیا اور اسے مکمل طور پر تباہ کر ڈالا۔

فرانس کے علاقے ایکواٹیبیا AQUETANIA کا ڈیوک یوڈیز EUDES اس کے حملہ کو روک نہ سکا۔ اس کے بعد اس نے لائیر LOIR کا رخ کیا، لیکن فرینکس FRANKS کے ڈیوک چارلس مارٹل نے مزاحمت کی۔ شہر POITIERS سے تقریباً 20 کلومیٹر شمال مشرق جنگ ہوئی جس میں عبدالرحمٰن غافقی کو اس کے لشکر میں عصبیت پھوٹ جانے کی وجہ سے شکست ہوئی۔ فرینکس کی تاریخ میں یہ لڑائی جنگ پوائٹرز کہلاتی ہے۔ اور عرب مورخین نے اسے بلاط الشہداء کا نام دیا ہے۔ اس جنگ کے بعد بچے کھچے مسلمان پراگندہ ہو کر ناربون کی طرف پسپا ہو گئے۔ جنگ پوائٹرز میں بڑی تعداد میں مسلمان میدان جنگ میں کام آئے جن میں خود عبدالرحمٰن غافقی بھی شامل تھا۔ اس اہم معرکہ کی تاریخ اکتوبر 732ء متعین کی گئی ہے۔

مسلمہ بن عبدالملک (م116ھ/733ء)

قسطنطنیہ کا محاصرہ کرنے والا مجاہد

دوسرے مروانی خلیفہ عبدالملک کا بیٹا، ممتاز سپہ سالار اور قسطنطنیہ کا محاصرہ کرنے والا مجاہد مسلمہ کے جوانمردانہ کارناموں کی وجہ سے عوام الناس کے تصورات پر اس کا ایک ایسا جیتا جاگتا نقش مرتسم ہو گیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی مقبول عام افسانے کا کردار ہے۔ اس کے والد خلیفہ عبدالملک نے بڑی احتیاط سے اس کی تعلیم و تربیت کی تھی۔ ایک طویل عرصہ فوجی ملازمت میں گزارنے کی وجہ سے اسے اپنی ذاتی شجاعت اور فن حرب کی مہارت دکھانے کے مواقع ملے۔ اس کے ماتحت اس سے کمال عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ خود مسلمہ اپنی غیر معمولی وجاہت سے کام لے کر بھی مظلوموں کی حمایت کرتا اور اپنے خاندان کے اتحاد و یک جہتی کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔

اس کی ماں ایک کنیز تھی اور اس پیدائشی اتفاقیہ نقص کی وجہ سے وہ زیادہ بلند رتبہ نہ حاصل کر سکا۔ ولید اول نے اپنے بھائی مسلمہ کے سپرد یہ کام کیا تھا کہ وہ یونانیوں کے خلاف معرکہ آرائی کی قیادت کرے، چنانچہ اس وقت سے، سوا چند وقفوں کے وہ عرب افواج کا سپہ سالار اعلیٰ رہا۔ 710ء میں وہ آرمینیا کا والی مقرر ہوا۔ یہ ایسا صوبہ تھا جو ابھی مکمل طور پر مطیع نہ ہوا تھا اور اس پر حکومت کرنے کے لیے کسی فوجی آدمی کی ضرورت تھی۔ مسلمہ نے اس صوبے میں کئی عسکری مہمات سر کیں اور 93ھ/ 712ء میں وہ آرمینیا کے راستے سے گالیشیا میں داخل ہو گیا اور اس طرح قسطنطنیہ پہنچنے کا راستہ کھل گیا۔ چنانچہ 98ھ/ 717ء میں اس نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا جس نے بڑا طول پکڑا اور اس کے دوران خود عرب افواج کو بڑے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

عمر بن عبدالعزیز نے برسر اقتدار آتے ہی مسلمانوں کو مزید جانی نقصان سے بچانے کے لیے یہ محاصرہ ترک کر دینے کا حکم دیا اور مسلمہ کو عراق میں خارجیوں کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے بھیج دیا۔ یزید ثانی نے مسلمہ کو کئی مرتبہ اپنے عہد میں یزید بن مہلب کی بغاوت فرو کرنے کے لیے بھیجا۔ اس باغی کی وفات کے بعد مسلمہ کو عراق کا والی بنایا۔ 108ھ میں وہ فوج میں واپس چلا گیا اور اس نے قیصریہ کو فتح کیا۔ اس نے سیاست میں ولید بن یزید کی حمایت کی اور اس خلیفہ کی وفات سے پہلے وفات پائی۔

افشین حیدر (م226ھ/841ء)

عباسی سپہ سالار اور وسط ایشیا سے تعلق رکھنے والا ترک بہادر

افشین اشروسنہ کے مقامی امراء و رؤسا کا لقب تھا جو اسلام سے پیشتر سے انہوں نے اختیار کر رکھا تھا۔ اشروسنہ ایک پہاڑی علاقہ ہے جو سمرقند اور خجند کے درمیان واقع ہے۔ اس علاقے کو عباسی عہد میں الفضل بن یحییٰ برمکی نے ایک عسکری مہم میں تحویل میں لیا تھا۔ پھر داخلی کشمکش کے بعد احمد بن ابی خالد کی سرکردگی میں اس علاقے میں ایک اور مہم بھیجی گئی اور اس علاقے کے حکمران افشین کاؤس نے اسلام قبول کر لیا۔ یہی کاؤس کا خیذار اسلامی تاریخ میں الافشین کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی جانب سب سے پہلے خلیفہ المامون کے عہد میں توجہ منعطف ہوئی۔ المامون کا بھائی المعتصم ان دنوں برائے نام مصر کا گورنر تھا۔ الافشین کو صوبے کی حکومت کا نظم و نسق تفویض ہوا اور اس نے بحیثیت ایک عباسی سپہ سالار کے ایک عرب بغاوت کو فرو کیا۔ جب المعتصم خلیفہ بنا تو الافشین نے خرمی باغیوں کے خلاف ایک پامردانہ جنگ لڑی جو اس کا ایک قابل قدر عسکری کارنامہ ہے۔ یہ جنگ مسلسل 835ء سے 738ء تک جاری رہی تھی۔ اس شاندار کامیابی کے صلے میں خلیفہ نے اسے ایک تاج اور دو مرصع تلواریں اور آذربائیجان اور آرمینیا کے علاوہ سندھ کی حکومت بھی عنایت کی تھی۔ اس کے بعد عموریہ

AMORIUM کی مشہور عسکری مہم میں جس کی قیادت خود المعتصم نے کی تھی الافشین نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ تاہم آگے چل کر افشین اور عبداللہ بن طاہر میں رقابت بروئے کار آئی۔ ماوراالنہر کا اہم ترین سردار ہونے کی وجہ سے الافشین اپنے آبائی علاقے پر دولت طاہریہ کا اقتدار ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے در پردہ المازیا (محمد بن قارن) "اصبہاذ" طبرستان کو بغاوت پر اکسایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود اسے بھی مازیار کی شکست کا خمیازہ بھگتنا پڑا اور محمد بن قاسم، طارق بن زیاد اور قتیبہ بن مسلم کی طرح وہ بھی حکمرانوں کے عتاب کا نشانہ بن گیا۔ اس پر دین سے برگشتہ ہو جانے کا الزام عائد کیا گیا اور ایک مشہور مقدمے کے بعد سامرا کے قید خانے میں اسے فاقہ زدگی سے ہلاک کر دیا گیا (شعبان 226ھ/مئی 841ء)

قاضی اسد بن فرات (213ھ/828ء)

ابو عبداللہ، ایک عرب عالم دین اور فقیہ جس سے صقلیہ کو فتح کیا

اسد بن الفرات بن سنان، دوسری اور تیسری صدی ہجری/آٹھویں اور نویں صدی عیسوی کے ایک عالم دین اور سپہ سالار، 142ھ/759ء میں پیدا ہوئے۔ دو سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ افریقیہ چلے گئے۔ اپنی ابتدائی تعلیم بھی انہوں نے وہیں پائی۔ 172ھ/788ء میں مدینہ منورہ آ گئے جہاں انہوں نے براہ راست حضرت امام مالک سے فقہ مالکی کی سند حاصل کی پھر وہاں سے عراق چلے گئے جہاں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعدد شاگردوں سے استفادہ کیا۔ افریقیہ واپس آنے کے بعد انہوں نے ایک محدث، فقیہ اور عالم دین کی حیثیت سے زندگی شروع کی۔

اغلبی امیر زیادۃ اللہ نے انہیں 818ء میں قیروان کا قاضی مقرر کیا۔ ان کے ساتھی ابو محرز تھے جن کے ساتھ وہ اکثر اپنے مزاج کی تیزی کی وجہ سے لڑ پڑتے تھے۔ انہوں نے ایک مشہور و معروف مالکی امام سحنون سے بھی اختلاف کیا جن کی کتاب المدونۃ ان کی کتاب الاسدیہ کے دور کامیابی کے بعد بھی معروف رہی۔

ان کی جذباتیت بعدازاں ان کے امیر عسکر مقرر کیے جانے کا سبب بن گئی۔ انہیں اس عسکری مہم کا قائد بنا دیا گیا جو 827ء میں بازنطینی صقلیہ پر حملے کی غرض سے بھیجی گئی تھی۔ انہوں نے اسلامی فوج کی قیادت کی اور جزیرہ صقلیہ کی فتح کے سلسلے میں پہلا قدم مزارہ کو فتح کر کے اٹھایا۔ صاحب قلم اور صاحب شمشیر تھے۔

213ھ/828ء میں سرقسطہ SYRACUSE کی فتح کے دوران زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے یا بعارضہ طاعون وفات پا گئے۔

جوہر صقلی (م 381ھ☆/992ء)

سپہ سالار، منتظم شمالی افریقہ اور مصر میں فاطمی سلطنت کا بانی و فاتح

اس کا نام جوہر بن عبداللہ تھا۔ چونکہ وہ صقلیہ کا باشندہ تھا اس لیے اسے جوہر الصقلی کہا جاتا ہے۔ اس کی پیدائش کی تاریخ نامعلوم ہے لیکن اس کی تاریخ وفات 20 ذوالقعدہ 381ھ/28 اپریل 991ء ہے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ جوہر فاطمی خاندان کا ایک آزاد شدہ غلام تھا اور سلافی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ سب سے پہلے تاریخ میں اس کا نام اس وقت سننے میں آتا ہے جب وہ ایک غلام تھا اور تیسرے فاطمی خلیفہ کا کاتب بھی۔

958ء میں جب خلیفہ المعز نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی پوری فوجی طاقت اس مہم میں لگا دے جو اس نے شمالی افریقہ کو فتح کرنے کے لیے ترتیب دی تھی تو اس مہم کا قائد اس نے اپنے کاتب جوہر الصقلی کو بنایا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جوہر فاطمی

سالاروں میں ماہر ترین اور قابل ترین سالار تھا۔ مغرب اوسط اور مغرب اقصیٰ میں جوہر کی یہ عسکری مہم عقبہ بن نافع کی مہم کے تقریباً284 سال بعد عمل میں آئی تھی تاہم فتوحات کے باوجود یہ مہم فیصلہ کن ثابت نہ ہوئی۔ جوہر نے المعز کو اپنی اس فتح کے ثبوت کے طور پر، بحر الظلمات سے پکڑی ہوئی کچھ زندہ مچھلیاں تحفے کے طور پر بھجوائی تھیں۔

969ء میں وہ اپنی اس شمالی افریقہ کی مہم کے بعد مصر میں سرگرم نظر آتا ہے۔ اس سال پھر خلیفہ المعز نے اسے مصر پر فوجی چڑھائی کے لیے بطور قائد عسکر منتخب کیا تھا۔ المعز کو توقع تھی کہ جوہر مصر کو بہت جلد فتح کرلے گا پھر ایسا ہی ہوا اور صرف چار ماہ کے اندر اندر الجوہر نے مصر فتح کرلیا۔ مصر میں فاطمی سلطنت قائم کرنے کے بعد جوہر نے 17 محرم 364ھ/ 17 اکتوبر 974ء کو شہر قاہرہ کی بنیاد رکھی۔ مگر اس کے کچھ عرصہ بعد المعز نے جوہر کو برطرف کردیا اور وہ مصر کا گورنر نہ رہا۔ اپنی گورنری مصر کے چار سالوں میں الجوہر نے بہت اچھے منتظم ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ اس نئے صوبے کے انتظامی کام کے علاوہ الجوہر کو قرامطی خطرے کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا جو اس زمانے میں بہت زور پکڑے ہوئے تھے۔ 978ء کے بعد ہمیں تاریخ میں اس بہادر سپہ سالار کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ جنوری 992ء میں اس نے وفات پائی۔

کہا جاتا ہے کہ 368ھ سے 381ھ تک یہ سال اس نے عبادت اور رفاہ عامہ کے کاموں میں بسر کیے۔ اس کا بیٹا الحسین جو اس کا جانشین بنا تھا خلیفہ کے خلاف سازش کرتے ہوئے مارا گیا تھا۔

بدر الجمالی (م 487ھ/ 1094ء)

فاطمین مصر کا مشہور سپہ سالار اور وزیر

فاطمین مصر کے عہد کا سپہ سالار اور وزیر سلطنت بنو فاطمہ جسے کسی زمانے میں بڑا شکوہ حاصل تھا۔ خلیفہ المستنصر کے عہد حکومت 1036ء تا 1094ء میں سلطنت تباہی کے کنارے پر پہنچ چکی تھی۔ شام میں آل سلجوق پیش قدمی کرنے لگے تھے۔ مصر میں ترک غلاموں کی فوج حبشیوں کے لشکر سے برسر پیکار تھی۔ مصر میں سات سالہ قحط نے ملکی وسائل کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اس دور کشاکش میں حکومت تمام اختیارات کھو چکی تھی بھوک اور بیماری سے عوام موت کا شکار ہو رہے تھے۔ مطلق العنانی اور تشدد نے خوشحالی کا خاتمہ کردیا تھا اور یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ فاطمی حکومت اب قریب الختم ہے اور بدعملی اور فتنہ وفساد کا دور دورہ شروع ہو کر رہے گا۔ اس موقع پر خلیفہ کی دعوت پر شامی سپہ سالار اور بدر الجمالی نے فوج کے ساتھ ساتھ حکومت کی باگ ڈور بھی سنبھال لی اور بڑی ہمت اور کوشش سے جس میں تشدد کا عنصر بھی نمایاں تھا، تمام بگڑے ہوئے حالات سنوارے۔ جس کی بدولت صحیح معنوں میں سلطنت فاطمیہ کا عہد ثانی شروع ہوا۔ بدر الجمالی ایک شامی امیر جمال الدولہ ابن عمار کا غلام تھا اسی نسبت سے وہ الجمالی کے نام سے مشہور ہوا۔ وزیر بننے سے پہلے وہ شام کے حکومتی معاملات میں بڑا نام پیدا کرچکا تھا، چنانچہ اسے دوبارہ دمشق کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے بعد اسے عکا میں سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ اس نے فاطمی خلیفہ کو جابر ومستبد ترک اہل کاروں سے نجات دلوائی تھی جس کے بعد وہ مصر میں سیاہ وسفید کا مالک بن گیا تھا۔ دار الحکومت کی شورش ختم کرنے کے بعد اس نے ملک کے انتظامی امور کی طرف توجہ دی۔ 1076ء میں دمشق سلجوقیوں کے قبضے میں چلا گیا اور اگلے سال سلجوقی سپہ سالار اتسز قاہرہ پر حملہ آور ہوا مگر بدر الجمالی نے فوجیں اکٹھی کرکے سلجوقی لشکر کو پسپا کردیا۔ بدر نے شام پر کئی مرتبہ لشکر کشی کی لیکن وہ دوبارہ دمشق پر قبضہ نہ کرسکا۔ قاہرہ کی دوسری فصیل اس کی تعمیر کردہ تھی۔ مارچ 1094ء میں اس نے وفات پائی اس کے بعد اس کا بیٹا وزیر بنا۔

سلطان بیبرس اول (م 676ھ/ 1277ء)

مشہور مملوک سپہ سالار فاتح عین الجالوت، تاتاریوں کے سیلاب کا رخ پھیر دینے والا

مملوک دولت البحریہ کا چوتھا سلطان، کہا جاتا ہے کہ وہ ان قپچاق ترکوں کی جماعت میں سے تھا جنہیں ایوبی سلطان الملک الصالح نے خریدا تھا۔ اس کا پہلا آقا ایدکیں بندقدار تھا اسی لیے اس کا لقب بندقداری ہوگیا تھا۔ اس لقب کا استعمال مارکو پولو نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔ بیبرس اول کا پہلا جنگی کارنامہ منصورہ کے میدان میں مصری فوج کی قیادت سنبھالنا تھا جس میں اس نے رفانس کے بادشاہ لوئی نہم کو گرفتار کرلیا تھا اور فارس کور کی فیصلہ کن فتح حاصل کی تھی۔ جب سلطان کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لیا تو شام کے ملک پر تاتاری لشکروں کی یلغار شروع ہو چکی تھی۔ فلسطین میں عین الجالوت کے مقام پر تاتاریوں سے ایک خونریز جنگ ہوئی جس میں سلطان قطز اور مغول سپہ سالار مارا گیا اور تاتاریوں کو شکست ہوئی جو مصریوں کی شاندار کامیابی تھی اور انہوں نے بڑھتے ہوئے تاتاری سیلاب کو بالآخر روک دیا تھا۔ اس موقع پر بیبرس ہراول دستے میں لڑ رہا تھا۔ اس جنگ کے دوران ہی سلطان قطز کو اس کے خیمے میں قتل کر دیا گیا اور بیبرس ''الملک الظاہر'' کے لقب کے ساتھ تخت مصر پر جلوہ افروز ہوا (658ھ/ 1260ء)۔ سلطان بیبرس بڑا بہادر، جرات مند اور اولوالعزم حکمران تھا اور جنگوں میں بنفس نفیس شرکت کرتا تھا۔ اس کے عہد میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے عہد کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ سلطان بیبرس نے ایک طرف تو عالم اسلام کو متحدہ قیادت عطا فرمائی اور دوسری طرف نہ صرف تاتاریوں بلکہ فرنگیون کے خلاف بھی فاتحانہ جنگ لڑی اور انتظامی امور میں جاگیردارانہ نظام کی بیخ کنی کر دی۔ اندرونی طور پر ملک کی از سر نو تنظیم کی اور حمص سے لے کر حوران تک ہر اس قلعے کو دوبارہ مستحکم بنایا جسے منگولوں نے تباہ کر دیا تھا۔ بغداد میں خلافت عباسیہ کے سقوط کے بعد جو انتشار پیدا ہوا تھا اور عالم اسلام صلیبیوں اور مغول میں باہمی اتحاد کے اشارات کی وجہ سے خطرات میں گھر گیا تھا اسے سلطان بیبرس نے ہی ان خطرات سے محفوظ کیا تھا۔

بیبرس المنصوری (م 725ھ/ 1325ء)

مملوک سپہ سالار، مورخ اور مصنف اور صاحب سیف وقلم مسلمان

بیبرس المنصوری نے اپنی عملی زندگی کی ابتدا الملک المنصور قلاؤون کے غلام کی حیثیت سے کی، اسی بنا پر وہ المنصوری کہلایا۔ بیبرس نے قلاوون کی فوج کے ساتھ 663ھ/ 1265ء میں شامی فرنگیوں کے خلاف بیبرس اول کی مہم میں شام اور کیلیکیا یا سلشار کی مہمات میں اور انطاکیہ کے محاصرے میں اور دیگر مہمات میں حصہ لیا۔ قلاوون نے جو مصر وشام کا سلطان ہوگیا تھا 1286ء میں بیبرس کو الکرک کے صوبے کا گورنر مقرر کر دیا مگر اس کے جانشین الملک الاشرف خلیل نے 1291ء میں بیبرس کو اس عہدے سے برطرف کر دیا۔ اس کے بعد وہ مصر لوٹ آیا اور اس نے عکا اور ایشیائے کوچک میں قلعۃ الروم کے محاصروں، نیز اگلے برس مغولوں کے خلاف دو مہمات میں حصہ لیا۔ جب 1293ء میں الملک الناصر محمد سلطان منتخب ہوا تو اس نے بیبرس کو سپہ سالار مقرر کر دیا اور رئیس عدالت کا اعلیٰ عہدہ اس کے سپرد کر دیا۔ اس وقت سے بیبرس کی زندگی اس فرمانروا کے ساتھ وابستہ ہوگئی اور اس کے بعد وہ اگلے کئی برس تک عسکری اور انتظامی خدمات سرانجام دیتا رہا۔ یہاں تک کہ 1304ء میں اسے رئیس عدالت کے عہدے سے معزول کر دیا گیا۔ اسی اثنا میں الملک الناصر کا حکومت پر کوئی اقتدار باقی نہ رہا اور وہ دو طاقتور سپہ سالاروں کے ہاتھوں میں محض کٹھ پتلی بن کر رہ گیا۔ آخر وہ خود ہی تخت سے دستبردار ہوگیا۔ بیبرس المنصوری

اس شہزادہ کا بڑا حامی تھا چنانچہ اس نے اسے تخت پر بحال کرانے کے لیے سخت جدوجہد کی اور جب 1310ء شہزادہ دوبارہ تخت پر متمکن ہوا تو اس نے بہت سے انتظام امور بیبرس کے سپرد کر دیے۔ یہاں تک کہ 1311ء میں اسے نائب السلطنت بنا دیا۔ یہ عہدہ سلطان کے بعد انتہائی اہم تھا۔ بیبرس اس عہدے پر ایک سال سے کم عرصے تک فائز رہا۔ اگست 1312ء میں اسے اس عہدے سے معزول کر کے اسکندریہ کے قید خانہ میں ڈال دیا گیا۔ جہاں وہ پانچ برس قید رہا۔ اس نے 725ھ/ستمبر 1325ء میں وفات پائی۔ بیبرس ایک متقی مسلمان تھا اور عسکری اور سیاسی مصروفیات کے باوجود کچھ وقت نکال کر تاریخی کتابیں بھی لکھتا تھا۔ اس کا بڑا علمی کارنامہ تاریخ اسلام ہے۔

خیرالدین باربروسہ (م 953ھ/1546ء)

مشہور ترکی امیر البحر اور الجیریا کا بیگلر بیگی، بہادر اور ہوش مندی میں بے مثل

اس کی پیدائش میتیلین METELIN میں 888ھ/1483ء کے لگ بھگ ہوئی۔ شروع میں اس نے اپنے بھائی کے ماتحت بحری مہمات میں شرکت کر کے بہادری اور ہوشمندی کے کارناموں میں بہت نام پیدا کیا۔ جب اس کے بھائی اوروج نے تلمسان کے خلاف حملہ کیا تو اس نے اپنے بھائی کو الجزائر کا گورنر بنا دیا۔ پھر جب اوروج کی موت کی خبر آئی تو خیرالدین باربروسہ کو اس کے ساتھیوں نے اتفاق رائے سے اس کا جانشین چن لیا جس کے بعد اسے ایک نازک صورتحال سے دوچار ہونا پا۔ شرشال اور تینیس کے شہروں میں بغاوت ہوگئی۔ کوکو kuko تلمسان کے حکمران ابوحمو نے شلف کی وادی پر حملہ کر دیا۔ اتنے مخالف حالات سے نمٹنا باربروسہ کی فوج کے لیے ممکن نہیں تھا۔ س لیے قسطنطنیہ سے سلطان سلیم سے مدد طلب کی گئی۔ سلطان نے اسی زمانے میں مصر کو فتح کیا تھا۔ اس نے خیرالدین کا حلف وفاداری قبول کرتے ہوئے دو ہزار فوج اور توپ خانہ اسے بھیج دیا اور خیرالدین کو ان خطرات کا مقابلہ کرنے کا موقع مل گیا۔ پھر خیرالدین نے اپنی بحری طاقت بڑھا کر بڑی جرأت مندی سے کام لیتے ہوئے غرناطہ کے سقوط کے بعد سے اسپین میں پھنسے ہوئے لاکھوں مسلمانوں کو وہاں سے نکال کر الجزائر میں آباد کیا۔

خیرالدین کی درخواست کو ترکی بحری بیڑے کا امیر البحر بنا کر پاشا کا خطاب دیا۔ بہت جلد خیرالدین اس میدان میں اپنی قابلیت کا ثبوت دیا اور ہسپانوی بیڑے کو اٹلی کے ساحل کے قریب زبردست شکست دی۔ اس فتح کیسے بحیرہ ایڈریاٹک اور بحیرہ روم کا وسطی حصہ ترکوں کے زیر اثر آ گیا۔ کریٹ اور چھوٹے جزائر پر بھی ترکوں کا قبضہ ہوگیا۔

1545ء میں فرانس نے سلطان ترکی سے امداد کی درخواست کی۔ سلطان سلیمان نے خیرالدین باربروسہ کو ایک زبردست بیڑہ دے کر بھیجا۔ خیرالدین نے نیس کے مقام کو فتح کرلیا اور موسم سرما فرانس کی بندرگاہ طولون میں گزرا۔

1546ء میں فرانس سے واپس آ گیا اور اسی سال اس نے قسطنطنیہ میں وفات پائی۔

غازی الدین خان (م 1709ء)

اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کا مشہور سپہ سالار اور ماہر جنگ

غازی الدین خان کا خطاب اورنگ زیب عالمگیر نے عابد خان المقلب بہ قلیج خان کے بڑے بیٹے میر شہاب الدین خان کو عطا کیا تھا۔ قلیج خان کو پنج ہزاری کا منصب حاصل تھا اور عہد شاہجہانی میں وہ ایک سے زائد صوبوں کا حاکم رہا تھا۔

شہاب الدین 1669ء میں ترکستان سے چل کر اورنگ زیب کے دربار میں پہنچا تھا اور اسے 300 سواروں کا

سالار مقرر کیا گیا تھا۔ اس نے عہد عالمگیری میں شہزادہ اکبر کی بغاوت فرو کرنے اور دکن کے طویل معرکوں خصوصاً بیجاپور، گولکنڈہ اور ادھونی کے محاصروں میں نمایاں اور امتیازی فوجی خدمات انجام دیں۔ اس نے 1679ء میں غازی الدین خان اور 1680ء میں اپنی عمدہ عسکری کارکردگی پر فتح جنگ کا خطاب پایا۔

اس کا انتقال 1709ء میں بہادر شاہ کے عہد میں ہوا۔ انتقال کے وقت وہ صوبہ گجرات کا صوبیدار تھا۔ اس نے اپنے پسماندگان میں ایک بیٹا میر قمر الدین الملقب بہ چین قلیچ خان چھوڑا جو بعد ازاں نظام الملک اور آصف جاہ کے القاب سے مشہور ہوا اور اس نے دکن میں ایک آزاد ریاست قائم کی۔ نظام الملک فرخ سیر کے عہد میں دکن میں نائب السلطنت مقرر ہوا تھا۔ اسی نے حیدرآباد دکن میں نظام شاہی کی بنیاد رکھی تھی۔

نادر شاہ افشار (م 1160ھ/ 1747ء)

آخری صفوی دور میں سپہ سالار اور بعد ازاں شاہ ایران، حملہ دہلی کی وجہ سے مشہور

نادر بن امام قلی بن نذر قلی، افشاروں کے ترجمان قبیلے قرقلوخیل سے تعلق تھا جن میں کچھ لوگ شمالی خراسان میں آباد ہو گئے تھے۔ 28 محرم 1100ھ/ 22 اکتوبر 1688ء کو کبکان، ایران میں پیدا ہوا۔ طہماسپ ثانی کی ملازمت میں داخل ہونے کے بعد اس کا نام طہماسپ قلی خان مشہور ہو گیا لیکن تخت نشینی کے بعد اس نے اپنا اصل نام نادر دوبارہ اختیار کر لیا۔ شاہ طہماسپ نے نادر شاہ کو فوج کا سپہ سالار بنا دیا۔ افغانوں اور ترکوں کو مختلف معرکوں میں شکست دینے کے بعد چھیالیس سال کی عمر میں اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور تین سال بعد مشرق کا رخ کرتے ہوئے اس نے کابل و غزنی کو فتح کیا اور 1739ء میں ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ کرنال کے قریب محمد شاہ کی مغل افواج کو شکست دینے کے بعد وہ 21 مارچ 1739ء میں فاتحانہ انداز میں دہلی میں داخل ہوا اور تقریباً اس نے دو ماہ تک دہلی میں قیام کیا۔ نادر شاہ کا نام خطبے اور سکہ رائج الوقت میں شامل کر لیا گیا۔ 26 مارچ 1739ء کو دہلی میں افواہ پھیل گئی کہ نادر شاہ قتل ہو گیا۔ جس کی وجہ سے دہلی کی شہری آبادی نے حوصلہ پا کر تین ہزار سے سات ہزار نادر شاہی سپاہی قتل کر دیئے۔ اگلے دن نادر شاہ نے جامع مسجد دہلی میں دہلی کے باشندوں کا قتل عام کرنے کا حکم دیا جو بمشکل رکا۔

دو ماہ بعد جب نادر شاہ دہلی سے روانہ ہوا تو اس نے تاوان کی رقم ساٹھ لاکھ روپیہ نقد اور پچاس کروڑ کے قیمتی جواہرات کی شکل میں وصول کی اور مال غنیمت کے طور پر کوہ نور ہیرا اور تخت طاؤس جیسی نادر اشیا ساتھ لے گیا۔ اس نے ترکوں کے خلاف بہت سی عسکری مہمات سر کیں اور اکثر انسانی کھوپڑیوں کے مینار بھی تعمیر کرائے۔

20 جون 1747ء کی شام کو اس کے پہرہ داروں نے اس کے خلاف سازش کر کے اسے قتل کر دیا اور اس کے قتل کے بعد اس کے کیمپ میں شورش اور بدامنی برپا ہوئی۔ اس کے بعد علی قلی میرزا کو اس کا جانشین مقرر کیا گیا اور باقی شہزادے تہہ تیغ کر دیئے گئے۔

احمد شاہ ابدالی (م 1184ھ/ 1773ء)

افغانستان کے سدوزئی خاندان کا بانی اور پانی پت کے تیسری جنگ کا فاتح

احمد شاہ درانی یا ابدالی افغانستان کے سدوزئی سلطنت کا بانی جو افغانوں کے ابدالی قبیلے کی شاخ سدوزئی کا فرد تھا۔ وہ 1724ء میں ملتان میں پیدا ہوا جہاں ایک سڑک کا نام آج بھی اس کے نام پر ابدالی روڈ ہے۔

احمد خان (شاہ) نے نادر شاہ افشار کی ملازمت میں نمایاں خدمات انجام دیں اور وہ ذاتی ملازم کے درجے سے ترقی کر کے ابدالیوں کے دستہ کا سالار بن گیا اور اسی حیثیت سے وہ اس ایرانی فاتح کے ہمراہ ہندوستان کی مہم پر بھی گیا۔ جون 1747ء میں جب نادر شاہ کو قزلباش سازشیوں نے قتل کر دیا تو احمد کو افغانستان کیطرف کوچ کرنے کا خیال آیا اور وہ افغانوں کا سردار بن گیا۔ احمد شاہ نے قندھار میں اپنی تاج پوشی کے بعد دُرِّ دُراں کا لقب اختیار کیا اور اس دن سے ابدالی درانی ہو گئے۔ اس نے اپنی ایک فوج خاص تیار کی اور افغانستان میں اپنی سلطنت قائم کر لی۔ ان دنوں ہندوستان میں بد نظمی کا دور دورہ تھا۔ احمد شاہ اپنے آپ کو نادر شاہ افشار کی مشرقی سلطنت کا وارث سمجھتا تھا اور ہند کے ان صوبوں کا دعویدار تھا جو نادر شاہ نے مغل شہنشاہ سے چھینے تھے۔ چنانچہ اس نظریئے کے مطابق اس نے 1747ء سے 1769ء تک نو مرتبہ ہندوستان پر حملہ کیا۔ ہندوستان پر پہلے حملے میں وہ قندھار سے روانہ ہوا اور اس نے لاہور اور سرہند پر قبضہ کر لیا۔ آخر کار دہلی سے مغلیہ فوج اسے روکنے کے لیے بھیجی گئی اور اسے منو پور کے مقام پر شکست ہوئی مگر دسمبر 1749ء میں احمد نے دوبارہ دریائے سندھ عبور کیا اور مغل سلطنت اس سے صلح کرنے پر مجبور ہوگئی۔ بعدازاں اس نے اپنی مغربی سرحد کی طرف توجہ دی اور ایران کے تاجاریوں کو شکست دی۔ 1752ء میں چار ماہ کے محاصرے کے بعد اس نے لاہور فتح کر لیا اور شاہ دہلی نے ملتان اور لاہور کے صوبے اس کے حوالے کر دیئے۔ جنوری 1757ء میں وہ دہلی تک جا پہنچا اور اس نے شہر میں لوٹ مار کی۔ مارچ 1757ء میں احمد شاہ کی فوج ہیضہ کی وباء کا شکار ہوگئی اور اسے ہندوستان سے لوٹنا پڑا۔ احمد شاہ کا سب سے بڑا کارنامہ شمالی ہندوستان میں مرہٹوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روکنا تھا جس کے لیے اس نے 1761ء میں پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست فاش دے کر ان کی بڑھتی ہوئی طاقت کو ختم کر دیا۔ 1762ء میں اس نے سکھوں کے خلاف بھی کارروائی کی اور ان کو شکست دی۔ احمد شاہ ابدالی نے 1773ء میں وفات پائی۔

جنرل بخت خان (م 1859ء)

محمد بخش، برعظیم کی جنگ آزادی 1857ء میں آزاد فوجوں کا سپہ سالار اعظم

ہندوستان کی جنگ آزادی کا دوسرا عظیم المرتبت راہنما جنرل بخت خاں تھا۔ اس کے والد کا نام عبداللہ خان تھا اور اُسے نجیب الدولہ روہیلہ کے خاندان سے قرابت تھی۔ تمام روایات متفق ہیں کہ جنرل بخت خاں پہلے انگریزی فوج میں ملازم تھا اور اسی وجہ سے جدید فنون جنگ سے بخوبی واقف تھا۔ پہلی جنگ افغانستان میں اس نے جنرل سیل کے ہمراہ توپ خانے میں خدمات انجام دیں تھیں۔ افغانستان سے واپسی پر جنرل بخت خان گوالیار کی مشہور چھاؤنی نیمچ میں رہا۔ جب میرٹھ میں سپاہ کا ہنگامہ شروع ہوا تو وہ بریلی میں مقیم تھا۔ اعلان آزادی کے بعد جنرل بخت خان بریلی سے اپنے توپ خانے کا پورا بریگیڈ لے کر دہلی پہنچا اور 2 جولائی 1857ء کو شہر میں داخل ہوگیا۔ بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے اپنے خسر نواب احمد قلی خان کو اس کا استقبال کرنے کا حکم دیا۔ پھر بخت خان نے بارگاہ شاہی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں سپہ سالار کی حیثیت سے اپنی خدمات پیش کرتا ہوں۔ اس پر بادشاہ نے نشان مودت کے طور پر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور ایک ڈھال اور تلوار کے علاوہ اسے جنرل کا خطاب دیا گیا اور تمام افواج آزادی کا کمانڈر اعظم بنا دیا گیا۔ انگریزوں پر پہلا حملہ 3 اور 4 جولائی کی درمیانی شب میں کیا گیا۔ بخت خان کی فوج میں سوار اور پیادے اور توپ خانہ کے کل 4 سے پانچ ہزار افراد شامل تھے۔ جنرل ہڈسن کہتا ہے کہ اس جنگ میں چالیس گورے مارے گئے۔ جون لال کے روزنامچے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جنگ میں بخت خاں فوج کے ساتھ نہیں گیا تھا اور صرف دور جمنٹیں بھیجی تھیں جو سامان سے دو بھری گاڑیاں انگریزوں سے چھین کر واپس آئیں۔ ادھر

بخت خان نے سپہ سالار بنتے ہی اصلاح احوال کی کوششیں بھی کیں مگر افسوس دہلی کے حالات ابتری کی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ مغل شہزادوں میں انتظامی صلاحیتیں موجود نہیں تھیں اور نالائق مشیر اس کے علاوہ تھے۔ پھر جب آخر کار انگریز دہلی میں داخل ہو گئے تو بخت خاں نے بادشاہ سے کہا کہ میرے ساتھ لکھنؤ چلیں مگر بادشاہ نے یہ مشورہ قبول نہ کیا اور بخت خاں بادشاہ کی طرف سے مایوس ہو کر نکلا اور اس نے لکھنؤ پہنچ کر مختلف لڑائیوں میں شرکت کی۔ حضرت محل نے بخت خاں کو خلعت عطا کی تھی۔ شاہجہاں پور میں بھی انگریزوں سے رزم آرائیاں ہوئیں پھر جنرل بخت خاں محمدی سے ہوتا ہوا نیپال میں داخل ہو گیا۔ باقی عمر وہیں گزاری مگر کسی کو معلوم نہیں کہ کس حال میں گزری۔ بہر حال جنرل بخت خاں ان مجاہدین آزادی میں سے تھا جنہوں نے زندگی کی ہر شے ملک پر قربان کرنے کا عزم کیا ہوا تھا۔

علماء ومجتہدین

ابن سیرین (م110ھ/729ء)

العیاشی، ابونصر محمد، تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی

البغدادی (429ھ/1037ء)

الطوسی (م460ھ/1067ء)

الشہرستانی (548ھ/1153ء)

ابن العربی الشیخ الاکبر (638ھ/1240ء)

الحلی (م726ھ/1325ء)

ابن ابی الجمہور (م912ھ/1506ء)

ملا جیون (م1130ھ/1718ء)

امام خمینی

ابن ابی الدنیا (م281ھ/894ء)

ابن بابویہ (م381ھ/991ء)

ابن زہر ابوبکر محمد بن مروان (م421ھ/1030ء)

ابوعبید البکری (م487ھ/1094ء)
دیکھیے سیاح وجغرافیہ دان

ابن القفطی (1236ء)

ابن الطقطقی، جلال الدین (709ھ/1309ء)

ابن الوردی (م861ھ/1457ء)

نور اللہ شوستری (م1019ھ/1610ء)

عبداللہ غزنوی (م1298ھ/1881ء)

الشاہ احمد نورانی (م2003ء)

ابن سیرین (م 110ھ/ 729ء)

ابوبکر محمد، مشہور تابعی محدث اور تعبیر رؤیا کا عالم بے مثل

یہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عصر اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا والد جرجرایا نامی شہر کا ٹھٹھیرا تھا، جسے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ عین التمر سے غلام بنا کر لائے تھے۔ جبکہ کتاب معجم ما استعجم میں محمد بن سیرین کو عین التمر کے قیدیوں میں ظاہر کیا گیا ہے، تاہم یہ روایت درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ فتح عین التمر 12ھ میں ہوئی تھی اور اس وقت تک ابن سیرین پیدا نہیں ہوا تھا۔ ایک اور روایت کے مطابق یہ بیسان کے جنگی قیدیوں میں سے تھا جسے حضرت مغیرہ نے فتح کیا تھا۔ ان کی والدہ صفیہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی آزاد کردہ کنیز تھیں۔ ابن سیرین تبع تابعین میں راویان حدیث کے دوسرے طبقے سے تھے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ وغیرہم سے حدیث روایت کی ہے۔ انہوں نے بصرے میں سکونت اختیار کی تھی اور اپنی بہن حفصہ اور کریمہ اور دوسرے بھائیوں کی طرح وہ بھی اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے مشہور تھے۔

تعبیر رویا بیان کرنے میں انہیں حجت مانا گیا ہے۔ چنانچہ متاخرین نے تعبیر رویا میں ان کے نام پر کئی رسالے لکھے، مثلاً منتخب الکلام فی تفسیر الاحلام اور کتاب الجوامع۔

ابن سیرین کی پیدائش بصرے میں تقریباً 33ھ/ 653ء میں ہوئی اور انہوں نے بصرے ہی میں 9 شوال 110ھ/ 15 جنوری 729ء کو وفات پائی۔

ابن ابی الدنیا (م 281ھ/ 894ء)

ابوبکر عبداللہ القرشی، عرب عالم، عباسی خلیفہ المکتفی کا اتالیق اور بہت سی کتابوں کا مصنف

عرب مصنف جو 208ھ/ 823ء میں پیدا ہوا۔ عباسی خلیفہ المکتفی کا اتالیق رہا اور 14 جمادی الاخریٰ 281ھ/ 22 اگست 894ء کو فوت ہو گیا۔ اس کی کثیر التعداد تالیفات میں سے، جو سب کی سب ادب میں تھیں، کچھ باقی ہیں جن کے نام یہ ہیں:

(1) الفرج بعد الشدۃ، جو المدائنی کی اسی نام کی کتاب کے نمونے پر لکھی گئی ہے، برلن میں موجود ہے۔

(2) کتاب الاشراف، جلد دوم دمشق میں موجود ہے۔

(3) مکارم الاخلاق، برلن میں موجود ہے اور برٹش میوزیم میں بھی

(4) کتاب العظمۃ، عجائب خلق پر، وی آنا میں موجود ہے۔

(5) من عاش بعد الموت، میونخ میں موجود ہے۔

(6) فضائل عشر ذی الحجہ، لائیڈن میں موجود ہے۔

(7) کتاب العقل وفضلہ، دمشق میں موجود ہے۔

(8) قصر الامل

(9) کتاب الیقین، استنبول کی کوپرولو لائبریری میں موجود ہے۔

(10) کتاب قری الضیف

(11) کتاب الشکر، استنبول، نوری عثمانیہ میں موجود ہے۔

(12) زم الدنیا، دمشق میں موجود ہے۔

(13) ذم الملاھی، آلات موسیقی کی مذمت کے بیان میں، دمشق میں موجود ہے۔

(14) کتاب الجوع، دمشق میں موجود ہے۔

(15) زم المسکیر، دمشق میں موجود ہے۔

(16) کتاب الرقۃ والبکاء، دمشق میں موجود ہے۔

(17) کتاب الصمت، دمشق میں موجود ہے۔

(18) قضاالحوائج، برلن میں موجود ہے۔

(19) کتاب الہواتف، قاہرہ میں موجود ہے۔

ابن بابویہ (م 381ھ/ 991ء)

چار بڑے شیعی جامعین حدیث میں سے ایک اور کتاب ''ممن لا یحضر الفقیہ'' کا مصنف

ابوجعفر بن محمد بن علی بن الحسین بن موسیٰ القمی الصدوق۔ اپنے عنفوان شباب میں وہ خراسان سے بغداد پہنچے اور وہاں کے بہت سے علماء ان کے شاگرد بن گئے۔ ان کی وفات رے میں 381ھ/ 991ء میں ہوئی۔ کتاب من لا یحضرۃ الفقیہ، حدیث سے متعلق ایک مجموعہ جو شیعہ حدیث کی چار کتابوں موسومہ الکتب الاربعہ میں شمار ہوتی ہے جبکہ باقی تین یہ ہیں۔

(2) الکافی از ابوجعفر محمد بن یعقوب الکلینی (م 328ھ/ 939ء)

(3) تہذیب الاحکام: الاستبصار ہر دو از ابوجعفر محمد بن الحسین بن علی الطوسی (م 460ھ/ 1067ء)

معانی الاخبار، شیعی احادیث کا ایک مجموعہ، عیون الاخبار الرضا شیعوں کے آٹھویں امام علی الرضا کی زندگی کے حالات اور آپ کے اقوال اور عقائد، یہ ابن بابویہ کی دوسری اہم تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ امام غیب کے شیعی عقیدے سے متعلق ان کی تصنیف ''کتاب اکمال الدین واتمام النعمۃ فی اثبات الغیبۃ وکشف الحیر ۃ الغمہ۔ اس کتاب کا ایک حصہ طر MOLLER نے جرمن زبان میں ایک مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ابن بابویہ تین سو کتابوں کے مصنف تھے۔ النجاشی نے اپنی کتاب الرجال میں ان کی 193 تصانیف کے نام دیئے ہیں۔

البغدادی (429ھ/ 1037ء)

ابومنصور عبدالقاہر بن طاہر الشافعی، ایک معروف عالم الٰہیات وفقہ وو راثت

اِن کے والد انہیں صرف حصول تعلیم کے لیے نیشاپور لے گئے تھے مگر عبدالقاہر نے وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ خراسان کے اکثر علما و فضلاء اس کے شاگرد تھے۔ البغدادی سترہ مضامین یا علوم میں تعلیم دینے کی قابلیت رکھتا تھا۔ جن میں فقہ، اصول، حساب، قانون وراثت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ترکمانوں کے فتنہ وفساد کی وجہ سے اس نے نیشاپور کو آخر خیر آباد کہا اور اسفرائین چلا گیا اور تھوڑے عرصے کے بعد وہیں وفات پائی۔ وفات کے وقت وہ خاصا امیر اور دولت مند تھا اور اکثر اہل علم کی امداد کیا کرتا تھا۔ فقہ، حساب اور وراثت پر اس کی کتابیں بہت مقبول تھیں۔ حساب پر اس کی ایک کتاب محفوظ رہی ہے۔ اس نے الٰہیات پر بھی متعدد کتابیں لکھیں۔ اس کی ''الملل والنحل'' اب مفقود ہوگئی ہے۔ ''اصول الدین''

ترتیب وتدوین کے اعتبار سے بہت عمدہ رسالہ ہے، جس کے شروع میں علم کی ماہیت، تخلیق عالم، خالق کائنات کی معرفت کا طریقہ، اس کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ یہ کتاب محمد بن عمر الرازی کی المحصل سے بہت مشابہت رکھتی ہے، لیکن اس میں ہر مسئلے کے بارے میں تمام فرقوں کی رائے بھی بیان کردی گئی ہے۔ اس کتاب کا انداز تحریر اول سے آخر تک محققانہ ہے۔ یہ بات اس کی دوسری تصنیف ''الفرق بین الفرق'' میں نظر نہیں آتی جس میں ہر فرقے کا ذکر الگ الگ کرتے ہوئے ان سب کا جائزہ مسلمہ عقائد اہل سنت کی روشنی میں لیا گیا ہے اور جو فرقے اس کے نزدیک صراط مستقیم پر قائم نہیں ان کی مذمت بھی کی گئی ہے۔ یہ کتاب اس موضوع کی دیگر کتب کے مقابلے میں مناظرانہ تنقید کی حامل ہے۔ اس کتاب میں اگرچہ سقراط اور افلاطون کے عنوان سے ایک الگ باب بھی موجود ہے لیکن اس کا عام موضوع اسلام ہی ہے۔

الطّوسی (م460ھ/1067ء)

دیکھیے محقق طوسی۔

ابن زہر (م421ھ/1030ء)

ابوبکر محمد بن مروان، اندلس کا متقی عالم اور فقیہ، اندلسی علماء کے خاندان کا بانی

ابن زہر، ان مسلمان علماء کے ایک خاندان کا نام ہے جو اندلس میں نویں صدی عیسوی کے شروع سے تیرھویں صدی عیسوی کی ابتدا تک ہوگزرے ہیں۔ یہ لوگ عرب سے ہجرت کرکے اندلس آئے تھے اور اپنے آپ کو عدنان کی نسل سے بتاتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی اولاد جنوب مشرقی اندلس میں شخن شاطبہ XATIVA سے جہاں یہ سب سے پہلے آباد ہوئے تھے، پورے اندلس میں پھیل گی۔

اندلسی شاخ کے مورث اعلیٰ کا نام زہر تھا۔ اس کا سوانح نگار ابن الابار اس کی نسبت الایادی بتاتا ہے، کیونکہ وہ اپنا سلسلہ نسب ایاد بن معد بن عدنان تک لے جاتا تھا، جسے عرب قوم کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ابن خلکان نے اپنی تصنیف وفیات العیان میں زہر الایادی کا ایک بیٹا مروان بتایا ہے جو ابوبکر محمد کا باپ تھا اور جس نے سب سے پہلے اپنے معاصرین میں نمایاں حیثیت حاصل کی تھی۔ ابوبکر محمد عالم وفقیہ تھا اور اپنے علم تقویٰ، فصاحت اور سخاوت کی وجہ سے مشہور تھا اس نے 86 برس کی عمر میں شہر طلبیرہ TALAVERA 421ھ/1031ء میں وفات پائی تھی۔

اس کا بیٹا ابومروان عبدالملک بن محمد بن مروان بن زہر تھا جو ایک مشہور طبیب تھا، وہ پہلے قیروان اور پھر قاہرہ میں طبابت کرتا تھا۔ اندلس واپس آکر اس نے بڑی شہرت پائی۔ اس کا بیٹا ابوالعلاء زہر بن ابی مروان تھا جو عام طور پر ابوالعلاء کے نام سے ہی مشہور ہے۔ اُسے تشخیص الامراض میں حیرت انگیز مہارت حاصل تھی۔ اس کے شاگردوں میں سے بہت مشہور طبیب ہوگزرے ہیں۔ یہ اشبیلیہ کے آخری عبادی حکمران المعتمد کے دربار میں طبیب تھا بعدازاں یوسف بن تاشفین کے پاس چلا گیا۔

ابوالعلاء کا بیٹا ابومروان عبدالملک بن ابی العلاء تھا جسے عام طور پر ابومروان بن زہر کہتے ہیں۔ اطالوی میں اس کا نام ABHOMERON AVEN ZOAR ہے۔ یہ بھی ایک معروف طبیب تھا۔ اس نے بھی علاج الامراض میں بڑی شہرت پائی۔

الطوسی (م460ھ/ 1067ء)

الشیخ محمد بن الحسن بن علی ابو جعفر، ایک شیعہ مجتہد، عالم، فلسفی اور مصنف

385ھ/995ء میں طوس (ایران) میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن سے پانے کے بعد وہ 408ھ/ 1017ء میں بغداد آ گیا اور شیخ المفید، محمد بن محمد النعمان البغدادی سے تعلیم حاصل کی۔ ان کی وفات پر طوسی نے السید المرتضیٰ کے حلقہ درس میں شمولیت اختیار کی اور 23 برس تک ان کی شاگردی اور مصاحبت میں رہا۔ ان کی وفات کے بعد اگلے بارہ برس تک مزید بغداد میں مقیم رہا اور شیعہ مذہب کی پرزور تبلیغ اشاعت کی کوششوں میں مصروف رہا۔ اس کے دشمنوں نے ایک مرتبہ خلیفہ القائم باللہ کے پاس اس کی شکایت کی کہ وہ خلفائے ثلاثۃ الراشدین کے بارے میں برے خیالات کا اظہار کرتا ہے اور اس کے ثبوت کے طور پر اس کی کتاب المصباح سے کچھ عبارتیں بھی پیش کیں، لیکن خلیفہ کے سامنے اس نے اپنی تحریروں کی کچھ اس طرح وضاحت کی کہ خلیفہ کو اطمینان ہو گیا کہ وہ اس برائی میں ملوث نہیں ہے اور نہ ہی سُنی مسلک کے خلاف بے ادبی کرتا ہے، چنانچہ خلیفہ نے اس کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہ کی مگر بغداد کی رائے عامہ اس کے خلاف ہوگئی اور آخر کار 448ھ/ 1057ء میں اسے بغداد چھوڑ کر نجف اشرف جانا پڑا جہاں اس نے اپنی بقایا عمر گزار دی۔ وہ شیعہ مذہب کا عظیم مجتہد تھا اور شیخ الطائفہ یا ''صرف الشیخ'' کے لقب سے جانا جاتا تھا۔ اس کے سوانح نگاروں کے مطابق اس کا انتقال 460ھ/ 1067ء میں نجف اشرف میں ہوا۔ اس کی دو کتابیں تہذیب الاحکام اور الاستصار شیعہ فقہ کی ان چار کتابوں میں شامل ہیں جن کی شیعہ حضرات بے حد تکریم کرتے ہیں اور بڑی قدر منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یوں وہ متعدد دیگر کتب کا بھی مصنف تھا۔ یاد رہے کتاب تہذیب الاحکام علم حدیث میں شیعہ عقیدے کی کتاب ہے۔ جبکہ کتاب الاستبصار بھی علم حدیث ہی کی کتاب ہے۔

ابو عبید البکری (م487ھ/ 1094ء)

اسلامی مغرب کا بڑا جغرافیہ نگار، اور بے مثل عالم الٰہیات، لسانیات ونباتات

دیکھیے سیاح اور جغرافیہ نگار

الشہرستانی (548ھ/ 1153ء)

محمد بن عبدالکریم، محقق، عالم ادیان ومذاہب، مصنف ''الملل والنحل''

پانچویں، چھٹی ہجری میں مذاہب، مسالک اور فرقون کے بارے میں لکھنے والے نامور مورخ۔ شہرستانی (469ھ/ 1076ء میں پیدا ہوئے۔ فقہ اور علوم کی تعلیم شہرستانی نے خرجانیہ اور نیشاپور میں پائی اور علم الکلام کی ابوالقاسم الانصاری سے۔ ابن خلکان کے نزدیک وہ اشعریہ تھے، تاہم السمعانی کی رائے میں ان پر اسمٰعیلیوں کا اثر تھا اور وہ اپنے مکالامت اور مباحثوں میں ہمیشہ حکمنا ہی کا ذکر کرتے تھے۔ انہوں نے حج کیا اور تین سال بغداد میں گزارے پھر واپس آ کر اپنے وطن میں مستقل قیام کیا اور 548ھ/ 1153ء میں وفات پائی۔ اُنہوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں جن میں سب سے زیادہ مشہور ادیان ومذاہب اور فرقوں کے بارے میں کتاب ''الملل والنحل'' ہے۔ دوسری تصانیف میں علم الکلام کے متعلق نہاۃ الاقدام فی علم الکلام قابل ذکر ہے۔ ان کی ایک اور تصنیف مابعد الطبعیات میں ہے جس کا عنوان مصارعۃ الفاسفہ یعنی فلسفیوں کا مجادلہ ہے۔ اسی عنوان سے ایک صدی بعد ابن القفطی (م1248) نے اپنی مشہور کتاب تصنیف کی تھی۔

کتاب الملل والنحل فلسفیانہ تصنیفات میں ایک بڑی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ 521ھ/1127ء میں تصنیف ہوئی اور اس میں مصنف نے اس وقت موجود ہر اس نظام پر تبصرہ کیا ہے جس کا تعلق حکمت اور مذاہب سے تھا اور جس کے مطالعے کا اس کو موقع مل سکا۔

کتاب کی ترتیب میں مصنف نے یہ اصول مدنظر رکھا ہے کہ اسلام کے مسلمہ عقائد سے کون کون سے مسلک یا فرقے کہاں تک ہٹے ہوئے ہیں یا کون کون سے اصل کے قریب ہیں۔ لہٰذا انہوں نے اولین اسلامی رفقوں کو لیا مثلاً شیعہ اور معتزلہ وغیرہ۔ پھر وہ اہل کتاب کو لیتے ہیں یعنی عیسائیوں اور یہودیوں کو کہ جن کی الہامی کتب کا اسلام کو اقرار ہے۔ ان مذاہب کا ذکر کیا گیا ہے جن کی الہامی کتب مشکوک ہیں یا جھوٹی تصور کی جاتی ہیں یعنی مثلاً مجوسی اور ثنویہ اور آخر میں ستارہ پرست صابیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

ابن القفطی (م 646ھ/1268ء)

ابوالحسن علی بن یوسف القفطی المعروف بہ جمال الدین 568ھ/1172ء میں قفط، مصر میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمر میں قاہرہ آ گیا جہاں اس نے عربی اور اسلامی علوم کی مختلف شاخوں کی تعلیم پائی اور پھر بیت المقدس جا کر اپنی تعلیم جاری رکھی، جہاں اس کے باپ کو 583ھ/1187ء میں ایک اہم عہدہ سنبھالنے کے لیے بلایا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ حلب چلا گیا جہاں دس سال تک ادبی مطالعات میں وہ ہمہ تن مصروف رہا یہاں تک کہ 610ھ/1213ء میں اسے مالیات کا نظام سپرد کر دیا گیا۔ اس عہدے پر وہ 1230ء تک فائز رہا۔ سوائے 613ھ سے 616ھ تک میں ایک سال کے وقفے کے۔ 633ھ/1248ء میں اسے اپنا وزیر بنا لیا اور اس نے اپنی وفات تک قلمدان وزارت سنبھالے رکھا۔

منصب وزارت کے دوران اسے اپنی ذاتی ادبی سرگرمیاں جاری رکھنے کے علاوہ دوسرے فضلاء کی مدد کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ مثلاً جب یاقوت مغلوں کے ڈر سے بھاگا تو ابن القفطی نے اس کی بڑی مدد کی۔ جس کا یاقوت نے بڑا شکریہ ادا کیا۔

ابن القفطی کی متعدد تصانیف ہیں جن میں سے زیادہ تر تاریخی ہیں۔ جیسے تاریخ قاہرہ، تاریخ المغرب، تاریخ یمن وغیرہ۔ اس کے علاوہ اس کی ایک تصنیف تاریخ الحکماء ہے۔ یہ کتاب قاہرہ سے 1326ھ میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں ابتدائی زمانے سے لے کر مصنف کے زمانے تک 414 طبیبوں، نجومیوں اور فلسفیوں کے حالات دیئے گئے ہیں اور اس لحاظ سے یہ کتاب بڑی قدر و منزلت کی حامل ہے۔ اس میں یونانی ادب کے متعلق اور یونانیوں کے متعلق عربوں کی معلومات کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے اور یونانیوں کے عہد قدیم کے بارے میں ایسی معلومات درج ہے جو اب قدیم کلاسیکی ماخذوں میں بھی مشکل سے ملتی ہے۔

ابن الطقطقی (م 709ھ/1309ء)

جلال الدین ابو جعفر محمد بن تاج، ایک شیعی مورخ، نقیب اور مصنف "کتاب الفخری" حضرت حسن اور ابراہیم طبطبا کے واسطے سے حضرت علی کی بیسویں پشت میں سے تھے۔ یہ خانوادہ رمضان میں سے تھے جس نے الحلۃ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ عطا ملک الجوینی وزیر اباقا کے اشارے پر ان کے والد کو جو کوفے اور بغداد میں خاندان علی کے نمائندہ تھے اور نقیب النقباء کہلاتے تھے، 680ھ/1281ء میں قتل کر دیا گیا تھا۔ ابن الطقطقی کی ولادت 660ھ/1262ء میں ہوئی۔ والد کے قتل کے بعد الحلۃ اور شیعوں کے مقامات مقدسہ (نجف و کربلا شریف) میں خاندان علی

کی نمائندگی (نقاہت) ان کے سپرد ہوئی۔ انہوں نے خراسان کی ایک ایرانی خاتون سے شادی کی۔
696ھ/ 1297ء میں موصل کا سفر بھی کیا، لیکن موسم کی خرابی کی وجہ سے انہیں راستہ میں رکنا پڑا اور اس طرح کتاب الفخری لکھنے کا موقع مل گیا۔ ان کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ بعض نے 709ھ/ اور بعض نے 702ء دی ہے۔
کتاب الفخری فخر الدین عیسیٰ کے نام منتسب ہوئی تھی جو مغل سلطان غازان خاں کی طرف سے گورنر موصل تھا۔ اسی بنا پر اس کا نام کتاب الفخری رکھا گیا۔ یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں امور سلطانیہ اور سیاسیات ملکیہ سے بحث کی گئی ہے۔ اور دوسرے میں ممالک اسلامیہ کی تاریخ کا خلاصہ دیا گیا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر بادشاہ کے حالات بیان کرنے کے بعد اس کے وزراء کا حال بھی لکھا ہے دوسرا حصہ عام طور پر لفظ بہ لفظ ابن الاثیر کی تاریخ یعنی کامل التوارخ سے کیا گیا ہے۔ وزراء کی تاریخ الصولی اور ہلال الصابی سے لی گئی ہے۔ اس کتاب کا شعیت کی طرف رجحان واضح ہے مگر اس میں تعصب نہیں پایا جاتا۔ اس کتاب کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ 1910ء میں شائع ہوا تھا۔

علامہ الحلی (726ھ/1325ء)

علامہ جمال الدین ابو منصور حسن بن یوسف، نامور امامیہ شیعی عالم اور مصنف
ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے شیعہ امامیہ کے نامور عالم، حلہ (مرکزی عراق کا دریائے فرات کے کنارے ایک شہر) میں رمضان المبارک 648ھ/ 1250ء میں پیدا ہوئے اور محرم 726ھ/ 1325ء میں انہوں نے وفات پائی۔ ان کی وفات کے بعد ان کا تابوت نجف اشرف لے جایا گیا اور انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مزار اقدس کے قریب دفن کیا گیا۔
الحلی نے ایک علمی خاندان میں پرورش پائی، ابتدائی تعلیم اپنے والد سدید الدین سے گھر پر ہی پائی۔ بعد ازاں اپنے ایک خالو اور اپنے ایک ماموں نجیب الدین یحیٰ مصنف جامع سے تعلیم پائی۔ علم حدیث، علم فقہ اور اصول فقہ پر دسترس حاصل کی۔ خاندان طاؤس سے خصوصی طور پر علم الحدیث کی تعلیم پائی۔ علوم عقلی میں وہ خواجہ نصیر الدین طوسی کے مکتب اور دبیران قزوینی کے شاگرد تھے۔
نقد الرجال کا مؤلف رقم طراز ہے کہ الحلی نے ستر سے زائد کتب تصنیف کی تھیں۔ خود علامہ الحلی نے خلاصۃ الاقوال میں اپنی کتابوں کی تعداد 67 بتائی ہے۔ علامہ الحلی کے خیالات تین مختلف مرحلوں سے گزرے۔ اس وجہ سے ان کی تالیفات کو تین قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب "منتہی الوصول" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ میں نے اپنی عمر کے چھبیسویں سال 674ء میں اپنی فلسفیانہ تالیفات کو ختم کر دیا تھا اور فقہ اور اصول پر لکھنے میں مشغول ہو گیا تھا۔ فن سیر اور رجال پر ان کی پہلی کتاب "خلاصۃ الاقوال" ہے جو انہوں نے 693ھ میں تصنیف کی تھی۔
علامہ الحلی نے خلافت عباسیہ کے خاتمے کے بعد ہلاگو کے خاندان کی حکومت کا زمانہ پایا۔ ہلاگو کا ایک بیٹا تگودار 681ء میں تخت پر بیٹھا اس نے دین اسلام قبول کیا تھا اور وہ شیعہ مذہب کو سنی مذہب پر ترجیح دیتا تھا اس لیے اس کے عہد میں شیعہ علماء کی سرپرستی کی گئی اور اس نے 707ھ میں علامہ جمال الدین حلی اور ان کے فرزند فخر المحققین کو حلہ سے اپنے دار السلطنت سلطانیہ بلوالیا تھا۔

ابن الوردی (م 861ھ/ 1457ء)

سراج الدین ابوحفص، عمر، شافعی عالم اور مصنف ''خریدۃ العجائب وفریدۃ الغرائب''

ایک شافعی عالم جس نے ذوالقعدہ 861ھ/ ستمبر اکتوبر 1457ء میں وفات پائی تھی۔ وہ ''خریدۃ العجائب وفریدۃ الغرائب'' کا مصنف ہے جو ایک طرح کی جغرافیے اور تاریخ فطرت NATURAL HISTORY کی کتاب ہے۔ محققین نے لکھا ہے کہ خریدۃ نجم الدین احمد بن حمدان بن شبیب الحرانی الحنبلی کی جامع الفنون وسلوۃ المحزون کا محض سرقہ ہے۔ مستشرقین نے یا تو اس کے بعض حصوں کا ترجمہ کیا ہے یا اس کے اقتباسات مع ترجمہ کے نقل کیے ہیں۔

بعض لوگوں نے اسے ابن الوردی زین الدین ابوحفص عمر بن المظفر بن عمر بن محمد ابی الفوارس محمد الوردی القرشی البکری الشافعی کی تصنیف بھی بتایا ہے۔ وہ 689ھ/ 1290ء میں بعارضہ طاعون حلب میں وفات پائی تھی۔ وہ جوانی میں قاضی محمد بن نقیب کا نائب مقرر ہوا تھا۔ بعدازاں اس نے ایک خواب کی بنا پر اس عہدے کو ترک کر کے اپنے آپ کو علمی کاموں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس نے اور بھی کئی تصانیف چھوڑی تھیں۔

ابن ابی الجمہور (م 912ھ/ 1506ء)

محمد بن زین الدین بن ابی جمہور عارف متکلم، شیعی صوفی، محدث اور مصنف

کرک نوح میں علی بن ھلال جزائری وشرف الدین عبدالکریم فتال غروی کا جوغری (نجف) میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے روضے کا خادم بھی رہا تھا شاگرد تھا۔ اس کے علاوہ وہ محقق کرکی کا ہم عصر تھا اور 912ھ کے بعد فوت ہوا تھا۔ وہ ایک حکیم مجتہد، عارف متکلم، صوفی شیعی اور اخباری (محدث) تھا۔ اس نے شیعی احادیث زیادہ باریک بینی سے جمع نہیں کی تھیں۔ چنانچہ مجلسی دوم نے یا تو اس لیے کہ اس کی جمع کردہ احادیث میں تصوف کی بو ہے اور یا اس لیے کہ اس نے جمع کرنے میں سہل نگاری سے کام لیا ہے، اس کی بعض تصانیف کو نہ پسند کیا۔ وہ 879ھ میں حج کو گیا اور پھر شام پہنچا۔ کرک نوح میں اس نے علی بن ھلال سے ملاقات کی اور ایک مہینہ اس کے ساتھ گزارا تھا اس کے بعد وہ خراسان چلا گیا تھا۔ 879ھ میں وہ حج کے لیے گیا اور پھر شام پہنچا۔ کرک نوح میں اس نے علی بن ھلال سے ملاقات کی۔

قاضی نوراللہ شوستری (م 1019ھ/ 1610ء)

ایک شیعہ عالم، مصنف اور اہل تشیع کے نزدیک شہید ثالث

قاضی نوراللہ شوستری بن السید شریف المرعشی الحسینی 956ھ/ 1549ء میں پیدا ہوئے۔ وہ مرعشی سادات خاندان سے تھے جو شوشتر میں آ کر آباد ہو گیا تھا۔ انہیں ہندوستان سے اتنا لگاؤ تھا کہ وہ اپنے آبائی وطن کو خیرآباد کہہ کر لاہور میں آ کر مقیم ہو گئے جہاں ان کو حکیم ابوالفتح کا تقرب حاصل ہو گیا۔ جس نے ان کو شہنشاہ اکبر کے دربار میں پیش کر دیا۔ اکبر نے انہیں شیخ معین کی جگہ لاہور کا قاضی مقرر کر دیا۔ مورخ عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے کہ اگرچہ وہ مذہباً شیعہ تھے، لیکن ایک انتہائی منصف مزاج، پرہیزگار اور صاحب علم شخص تھے۔ تاہم بعض مذہبی الزامات کی بنا پر شہنشاہ جہانگیر کے حکم پر انہیں ہلاک (شہید) کر دیا گیا (1610ء)

شیعہ اصحاب انہیں ''شہید الثالث'' کا درجہ دیتے ہیں اور ان کے مقبرے کی زیارت کے لیے ہندوستان کے ہر

گوشے سے اکبر آباد آتے تھے۔ قاضی نوراللہ شوشتری نے بہت سی کتابیں بھی تصنیف کی تھیں جن میں سے چند کے نام یہ ہیں:

(1) حاشیہ علی البیضاوی۔ یہ بیضاوی کی تفسیر قرآن کی شرح ہے۔

(2) حاشیہ شرح الحدید علی التجرید۔ نصیرالدین طوسی کی تجرید الکلام کی شرح از قوشجی کا فرہنگ۔

(3) احقاق الحق وازہاق الباطل۔ فضل بن روز بہائی کی کتاب ابطال الباطل کے جواب میں سنی مذہب کے خلاف ایک مناظرانہ رسالہ ہے۔ روز بہائی کی یہ کتاب حسن بن یوسف بن علی الحلی کی تصنیف ''کشف الحق ونہج الصدق'' کی تردید میں لکھی گئی تھی۔

(4) مجالس المومنین۔ شیعہ مشاہیر کا تذکرہ ہے فارسی زبان میں۔ جو ابتدائے اسلام سے صفویہ خاندان کے برسر اقتدار آنے کے زمانے تک پر محیط ہے۔

شیخ فیضی کی بے نقط تفسیر پر انہوں نے سرنامہ (توقیع) لکھا تھا جو حد تعریف سے ماوراء ہے۔ شعر گوئی کا طبعی ملکہ بھی رکھتے تھے اور دلکش اشعار کہتے تھے۔ قاضی صاحب نے لاہور کے شر پسند مفتیوں اور مکار محتسبوں کو سیدھا کر کے رکھ دیا تھا۔

ملا جیون (م 1130ھ/1718ء)

ایک حنفی الصالحی، مشہور عالم دین فقیہ اور مفسر، اورنگ زیب عالمگیر کا استاد

ملا احمد بن ابی سعید بن عبیداللہ، ان کا دعویٰ تھا کہ وہ حضرت صالح کی اولاد میں سے ہیں۔ 1047ھ/ 1637ء میں لکھنؤ کے قریب امیٹھی میں پیدا ہوئے۔ اکیس برس کے تھے جب انہوں نے اپنی تفسیر الاحمدی مکمل کی۔ اللہ کی طرف سے انہیں غیر معمولی حافظ عطا ہوا تھا۔ چنانچہ انہوں نے صرف سات برس کی عمر میں قرآن کریم حفظ کر لیا تھا۔ انہوں نے اوائل عمر ہی میں پہلے محمد صادق الستر کھی سے اور پھر لطف اللہ کوڑا جہاں آبادی سے سولہ برس کی عمر میں عقلی اور نقلی علوم کی تکمیل کی۔ سرکاری مغلیہ تاریخ کے علاوہ ان کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ اورنگ زیب نے انہیں اپنے اساتذہ میں شامل کر لیا تھا اور ان وہ ان کی بہت عزت و تکریم کرتا تھا۔ یہ بھی امکان ہے کہ اورنگ زیب نے اپنی تخت نشینی کے بعد کچھ کتب اُن سے پڑھی ہوں، ملا صاحب نے یقیناً فقہ حنفی میں اعلیٰ قابلیت حاصل کی ہوگی کیونکہ اکیس برس کی عمر میں انہوں نے اپنی تصنیف تفسیر الاحمدی مکمل کر لی تھی۔ یہ ایسے احکام سے بحث کرتی ہے۔ جن کا ماخذ صرف قرآن مجید ہے۔ 1676ء میں وہ اجمیر اور دہلی کو روانہ ہوئے جہاں انہوں نے کافی عرصہ قیام کیا۔ 1690ء/ 1!02ھ میں وہ پہلی مرتبہ حج کے لیے عرب گئے۔ 1695ء میں ہندوستان واپس آ کر انہوں نے شاہی ملازمت اختیار کر لی اور چھ برس تک اورنگ زیب کے لشکروں کے ساتھ رہے۔

1700ء میں دوسری مرتبہ حج پر گئے اور 1704ء میں امیٹھی واپس آئے۔ دوسرس کے قیام کے دوران انہیں شیخ یاسین بن عبدالرزاق قادری سے خرقہ تصوف عطا ہوا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد شاہ عالم اول نے ان سے اجمیر میں 1707ء میں ملاقات کی اور انہیں ہمراہ لاہور لے گیا۔ شاہ عالم کی وفات کے بعد وہ دہلی لوٹے اور معلمی میں مشغول ہو گئے۔ انہوں نے اپنے آبائی شہر امیٹھی میں بھی ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ ان کا انتقال دہلی میں جامعہ مسجد میں اپنے زاویئے میں ہوا تھا تاہم انہیں ان کے آبائی شہر میں دفن کیا گیا تھا۔

ان کی تصنیفات میں التفسیر الاحمدیہ، نورالانوار، جو النسفی کی کتاب منار الانوار کی شرح ہے اور علم فقہ کی کتاب مناقب الاولیاء، اولیاء و مشائخ کے سوانح۔ یہ کتاب انہوں نے پیرانہ سالی میں لکھی تھی۔ آداب احمدی، تصوف اور صوفیہ کے مقامات پر ہے، شامل ہیں۔

سید عبداللہ غزنوی (م 1298ھ/1881ء)

غزنی سے ترک وطن کر کے امرتسر میں آباد ہونے والے عالم دین، محدث اور مفسر

سید عبداللہ غزنوی، غزنی کے ایک محدث عالم جنہیں اپنے عقائد کی بنا پر پہلے اپنے ملک میں اپنے شہر سے بدر ہونا پڑا اور بالآخر ہندوستان میں کچھ عرصہ دہلی میں قیام کرنے کے بعد پنجاب کے شہر امرتسر میں سکونت اختیار کی اور اسی شہر میں ان کا انتقال 1881ء میں ہوا۔ نزھۃ الخواطر میں ان کا شجرہ نسب کچھ یوں درج ہے۔ سید عبداللہ بن محمد بن محمد شریف الغزنوی الشیخ محمد اعظم۔ وہ 1230ھ/1815ء میں قلعہ بہادر خیل کے مقام پر جو غزنی کے مضافات میں واقع ہے پیدا ہوئے۔ سید عبداللہ غزنوی کے والد بزرگوار اور جد امجد کا شمار بھی اولیاء صالحین امت میں ہوتا تھا۔

ابتداء میں علمائے غزنی سے پڑھتے رہے اور علوم متداولہ کی تحصیل بھی وہیں کی۔ ان کی تیز فہمی اور سلامتی فکر پر لوگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ تفسیر و حدیث سے انہیں والہانہ شغف تھا۔ غزنی میں اس زمانے میں کوئی ایسا عالم نہیں تھا جس سے آپ نے اکتساب نہ کیا ہو۔ پھر اکتساب علم کے لیے حبیب اللہ قندھاری کی خدمت میں قندھار حاضر ہوئے۔

ایک بار وہ اپنے دادا کی قبر پر گئے جو اس علاقے میں مرجع خلائق تھی تو انہیں القاء ہوا "لا الہ غیرک" انہوں نے گمان کیا کہ یہ ورد وظیفہ کے لیے سکھایا گیا ہے لیکن بعدازاں ایقان ہوا کہ وہ اللہ کی طرف سے اشارہ تھا کہ اس کے سوا کسی دوسرے کی طرف رجوع کرنا یا استعانت طلب کرنا شرک ہے۔ پھر یہ خیال ان کے دل میں راسخ ہو گیا کہ بزرگوں کے مزاروں پر اس خیال سے جانا کہ کوئی مطلب حاصل ہو جائے توحید میں رخنہ ڈالتا ہے اور کلمہ شہادت کے منافی ہے۔ ابتدائے سلوک میں جو جذب کی کیفیت طاری ہوئی مخلوق سے گریزاں ہو گئے اور خواجہ ہلال پہاڑ کے ویرانے میں اقامت گزیں ہو گئے۔ پھر جب انہوں نے خالص توحید اور اتباع سنت کی طرف لوگوں کو دعوت دی اور بدعات کے خلاف آواز اٹھائی تو انہیں کابل سے نکال دیا گیا اور دہلی آ گئے۔ 1857ء کے ہنگاموں میں وہ امرتسر آ گئے اور یہیں وفات پائی۔ برصغیر میں علمائے اہل حدیث میں اولین تھے اور انہیں نے اس مسلک کی بنیاد رکھی تھی۔

امام آیت اللہ خمینی (م 1989ء)

امام العصر، شیعی مجتہد و انقلابی راہنما، بانی جمہوریہ اسلامی ایران

ایران کے مذہبی راہنما اور بانی اسلامی جمہوریہ ایران آیت اللہ روح اللہ موسوی خمینی 24 ستمبر 1902ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق خمین سے تھا۔ ایران، عراق میں دینی علوم کی تکمیل کی۔ 1960ء میں وہ ایک سیاستدان کی حیثیت سے ابھرے۔ ان دنوں شاہ ایران نے سفید انقلاب کے نام سے جو معاشرتی و اقتصادی پروگرام وضع کیا تھا انہوں نے اس کی شدید مخالفت کی۔ شاہ نے عوام کی مخالفت سے بچنے کے لیے اسے یہ رنگ دیا کہ آیت اللہ سفید انقلاب کے خلاف ہیں اور وہ بڑے زمینداروں سے زمین چھیننے کے حق میں نہیں اور نہ ہی وہ خواتین کو مساویانہ حقوق دینے پر رضامند ہیں۔ پھر جب شاہ ایران کے خلاف انہوں نے آواز اٹھائی تو 1964ء میں انہیں ملک بدر کر دیا گیا۔ امام آیت اللہ خمینی نے عراق میں نجف اشرف کے مشہور دینی مرکز میں قیام کیا لیکن بعدازاں 1977ء میں انہیں دیار غیر فرانس میں پناہ لینا پڑی۔ 1978ء میں انہوں نے فرانس میں قیام کے باوجود ایران میں بادشاہت کے خاتمہ اور جمہوریت کے بول بالا کے لیے، اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے تحریک چلائی جس کے نتیجے میں بالآخر شاہ کو ایران چھوڑنا پڑا اور اسلامی انقلاب ایران کے بعد فروری 1979ء

میں وہ وطن واپس آگئے اور انہوں نے ایران کی قیادت سنبھال لی اور 1989ء میں وفات پائی۔ امام آیت اللہ خمینی جدید دور کے کثیر التصانیف مصنف تھے۔ ان کی اہم تصانیف یہ ہیں:

(1) شرح دعائے سحر (عربی)

(2) مصباح الھدایۃ ال الخلافۃ الولایۃ (عربی)

(3) لقاء اللہ

(4) سر الصلوٰۃ صلاۃ العارفین یا معراج السالکین۔

(5) تعلقیہ علیٰ شرح فصوص الحکم (عربی)

(6) تعلیقہ علیٰ مصباح الانس

(7) تعلیقہ علیٰ شرح حدیث رائس الجالوت

(8) تفسیر سورۃ حمد

(9) الحاشیہ علی الاسفار

(10) آداب الصلاۃ

(11) مبارزہ بانفس جہاد اکبر

(12) شرح حدیث جنود عقل وجہل

(13) شرح اربعین

الشاہ احمد نورانی (م 2003ء)

عالم دین، مبلغ اسلامی، سیاستدان اور ایک ہر دلعزیز شخصیت

1926ء میں میرٹھ، یوپی بھارت میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شاہ عبد العلیم صدیقی بلند پایہ عالم دین و مبلغ اسلام تھے۔ شاہ احمد نورانی بڑے ذہین تھے انہوں نے صرف آٹھ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ بیس سال کی عمر میں مدرسہ اسلامیہ قومیہ میرٹھ سے درس نظامی کی سند فضیلت حاصل کی۔ بعد ازاں نیشنل عربک کالج سے بی اے کیا۔ 1949ء میں ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔ اس کے ساتھ ہی اندرون ملک اور بیرون ملک تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔

1970ء میں ہونے والے عام انتخابات میں کراچی کے حلقے سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور اسمبلی میں جمعیت علما اسلام پاکستان کے پارلیمانی گروپ کی قیادت کی۔ مئی 1973ء میں بالاتفاق آپ کو جمعیت علمائے پاکستان کا صدر چنا گیا۔ جمعیت کو خالص مذہبی جماعت کی سطح سے اٹھا کر ملک کی معروف سیاسی جماعت بنانے میں آپ نے اہم کردار ادا کیا۔ اردو، فارسی، عربی، انگریزی، فرانسیسی اور سواحلی زبانوں پر آپ کو کامل دسترس حاصل تھی۔

علامہ احمد سعید کاظمی صاحب نے 1940ء میں جمعیت علما پاکستان کی بنیاد رکھی تھی۔ 1973ء میں آپ نے اس جماعت کی قیادت قبول کی اور اس کے پلیٹ فارم سے بعد ازاں وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کے مدمقابل وزیر اعظم کے عہدے کے انتخاب میں حصہ لیا۔ آپ تادم مرگ اس جماعت کے سربراہ رہے۔ 1977ء میں چلنے والی تحریک نظام مصطفیٰ میں فعال ہونے کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔

مولانا نے دنیا بھر میں اسلام کا پیغام عام کرنے کے لیے 1972ء میں ورلڈ اسلامک مشن کی بنیاد رکھی تھی اور مختلف ممالک میں اس کے دفاتر قائم کر کے اسے فعال بنا دیا تھا۔ مولانا شاہ احمد نورانی ہی وہ شخصیت تھے جنہوں نے 30 جون 1974ء کو قومی اسمبلی میں قادیانیوں کے خلاف بل پیش کیا تھا۔ آپ ہی کے ایما پر دعوت اسلامی کی بنیاد رکھی تھی۔ دل کا دورہ پڑنے سے آپ نے 11 ستمبر 2003ء کو انتقال کیا۔

مصنّفین و شعرائے کرام

مصنّفین

الجاحظ	الاصمعی	ابوالعلا
بیہقی	ابن منظور	ابوالفداء
ابن الندیم	حاجی خلیفہ	ابوالفضل علامی
میر امن	سر سید احمد خان	مولوی عبدالحق
مولانا ظفر علی خاں	مولانا غلام رسول مہر	ممتاز مفتی
مرزا ابن حنیف	ریاض قادری	

شعرائے کرام

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ	الفرزدق	ابن عبدربہ
ابوالقاسم فردوسی	امام البوصیری	مولانا روم
شیخ سعدی	حافظ شیرازی	امیر خسرو
مولانا عبدالرحمٰن جامی	میر تقی میر	مومن
غالب	ذوق	اکبر الٰہ آبادی
علامہ اقبال	فیض احمد فیض	صوفی تبسم
ساحر لدھیانوی	احمد ندیم قاسمی	احمد فراز
مظفر وارثی	خطاط نقاش و معمار	ابن البواب
یاقوت المستعصمی	بہزاد	معمار سنان ترک
قاسم آغا	احمد معمار	عبدالصمد شیریں قلم
عبدالمجید پروین رقم	ملک عاشق ملتانی	عبدالرحمٰن چغتائی
صادقین	خادم انسانیت	عبدالستار ایدھی
انقلابی و مصلح	امام ابن تیمیہ	الشیخ محمد بن عبدالوہاب

جمال الدین افغانی	مصطفیٰ کمال پاشا	احمد اعرابی پاشا
جنرل عبدالکریم قاسم	ڈاکٹر مصدق	حواری بومدین
رفیق الحریری	حسنی الزعیم	جمال عبدالناصر
کرنل محمد قذافی	حبیب بورقیبہ	احمد بن بیلا

الجاحظ (م255ھ/868ء)

ابوعثمان عمرو بن بحر الفقیمی البصری، مشہور عربی نثر نگار اور فاضل مصنف

الجاحظ کتب ادب کے علاوہ معتزلی الٰہیات اور سیاسی رنگ کے مباحث پر لکھنے والا تھا۔ 160ھ/776ء میں وہ بمقام بصرہ پیدا ہوا۔ وہ بنوکنانہ کے ایک گمنام موالی خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو حبشی الاصل تھا۔ اس کا لقب جاحظ اس وجہ سے پڑا تھا کہ وہ بڑی آنکھوں اور ابلے ہوئے ڈھیلوں والا تھا۔ بچپن کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شروع ہی سے پڑھنے کے لیے بے پایاں شوق رکھتا تھا۔ وہ شروع ہی سے مسجدوں میں ان لوگوں کے پاس جا بیٹھتا تھا جو مختلف مسائل پر بحث کرتے تھے۔ مربد میں تحقیق لسانی کی جو مجلسیں منعقد ہوتی تھیں وہ بھی اس کی توجہ خاص کا درجہ رکھتی تھیں۔ فقہ، لغات، علم لسانیات اور شعر وادب کے فاضل ترین علمائے عصر، مثلاً اصمعی، ابوعبیدہ اور ابوزید کے حلقہ درس بھی اس کی پسندیدہ محفلیں تھیں۔ رفتہ ان محفلوں میں شرکت نے اسے عربی زبان کا ماہر بنا دیا۔ اس کی غیر معمولی ذہانت نے اسے بچپن ہی میں معتزلہ عالموں اور امراء کے حلقوں میں روشناس کرا دیا تھا۔ جہاں ان مسائل پر اکثر بحث ہوتی تھی جن کا اس زمانے میں مسلمانوں کو سامنا تھا۔ مثلاً الٰہیات کے مسائل میں مذہب اور عقل کی مطابقت کا مسئلہ، جسے عباسیوں کے مخالفین برابر ہوا دیتے تھے۔ اسلامی فرقوں کے اختلافی مسائل اور غیر عرب قوموں کے دعاوی۔ اس نے مخلوط آبادی میں رہ کر وہاں کے مختلف عناصر کا گہرا مطالعہ کیا جس سے فطرت انسانی کے متعلق اسے وسیع معلومات حاصل ہو گئیں۔ پھر بغداد میں اسے علم کے ایک بیش بہا خزانہ سے مستفید ہونے کا موقع ملا جو یونانی علوم کی کتب کے عربی ترجمے کی شکل میں وہاں موجود تھا اور خلیفہ المامون کے عہد میں کیا گیا تھا۔ زندگی کے آخری ایام میں جبکہ اس کا آدھا دھڑ مفلوج ہو گیا تھا وہ بغداد سے واپس بصرہ آ گیا تھا اور وہیں اس نے محرم 255ھ/ دسمبر 868ء میں وفات پائی۔ بہت سے دیگر عرب مصنفوں کی طرح جاحظ نے بھی کثیر تعداد میں کتب لکھیں۔

اس کی تصانیف میں اہم ترین کتاب الحیوان ہے جو ارتقائے انواع، آب و ہوا کے اثرات اور حیوانات کی نفسیات پر لکھی گئی ہے اور فی زمانہ دستیاب ہے۔

الاصمعی (م213ھ/828ء)

نامور ماہر لسان عربی اور نحوی، عالم دین

ابوسعید عبدالملک بن قُریب الاصمعی، ماہر لسان العربی، اس کی تاریخ پیدائش اکثر اوقات 123ھ/ 741ء بتائی جاتی ہے۔ اصمعی اس کے آباؤ اجداد میں سے ایک سے ماخوذ ہے۔ حیرت انگیز حافظہ اور غیر معمولی تنقیدی طبیعت الاصمعی کی امتیازی شان بتائی گئی ہے۔ وہ سوار ہو کر علم اللغت کی بابت معلومات حاصل کرنے کے لیے بدویوں کے پاس دیہات جایا کرتا تھا تاکہ ان کے منہ سے عربی کے کلاسیکل اشعار کے قطعات سن کر جمع کرے۔ ابھی وہ جوان ہی تھا کہ طالبان علم اس کی

تلاش میں رہنے لگے اور اس وقت اس کی مجلس دور دور تک مشہور ہو چکی تھی۔ علم اللسان کے مختلف شعبوں میں سے اس کا ذہن علم اللغت سے بے حد مطابقت رکھتا تھا۔ جن حالات میں الاصمعی بغداد آیا اور اس نے ہارون الرشید کے دربار میں رسائی پائی ان کی بابت چند روایات پائی جاتی ہیں جن میں سے ایک المرزبانی نے یوں بیان کی ہے کہ وہ بصرے میں قیام کے دوران خلیفہ سے مل چکا تھا۔ محمد الامین نے اپنی ولی عہدی کے زمانے میں اسے بغداد بلا بھیجا اور وزیر الفضل بن ربیع نے اسے خلیفہ سے ملا دیا۔ ادھر برمکی خاندان نے بھی اسے بہت نوازا، تاہم جب برمکیوں کا زوال شروع ہوا تو الاصمعی ان کی ہجو کرنے سے نہیں چوکا۔ الاصمعی کی رائے میں درباری شاعر اسحٰق بن ابراہیم الموصلی اس کا مدمقابل تھا اور اپنی ظرافت طبع کی بدولت خلیفہ سے زیادہ انعام پاتا تھا۔ ادھر الاصمعی بھی ہنسانے والی کہانیاں سنا کر خلیفہ کا دل بہلایا کرتا تھا۔ الاصمعی نے اپنی تصنیفات میں البتہ ایسا تنقیدی رویہ اختیار کیا جو اس زمانے کے لحاظ سے جاذب توجہ تھا۔ اس نے زمانہ قبل از اسلام اور ابتدائے اسلام کے شعراء کے بہترین قطعات اپنے مجموعہ اشعار اصمعیات میں جمع کیے تھے۔ الاصمعی نے اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے رسالے تصنیف کیے تھے جن کے نام ''الفہرست'' میں دیئے گئے تھے۔ الاصمعی نے 213ھ/828ء میں وفات پائی۔

ابو العلا المصری (م 449ھ/1057ء)

احمد بن سلیمان ابو العلاء المصری، مشہور نابینا، عرب شاعر، فلسفی اور مصنف

وہ معرۃ النعمان میں پیدا ہوا۔ تاریخ کے مشہور قبیلے سے اس کا تعلق تھا۔ المصری کی عمر ابھی صرف چار برس تھی کہ چیچک کے حملے سے اس کی بائیں آنکھ جاتی رہی اور پھر کچھ مدت بعد وہ دوسری آنکھ سے بھی محروم ہو گیا۔ یہ ایک ایسا حادثہ تھا جس سے اس کے افکار اور اشعار نے بڑا اثر قبول کیا اور وہ زندگی بھر احساس کمتری کا شکار رہا۔ تاہم اس نے بلا کا حافظہ پایا تھا اور ایسا فوق العادۃ کہ اس پر حیران ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ یہ اس کا حافظہ ہی تھا جس نے بصارت سے محروم کے باوجود اس کی تصانیف میں حد سے زیادہ وسعت اور تنوع پیدا کر دیا تھا۔ ابو العلاء نے مصیبت اور کشمکش کا زمانہ پایا۔ حمدانی حکومت جو معرۃ النعمان میں قائم تھی فاطمیوں اور بوزنطینیوں کے حملوں کی وجہ سے اپنی شان و شوکت اور عظمت کھو چکی تھی۔ صالح بن مرداس نے اس موقع کو غنیمت جان کر بغاوت کی اور 1012ء میں معرۃ النعمان کا محاصرہ کر لیا۔ اس زمانے میں دار الحکومت بغداد کی حالت بھی کچھ اچھی نہیں تھی وہاں آل بویہ کا راج تھا۔ 1008ء میں ابو العلاء نے بغداد کا سفر کیا۔ جس کے سبب کا پتہ نہیں چلتا۔ بغداد میں اس کا قیام ایک سال سات مہینے رہا۔ کہتے ہیں اہل بغداد کو الوداع کہتے ہوئے اس نے ایک قصیدہ بھی لکھا تھا۔ اپنی والدہ کی وفات کے بعد ابو العلاء نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور گوشت انڈے اور دودھ کا استعمال چھوڑ دیا۔ جب صالح بن مرداس نے معرۃ النعمان کا محاصرہ کیا تو اہل شہر نے ابو العلاء کو اس کے پاس سفارش کے لیے بھیجا۔ مرداس نے بظاہر اس کے احترام میں محاصرہ اٹھا لیا اور شہر کا نظم و نسق بھی اسی کے حوالے کر دیا۔ ناصر خسرو نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ معرۃ النعمان میں ایک شخص جس کا نام ابو العلاء المعری تھا وہ وہاں کا رئیس تھا۔ ابو العلاء کی تصانیف بے شمار ہیں جو اس نے نابینا ہونے کی وجہ سے املا کرائیں۔ منظوم تصانیف میں ''سقط الزند'' مشہور ہے۔ اس کے علاوہ ''الدرعیات''، ''اللزومیات'' اور منثور التصانیف بہت مشہور ہیں۔ ابو العلاء المصری نے 449ھ/1057ء میں وفات پائی۔

بیہقی (م 565ھ/1169ء)

ظہیر الدین ابو الحسن علی بن زید بن فندق ایک ایرانی فاضل اور کثیر التعداد کتابوں کا مصنف

ایرانی مصنف سبزوار میں 493ھ/1100ء میں پیدا ہوا۔ اس کی کثیر التعداد تصانیف (ستر سے زائد) میں سے زیادہ مشہور یہ ہیں۔ تاریخ بیہق (یہ تاریخی بیہقی سے الگ ہے) صوان الحکمۃ کا فارسی ترجمہ ہے۔ البیہقی اپنا شجرہ نسب ایک صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ سے ملاتا ہے۔ اس کا یہ دعویٰ بھی تھا کہ وہ مورخ طبری کے عزیزوں میں سے ہے۔ اس نے اعلیٰ تعلیم نیشاپور اور مرو میں حاصل کی اور زیادہ تر زندگی خراسان میں گزاری۔ تھوڑی مدت کے لیے وہ بیہق کا قاضی بھی مقرر ہوا تھا۔ پھر مشرف المملکۃ ہو گیا مگر اس عہدے پر اسے فرائض کی ادائیگی مشکل نظر آئی اس لیے وہ جلد ہی مستعفی ہو گیا۔ کچھ عرصہ اس نے مشہور شہر رے میں الجبرا اور علم نجوم کا مطالعہ کیا۔

507ھ/1113ء میں وہ اپنے والد کے ساتھ عمر خیام سے ملاقات کرنے کے لیے گیا تھا۔ اس کی زندگی کا ایک اور واقعہ مورخین نے یہ درج کیا ہے کہ خراسان میں سلجوقی بادشاہ سلطان سنجر کے دربار میں گرجستان کے عیسائی بادشاہ DEMERI کی طرف سے ایک قاصد کچھ سوالات لے کر پہنچا جو عربی اور سریانی زبانوں میں لکھے ہوئے تھے۔ بظاہر یہ سوالات دینی مباحث سے متعلق ہوں گے مگر اہل دربار میں سے ان کا جواب کوئی نہ دے سکا اس لیے سلطان نے بیہقی کو ان کے جوابات دینے کا حکم دیا اور اس نے دونوں زبانوں میں ان سوالات کے جوابات دیا۔ یہ واقعہ البیہقی نے خود اپنی سوانح میں بیان کیا ہے۔

یاقوت کے مطابق البیہقی کی وفات 565ھ/1169ء میں ہوئی تھی۔ البیہقی کے انتخاب اشعار و شاح الدمیۃ کے کچھ حصوں کا پتہ چلتا ہے جسے باخرزی کی دمیۃ القصر کا تکملہ کہا گیا ہے۔ فقہی علوم پر اور علم نجوم پر فارسی میں البیہقی کا ایک رسالہ جوامع الاحکام کیمبرج یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ ایک زمانے میں اس کا خلاصہ بھی موجود تھا۔

البونی (م622ھ/1225ء)

پراسرار علوم، سحر و طلسمات، کہانت اور غیب دانی کا مختار عرب مصنف، صاحب ''سر الحکم''

محی الدین ابوالعباس احمد بن علی البونی کا شمار پراسرار علوم (سحر و طلسمات) کے اہم ترین عرب مصنفین میں ہوتا ہے۔ اس نے 622ھ/1225ء میں وفات پائی۔ وہ کہانت اور غیب دانی کے موضوع پر کتاب ''سر الحکم'' کا مصنف ہے اور اس نے بسملۃ کے فضائل اور اسمائے حسنیٰ و حروف ابجد پر بھی چھوٹی چھوٹی کتابیں تصنیف کیں ہیں۔ ان رسائل میں کراماتی تعویذوں، پراسرار حروف اور دیگر طلسماتی علامتوں کا ذکر ہے۔

ان مسلمانوں میں جو جادو اور تعویذوں کا کاروبار کرتے ہیں البونی کی تصانیف آج بھی مستعمل ہیں۔ مغرب میں بعض مصنفوں نے ان کتابوں سے بہت کام لیا ہے۔ مثلاً REINAUD نے دو جلدیں اس کام پر شائع کیں جن میں سحر زدگی پر بحث کی گئی ہے۔

جادو پر ایک دلچسپ مخطوطہ جو پیرس کی قومی لائبریری میں محفوظ ہے، جزوی طور پر البونی کی تصانیف پر مبنی ہے۔ اس کتاب میں البونی کا حوالہ صریحاً غلطی سے شرف الدین کے نام سے دیا گیا ہے۔

ابن منظور (م711ھ/1311ء)

ابن منظور، ابوالفضل جمال الدین محمد بن مکرم، امام نحو و لغت، عالم تاریخ و کتابت صاحب لسان عرب

ابن منظور کا تعلق حضرت رویفع ابن ثابت صحابی کے خاندان سے تھا۔ وہ مصر کے بڑے معزز اور علم دوست

گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ حدیث میں حفظ اور علو اسناد کی انفرادیت کا درجہ نہ حاصل کر سکے۔ نحو و لغت کے امام اور تاریخ و کتابت کے جید عالم تھے۔ تاریخ و ادب میں ان سے بہت سی تالیفات یادگار ہیں۔ ان کے بیٹے قاضی قطب الدین نے الصفدی سے کہا تھا کہ ابن منظور نے پانچ سو کتابیں اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی چھوڑی تھیں۔ مصر میں وہ کاتب الانشاء الشریف کے فرائض انجام دیتے تھے اور ایک عرصہ مکہ میں مقیم رہے۔ الصفدی کا قول ہے کہ کتب ادب میں مجھے کوئی ایسی کتاب یاد نہیں جس کا اختصار ابن منظور نے نہ کیا ہو۔

ابن منظور کا گراں مایہ شاہکار عربی زبان کی ضخیم ترین اور اہم ترین لغت ''لسان العرب'' ہے، جو 689ھ میں پایہ تکمیل کو پہنچی تھی۔ مؤلف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ الصفدی نے قاہرہ میں دیکھا تھا، جس پر اس عہد کے اکابر اہل علم، مثلاً علامہ اثیر الدین ابوحیان وغیرہ کی تقریظات مندرج تھیں۔

محققین نے لکھا ہے کہ اگرچہ ابن منظور نے اس کتاب کی تالیف کے لیے بدوی لوگوں سے الفاظ کے معنی اور مطالب معلوم کرنے کی غرض سے کوئی سفر صحرا نہیں کیا بلکہ قدیم لغات کے متفرق اور غیر منظم ذخیرہ معلومات کو بڑے سلیقے اور قرینے سے اور شرح و بسط سے جمع کر دیا ہے۔ ابن منظور کے سیرت نگاروں نے ابن درید کی جمهرة اللغة کو بھی لسان العرب کے مصادر میں شامل کیا ہے۔ تاہم جمهرہ کی جو روایات لسان العرب میں مندرج ہیں وہ المحکم سے ماخوذ ہیں جو ابن سیدة کی تصنیف ہے۔ لسان العرب عربی زبان کی سب سے بڑی لغت ہی نہیں بلکہ قدیم اشعار کا نادر مجموعہ بھی ہے۔ اس میں کم و بیش 1300 شعراء کے نام اور چالیس ہزار اشعار محفوظ ہو گئے ہیں۔

ابوالفداء (732ھ/1331ء)

اسماعیل بن علی بن محمود، مورخ، جغرافیہ دان اور تقویم البلدان اور تاریخ بشر کا مصنف

اس کا تعلق آل ایوب کے شاہی خاندان سے تھا۔ وہ 1273ء میں دمشق میں پیدا ہوا۔ 12 سال کی عمر میں اپنے والد اور ابن عم الملک المظفر محمود ثانی امیر حماۃ کے ساتھ مرقب کے محاصرے اور تسخیر میں شریک تھا۔ صلیبیوں کے خلاف اس نے بعد کے معرکوں میں بھی شرکت کی۔ 1299ء میں جب حماۃ کی ایوبی ریاست ختم کر دی گئی تو ابوالفداء نے مملوک کی ملازمت اختیار کر لی۔ مملوک بادشاہ الملک الناصر محمد بن قلادون کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہا۔ 1310ء میں اسے امیر عرب مہنا شیخ آل فضل کے کہنے پر حماۃ کا عامل مقرر کیا گیا۔ 1320ء میں اس نے سلطان محمد کی معیت میں حج کا سفر کیا۔ جب یہ دونوں قاہرہ واپس آئے تو 17 محرم 720ھ/ 28 فروری 1320ء کو اسے نشانات سلطنت اور الملک المؤید کا لقب عطا ہوا۔ اس پر سلطان کی عنایات کا سلسلہ تادم آخر جاری رہا۔ اس نے 23 محرم 732ھ/ 27 اکتوبر 1331ء کو وفات پائی۔ دینی اور ادبی مباحث پر اس کی بہت سی تصانیف تھیں جن میں سے زیادہ تر تلف ہو گئیں۔ اس کی شہرت کا دار و مدار اس کی دو تصانیف پر ہے۔ ان میں سے ایک اس کی ''تاریخ البشر'' ہے جو ایک عمومی تاریخ ہے۔ اس کے ابتدائی حصے ابن الاثیر کی تاریخ کامل سے لیے گئے ہیں۔ اس تاریخ کو اس کے زمانے میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ اس کی دوسری مشہور تصنیف ''تقویم البلدان'' وصفی جغرافیے کی کتاب ہے، جس میں طبیعی اور ریاضی معلومات کا اضافہ جدولوں کی شکل میں کیا گیا ہے۔ یہ کتاب 721ھ/ 1321ء میں اتمام کو پہنچی تھی اور بڑی حد تک اس تصنیف نے اپنی پیشرو جغرافیے کی تصانیف کی جگہ لی تھی۔

ابن الندیم (م385ھ)

ابن الندیم کی ''الفہرست'' کتابیات اورتراجم کے بارے میں خاص شہرت کی حامل ہے

محمد بن سحاق ابی الیعقوب الندیم، ابن الندیم کے نام سے مشہور ہے۔اس کی کنیت ابوالفتح یاابوالفرج تھی۔اس کا مسکن بغداد تھا۔یہ شخص وراق تھایعنی کتابوں کی تصحیح وترتیب اور نقل وفروخت کرتا تھا۔اس زمانے میں اس کا یہ پیشہ ایک معزز پیشہ سمجھا جاتا تھا۔اس کے شب وروز اپنے اسی پیشے کی وجہ سے مختلف النوع مضامین پر مشتمل کتابوں کی صحبت ورفاقت میں بسر ہوتے تھے۔اس لیے کتابوں کے بارے میں اس کا علم بہت وسیع تھااوروہ ہرفن کی کتابوں اوران کے مصنفین کے بارے میں کامل علم وآگاہی رکھتا تھا۔اس کی کتاب الفہرست چوتھی صدی ہجری کے اواخریعنی مصنف کی زندگی تک کے علوم وفنون کا خزانہ ہےاوراس دور کے تہذیبی وتمدنی سرمایہ علمی کی آئینہ دار ہے۔اس میں بتایا گیا ہے کہ اس دور میں دنیا کے مختلف گوشوں میں کون سی زبانیں رائج تھیں۔ان کا رسم الخط کیا تھااوروہ کیونکر معرض وجود میں آئی تھیں،اوران کے مشہور خطاط اور کاتب کون لوگ تھے۔

اس کتاب میں قرآن مجید کے نزول،اس کی جمع وتدوین،قراء،مفسرین اورمشہور کاتبین قرآن کے بارے میں معلومات دی گئی ہیں۔فقہائے حنفیہ،فقہائے شافعیہ،فقہائے حنبلیہ اورفقہائے مالکیہ،اصحاب الحدیث،اہل ظواہر،فقہائے شیعہ،فلاسفہ یونان اوران کی تصانیف،طب کا آغاز۔یوں کہنا چاہیے کہ یہ کتاب علوم انسانی کی پہلی کیٹلاگ اورفہرست کتب و مصنفین ہے۔

تاہم یہ ایک بڑا تاریخی سانحہ ہے کہ جس شخص نے علوم وفنون کی اتنی بڑی خدمت کی اور مختلف مصنفین ومؤلفین کو دنیا سے روشناس کرایاان کی تصنیفات کی چہرہ کشائی کی اورتمام علوم وفنون کی کتب کا تعارف کرایا خوداس کی زندگی پردہ اخفاء میں ہے۔تاریخ یہ تک نہیں بتاتی کہ وہ کس خاندان کا فرد تھا؟ کہاں پیدا ہوا؟ صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ اس نے 20 شعبان 385ھ کووفات پائی اوروہ مذہباً شیعہ تھا۔

حاجی خلیفہ (م871ھ/1466ء)

مصطفیٰ بن عبداللہ معروف بہ کاتب چلپی،ایک مشہورترک عالم اور مصنف ''کشف الظنون''

المعروف بہ کاتب چلپی،ایک مشہورترک مصنف جو1017ھ/1608ء میں قسطنطنیہ میں پیدا ہوا۔چودہ سال کی عمر میں فوج میں بھرتی ہوگیا۔اسے اناطولیہ کے دفتر محاسبہ میں ایک میرمنشی کی جگہ مل گئی۔

وہ1033ء سے1045ء تک مختلف مہمات میں لشکر سلطانی کے ہمراہ ایشیائے کوچک کی مشرقی سرحد پر مقیم اور مہمات میں شریک رہا۔اس نے ایرانیوں کے خلاف بغداد کے ناکام محاصرے میں بھی شرکت کی۔دسمبر1628ء میں وہ شاہی فوج کے ہمراہ قسطنطنیہ واپس آگیااورفوج کے انتظامی دفتر میں منشی مقرر ہوا۔جس سے وہ بالآخر1645ء میں مستعفی ہوگیااور بعدازاں بطور معاون،خلیفہ کے اس نے ملازمت کرلی اوراسی وجہ سے حاجی خلیفہ کے نام سے مشہور ہوا۔اس کا انتقال قسطنطنیہ میں ستمبر1657ء میں ہوا۔اس کی علمی تصانیف بہت اہم ہیں۔

(1) فذلکہ: تقریباً ڈیڑھ سوحکمران خاندانوں کی مختصر تاریخ ہے۔یہ مورخ الجنابی کی تاریخ سے ماخذ ہے۔حاجی خلیفہ کی یہ تاریخ عربی میں ہے۔حاجی خلیفہ نے اپنی اس تصنیف کا ذکراپنی قاموس المشاہیر میں کیا ہے۔

(2) ''تقویم التاریخ'' جو تاریخی جدولوں پر مشتمل ہے۔ 1058ھ میں مکمل ہوئی۔ اس میں ابتدائے آفرینش سے لے کر 1058ھ کے واقعات مذکور ہیں۔ یہ فارسی زبان میں ہے۔

(3) جہاں نما، یعنی بیان کائنات یا احوال عالم۔ اس کی طبع اول 1058ھ میں ہوئی۔

(4) مسلم الوصول الی طبقات الفحول یعنی قاموس الشاہیر عربی میں ہے۔ یہ قسطنطنیہ میں کتاب خانہ شہید علی پاشا میں موجود ہے۔

(5) ''کشف الظنون عن اسامی الکتب الفنون'' یہ حاجی خلیفہ کی سب سے مشہور اور اہم تصنیف ہے جو ایک انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اس نے یہ کتاب بیس سال میں تصنیف کی تھی۔ دیگر اہم کتب میں لوامع النور فی ظلمۃ اطلس مینور شامل ہے۔

ابوالفضل علامی (1011ھ/1602ء)

مغل شہنشاہ اکبر کا مقرب خاص، صاحب طرز انشاپرداز، مصنف اکبر نامہ، آئین اکبری اور انشائے ابوالفضل شیخ ابوالفضل علامی، اپنے زمانے کے مشہور عالم شیخ مبارک ناگوری کا دوسرا بیٹا تھا۔ جبکہ اس کا بھائی شیخ فیضی تھا۔

شیخ ابوالفضل 6 محرم 958ھ کو بمطابق 14 جنوری 1551ء کو پیدا ہوا۔ اس کے والد ایک معلم دینیات تھے۔ اس نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور پندرہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گیا۔ مغل شہنشاہ اکبر کے دربار میں ابوالفضل کی رسائی 1574ء میں ہوئی اس کے اس کے بھائی فیضی نے دربار اکبری میں متعارف کرایا تھا۔ رفتہ رفتہ اسے اتنا قرب سلطانی نصیب ہوا کہ وہ دیگر تمام اہل دربار کی بہ نسبت اکبر کے بہت قریب ہو گیا۔ ابتداء میں اسے منشی گیری کی خدمات سپرد کی گئی تھیں لیکن پھر وزیر کے عہدے پر فائز کر دیا گیا تھا۔ اور آخر میں صدر الصدور کے عہدے کو پہنچ گیا تھا۔

ابوالفضل نے اکبر کے مذہبی عقائد میں اچھا خاصا دخل پیدا کر لیا تھا۔ اکبر کے ذہن میں اس نے یہ بات ڈالی تھی کہ مذہب کے متعلق اس کے نظریات معاصر علماء سے کہیں افضل و برتر ہیں۔ شاید انہیں نظریات کی بناپر اکبر کو نیا مذہب دین الٰہی ایجاد کرنے کا شوق چرایا تھا۔ درباری اکبری میں ابوالفضل کا اثر ونفوذ اتنا بڑھا کہ دیگر درباری اس سے حسد کرنے لگے تھے۔ جب شہزادہ سلیم نے سرکشی اختیار کی تو ابوالفضل کو جسے پہلے دکن بھیج دیا گیا تھا اب واپس بلایا گیا مگر شومئی قسمت سے راستے میں اسے سردار راجہ بیر سنگھ دیو بندیلہ نے گوالیار سے تین کوس کے فاصلے پر روک کر 22 اگست 1602ء کو قتل کر دیا۔ یاد رہے کہ بندیلہ شہزادہ سلیم کا حامی تھا۔ اس واقعہ سے اکبر کو دلی صدمہ پہنچا تھا۔

ابوالفضل کی تصانیف میں ''اکبر نامہ'' سب سے اہم تصنیف ہے جو اکبر کے بزرگوں کی مختصر اور عہد اکبری کی ایک مبسوط تاریخ ہے۔ اس کی دوسری اہم تصنیف '' آئین اکبری'' ہے۔ اس کتاب میں دربار اور جرم سزا، متوطین اور متعلقین دربار، سال الٰہی، مالیات، اہل ہنود کا ادب، ہندوستان پر بیرونی حملہ آور، سیاح اور مسلمان صوفیاء جیسے عنوانات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔

میرامن (حیات 1221ھ/1806ء)

اردو کے ابتدائی ادیب اور مصنف باغ و بہار وغیرہ

میرامن نام، تخلص لطف، وطن دہلی۔ ان کے آباؤ اجداد ہمایوں کے عہد میں ہندوستان اور پشت در پشت مغلیہ سلطنت میں انتظامی امور کی خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کی خدمات کے صلے میں وہ جاگیر و منصب کے حقدار بنے اور

دہلی کے امراء اور معززین میں شمار ہوئے۔ میر امن دہلی میں پیدا ہوئے اور یہیں پرورش پائی۔ تاریخ پیدائش کا پتہ نہیں چلتا۔ کوئی تیس چالیس سال تک دہلی ہی میں رہے۔ شاہان مغلیہ کا زوال وانحطاط اپنی آنکھوں سے دیکھا، جب 1756ء میں احمد شاہ ابدالی نے دہلی کو تاراج کیا اور سورج مل نے دہلی کے بہت سے امیروں کی جائیدادیں ضبط کرلیں تو امراء اور شرفاء دہلی چھوڑ کر بھاگے۔ میر امن نے بھی ان حالات میں وطن عزیز کو خیرآباد کہا اور عظیم آباد (پٹنہ) میں رہائش اختیار کی مگر وہاں فراغت میسر نہ آئی اور وہ روزگار کی تلاش میں کلکتہ پہنچے۔ نواب دلاور جنگ نے انہیں اپنے بھائی میر محمد کاظم خان کا اتالیق مقرر کردیا لیکن یہ زیادہ دن نہ چل سکا اور اسی زمانے میں جب کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج بنا اور کالج کو اچھے لکھنے والوں کی تلاش ہوئی۔ میر بہادر علی حسینی وہاں کے میر منشی تھے۔ میر امن ان کی وساطت سے ہندوستانی زبان کے پروفیسر گلکرسٹ تک پہنچے اور کالج میں ملازم ہوگئے۔ انہیں پروفیسر گلکرسٹ کے کہنے پر انہوں نے کالج کے لیے دو کتابیں لکھیں۔ (1) باغ و بہار اور (2) ''گنج خوبی''

باغ و بہار کے متعلق خود مصنف نے لکھا ہے کہ اس کتاب کو انہوں نے 1801ء میں لکھنا شروع کیا اور وہ 1802ء میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔ باغ و بہار بلاشبہ اردو زبان کی مقبول ترین داستان ہے۔ اس کے ماخذ کے متعلق طرح طرح کی روایتیں ہیں۔ میر امن نے اسے فارسی کتاب قصہ چہار درویش سے ترجمہ کیا تھا اور اس کے اصل مصنف امیر خسرو ہیں جنہوں نے حضرت نظام الدین اولیاء کی علالت کے زمانے میں ان کا دل بہلانے کے لیے یہ کہانی انہیں سنائی تھی مگر محققین نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس داستان کے اصل مصنف امیر خسرو بھی نہیں ہیں اور اسے عطا حسین خان نے لکھا تھا۔

سر سید احمد خان

ادیب، عالم اور مصلح وقت، علی گڑھ کالج کے بانی اور مصنف آثار صنادید

سر سید احمد خان، جواد الدولہ، عارف جنگ، انیسویں صدی کے مسلمانان ہند کے ایک عظیم راہنما، مصنف، ماہر تعلیم، نقوی سید تھے۔ دہلی میں اکتوبر 1817ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد میر تقی ولد سید ہادی ایک درویش مزاج انسان تھے۔ ان کے اسلاف صدیوں سے مغلیہ سلاطین کے ماتحت سرکاری منصبوں پر فائز چلے آرہے تھے۔ سر سید بھی بچپن سے اپنے والد کے ہمراہ بادشاہ کے دربار میں جایا کرتے تھے۔ یہ تعلق 1857ء تک قائم رہا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی پائی۔ والد کے انتقال کے بعد عدالت کا کام سیکھ کر سررشتہ دار ہوگئے بعدازاں آگرے کے کمشنر کے نائب منشی بن گئے پھر ترقی کر کے جج بن گئے اور اس عہدے پر کئی شہروں بشمول علی گڑھ میں کام کرتے رہے۔ 1869ء میں انگلستان گئے۔ 1876ء میں ملازمت سے الگ ہو کر علی گڑھ میں مقیم ہوگئے۔ 1878ء میں وہ امپریل کونسل کے رکن بھی نامزد ہوئے۔ ایجوکیشن کمیشن اور پبلک سروس کمیشن کے رکن بھی رہے۔ 1888ء میں انہیں KCSI کا خطاب ملا اور ایڈنبرا یونیورسٹی سے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری بھی ملی۔ 1857ء کے ہنگاموں میں انہوں نے بہت سے انگریزوں کی جان بچائی اور ایک کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' لکھی۔ بحیثیت مصنف وہ آثار صنادید، تزک جہانگیری، خطبات احمدیہ جو انہوں نے سر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتراضات کے جواب میں لکھی تھی اور دیگر کئی کتب کے مصنف ہیں۔ سر سید پہلے مصلح تھے جنہوں نے مسلمانان ہند کو مغربی علوم کی اہمیت سے آگاہ کیا اور اپنی تحریروں اور تقاریر سے مسلمانوں کو سائنس اور انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے پر آمادہ کیا۔ اسی سلسلے میں انہوں نے 1857ء میں علی گڑھ میں ایک اسکول کھولا جو 1877ء میں کالج کا درجہ پاگیا اور محمڈن اینگلو کالج علی گڑھ کے نام سے مشہور ہوا اور بعدازاں مسلم یونیورسٹی میں تبدیل ہوگیا۔ سیاسی طور پر بھی انہوں نے مسلمانوں کے تشخص کو

ہندوؤں سے الگ ثابت کیا۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک مسلمانوں میں علوم جدیدہ کا شوق پیدا نہیں ہوگا اور وہ جذبات کی بجائے عقل کو راہنما نہیں بنائیں گے ایک ترقی یافتہ قوم نہیں بن سکتے۔ ان خیالات کی وجہ سے تنگ نظر علماء نے ان پر کفر کے فتوےٰ تک لگائے مگر وہ آخر دم تک اپنے نظریات پر قائم رہے۔ سرسید احمد کان نے 1898ء میں وفات پائی۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق (م 1961ء)

ہندوستان میں تحریک اردو کے نامور قائد، صاحب طرز انشا پرداز اور محقق

ڈاکٹر مولوی عبدالحق جو بابائے اردو کے نام سے مشہور ہیں، ہاپوڑ ضلع میرٹھ کی ایک قانون گو برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد کے ساتھ پنجاب میں رہ کر مڈل تک حاصل کی پھر بی اے علی گڑھ کالج سے کیا۔ علی گڑھ ہی میں سرسید احمد خاں، شبلی نعمانی، حالی اور سید محمود جیسے زعما کی صحبت پائی۔ کچھ روز محسن الملک کے پاس بمبئی میں رہے۔ وہیں سے کرنل افسر جنگ انہیں حیدرآباد دکن لے گئے اور وہاں اپنے قائم کردہ فوجی مدرسہ آصفیہ کا صدر مقرر کیا۔ مولوی صاحب افسر جنگ کے رسالے ''افسر'' کی ادارت بھی کرتے رہے پھر معتمدی امور عامہ میں مترجم بنائے گئے۔ علی گڑھ کے بہت سے تعلیم یافتہ ان دنوں حیدرآباد میں مقیم تھے اور حیدرآباد ان دنوں ہندوستان کا علمی مرکز بنا ہوا تھا۔ عبدالحق یہاں ادبی صحبتوں میں شریک رہے اور تقریر ونثر نگاری میں مشہور ہوگئے۔ اپنے ہم سبق مولانا ظفر علی خاں کے ''دکن ریویو'' میں تنقیدی، علمی مضامین اور متعدد کتابوں پر مقدمات اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ محکمہ تعلیم میں مددگار (1911ء) اور پھر انسپکٹر صوبہ اورنگ آباد بنائے گئے۔ ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے شعبہ ترقی اردو کے معتمد منتخب ہوئے۔ اس کا دفتر بڑی اورنگ آباد میں قائم کیا اور یہاں تک کہ وہ پورے ہندوستان میں ایک نہایت موثر علمی ادارہ بن گیا۔ 25 برس میں 200 کے قریب کتابیں لسانیات لغت اور جدید علوم پر شائع کیں۔ سہ ماہی جریدہ اردو شائع کیا اور اردو ٹائپ کا ایک مطبع بھی قائم کیا۔ اسی دوران مولوی صاحب کی تحریک سے جامعہ عثمانیہ قائم کرنے اور اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا فیصلہ ہوا۔ جامعی درسیات کی تیاری کے لیے دارالترجمہ قائم کیا گیا جس کے وہ پہلے ناظم مقرر ہوئے۔

1930ء میں انہیں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے شعبہ اردو کا صدر بنا دیا گیا، جب 1936ء میں گاندھی جی نے ہندی پرشد بنا کر اردو کی مخالفت کی تو مولوی صاحب اردو کی حمایت میں میدان میں اترے اور انجمن ترقی اردو کا دفتر دہلی منتقل کیا۔ بعد ازاں 1947ء میں کراچی پاکستان منتقل کیا گیا۔ کراچی میں اردو کالج کا قیام انہیں کا مرہون ہے۔ آپ نے 1961ء میں انتقال کیا۔ آپ نے بہت سی اہم علمی یادگاریں چھوڑیں جن میں ''تحقیق الجہاد''، ''اعظم الکلام'' اور ''قواعد اردو'' بہت اہم ہیں۔

مولانا ظفر علی خاں (م 1956ء)

برصغیر کے مشہور منفرد صحافی اور اخبار ''زمیندار'' کے ایڈیٹر اور بلند پایہ شاعر ومصنف

مولانا ظفر علی خاں بانی اخبار زمیندار، مولانا سراج الدین احمد خاں کے صاحبزادے تھے۔ آپ 1873ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق جنجوعہ راجپوت برادری سے تھا۔ ان کا خاندان وزیرآباد کے متصل گاؤں کرم آباد میں آباد تھا۔ مولانا ظفر علی خاں نے ابتدائی تعلیم کے بعد علی گڑھ کالج اور الہ آباد یونیورسٹی سے تعلیم پائی، اور 1894ء میں امتیاز کے ساتھ بی اے کیا۔ اس کے بعد پہلے بمبئی اور پھر حیدرآباد پہنچے۔ ریاست میں اعلیٰ منصب پر فائز کیے گئے اس کے ساتھ ساتھ اہم علمی اور ادبی کام بھی انجام دیتے رہے۔ 1905ء میں دکن ہی سے اپنا ماہنامہ ''دکن ریویو'' نکالا۔ ڈرامہ ''جنگ روس وجاپان'' لکھا۔

مقصد یہ تھا کہ اردو ڈرامہ ابتذال سے پاک ہو۔آپ کی یہ طویل تمثیل زبان و بیان شستہ اور برجستہ مکالموں اور دلکش اشعار کی وجہ سے خاصے کی چیز ہے۔اور عامیانہ اسٹیج کے معیار سے بہت بلند رہی ہے۔مولانا ظفر علی خان صاحب طرز شاعر، منفرد صحافی اور یگانہ ادیب تھے۔طنزیات و مضحکات کی طرز کے امام بھی کہلائے۔صحافت بھی عصر حاضر کے استاذ ہوئے۔اپنے اسلوب میں شبلی کے مدِاوسط تھے۔بے باک صحافی اودلیر سیاستدان اور سالارِقوم تھے۔جہاد آزادی میں گھر بار اور جاگیریں لٹائیں۔برطانوی استبداد کی قید و بند کا شکار رہے مگر زبان وقلم سے جہاد سے باز نہ آئے۔ان کی بے شمار تصانیف ضائع ہوگئیں۔موجود تصانیف میں یہ مشہور ہیں ''بہارستان''،''نگارستان''،''معاشیات معرکہ مذہب وسائنس''،''خیابان فارس''،''سیر ظلمات''، ''لطائف الادب''،''غلبہ روم''۔انہوں نے انگریزی افسانے سے اخذ کر کے ایکانکی ڈراما''تولہ بھر ریڈیم 1917ء میں لکھا۔روزنامہ زمیندار کی فائل ان کی صحافی زندگی کی بے مثل یادگار ہے۔اسلام سے والہانہ عشق تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فدائی تھے۔حیدرآباد سے آکر روزنامہ زمیندار لاہور سے جاری کیا تھا۔1956ء میں وفات پائی اور کرم آباد وزیرآباد میں دفن ہوئے۔

مولانا غلام رسول مہر (م1970ء)

محقق، ادیب، مترجم، صحافی اور مورخ، ہر شعبہ میں بلند مرتبہ پر فائز شخصیت

1885ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے۔اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے کرنے کے بعد روزنامہ زمیندار سے منسلک ہوگئے۔بعدازاں مولانا عبدالمجید سالک کے ساتھ مل کر اخبار''انقلاب'' جاری کیا جسے برصغیر کی صحافت میں ممتاز مقام حاصل ہوا۔انقلاب کی بندش کے بعد ادبی اور تحقیقی کاموں میں مصروف ہوگئے اور اس دوران بڑے مفید علمی کارنامے انجام دیئے۔اس دور میں بھی انہوں نے چار سے پانچ سو کے قریب مضامین مختلف اخبارات اور رسائل کے لیے بھی لکھے۔انہیں تاریخ اور تحقیق سے بے حد دلچسپی تھی۔تحقیقی کارناموں میں مرزا غالب کی سوانح عمری بڑی اہمیت رکھتی ہے۔متعدد کتابوں کے ترجمے بھی کیے جن میں ولیم ایل لینگر کی انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم اور تاریخ اسلام (تین جلدوں میں) تاریخ شام، تاریخ لبنان، سکندر اعظم، اسلام، صراط مستقیم، جزیہ اور اسلام، اسلامی مملکت وحکومت کے بنیادی اصول قابل ذکر ہیں۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم، رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم، انبیائے کرام، سید احمد شہید، سرگذشت مجاہد، 1857ء، جماعت مجاہدین وغیرہ ان کی دیگر مشہور کتب ہیں۔ان کا انداز تحریر بڑا دلکش تھا اور وہ اپنے خیالات کو بڑی روانی سے پیش کرتے تھے۔اردو جامع انسائیکلوپیڈیا (شیخ غلام علی اینڈ سنز) میں بہت سے اسلامی اور تاریخی مقالات بھی انہوں نے تحریر کیے تھے۔1970ء میں وفات پائی۔

ممتاز مفتی (م1995ء)

ممتاز افسانہ نگار، ناول نویس اور سفرنامہ نگار

ممتاز مفتی 1906ء میں پٹیالہ مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے۔اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے کیا۔مختلف اسکولوں میں 12 سال تک درس وتدریس کا فریضہ انجام دیا۔قیام پاکستان کے مختلف سرکاری اداروں میں مختلف حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ان کی پہلی کہانی 1936ء میں ماہنامہ''ادبی دنیا'' لاہور میں شائع ہوئی تھی۔ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے جن میں ان کہی، گہماگہمی، چپ، گڑیا گھر اہم ہیں۔ڈراموں میں نظام سقہ، مضامین میں غبارے اور پیاز کے چھلکے کے نام سے خاکے بھی ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔''علی پور کا ایلی'' اردو ناول کی تاریخ کا

ناقابل فراموش باب ہے۔ الکھ نگری، او کھے لوگ، روغنی پتلے، سے کا بندھن، کہی نہ جائے، مفتیا نے ان کے اور شاہکار ہیں۔ حضرت امیر خسرو کے عرس پر بھارت گئے تو وطن واپسی پر ''ہندویاترا'' کے نام سے سفرنامہ لکھا جسے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسی طرح حج پر گئے تو ''لبیک'' کے نام سے رپورتاژ لکھا جو کلاسیک کا درجہ حاصل کر گیا ہے۔ حکومت پاکستان نے ان کی ادبی خدمات کے صلے میں انہیں ستارہ امتیاز دیا۔ احمد عقیل روبی نے ان کے فن اور خدمات پر ''علی پور کا مفتی'' نامی کتاب لکھ کر انہیں خراج تحسین پیش کیا۔ ہندیاترا پر انہیں 1982ء مین ہجرہ ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔

مرزا ابن حنیف (م2004ء)

علم کا سمندر، ایک غیر روایتی انسان اور اردو زبان کے اولین ماہر مصریات

محقق عصر مرزا ابن حنیف صاحب کا اصل نام مرزا ظریف بیگ تھا۔ مگر اپنی زندگی میں اور بعد از وفات اپنے قلمی نام ابن حنیف سے ہی جانے جاتے ہیں۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ اور ایک عرصہ تک روزنامہ امروز ملتان سے بطور مترجم وابستہ رہے۔

مرزا صاحب کا موضوع قدیم ادب، قدیم تہذیبیں، آثار قدیمہ اور قدیم داستانیں تھا۔ سب سے زیادہ انہیں قدیم مصر اور اس کے ادب سے دلچسپی تھی۔ اس دلچسپی کا ثبوت ان کی چار جلدوں میں تصنیف مصر کا قدیم ادب ہے جو اس موضوع پر اردو زبان میں حرف آخر ہے۔

مرزا ابن حنیف صاحب تحقیق کے میدان میں ایک اتھارٹی کی حیثیت رکھتے تھے۔ اجڑی ہوئی تہذیبوں ان کے مدفنوں اور وہاں سے دریافت ہونے والے ٹوٹے ہوئے برتنوں اور دیگر آثار کے بارے میں ان سے زیادہ معلومات کہیں اور سے نہیں ملتی تھی۔ قدیم تہذیبوں کے بارے میں ان کی زندگی میں کسی نے بھی کام کرنا ہوتا تو وہ بالضرور مرزا صاحب سے بنیادی معلومات حاصل کرتا تھا۔ مستنصر حسین تارڑ صاحب نے دریائے گھاگرا کی اجڑی ہوئی تہذیب کے بارے میں اپنا ناول ''بہاؤ'' لکھنا چاہا تو مرزا صاحب سے رابطہ کیا۔ اس کا اعتراف انہوں نے خود اپنی کتاب میں کیا کہ بنیادی معلومات مرزا ابن حنیف صاحب کی عطا ہے۔ مجھ جیسے ناخواندہ نے اپنی کتاب ''تاریخ عالم'' کے لیے تصحیح انہیں سے حاصل کی تھی اور میں آج بھی انہیں اپنا استاد مانتا ہوں۔ مرزا صاحب 2004ء میں وفات پا گئے۔

ان کی تصانیف میں یونان کی بھولی بسری کہانیاں، گلگامش کی داستان، سات دریاؤں کی سرزمین، تخلیق کائنات قدیم عراقیوں اور یونانیوں کی نظر میں، دنیا کا قدیم ترین ادب، اس کتاب پر انہیں ہجرہ ایوارڈ ملا تھا۔ ان کے علاوہ مصر کا قدیم ادب (چار جلدیں) اہم ترین ہیں۔ مصریات کو اردو زبان میں انہیں نے پیش کیا تھا اسی وجہ سے وہ اردو زبان کے اولین ماہر مصریات بھی ہیں۔

ریاض قادری (حیات 2017ء)

انگریزی زبان میں اولیائے کرام کا تذکرہ لکھنے والے جدید زمانے کے مصنف

محمد ریاض قادری لاہور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد کا نام حاجی میاں چنن دین تھا۔ 1939ء میں پیدا ہوئے۔ 1956ء میں میٹرک کرنے کے بعد کچھ عرصہ سرکاری ملازمت میں رہے۔ 1959ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ انفارمیشن سائنس میں ڈپلومہ کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری میں کچھ عرصہ خدمات انجام دیں۔

شادی کے بعد 1966ء میں کراچی یونیورسٹی سے انفارمیشن سائنس میں ایم ایس سی کیا۔ لاہور واپس آکر برٹش کونسل میں بطور لائبریرین خدمات انجام دیتے رہے۔ اسی سروس کے دوران انہوں نے ایم۔ اے پولیٹیکل سائنس اور ایم۔ اے انگلش کیا۔ برٹش کونسل نے 1971ء میں انہیں لائبریری مینجمنٹ کی اعلیٰ تربیت کے لیے برطانیہ بھیجا۔ 1978ء میں ملک عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ کی مرکزی لائبریری سے ملازمت کی پیشکش ہوئی وہاں دو سال تک کام کیا۔ اس دوران انہیں حج و عمرہ کرنے کی سعادت اور بارگاہ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہونے کا موقع و شرف حاصل ہوا۔ بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے دلائل الخیرات پڑھنے کی ہدایات ملیں۔ وطن واپسی پر کچھ عرصہ پنجاب پبلک لائبریری میں چیف لائبریرین کی خدمات انجام دیں۔ وہاں کے حالات ناگفتہ بہ ہونے کی وجہ سے مستعفی ہوگئے۔ پھر 1983ء میں اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کی سنٹرل لائبریری میں اگلے 14 سال تک چیف لائبریرین کی خدمات انجام دیں۔ اسی دوران آپ نے انفارمیشن سائنس میں اکیڈمک مقاصد کے لیے کچھ کتابیں تالیف کیں جو مقبول ہوئیں۔ دنیائے تصوف سے علمی تعلق 1959ء میں حضرت علی احمد صابر پیا کلیری کی سوانح عمری ''حقیقت گلزار صابری'' پڑھنے سے پیدا ہوگیا تھا اور اس کے بعد اولیائے کرام کے حالات و واقعات کے مطالعہ کا ایسا شغف پیدا ہوا کہ اب تک دنیا روشن ہوگئی پھر ایک عظیم ہستی نے ان کے ہاتھ میں قلم تھما کر اولیائے کرام کی روحانی زندگی کرامات اور اسلامی تصوف کو اجاگر کرنے کے لیے بہ زبان انگریزی تصنیف و تالیف کا حکم دیا اور آپ نے انگریزی زبان میں کئی کتب در شان اولیاء تصنیف کیں۔ اس موضوع پر ان کی کئی کتب شائع ہو چکی ہیں اور تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ جاری ہے۔

ع ؎ خدا کرے زور قلم اور زیادہ......

شعرائے کرام

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ (م نواح 60ھ)

شاعر دربار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر بنو تمیم کی فخریہ شاعری کا رد کرنے والے

حضرت ابو ولید حسان رضی اللہ عنہ بن ثابت انصاری مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ زمانہ جاہلیت میں پرورش پائی، جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد شاعری کو پیشے کے طور پر اپنایا اور اسی کے سہارے زندگی بسر کی۔ وہ اس دور میں شاہان مناذرہ وغساسنہ کی مدح کرتے تھے اور ان سے انعامات پاتے تھے۔ ملوک غسان میں سب سے زیادہ انہوں نے آل جفنہ کی مدح کی اور زیادہ تر انہیں کے دربار سے تعلق تھا۔ آل جفنہ انہیں دل کھول کر نوازتے تھے۔ آل جفنہ خود عیسائی مذہب پر قائم رہے اور حضرت حسان کے اسلام قبول کر لینے کے باوجود بھی انہوں نے اپنے برتاؤ میں تبدیلی نہیں کی اور ان کے قاصد قسطنطنیہ سے ہدیے اور تحائف لے کر حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے پاس آتے تھے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے تو دیگر شرفاء انصار کے ساتھ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے بھی اسلام قبول کیا اور اپنی شاعری اور زندگی

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح وحمایت کے لیے وقف کردی۔ پھر جب قریش کی ہجو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر گراں گزرنے لگی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جن لوگوں نے اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد اپنے ہتھیاروں سے کی ہے، انہیں کیا چیز روکے ہوئے ہے کہ وہ اپنی زبانوں سے مدد نہ کریں۔'' یہ فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سنتے ہی حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کہا ''میں اس خدمت کے لیے حاضر ہوں، بخدا اگر مجھے چٹان پر رکھ کر دو ٹکڑے بھی کردیا جائے تو میں اس خدمت کو بجالانے میں کوتاہی نہ کروں۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مگر تم ان کی ہجو کیونکر کروگے، میں بھی انہیں کے خاندان سے ہوں۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان میں سے اس طرح صاف نکال دوں گا جس طرح گندھے ہوئے آٹے سے بال۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کفار کی ہجو کرو روح القدس تمہارے ساتھ ہے۔'' چنانچہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے ان کی ہجو کرکے انہیں سخت ایذا پہنچائی اور کفار اس ہجو سے ایسے ہی تلملائے جیسے اندھیرے میں لگنے والے تیروں سے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح خوانی اور کفار کی ہجو کرنے سے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو بڑی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی اور وہ شاعر دربار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز پاگئے۔ بیت المال سے انہیں وظیفہ ملتا تھا۔ 54ھ میں 120 سال عمر پاکر وفات پائی۔

الفرزدق (م114ھ/733ء)

ہمام بن غالب بن صعصعہ، اموی عہد کا ایک ممتاز اور نامور عرب شاعر

ابوفراس ہمام بن غالب تمیمی بصرہ میں پیدا ہوا اور آغوشِ ادب میں پرورش پائی۔ اپنے والد سے اشعار پڑھے اور شاعری سیکھی، حتیٰ کہ اس کی طبیعت شاعری کے لیے موزوں اور زبان رواں پاگئی۔ جنگ جمل کے بعد ایک دن اس کا باپ نوعمری میں اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لے گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''اسے قرآن پڑھاؤ کہ وہ اس کے لیے بہتر ہے۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ بات آخر عمر تک اس کے ذہن نشین رہی۔ اس نے حفظ قرآن کا ارادہ کیا اور پاؤں میں بیڑی پہن لی۔ اور قسم کھائی کہ اسے قرآن حفظ کرنے سے پہلے نہ کھولے گا۔ پھر اس نے اپنی یہ قسم سچی کردکھائی۔ بعدازاں وہ کوفہ اور بصرہ کے والیوں سے جاملا کبھی ان کی مدح کرتا اور کبھی ہجو وہ بھی اسے اپنا مقرب بنالیتے اور کبھی راندہ درگاہ۔ شام میں خلفا بنوامیہ کی مدح کی خصوصاً خلیفہ عبدالملک کی اس نے اسے انعام واکرام سے نوازا، لیکن آل علی رضی اللہ عنہ کی حمایت وطرفداری کی وجہ سے وہ دربار اموی میں کامیابی حاصل نہ کرسکا۔ مثلاً ایک مرتبہ حج کے موقع پر اموی شہزادہ ہشام بن عبدالملک کے ساتھ تھا جبکہ اس نے حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر اور لوگوں میں ان کی تکریم اور عزت دیکھتے ہوئے حقارت آمیز تجاہل سے کام لیا اور فرزدق سے پوچھا کہ یہ کون ہیں کہ زمانہ ہماری بجائے ان کے سامنے جھکا جاتا ہے۔ فرزدق کو اس کا یہ سوال ناگوار گزرا اور اس نے اس کے جواب میں فی البدیہہ ایک قصیدہ کہا جو عربی ادب میں آج بھی مقبول ہے۔ ''ھذا الذی تعرف البطحاء وطأتہ والبیت یعرفہ والحل والحرم۔'' یہ وہ شخص ہیں کہ سرزمین بطحا، ان کے قدموں کی چاپ کو پہچانتی ہے اور خانہ کعبہ، حرم اور غیر حرم سبھی مقامات ان کو جانتے ہیں۔ اس قصیدہ پر ہشام نے ان کو قید کردیا مگر بعدازاں چھوڑ دیا۔ امام زین العابدین نے قید خانے میں ان کو اشرفیوں کی ایک تھیلی بھجوائی جو اس نے قبول کرنے سے انکار کیا مگر آپ کے یقین دلانے پر قبول کرلیا۔

فرزدق نے 114ھ یا 110ھ میں بعمر ایک سو برس وفات پائی۔ فرزدق کو اپنی اصل پر بڑا فخر تھا اور اپنے خاندان پر وہ ناز کرتا تھا۔ خلفا کے سامنے بھی وہ اپنے آباء کے بلند کارنامے بیان کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔

ابن عبدربہ (م 328ھ/940ء)

ابوعمرو احمد بن ابی عمر محمد بن عبدربہ، مشہور اندلسی شاعر، ادیب، صاحب "العقد فرید"

اس کا دادا اندلس کے دوسرے خلیفہ بنوامیہ کا آزاد کردہ غلام تھا۔ ابن عبدربہ قرطبہ میں پیدا ہوا اور وہیں اس نے پرورش پائی۔ اندلس کے علما و ادباء سے کسب علم کیا۔ یاقوت نے اپنی "معجم الادباء" میں لکھا ہے کہ ابوعمر ابن عبدربہ کو علم میں گرانقدر مقام حاصل تھا۔ وہ دیانت و تقویٰ کے ساتھ ساتھ ادب میں سرداری اور شہرت کا مالک تھا۔ اُسے ایسا زمانہ نصیب ہوا جس میں حکمرانوں کو علم و ادب کی قدر تھی۔ چنانچہ وہ گمنامی سے نکل کر بلند مرتبہ اور فقیری کے بعد امیر ہوگیا۔ اسے محققین نے تفضیلی بھی خیال کیا ہے مگر اس پر شاعری کا مذاق غالب تھا۔ آخری عمر میں اسے فالج ہوگیا تھا، 328ھ/940ء میں اس کی وفات ہوئی۔

ابن عبدربہ کی شاعری کا بیشتر عمدہ حصہ وصف اور غزل کا ہے۔ مشرقی حسن و شوکت اور مغربی نزاکت و سلاست کو یکجا جمع کردینے میں اس کی شاعری ابن زیدون کی شاعری سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔ چنانچہ مشرقیوں میں اسے زیادہ مقبولیت حاصل ہوگئی تھی۔ ابن الخطیب نے روایت کی ہے کہ ولید اندلسی نے جب حج کیا تو واپسی میں وہ مصر میں ٹھہرا۔ یہاں جامع عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ میں وہ ابوالطیب متنبی سے ملا اور کچھ دیر باتیں کرتا رہا۔ پھر اس سے متنبی نے فرمائش کی کہ ہمیں اندلس کے خوش کلام شاعر یعنی ابن عبدربہ کا کلام تو سناؤ۔ چنانچہ اس نے ابن عبدربہ کے کچھ اشعار سنائے جنہیں سن کر متنبی بہت خوش ہوا اور اس نے کہا اے ابن عبدربہ! عراق تیرے پاس گھسٹ کر پہنچے گا۔ اس نے حکم بن عبدالرحمٰن الناصر کو کچھ اشعار اپنے ہاتھ سے لکھے تھے۔ ابن عبدربہ نے ادب کے موضوع پر ایک جلیل القدر کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام "العقد الفرید" ہے یہ کتاب عربی زبان و ادب کی بنیادی کتابوں میں سے ہے۔ جس میں بکھری ہوئی بہت سی باتیں، واقعات و حوادث، انساب، امثال حتیٰ کہ طب اور موسیقی کے متعلق بھی معلومات جمع ہیں۔

ابوالقاسم فردوسی (411ھ/1020ء)

شاہنامہ کا مصنف اور عظیم فارسی شاعر، محمود غزنوی کا درباری شاعر

فردوسی نے جہاں شاہنامہ لکھ کر ایران قدیم کی تاریخ مرتب کردی وہیں اس نے فارسی زبان کو نئی زندگی بھی عطا کی تھی۔ فردوسی کی کنیت ابوالقاسم ہے۔ فردوسی کا سنہ پیدائش کسی تذکرے نویس نے قطعی طور پر نہیں لکھا البتہ بات حتمی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ شاہنامہ 400ھ بمطابق 1009 میں مکمل ہوا تھا۔ اس کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اکہتر برس کی عمر میں 35 سال کی محنت شاقہ کے بعد یہ شاہکار مکمل کیا تھا۔ اس لحاظ سے اس کی پیدائش کا سال 329ھ بمطابق 940ء عیسوی بنتا ہے۔ کہتے ہیں کہ فردوسی جب ضعیفی کو پہنچا تو اس نے شاہنامہ کو مکمل کر کے محمود غزنوی کی خدمت میں محنت کا صلہ حاصل کرنے کے لیے پیش کرنے کا فیصلہ کیا اس سلسلے میں اس نے ایک قصیدہ محمود غزنوی کی شان میں لکھ کر شاہنامہ میں شامل کیا اور دربار غزنی میں رسائی حاصل کی۔ اور کچھ مدت تک دربار غزنویہ سے شاہنامہ سنا کر داد و تحسین حاصل کی لیکن جب انعام و اکرام کا وقت آیا تو حاسدوں نے بدگوئی کی جس وجہ سے محمود کا دل مکدر ہوگیا اور بقول نظامی عروضی بادشاہ نے اسے صرف بیس ہزار درہم دے کر ٹال دیا۔ نظامی عروضی کے مطابق فردوسی اس سلوک سے سخت افسردہ خاطر ہوا۔ غسل کرنے کے لیے ایک حمام میں گیا۔ غسل سے فارغ ہو کر باہر آیا ایک عطار سے اس نے شربت کا ایک گلاس پیا اور بادشاہ کا انعام عطار اور حمام کے

مالک میں تقسیم کر کے غزنی سے نکل گیا۔ مروضی ہی کے مطابق اس محمود کی ہجو کہی اور اسے بمہر کر کے محمود کے غلام ایاز کو بھجوا دی۔ کہتے ہیں ایک موقع پر محمود کے وزیر حسن میمندی نے جب فردوسی کے شاہنامے سے ایک شعر پڑھا تو محمود نے پوچھا یہ شعر کس کا ہے۔ جس نے کہا اس بدنصیب شاعر کا جو بارگاہ غزنویہ سے محروم لوٹا دیا گیا تھا۔ تلافی کے طور پر محمود نے ساٹھ ہزار اشرفیاں فردوسی کو بھجوائیں مگر اتفاق دیکھئے کہ جب محمود کا یہ انعام اسے پہنچا تو اس کا جنازہ اٹھایا جا رہا تھا۔ محمود کو اطلاع ملی تو اس نے حکم دیا کہ اس رقم سے اس کے ایصال ثواب کے لیے ایک کارواں سرائے تعمیر کر دی جائے۔

امام البوصیری (م696ھ/ 1297ء)

ایک مشہور عرب عالم، صوفی، شاعر اور مصنف ''قصیدہ بردہ شریف''

ابو عبداللہ شرف الدین محمد بن حماد بن محسن، عرب شاعر اور صوفی، جن کا قصیدہ بردہ شریف خاص طور پر مشہور ہے۔ بربری نسل سے تھے۔ ان کا تعلق قبیلہ منہاجہ کی ایک شاخ بنوصبھون سے تھا۔ ان کے باپ مصر کے قصبہ بوصیر کے تھے اور والدہ دلاص کی۔ اسی وجہ سے آپ بوصیری، منہاجی اور دلاصی کہلاتے ہیں، لیکن البوصیری کی نسبت زیادہ مشہور ہے۔ یکم شوال 608ھ/ 7 مارچ 1212ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے بچپن اور تعلیم کے متعلق بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ بعدازاں بلبیس میں کاتب یعنی محرر کے عہدے پر مامور ہوئے اور حسابی کام انجام دیئے تھے تاہم کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ کچھ عرصہ بیت المقدس، مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ میں بھی رہے۔ آخری عمر میں پنڈلی ٹوٹ جانے سے معذور ہو گئے تھے۔ 695ھ/ 1296ء میں انتقال ہوا اور امام الشافعی کے مقبرے کے جوار میں دفن کیے گئے۔

امام البوصیری نے حفظ قرآن کا ایک چھوٹا سا مدرسہ بھی کھولا تھا۔ انہیں سیرت سے خاص شغف تھا، اس کے ساتھ ہی عیسائیوں اور یہودیوں سے مناظرے کا شوق رکھتے تھے۔ اسی غرض سے انہوں نے انجیل اور توراۃ کا مطالعہ بھی کیا۔ ان کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے مخالفین کی رد خود ان کی مقدس کتابوں سے کی تھی۔ البوصیری کو تصوف اور شاعری سے بڑا لگاؤ تھا۔ شعر حسن و لطافت ان کا خاصہ تھا۔ جب الصاحب زین الدین یعقوب کا قرب حاصل ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں شاندار قصیدے لکھنے شروع کیے اور یہی قصائد نعتیہ ان کی شہرت کا باعث ہوئے، بالخصوص قصیدہ بردہ شریف۔ صوفیہ کے ہاں امام البوصیری کا بڑا درجہ ہے اور وہ انہیں بسا اوقات مرتبہ ''غوثیہ کبریٰ'' تک پہنچا دیتے ہیں۔ انہوں نے ابوالحسن شاذلی کے خلیفہ ابوالعباس المرسی سے طریقت سیکھی تھی۔ ان کا سب سے عظیم شاعرانہ کارنامہ قصیدہ البردہ ہے۔ جس کا عنوان ''الکواکب الدریہ فی مدح خیر البریہ'' ہے۔ جب یہ مکمل ہوا تو ایک رات انہیں خواب میں زیارت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوئی وہ بعارضہ فالج اس وقت معذور تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست شفقت ان کے جسم پر پھیرا اور اپنی چادر عطا فرمائی۔ جب وہ صبح بیدار ہوئے تو اپنے آپ کو صحت یاب پایا۔

مولانا روم (672ھ/ 1273ء)

جلال الدین رومی، قونیہ کے نامور صوفی عالم، شہرہ آفاق شاعر اور مصنف ''مثنوی معنوی''

جلال الدین رومی جو مولانائے روم کے عرف سے مشہور ہیں۔ دنیائے اسلام کے عظیم صوفی شعراء میں سے ایک ہیں۔ ان کے والد کا نام بہاؤالدین سلطان العلما تھا۔ مولانا 604ھ/ 1207ء میں بمقام بلخ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ بعد کی تربیت شیخ بہاؤالدین کے ایک مرید خاص سید برہان الدین محقق نے کی۔ اٹھارہ برس کی عمر میں

اپنے والد کے پاس قونیہ آگئے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ والد کی وفات کے بعد حلب اور دمشق کا سفر کیا۔ حلب میں کمال الدین بن عدیم حلبی اور بعض دوسرے فضلا سے اکتساب علم کیا۔ مولانا کی زندگی کا اہم ترین واقعہ تذکرہ نگاروں نے یہ لکھا ہے کہ ان کی ملاقات حضرت شمس تبریز سے ہوئی۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے مولانا روم کی کتب تالاب میں پھینک دیں مگر بعدازاں وہ بالکل خشک باہر نکال دیں۔ یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ مولانا کے دل میں حضرت شمس کی عقیدت اور ان کا احترام عشق کی حد تک پہنچتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی غزلیات کا دیوان اپنے اس مرشد روحانی کے نام معنون کیا ہے۔ ''مناقب العارفین'' کی رو سے یہ واقعہ 642ھ میں پیش آیا تھا۔ بعض روایات کی رو سے مولانا کے متعلقین حضرت شمس سے مولانا کے اس پرشوق تعلق سے ناخوش تھے پہلے حضرت روٹھ کر چلے گئے پھر انہیں قتل کر دیا گیا مگر یہ روایت کچھ صحیح معلوم نہیں ہوئی۔ البتہ حضرت شمس کی جدائی کا جو صدمہ مولانا روم کو پہنچا اس کی کچھ تلافی حسام الدین چلپی کی رفاقت سے کسی حد تک دور ہوئی۔ حسام الدین کے ایما پر مولانا کو مثنوی کی تحریک ہوئی اور انہیں کے اصرار پر اس عظیم فن پارے کو مکمل کیا گیا تھا۔ مولانا نے 672ھ/ 1273ء میں وفات پائی اور قونیہ میں ان کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔ مولانا کے سلسلہ طریقت کو جلالیہ اور مولویہ کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے کی خصوصیت سماع اور رقص درویش ہے۔ مولانا کی تصانیف میں سب سے اہم مثنوی معنوی ہے۔ جو ایک اخلاقی منظوم تصنیف ہے۔ یہ چھ دفتروں پر مشتمل ہے۔ ساتواں دفتر جو بعدازاں دریافت ہوا تھا کہا جاتا ہے کہ جعلی ہے۔ حسام الدین نے مولانا کو مشورہ دیا تھا کہ وہ سنائی اور عطار کی مثنویات جیسا کوئی شاہکار تخلیق کریں اس پر مولانا نے اپنے عمامے سے نکال کر مقدمہ کے اٹھارہ شعر سنائے تھے۔

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ (م 691ھ/ 1292ء)

شیخ مشرف الدین بن مصلح الدین شیرازی، شہرہ آفاق فارسی شاعر وادیب، مصنف ''گلستان و بوستان''

فتنہ تاتار ایل خانیہ سے جب سرزمین ایران بے گناہوں کے خون سے لالہ زار بنی اور گھر ویران اور مسجد میں تباہ ہوئیں اور علم وادب کے مرکز فنا ہوئے، کتب خانے نذر آتش کر دیئے گئے۔ علما یگانہ تیغ بیداد کا نشانہ بنے تو عین اسی زمانے میں ایک ایسی نادر روزگار ہستی وجود میں آئی جس کے ادبی کارناموں نے اہل ایران کے مجروح دلوں پر مرہم کا کام کیا۔ وہ برزگوار ہستی حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کی ذات گرامی قدر تھی۔ شیخ سعدی ایران کے مشہور شہر شیراز میں پیدا ہوئے۔ سال پیدائش آپ کے جدید سوانح نگاروں نے تقریباً 585ھ/ 1189ء لکھا ہے۔ آپ کا سن وفات 691ھ/ 1292ء ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے ایک سو سال عمر پائی۔ آپ کا خاندان علم وفضل کی وجہ سے مشہور تھا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے پائی، لیکن جلد ہی شفقت پدری سے محروم ہوگئے۔ والد کی وفات کے بعد علما شیراز سے تحصیل علوم کی اور یگانہ روزگار عارف شیخ شہاب الدین سہروردی سے بھی اکتساب فیض کیا۔ حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے سینے میں ایک بے چین دل تھا اس لیے آپ کسی ایک جگہ قیام نہ کرتے اس لیے تعلیم سے فراغت پا کر اطراف عالم کو دیکھنے لگے۔ بغداد سے نکل کر شام وفلسطین، مکہ معظمہ، ایشیائے کوچک اور شمالی افریقہ تک کی سیاحت کی۔ دوران سیاحت آپ نے چودہ حج کیے۔ بوستان کی بعض حکایات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے ترکستان اور ہندوستان کا سفر بھی کیا تھا اور کچھ مدت سومنات کے مندر کے مجاہد بھی رہے۔ آپ کے کلام سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ مختلف حیثیات کے حامل تھے۔ مثلاً حسن پرست بھی تھے اور زاہد بھی، واعظ بھی تھے اور عابد شب زندہ دار بھی۔ ایک حکایت میں لکھتے ہیں کہ مجھے طرابلس کی صلیبی جنگ میں عیسائیوں نے گرفتار کر لیا تھا اور خندق کھودنے کے کام پر لگا دیا تھا آخر ایک شناسا نے زرفدیہ دے کر آزاد کرایا۔

تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ حاکم ملتان نے قاصد بھیج کر ملتان آنے کی دعوت بھی دی تھی جو آپ نے ضعیفی کی وجہ سے قبول نہیں کی تھی۔ بقیہ عمر آپ شیراز کی ایک خانقاہ میں گوشہ نشین ہو گئے تھے وہیں 691ھ/1292ء میں وفات پائی۔

حافظ شیرازی (791ھ/1389ء)

لسان الغیب شمس الدین محمد، ممتاز ترین فارسی غزل گو اور صاحب دیوان شاعر

حافظ فارسی غزل گو شاعر، اس کا نام اور لقب شمس الدین محمد ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ولادت 720ھ/1320ء میں یا اس کے بعد شیراز میں ہوئی۔ اوائل عمر میں قرآن حفظ کیا اور علم دین اور متعلقہ علوم کی تحصیل میں منہمک رہے اور عربی زبان و ادب سے بہت اچھی واقفیت حاصل کر لی۔ 1353ء میں مظفری خاندان کے سلطان مبارز الدین نے شیراز فتح کیا جس سے اہل شیراز کو بڑی تکلیف اٹھانا پڑی اور خود حافظ بھی ان کے بدلے ہوئے حالات کو برداشت نہ کر سکا۔ جب مبارز الدین کے بعد اس کا بیٹا جلال الدین شاہ شجاع تخت نشین ہوا تو حافظ نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔ اس زمانے تک حافظ کی ادبی شہرت چمک اٹھی تھی۔ اس سے پہلے وہ مبارز الدین کے وزیر برہان الدین کی مدح میں قصیدہ لکھ چکے تھے۔ نئے وزیر خواجہ قوام الدین جو ٹکسال کے ناظم بھی رہ چکے تھے انہیں جب بادشاہ بیدردی سے قتل کروایا تو حافظ اس کا نوحہ کہے بغیر نہ رہ سکا تاہم بادشاہ کے غیظ و غضب سے بچنے کے لیے اس کے بعد انہیں بڑی احتیاط برتنا پڑی۔ حافظ شیراز کے ایک مدرسے میں تفسیر قرآن کا معلم تھا۔ شاید خواجہ قوام الدین ہی نے اس کا تقرر اس مدرسہ میں کیا تھا۔ حافظ کو غزل گوئی میں کمال حاصل تھا۔ آخر میں انہوں نے اپنی غزلیات کو دیوان کی صورت میں مرتب کیا۔ اب پہلی مرتبہ حافظ کا نام اس کے آبائی شہر، شیراز سے نکل کر دور دور تک مشہور ہو گیا۔ چنانچہ ہرمز کے والی، توران شاہ نے بہت فیاضی کے ساتھ اس کی قدر دانی کی۔ دکن کے بہمنی حکمران محمود شاہ اول کے عہد میں بادشاہ کے وزیر قانون کی طرف سے حافظ کو ہند آنے کی دعوت دی گئی لیکن حافظ اسے قبول نہ کر سکا۔ اسی طرح ایلخانی حکمران احمد جلائر نے حافظ کو بغداد آنے کی دعوت دی انہوں نے اس کی دعوت کو بھی قبول نہ کیا۔ برادر خواجہ عادل کی مفارقت دائمی کا حافظ کو بہت صدمہ ہوا اور اس نے ع برادر خواجہ عادل طاب مثواہ پس از پنجاہ و نہ سال حیاتش سے ان کی تاریخ وفات اور عمر نکالی۔ آخری عمر میں حافظ کو دوبارہ مظفری خاندان کا ایک مربی شاہ منصور مل گیا، جس نے تیمور کے جانے کے بعد فارس پر قبضہ کر لیا تھا۔ بہر حال اس نے 791ھ/1388ء میں وفات پائی۔ حافظ ایران کے غزل سرا شعراء میں بزرگ ترین مرتبہ رکھتے ہیں اور ان کے کلام کو اتنی حاصل ہوئی کہ لوگ انہیں لسان الغیب کہتے تھے اور ان کے دیوان سے فال نکالتے تھے۔ ہندوستان میں عہد جہانگیری میں کلام حافظ کے مطالعے کا خاص ذوق پیدا ہوا تھا۔

امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ دہلوی م (725ھ/1325ء)

پاکستان و ہند کے عظیم المرتبت فارسی شاعر، موسیقار اور مرید خاص حضرت نظام الدین اولیاء

651ھ/1253ء میں پٹیالی (مومن آباد) میں پیدا ہوئے۔ ابتداء میں ان کا تخلص سلطانی تھا لیکن بعد ازاں تبدیل کر کے خسرو اختیار کیا۔ ان کے والد سیف الدین محمود ترک قبیلے ہزارہ لاچین سے تھے۔ وہ سلطان التمش کے عہد میں برصغیر آئے اور سلطانی لشکر میں ملازمت اختیار کی۔ جناب امیر خسرو کی والدہ عارض ممالک عماد الملک کی بیٹی تھیں۔ امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ نے بچپن ہی سے شعر کہنے شروع کر دیئے تھے۔ آٹھ سال کی عمر میں یتیم ہو گئے تو پرورش نانا نے اپنے ذمے لی۔

نانا کی وفات کے بعد امیر نے سلطان بلبن کے بھتیجے علاؤالدین کشلو خاں کے ہاں ملازمت کر لی جو سامانہ کا حاکم تھا۔اس کے کچھ عرصہ بعد امیر خسرو شہزادہ بغرا خاں کے ساتھ بنگالہ گئے اور پھر وہاں سے واپس آ کر سلطان کے بڑے بیٹے محمد قان ملک کی ملازمت اختیار کی اور اس کے ساتھ ملتان چلے گئے۔1284ء میں شہزادہ محمد تاتاریوں سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئے اور امیر خسرو کو تاتاریوں نے قید کر لیا۔لیکن تھوڑی مدت کے بعد ان کی قید سے رہائی پا کر دہلی واپس پہنچ گئے۔امیر خسرو نے تقریباً پانچ سال ملتان میں قیام کیا۔دہلی میں انہوں نے اب امیر علی سرجاندار ملقب بہ حاتم خاں کے ہاں ملازمت اختیار کی۔اسی دوران جب سلطان معزالدین کیقباد 686ھ/ 1287ء میں اپنے والد بغرا خاں سے ملاقات کرنے بنگالے گیا تو امیر خسرو نے ان کے ہمراہ تھے۔واپسی پر حاتم خان اودھ کے حاکم مقرر ہوئے تو امیر خسرو دو سال تک ان کے ہمراہ رہے۔سلطان جلال الدین خلجی کے عہد میں خسرو کو خلعت امارت عطا ہوا اور بارہ سو تنکہ سالانہ وظیفہ ملتا رہا۔آخر عمر میں امیر خسرو غیاث پور کے بزرگ حضرت نظام الدین اولیاء کے مرید ہوئے اور جب سلطان محمد بن تغلق کی تخت نشینی کے چند ماہ بعد 725ھ/ 1325ء میں ان کا انتقال ہوا تو انہیں حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار کے پائنتی دفن کیا گیا۔امیر خسرو کی حسب ذیل تصانیف موجود ہیں۔

(1) پانچ دیوان (2) خمسہ پانچ گنج (3) غزلیات (4) منثور تصانیف (5) تاریخی مثنویاں

امیر خسرو کی تصانیف قرون وسطیٰ کے اسلامی ہندوستان کے تمدن کا مفصل ترین یکجا مرقع پیش کرتی ہیں۔

مولانا عبدالرحمٰن جامی (م898ھ/1492ء)

ایک جلیل القدر صاحب دیوان فارسی شاعر، نامور عالم دین اور برگزیدہ صوفی ونعت خواں

مولانا نورالدین عبدالرحمٰن، جلیل القدر فاسی شاعر، نامور عالم اور برگزیدہ صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی تھے۔خراسان کے ضلع جام کے قصبہ خرجرد میں 23 شعبان 817ھ/ 7 نومبر 1414ء کو پیدا ہوئے اور ہرات میں 18 محرم 898ھ/ 9 نومبر کو وفات پائی۔ان کا خاندان دشت میں آباد تھا جو اصفہان کے نواح میں ایک قصبہ تھا یہی وجہ تھی کہ وہ شروع دشتی تخلص کرتے تھے۔جامی کے والد نظام الدین احمد نے دشت چھوڑ کر جام میں سکونت اختیار کی پھر آپ نے اسی نسبت سے جامی تخلص کیا۔جامی بچپن میں اپنے والد کے ہمراہ ہرات اور سمرقند گئے تھے جو ان دنوں علوم اسلامی اور ادبیات ایران کے مرکز تھے۔یہیں آپ نے علوم اسلامی کی تحصیل کی اور تاریخ و ادب میں عرفان حاصل کیا اور پھر تصوف کی طرف متوجہ ہوئے۔آپ نے حضرت سعدالدین محمد الکاشغری کے ہاتھ پر بیعت کی جو سلسلہ نقشبندیہ کے بانی، حضرت بہاؤالدین نقشبند کے مرید تھے۔1472ء میں حضرت جامی حج پر تشریف لے گئے پھر ہمدان، کربلا معلیٰ، بغداد، نجف اشرف، دمشق حلب اور تبریز کی سیاحت کرتے ہوئے سفر حج سے واپس آئے۔بقیہ زندگی ہرات میں گزری جہاں ان کا سارا وقت مطالعہ علمی، شعر و شاعری اور مجاہدات میں بسر ہوتا تھا۔انہوں نے جاہ و منزلت اور مال و دولت کے لیے کبھی کسی سلطان کے دربار میں حاضری نہیں دی اور نہ ہی قصائد کہہ کر حکمرانوں کی خوشامد کی۔اس کے باوجود ہم عصر سلاطین ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان کی خواہش ہوتی تھی کہ جامی اپنی تصانیف ان کے نام معنون کریں۔جب ان کی شہرت ترکی پہنچی تو سلطان محمد فاتح نے ان کو استنبول آنے کی دعوت دی، بایزید ثانی نے بھی ان کے نام دو خطوط ارسال کیے۔آخر عمر میں مولانا جامی ہوش و خرد کھو بیٹھے تھے تاہم علی شیر نوائی نے اس کی تصدیق نہیں کی جو ان کا شاگرد اور مرید تھا۔حضرت جامی کی وفات پر ان کی نماز جنازہ حاکم ہرات نے پڑھائی۔ان کا نعتیہ کلام فارسی زبان کی بہترین نعتوں پر مشتمل ہے۔اس کے علاوہ ان کی

بہت سی کتب نثر میں بھی ہیں۔

سید خواجہ میر درد (م 1133ھ/1819ء)

اردو کے مشہور صوفی شاعر اور مصنف اور اردو شاعری کے چار ستونوں میں سے ایک

خواجہ محمد ناصر عندلیب کے بیٹے، دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا اجداد عالمگیر بخارا سے ہجرت کر کے دہلی آئے تھے۔ سلسلہ نسب والد کی طرف سے حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند اور ماں کی جانب سے حضرت غوث الاعظم تک پہنچتا ہے۔ قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ اور تصوف پر دسترس رکھتے تھے۔ موسیقی پر بھی عبور تھا۔ سپاہی پیشہ تھے، لیکن والد کے حکم پر نوکری چھوڑ کر درویشی اختیار کی۔ 28 برس کی عمر میں دنیاوی معاملات سے دست کش ہو گئے۔ 39 سال کی عمر میں والد کے انتقال پر ان کے سجادہ نشین ہوئے۔ خاندان میں پیری مریدی کا سلسلہ تھا۔ دہلی پر آئے دن کی تباہیوں سے جہاں دوسرے اہل کمال دوسری جگہوں پر ہجرت کر گئے وہیں انہوں نے دہلی سے قدم باہر نہ نکالا۔ استغنا کا یہ عالم تھا کہ بادشاہ وقت تک سے ملنے میں عار محسوس کرتے تھے ہر مہینے کی دوسری اور چوبیسویں تاریخ کو محفل سماع منعقد کراتے تھے جس میں بڑے بڑے قوال اپنا کمال دکھاتے تھے۔ دہلی میں 1819ء میں وفات پائی۔ میر درد اردو شاعری کے چار ستونوں میں سے ایک تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اردو شاعری میں متصوفانہ مضامین ان سے بہتر کسی نے نہیں باندھے۔ ان کی تصانیف میں رسالہ احکام الصلوٰۃ 15 برس کی عمر میں دوران اعتکاف لکھا تھا۔ "واردات درد" جو تصوف کے متعلق ہے 29 سال کی عمر میں تصنیف کی تھی۔ علم الکتاب پر 111 رسالے ہیں۔ نالۂ درد 1777ء میں تصنیف ہوا۔ آہ سرد 1780ء میں لکھا گیا۔ ان کے علاوہ درد دل اور شمع محفل وغیرہ بھی ہیں۔ ایک دیوان فارسی اور ایک اردو میں یادگار چھوڑا ہے۔

میر تقی میر (م 225ھ/1810ء)

اردو زبان کا نامور صاحب طرز شاعر اور تذکرہ نگار، زندہ جاوید غزل گو

میر تقی میر کے بزرگ حجاز سے دکن اور پھر احمد آباد گجرات پہنچے ان کے جد اعلیٰ نے اکبر آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ میر ابھی کم سن تھے اور ان کی عمر ابھی صرف گیارہ برس تھی کہ ان کے والد میر محمد علی متقی نے وفات پائی اور میر بھی مشاہیر عالم کی اکثریت کی طرح کم سنی میں یتیم ہو گئے۔ یتیمی نے میر کے بچپن پر اور ان کے ذہن میں غم والم کے دیرپا نقوش ثبت کر دیے۔ والد کی وفات کے بعد ان کے سوتیلے بھائی میر محمد حسن نے بھی ان کے سر پر دست شفقت نہ رکھا۔ چنانچہ اسی کم سنی میں جب وہ بڑی کس مپرسی کی حالت کو پہنچے تو تلاش معاش میں دلی آ گئے۔ دہلی میں نواب صمصام الدولہ امیر الامراء نے جو ان کے والد کے معتقد تھے، اپنی سرکار سے ایک روپیہ ان کا روزینہ مقرر کیا تا آنکہ نواب صاحب نادر شاہ کے حملہ دہلی میں مارے گئے اور میر کی یہ وجہ معاش بھی بند ہو گئی اور وہ اکبر آباد واپس لوٹ گئے جہاں وہ اپنے بھائی کے ماموں سراج الدین علی خاں آرزو بھی ان سے بدسلوکی سے پیش آئے۔ میر تقی میر بڑی حساس طبیعت کے مالک تھے اس لیے ایک بار پھر اکبر آباد کو چھوڑنا پڑا۔ کچھ مورخین نے میر کے اکبر آباد سے اس مرتبہ نکلنے کو ایک واقعہ محبت سے مربوط کیا ہے۔ بہر حال ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان سب غم والم کے سبب ان پر جنون کی سی حالت طاری ہو گئی جو اگرچہ علاج معالجے سے دور ہو گئی مگر ان کے ذہن پر اس کے اثرات ہمیشہ باقی رہے۔ اس کے بعد میر رعایت خاں کی مصاحبت میں رہے پھر کچھ دیر کے لیے دیوان مہانرائن کی پھر جب نادر شاہی اور احمد شاہی خونریزیوں کے سبب دلی اجڑی اور لکھنؤ آباد ہوا تو میر لکھنؤ چلے گئے اور تادم مرگ لکھنؤ ہی میں

رہے۔ سال وفات میں اختلاف ہے اکثر کی رائے میں بعمر 90 سال 225ھ/1810ء میں وفات پائی۔

تصانیف کلیات نظم اردو میں جس میں غزلیات کے چھ دیوان بتائے گئے ہیں اور مثنویات میں دریائے عشق، شعلہ عشق، معاملات عشق، اعجاز عشق اور جوش عشق شامل ہیں۔

حکیم محمد مومن خان (م 1268ھ/1851ء)

اردو زبان کے صف اول کے شاعر اور غزل گو

حکیم محمد مومن خان، اردو زبان کے صف اول کے شعراء میں سے ایک اور نجبائے کشمیر میں سے تھے۔ ان کے دادا حکیم مدار خان شاہ عالم کے عہد میں دہلی آئے اور شاہی اطباء میں داخل ہوگئے۔ شاہی سرکار سے موضع بلاھہ جاگیر میں ملا۔ یہ جاگیر نواب آف جھجر نے ضبط کر کے ایک ہزار روپیہ سالانہ پنشن مقرر کر دی یہ پنشن ان کے خاندان میں چلتی رہیں۔ مومن کا خاندان دہلی کے کوچہ چیلاں میں رہتا تھا۔ یہیں مومن 1215ھ/ 1800ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام محمد مومن رکھا گیا۔ عربی کی تعلیم شاہ عبدالقادر دھلوی سے حاصل کی۔ فارسی میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ حفظ قران مجید کے کوچہ عاشقی میں نکل گئے جس کا ذکر انہوں نے اپنی مثنوی ''شکایت ستم'' میں کیا ہے۔

علوم متداولہ کے علاوہ طب، رمل، نجوم، شطرنج، موسیقی اور ریاضی میں بھی دخل رکھتے تھے۔ بعض درباروں سے بھی متعلق رہے اور ایک بار لکھنو اور حیدر آباد کی کشش نے انہیں نقل مکانی پر آمادہ کر دیا تھا۔ عام خیال یہ ہے کہ مومن قصیدہ گوئی کو عیب سمجھتے تھے، لیکن یہ درست نہیں کیونکہ ان کے کلام میں راجا اجیت سنگھ کی تعریف میں قصیدہ اور نواب وزیر محمد خاں والی ٹونک کی تعریف میں اشعار موجود ہیں۔

تذکرہ نگاروں نے دو چیزوں سے ان کی وابستگی بتائی ہے جس نے ان کی زندگی اور شاعری دونون پر اثر ڈالا تھا۔ ان میں سے ایک تو ان کی رنگین مزاجی تھی اور دوسری مذہب سے ان کی گہری عقیدت اور بزرگان دین سے محبت۔ ان نو قصیدوں میں سے سات حمد و نعت اور مناقب میں ہیں۔

قیاس ہے کہ مومن نے مئی 1818ء اور مئی 1819ء کے درمیان سید احمد بریلوی سے بیعت کی تھی تاہم جہاد کی تحریک میں عملی طور پر حصہ نہ لیا البتہ جہاد کی حمایت میں ان کے ہاں شعر ملتے ہیں۔ کلب علی خان نے رقعات مومن کے حوالے سے لکھا ہے کہ انہوں نے دو شادیاں کی تھیں۔ مومن کے شاعرانہ مرتبے پر تمام تذکرہ نگار متفق ہیں کہ انہیں قصیدہ، مثنوی اور غزل پر یکساں قدرت حاصل تھی۔

میرزا اسداللہ خان غالب (م 1285ھ/ 1869ء)

برصغیر پاک و ہند میں اردو اور فارسی کے عظیم صاحب دیوان شاعر اور متعدد کتابوں کے مصنف

میرزا اسداللہ غالب 27 دسمبر کی شب 1797ء میں طلوع سحر سے چار ساعت پہلے آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم شیخ معظم سے حاصل کی۔ پھر یزد کا ایک جلیل القدر امیر زادہ جو زردشت کا مذہب چھوڑ کر مسلمان ہوا تھا آگرہ میں دو برس غالب کے ہاں مقیم رہا۔ اس نے تمام علوم عقلیہ بغداد سے حاصل کیے تھے۔ غالب اسے جاماسپ عہد اور جمہر عصر کہتے تھے۔ اسی سے انہوں نے فارسی اور عربی پر عبور حاصل کیا۔ غالب دس سال کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے، شروع میں میرزا بیدل، میرزا جلال اسیر اور شوکت بخاری کی طرز میں شعر کہے۔ 13 سال کی عمر میں غالب کی شادی نواب بخش خاں کی بیٹی سے ہوئی

بقول حالی میرزا کو اپنی بیوی سے بہت محبت تھی۔ مگر انہوں نے اپنے خطوط میں اس کے برعکس لکھا ہے کہ خانگی زندگی میں بھی مسرت اور سکون میسر نہ ہوا۔ شادی کے بعد دہلی میں رہنے لگے۔ شاعری میں کسی کی شاگردی نہیں کی۔ پہلے اسد اور پھر غالب تخلص اختیار کیا۔ طبیعت شروع سے فارسی گوئی کی طرف مائل تھی بعد میں اردو میں مراسلت کی ابتداء کی۔ 1826ء میں بسلسلہ قضیہ پنشن لکھنؤ اور بنارس سے ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے اور تین سال وہاں قیام کے باوجود شنوائی نہ ہوئی۔ 1847ء میں کوتوال دہلی نے بربنائے مخالفت ومخاصمت تین ماہ کی سزا دی۔ 1850ء میں بہادر شاہ ظفر نے شاہان تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا اور پچاس روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کیا۔ ساتھ ہی نجم الدولہ، دبیر الملک اور نظام جنگ کا خطاب عطا کیا۔ 1852ء میں کتاب کا نصف حصہ ''مہر نیم روز'' فارسی میں مکمل کیا۔ 1854ء میں ذوق کے انتقال پر بہادر شاہ نے اپنا استاد بنایا، 1857ء کے ہنگاموں کے بعد غالب کا وظیفہ اور پنشن بند ہوگئی۔ امن بحال ہونے پر رامپور گئے نواب یوسف علی خان نے سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کیا بعد تحقیق کے پنشن بھی بحال ہوگئی۔ بعمر 72 سال 1869ء میں فوت ہوئے اور درگاہ نظام الدین اولیاء کے قرب میں دفن ہوئے۔

اردو فارسی کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ نظم ونثر میں ان کا کوئی ثانی نہیں ملتا۔ اور نثر کی سادہ نگاری انہیں کی مرہون ہے۔ شاعری میں طرز جدید کے موجد مانے جاتے ہیں۔

شیخ محمد ابراہیم ذوق (م 1271ھ/1854ء)

اردو صاحب دیوان مشہور شاعر، خاقانی ہند اور استاد بہادر شاہ ظفر

شیخ محمد ابراہیم ذوق، اردو کے مشہور شاعر، ولادت۔ 11 ذوالحجہ 1204ھ/22 اگست 1790ء کو ہوئی۔ ذوق شیخ محمد رمضان کے اکلوتے بیٹے تھے جو دہلی کے نواب لطف خان کے معتمد علیہ تھے۔ ابتدائی تعلیم حافظ غلام رسول شوق کے مکتب سے حاصل کی۔ شوق خود بھی شاعر تھے۔ استاد نے اپنے اس شاگرد میں شعر گوئی کا ذوق پیدا کر دیا اور انہوں نے میرزا سودا کے طرز پر شعر کہنے شروع کر دیئے اور ایک نوجوان شاعر کی حیثیت سے انہیں شہرت حاصل ہوتی چلی گئی۔

ذوق نے طب، موسیقی اور نجوم وغیرہ کا مطالعہ بھی بڑے انہماک سے کیا پھر جب آگے چل کر انہوں نے قصائد کہنے شروع کیے تو ان علوم کی فنی اصطلاحات سے خوب فائدہ اٹھایا، ذوق کی شہرت پھیلی تو ان کے ایک ہم جماعت میر کاظم حسین نے انہیں ابوظفر ولی عہد سلطنت اکبر شاہ ثانی کے حضور میں پیش کیا جن کے اشعار کی اصلاح آگے چل کر 1816ء میں ان کے ذمے کی گئی۔ ذوق نے اکبر شاہ ثانی کی خدمت میں جو قصیدہ پیش کیا اس پر ''خاقانی ہند'' کا لقب پایا۔

1837ء میں جب ان کا شاگر مغل شہزادہ بہادر شاہ ثانی کے لقب سے تخت نشین ہوا تو ذوق درباری شاعر بن گئے اور ان کے مشاہرے میں اضافہ ہوا اور پیرانہ سالی میں انہیں خان بہادر کا خطاب بھی ملا۔ جشن عید اور شاہی قلعہ میں منعقد ہونے والی دیگر تقریبات پر قصیدہ خوانی کی بدولت بھی انہیں بہت سی مراعات حاصل ہوئیں۔ اسی زمانے میں دکن کے مدار المہام چندولال نے انہیں دکن آنے کی دعوت دی مگر انہوں نے ایک غزل ''کون جائے ذوق دل کی گلیاں چھوڑ کر'' انہیں ارسال کی اور خود نہ گئے۔ ذوق کا انتقال 23 صفر 1271ھ/15 نومبر 1854ء کو ہوا یوں وہ جنگ آزادی کے ہنگاموں سے پہلے ہی دنیا چھوڑ گئے۔

ذوق ایک پرگو شاعر تھے لیکن ان کے کلام کا بہت سا حصہ 1857ء کے ہنگاموں کی نذر ہو گیا۔ شیفتہ نے لکھا ہے کہ ذوق نے اپنے کلام کو دیوان کی صورت میں مرتب نہیں کیا تھا۔ شاعری کی حیثیت سے ذوق اپنے معاصرین میں بھی ہردلعزیز

تھے۔ مگر غالب سے ان کی نوک جھونک رہتی تھی۔ ان کے شاگردوں میں بڑے نامور اہل سخن ہوئے جن میں ظفر، داغ، آزاد، ظہیر اور انور کو خاص طور پر ناموری حاصل ہوئی۔

اکبرالہ آبادی (م 340ھ/ 1921ء)

اردو کے منفرد اور طنز نگاری میں ممتاز شاعر

اکبرالہ آبادی کا نام سلیم اکبر حسین رضوی تھا وہ 16 نومبر 1846ء کو پیدا وئے۔ ان کی والدہ اکبر کی تعلیم کے خیال سے الہ آباد آگئی تھیں۔ ابتدائی تعلیم عربی فارسی تعلیم والد سے حاصل کی۔ 1856ء میں جمنا مشن اسکول میں داخل ہوئے مگر 1859ء میں تعلیم چھوڑ دی مگر مطالعہ جاری رکھا اور انگریزی، فلسفہ اور تصوف میں اچھی خاصی استعداد پیدا کرلی مصوری کا بھی شوق رہا۔ 1867ء میں وکالت کا امتحان پاس کر کے کچھ عرصہ وکالت بھی کی اور عارضی طور پر نائب تحصیل دار اور پھر داروغہ آبکاری بھی رہے۔ 1870ء میں ہائی کورٹ میں چیف جسٹس کے مثل خواں مقرر ہوئے اور 1894ء میں سیشن جج مقرر ہوئے۔ 9 ستمبر 1921ء کو وفات پائی اور الہ آباد میں دفن ہوئے۔

گیارہ برس کی عمر میں شعر گوئی کا آغاز کیا تھا اور سترہ برس کی عمر میں غزلیں کہنے لگے تھے۔ 1867ء تک اچھی خاصی شہرت شاعری میں حاصل ہو چکی تھی۔

اکبرالہ آبادہ کا امتیازی کارنامہ ان کی شاعری ہے، خاص رنگ ظرافت نے انہیں اردو ادب میں منفرد مقام دیا ہے۔ ان کی غزل بھی معنی اور اسلوب کے لحاظ سے قابل توجہ ہے۔ ابتداء سے 1866ء تک نومشقی کا دور تھا اس میں پرانا رنگ پایا جاتا ہے۔ 1866ء سے 1883ء تک اگرچہ رنگ وہی ہے مگر پختگی پائی جاتی ہے۔ 1884ء سے 1909ء تک اخلاقیات و روحانیات کی چاشنی اور ظریفانہ انداز نکھر کر سامنے آگیا۔ 1909ء سے 1912ء تک حسن وعشق کے ساتھ ساتھ حقائق وعرفان کا میلان زیادہ ظرافت کی نوک تیز تر اور سیاسی طنز پر مخزن نے انہیں "لسان عصر" کا خطاب پیش کیا تھا۔ 1912ء سے 1921ء تک کی شاعری میں زندگی کی بے حقیقتی اور بے ثباتی کا اظہار ہے مگر سیاسی اور مجلسی طنز بھی موجود ہے اور انداز میں شوخی قائم ہے۔

اکبرالہ آبادی طنز نگاری میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کی طنز کا دارومدار اسلوب پر بھی ہے اور مواد پر بھی۔ اکبر کی غزل بھی ایک خاص رنگ کی حامل ہے۔ ان کی غزل کا ہر دور معانی ومضامین کے امتیاز کی وجہ سے الگ الگ پہچانا جاتا ہے۔

علامہ محمد اقبال (م 1357ھ/ 1938ء)

مفکر پاکستان، برعظیم پاک وہند کے شہرہ آفاق شاعر و مفکر، متعدد شعری مجموعوں اور کتب کے مصنف

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال 22 فروری 1873ء/ 20 ذوالحجہ 1289ھ کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ علامہ کے والد اگرچہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن فہم حقائق میں ایسی دسترس حاصل تھی کہ شمس العلما مولانا میر محمد حسن سیالکوٹی جیسے عالم انہیں ان پڑھ فلسفی کے خطاب سے یاد کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم مکتب سے شروع ہوئی پھر پرائمری اور مڈل ومیٹرک کے امتحانوں میں وظیفہ حاصل کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم کے دوران اقبال کا خاص تعلق پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ، استاد فلسفہ سے پیدا ہوا جو عربی کے بھی فاضل تھے اور اپنی کتاب PREACHING OF ISLAM کی بدولت شہرہ آفاق ہیں۔ ایم اے کرنے کے بعد اقبال نے 1899ء میں اورینٹل کالج لاہور میں عربی ایڈر مقرر ہوئے، اسی دوران اسلامیہ کالج لاہور میں انگریزی اور

فلسفے کے استاد بھی رہے۔ اسی زمانے میں علامہ نے علم الاقتصاد پر ایک کتاب لکھی تھی جو ان کے قول کے مطابق اردو میں سب سے مستند کتاب تھی۔

1895ء میں لاہور میں حکیم امین الدین بیرسٹر کے ہاں ایک طرحی مشاعرہ منعقد ہوا جس میں اقبال نے اپنی پہلی طرحی غزل ع موتی سمجھ کر شان کریمی نے چن لیے پھر اپنے احباب کے اصرار پر علامہ نے انجمن حمایت الاسلام کے لیے اپنی پہلی مشہور نظم "نالہ یتیم" لکھی۔ یہ نظم بہت مقبول ہوئی۔ پھر اقبال کی نظمیں انجمن کے سالانہ جلسوں کی ایک امتیازی خصوصیت بن گئیں۔ ادھر ساتھ ساتھ علامہ کی شاعری پر نکھار آتا چلا گیا اور اقبال شعرائے ہند کی صف اول میں ممتاز مقام پر فائز ہوگئے۔ اگست 1905ء میں آپ ولایت گئے اور تین سال آپ نے یورپ میں گزارے اور کیمبرج اور میونخ یونیورسٹیوں میں اعلیٰ امتحان پاس کیے۔ لندن یونیورسٹی میں چھ ماہ کے لیے عربی کے پروفیسر رہے۔ واپسی پر لاہور میں گورنمنٹ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ حکومت نے کالج میں کام کے ساتھ وکالت کی اجازت بھی دے دی۔ دو تین سال کی خاموشی کے بعد ان کی قومی و ملی نظموں کا زریں سلسلہ پھر جاری ہوگیا اور اس مرتبہ بات "شکوہ" اور "جواب شکوہ" تک پہنچی۔ اقبال نے عملی سیاست میں بہت حصہ لیا مگر 1930ء کا ان کا خطبہ الٰہ آباد برصغیر کی سیاست میں یادگار اور قیام پاکستان کی تاریخ میں اہم ہے۔ 21 اپریل 1938ء کو علم و حکمت اسلامی کا یہ آفتاب غروب ہوگیا۔

فیض احمد فیض (م 1984ء)

جدید زمانے کے اردو شعرا میں ایک اہم شخصیت اور مارکسی فلسفے کے علمبردار شاعر

فیض احمد فیض، شاعر اور صحافی، کالا قادر ضلع نارووال میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج اور اورنٹل کالج لاہور سے انگریزی اور عربی میں بالترتیب ایم۔ اے کیا۔ 1936ء میں ایم اے او کالج امرتسر اور 1940ء میں ہیلی کالج آف کامرس میں انگریزی کے لیکچرار مقرر ہوئے۔

دوسری جنگ کے دوران (1942ء) فوج کے محکمہ تعلقات عامہ میں خدمات انجام دیں، وہاں کیپٹن کے عہدے سے ترقی کر کے لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے تک پہنچے۔ جنگ عظیم دوم کے اختتام پر 1946ء میں میاں افتخار الدین کے قائم کردہ اشاعتی ادارے پروگریسو پیپرز لمیٹڈ نے روزنامہ پاکستان جاری کیا تو فیض اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

قیام پاکستان کے بعد اسی ادارے کے زیر اہتمام روزنامہ امروز اور بعد ازاں ہفت روزہ لیل و نہار کا اجرا ہوا تو فیض ان تینوں اخبارات کے ایڈیٹر ان چیف مقرر ہوئے۔ اسی دوران ٹریڈ یونین فیڈریشن کے نائب صدر منتخب ہوئے اور مزدوروں کے نمائندے کی حیثیت سے آئی ایل او نمائندے کی حیثیت سے جینوا اجلاس میں شرکت کی۔ 9 مارچ 1951ء کو حکومت کا تختہ الٹنے کے الزام میں گرفتار کر لیے گئے اور 1955ء میں رہائی ملی۔

صدر ایوب نے پروگریسو پیپرز کا ادارہ سرکاری تحویل میں لیا تو فیض صاحب اس ادارے سے الگ ہوگئے اور کچھ عرصہ عبداللہ ہارون کالج کراچی میں انگریزی ادبیات کے استاد رہے۔ ملک کے متعدد سرکاری و نیم سرکاری ثقافتی اداروں کے عہدہ دار مقرر کیے گئے۔

شعر گوئی کا آغاز طالب علمی کے زمانہ سے کیا تھا۔ ابتداء میں صرف غزلیں کہتے تھے۔ ذہنی بلوغت کے بعد نظمیں کہنا شروع کیں۔۔ لاہور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ قائم کرنے میں سجاد ظہیر کی مدد کی اور ایک عرصہ اس انجمن کے روح رواں رہے۔ کیمونزم یا مارکسی فلسفہ کے علمبردار تھے۔ 1962ء میں لینن ایوارڈ بھی ملا۔ مجموعہ کلام میں نقش فریادی،

زنداں نامہ، دست صبا، سروادیٔ سینا، متاع لوح وقلم اہم ہیں۔ دیگر تصانیف میں شام شہر یاراں، مہ وسال، آشنائی قابل ذکر ہیں۔ 1984ء میں وفات پائی۔

صوفی تبسم (م 1978ء)

بچوں کے لیے ٹوٹ بٹوٹ جیسے دلچسپ کردار کے خالق اور پنجابی کے عظیم شاعر

ممتاز شاعر اور ادیب۔ امرتسر، مشرقی پنجاب (انڈیا) میں 4 اگست 1899ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم چرچ مشن ہائی اسکول امرتسر میں حاصل کی۔ پھر لاہور چلے آئے اور ایف سی کالج سے بی اے آنرز کیا۔ اسلامیہ کالج سے ایم اے کرنے کے بعد ستمبر 1927ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں تعینات ہوئے۔ ستمبر 1931ء تا 1954ء گورنمنٹ کالج لاہور میں خدمات انجام دیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد خانہ فرہنگ ایران کے ڈائرکٹر رہے۔ 25 برس تک پنجاب یونیورسٹی میں فارسی اور اردو کی کلاسوں کو پڑھاتے رہے۔ اردو شاعری میں حکیم فیروز الدین طغرائی سے تلمذ رکھتے تھے۔ عرصے تک فارسی شعر بھی کہتے رہے۔ ریڈیو پاکستان سے وابستہ بھی رہے۔ بچوں کے لیے ٹوٹ بٹوٹ اور جھولنے جیسی نظمیں لکھیں۔ تصانیف میں ٹوٹ بٹوٹ، دوگونہ (امیر خسرو کی سو چیدہ فارسی غزلوں کا اردو ترجمہ)۔ نثر میں مسلمانوں کا علم جغرافیہ اور شوق سیاحت۔ شرح غزلیات فارسی، صد شعر اقبال، غالب کے فارسی دیوان کی شرح، کارل جیک کے ڈرامے کا ترجمہ جاہ وجلال کے نام سے طبع ہوا۔

1963ء میں حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی اور 1967ء میں ستارہ امتیاز سے نوازا۔ ایرانی حکومت نے تمغہ نشان فضیلت عطا کیا۔ آپ نے اقبالیات کے سلسلے میں بھی کافی کام کیا۔ صد شعر اقبال پر ادارہ مصنفین پاکستان کی طرف سے 3 ہزار روپے کا نقد انعام ملا۔ ٹوٹ بٹوٹ کی تخلیق پر انعام پایا۔ علامہ اقبال کے جشن صد سالہ کے سلسلہ میں شب و روز محنت کی۔ 1978ء میں لاہور میں انتقال ہوا۔

ساحر لدھیانوی (1922ء-1980ء)

اردو شاعر، نام عبدالحئی تھا۔ ساحر تخلص کرتے تھے۔ 1938ء میں خالصہ ہائی اسکول لدھیانہ سے میٹرک کر کے گورنمنٹ کالج میں داخل لیا اور ملکی سیاست میں حصہ لینے لگے۔ 1942ء میں جب بی۔ اے فائنل میں تھے، یہ معلوم ہونے پر کہ انگریز دشمنی کی پاداش میں کالج سے نکال دیئے جائیں گے، لاہور آ کر اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا، لیکن بوجوہ امتحان سے پہلے ہی تعلیم ترک کر دینا پڑی۔ کچھ عرصہ ادب لطیف، شاہکار اور سویرا کی ادارت کی۔ تقسیم ہند کے بعد بمبئی چلے گئے اور فلمی گانے لکھنے لگے۔ ہندوستان ترقی پسند ادب تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ مجموعہ ہائے کلام، تلخیاں، گاتا جائے بنجارا، پرچھائیاں اور کلیات ساحر ہیں۔ 1980ء میں وفات پائی۔

احمد ندیم قاسمی (م 2006ء)

اردو زبان کے جدید شعراء اور ادباء میں سے ایک عظیم شخصیت

احمد ندیم قاسمی، شاعر و ادیب، انگہ ضلع خوشاب میں 1916ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام پیر غلام نبی عرف نبی چن تھا۔ 1935ء میں ایجرٹن کالج بہاولپور میں سے بی اے کیا۔ 37-1936ء میں ریفارمز کمیشن میں محرری یا کلرکی کرتے

رہے۔ اوکاڑہ میں کچھ دن ٹیلی فون آپریٹر بھی رہے۔ 1942ء میں ہفت روزہ پھول اور ہفت روزہ تہذیب نسواں لاہور کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ 1943ء میں ماہنامہ ادب لطیف کے مدیر مقرر ہوئے۔ 1948ء تا 1949ء رسالہ نقوش کی بھی ادارت کی۔ 1948ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے سیکریٹری جنرل منتخب ہوئے۔ مئی 1957ء میں پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت چھ ماہ کے لیے نظر بند کیے گئے۔

1953ء میں پروگریسو پیپرز کے اخبار امروز کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ 1958ء میں پھر پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت ایک سال کے لیے نظر بند کر دیے گئے۔ 1959ء میں پروگریسو پیپرز پر صدر ایوب کے سرکاری قبضے کے بعد امروز سے استعفیٰ دے دیا۔ 1963ء میں ادبی مجلہ فنون جاری کیا۔ 1976ء میں بزم اقبال کے اعزازی سیکرٹری مقرر ہوئے۔ 10 جولائی 2006ء کو لاہور میں وفات پائی۔

شعری مجموعے، رم جھم، جلال و جمال، شعلہ گل، دشت وفا اور محیط ہیں۔ افسانوں کے مجموعے چوپال، بگولے، طلوع و غروب، سیلاب و گرداب، آنچل، آبلے، آس پاس وغیرہ اہم ہیں۔ ان کے افسانوں کے کل 16 مجموعے شائع ہوئے۔ احمد ندیم قاسمی کی دو کتابوں کا ترجمہ جاپانی، چینی اور روسی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ انہوں نے بچوں کے لیے کہانیاں بھی لکھیں۔

حکومت پاکستان نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں تمغہ حسن کارکردگی عطا کیا اور بعدازاں ستارہ امتیاز سے بھی نوازا۔ 1998ء میں انہیں وزیراعظم کا کمال فن ایوارڈ بھی دیا گیا۔ یہ اس سلسلے کا پہلا ایوارڈ تھا جو کسی شخصیت کو اس کی پوری زندگی کی ادبی خدمات پر دیا گیا۔

احمد فراز (م 2008ء)

بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں اردو زبان کے جدید شعراء میں سے ایک

احمد فراز کا خاندانی نام سید احمد شاہ تھا۔ وہ 14 جنوری 1931ء کو کوہاٹ میں پیدا ہوئے۔ اسلامیہ ہائی اسکول کوہاٹ سے میٹرک کرنے کے بعد ایڈورڈز کالج پشاور سے ایم اے فارسی اور ام اے اردو کے امتحانات اعزازی طور پر پاس کیے۔ ان کے والد بزرگوار، آغا برق شاعری کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی شاعری کی ابتداء ان کے گھر سے ہوء۔ 1950ء سے 1960ء تک ریڈیو پاکستان میں بطور پروڈیوسر ملازمت کی۔ بعدازاں اسلامیہ کالج پشاور میں بطور لیکچرار کستان نیشنل سنٹر راولپنڈی کے ڈائرکٹر رہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان لوک ورثہ اور نیشنل بک فاؤنڈیشن کے سربراہ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ان کا انتقال 2008ء میں ہوا۔

ادبی زندگی کا آغاز زمانہ طالب علمی سے ہوا تھا۔

ان کی شعری تصانیف میں یہ اہم مجموعے شامل ہیں۔

(1) تنہا تنہا (2) دردآشوب (3) نایافت (4) جاناں جاناں (5) شب خون (6) میرے خواب ریزہ ریزہ (7) بے آواز گلی کوچوں میں (8) نابینا شہر میں آئینہ (9) پس انداز موسم (10) سب آوازیں میری ہیں (11) خواب گل پریشاں (12) کلیات فراز۔

ان کی ادبی خدمات پر مختلف اداروں نے انہیں مختلف ایوارڈز سے نوازا۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(1) آدم جی ایوارڈ 1966ء (2) اباسین ایوارڈ 1990ء (3) فراق گورکھپوری ایوارڈ بھارت 1988ء (4)

اکیڈمی آف اردو لٹریچر کینیڈا1991ء(5) ٹاٹا ایوارڈ جمشید نگر بھارت 1992ء(6) نقوش ایوارڈ 1993ء(7) ستارہ امتیاز حکومت پاکستان 1995ء۔اس کے علاوہ ان کی شخصیت اور فن پر پی ایچ ڈی کے مقالے بھی لکھے گئے ہیں۔

مظفر وارثی (م 2011ء)

پاکستان کے وہ نعت گو شاعر جن کی آواز میں ترنم، مٹھاس اور شاعری میں ادب شامل تھا

مظفر وارثی کا پورا نام محمد مظفر الدین احمد تھا۔وہ 23 دسمبر 1933ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ان کے والد گرامی قدر علامہ صوفی شرف الدین وارثی میرٹھ فصیح الہند اور شرف شعراء کے خطابات سے یاد کیے جاتے تھے۔مظفر وارثی نے ایم اے او کالج سے ایف کیا اور بعدازاں ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا اور 1953ء میں اسٹیٹ بینک آف آفیسر ریٹائر ہوئے۔ دوران ملازمت انہوں نے شاعری اور نعت گوئی کے سلسلے کو جاری رکھا۔حمد، نعت، غزل، گیت اور قطعات غرض ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔تحریر اور آواز دونوں مقامات پر اپنا دلکش اور مسحور کن نقش رکھتے تھے۔اکثر ترنم سے نعت پڑھتے تھے۔ان کا کلام فنون، ادب لطیف، ماہ نور، اوراق، اخبار جہاں، افکار، سویرا، بیسویں صدی اور شمع دہلی بھارت کے علاوہ پاکستان کے قومی اخبارات میں شائع ہوتا رہا تھا۔

ان کے قابل ذکر شعری مجموعے یہ ہیں۔(1) برف کی ناؤ، باب حرم، لہجہ، نور ازل، الحمد، حصار، لہو کی ہریالی، ستاروں کی آبجو، کعبہ کا عشق، کھلے دریچے بند ہوا۔ دل سے در نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک، ظلم نہ سہنا، کمند، میرا آسمان، کلیات۔ 1980ء میں انہیں ٹی وی کے بہترین نعت گو شاعر ایوارڈ اور 1981ء میں قومی تشخص ایوارڈ سے نوازا گیا۔اور صدارتی تمغہ حسن کارکردگی عطا ہوا۔صدر ضیاء الحق ان کی نعت گوئی سے خصوصی طور پر متاثر تھے۔

خطاط، نقاش اور معمار

ابن البواب (م413ھ/1022ء)
بہزاد (م946ھ/1298ء)
قاسم آغا (م1070ھ/1659ء)
عبدالصمد شیریں قلم (حیات 1593ء)
عبدالرحمٰن چغتائی (م1975ء)
ملک عاشق ملتانی (م2005ء)
یاقوت المستعصمی (م698ھ/1298ء)
معمار سنان ترک (م996ھ/1588ء)
احمد لاہوری
عبدالمجید صوفی پروین (1946ء)
صادقین (م1987ء)
خادم انسانیت عبدالستار ایدھی (م2016ء)

ابن البواب (م413ھ/1022ء)

ابوالحسن علاء الدین علی بن ہلال، مشہور عرب خوش نویس

ابن البواب (دربان کا بیٹا) ابوالحسن علاء الدین علی بن ہلال کا عرفی نام ہے۔ جو ایک مشہور عرب خوش نو نویس تھا اور بارگاہ خلفائے بغداد کے ایک دربان کا بیٹا تھا۔ اسے ابن الستری بھی کہتے تھے۔ اس کی وفات 413ھ/1022ء میں ہوئی اور اسے بغداد میں امام احمد بن حنبل کے مزار کے قریب دفن کیا گیا۔ اسے علم فقہ پر بھی دسترس حاصل تھی۔ قرآن مجید اسے حفظ تھا اور اس نے قرآن مجید کے چونسٹھ نسخے اپنے ہاتھ سے لکھے تھے۔ اُن میں سے ایک نسخہ جو خط ریحانی میں لکھا ہوا ہے قسطنطنیہ کی لالہ لی مسجد میں موجود ہے جسے سلطان سلیم اول نے وہاں کے لیے وقف کیا تھا۔ اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا جاہلی شاعر سلامۃ بن جندل کا دیوان بھی آیا صوفیہ کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس نے خط ریحانی اور خط محقق ایجاد کیے اور خطاطی کے بھی ایک نئے دبستان کی بنیاد رکھی تھی جو خطاط یاقوت المستعصمی کے زمانے تک باقی رہا تھا۔

یاقوت المستعصمی (م698ھ/1298ء)

ایک مشہور خطاط اور معروف قلمکار جو آخری عباسی خلیفہ کا غلام تھا

جمال الدین ابوالمجد بن عبداللہ، ایک مشہور خطاط، وہ بغداد کے آخری عباسی خلیفہ المستعصم کا غلام تھا، جس نے اس کی پرورش کی اور تعلیم دلائی تھی۔ اس کے عرف المستعصمی کا یہی باعث ہے۔ اس کا حسب و نسب غیر معلوم ہے۔ بعض

مورخین کے مطابق وہ امامیہ کا رہنے والا ایک یونانی تھا۔ جسے کسی جنگ کے دوران اسے غلام بنا کر بیچ دیا گیا تھا اور اُسے خواجہ سرا بنا دیا گیا تھا۔ اس کی وفات بمقام بغداد 698ھ/ 1298ء میں بعمر اسی برس قمری ہوئی تھی۔ ابن البواب کی کتابت اور خطاطی کی روایات کو جاری رکھنے کی وجہ سے اسے ''قبلۃ الکتاب'' یعنی خوش نویسوں کا نمونہ یا استاد کہتے تھے اور وہ ایک مدرسہ کا سربراہ بھی تھا۔ اسے نظم ونثر کہنے کا بھی ملکہ حاصل تھا۔ اس کے قلم سے اشعار کا ایک انتخاب کتاب اخبار اور ایک مجموعہ امثال ''افکار الحکماء'' میں دیا گیا ہے۔ اس کے لکھے ہوئے قرآن مجید کے نسخے مندرجہ ذیل لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ آیا صوفیہ، قسطنطنیہ، قاہرہ، کتاب خانہ ملی پیرس، ذخیرہ PEYTEL وغیرہ۔

بہزاد (م946ھ/ 1536ء)

استاد کمال الدین، ایران کا سب سے نامور مینا توری مصوف

بہزاد کی ان فنی تخلیقات کی بنا پر جو اس وقت موجود ہیں یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس کی پیدائش 854ھ/ 1450ء اور 865ھ/ 1460ء کے درمیان ہوئی تھی۔ ہندوستان کے شہنشاہ جہانگیر نے توزک جہانگیری میں لکھا ہے کہ بہزاد نے ایک فنکار خلیل مرزا کی طرز میں مصوری شروع کی تھی۔ بہر حال بہزاد کی ہنروری کا اعتراف قدر شناسوں نے بہت جلد کیا اور اپنے پہلے سرپرست میر علی شیر نوائی اور بعد کے زمانے میں تیموری سلطان حسین بایقرا کی عنایت سے اسے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو پیش کرنے کے بہت سے مواقع پیش آئے۔ سلطان حسین کا دربار ہرات میں تھا، اس زمانے کے منتخب روزگار علما و فضلاء اس دربار میں موجود تھے۔ ان میں ملا عبدالرحمٰن جامی، خواند امیر اس بزم کے گویا شہ نشین تھے۔ شیبانی کے ہاتھوں سلطان حسین کی حکومت کی بربادی کے بعد بھی بہزاد ہرات ہی میں مقیم رہا۔ سلطان حسین کے بارے میں بابر نے لکھا ہے کہ یہ سلطان خود قلم لے کر بہزاد کی تصویروں کی اصلاح کرتا تھا۔ بابر نے دراصل سلطان حسین کی مذمت کی ہے۔ شاہ اسمٰعیل صفوی کے ہرات فتح کرنے کے بعد بہزاد تبریز آ گیا جو صفویوں کا دارالحکومت تھا۔ شاہ اسمٰعیل صفوی بہزاد پر بڑے لطف و کرم کرتا تھا۔ 1522ء میں بہزاد کو شاہی کتب خانے کے کتاب دار کا منصب عطا کیا گیا۔ شاہ طہماسپ کے عہد میں بھی نامزد کتب خانے کا کام کرتا رہا۔ اسی دور میں اس نے کئی شاگردوں کو مصوری سکھائی۔ ''تاریخ خاک قبر بہزاد'' کے مطابق بہزاد نے 942ھ/ 1535ء میں وفات پائی۔ اور وہ تبریز میں فارسی کے معروف شاعر شیخ کمال خجندی کے پہلو میں دفن ہوا۔ بہزاد اپنے عہد کا عظیم ترین فنکار تھا اور جیتی جاگتی شبیہ بنانے کی قوت پر بہت زور دیتا تھا۔ بہزاد کو ناقدین فن مصوری کے مطابق قلم پر گرفت اور خاکہ کشی اور صورت گری میں فوقیت حاصل تھی۔

معمار سنان ترک (م996ھ/ 1588ء)

عہد عثمانی کا عظیم معمار، ایک ماہر تعمیرات اور چیف انجینئر

سلطنت عثمانیہ کا مشہور ترین معمار، سنان ایک غیر مسلم خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ قیصری کے گاؤں اغرناس میں پیدا ہوا (1490ء)۔ اصل نام سنان الدین یوسف تھا۔ 22 سال کی عمر میں سلطان یاؤز سلیم کے محل کے عسکری اسکول میں داخلہ لیا۔ محل میں آنے کے بعد اس نے اسلام قبول کیا۔ فن معماری میں دلچسپی رکھنے کی وجہ سے اپنے زمانے کے مشہور معماروں کے ساتھ رہا اور بڑھئی کا کام بھی سیکھا۔ 1514ء میں جب سلطان سلیم مصر کی مہم پر گیا تو وہ بھی ساتھ تھا۔ کچھ عرصہ بعد سلطان سلیمان قانونی کے لشکر کے ساتھ بلغراد اور جزیرہ روڈس کی عسکری مہمات میں شامل ہوا۔ 1526ء میں جنگ

موہاکMOHAC میں شریک ہوااور اس کے بعد گروپ کمانڈر بنادیا گیا۔1534ء میں تبریز اور بغداد کے جنگی فسروں میں کامیابیوں کی وجہ سے اعلیٰ افسر کے عہدے پر فائز کردیا گیا۔1538ء میں مولداویہ کی عسکری مہم میں پُرت نامی نہر پر صرف 13 دن کی قلیل مدت میں پل تعمیر کیااور سلطان سلیمان قانونی سے دادِ تحسین حاصل کی۔49 سال کی عمر میں فن معماری کا سربراہ بنادیا گیااور وفات تک اس سرکاری عہدے پر فائز رہا۔17 جولائی 1588ء کو استنبول میں وفات پائی اور مرنے سے پہلے اپنے مقبرے کی تعمیر خود ہی کی تھی۔معمار سنان عہدہ عثمانی کے طاقتور ترین دور یعنی سلطان سلیمان قانونی، سلطان سلیم ثانی اور مراد ثالث کے عہد میں سربراہ معمار کے طور پر خدمات سرانجام دیں۔سلطنت عثمانیہ کے فن تعمیر میں سب سے بڑا حصہ معمار سنان کا ہے۔چیف انجینئر بننے سے پہلے آپ کی تین تعمیرات قابل ذکر ہیں۔پہلی حلب میں کلیۂ خسرویہ، دوسری گیبزہ GEBZE استنبول میں موجودہ کلیۂ چوبان مصطفیٰ پاشااور تیسری بھی استنبول ہی میں خرم سلطان کے لیے تعمیر کردہ کلیۂ حسکی۔ چیف انجینئر بننے کے بعد کی تعمیر کردہ تین بڑی عمارات نے ان کو فن کی بلندیوں پر پہنچادیا۔ان میں پہلی استنبول کی شہزادہ باشی مسجد دوسری مسجد سلیمانیہ استنبول اور تیسری اور سب سے خوبصورت ادرنہ کی جامع مسجد سلیمیہ ہے جس کی تعمیر 1575ء میں تکمیل کو پہنچی تھی اور اس وقت معمار سنان کی عمر 86 سال تھی۔

قاسم آغا (م 1070ھ/1659ء)

المعروف بہ قوجہ (بوڑھا) آل عثمان کا ایک شاہی معمار

قاسم آغا کو 5 نومبر 1622ء کو مشہور معمار محمد آغا کی جگہ جس نے استنبول میں مسجد احمد کی تعمیر کی تھی، شاہی معمار مقرر کیا گیااور 22 مارچ 1642ء کو اس کے فرائض منصبی سے سبکدوش کردیا گیا تھا۔اب یہ عہدہ مصطفیٰ آغا کو دے دیا گیا جو مرمت جی کے لقب سے مشہور تھا۔تاہم صرف چند ماہ کے بعد اسے ایک کم مالیت کا تخمینہ پیش کرنے کے باعث ایک بار پھر اس کے عہدے پر مامور کردیا گیا۔

اکتوبر 1651ء میں والدہ سلطانہ مہ پیکر نے اس کی دیانتداری سے خوش ہو کر اسے اپنے معاملات کا مہتمم MANAGER مقرر کردیا،لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد جب اس نے کوپرو محمد پاشا کی (جو آگے چل کر وزیر اعظم بنا) مایت کی تو اسے اپنے عہدے اور تمام اعزازات سے محروم ہونا پڑا۔اسے بریدی قلعہ میں قید کردیا گیااور پھر بہت جلد قبرص جلاوطن کردیا گیا۔

بعدازاں جلاوطنی سے آزادی ملی اور پھر کئی ناکام کوششوں کے بعد وہ بالآخر 1655ء میں محمد پاشا کے لیے وزارت عظمیٰ کا قلمدان حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔قاسم آغا نے 18 ستمبر 1659ء کو ایک طویل عمر پانے کے بعد انتقال کیا۔اسے 1651ء میں ینی والدہ جامع کی تعمیر کے لیے مامور کیا گیا تھا مگر معمار اعلیٰ کی حیثیت سے نہیں۔آل عثمان کی تاریخ میں اس نے ایک سیاست دان کی حیثیت سے جو حصہ لیا وہ زیادہ اہم ہے۔بالخصوص سرکاری مورخ نعیما نے اس کا حال بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔

احمد معمار لاہوری

برعظیم پاک وہند کا عہد شاہجہانی کا ایک نامور معمار اور ماہر تعمیرات

احمد معمار کو عموماً لاہوری لکھا جاتا ہے۔اس کے پوتے امام الدین ریاضی نے اپنی تصنیف ''تذکرہ باغستان'' میں

اسے ہروی بھی قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کے پردادا ہرات افغانستان سے برصغیر آئے تھے۔ پہلے وہ لاہور میں آباد ہوئے اور دہلی میں قیام پذیر رہے۔ ترکی مورخین نے مشہور زمانہ ترک معمار سنان کے دو تلامذہ عیسیٰ اور یوسف کا تذکرہ کیا ہے۔ مغلیہ عہد کے ابتدائی سالوں میں یوسف معمار لاہور آ کر رہائش پذیر ہوا اور یہیں احمد معمار کی پیدائش ہوئی۔ عہد شاہجہانی میں اسے لاہور کا باشندہ قرار دے کر لاہوری لکھا جانے لگا۔

محمد یوسف معمار کا نام و تاریخ ایک کتبہ میں بھی ملتی ہے، جو ظاہر کرتا ہے کہ اس ابوظفر ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں (1554ء) دکن کا ایک قلعہ تعمیر کیا تھا۔ عمل صالح میں جو عہد شاہجہانی کی تاریخ ہے لکھا ہے کہ 25 ذوالحجہ 1048ھ کو عہد شاہجہانی کے بارہویں سال جلوسی استاد احمد و حامد کو جو سرکاری تعمیرات کے ماہر فن اور نادر روزگار معمار ہیں اس کام پر معمور ہوئے۔ سر سید احمد خان نے اپنی تصنیف آثار صنادید میں لال قلعے کی تعمیر کے ضمن میں استاد احمد و حامد کا ذکر کیا ہے۔ احمد معمار کے تاج محل کا نقشہ نویس ہونے کا مسئلہ بھی علمی مباحث کا موضوع رہا ہے اور محققین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ احمد معمار ہی تاج محل اور دیگر شاہجہانی تعمیرات کا معمار تھا۔ ایک مثنوی جو لطف اللہ مہندس ابن استاد احمد معمار ی لاہوری نے اپنے دیوان ''مہندس'' میں لکھی ہے کے مطابق استاد احمد معمار شاہجہاں کا ایک درباری معمار تھا۔ وہ ریاضیات فلکی کی مستند کتاب المجسطی اور نصیر الدین طوسی کی کتاب ''تحریر اقلیدس'' کا عالم بھی تھا۔ اسے نادر العصر کا خطاب عطا ہوا تھا اور بادشاہ کے حکم پر اسی نے روضہ تاج یا مقبرہ ممتاز محل اور لال قلعہ کی تعمیر کی تھی۔

عبدالصمد شیریں قلم (حیات 1593ء)

ایرانی مصور اور خطاط جس کا شمار ہندوستان میں مغل مصوری کے بانیوں میں ہوتا ہے

ابوالفضل علامی کی کتاب ''آئین اکبری'' کے مطابق استاد عبدالصمد شیریں قلم شیراز سے آیا تھا جہاں اس کا باپ شاہ شجاع کا وزیر تھا۔ عبدالصمد نے شہنشاہ ہمایوں سے ایران میں اس کے جلاوطنی کے دنوں ملازمت کی استدعا کی تھی جو ہمایوں نے قبول کر کے اسے اپنے دربار میں جگہ دی۔ تاہم عبدالصمد ہمایوں کے ساتھ ایران سے ہندوستان نہ آ سکا اور 1549ء میں کابل پہنچا۔ کہتے ہیں اکبر نے اپنے بچپن میں خواجہ عبدالصمد سے مصوری سیکھی تھی، پھر جب اکبر تخت نشین ہوا تو اس نے مصور پر عنایات خاص مبذول کیں۔

سرکاری وقائع نگاری کے مطابق ظل الٰہی کی ایک نگاہ اکسیر نے اسے مقام بلند عطا کیا اور اس دور میں عبدالصمد شیریں قلم کو ایک استاد کی حیثیت حاصل رہی، اور اس کے شاگرد بھی استادی کے درجے کو پہنچے۔ اس کے شاگردوں میں مشہور ترین ایک ہندو فن کار دسونتھ تھا اس نے فن مصوری میں بڑا نام پیدا کیا تھا۔ عبدالصمد شیریں قلم کو عہد اکبری میں نہ صرف ایک شاہی مصور کی بلکہ ایک امیر کبیر کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ اکبر اس کا انتہائی احترام کرتا تھا اور اسے چہار صدی کا منصب بھی عطا ہوا تھا۔

شہزادہ سلیم بھی اس کے درس میں شریک ہوتا تھا اور آگے چل کر وہ شہزادہ سلیم کا مقرب بنا اور اس نے اُسے امیر الامراء کا بلند پایہ خطبا بھی عطا کیا تھا۔ 1576ء میں عبدالصمد کو فتح پور سیکری کی ٹکسال کا مہتمم بنایا گیا اور اپنی ملازمت کے آخری ایام میں وہ دیوان ملتان کے عہدے پر فائز رہا۔ عبدالصمد کی ابتدائی شہرت فن خطاطی کی مرہون تھی۔ اس کے لقب شیریں رقم سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ پرسی براؤن نے لکھا ہے کہ یہ لقب اسے ہمایوں نے عطا کیا تھا، بہر حال تاریخ فن کاری میں اسے جو مقام حاصل ہے وہ اس کی مصوری کی وجہ سے ہے۔

عبدالصمد شیریں رقم نے اپنے ہم وطن مصور میر سید علی کے ساتھ مل کر داستان امیر حمزہ کی بڑی تقطیع کی چودہ جلدوں کو مصور کیا تھا اس کے کئی اوراق آج بھی یورپ کے عجائب خانوں میں محفوظ ہیں۔ عبدالصمد کی شہرت یہ بھی ہے کہ وہ پوست کے بیج پر قرآن مجید کی ایک مختصر سورت لکھ سکتا تھا۔

عبدالمجید صوفی پروین رقم (م 1946ء)

بیسویں صدی میں خط نستعلیق کے بہترین خوش نویس

عبدالمجید صوفی جن کی خداداد صلاحیتیں شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی نظامی کے فنی مشوروں سے اور بھی چمک اٹھی تھیں۔ انہیں پروین رقم کا خطاب مولانا غلام رسول مہر نے دیا تھا۔ بے شمار مقامات اور خوش نویسی کے دوسرے شاندار کارناموں کے علاوہ پروین رقم کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے حضرت علامہ اقبال کی بیشتر تصانیف کی کتابت کے فرائض ادا کیے تھے۔ ان کے ایک صاحبزادے جن کا نام اقبال تھا مگر وہ ابن پروین رقم کے نام سے مشہور تھے فن خطاطی میں اپنے والد کے مقلد تھے۔ علامہ اقبال کے مزار پر جو فارسی اشعار رقم ہیں ان کی کتابت بھی ابن پروین رقم نے کی تھی۔

عبدالمجید پروین رقم 1901ء میں ایمان آباد ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے اور انہوں نے 1946ء میں لاہور میں وفات پائی۔ ان سب کا سب سے عظیم کارنامہ فارسی نستعلیق اسٹائل کو اردو میں متعارف کرانا ہے۔

عبدالرحمٰن چغتائی (م 1975ء)

ایک عظیم مسلمان مصور جس کی خدمات کے اعتراف میں حکومت انگریزی نے خان بہادر کا خطاب دیا تھا

21 ستمبر 1894ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا نام میاں کریم بخش تھا۔ میو اسکول آف آرٹس کے طالب علم رہے۔ فن مصوری پر انتقادی مقالات کے علاوہ افسانے بھی لکھتے رہے۔ 1934ء میں اعتراف کمال کے طور پر حکومت برطانوی ہند نے انہیں ''خان بہادر'' کا خطاب عطا کیا تھا۔ 1960ء میں حکومت پاکستان نے ''ہلال امتیاز'' کا اعزاز عطا کیا۔ چغتائی کے بزرگوں میں احمد اور حامد دو بھائی شہنشاہ شاہجہاں کے میر تعمیرات تھے اور انہوں نے تاج محل کی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔

چغتائی کے دادا مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار دار اور میر تعمیرات رہے۔ شروع میں انہوں نے مصوری کو تفریحی مشغلے کے طور پر اختیار کیا تھا پھر انہماک بڑھا اور انہوں نے فن مصوری میں نہایت بلند مقام حاصل کیا۔ عبدالرحمٰن چغتائی کے شاہکاروں کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''مرقع چغتائی'' یعنی دیوان غالب مصور مطبوعہ 1927ء، نقش چغتائی، ''چغتائی کی تصاویر'' چغتائی کی ہندوستانی تصاویر اور علامہ اقبال کے اشعار کا مصور نسخہ ''عمل چغتائی''۔ اس کے علاوہ ان کے یہ نسخے زیر ترتیب تھے۔ (1) ''عمر خیام کے اشعار کا مصور نسخہ'' (2) ''چغتائی کا فن'' (3) ''کار چغتائی''۔ چغتائی ایک ہزار سے زائد تصاویر اور تقریباً اتنے ہی پنسل کے نقوش تیار کر چکے تھے۔ دنیا کے اکثر بڑے عجائب خانوں جیسے برٹش میوزیم، لندن، اور پیرس و برلن کے عجائب خانوں میں ان کی تصاویر کی نمائش منعقد ہوئی تھیں۔ ان کی بعض تصاویر اقوام متحدہ کے دفاتر میں آرائش کے لیے بھی حاصل کی گئی تھیں۔ اسی طرح ہالینڈ کے شہر ہیگ کے ''قصر امن'' PEACE PALACE میں بھی ان کی تصاویر دیکھی جا سکتی ہیں۔ چغتائی کو قدیم استادان فن مصوری کے فن پارے جمع کرنے کا شوق تھا۔ اس نے قدیم ایرانی و ہندوستانی مصوروں کے شاہکار جمع کر رکھے تھے۔

صادقین (م 1987ء)

عالمی شہرت یافتہ پاکستانی مصور، خطاط اور شاعر

صادقین امروہہ (بھارت) میں 1929ء میں پیدا ہوئے۔ پورا نام، صادقین احمد نقوی تھا۔ 1948ء میں آگرہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ مختصر مدت کے لیے امام المدارس ہائی اسکول میں مصوری کے استاد رہے۔ 1950ء میں ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور ریڈیو پاکستان میں پروگرام اسسٹنٹ کی خدمات انجام دیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک مصور تھے۔ 1954ء میں ان کی تصویروں کی پہلی نمائش کوئٹہ میں منعقد ہوئی۔ 1960ء میں ان کے فن پاروں کی نمائش کا انتظام بیرون ملک کیا گیا۔ اسی ضمن میں پیرس میں منعقد ہونے والی تصویروں کی نمائش میں انہیں بڑی داد ملی۔ 1965ء کی پاک و ہند جنگ کے بعد ''شہید جنگ'' کے عنوان سے دیوار گیر تصویریں بنائیں۔

1968ء میں اپنے منفرد اسلوب میں خطاطی کا آغاز کیا۔ قرآنی آیات کو خطاطی کا رنگ دے کر ہر آیت میں پوشیدہ معنوں کو قرطاس پر اس طرح اجاگر کیا کہ ہر جملہ کے اصل معنی اور مفہوم کھل کر ناظرین کے سامنے آ جاتے ہیں۔

اکتوبر 1974ء میں ایک درجن سے زائد عرب ممالک کا دورہ کیا اور فن خطاطی میں داد حاصل کی۔ غالب، فیض اور علامہ اقبال کو بھی مصورہ انداز میں پیش کیا۔ ماری پور میں کسٹم کلب، سروسز کلب اور اسٹیٹ بینک کی لائبریری میں میورل یا دیوار گیر تصاویر بنائیں۔ منگلا ڈیم کے بجلی گھر میں ''رزمیہ محنت'' کے عنوان سے 25x175 کی عظیم الشان تصویر بنائی جو محنت کی عظمت اور اس کے تاریخی ارتقا کو اجاگر کرتی ہے۔ وہ اعلیٰ پائے کے مصور و خطاط ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ انہوں نے 1500 رباعیاں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ 1962ء میں انہیں حکومت پاکستان کی طرف سے تمغہ حسن کارکردگی دیا گیا۔ وہ دنیائے مشرق کے پہلے مصور تھے جن کی صلاحیتوں کا اعتراف مغربی اخبارات نے کیا اور انہیں مشرق کے پکاسو کا خطاب دیا۔

ملک عاشق ملتانی (م 2005ء)

ملتانی فن نقاشی میں نام پیدا کرنے والی حالیہ زمانے کی ایک اہم شخصیت

ملتان میں فن خطاطی کی ایک اور شکل اسلامی نقاشی یا مصورانہ خطاطی ہے جس کا عکس برصغیر، وسطی ایشیا اور ایران بلکہ پورا اسلامی دنیا کی تاریخی عمارات میں نظر آتا ہے۔ ملتان میں اس فن کے سینکڑوں استاد ہو گزرے ہیں جنہوں نے فن نقاشی کو حسن جدت بخشا۔ ملتان کی بیشتر مساجد اور تاریخی عمارات پر ان کا نقاشی کا کام آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ حالیہ دور میں ملتان میں ایک قابل تکریم ہستی ہو گزری ہے جس نے نقاشی کا اتنا کام کیا کہ اس کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہستی تھی ملک محمد عاشق نقاش جنہیں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی ملا تھا۔ ملک محمد عاشق نقاش کی انفرادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ملک بھر میں مساجد اور دیگر عمارات پر نقاشی کے کام کا رجحان بڑھ گیا ہے۔ ملک عاشق ملتانی کا تعلق ایک راجپوت فیملی سے تھا جس نے تیرھویں صدی میں حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی کے دست حق پرست پر اسلام قبول کیا تھا۔ ملک عاشق نقاش کے والد ملک عبداللہ بھی اپنے وقت کے بہترین نقاش اور خطاط تھے۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے 1910ء میں پہلی بار منقش اونٹ کی کھال کا برقی لیمپ متعارف کرایا تھا جو بعد کے زمانے میں ملتان کی سوغاتوں میں سے ایک اہم سوغات بن گیا۔ اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ملک عاشق نقاش نے نقاشی کے فن کو آگے بڑھایا اور اونٹ کی کھال

کے بنے ہوئے منقش لیمپوں اور گلدانوں کو کو مزید خوبصورت بنایا۔ اس کے علاوہ ایوان اقبال لاہور، سرینا ہوٹل فیصل آباد اور دیگر کئی عمارت پر اپنے فن کے ثبوت چھوڑے ہیں۔ ملک عاشق صاحب کے منقش گلدانوں، لیمپوں اور دیگر اشیا کی نمائش لوک ورثہ اسلام آباد کے زیر اہتمام مشرق وسطیٰ، انگلستان اور جرمنی کے شہروں میں ہو چکی ہے۔ ملتان کے اس نقاش خاندان کو ہمیشہ اعزازات سے نوازا گیا ہے۔ ملک عبداللہ نقاش کو 1933ء میں نواب آف بہاولپور نے اور 1937ء میں لکھنؤ میں ہونے والی صنعتی نمائش میں اعزازات ملے تھے۔ وہیں ملک عاشق کو صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے نوازا۔

خادم انسانیت

عبدالستار ایدھی (م2016ء)

ملنے کے نہیں، نایاب ہیں ہم!
خدمت انسانی کا اک باب ہیں ہم!

چند انسان ایسے بھی دنیا میں آتے ہیں جو اسے خاص الخاص اور رشک جنت بنا دیتے ہیں۔ عبدالستار ایدھی بھی ایسی ہی نابغہ روزگار شخصیات میں سے ایک تھے۔ یہ بے مثل اور نایاب ہستی 8 جولائی 2016ء کو ہم سے بچھڑ گئی اور راہی عدم ہوئی۔ ایدھی نے ایک ایسے گھرانے میں جنم لیا تھا جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ بیس سال کے ہوئے تو بانٹوا، گجرات سے 1947ء میں کراچی آ گئے۔ زندگی کے روزمرہ اخراجات پورے کرنے کے لیے کراچی کی گلیوں میں گھوم پھر کر ماچس اور پنسلیں وغیرہ فروخت کرتے تھے، پھر کپڑا بھی بیچا۔ اس زمانے میں کراچی تباہ حال مہاجروں سے بھرا ہوا تھا، یہاں کے فٹ پاتھوں پر لٹے پٹے اور بیماریوں کے مارے ہوئے لوگوں کا بسیرا تھا۔ اکثر لوگ تیمارداری سے محروم تھے اور سسک سسک کر زندگی گزار رہے تھے۔ ان حالات نے نوجوان ایدھی کو غم زدہ کر دیا اور وہ غم روزگار بھول کر بیماروں کی خدمت کے لیے ڈسپنسری کھولنے کے لیے تیار ہو گئے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا چندہ جمع کرنے کے لیے انہیں گھر گھر جا کر بھیک مانگنا پڑی تب کہیں جا کر اتنی رقم اکٹھی ہوئی کہ چھوٹا سا دواخانہ کھول سکیں۔ میڈیکل کے طلبہ و طالبات دکھی انسانیت کے علاج میں ان کا ہاتھ بٹانے لگے۔ اس کے بعد انہوں نے مڑ کر نہیں دیکھا اور بیمار اور لاوارث اور بے یار و مددگار انسانوں کی خدمت کرنا اپنا شعار اور زندگی کا مقصد بنا لیا۔ ایدھی صاحب نے جو سفر اور راستہ اختیار کیا وہ صعوبتوں، کانٹوں اور مشکلات سے پُر تھا۔ تاہم انہوں نے مسکراتے ہوئے انتہائی بردباری سے مصائب کا سامنا کیا اور اپنی تنظیم ایدھی فاؤنڈیشن کی بنیاد رکھی اور سماجی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع کرتے چلے گئے۔ کبھی فساد اور ہنگاموں میں زخمیوں کو اٹھانے کے لیے اپنی جان داؤ پر لگاتے تو کبھی گندگی میں لت پت انسانوں کو سہارا دینے سے نہ ہچکچاتے۔ ان کی لازوال انسان دوستی کے رُوح پرور واقعات دیکھ کر قوم نے بجا طور پر ''بابائے خدمت'' کا خطاب دیا۔ ایدھی صاحب کو سماجی خدمات دیتے ہوئے اربوں روپے بطور چندہ ملے مگر انہوں نے اپنی ساری زندگی ایک چھوٹے سے فلیٹ میں گزاری اور بے غرضی، سادگی اور ایثار کی مثال بن گئے۔

مورخین

البلاذری (م 279ھ/892ء)	الطبری (م 310ھ/923ء)
الیعقوبی	المسعودی (م 345ھ/956ء)
خطیب بغدادی (م 493ھ/1071ء)	البیہقی
ابن الاثیر (م 630ھ/1232ء)	ابن خلکان (م 681ھ/1282ء)
الجوینی (م 682ھ/1283ء)	قاضی منہاج الدین
رشید الدین طبیب (م / 1318ء)	ابن خلدون (م 807ھ/1406ء)
ابن حجر عسقلانی (م 852ھ/1449ء)	ابن عرب شاہ (م 853ھ/1450ء)
محمد قاسم فرشتہ (م 1014ھ/1605ء)	خافی خان (م 1145ھ/1732ء)
سید امیر علی (م 1347ھ/1928ء)	ڈاکٹر مبارک علی

البلاذری (م 279ھ/892ء)

ابوالحسن احمد بن یحییٰ بن جابر بن داؤد، ممتاز عرب مورخ اور مصنف ''فتوح البلدان''، وغیرہ

البلاذری تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کا ایک بڑا عرب مورخ، ماہر انساب اور جغرافیہ نگار تھا۔ اس کی زندگی کے متعلق بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ اس کی ولادت اور وفات کی تاریخوں کی بھی توثیق نہیں ہوتی۔ اس کے اساتذہ کی تاریخوں سے واضح ہوتا ہے کہ وہ نویں صدی کے دوسرے عشرے کے آغاز ہی میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی وفات کی تاریخ 892ء اغلب ترین تاریخ ہے۔ اس کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ اس نے فارسی کتابوں کے ترجمے کیے۔ اس لیے یہ بھی فرض کر لیا گیا ہے کہ وہ ایرانی النسل تھا۔ تاہم اس کا دادا مصر میں الخصب کی ملازمت کر چکا تھا اس لیے اس کا عرب ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ وہ غالباً بغداد میں پیدا ہوا اور اس نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ بھی وہیں گزارا۔ شوق تحصیل علم اسے دمشق، حمص اور انطاکیہ لے گیا اور عراق کے مشہور علما سے جن میں المدائنی، ابن سعد اور مصعب الزبیری شامل ہیں اس نے اکتساب علم کیا۔ وہ عباسی خلیفہ المتوکل کا درباری ندیم تھا اور عباسی دربار میں اس کا اثر بظاہر خلیفہ المستعین کے عہد تک رہا۔ اس کی قسمت کا ستارہ خلیفہ المعتمد کے عہد حکومت میں نہایت سرعت سے غروب ہونا شروع ہوا۔ وہ شاعر ابن المعتز کا اتالیق تھا۔ البلاذری کی دو عظیم تاریخی کتابیں دستبرد زمانہ سے بچ گئی ہیں اور آج بھی بڑی مشہور معروف ہیں۔ (1) ''فتوح البلدان''، یعنی مسلم فتوحات کی تاریخ۔

اس کتاب کا آغاز غزوات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتا ہے اور اس کے آخر میں عراق و ایران پر قبضہ اور تصرف کے حالات دیئے گئے ہیں۔ البلاذری کی دوسری کتاب ''انساب الاشراف'' ایک بہت ضخیم کتاب ہے جو مکمل نہیں ہو سکی اس کی ترتیب انساب وار کی گئی ہے اور اس کا آغاز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعزہ و اقارب کے حالات سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد علوی آتے ہیں۔ پھر عباسی، بنوامیہ کو غیر متناسب جگہ دی گئی ہے۔ وہ بنو ہاشم کے بعد آئے ہیں۔ اس کتاب کا ایک مکمل نسخہ استنبول سے ملا تھا۔

الطبری (م310ھ/923ء)

ابوجعفر بن محمد جریر، مشہور مفسر و مورخ، ''تاریخ رسل والملوک'' کے مصنف

دیکھیے مفسرین کرام

یعقوبی

مشہور زمانہ عرب مؤرخ اور مصنف ''تاریخ یعقوبی''

احمد بن ابویعقوب بن جعفر بن وہب بن واضح الکاتب عباسی، ایک عرب مؤرخ اور جغرافیہ نگار۔ وہ صالح اور بعد ازاں اس کے والد خلیفہ المنصور کے ایک آزاد غلام واضح کی اولاد سے تھا اور اسی نسبت سے عباسی کہلاتا ہے۔ اپنے مؤرث کی طرح جو مصر کا والی تھا اور ادریس بن عبداللہ کو الفخ میں 169ھ/785ء میں شکست کھانے کے بعد مارا گیا۔ ہمارے مؤرخ کا تعلق بھی امامیہ کے معتدل موسوی فرقے سے تھا۔ یعقوبی نے عالم جوانی میں آرمینیا اور خراسان میں آل طاہر کی ملازمت میں گزاری۔ اپنے کارناموں کا ذکر اس نے اپنی ایک خصوصی تصنیف میں کیا۔

اس نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف ''تاریخ یعقوبی'' جو دراصل تاریخ عالم ہے اس میں اس نے 259ھ/872ء تک کے حالات درج کیے ہیں۔ یہ تاریخ اس نے بلاد مشرق میں قیام کے دوران لکھی تھی۔ اس کتاب کا آغاز انبیائے بنی اسرائیل کے حالات سے ہوتا ہے، پھر حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کے حواریوں، نیز شام، آشور اور بابل کے حکمرانوں کا تذکرہ ہے۔ بعد ازاں ہندوستان یونان اور شمالی اقوام، جن میں ترک، چینی، مصری، بربر، اہل ابی سینیا شامل کا ذکر کیا گیا ہے۔

آخر میں قبل از اسلام عربوں کے حالات دیے گئے ہیں دوسرے حصے میں، جو پہلے سے زیادہ اہم ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے 256ھ/872ء تک کے حالات مذکور ہیں۔ اس کتاب میں اگرچہ شیعی میلان واضح ہے، مگر کبھی شدت پسندی کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا اس لیے ئی تاریخ شیعہ اور سنی دونوں کے لیے اہمیت رکھتی ہے۔

المسعودی (م345ھ/956ء)

ابوالحسن علی بن الحسین، نامور عرب مورخ اور جغرافیہ نگار، صاحب ''المروج الذھب''

اس کی زندگی کے حالات کا پتا کہیں کہیں محض اس کی اپنی تصانیف سے چلتا ہے۔ ابن الندیم کے مطابق اس کی پیدائش بغداد میں ہوئی تھی اور اس کا تعلق ایک عرب خاندان سے تھا جس کا سلسلہ نسب ایک صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ اس نے ایران کا سفر کیا اور وہ 305ھ/917ء میں کچھ عرصہ اصطخر میں رہا۔ اگلے سال وہ برصغیر کے سفر پر نکلا اور اس نے ملتان اور المنصورہ کی سیاحت کی۔ پھر وہ کھمبایت اور صیمور کے راستے لنکا تک گیا۔ بعض سوداگروں کے ہمراہ بحر چین

پہنچا اور وہاں سے زنجبار واپس ہو کر عمان چلا آیا۔ اس کے بعد وہ ایک بار پھر سفر پر نکلا اور بحیرہ خزر کے جنوبی ساحل کے علاقوں میں سفر کرتے ہوئے 314ھ/ 933ء میں طبریہ فلسطین پہنچا پھر انطاکیہ اور ملک شام کے سرحدی شہروں کی سیاحت کرتا ہوا چند روز کے لیے بصرہ میں قیام کر کے دمشق آ گیا۔ اس کے بعد کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کبھی شام اور کبھی مصر میں رہتا تھا۔ 955ء میں وہ الفسطاط میں تھا کہ یہیں اگلے سال اس کا انتقال ہو گیا۔

اس کی زیادہ تر تصانیف جن کی فہرست المستشرق D.GOEGE نے دی ہے ضائع ہو چکی ہیں کیونکہ وہ عام مذاق کے مطابق نہیں تھیں۔ متاخرین کی دلچسپی المسعودی سے فقط مورخ کی حیثیت سے ہے۔ 332ھ/ 943ء میں اس نے تاریخ عالم سے متعلق اپنی معرکۃ الآرا تصنیف لکھنا شروع کی تھی۔ ''کتاب اخبار زماں و من آبادہ الحدثان...... جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ 30 جلدوں میں تھی۔ بدقسمتی سے اس کی دس جلدیں نہیں مل سکیں اور اس کی 20 جلدیں کتب خانہ آیا صوفیہ استنبول میں محفوظ ہیں۔ اس میں ایک مختصر جغرافیائی تبصرے کے بعد اس نے غیر اسلامی اقوام کی تاریخ دی ہے۔ البتہ اپنی تصنیف کا خلاصہ اس نے اپنی کتاب المروج الذہب و معادن الجواہر میں دیا ہے۔ المسعودی کی ایک اور تصنیف ''تنبیہ والاشراف'' ہے جس میں اس نے اپنی تمام علمی مساعی پر تبصرہ لکھا تھا۔

الخطیب بغدادی (م493ھ/ 1071ء)

ابو بکر احمد بن علی بن ثابت، مشہور فقیہ، واعظ، مورخ اور مصنف ''تاریخ بغداد''

24 جمادی الآخرۃ 392ھ/ 10 مئی 1002ء کو بمقام درزجان پیدا ہوئے جو بغداد کے جنوب میں دریائے دجلہ کے کنارے ایک بڑا سا گاؤں ہے۔ وہ ایک خطیب (واعظ) کے بیٹے تھے۔ انہوں نے اسی وجہ سے لڑکپن حدیث کی جستجو میں گزارا اور ادھر اُدھر سفر کرتے رہے۔ بصرہ، نیشاپور، اصفہان، ہمدان اور دمشق گئے اور وہاں کے محدثین کرام سے مستفید ہوئے۔ بالآخر انہوں نے بغداد میں سکونت اختیار کی اور خطیب کے عہدے پر فائز ہو گئے اور اسی وجہ سے بعد کے زمانے میں خطیب بغدادی کے نام سے مشہور ہوئے۔ علم الحدیث پر تبحرانہ دسترس رکھنے کی وجہ سے بغداد میں بہت شہرت اور اقتدار حاصل ہوا۔ ان کے تذکرہ نگاروں میں سے ایک نے لکھا ہے کہ بغداد کے محدثین یہ سمجھتے تھے کہ اپنے واعظوں میں احادیث روایت کرنے سے پہلے خطیب بغدادی سے ان کی صحت کے بارے میں رجوع کرنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ حنابلہ کی مخالفانہ روش کی وجہ سے خطیب بغدادی کو تکالیف کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ حنبلی ہونے کے بعد ان کا شافعی مذہب کو ترجیح دینا امام احمد بن حنبل کے شاگردوں کو ناگوار گزرتا تھا۔ وہ امور فقہ میں بھی قیاس کے سخت مخالف تھے۔ حنابلہ کی مخالفت کے باوجود خلیفہ القائم اور وزیر ابن المسلمہ کی تائید و حمایت سے وہ المنصور کی جامع بغداد میں درس حدیث دیا کرتے تھے۔ حنبلیوں نے جس انداز میں عداوت کا اظہار کیا تھا اس لیے وہ بھی ان پر تنقید کرنے لگے۔ اسی وجہ سے بعد کی نسلوں نے ان پر لقب برتنے کا الزام لگایا۔ جب بغداد میں البساسیری کی کامیاب بغاوت کے بعد وزیر المسلمۃ کی بربادی ہوئی تو الخطیب نے راہ فرار اختیار کی اور دمشق میں پناہ لی مگر وہاں فاطمی حاکم کے حکم پر گرفتار ہوئے اور قتل ہونے سے صرف جیل سے فرار کی وجہ سے بچے۔ بعد ازاں بغداد میں امن بحال ہوا تو بغداد آ گئے اور وہیں 463ھ/ 1071ء میں انتقال کیا۔ ان کی تصنیف ''تاریخ بغداد'' بہت مشہور ہے۔

البیہقی

ابوالفضل بیہقی محمد بن الحسین، فارسی کا نامور مورخ

دیکھیے ''مصنفین''

ابن الاثیر (م630ھ/1232ء)

عرب عالم، مورخ اور صاحب ''اسد الغابۃ''

یہ تین عالم و فاضل بھائیوں کا نام ہے، جن میں سے دوسرا بھائی عزالدین ابوالحسن علی بن محمد جو 555ھ/1160ء میں پیدا ہوا اور اس نے 630ھ/1232ء میں بمقام موصل وفات پائی۔ اپنی کتاب الکامل فی التاریخ کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس کتاب کا ایک حصہ فرانسیسی ترجمے کے ساتھ پیرس سے 1872ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ابن الاثیر نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی ایک معجم بہ ترتیب حروف تہجی مسمی بہ ''اسد الغابہ'' فی معرفتہ الصحابہ'' کے نام سے ترتیب دی تھی جس میں ساڑھے سات ہزار افراد کے حالات زندگی قلمبند کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ سمعانی کی کتاب الانساب کا ایک خلاصہ اللباب فی معرفتہ الانساب کے نام سے بھی مرتب کیا تھا۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ یہ خلاصہ اصل کتاب سے بہتر ہے۔ تاہم اس کی تمام تصانیف میں سے سب سے زیادہ اہم اس کی ''الکامل فی التاریخ'' ہے جو 628ھ تک کے واقعات پر ختم ہوتی ہے اور علم التاریخ کی ایک انتہائی بیش قیمت کتاب ہے۔

عزالدین نے موصل اور بغداد میں تعلیم پائی اور شام کی سیاحت بھی کی اور اس کے علاوہ اس نے اپنی زندگی ایک نجی عالم کی حیثیت سے تحصیل علم ہی میں بسر کی۔ ابن خلکان نے اس سے ملاقات کی تھی اور وہ اس کے فضل و اخلاق سے بہت متاثر ہوا تھا۔

ابن خلکان (م681ھ/1282ء)

شمس الدین ابوالعباس احمد بن محمد الشافعی، ایک مشہور تذکرہ نگار اور ''وفیات العیان'' کا مصنف

محققین نے لکھا ہے کہ خلکان، ابن خلکان کے اجداد میں سے کسی کا نام تھا۔ وہ 11 ربیع الثانی 608ھ/22 ستمبر 1211ء کو موصل کے قریب پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد کے علاوہ المؤید زینب بنت عبدالرحمٰن اور ابن مکرم الصوفی سے حاصل کی پھر موصل میں کمال الدین موسیٰ بن یونس سے فیض یاب ہوا۔ اس کے بعد دمشق میں تعلیم حاصل کی۔ 1238ء میں وہ قاہرہ پہنچا اور قاضی القضاۃ یوسف بن الحسن السنجاری کا نائب بن گیا۔ 1260ء میں اسے قاضی القضاۃ بنا کر دمشق بھیجا گیا لیکن یہ عہدہ 1279ء میں ایک سازش کا الزام لگنے پر اس سے چھن گیا اور پانچ سال کے بعد صرف شافعیوں کے لیے مخصوص ہو گیا۔

سات سال تک قاہرہ کے مدرسہ الفخریہ میں مدرس کے فرائض ادا کرنے کے بعد اسے پھر قاضی القضاۃ بنا دیا گیا مگر مئی 1281ء میں یہ عہدہ اس سے دوبارہ چھن گیا۔ اکتوبر 1282ء میں وہ جب قاہرہ کے مدرسہ امینیہ میں مدرس کے فرائض کر رہا تھا پانچ دن تک بیمار رہنے کے بعد اس نے وفات پائی۔ اس کی سب سے بہترین تصنیف وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان ہے جو اس نے قاہرہ میں 1256ء میں لکھنا شروع کی تھی اور جنوری 1274ء میں مکمل ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ آج کل برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے۔

الجوینی (م 682ھ/1283ء)

علاءالدین عطاملک بن محمد ایک ایرانی حاکم اور مورخ، مصنف "تاریخ جہاں کشائی"

تاریخ جہاں کشائی ہی ایک ایسی تصنیف ہے، جس سے ہمیں اس کی زندگی کے تفصیلی حالات ملتے ہیں، بقول ابن طقطقی اس کا خاندان ہارون الرشید کے وزیر فضل بن ربیع کی اولاد ہونے کا دعوی کرتا تھا۔ علاؤالدین کا پردادا بہاؤالدین محمد بن علی خوارزم شاہ تکش کی ملازمت میں تھا۔ علاؤالدین کے والد کا ذکر بھی 1233ء میں نیشاپور میں سننے میں آتا ہے۔ جب تاتاری فوجیں وہاں پہنچیں تو وہ بھاگ کر طوس چلا گیا اور وہاں ایک قلعہ میں پناہ لی مگر قلعہ کے حاکم نے ان سب کو مغول کے حوالے کر دیا جہاں اس کا پرتپاک استقبال کیا گیا اور صاحب دیوان کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ علاؤالدین جوینی نے لکھا ہے کہ وہ ابھی کم عمر ہی تھا کہ اس نے اپنے والد کی مرضی کے خلاف "دیوان" میں ملازمت کر لی تھی۔ وہ ارغون آقا کی ہمرکابی میں دو مرتبہ منگولیا گیا اور پہلی مرتبہ 1251ء میں اور بعدازاں 1253ء میں 1256ء میں جب ہولاکو خاں خراسان پہنچا تو علاؤالدین جوینی اس کی خدمت میں منسلک ہو گیا۔ چنانچہ جب ہولاکو خان نے اسماعیلیوں کے قلعہ الموت اور بعدازاں بغداد پر حملہ کیا تو جوینی اس کے ہمراہ تھا بلکہ اسماعیلیوں کے سردار رکن الدین خورشاہ کے ہتھیار سے قلعہ الموت کا مشہور کتب خانہ تباہی سے بچ گیا تھا۔

657ھ/1259ء میں بغداد پر قبضہ کرنے کے ایک سال بعد علاؤالدین کو عراق عرب اور خورستان کا حاکم مقرر کیا گیا تھا۔ آباقاخان کے عہد میں 1281ء میں علاؤالدین کو ایک ذاتی دشمن کی انگیخت پر اس الزام میں قید کر دیا گیا کہ اس نے سرکاری خزانے میں خرد برد کی تھی۔ تاہم بعدازاں اسے رہا کر دیا گیا۔ مگر دوبارہ گرفتار کر لیا گیا اس مرتبہ اس پر الزام تھا کہ وہ مملوک مصر سے خط و کتابت کا مرتکب ہوا ہے۔ تاہم سلطان احمد تکودار نے تخت نشینی کے بعد اسے رہا کر دیا۔ اس نے 5 مارچ 1283ء کو وفات پائی۔ اس کی تاریخ جہاں کشائی تاتاری عہد کی مفصل تاریخ ہے۔ چینی نے اپنی اس تاریخ پر کام اس زمانے میں شروع کیا تھا جب وہ منگولیا میں تھا۔ وہ اپنی تاریخ میں 1260ء تک کے واقعات کا ذکر کرتا ہے۔

قاضی منہاج الدین سراج (658ھ/1260ء)

تاریخ ناصری، برصغیر پاک و ہند میں مسلم دور میں لکھی جانے والی ابتدائی تاریخ ہے

اس کے مصنف کا نام عثمان، لقب منہاج الدین اور کنیت ابوعمرو تھی۔ مولانا عبدالحق محدث دہلوی اور طبقات ناصری کے انگریز مترجم ایچ راورٹی نے انہیں جرجانی لکھا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ مصنف منہاج سراج کے مورث اعلیٰ مولانا عبدالخالق کا وطن جوزجان تھا اس لیے وہ جوزجانی ہیں۔ ان مولانا عبدالحق کی شادی سلطان ابراہیم غزنوی کی ایک بیٹی سے ہوئی تھی۔ قاضی منہاج سراج ان مولانا عبدالخالق کا پڑپوتا تھا۔ اس کی ابتدائی تربیت فیروزکوہ کے شاہی محل میں ہوئی۔ سات برس کی عمر میں اپنے استاد سے اس نے جو روایات سنیں وہ بھی ساری زندگی یاد رکھی۔ بیس بائیس سال کی عمر تک وہ تحصیل علم میں مصروف رہا۔ اس کے معلموں میں ایک امام علی غزنوی بھی تھے۔ چوبیس سال کی عمر میں اس نے پہلا سفر 613ھ/1216ء میں کیا۔ وہ فیروزکوہ سے بست پہنچا اور وہاں سے بہ حیثیت سفر سیستان گیا۔ 1227ء کے اوائل میں وہ زنی سے درگول کے راستے ہند پہنچا۔ اس زمانے میں ناصرالدین قباچہ اوچ کا حاکم تھا اور سلطان التمش ہندوستان کا بادشاہ دونوں حالت جنگ قائم تھی پھر جب سلطان التمش نے اوچ کو فتح کیا تو منہاج سراج کی ملاقات سلطان التمش سے ہوئی اور مولانا سلطانی لشکر کے

ساتھ دہلی پہنچا۔ کچھ دن قاضی گوالیار رہ کر مولانا سلطانہ رضیہ کے دور میں دہلی آیا اور سلطانہ رضیہ نے درس گاہ ناصریہ کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا۔ معزالدین بہرام شاہ کے عہد میں مولانا کو قاضی القضاۃ ہند کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ بہرام شاہ کے عہد میں فتنہ برپا ہوا تو قاضی صاحب لکھنوتی چلے گئے۔ سلطان ناصرالدین محمود کے عہد میں مولانا کو دوسری مرتبہ قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ سلطان بلبن کے عہد میں مولانا نے ''طبقات ناصری'' تصنیف کی۔ اور اس کتاب کے بائیسویں طبقے میں مولانا نے سلطان بلبن کے حالات رقم کیے۔ محققین نے لکھا ہے کہ بائیسویں طبقے کو مکمل کرنے کے بعد مولانا زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہے اور انہوں نے اندازاً اسی سال یعنی 1260ء میں وفات پائی۔

رشید الدین طبیب (م 1318ء)

ایران کا ممتاز مورخ اور مصنف ''تاریخ غازانی''

پورا نام فضل اللہ رشید الدین بن عماد الدولہ ابوالخیر تھا۔ ہمدان میں تقریباً 1247ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا عروج مغل فرمانروا اباقاخان کے عہد حکومت میں ایک طبیب کی حیثیت سے شروع ہوا، لیکن چونکہ حکیم حاذق ہونے کے علاوہ انتہائی قابل مدبر اور دوراندیش بھی تھے اس لیے سلطان غازان خان کے عہد میں ترقی کر کے سدر اور درباری مورخ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1303ء میں رشید الدین صدر کی حیثیت سے غازان خان کے ساتھ فوج کشی کی ایک مہم پر شام گیا۔ الجائتو کے عہد میں رشید الدین اپنی ملازمت کے انتہائی عروج پر پہنچا۔ اس نے اپنی بے حساب دولت متعدد خیراتی عمارات پر صرف کی مثلاً اس نے ایران میں نئے مغل دارالحکومت سلطانیہ کو خوبصورت بنانے کے لیے اس کے مضافات میں ایک بستی اپنے نام پر ''ربع رشیدیہ'' کے نام سے تعمیر کرائی۔ اسی زمانے میں وہ اپنی تاریخ عالم (جامع التواریخ) پر مسلسل کام کرتا رہا۔ 14 اپریل 1306ء کو اس نے اپنی اس تصنیف کی پہلی جلد بادشاہ کے حضور میں پیش کی۔ اس زمانے میں اس کے اثر و نفوذ کی انتہا نہیں تھی۔ یہاں تک کہ وہ سلطان الجائتو کو شافعی المسلک بنانے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ بغداد کے دو فاضل شہاب الدین سہروردی اور جمال الدین محض اس کی وجہ سے سزائے موت پانے سے بچ گئے، ان پر مصریوں سے ساز باز کرنے کا الزام تھا۔ مگر اس جیسے بلند منصب شخص کے حاسد پیدا ہو جانا بھی ایک قدرتی امر تھا۔ 1313ء میں جب خزانہ شاہی قلت کا شکار ہوا اور فوج کو تنخواہ تک نہ مل سکی تو اسے بڑے ناخوشگوار واقعات کا سامنا کرنا پڑا۔ سلطان الجائتو کی وفات کے بعد دشمنوں نے اسے تباہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ وہ اپنے اعلیٰ منصب سے برطرف کر دیا گیا اور یہاں تک کہ اس پر سلطان الجائتو کو زہر دینے کا الزام بھی لگایا گیا اور اس کی پاداش میں اسے اس کے بیٹے سمیت قتل کر دیا گیا رشید الدین کی وجہ شہرت اس کی تصنیف جامع التواریخ ہے جسے تاریخ غازانی بھی کہا جاتا ہے۔ اس کتاب میں اس نے مغول تاریخ اور عام تاریخ کو دو جلدوں میں مرتب کیا تھا۔

ابن خلدون (م 807ھ/1406ء)

صاحب کتاب العبر والمقدمہ ابوزید عبدالرحمٰن الملقب بہ ولی الدین، اندلس کا نامور عالم، محدث اور مورخ

ابن خلدون کی شہرت آج پوری دنیا میں بحیثیت مورخ اور بانی عمرانیات بہت زیادہ ہے مگر فلسفہ تاریخ کے اس امام کے حالات زندگی بہت کم ملتے ہیں۔ وہ تیونس میں پیدا ہوا اور اس کا نام ابوزید ولی الدین عبدالرحمٰن بن خلدون تھا۔ وہ یکم رمضان 732ھ/ بمطابق 27 مئی 1332ء کو پیدا ہوا تھا۔ اس نے اپنے والد اور تیونس کے سربرآوردہ اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اور جب تیونس پر ابوالحسن مرینی نے 1347ء میں قبضہ کیا تو عبدالرحمٰن کو ان اندلسی علماء سے اکتساب علم کرنے کا موقع

حاصل ہوا۔ جو ابوالحسن مرینی کے دربار سے منسلک تھے۔ اکیس سال کی عمر میں ابن خلدون تیونس کے بادشاہ کا کاتب العلامہ مقرر ہوا مگر جلد ہی بدامنی پھیل جانے کی وجہ سے اسے بسکرہ کی طرف بھاگنا پڑا۔ یہاں اس نے مرینی کے ایک سپہ سالار کے ماتحت ایک عسکری مہم میں بھی حصہ لیا۔ پھر سلطان مرینی نے اسے فاس آنے کی دعوت دی جہاں وہ ایک بار پھر کاتب کے عہدے پر فائز ہو گیا۔

1356ء میں سلطان کے عتاب کا نشانہ بنا اور اسے دو مرتبہ قید خانے کی ہوا کھانا پڑی۔ دوسری مرتبہ قید خانے سے رہائی اسے سلطان کی وفات کے بعد ملی۔ اسے نئے سلطان ابوسالم نے عزت بخشی اور 1359ء میں اسے پہلے اپنا کاتب اور بعد ازاں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز کر دیا۔ سلطان ابوسالم کے اچانک قتل ہو جانے کے بعد ابن خلدون کو بدنام وزیر عمر بن عبداللہ کے زیر عتاب آ گیا۔ پھر غرناطہ جانے کی اجازت ملی تو غرناطہ میں بنوالاحمر کے دربار میں مقیم رہا اور غرناطہ کے مشہور عالم ابن خطیب سے اس کے دوستانہ مراسم قائم ہوئے مگر دو سال کے بعد اسے غرناطہ بھی چھوڑنا پڑا اور وہ بجایہ کے حفصی حاکم ابوعبداللہ کی دعوت پر بجایہ آ گیا اور عبداللہ نے اسے اپنا حاجب بنا لیا مگر وائے قسمت کے والئی قسطین کے بجایہ فتح کرنے پر ابن خلدون کو بسکرہ واپس جانا پڑا۔ یوں اس کی زندگی مختلف سلاطین کے درباروں میں گزری۔ 1378ء میں وہ قلعہ ابن سلامہ میں مقیم تھا کہ اس نے اپنی مشہور زمانہ تاریخ لکھنا شروع کی بعد ازاں وہ اس سلسلے بعض کتابوں سے استفادہ کرنے کے لیے مصر میں اسکندریہ اور قاہرہ پہنچا اسی دوران 1387ء میں اس نے حج کیا مصر میں قیام کے دوران جب وہ تیمور کے خلاف جنگ کے لیے دمشق گیا تو 1404ء میں اس کی ملاقات امیر تیمور سے ہوئی بعد ازاں وہ اپنی وفات تک قاضی کے منصب پر فائز رہا اور اس نے 1406ء میں وفات پائی۔

ابن حجر عسقلانی (م852ھ/1449ء)

ابوالفضل شہاب الدین احمد بن علی، مشہور شافعی، محدث، فقیہ اور مورخ

12 شعبان 773ھ/ 18 فروری 1372ء کو پرانے قاہرہ میں پیدا ہوئے اور بہت بچپن ہی میں ماں اور باپ دونوں کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئے۔ ان کے والد نورالدین بہت مشہور عالم تھے اور انہیں فتویٰ دینے اور درس دینے کی اجازت تھی۔ العسقلانی نے والدین کے بعد اپنے ایک سرپرست، مشہور تاجر زکی الدین الخروجی کے زیر نگرانی پرورش پائی اور حفظ قرآن کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں فقہ اور صرف ونحو پر عبور حاصل کر لیا۔ علم حدیث کی تعلیم انہوں نے البلقینی، ابن الملقن اور عزالدین ابن جماعۃ سے حاصل کی۔ 793ھ/ 1390ء میں انہوں نے اپنے آپ کو علم حدیث کے مطالعے کے لیے وقف کر لیا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے مصر، شام اور حجاز و یمن کے کئی سفر کیے اور وہاں علمائے حدیث سے استفادہ کیا۔ ان میں اکثر علماء نے انہیں فتویٰ جاری کرنے اور درس دینے کی اجازت عطا کی۔

منصب قضاۃ کو قبول کرنے سے کئی مرتبہ انکار کے بعد، بالآخر انہوں نے اپنے دوست قاضی القضاۃ جمال الدین البلقینی کی درخواست پر اس کا نائب بننا منظور کیا۔ محرم 827ھ/ 1423ء میں وہ قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز ہوئے اور مجموعی طور پر اکیس سال اس عہدے پر فائز رہے، مگر ان سالوں میں انہیں بار بار معزول اور بحال کیا گیا۔ قاضی کیطور پر کام کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور تفسیر، حدیث اور فقہ پر درس دیتے رہے۔

ابن حجر کی ایک مورخ، نثر نگار اور شاعر کی حیثیت سے بھی بڑی قدر و منزلت تھی اور انہوں نے اپنی زندگی میں خاصی ادبی سرگرمی دکھائی۔ ان کی کئی تصانیف کی جن میں سے کئی مطالعہ اسلام کے سلسلے میں بڑی اہمیت کی حامل تھیں۔ ان کی

زندگی ہی میں بڑی مانگ تھی۔ بالخصوص ''فتح الباری فی شرح البخاری''۔ مورخ کی حیثیت سے ان کی ''الاصابہ فی تمیز الصحابہ'' اور ''تہذیب التہذیب'' بڑی اہم ہیں۔ ان کی دیگر تصانیف میں بلوغ المرام ادلۃ الاحکام فی علم الحدیث بڑی اہم تصنیف ہے۔ ابن حجر نے 852ھ/ 13 فروری 1449ء کو انتقال کیا۔ ان کے شاگرد السخاوی نے ان کی ایک جامع سیرت الجواہر فی الدرر فی شیخ الاسلام کے نام سے لکھی ہے۔

ابن عرب شاہ (م 854ھ/ 1450ء)

عربی، ترکی، فارسی اور مغل زبانوں کا ماہر اور مترجم و مورخ

احمد بن عبداللہ الدمشقی 25 ذوالقعدہ 791ھ/ نومبر 1389ء میں دمشق میں پیدا ہوئے اور جب تیمور نے 803ھ میں دمشق فتح کیا اور وہاں کے بہت سے باشندوں کو جبراً اپنے ساتھ لے گیا تو اسے بھی اپنے خاندان کے ساتھ نوعمری ہی میں سمرقند جانا پڑا۔ وہاں اس نے الجرجانی، الجزری اور دیگر علما سے تحصیل علم کی اور ترکی، فارسی اور مغولی زبانیں سیکھیں۔ 811ھ میں وہ مغولستان میں ختا چلا گیا جہاں اس الشیرامی سے حدیث کا درس لیا پھر وہ خوارزم اور دشت پہنچا جہاں 814ھ میں بھی وہ موجود تھا۔ یہاں سے کریمیا کے راستے وہ ترکی کے شہر ادرنہ میں وارد ہوا اور وہ سلطان محمد اول بن بایزید کا معتمد خاص بن گیا۔ اس نے سلطان کے لیے عربی و فارسی کی کئی کتابوں کا ترکی میں ترجمہ کیا جن میں العوفی کی جامع الحکایت ولامع الروایات اور ابوالیث سمرقندی کی تفسیر اور الدینوری کی تعبیر شامل تھیں وہ سلطان کے لیے عربی اور فارسی زبانوں میں خط و کتابت بھی کرتا تھا۔ 824ھ میں وہ حلب گیا اور 828ھ میں دمشق جہاں اس نے اپنے دوست ابوعبداللہ محمد البخاری سے حدیث پڑھی۔ 832ھ میں اس نے حج کیا اور پھر 840ھ میں نقل وطن کر کے قاہرہ چلا گیا جہاں اسے 5 رجب 854ھ/ 14 اگست 1450ء کو وفات پائی۔ اس کی سب سے بڑی تصنیف ''عجائب المقدور فی نوائب تیمور'' ہے۔ اس کا ترجمہ دنیا کی کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں تیمور کی فتوحات اور اس کے جانشین کے عہد کے حالات بیان کیے گئے ہیں اور تیمور کو ظالم، بدکار اور جابر ظاہر کیا گیا ہے۔ لیکن کتاب کے آخر میں تیمور کی خوبیوں کو بھی سراہا گیا ہے۔ اس کتاب میں سمرقند اور وہاں کے علماء کے بارے میں بھی بیش قیمت معلومات درج ہیں۔ تیمور کے بارے میں اس کتاب کے علاوہ اس کی تصنیف ''فاکہۃ الخلفا و مفاکہۃ الظرفاء'' بھی بڑی کتاب ہے۔ اس کا بھی لاطینی کے ساتھ ساتھ دنیا کی کئی اور زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس کی کتاب ''مرزبان نامہ'' فارسی زبان کی اہم کتابوں میں شامل ہے۔

فرشتہ محمد قاسم ہندوشاہ (م 1014ھ/ 1605ء)

ایک مشہور مسلم مورخ اور سلاطین احمد نگر کا درباری عالم، صاحب ''تاریخ فرشتہ''

فرشتہ کی زندگی کے حالات پر دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں اور بہت کم حالات زندگی ملتے ہیں۔ فرشتہ کا نام ملا محمد قاسم ہندوشاہ تھا اور تخلص فرشتہ۔ فرشتہ کا آبائی وطن استرآباد ہے۔ جہاں وہ 960ھ/ 1552ء میں پیدا ہوا۔ اس کے والد کا نام مولانا غلام علی ہندوشاہ تھا۔ اس نے احمد آباد میں شاہی خاندان کے افراد کے ساتھ تعلیم پائی۔ جب وہ جوان ہوا مرتضی نظام شاہ کے حلقہ ملازمین میں شامل ہو گیا۔ حسین نظام شاہ ثانی کے قتل کے بعد وہ بیجاپور چلا گیا اور 1560ء میں ابراہیم عادل ثانی کی ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں اس نے سب سے پہلے ''اختیارات قاسمی'' کے نام سے طب کے متعلق ایک کتاب لکھی۔ فرشتہ کی علمی صلاحیت سے بھی لوگ ناواقف نہ تھے۔ ابراہیم عادل ثانی بڑا علم پرور حکمران تھا۔ اسے جب فرشتہ کی علمی صلاحیتوں اور

خاص کر علم تاریخ سے دلچسپی کے متعلق پتہ چلا تو اس نے فرشتہ کو اسلامی ہندوستان کی تاریخ لکھنے کا حکم دیا۔ فرشتہ نے پہلے تو انکساری سے کام لیتے ہوئے بادشاہ کو کہا کہ وہ اس خدمت کا اہل نہیں ہے لیکن ابراہیم کے پیہم اصرار پر آخر اس نے قلم اٹھایا اور نمونے کے چند اوراق لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیے۔ ان اوراق میں اس نے جان بوجھ کر ابراہیم کے باپ علی عادل شاہ کے عہد کے حالات لکھے اور اس کے قتل کے شرمناک واقعے کو بلا کم و کاست بیان کر دیا۔ بادشاہ نے باپ سے محبت کی بجائے حقیقت پسندی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے فرشتہ کی اس روش کو سراہا اور حکم دیا کہ ایسی ہی صاف گوئی سے وہ یہ تاریخ لکھے۔ فرشتہ نے یہ تاریخ 1606ء میں لکھنا شروع کی اور پانچ سال کی محنت شاقہ کے بعد 1611ء میں اسے مکمل کیا۔ اس نے تقریباً 32 تاریخی کتابوں سے اپنی اس کتاب کے لیے استفادہ کیا تھا۔ تاریخ فرشتہ مقدمہ کے علاوہ 12 حصوں پر مشتمل ہے۔ 11 حصوں میں لاہور دہلی، دکن، گجرات، مالوہ بنگال، جونپور، ملتان، سندھ اور مالا بار کے سلاطین کا تذکرہ ہے اور بارہویں حصے میں ہندوستان کے صوفیائے کرام کے حالات ہیں۔ فرشتہ ایک بہت ہی محنتی اور صاحب شعور مورخ تھا۔ اس کی یہ تصنیف اس کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

خافی خان (م 1145ھ/1732ء)

محمد ہاشم نظام الملک، مغلیہ ہند کا ایک نامور عالم، مورخ اور مصنف ''منتخب اللباب''

خافی خان کا اصل نام محمد ہاشم نظام الملکی تھا۔ اسے خافی خان کا لقب محمد شاہ نے دیا تھا۔ یہ خواجہ میر کا بیٹا تھا جو مشرقی ایران کے ایک قلع خاف کے رہنے والے تھے۔ خافی خان کی پیدائش 1624ء کے لگ بھگ ہوئی۔ خافی خان نے غالباً مغربی سیاح برنیئر کے دوست دانش مند کی طرح اپنی زندگی کا آغاز بطور تاجر یا سرکاری کلرک کے کیا تھا۔ اسی حیثیت میں وہ بمبئی گیا اور ایک انگریز افسر سے ملاقات کی۔ بعدازاں اس نے اورنگ زیب، بہادر شاہ اور محمد شاہ کے عہد میں دکن اور گجرات میں بھی ملازمت اختیار کی۔ وہ احمد آباد میں بھی رہا۔ غالباً زندگی کے آخری ایام اس نے دکن کے آصف جاہ نظام الملک کے دربار میں بسر کیے۔ اسی وجہ سے اس کا لقب نظام الملکی پڑا تھا۔ وہ ''مآثر الامراء'' کے مصنف شاہ نواز کا خاص دوست تھا۔ خافی خان نے ''منتخب اللباب'' کے نام سے ہندوستان کے تیموری حکمران خاندان کی تاریخ مرتب کی۔ یہ ایک معیاری کتاب ہے۔ مستشرقین اس کتاب کے اسلوب، صحت بیان اور غیر جانبداری کے بہت مداح ہیں۔ اگرچہ بہت سی جگہوں پر یہ کتاب مغربی معیار کے مطابق قدرے مغلق ہے۔ تاہم ہندوستان میں لکھی جانے والی مقامی تاریخوں میں سب سے دلچسپ ہے۔ اس کتاب کا آغاز تاتاریوں اور مغلوں کے حال بیان کرنے سے ہوتا ہے۔ اس میں تیمور اور اس کے تیسرے بیٹے میران شاہ اور اس کی اولاد کے سوانح حیات دیئے گئے ہیں جو شہنشاہ بابر کے آباؤ اجداد تھے۔ اس کے بعد اس نے آگرے اور دہلی کے مغل شہنشاہوں کے حالات رقم کیے ہیں۔ سب سے پہلے بابر کا ذکر آیا ہے اور کتاب کے آخر میں محمد شاہ کے جلوس کے چودھویں سال 1732ء تک کے حالات رقم کیے گئے ہیں۔ یوں یہ تاریخ مغلیہ دور کے تقریباً 200 سال کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ خافی خان کی اس تاریخ کی خوبی یہ ہے کہ اس میں قصہ در قصہ روایتیں پائی جاتی ہیں اور مصنف نے جگہ جگہ اپنے ذاتی مشاہدے بیان کیے ہیں۔ شیر شاہ اور جہانگیر کے بارے میں اس نے جو کچھ لکھا وہ انصاف پر مبنی ہے۔ جہانگیر کے ضمن میں اس میں ملکہ نور جہاں کا بھی احوال بیان کیا گیا ہے۔

سید امیر علی (م 1347ھ/1928ء)

ایک نامور ہندوستانی، قانون دان، سیاست دان اور مورخ و مصنف

سید امیر علی کا تعلق ایک شیعہ سادات خاندان سے تھا جو نادر شاہ افشار کے ساتھ خراسان سے ہندوستان آیا اور یہاں سکونت پذیر ہوگیا۔ اس خاندان کے افراد یکے بعد دیگرے مغلوں، اودھ کے درباروں اور آخر کار ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت سے منسلک رہے۔ سید امیر علی نے محسنیہ ہگلی کالج میں جو کلکتے کے نزدیک تھا میں تعلیم حاصل کی۔ یہاں انہوں نے نہ صرف عربی زبان سیکھی بلکہ انگریزی ادب سے بھی پوری واقفیت حاصل کی۔ بعد ازاں قانون کا مطالعہ بھی کیا۔

1869ء سے 1873ء تک وہ انگلستان میں رہے اور 1973ء میں انہوں نے بیرسٹری کی سند حاصل کی۔ 1904ء میں بنگال ہائی کورٹ سے سبکدوش ہونے کے بعد انہوں نے اپنی انگریز بیوی ISABELLEIDA کے ساتھ انگلستان میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ سید امیر علی کی سرگرمیاں متعدد میدانوں میں نمایاں تھیں۔ مثلاً اسلامی قوانین کے پروفیسر کی حیثیت میں، وکالت میں، عدالت میں، خدمت خلق میں، حکومت کے نظم و نسق میں سیاست میں اور مصنف اور مورخ کی حیثیت میں۔

ان کی بعض تصانیف اس اسلامی قانون کے سلسلے میں جو انگریزوں کے عہد میں مدون ہوا تھا ANGLO MOHAMMAD LAW مستند تصور کی جاتی تھیں۔

1883ء میں وہ وائسرائے کی کونسل میں تین ہندوستانی ارکان میں سے ایک تھے۔ لندن کی پریوی کونسل کے پہلے ہندستانی رکن بھی مقرر ہوئے اور لندن کی ہلال احمر سوسائٹی کے سرکردہ بانیوں میں سے تھے۔ مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت اور ان کی سیاسی تربیت بھی ان کا نصب العین تھا۔ تاہم جس کام سے ان کو شہرت ملی وہ ایک مصنف کی حیثیت ہے۔ انہوں نے مغرب کے نظریہ اسلام کے جواب میں پیغمبر اسلام کی سیرت پر تحقیقی مقالہ لکھا جو آپ کی اہم تصنیف ''روح اسلام'' THE SIPRIT OF ISLAM کی بنیاد بنا۔

اسلام کے متعلق ان کی یہ جدید طرز کی تصنیف بڑی مقبول ہوئی تھی۔ آپ کی دوسری اہم تصنیف A SHORT HISTORY OF ISLAM ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے انگلستان میں ایسے مضامین لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا جن سے دنیا کے سامنے اسلام کی حقانیت آجائے۔

ڈاکٹر مبارک علی (حیات 2017ء)

معلم، اور عصر حاضر کے ممتاز مورخ گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر

ڈاکٹر مبارک علی ریاست ٹونک میں 1941ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مسعود علی خان تھا۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ خلیلیہ ٹونک میں حاصل کی۔ تعلیم کی ابتدا قرآن پاک سے ہوئی پھر مروجہ علوم میں کریمہ، گلستان و بوستان اور دیوان حافظ کو پڑھا۔ قیام پاکستان کے بعد 1952ء میں حیدرآباد سندھ آگئے۔ 1957ء میں میٹرک کیا پھر سٹی کالج میں ایف اے کے دوران فرسٹ پرائز حاصل کیا۔ تعلیمی مباحثوں میں حصہ لینے لگے۔ 1961ء میں بی۔ اے کرنے کے بعد سندھ یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ میں داخلہ لے لیا۔ یونیورسٹی کے زمانہ میں صدر ایوب خاں کے خلاف چلنے والی تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔ 1963ء میں سندھ یونیورسٹی سے ایم اے تاریخ کیا چونکہ ایم اے میں فرسٹ ڈویژن لی تھی اس لیے سندھ یونیورسٹی میں لیکچرار کی جگہ

مل گئی۔ سات سال سندھ یونیورسٹی میں پڑھایا۔ 1970ء میں برٹش کونسل کی طرف سے لندن میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے وظیفے کی پیشکش ہوئی لیکن بوجوہ برٹش کونسل کی اس آفر کو قبول نہ کر سکے اور اپنے ذاتی خرچ پر لندن گئے۔ لندن میں غیر ملکی طلبا کی ٹیوشن فیس بہت زیادہ تھی، چنانچہ ایک دوست کے مشورے پر جرمنی کی روہر RUHR یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا وہاں سے 1976ء میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ ان کے مقالہ کا عنوان تھا۔ ''مغل دربار اور اس کی رسومات'' جرمنی سے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد حیدرآباد یونیورسٹی واپس آ گئے۔

1989ء میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیئرمین کی ہدایت پر انہیں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ ساؤتھ ایشین اسٹڈیز میں ڈیپوٹیشن پر بھیج دیا گیا۔ لیکن وائس چانسلر نے انہیں اپنے ہاں لینے سے انکار کر دیا۔ مجبوراً مستعفی ہو گئے اور فرنٹیئر پوسٹ لاہور میں فری لانس صحافی کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ 1990ء میں گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر مقرر ہو گئے۔

آپ کی تصانیف میں ''مغل دربار، آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان، تاریخ کے نظریات، تاریخ اور فرقہ واریت، سندھ کی پہچان'' وغیرہ اہم ہیں۔

O

انقلابی و مصلح

الشیخ محمد بن عبدالوہاب	سید جمال الدین افغانی
محمد عبدہ	احمد اعرابی پاشا
جنرل عبدالکریم قاسم	ڈاکٹر مصدق
کرنل حواری بومدین	رفیق الحریری
حسنی الزعیم	جمال عبدالناصر
کرنل معمر قذافی	

الشیخ محمد بن عبدالوہاب (م 1206ھ/1792ء)

نجد کے مشہور عالم دین اور مصلح، مصنف، واعظ اور بدعات کی تحریک کے بانی

عینیہ کے قبیلے بنوتمیم میں 1115ھ/1703ء میں پیدا ہوئے ان کا قبیلہ علم وفضل اور دنیوی وجاہت کے اعتبار سے پورے نجد میں مشہور تھا۔ ان کا خاندان ان کی شہرت سے پہلے آل مشرف کہلاتا تھا بعدازاں ''آل شیخ'' کہلانے لگا۔ محمد بن عبدالوہاب ابھی دس برس کی عمر کو نہ پہنچے تھے کہ قرآن مجید حفظ کرلیا اور اپنے والد گرامی شیخ عبدالوہاب سے فقہ حنبلی کی کتب پڑھیں نیز تفسیر وحدیث کی اکثر کتابیں مطالعہ کیں۔ اسی کم عمری میں حج کیا اور دو ماہ مدینہ منورہ میں مقیم رہے۔

1135ھ/ میں جب آپ 20 برس کی عمر کے ہوئے تو مزید حصول علم کے لیے حجاز چلے گئے اور کئی علمائے کرام سے، مثلاً شیخ عبداللہ بن ابراہیم وغیرہ سے اکتساب علم کیا۔ 1139ھ/1726ء میں ان کے والد عینیہ سے منتقل ہو چکے تھے۔ یہاں آنے کے بعد آپ نے اپنے آپ کو رد بدعات اور تبلیغ توحید کے لیے وقف کردینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ حریملا ہی میں واعظ وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کی مشہور تصنیف ''کتاب التوحید'' اسی زمانے کی یادگار ہے۔ ان دنوں نجد میں قبائلی نظام رائج تھا اور مختلف علاقے مختلف قبیلوں کی سرداری میں تھے جو ایک دوسرے سے اکثر پنجہ آزمار ہتے تھے اور امن عامہ میں خرابی کا باعث بنتے تھے۔ ان حالات میں انہوں نے اپنے تبلیغی نظام کو بہتر بنانے کے لیے اہل نجد کے باہمی اختلافات ختم کرا کر ایک امیر کی سرکردگی میں لانے کی مہم شروع کی جو بالآخر آل سعود سے رابطہ پر منتج ہوئی اور آل شیخ اور آل سعود میں ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے وابستہ اور منسلک ہوگئے۔ امیر محمد بن سعود نے شیخ کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور یوں شیخ کی دعوت کا سلسلہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ شیخ نے مسلسل پچاس برس تک دعوت اور تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا اور 1206ھ/1792ء میں وفات

پائی۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب کی چلائی ہوئی تحریک جسے بعدازاں وہابیت کا نام دیا گیا بنیادی طور پر ایک اصلاحی اور ابلاغی تحریک تھی جس نے آگے چل کر کچھ سیاسی رنگ بھی اختیار کرلیا۔ اساسی طور پر اس کا مقصد عرب معاشرے کی اصلاح اور تعمیر نو کرنا تھا، ضرورت کے تحت اس تحریک کو تشدد کا سہارا بھی لینا پڑا۔ جس کی بنا پر اس کی مخالفت بھی کی گئی۔

سید جمال الدین افغانی (م 1897ء)

پان اسلام ازیا وحدت عالم اسلامی کے زبردست داعی و مصلح انقلابی

1838ء میں افغانستان کے شہر السعد آباد میں پیدا ہوئے اور انیسویں صدی کی دنیائے اسلام کی ایک نمایاں ترین شخصیت تھے۔ یہ آپ ہی تھے جنہوں نے اسلامی ممالک کو مغربی اقوام کے اقتدار اور جنگل سے آزاد کرانے کی جدوجہد کا سبق دیا۔ آپ کا مقصد انیسویں صدی کے مسلم ممالک کو ایک خلیفہ کے تحت متحد کر کے ان کا ایک آزاد بلاک قائم کرنا تھا تاکہ مغرب کی سامراجیت کا مقابلہ کیا جاسکے۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد افغانستان کے امیر محمد اعظم خان کے وزیر رہے۔ پھر جب انگریزوں کی سازش سے افغانستان میں بغاوت رونما ہوئی تو برطانوی ہندوستان آگئے مگر یہاں برطانوی حکومت نے انہیں دو ماہ سے زیادہ قیام کی اجازت نہیں دی۔ یہاں سے ترکی گئے مگر وہاں بھی درباری علما اور مشائخ کی سازشوں کا شکار ہوگئے اور قاہرہ چلے گئے۔ قاہرہ میں آٹھ سال رہے اور پان اسلام ازم کی پورے زور شور سے تبلیغ کی۔ حلقہ اثر بہت وسیع ہونے لگا تو وہاں بھی انگریزوں کو اپنے مفادات پر کاری ضرب پڑنے کا خطرہ پیدا ہوا تو انہوں نے خدیو مصر رفیق پاشا پر زور دے کر انہیں مصر سے بھی جلاوطن کردیا اور آپ اپنے ساتھی محمد عبدہ کے ساتھ پیرس آگئے۔ پیرس سے ''عروۃ الوثقیٰ'' کے نام سے ایک عربی جریدہ نکالا۔ یہ جریدہ وحدت اسلامی کا نقیب اور اس میں انقلابی مقالات شائع ہوتے تھے۔ مگر یہ دس ماہ سے زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا۔ اس دوران آپ نے روس و انگلستان کا سفر بھی کیا۔ ایران میں بھی رہے۔ آخری عمر میں سلطان ترکی کی دعوت پر قسطنطنیہ گئے اور یہیں کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر وفات پائی اور قسطنطنیہ ہی میں مدفون ہوئے۔ بعدازاں ایک امریکی نے ان کی نعش کو افغانستان منتقل کرا کے وہاں ایک مقبرہ بھی تعمیر کروادیا۔

محمد عبدہ (م 1905ء)

مصر کے مشہور مفکر اور مصلح عالم جن کے افکار و نظریات نے پوری دنیائے اسلام کو متاثر کیا

محمد عبدہ مصری کسانوں کے متوسط الحال خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد عبدہ ابن حسن ترکی النسل تھے جبکہ والدہ کا سلسلہ نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے جاملتا تھا۔ وہ 1849ء میں پیدا ہوئے اور بارہ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کرلیا۔ دینی تعلیم کے لیے طنطا بھیجے گئے مگر وہاں کا طریقہ تعلیم پسند نہ آیا اور واپس آ کر شادی کرلی اور کھیتی باڑی کرنے لگے تاہم جلد ہی قاہرہ کی مشہور درس گاہ جامع الازہر منتقل ہوگئے اور شیخ حسن الطویل جیسے اساتذہ سے مستفید ہوئے۔ پھر سید جمال الدین افغانی کے فیض صحبت سے علمی اور فکری غذا میسر آئی۔ سید افغانی کی صحبت میں انہوں نے قوم کی خدمت کا بے پناہ جذبہ پایا اور اجتماعی اصلاح اور قرآن مجید کی تفہیم و تفسیر کو مقصد زندگی بنالیا۔ اس کے ساتھ تعلیم مکمل کر کے جامع الازہر ہی میں پڑھانے لگے۔ 1878ء میں دارالعلوم مصریہ میں تاریخ کے استاد مقرر ہوئے اور طلبا کو قوموں کے عروج و زوال کا فلسفہ پڑھانے لگے۔ شیخ محمد عبدہ اپنے تعلیمی و علمی مشاغل میں مصروف تھے کہ اچانک خدیو مصر، رفیق پاشا نے سید جمال الدین افغانی کو ملک بدر کردیا اور محمد عبدہ کو ملازمت سے برطرف کردیا اور ان کے گاؤں میں نظر بند بھی کردیا۔ یہ سب ان کے اصلاحی

انقلابی اور سیاسی مقالات اور ترقی پسندانہ خیالات کی وجہ سے ہوا۔ پھر جب سید جمال الدین افغانی جلاوطن ہو کر پیرس گئے تو محمد عبدہ ان کے ساتھ تھے۔ وہاں انہوں نے ''عروۃ الوثقیٰ'' نامی جریدہ شائع کرنا شروع کیا اور قیام پیرس کے دوران فرانسیسی زبان سیکھ لی۔ پیرس سے مصر واپس آئے تو افتاء کے منصب پر فائز ہوئے۔ اسکندریہ کینسر کی بیماری میں مبتلا ہو گئے اور 1905ء میں وفات پائی، قاہرہ میں دفن ہوئے۔ ان کی مشہور تصانیف میں ''رسالۃ التوحید'' اور ''الاسلام والنصرانیۃ'' بڑی اہم ہیں۔ قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھنا شروع کی تھی مگر مکمل نہ کر سکے۔ اس کام کو ان کی وفات کے بعد ان کے ایک شاگرد شیخ محمد رضا رشید نے مکمل کیا۔

احمد اعرابی پاشا

مصر کو برطانوی اثرات سے نکالنے کی اولین کوشش کرنے والا انقلابی مجاہد

احمد اعرابی پاشا (1841ء-1911ء) مصر کی تحریک آزادی کا مشہور انقلابی راہنما۔ جامعہ الازہر سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد فوج میں بلند منصب حاصل کیا، بعد ازاں وزیر دفاع مقرر ہوا۔ وہ مصر میں غیر ملکی اثر خصوصاً برطانوی اثرات کا سخت مخالف تھا۔ اس 1882ء میں مصر کو دام صیاد سے نکالنے کی اولین کوشش کی اور ترکی اور برطانیہ دونوں کے اقتدار کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ مصر کے عوام کے جذبات مغربی ممالک کے خلاف عموماً مشتعل تھے لیکن جس چیز نے اعرابی پاشا کی تحریک انقلاب کو آگ کی طرح پورے مصر میں پھیلا دیا وہ تھا قانون ادائیگی قرضہ۔ جو پانچ یورپی طاقتوں کے اثر و رسوخ کی وجہ سے خدیو مصر توفیق پاشا نے پاس کیا تھا۔ اس قانون نے مصر کی عوام کو یقین دلا یا کہ اب یورپ سود خور ساہو کاروں کی طرح مصر کو ہڑپ کیے بغیر نہیں رہے گا۔ وہ اس حقیقت سے آشنا ہو گئے تھے کہ سلطان ترکی بھی یورپ کا مالی طور پر اسیر ہے وہ بھی مصر کے لیے کچھ نہیں کر سکے گا۔

1882ء میں وزیر دفاع احمد اعرابی پاشا کی قیادت میں مصر نے ترکی اور برطانیہ دونوں کے خلاف اعلان بغاوت کر دیا۔ یہ باغیانہ تحریک دراصل مصر کی پہلی قوم پرست تحریک تھی۔ عربی پاشا نے خدیو مصر سے مطالبہ کیا کہ وہ وزارت کو بدل دے اور فوج کی تعداد میں اضافہ کر کے 18 ہزار کر دے۔ اعرابی پاشا کا ساتھ مصر کی پوری فوج نے دیا اور اس نے سامراجیت کے خلاف جنگ شروع کر دی، اس موقع پر برطانیہ، فرانس اور ترکی نے خدیو مصر کے خلاف ہونے والی اس بغاوت کو کچلنے کے مشترکہ فوجی اقدامات شروع کر دیئے اور اس بغاوت سے پیدا ہونے والے بھیانک نتائج کا پرزور پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ اعرابی پاشا اور برطانوی فوجوں میں باقاعدہ ٹھن گئی۔ شروع میں مصری فوج غالب رہی مگر برطانیہ نے جلد ہی برطانوی ہندوستان سے سپاہیوں کی کمک پر کمک منگوالی۔

برطانیہ نے اعرابی پاشا کے خلاف اس جنگ کا آغاز اس کے جیسے خوبصورت شہر پر گولہ باری سے کیا۔ آخر دو ماہ کی مسلسل جنگ کے بعد اعرابی پاشا کی فوج کو شکست ہو گئی۔ مصر پر انگریزی اقتدار کا راستہ صاف ہو گیا۔ اعرابی پاشا کو گرفتار کر کے سزائے موت سنائی گئی، مگر عوام میں مقبولیت کی وجہ سے سزائے موت منسوخ کر دی گئی اور انہیں سری لنکا لے جا کر قید کر دیا گیا۔ سری لنکا میں وہ 19 سال قید رہے۔ یہیں 1901ء میں انہیں مصر واپس آنے کی اجازت دی گئی مگر اس وقت تک ان کے قویٰ جواب دے چکے تھے اور وہ ضعیفی کی وجہ سے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

مصر میں انگریز سامراجیت کا نمائندہ خاص لارڈ کرومر جس نے اعرابی پاشا کی انقلابی تحریک آزادی کو کچلنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اعرابی پاشا کی تحریک ناکام ہو جانے کے برطانیہ کے ایک پولیٹکل ایجنٹ مستقل طور پر مصر میں تعین کیا گیا

جو مصر پر برطانیہ کی طرف سے حکومت کرتا تھا۔ تاہم بظاہر مصر کی آزادی برقرار رہی اور قسطنطنیہ سے اس کا تعلق قائم رہا مگر درحقیقت اعرابی پاشا کی شکست کے بعد برطانیہ مصر کے سیاہ وسفید کا مالک بن گیا تھا۔

جنرل عبدالکریم قاسم

عراق کی ہاشمی سلطنت کو انقلاب سے تہہ وبالا کرنے والا انقلابی راہنما

مشرق وسطیٰ بیسویں صدی کے آغاز سے ہی پے درپے فوجی انقلابیت کی زد میں رہا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ کے اکثر ممالک میں سیاسی مسائل کا فیصلہ عوام ووٹوں سے کرنے کا حق نہیں رکھتے ہیں اور اکثر میں شاہانہ نظام حکومت قائم رہا ہے۔ جس میں عوام کی آواز دبا دی جاتی ہے۔ عراق میں ہاشمی خاندان کی دچالیس سالہ بادشاہت کا خاتمہ جنرل عبدالکریم قاسم نے کیا تھا جو برطانیہ کے تعلیم یافتہ تھے۔ ہاشمی بادشاہت کا آغاز شاہ فیصل اول کے تخت نشینی سے 1921ء میں ہوا تھا جبکہ اس کے پوتے شاہ فیصل سوم کو شاہی محل میں ہلاک کرکے جنرل قاسم کی فوج نے سڑکوں پر رگیدا اور اس کی نعش کو چوراہے پر لٹکا کر اس کی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔

جنرل عبدالکریم قاسم (1914ء-1963ء) نے فوجی تربیت حاصل کر کے فوج میں ملازمت کی۔ وہ 1948ء میں عراق کی طرف سے اسرائیل کے خلاف لڑی جانے والی جنگ میں شامل تھے۔ 1955ء میں انہیں عراقی فوج کے انیسویں بریگیڈ کا کمانڈر مقرر کیا گیا۔ اور یوں وہ عراقی فوج کے سربراہ بن گئے۔ 1950ء کی دہائی میں عراق کے شاہ فیصل کی حکومت نئے حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی اس لیے اس کے خلاف انقلاب ناگزیر تھا۔ عراقی عوام کو برسوں سے دبا کر رکھا گیا تھا جس کا ردعمل شدید طور پر ظاہر ہونا لازم تھا۔

14 جولائی 1958ء کو چند فوجی افسروں کے ساتھ مل کر جنرل قاسم شاہ فیصل کی حکومت کے خلاف انقلاب بپا کر دیا جس کے نتیجہ میں شاہ عراق، فیصل سوم، عراق کے وزیراعظم نوری السعید اور شاہ فیصل کے چچا شہزادہ عبداللہ شاہی محل میں قتل کر دیئے گئے۔

اس کے ساتھ ہی عراق کو جمہوریہ قرار دے دیا گیا۔

انقلاب کے فوراً بعد جنرل قاسم نے عرب یونین، مصر کے صدر ناصر کے ڈاکٹر مصدق حامی عرب قوم پرستوں اور اپنے ایک عراقی ساتھی کرنل عارف کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے اس نے کمیونسٹوں سے گٹھ جوڑ کیا مگر جیسے ہی ان کا یہ مطلب پورا ہوا خود کمیونسٹ اس کے زیر عتاب آگئے اور انقلابیت کا نشانہ بن گئے۔ عراق کے سینکڑوں سرکاری افسر بھی صدر جمال عبدالناصر کے حامی تھے۔ جنرل قاسم نے ان سب کا بڑی خوش اسلوبی سے صفایا کر دیا۔ کرنل عبدالسلام جو صدر ناصر کے حامی تھے ان کو برطرف کر کے ان کے خلاف سازش کے الزام میں مقدمہ چلایا اور انہیں سزا دی گئی مگر بعد ازاں معاف کر دیا گیا۔

جنرل قاسم نے سرحدی کرد علاقے میں تحریک چلانے والے ایک ملا برزکو جو روسیوں سے ساز باز رکھتے تھے اور شاہ فیصل نے اسے جلاوطن کر دیا تھا، وہ ماسکو میں سیاسی پناہ لیے ہوئے تھے کو واپس عراق بلا لیا جو ان کی ایک سیاسی غلطی تھی۔ ملا برزانی واپسی کے بعد جنرل قاسم کے لیے مستقل پریشانی کا باعث بن گئے اور کرد علاقے پر بمباری کے باوجود بھی اس کی باغیانہ تحریک کا خاتمہ نہ ہو سکا۔

ان کی حکومت میں بغداد ریڈیو مغربی سامراجیت کے خلاف پروپیگنڈہ کرتا رہا تھا لیکن وہ اپنے اخباری انٹرویو

میں کہتے تھے کہ وہ مغربی بلاک کے خلاف نہیں ہیں۔اس طرح کبھی وہ مغربی بلاک کی طرف جھک جاتے اور کبھی روس سے توقعات باندھتے تھے۔سیاسی معاملات میں وہ کسی سیاسی نظریہ سے وفاداری کے قائل نہیں تھے۔یہی وجہ تھی کہ عراق کے تمام سیاسی عناصر کو انہوں نے ناخوش کردیا۔اس طرح ان کا کوئی ساتھی نہ رہا اور سب ان کے خلاف ہوگئے۔

آخر 8 فروری 1963ء کو خود ان کی حکومت کے خلاف انقلاب برپا ہوگیا۔باغیوں نے وزارت دفاع کے دفتر پر بمباری کر کے اسے کھنڈرات میں بدل دیا۔جنرل قاسم کے وفادار فوجی دستوں پر قابو پا کر باغیوں نے بغداد پر قبضہ کرلیا۔9 فروری کو جنرل قاسم پر ایک فوجی عدالت میں سرسری طور پر مقدمہ چلایا گیا اور چند ایک مختصر کارروائی کے بعد انہیں موت کی سزا سنائی گئی یوں عراق کا ایک انقلابی خود دوسرے انقلاب کا شکار ہوگیا اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر کے اس کی نعش کی نمائش کی گئی۔

ڈاکٹر مصدق

اسلامی انقلاب ایران سے تقریباً 30 سال پہلے شاہ ایران کو ایران چھوڑنے پر مجبور کرنے والے انقلابی ڈاکٹر مصدق (1880ء - 1967ء) ایران کے وزیر اعظم، ان کا تعلق شاہان قاچار کے خاندان سے تھا۔ 1906ء میں جب ایران کا آئین بنا تو انہوں نے (ڈاکٹر مصدق نے) اس کی سخت مخالفت کی جس کی پاداش میں ان کو جلاوطن کردیا گیا۔1907ء میں ایران واپس آئے تو انہیں محکمہ بحالیات میں ملازمت مل گئی، لیکن یہاں بھی کچھ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے کیونکہ ان پر حکومت مخالف کارروائیوں کا الزام تھا۔تاہم کچھ عرصہ بعد انہیں وزیر خزانہ کی حیثیت سے کابینہ میں شامل کرلیا گیا۔لیکن پھر مخالفانہ کارروائیوں سے باز نہ آنے کی وجہ سے برطرف کردیئے گئے اور جیل میں ڈال دیئے گئے۔اپریل 1951ء میں جب اینگلو ایران تیل کا تنازعہ ابھرا تو حسب سابق ایک انقلابی انسان ہونے کی وجہ سے انہوں نے حکومت مخالف رویہ اختیار کیا جس کی وجہ سے وزیر اعظم بنادیئے گئے۔اسی دوران قومی اسمبلی نے ایک قرارداد پاس کر کے اتفاق رائے سے تیل کی صنعت کو قومی ملکیت میں لے لیا۔

ایران میں تیل کی صنعت کو قومی ملکیت میں لیے جانے کے بعد اینگلو ایرانی تیل کمپنی نے جوابی کارروائی کے طور پر تیل کے کنوئیں اور آبدان کی تیل ریفائنری کو بند کردیا اور انگریز ملازمین کو واپس انگلینڈ بھیج دیا۔مغرب کے ان انتظامی اقدامات کے خلاف روس نے ایران کے تیل کے بحران پر قابو پانے کے لیے روسی ماہرین کی خدمات ایران کو پیش کیں جو ڈاکٹر مصدق نے رد کردیں۔ڈاکٹر مصدق کی اس منفی پالیسی کی وجہ سے ایران شدید اقتصادی بحران میں پھنس گیا جس کی وجہ سے ملک گیر توڑ پھوڑ کی تحریک اور ہنگامے شروع ہوگئے۔یہ تحریک کمیونسٹ عناصر اور فدائیان اسلام نامی ایک مذہبی گروہ نے شروع کیے تھے۔انہیں ہنگاموں کے دوران ایران میں بادشاہت کے خاتمے اور جمہوریت کے قیام کی تحریک زور پکڑ گئی۔ ایران میں اس قسم کی انقلاب کوئی نئی چیز نہیں تھی پہلے شاہان قاچار کے عہد میں تحریکیں چلتی رہی تھیں۔ایرانی وزیر اعظم خود ایک انقلابی شخصیت ہونے کی وجہ سے بادشاہت کے خاتمہ کے حق میں تھا۔اس نے 10 اگست 1953ء کو ایک استصواب رائے کروا کر اس کو ختم کرنا چاہا۔جوابی کارروائی کے طور پر شاہ محمد رضا نے اس کو وزیر اعظم کے عہدے سے ہٹا کر جنرل فضل اللہ زاہد کو وزیر اعظم بنادیا گیا مگر اس تبدیلی کے باوجود ایران میں حالات بادشاہ کے لیے اتنے ناسازگار ہوگئے کہ خود رضا شاہ پہلوی کو وہاں سے فرار ہونا پڑا۔مگر شاہ کی خوش قسمتی سے اسی دوران ڈاکٹر اور فدائیان اسلام میں اختلاف پیدا ہوگئے۔ادھر امریکہ کے ادارے سی آئی اے نے شاہ کی حمایت میں ڈالرز خرچ کر کے مظاہرہ کروائے۔وزیر اعظم زاہدی نے فوج کی مدد سے ڈاکٹر مصدق کے حامیوں کو کچل کر رکھ دیا۔9 اگست کو سی آئی نے ڈاکٹر مصدق کا تختہ الٹ دیا اور انہیں گرفتار کرلیا گیا۔ڈاکٹر مصدق

پر فوجی عدالت میں غداری کا مقدمہ چلا گیا۔ اور سزائے قید سنائی گئی۔ قید کاٹنے کے دوران ایران کی یہ انقلابی شخصیت سخت علیل ہوگئی اور علاج کے لیے یورپ بھیجنا پڑا۔ یورپ سے واپسی پر سرطان کے عارضہ میں مبتلا ہو جانے سے 1967ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ایران کی ایک عظیم انقلابی شخصیت ہونے کی وجہ سے ایران کی تاریخ میں انہیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا اور وہ تاریخ ایران کے صفحات میں آج بھی زندہ ہیں۔

کرنل حواری بومدین

19 جون 1965ء کی صبح ریڈیو الجزائر سے ایک خبر نشر کی گئی جس میں بتایا گیا کہ الجزائر میں ایک فوجی انقلاب کے ذریعے صدر احمد بن بیلا کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا ہے۔ اس انقلاب کے سربراہ کرنل حواری بومدین تھے جنہیں صدر احمد بن بیلا نے الجزائر کا وزیر دفاع مقرر کیا تھا۔ مئی 1963ء سے وہ نائب وزیر اعظم کے عہدے پر فائز چلے آرہے تھے۔

کرنل حواری بومدین 23 اگست 1932ء کو ایک غریب کسان کے گھر پیدا ہوئے تھے۔ ان کا نام پیدائش کے وقت محمد بخار رکھا گیا تھا جو فرانسیسی تسلط کے خلاف جنگ آزادی لڑتے وقت تبدیل کر لیا گیا تھا۔ نام کی تبدیلی کا مقصد فرانسیسی حکمرانوں کے ہاتھوں پکڑے جانے سے بچنا تھا جنہوں نے الجزائر کے انقلابی راہنماؤں کے سروں کی قیمت مقرر کر دی تھی۔

حواری بومدین شروع ہی سے قوم پرست تھے۔ انہوں نے قسطنطنیہ کے ایک دینی ادارے میں تعلیم پائی اور قوم پرستی کی تحریکوں کے روح رواں رہے۔ 1951ء میں انہوں نے قاہرہ کی جامع الازہر میں داخلہ لے لیا۔ بعدازاں وہ مصر میں ایک اسکول ٹیچر بن گئے۔ اس زمانے میں الجزائر فرانسیسی قبضے کے خلاف جنگ آزادی لڑ رہا تھا۔ حواری بومدین نے جہاد آزادی میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا اور الجزائر واپس پہنچ کر حریت پسندوں سے رابطہ کیا۔ انہیں فوجی تربیت کے حصول کے لیے واپس مصر بھیج دیا گیا جہاں انہوں نے ایک فوجی اسکول میں تربیت حاصل کی۔ 1954ء کے آخر تک وہ واپس الجزائر آگئے اور اسی سال نومبر میں فرانس کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔

اگلے تین سال میں حواری بومدین کو مغربی الجزائر میں ایک انقلابی فوجی کمانڈر بنا دیا گیا۔ ستمبر 1958ء میں الجزائر کی عارضی حکومت قائم کر دی گئی اور بومدین کو چھاپہ مار کارروائیوں کا کمانڈر بنا دیا گیا۔ پھر 3 جولائی 1962ء کو الجزائر نے تقریباً 132 سال بعد فرانس سے آزادی حاصل کر لی۔ الجزائر کی آزادی کے حقیقی معمار احمد بن بیلا کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ 15 ستمبر 1963ء کو احمد بیلا ملک کے صدر بن گئے اور حواری بومدین کو نائب وزیر بنا دیا گیا۔ وہ وزیر دفاع کے عہدے پر بھی فائز تھے۔

کچھ عرصے بعد حواری بومدین اور احمد بن بیلا کے درمیان نظریاتی اختلافات نے شدت اختیار کر لی۔ 1965ء میں احمد بن بیلا نے الجزائر میں ایک سربراہ کانفرنس بلائی مگر اس کانفرنس کے انعقاد سے صرف دو دن پہلے الجزائر میں انقلاب بپا ہوگیا اور صدر احمد بن بیلا کو ان کے گھر پر نظر بند کر دیا گیا اور انقلابی کونسل نے اعلان کیا کہ اس نے ملک کی باگ ڈور سنبھال لی ہے۔

حواری بومدین 1965ء سے 1969ء تک الجزائر کے صدر رہے۔ انہوں نے انقلاب کے بعد برسر اقتدار آنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ 1963ء کا آئین معطل کر دیا۔ اس آئین کے تحت ایک قومی اسمبلی بھی قائم کر دی گئی تھی وہ بھی توڑ دی گئی۔ حواری بومدین نے ملک میں قومیانے کی پالیسی اختیار کی۔ 1965ء میں معدنی تیل کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ 1968ء میں بینکوں اور بیمہ کمپنیوں کو بھی قومی تحویل میں لے لیا گیا۔ اس کے علاوہ مختلف کارخانوں اور فرانس کی تیل کمپنی کو بھی

قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ یہ حواری بومدین کے اسلامی سوشلزم کے نفاذ کا ایک حصہ تھا۔
صدر حواری بومدین اگلے تیرہ برس تک الجزائر کے سیاہ و سفید کے بلاشرکت غیرے مالک بنے رہے۔ 1978ء میں وہ خون کے ایک مہلک مرض میں مبتلا ہو گئے اور تیسری دنیا کے اس ممتاز انقلابی راہنما نے آخرکار 26 دسمبر 1978ء کو بحالت علالت انتقال کیا۔ یاد رہے کہ جب 1965ء میں انقلابی کونسل کے صدر کی حیثیت سے انہوں نے انقلاب کے بعد ٹیلی وژن سے خطاب کیا تھا تو اپنا چہرہ نہ دکھانے کی ہدایت کی تھی مگر آہستہ آہستہ سامنے آتے چلے گئے تھے۔

رفیق الحریری

لبنان میں انقلاب صنوبر جس کی موت کے بعد برپا ہوا وہ عظیم انقلابی

نام ونسب: رفیق بہاؤ الدین الحریری، یکم نومبر 1944ء کو پیدا ہوئے۔
وہ 1992ء سے 1998ء تک اور پھر 2000ء سے 20 اکتوبر 2004ء کو اپنے مستعفی ہونے تک لبنان کے وزیراعظم رہے۔

وہ لبنان کی ایک سیاسی اور انقلابی شخصیت تھے اور ان کا تعلق ایک سنی مسلم گھرانے سے تھا۔ ان کا خاندان لبنان کے مشہور شہر سیڈون SIDON کا رہنے والا تھا۔ انہوں نے بیروت یونیورسٹی سے بزنس ایڈمنسٹریشن میں گریجویشن کیا۔
1965ء میں رفیق الحریری کام کے سلسلے میں سعودی عرب گئے۔ وہاں انہوں نے کئی تعلیمی اداروں میں پڑھایا پھر وہ تعمیراتی صنعت سے وابستہ ہو گئے۔ 1978ء میں انہیں سعودی عرب کی شہریت مل گئی جبکہ لبنان کے شہری تو تھے ہی۔
1979ء میں انہوں نے لبنان میں اسلامک ایسوسی ایشن برائے تعلیم و ثقافت قائم کی جس کا مقصد فلاحی کام کرنا تھا۔ 1982ء میں الحریری نے جنوبی لبنان کے مسئلے کا شکار ہونے والوں کی امداد کے لیے ایک کروڑ بیس لاکھ ڈالر بطور عطیہ لبنان کی حکومت کو پیش کیے۔ اس کے علاوہ بیروت کی گلیوں اور شاہراہوں کو صاف رکھنے کے لیے بھی انہوں نے اپنی تعمیراتی کمپنی کی خدمات پیش کیں۔

رفیق الحریری 1980ء کی دہائی کے آغاز میں ایک مالدار اور متمول کاروباری ساکھ کے ساتھ لبنان واپس لوٹے اور انہوں نے مختلف اداروں کو بڑے بڑے عطیات اور خطیر رقمیں دے کر بڑا نام پیدا کیا اور لبنان کی سیاست میں حصہ لینے لگے۔ 1992ء میں وہ خانہ جنگی کے بعد منتخب ہونے والے پہلے وزیراعظم تھے ان کی یہ مدت وزارت 1998ء تک تھی۔
اکتوبر 2000ء میں وہ دوسری بار وزیراعظم منتخب ہوئے اور انہوں نے اپنی کابینہ تشکیل دی۔ اسی دوران انہوں نے 2001ء میں بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے حزب اللہ کے ان ارکان کو امریکہ کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا جنہیں امریکہ نے دہشت گرد قرار دیا ہوا تھا۔ رفیق الحریری نے اس انٹرویو میں کہا تھا کہ حزب اللہ اس کے خلاف لبنان کا دفاع کرتی ہے۔ اس نے امریکہ پر الزام لگایا تھا کہ امریکہ ریاستی دہشت گردی میں اسرائیل کا ساتھی ہے۔ جس پر امریکہ کے صدر جارج بش نے ان سے پوچھا تھا کہ کیا وہ دہشت گردی کے خلاف امریکہ کے ساتھ ہیں یا پھر دہشت گردوں کے ساتھ ہیں۔
14 فروری 2005ء کو وزیراعظم الحریری 4000 پونڈ وزنی دھماکہ خیز مواد سے کیے جانے والے دھماکے میں بیروت کی ایک شاہراہ پر سفر کرتے ہوئے ہلاک ہو گئے۔ یہ دھماکہ خیز مواد ان کی مٹسوبشی کار میں رکھا گیا تھا۔ اس دھماکے میں مزید 22 افراد ہلاک اور 100 کے قریب زخمی ہوئے تھے۔ ہلاک ہونے والوں میں الحریری کے باڈی گارڈ بھی شامل تھے۔ الحریری کو محمد الامین مسجد کے قریب دفن کیا گیا۔ 2006ء کی ایک رپورٹ کے مطابق یہ دھماکہ ایک خودکش بمبار نے خود کو اڑا

کر کیا تھا۔ کینیڈین براڈ کاسٹ کارپوریشن نے خبروں کے بلیٹن کے دوران بتایا تھا کہ یہ خودکش دھماکہ حزب اللہ نے کرایا تھا جبکہ حزب اللہ نے اس دھماکہ کا الزام اسرائیل پر لگایا تھا۔

رفیق الحریری ایک بین الاقوامی حیثیت کے لبنانی راہنما تھے اور ان کی فرانسیسی صدر جیکولیس شیراک سے ذاتی دوستی تھی۔ رفیق الحریری کے قتل کے بعد ان کی بیوہ کو سب سے پہلے جس نے تعزیتی پیغام بھیجا وہ جیکولیس شیراک ہی تھے۔

21 فروری 2005ء کو لاکھوں لبنانی شہریوں نے رفیق الحریری کے قتل کی واردات کے مقام سے جلوس نکالا جس میں شامی فوج کے انخلا کے ساتھ لبنان کے شام نواز وزیراعظم ایمائیل لاہود پر اس قتل کا الزام اس احتجاجی مظاہرے سے مظاہروں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو ''انقلاب صنوبر'' کہلاتا ہے۔

حسنی الزعیم (1949ء-1897ء)

جب شام کا صدر القوتلی بدلتے حالات پر قابو نہ پا سکا تو حسنی الزعیم نے انقلاب بپا کر دیا۔

شام کا ایک انقلابی فوجی اور سیاسی راہنما۔ اس کا خاندان کرد اور ترک نسل سے تھا۔ حسنی الزعیم عثمانی فوج کا افسر تھا۔ جب شام کے فرانس سے آزادی حاصل کرنے کے بعد 1946ء میں حسنی الزعیم کو چیف آف اسٹاف بنا دیا گیا۔ اس کی قیادت میں شام کی فوج 1948ء میں اسرائیل کے خلاف لڑی۔ بعد ازاں مارچ 1949ء میں ایک فوجی انقلاب بپا ہوا جس کی قیادت کرنل حسنی الزعیم نے کی۔ اس انقلاب میں بغیر خون بہائے ملک کی جمہوری حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ 11 اپریل 1949ء کو حسنی الزعیم نے شام کے صدر کا عہدہ سنبھال لیا اور صدر شکری القوتلی اور کئی دیگر سیاسی زعما پر مقدمے قائم کر دیئے۔ حسنی الزعیم نے اعلان کیا کہ فوجی انقلاب لانے کا مقصد ملک میں پرامن ماحول تشکیل دینا ہے اور انتظامی امور کو بہتر بنانا ہے۔ حسنی الزعیم نے صدر بننے کے بعد اپنے لیے فیلڈ مارشل کا عہدہ پسند کیا مگر ابھی وہ یہ عہدہ سنبھال نہ پائے تھے کہ امریکی ادارے سی آئی اے کی منصوبہ بندی پر ایک اور فوجی افسر سامی الحناوی نے ایک اور فوجی انقلاب بپا کر دیا۔ اس مرتبہ سامی الحناوی نے کرنل الزعیم کو دوران انقلاب قتل کر کے اقتدار سنبھال لیا۔ اس فوجی افسر نے بیان دیا کہ وہ ملک میں آئینی حکومت قائم کرے گا اور ملک میں اصلاحات نافذ کی جائیں گی۔ سامی الحناوی نے صدر کا عہدہ سنبھال لیا مگر شاید 1949ء شام کی تاریخ میں پیہم انقلابات کا سال تھا۔ 19 دسمبر 1949ء کو ایک تیسرے فوجی افسر کرنل ادیب ششکلی نے حناوی کو قتل کر دیا اور 1954ء تک استبدادی انداز میں اقتدار پر قابض رہا۔

ادیب ششکلی نے شام میں انتخابات منعقد کرائے جن کے بعد اگست 1955ء میں شام میں جمہوری و آئینی حکومت قائم ہوگئی اور تیسری بار شکری القوتلی شام کے صدر منتخب ہوگئے۔ یکم فروری 1958ء کو شام اور مصر کا الحاق وجود میں آیا اور شامی حکومت ختم ہوگئی۔ صدر قوتلی اپنے عہدے سے مستعفی ہوگئے۔ شام اور مصر کا یہ اتحاد و الحاق ستمبر 1961ء تک قائم رہا۔ 8 مارچ 1963ء کو شام میں فوج کے زیر قیادت ایک اور انقلاب آ گیا۔ یہ انقلاب بعث پارٹی کا لایا ہوا انقلاب تھا۔ بعث پارٹی کا بانی ایک عیسائی راہنما مائیکل عفلق تھا جو 1949ء میں کرنل حسنی الزعیم کے لائے ہوئے انقلاب کے بعد وزیراعظم کے عہدے پر فائز رہا تھا۔

جمال عبدالناصر

مصر کا وہ عظیم انقلابی جس نے برطانیہ اور فرانس سے نہر سویز چھین لی تھی

22 جولائی 1952ء کی رات صرف نو ے فوجی افسران کی ایک تنظیم نے جمال عبدالناصر کی سرکردگی میں ایک انقلاب کے ذریعہ مصر کے شاہ فاروق کی حکومت کا تختہ الٹا دیا۔ فوج کے ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں نے اسکندریہ میں شاہ فاروق کے محل کا محاصرہ کرلیا۔ جس میں عارضی طور پر اقامت گزیں تھے۔ شاہ فاروق کو گرفتار کر کے تاج و تخت سے دستبردار ہونے پر مجبور کردیا گیا۔ شاہ کو یہ اختیار دیا گیا کہ چاہے تو وہ مصر چھوڑ کر چلا جائے یا پھر فوجی عدالت میں اپنے خلاف چلائے جانے والے مقدمہ کا سامنا کرے۔

مصر میں 1952ء میں رونما ہونے والے اس فوجی انقلاب کے روح رواں جمال عبدالناصر تھے جو 1918ء میں پیدا ہوئے اور انہوں نے ملٹری اکیڈیمی قاہرہ سے تعلیم حاصل کی اور سیکنڈ لیفٹیننٹ کا کمیشن حاصل کیا۔ فوج میں جا کر انہوں نے دیکھا انگریز فوجی افسران مصری افسران سے توہین آمیز سلوک کرتے ہیں۔ ان حالات میں انقلاب کے سوا ان کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا جو مصر سے یہ غیر ملکی اثر و رسوخ ختم کرسکتے۔ انقلاب کے بعد ان کے ایک ساتھی جنرل نجیب مصر کے صدر بن گئے اور مصر کو جمہوریہ قرار دینے کے بعد جمال عبدالناصر نے وزیراعظم کا عہدہ سنبھال لیا۔ جنرل نجیب کی سربراہی میں انقلابی کمانڈ کونسل قائم کردی گئی اور ان تمام انقلابیوں نے محبت وطن افراد کے تعاون سے اصلاحات اور تعمیر جدید کا کام شروع کردیا۔ شہری کمیٹیاں بنائی گئیں تا کہ نئے آئین کی تشکیل اور نئی حکومت کی ترتیب میں مدد دے سکیں۔ 9 ستمبر 1952ء کو اصلاح اراضی کا اعلان کیا گیا۔ جس کے تحت دو سو ایکڑ سے زیادہ اراضی رکھنے کی ممانعت کردی گئی۔ جنرل نجیب ملک میں جلد جمہوریت بحال کرنا چاہتے تھے جبکہ جمال عبدالناصر اس انقلاب کی پشت پر اصل طاقت تھے جمہوریت کے محاذ کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جمہوریت کی بحالی سے انقلاب ہو جائے گا۔ جنرل نجیب اور کرنل ناصر میں اس معاملہ پر اختلاف بڑھتا چلا گیا جس کے نتیجے میں جنرل نجیب کو مختلف اختیار سے محروم کردیا گیا اور بالآخر 14 نومبر 1954ء کو ان کی صدارت کا عہدہ چھین لیا گیا۔ جمال عبدالناصر صدر و وزیراعظم دونوں عہدوں پر فائز ہو گئے۔ جنرل نجیب سیاہ و سفید کے مالک بن گئے اور صدر کے عہدے پر اگلے سولہ سال اپنی وفات (1970ء) تک فائز رہے۔ 1956ء میں ملک کے صدر بن گئے اور انہوں نے وزیراعظم کا عہدہ چھوڑ دیا۔ صدر ناصر شروع میں مغرب کے خلاف نہ تھے، لیکن بعد ازاں وہ کمیونزم اور روس کی طرف زیادہ جھک گئے۔ جب مغربی ملکوں نے مصر کو اپنے وعدے کے مطابق قرضہ فراہم نہ کیا تو انہوں نے نہر سویز کو قومی ملکیت میں لے لیا اور اعلان کیا کہ اسوان ڈیم اب نہر سویز کی آمدنی سے تعمیر کیا جائے گا۔ برطانیہ اور فرانس نے صدر ناصر کی اس حکمت عملی کا جواب اسرائیل سے سازش کر کے 29 اکتوبر کو مصر پر حملہ کردیا۔ امریکہ نے اس حملے کی پرزور مذمت کی جس کی وجہ سے برطانیہ اور فرانس کو اپنی فوجیں واپس بلانا پڑیں۔

روس نے صدر ناصر کے کمیونزم کی طرف جھکاؤ کی وجہ سے مصر کو اسلحہ اور دیگر امداد سے نوازا جس سے صدر ناصر کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ وہ اسرائیل کے ساتھ جنگ میں روس پر بھروسہ کرسکتے ہیں۔ صدر ناصر کی پالیسیوں کی وجہ سے اسرائیل نے 1967ء میں مصر پر بغیر اعلان جنگ حملہ کردیا اور صحرائے سینا پر قبضہ کرلیا۔ اس شکست نے صدر ناصر کی آنکھیں کھول دیں اور انہوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا مگر قوم کے مجبور کرنے پر انہوں نے اپنا استعفیٰ واپس لے لیا۔

کرنل محمد قذافی

لیبیا کا وہ مرد آہن جس پر مغربی دنیا دہشت گردی کی پشت پناہی کا الزام لگاتی رہی

یکم ستمبر 1969ء کو ایک پرامن فوجی انقلاب کے ذریعے ایک انقلابی کونسل نے لیبیا کے شاہ ادریس کی اٹھارہ سالہ پرانی حکومت کا خاتمہ کردیا۔ دیگر عرب ممالک کی طرح لیبیا میں یہ انقلاب ایک فوجی گروہ نے برپا کیا تھا جس کا سربراہ کرنل معمر قذافی نامی ایک فوجی افسر تھا۔

کرنل معمر قذافی اونٹوں کے ایک تاجر کے گھر پیدا ہوا اور اس نے کھلے صحرا میں پرورش پائی۔ 1961ء میں اس نے بن غازی کی فوجی درس گاہ سے تعلیم حاصل کی۔ دوران تعلیم لیبیا کی حکومت نے فوجی حکمت عملی پر ان کا لکھا ہوا مقالہ شائع کرنے سے انکار کردیا۔ جس سے ان کے سینے میں شاہ ادریس کی حکومت کے خلاف نفرت کا الاؤ روشن ہوگیا۔ جب وہ فوج میں افسر مقرر ہوئے تو اس کا سینہ ایمان وایقان کی روشنی سے منور تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے کئی ہم خیال دوستوں کے ساتھ مل کر ایک فری آفیسرز نامی خفیہ تنظیم قائم کی اور شاہ ادریس کی حکومت کے خلاف راہیں ہموار کرنے لگے۔ اس کے ساتھی افسروں نے شاہ ادریس کے خلاف اٹھ کھڑا ہونے کا فیصلہ کیا تو یہ حلف بھی اٹھایا کہ وہ زندگی بھر شراب نہیں پئیں گے، سگریٹ استعمال نہیں کریں گے بلکہ سادہ اور پاکیزہ زندگی گزاریں گے۔ پھر جلد ہی انہیں حکومت کے خلاف انقلاب برپا کرنے کا موقع مل گیا۔

شاہ ادریس جب اگست 1969ء میں ترکی کی سیر وتفریح میں مشغول تھا اور اس کا آرام طلب ولی عہد دار الحکومت میں موجود تھا جسے نیند سے اتنا پیار تھا کہ اس کے محل پر دو مرتبہ گولہ باری کی گئی مگر وہ اپنے خواب غفلت سے نہیں جاگا۔ انقلابی کونسل نے اسے اور شاہ ادریس کو اقتدار سے بے دخل کردیا۔

کرنل معمر قذافی نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی لیبیا کی پرسکون زندگی میں ہلچل مچادی، داخلی اور خارجی دونوں محاذوں پر مسلسل جرات مندانہ اقدامات کیے۔ ان کے عہد میں پہلی مرتبہ لیبیا نے دنیائے عرب اور دنیائے اسلام کی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ تیل کی آمدنی نے لیبیا کی معیشت کو مضبوط بنا دیا۔ صدر قذافی اصلاحات کا آغاز مختلف اداروں کو قومی تحویل میں لے کر کیا۔ ملک میں صنعتیں تو تھیں ہی نہیں اس لیے بعض تیل کی کمپنیوں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا اور بعض میں حکومت شریک ہوگئی۔ بینک اور بیمہ کمپنیاں بھی قومیائی ہوگئیں۔ قذافی نے ایک اور انقلابی اقدام یہ کیا کہ برطانیہ اور امریکہ کے فوجی اڈوں کو ختم کردیا۔ ان کے بارے میں ایک امریکی ترجمان نے کہا تھا کہ وہ اور ان کے ساتھی صرف 3 گھنٹے سوتے اور اکیس گھنٹے کام کرتے ہیں۔

سود سے پاک معاشرہ قائم کرنے کے لیے قذافی نے بینکوں سے جاری کیے جانے والے تمام قرضوں سے سود معاف کردیا تھا اور آئی ایم ایف کو اپنے ملک میں سنٹرل بینکنگ کی اجازت نہیں دی تھی۔ ملک میں بجلی مفت سپلائی کی جاتی تھی اور اس کا کوئی بل نہیں لیا جاتا تھا۔ انصافی کی باتیں کرنے والوں کے لیے یہی کافی ہے کہ کرنل قذافی نے اپنے والدین کو بھی مکان اس صورت میں فراہم کیا جب لیبیا کے ہر باشندے کو یہ سہولت فراہم کردی۔ لیبیا میں تعلیم اور طبی سہولتیں سب کے لیے مفت اور عام کردی گئی تھیں اور غیر ممالک میں تعلیم حاصل کرنے والوں کے لیے ہر طرح کی سہولت فراہم کردی گئی۔ اہل عرب

بدقسمتی سے کرنل قذافی پر ہمیشہ سے دہشت گردی پھیلانے کا الزام لگتے رہے ہیں۔ کرنل ریاست ہائے متحدہ افریقہ بنانے کے بڑے حامی تھے۔ حال ہی میں انہیں افریقی اتحاد نامی تنظیم کا صدر نشین بنایا گیا۔ اس تنظیم میں افریقہ کے 53 ممالک شریک تھے۔

2011ء میں نیٹو اور باغی قبائل نے قذافی کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ اسی جنگ کے دوران وہ 20 اکتوبر کو اپنے آبائی شہر سرت میں باغی حملہ آور کا مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے اس وقت ان کی عمر 69 سال تھی۔

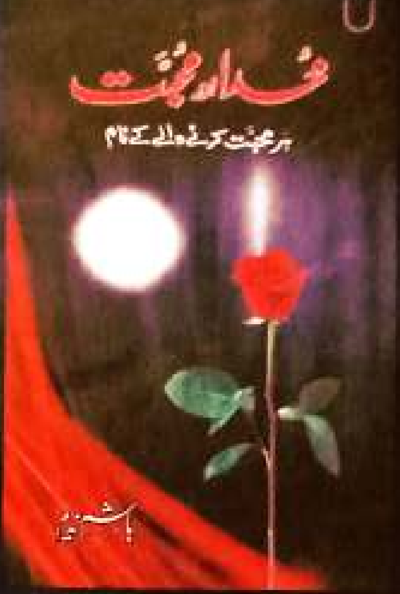

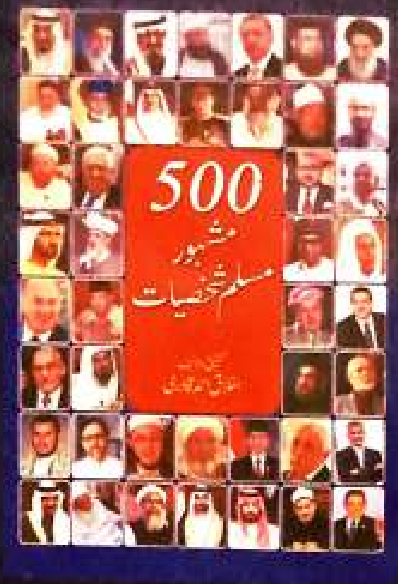

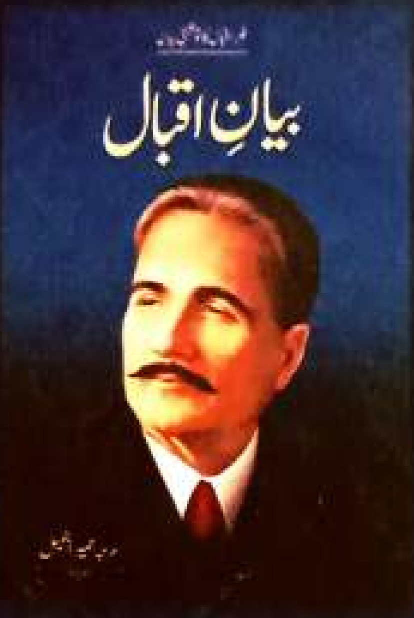

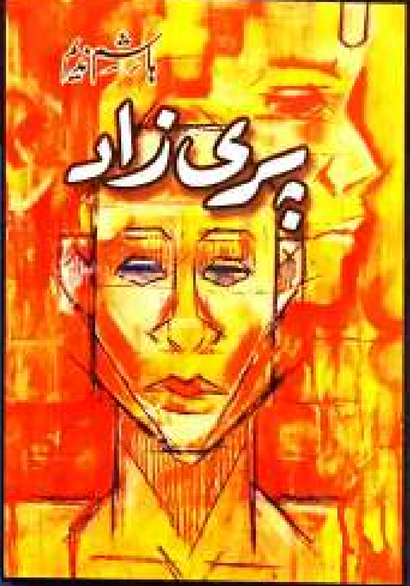

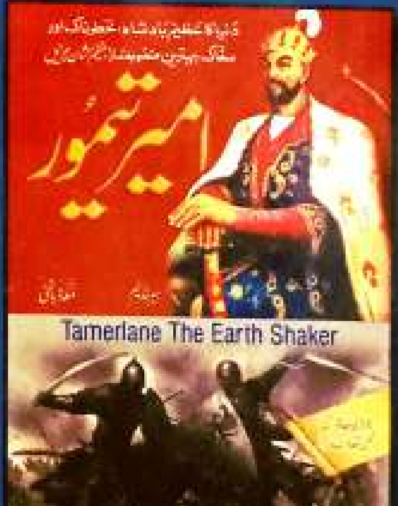

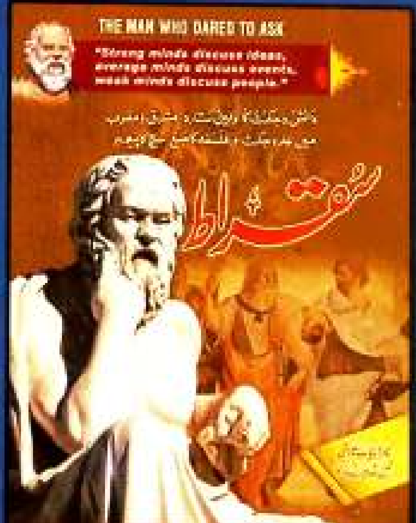

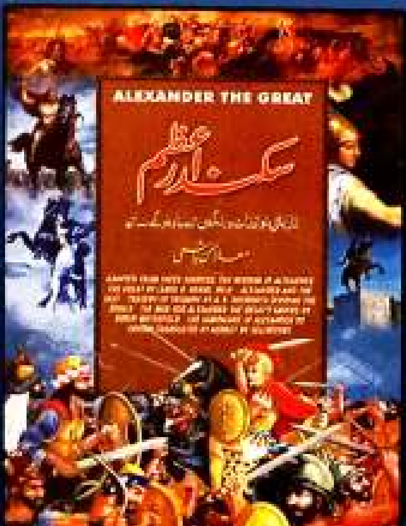

دُعا پبلی کیشنز

الحمد مارکیٹ اُردو بازار لاہور فون: 042-37233585

E-mail:duapublications@gmail.com

DUA PUBLICATIONS

Rs.995/-